مستنصر حسین تارڑ
نیویارک کے سو رنگ

فہرست

ہزاروں راستے ہیں منزلیں ہیں

فلوریڈا

نیویارک واپسی

''براڈوے سٹریٹ نمبر 112 نیویارک''

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے اداؔ
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

وہ امراؤ..... لکھنؤ کی جان..... جس کی اداؔ سے جان جاتی تھی کیسے جان گئی کہ اگلے وقتوں میں کوئی میرؔ تو تھا ہی پر آنے والے وقتوں میں کوئی تارڑ بھی ہوگا جو اپنا حالِ دلِ زار نثر میں تو بیان کر پائے گا پر اپنی حیات کو ایک شعر میں کیسے سمیٹے گا ہرگز سمیٹ نہ پائے گا تو کیوں نہ میں اس کی حیات کے منشور کو ایک شعر میں سمو دوں......

بے شک اُس نے امراؤ جان ادا نے اپنی حیات کی تلخیوں اور محرومیوں کو صرف ایک شعر میں سمو دیا..... پر اس نے مجھ پر بھی احسان کیا جو میں نثر میں بیان کرنے سے قاصر رہا اس نے شعر میں بیان کر دیا......

اگرچہ اس نے اپنی حیات کی مجبور آوارگی کے اندھیرے میں زمانے کی سیر کا ایک دیا جلایا پر اس نے دراصل میرے دل کی بات نثر کر دی..... اس نے لکھنؤ کے آس پاس ہی سفر کیا...... اکوں اور بیل گاڑیوں میں کیا پر وہ میرے دنیا جہان کے سفروں پر حاوی ہوگئی..... یوں آوارگی میں ایک طوائف میری مرشد ٹھہرتی ہے......

ہم جیسوں کے مرشد بھی ہم جیسے ہی ہوتے ہیں۔

نیویارک۔ براڈوے سٹریٹ نمبر 112۔

سلجوق کی دسویں منزل پر واقع فلیٹ کے شیشے کی دیوار کھڑکی پر بارش کی بوچھاڑیں

گیلے آبی آنسو بہاتیں، سینہ کوبی کرتیں، ماتم کرتیں دستکیں دیتی تھیں.....

فلیٹ کے شفاف چوبی فرش پر میرا سامان بندھا پڑا تھا.....

میرا کچھ سامان تمہارے پاس پڑا ہے.....

اس عمر میں یوں بھی یہ سامان کر لینا چاہئے کہ سامان باندھ لینا چاہئے کہ جانے کون سی گھڑی کوچ کا نقارہ سنائی دینے لگے..... جو نقارہ باجت ہے دن رین وہ جانے کون سے لمحے تھم جائے..... نہ باجے۔

سنٹرل پارک نیویارک کے درختوں کے پتے ایک پُر ملال زردی میں آزردہ گرنے لگے تھے..... موسموں کے پیمانے میں 24 ستمبر کو نیویارک میں باقاعدہ خزاں کا آغاز ہو جاتا ہے اور میں جو خود بھی خزاں کی اس زردی کی زد میں آیا ہوا تھا کہ ڈوبتے سورج کی زردی حیات کے منظر کو زرد کر رہی تھی..... سامان بندھا پڑا تھا اور کوچ کے نقارے کی آواز سنائی دینے کو تھی۔

میں جو خود بھی خزاں تھا اس موسمی خزاں کو دل میں اتارتا تھا پر رنجیدہ اور ملول نہ ہوتا تھا کہ میں نے سفرِ حیات کو موسموں کے تسلسل کے پہلو بہ پہلو طے کیا تھا۔ مجھے خزاں کی آمد سے دکھ نہ ہوا تھا بلکہ ایک قرار آ گیا تھا کہ پتھر میں کونپلیں بھی تو اسی حیات کے آغاز میں پھوٹیں..... بہار بھی تو یوں نازل ہوئی جیسے آسمانی صحیفے اترتے ہیں تو اب اگر خزاں وارد ہو گئی تو شکایت کیسی.....

میرے پتے بھی زرد ہو کر گرنے کو تھے..... لیکن کیسے خوش نما اور چین کی زرد شہزادیوں کے پیراہنوں کی مانند شاندار تھے..... دنیا بھر میں صرف ایک شجر ہے جو بہار میں نہیں صرف خزاں میں اپنے جوبن پر آتا ہے اور وہ ہے آتشِ عشق میں جلنے والا چنار..... تو جیسے میں امراؤ جان ادا کا ایک روپ ہوں کچھ ایسے ہی میں ایک خزاں رسیدہ چنار بھی ہوں۔ دور سے یہ چنار اگرچہ خوش نظر لگتا ہے لیکن ذرا قریب ہو جائیں تو اس کے زوال کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں..... کوئی دن جاتا ہے جب اس کا آخری پتہ بھی اس کی ڈالیوں سے جدا ہو کر زمین پر گر جائے گا اور گل سڑ کر مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائے گا..... پر ابھی سے کیا غم، جب یہ آخری پتہ زمین پر گرے گا تب دیکھا جائے گا۔

نیچے..... براڈوے سٹریٹ نمبر 112 پر واقع دسویں منزل سے نیچے بارش اور تیز ہواؤں کی زد میں آ کر اپنی ڈالیوں سے بچھڑنے والے بے انت زرد پتے پہلے تو زرد کٹی پتنگوں کی مانند ڈولتے پھرتے اور پھر وہ برستے مینہ میں بھیگتے بھاری ہو کر نیچے سٹریٹ کے پتھریلے فرش پر جا

گرتے تھے اور اُس کی سرمئی سطح پر گرمی میں آئے ہوئے ایک بدن کی مانند چپک جاتے تھے۔ اُس شیشے کی دیواری کھڑکی کہ جس پر بارش کے بے تحاشا آنسو برستے اُسے دُھندلاتے تھے تو نیچے براڈوے سٹریٹ کے فرش سے چپکے زرد پتے میوزیم آف ماڈرن آرٹ میں آویزاں کسی تجریدی تصویر کا رُوپ دھارتے تھے..اور یہ تصویر وہ بناتا تھا جس کی بنائی ہوئی تصویروں کی نقالی کر کے ہم اُس کی خدائی میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔

شفاف چوبی فرش پر میرا سامان بندھا پڑا تھا.....

مجھے کل اپنے وطن لوٹ جانا تھا.....

خزاں کا آغاز..... نیچے سٹریٹ کے پتھریلے فرش پر چپکے ہوئے زرد پتے... بارش اور ہلکی خنکی مجھے آج سے 37 برس پیشتر ترکی کے شہر ارض روم تک لیے جا رہی تھی کہ وہاں بھی خزاں کا آغاز ہو چکا تھا اور میں نے صبح سے سوائے چند انگوروں اور کچھ دہی کے کچھ نہ کھایا تھا اور میں نے جیب میں سے اپنا آخری سکہ نکال کر ایک فقیر کی جھولی میں ڈال دیا تھا..ارض روم اور نیویارک کے درمیان زمین کے بھی اور زمانے کے بھی بہت فاصلے تھے... لیکن اُن زمانوں کی مہک مجھ تک پہنچ رہی تھی..تب میں کسی بھی بندھن سے بے نیاز ایک لاپروا اور غیر ذمہ دار نوجوان آوارہ گرد تھا..اور اب میں بندھا ہوا تھا... بال بچوں اور عمر کے بیت گئے برسوں میں..اور اس کے باوجود ابھی تک لاپروا بھی تھا اور غیر ذمہ دار بھی اور آوارگی کا جنوں بھی کم ہونے کو نہ آتا تھا۔

یہ امریکہ اور کینیڈا سے میری پہلی اور کنواری ملاقات تھی..فلوریڈا اور نیویارک میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد میں کینیڈا گیا تھا اور وہاں سے پھر نیویارک واپس آیا تھا جہاں سلجوق کولمبیا یونیورسٹی میں بین الاقوامی امور میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے مقیم تھا..

یہ ابھی دو چار روز پہلے کی بات ہے جب میں کینیڈا کے سب سے خوش نظر اور پُر تاثیر صوبے برٹش کولمبیا سے واپس آ رہا تھا اور وہ میرا آخری دن تھا جب موسم کی پہلی برفباری شروع ہو گئی تھی..کینیڈین راکیز کی جھیلوں اور جنگلوں پر برف اُتر رہی تھی اور شاہراہ کے دونوں جانب درختوں کی شاخیں برف کے بوجھ سے جھکتی جا رہی تھیں جب میں نے ایک اداس مگر پھر بھی دل کو خوشی سے بھرنے والا ایک زرد اُڑتا ہوا منظر دیکھا..... پہلے ہوا دم روکے ہوئے ایک سناٹے میں تھی اور اُس خاموشی میں ہولے ہولے برف اُترتی تھی.....کار کی ونڈ سکرین سفید ہو جاتی اور پھر وائپر

کے مسلسل حرکت کرتے ہاتھ اُسے سمیٹ کر پرے کرتے جاتے اور راستہ دکھائی دینے لگتا..کوئی ایک مقام آیا جہاں وادی یکدم وسیع ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی تیز ہوا کا شور کار کی بند کھڑکیوں میں سے بھی اندر آنے لگا..خاموشی سے گرتی برف ہوا کے زور سے بے بس ہوگئی..اُس کے گالے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک سفید پیراہن کی مانند دکھائی دینے لگے جو لہر در لہر پھڑ پھڑا رہا تھا اور پھر اُسی لمحے برابر کے قدیم جنگلوں کے جتنے بھی خزاں رسیدہ پتّے تھے وہ اپنی ڈالیوں سے جدا ہوئے اور اُن کی زردی برف کی سفیدی پر حاوی ہوگئی..زردی کا ایک انبار تھا جو اُمڈتا چلا آتا تھا۔ راستہ دیکھنا مشکل ہوگیا کہ برف کو تو کار کے وائپر سمیٹ سکتے تھے لیکن زرد پتّوں کا یہ بُن تو اُن کی پہنچ سے باہر ساری وادی کو بھر رہا تھا.....اور زرد پتّوں کے اس اُڑتے ہوئے بُن میں ہماری کار جیسے دفن ہو رہی تھی.....وہ ڈولتے ہوئے ہماری جانب آتے اور ونڈ سکرین کی گیلاہٹ پر اداس چہروں کی مانند چپک جاتے.....پتّوں کی رگیں گویا سوکھی ہوئی شریانیں تھیں جن میں خون بھی زرد ہو چکا تھا اور وہ اپنی زرد آنکھوں سے ونڈ سکرین کے پار ہمیں تکتے جاتے...

ہر پتّہ کوئی نہ کوئی ایسا نقش تھا جو میری حیات کی تصویر پر ثبت تھا.....کوئی نہ کوئی ایسا چہرہ تھا جو دیکھا ہوا لگتا تھا.. پر کوئی بھی چہرہ اکثر نہ رہا..جونہی کچھ شناسائی ہونے کو لگتی اپنی زرد آنکھوں سے مجھے تکتا وہ پتّہ ہوا کی زد میں آ کر ونڈ سکرین سے جدا ہو کر برف کی سفیدیوں میں گم ہو جاتا.. اور اُس کی جگہ کوئی اور چہرہ لے لیتا اور مجھے تکنے لگتا.....کیا تم مجھے پہچانتے ہو..

خزاں مصور تھی..اور وہ کار کی ونڈ سکرین کو ایک کینوس کی مانند کبھی برف کی سفیدی سے پینٹ کر دیتی اور پھر اُسی لمحے اُس پر زرد پتّوں کے چہرے ثبت کر دیتی..ساری وادی زردی سے بھر گئی..

راستہ دیکھنا مشکل ہوگیا.....

اور پھر کوئی ایک مقام آیا جب ہم اُس سفید اور زرد دنیا میں سے نکل کر دُھوپ میں آ گئے..اور پھر نہ پری رہی اور نہ ہی جنوں رہا..

یہ ابھی دو چار روز پہلے کی بات تھی...

فرش پر میرا سامان بندھا پڑا تھا اور کل مجھے وطن واپس جانا تھا۔



''امریکہ کی اَن چکھی مے''

عدمؔ نے کہا تھا کہ.....کون ہے جس نے مے نہیں چکھی اور کون جھوٹی قسم کھاتا ہے لیکن میں واقعی ایک سچی قسم کھاتا ہوں کہ میں زندگی میں پہلی بار امریکہ جا رہا تھا..میں نے یہ مے ابھی تک نہیں چکھی تھی..میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کڑوی کسیلی ہے یا اس کے خمار میں ایسی کرامت ہے کہ وہ آپ کو جنّت سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے...

میں بالکل ویسے ہی پہلی بار امریکہ جا رہا تھا جیسے ابھی اسی برس میں پہلی بار دوبئ گیا تھا تو عوام الناس نے مجھ پر بہت ترس کھایا کہ ہائے ہائے یہ بے چارہ آج تک دوبئ بھی نہیں گیا تھا اور اپنے آپ کو جہاں گرد کہتا ہے.. یہاں بھی کچھ یہی صورتِ حال درپیش تھی کہ ہائے ہائے یہ بے چارہ..ٹی ہاؤس کے ویٹر بھی امریکہ جا کر مشاعرے پڑھ آئے ہیں اور اپنے ساتھ جشن برپا کروا کے آئے ہیں تو یہ بے چارہ..

چنانچہ میں امریکہ جاتا تھا تو چندے شرمندہ سا جاتا تھا..

ویسے دل کے بھیتر میں جو راز ہے وہ آپ پر ظاہر کرتا ہوں کہ جیسے مکّے مدینے آپ تبھی جاتے ہیں جب آپ کو بلاوا آتا ہے تو امریکہ نے بھی کبھی مجھے نہیں بلایا۔ ایشیا اور یورپ کا تقریباً ہر ملک مجھ پر اپنے پُرکشش ڈورے ڈالتا تھا..اپنے مناظر..قدیم ثقافت اور تاریخ کے ڈورے ڈالتا تھا پر امریکہ نے ڈورے تو کیا کبھی ایک ڈوری بھی نہ ڈالی..

وہ ڈوری ڈال بھی دیتا تو میں اُس کی جانب نہ کھنچتا کہ ہم دونوں کا منشور الگ الگ تھا..

گزر چکے زمانوں میں یورپ میں جو شب و روز گزرے اُن میں ایک سمندر پار کر کے امریکہ پہنچنے کے مواقع قدم بہ قدم ملتے تھے..میں نہایت آسانی سے ساؤتھمپٹن کی بندرگاہ سے کسی

لگژری لائنر میں سوار ہو کر محض پچاس پاؤنڈ کے کرائے میں نیویارک پہنچ سکتا تھا جو کسی زمانے میں نیو ایمسٹرڈیم کہلاتا تھا پر طبیعت راغب نہ ہوتی تھی.. مجھے نہایت جدید تہذیب کے بلند اور بھڑکیلے مظاہر متاثر نہ کرتے تھے... مجھے دُنیا کی بلند ترین آسمانوں میں چھید کرنے والی عمارتوں.. طویل کاروں.. نیون سائنز.. جوئے خانوں اور دولت کے انباروں سے کچھ لگاؤ نہ تھا.. میں بے شک نوادا کے صحراؤں اور گرینڈ کینین کے رعب میں آجاتا تھا پر ان کا وسیع جلال کافی نہ تھا..

اُن زمانوں میں امریکہ سے اجتناب کی ایک اور وجہ بھی تھی..... میں یورپ کے طول و عرض میں کاندھے پر سامان اُٹھائے ہچ ہائکنگ کے ذریعے سفر کرتا آوارہ ہوتا تھا.. راتوں کے لیے میرا مختصر خیمہ میرا گھر تھا اور امریکہ میں یہ سہولتیں دستیاب نہ تھیں اور فاصلے اتنے طویل اور بے پناہ تھے کہ میں اُن میں گم ہو سکتا تھا...

یورپ.. امریکہ کے نہایت وسیع کینوس کے رُوبرُو ایک مختصر تصویر تھا. مختصر اور کوزی تھا.. موسم سرما کی ٹھٹھرتی ٹھنڈک میں ہاتھوں سے دھنکی ہوئے کپاس بھری رضائی کی مانند سکھ دینے والا اور کوزی تھا جب کہ امریکہ ایک جدید کمفرٹر تھا جو اتنا بڑا تھا کہ میں اُس میں گم ہو سکتا تھا.. اور نہ وہاں لُوور.. پراڈو.. نیشنل گیلری.. اوفیزی گیلری.. ڈاہلم یا فان گوگ میوزیم تھے.. اگر کچھ تھا تو دنیا کی بلند ترین عمارتیں.. برگر.. کوکا کولا اور ہالی وڈ تھا.. اور ہاں مارلن منرو تھی... یہ صرف مارلن منرو تھی جو اُن زمانوں میں کبھی کبھار مجھے امریکہ کی جانب ملتفت کرتی تھی ورنہ اُس میں میرے لئے کچھ کشش نہ تھی..

اگرچہ میں امریکہ سے اجتناب کرتا تھا لیکن یورپ میں امریکیوں کی قربت اور دوستی کا تمنائی رہتا تھا کہ وہ یورپی اقوام کی نسبت نہایت کھلے دل کے... انتہائی دوست اور کسی بھی احساسِ کمتری سے عاری تھے.. اُن کا ظاہر اور باطن ایک لگتا تھا.. انہوں نے زبان اور لباس کو اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق ڈھال لیا تھا جب کہ یورپی ان کی قید میں بے آرام ہوتے تھے.. یورپ کی آوارہ گردی کے دوران یہ صرف امریکی تھے جن کے میں بہت قریب آیا بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ وہ منتظر رہتے تھے کہ کوئی قریب آئے.. اور اگر کوئی قریب نہ آئے تو وہ اس کے قریب چلے جاتے تھے اور ایک چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے تھے.. ''ہائے.. میں مائک ملر ہوں.. میرے ساتھ برلن چلو چند بطخوں کے ساتھ..'' میں آج بھی.. تقریباً سینتالیس برس بعد بھی ایک امریکی خاتون کو یاد کرتا ہوں جو تب اس

عمر کی تھی جس عمر کا میں آج ہوں.. میں سوئٹزرلینڈ سے جرمنی کے شہر فرائی برگ تک آیا کیونکہ مجھے بلیک فارسٹ دیکھنے کا چاؤ تھا.. میں صُبح سے بھوکا پیاسا مسلسل سفر کر رہا تھا اور فرائی برگ پہنچ کر معلوم ہوا کہ کیمپنگ سائٹ یہاں نہیں شہر سے بہت دور ایک گاؤں کے پاس ہے جہاں سے بلیک فارسٹ شروع ہوتا ہے.. وہاں تک گرتے پڑتے ایک ٹرام میں گیا.. پھر معلوم ہوا کہ کیمپنگ سائٹ ابھی دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جہاں تک پیدل جانا ہوگا.. اپنا بھاری رُک سیک اٹھائے بھوک اور تھکاوٹ سے نڈھال میں ہولے ہولے چلنے لگا اس کے ساتھ ہی بارش شروع ہوگئی.. یقین کیجیے کہ مجھے اپنی اس حالت زار اور بے بسی پر رونا آ گیا.. بالآخر کیمپنگ سائٹ تک پہنچ ہی گیا.. بارش میں بھیگتے ہوئے اپنا خیمہ نصب کیا اور پھر ایک بھیگے ہوئے اور فاقہ زدہ چوہے کی طرح رینگتا ہوا اس کے اندر چلا گیا.. کیمپنگ سائٹ میں میری توقع کے برعکس نہ کوئی ریستوران تھا اور نہ ہی کوئی سٹور جہاں سے خوراک حاصل کی جا سکتی.. شاید میرے رک سیک میں کہیں ایک باسی اور بوسیدہ فرنچ بریڈ تھی اور مجھ میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ اسے تلاش کر سکتا.. اتنی دیر میں خیمے کے باہر کسی موجودگی کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی.. ''ہیلو.. ہے دیئر.. انی باڈی ہوم'' کی آواز سنائی دی.. میں کھسکتا ہوا آگے ہوا اور خیمے کا پردہ اٹھا دیا.. باہر ایک سفید بالوں والی امریکی خاتون جھکی ہوئی تھی اور مسکرائے چلے جا رہی تھی'' میں نے اور میرے خاوند نے تمہیں اس بیہودہ بارش میں یہاں آتے دیکھ لیا تھا.. کیسا فضول ملک ہے جرمنی جہاں بارش ہوتی رہتی ہے.. ہم رات کے لیے اپنا کھانا تیار کر رہے تھے یہ تمہارا حصّہ ہے'' اس نے ایک طشتری آگے بڑھا دی جس میں ایک بڑے سائز کی ایسی سٹیک تھی جو ابھی تک سلگ رہی تھی' فرنچ فرائز کا ایک ڈھیر تھا اور بہت ساری سلاد تھی.. پہلے بے بسی پر رونا آیا تھا اور اب اس اجنبی خاتون کی بے وجہ محبت اور مہربانی پر رونا آیا.. اگلی صبح ناشتہ بھی پہنچا دیا گیا..

تو میں امریکیوں کی مہمان نوازی اور کھلی طبیعت کا شیدائی تو تھا پر ان کا ملک دیکھنے کا تمنائی نہ تھا..

اگر میں اب زندگی میں پہلی بار امریکہ کی جانب سفر کرتا تھا تو اس ماہیتِ قلب کا سبب کیا تھا.. صرف میرا بیٹا سلجوق.. جو پاکستان فارن سروس میں ہے اور ورلڈ بینک کے سکالرشپ پر کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں بین الاقوامی امور میں ماسٹرز کر رہا تھا.. اور میری اکلوتی بیٹی ڈاکٹر عینی

جو فلوریڈا میں رہتی تھی اور میرا اکلوتا نواسا نوفل جس کی پہلی سالگرہ قریب تھی.. ورنہ میں امریکہ دیکھنے کا ہرگز تمنائی نہ تھا..

ایک مدت کے بعد مجھے کسی بھی ملک کا ویزا حاصل کرنے کا عذاب سہنا پڑا تھا.. پچھلے چند برسوں میں جہاں بھی گیا، چین، نیپال، ہندوستان قطر یا دوبئی تو ذرا سرکاری طور پر گیا.. مجھے کچھ نہ کرنا تھا سوائے ایک سوٹ کیس پیک کرنے کے اور ائیر پورٹ پر اتر کر استقبالیہ کمیٹی سے ہاتھ ملانے کے.. تمام سفری کاغذات گھر بیٹھے پہنچ جاتے تھے۔ ویزا حاصل کرنے کا وبال میرے گمان میں بھی نہ تھا.. پر میں شکایت نہیں کرسکتا کیونکہ اگر مجھے جان و دل اتنے ہی عزیز تھے تو اُس کی گلی میں کیوں گیا تھا..

میرے برابر میں ایک نوجوان اور قدرے متکبّر مولانا تشریف فرما تھے.. جب آئے تو سلام دعا کے بغیر نشست پر براجمان ہو کر تسبیح میں مشغول ہو گئے.. واہیات سے رنگ کی شلوار قمیض.. سر پر ایک سیاہ چوکور ٹوپی جس میں سے اُن کی دراز زلفیں سُست سنپولیوں کی مانند لہراتی تھیں۔ ترچھی ہوئی جعلی سی داڑھی جسے وہ بار بار ہتھیلی سے گالوں پر یوں چپکاتے تھے جیسے سریش سے لگائی گئی ہو اور اُس کے اُترنے کا خدشہ ہو. تقدس کا ایک مخصوص ڈرامائی گیٹ اپ.. دوران سفر میں نے ذرا خوشگوار ہونے کی کوشش کی لیکن انہوں نے مجھ سے کچھ کلام کرنا مناسب نہ جانا..

جے ایف کے نیویارک پر اُتر کر وہ گرین کارڈ ہولڈرز کی قطار میں کھڑے ہوگئے، باہر نکلے تو تین چار منتظر پاکستانی اُن کے ہاتھ چومنے کو آئے.. وہ یقیناً کوئی برگزیدہ ہستی تھے جو امریکہ کی قباحتوں اور بے حیائیوں میں جانے کیسے اپنا دامن بچا کر مذہب کی سربلندی کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے.. لاہور میں صبح کی سیر کے دوران ایک مولانا سے بھی ملاقات رہتی ہے اور ان سے چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی ہے.. پڑھے لکھے شخص ہیں.. ایک روز خواجہ صاحب کہنے لگے ''تارڑ صاحب.. میں لنڈن سے واپس آ رہا تھا تو ہیتھرو ائیر پورٹ پر کیا دیکھتا ہوں کہ یہی مولانا چلے آ رہے ہیں.. یہاں تو جوگنگ سُوٹ میں ہوتے ہیں اور وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چمکدار زرق برق طلائی چوغے میں ملبوس ہیں.. سر پر سبز رنگ کا عمامہ ہے، ہاتھ میں ایک عصا ہے اور آنکھوں میں کوہ طور کا سارا سُرمہ ہے.. جو مرید اُن کو ائیرپورٹ پر چھوڑنے آئے تھے وہ نہ صرف ان کے ہاتھ چومتے تھے بلکہ رخصت ہوتے ہوئے ان کی جانب پشت نہ کرتے تھے بلکہ اُلٹے قدموں سے انہیں کورنش بجا

لاتے ہوئے چلتے تھے.. اور آپ ہیں کہ ان کی عزت نہیں کرتے.. یہی مولانا ہر برس جنوبی افریقہ بھی جاتے ہیں اور وہاں انہوں نے ایک شرعی مسئلہ پیش کر دیا کہ نکاح کے ٹوٹنے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا جانے کس چھوٹی سی لغزش سے ٹوٹ جائے تو عین ممکن ہے کہ آپ میں سے بیشتر حضرات اپنی بیویوں کے ساتھ گناہ کی زندگی بسر کر رہے ہوں تو احتیاطاً نکاح دوبارہ کروا لیں اور اس کارِ خیر کے لیے میں حاضر ہوں چنانچہ ہر برس جنوبی افریقہ جاتے ہیں اور درجنوں جوڑوں کو گناہ کی زندگی سے بچانے کے لیے اُن کے نکاح دوبارہ پڑھتے ہیں اور بقول ان کے یہ شکر گزار لوگ اُن کے چوغے کو نوٹوں سے بھر دیتے ہیں..

اگر آپ توہم پرستی اور مذہب کے نام پر جہالت دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ پاکستان میں نہیں.. ناروے، انگلینڈ اور امریکہ وغیرہ میں مقیم پاکستانیوں میں دیکھئے آپ عش عش کر اٹھیں گے.. جس بھی ڈبہ پیر کا کاروبار پاکستان میں نہیں چلتا وہ انگلینڈ کا رخ کرتا ہے اور پیر کامل ہو جاتا ہے..

جہاز کی نشستوں کی آخری قطار میں جہاں ٹانگیں پھیلانے کی گنجائش ہوتی ہے وہاں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی جو ہمہ وقت اور ہمہ تن آس پاس سے غافل اپنے سات آٹھ ماہ کے بچّے کی آؤ بھگت میں مگن تھی، کبھی اُسے کھلاتی تھی اور کبھی جھلاتی تھی.. وہ بچہ کلکاریاں مارتے اُس کے کٹے ہوئے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر کھینچتا تو وہ درد کے مارے دوہری ہوتی ہوئی بھی مسکراتی تھی اور اپنے بال اُس کی گرفت سے نہ چھڑاتی تھی۔ مسلسل اُس سے باتیں کئے چلی جاتی تھی ناراض ہو کر کبھی اُسے ''کھوتا'' کہتی تھی اور خوش ہو کر اسے ''چُوڑا'' کہتی تھی.. کبھی وہ اُس کی ناک کو مٹھی میں لے لیتا اور کبھی اُس کی آنکھوں کو تھپکنے لگتا.. وہ اُسے دودھ پلاتی تو وہ منہ کھول کر سو جاتا.. لڑکی اُسے جہاز کی پارٹیشن کے ساتھ آویزاں کئے ہوئے پالنے میں لٹا کر کچھ دیر ستا لیتی اور پندرہ بیس منٹ بعد پھر وہی کھیل شروع ہو جاتا..

روزِ ازل سے مامتا کی سٹیج پر یہی کھیل کھیلا جا رہا ہے اور اس کے باوجود ہر بچّے کی آمد پر یہ کھیل جیسے پہلی بار کھیلا جاتا ہے.. آپ اس سینکڑوں بار دیکھے گئے کھیل کو دیکھ دیکھ کر اُکتاتے نہیں.. ہر بچہ وہی حرکتیں اور وہی شرارتیں کرتا ہے.. وہی آوازیں نکالتا ہے جو اس دنیا میں آنے والا ہر بچہ نکالتا ہے.. آج تک روزِ ازل سے آج تک جتنے بچّے پیدا ہوئے اُن کی حرکات و سکنات میں کچھ

تبدیلی نہیں آئی۔ ایک تسلسل ہے اور اس کے باوجود ہر بچّہ ایک نیا بچّہ ہوتا ہے.. ہر ماں اپنے بچّے کی انہی حرکتوں' شرارتوں اور آوازوں کو اس طرح انجائے کرتی ہے جیسے وہ اس کائنات کے وجود میں آنے کے بعد پہلا بچّہ ہو.. ماں تو اپنی جگہ وہ بچّہ دیکھنے والوں کو بھی اپنے آپ میں مگن کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ میں بھی اس پرواز کے دوران اسی بچّے میں مگن رہا.. اور نیویارک تک میں یہ جان گیا کہ یہ کتنی دیر سوتا ہے.. کتنا دودھ پی کر فیڈر کو پرے دھکیل دیتا ہے اور پھر کتنا وقت اپنی ماں کے بال نوچنے میں صرف کرتا ہے۔

میں قدرت کے اس عظیم کھیل اور انوکھے کھیل کو تقریباً بھول چکا تھا جو ایک بچّہ زندگی کی سٹیج پر وارد ہو کر کھیلتا ہے کیونکہ میرے بچّے' بچّے نہیں رہے تھے، بڑے ہو چکے تھے.. لیکن میں اپنی بیٹی کے بچّے نوفل کو پہلی بار ملنے جا رہا تھا چنانچہ یہ بچّہ مجھے اُس ملاقات کے لیے تربیت دے رہا تھا۔ مجھے سکھا رہا تھا کہ دیکھو ایک بچّے کے ساتھ اس طرح محبت کرتے ہیں۔

بے شک غیر ملکی ایئر لائنز میں سفر کرنے کے بے شمار فوائد ہیں۔ ٹکٹ نسبتاً کم قیمت پر مل جاتے ہیں۔ صفائی ستھرائی بھی بڑھیا ہوتی ہے اور آس پاس نہایت ''تہذیب یافتہ'' اقوام کے لوگ براجمان ہوتے ہیں۔ ٹائلٹ صرف یوڈی کلون سے مہکتے ہیں اور خورد و نوش کے بندوبست بھی نہایت خمار آور ہوتے ہیں جب کہ پی آئی اے کے کرائے گراں ہیں.. سروس میں بے اعتنائی ہوتی ہے.. ٹائلٹ میں یوڈی کلون کے سوا ہر ''مہک'' ہوتی ہے اور آس پاس جو ہجوم ہوتا ہے وہ زیادہ تر انار کلی یا زیب النساء کی نسبت بھی ذرا نچلے درجے کا ہوتا ہے تو اس کے باوجود پی آئی اے ہی کیوں؟.. عینی چونکہ ان راستوں کی مسافر اکثر ہوتی ہے تو اس ترجیح کے بارے میں وہ بڑی پتے کی بات کرتی ہے.. کہ ابّو میں پی آئی اے میں نیویارک جاتی ہوں تو اداس نہیں ہوتی، لگتا ہے کہ ابھی پاکستان میں ہی ہوں.. زبان، اخبار، ٹیلیویژن، ایئر ہوسٹسوں کے لباس اور آس پاس کے لوگ اپنے جیسے ہوتے ہیں۔ بلند آواز میں بات کرتے ہیں تو جہاز پُر رونق اور زندہ لگتا ہے اور جونہی میں نیویارک اُتر کر آرلینڈو جانے والی فلائٹ میں سوار ہوتی ہوں تو ہر سُو سناٹا ہوتا ہے۔ تمام چہرے اجنبی اور مجھ سے مختلف ہوتے ہیں.. زبان بھی الگ ہوتی ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ پاکستان مجھ سے چھوٹ گیا ہے.. آپ لوگوں سے میں جدا ہو گئی ہوں.. میں یکدم تنہا ہو جاتی ہوں اور اداس ہو جاتی ہوں اور رونے لگتی ہوں.. آس پاس کوئی میری جانب دیکھتا بھی نہیں کہ یہ لڑکی کیوں روئے

چلی جا رہی ہے.. پی آئی اے میں سفر کرتے ہوئے ایک بار یونہی آنسو بہنے لگے تو ایک اماں جی اپنی سیٹ سے اٹھ کر آ گئیں اور سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں.. بیٹی کیا ہوا۔

میں تقریباً انچاس برس کے بعد کسی جہاز میں سوار یورپ کی جانب جا رہا تھا.. پہلی بار کے بعد میں جتنی مرتبہ یورپ گیا خشکی کے راستے گیا..

آج یہی محسوس ہوتا ہے شاید یہ قبل از مسیح کا قصہ ہے جب میں انگلینڈ جانے کے لیے پہلی بار ایک جہاز میں سوار ہوا تھا.. آپ کو اس قصے کے قبل از مسیح ہونے کا یقین تب آئے گا جب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ان دنوں ابھی جیٹ ہوائی جہاز ایجاد ہی نہیں ہوئے تھے اور شرفاء انگلستان جانے کے لیے بحری جہاز کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ رائل ڈچ ایئر لائنز یعنی کے ایل ایم کا ایک سپر کانسٹلیشن جہاز تھا اور ظاہر ہے پنکھوں والا تھا.. یہ جہاز آج کے پیمانوں کے مطابق چیونٹی کی چال چلتا تھا بلکہ اُڑتا تھا.. پرواز کم کرتا تھا اور جگہ جگہ اُتر کر پٹرول بھروانے میں زیادہ وقت صرف کرتا تھا.. کراچی سے روانہ ہوتے ہی ہانپنے لگا اور تہران میں جا اُترا.. پھر ایک انگڑائی لی اور قاہرہ کی رات کے سحر میں مبتلا ہو کر وہاں لینڈ کر گیا.. تمام مسافروں کو ایک کوچ میں سوار کر کے ایک نہایت ہوش ربا نائٹ کلب میں لے جایا گیا تا کہ ڈنر کر سکیں۔ ڈنر کیا خاک کرتے کلب میں عرب دوشیزاؤں کے بدن ایسے تھرکتے تھے جیسے اُنہیں مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو.. اُن سے نظر ہٹتی تو میز پر دھری خوراک پر نظر کرتے.. ویٹروں نے تُرکی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں اور صدر دروازے کے اوپر جمال عبدالناصر کی تصویر سجی تھی.. وہ دوشیزائیں کچھ دیر تو خاموشی سے تھرکتیں اور سوائے اُن کی نافوں میں بندھی گھنٹیوں کے اور کوئی آواز نہ آتی اور پھر یکدم آرکسٹرا کو بھی حال سا پڑ جاتا اور وہ یا حبیبی یا حبیبی کا الاپ کرنے لگتیں.. زندگی میں پہلی بار عربوں کی زبانی عربی سنی تو ہم نے احترام سے سر جھکا دیئے.. قاہرہ سے کوچ ہوا تو ابدی شہر روم میں جا اُترے جہاں دوپہر ہونے والی تھی.. مسافر حضرات کو ایئر پورٹ ریستوران میں من پسند لنچ کے لیے کوپن جاری کر دیئے گئے.. روم میں یہ قیام مجھے اُن بھولے مولانا کی نسبت سے یاد آتا ہے جو انگلستان میں تبلیغ کی خاطر جا رہے تھے لیکن انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتے تھے اور بقول اُن کے کہ جب کفار کے سینے میں نور کی شمع روشن ہو گی تو وہ خود بخود اردو اور پنجابی وغیرہ سمجھنے لگیں گے..

ویٹر نے خوراک کا مینو سامنے رکھ دیا تو بھولے مولانا نے اُسے میری جانب سرکاتے ہوئے کہا.. بیٹا تم یہ پڑھ سکتے ہو؟

مینو شاید فرانسیسی یا اطالوی زبان میں تھا انگریزی میں ہرگز نہ تھا لیکن مجھے یورپی خوراک سے شغف کے باعث یہ معلوم تھا کہ ''پولے'' چکن کو کہتے ہیں اور صرف یہی ایک لفظ میری سمجھ میں آیا..

''بیٹے تم کیا کھاؤ گے؟'' انہوں نے بے چارگی سے پوچھا۔

''جناب میں تو چکن کھانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں..''

''یہ حلال ہے؟''

''پتا نہیں سر.. پولے ہے جو بھی ہے۔''

''تو پھر تم ویٹر سے کہو کہ مجھے کچھ سبزیاں لا دے.. جو تلی ہوئی نہ ہوں' اُبلی ہوئی ہوں. میں حرام نہیں کھانا چاہتا'' ظاہر ہے انہوں نے یہ حرام والا وار مجھ پر کیا تھا..

جب ہمارا آرڈر لایا گیا تو اُس کا منظر کچھ یوں تھا.. ایک باوردی ویٹر ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا ریستوران میں داخل ہوا. ٹرالی ہماری میز کے پاس آ رُکتی ہے.. اس کے اوپر ایک سنہری طشت میں بھاپ اُڑاتا ایک روسٹ چکن ہے جو گرم شوربے میں بھیگا ہوا لذّت کی مہک کو پورے ریستوران میں بکھیرتا ہے.. چکن کے گرد انواع واقسام کی تلی ہوئی سبزیاں اور ساس ہیں.. یہ طشتری میرے آگے سجا دی گئی.. پھر ویٹر نے جھک کر ٹرالی کے نچلے حصے میں سے ایک پلیٹ برآمد کی جس میں چند مٹر کے دانے، کچھ ناتواں سی گاجریں اور شلغم وغیرہ ایک ناخوشی کی حالت میں اُبلے ہوئے پڑے تھے.. یہ پلیٹ مولانا کے آگے رکھ دی گئی.. جب میں اپنے خستہ اور گرم چکن کے چند پارچے شکم میں اُتار چکا اور مولانا ابھی کانٹے سے مٹر کے ایک دانے کا تعاقب کر رہے تھے تو انہوں نے پوچھا ''برخوردار یہ چکن ذائقے میں کیسا ہے؟''

میں نے چٹخارے لیتے ہوئے عرض کیا کہ جناب بس کیا عرض کروں.. بہت ہی سبحان اللہ..

مولانا نے اپنی پلیٹ پرے دھکیل کر کہا ''مجھے اس چکن کی شکل سے لگتا ہے کہ یہ حلال ہی ہو سکتا ہے. تم ویٹر سے کہو مجھے بھی یہی لا دے''۔

پنکھوں والا یہ جہاز روم سے اُڑا اور اڑتے اڑتے جرمنی کے شہر ڈسلڈوف میں جا اُترا..

وہاں ذرا دم لے کر ٹینکی فل کروا کے جو پرواز کی ہے تو بیس تیس منٹوں میں ہالینڈ کے گلِ لالہ شہر ایمسٹرڈیم کے گلے جا لگے ہیں۔ یہاں بھی قاہرہ کی مانند ہمیں ایک کوچ میں سوار کر کے نہروں کے نظارے کروائے گئے.. یہ پہلا یورپی شہر تھا.. جسے میں دیکھ رہا تھا.. دیکھ کیا رہا تھا ایک نیلا نیلا خواب تھا جو مختلف رنگوں کی دُھند میں ملفوف تھا اور اس دُھند میں جتنے چہرے تھے خاص طور پر لڑکیوں کے وہ کوہ قاف سے اُتر کر سیدھے میرے کچے اور نوجوانی کی حد کو عبور کرنے والے بدن کو ایک شرمندہ سناٹے میں لے جاتے تھے.. میں جب دوبارہ ایمسٹرڈیم گیا تو نہ وہ دُھند تھی اور نہ وہ نیلے خواب.. عام سے لوگ تھے اور معمولی سی لڑکیاں کہ یہ صرف پہلی ملاقات کے سحر تھے جو ہر شے کو رنگین کرتے تھے..

ایمسٹرڈیم چونکہ کے ایل ایم کا گھر تھا اور جہاز بھی اتنی طویل پروازوں کے بعد تھکاوٹ سے چور تھا اس لیے یہاں سے لنڈن تک بی او اے سی کے طیارے میں قدم رنجہ فرمایا.. یہ طیارہ لنڈن سے ادھر کہیں بھی نہ اُترا کہ نیچے سمندر تھا..

مجھے ٹھیک طرح سے یاد تو نہیں لیکن کراچی سے لنڈن تک کے اس سفر کے دوران کافی شب و روز گزرے..

اور آج..

انچاس برس بعد ہم محض سات گھنٹے کی براہ راست پرواز کے بعد مانچسٹر میں اُترنے والے تھے یعنی آگے چلیں گے ذرا دم لے کے۔

مانچسٹر ایئرپورٹ پر چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر پی آئی اے کے تمام مسافروں کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے سامان سمیت جہاز سے باہر نکل جانے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ طویل قطاریں لگتی ہیں اور پھر آپ کو اور آپ کے سامان کو نہ صرف سکیورٹی مشینوں سے گزارا جاتا ہے بلکہ جی بھر کے آپ کو ٹٹولا بھی جاتا ہے..

یہاں ایک مختصر قیام تھا..

ایئرپورٹ کی رونقوں اور گہما گہمی میں سے گزرتے ہوئے.. سموکنگ ایریا کی تلاش میں دربدر ہوتے ہوئے مجھے ایک ریستوران سے کافی اور الکوحل کی ملی جلی مہک آئی جو یورپ کی پہلی

پہچان تھی اور اُس میں ایک عجیب سا سرور تھا۔ سموکنگ ایریا میں پچھلے آٹھ نو گھنٹوں سے لیڈی نکوٹین کے وصل سے محروم لوگ اس مرگ صفت محبوبہ سے ہونٹ لگائے اُس کے زہریلے سانسوں کو اپنے اندر اُتار رہے تھے.. میں بھی اُن میں شامل ہو گیا..ایک گہرا زہریلا سانس اپنے اندر اُتارا اور سُکھی ہو کر شانت ہو گیا..

جہاز ایئرپورٹ سے بلند ہوا تو نیچے وہ شہر نظر آنے لگا جو کبھی میرا گھر ہوا کرتا تھا..

یہیں کہیں راشڈیل روڈ پر مکان نمبر 1012 ہوا کرتا تھا جس میں ایک مہربان خاتون مسز چیپ مین..اس کا بوڑھا باپ اور میں رہا کرتے تھے..اور سکاٹش ٹیریئر کتا ''وِسکی'' رہا کرتا تھا جو گھر سے باہر اپنا پٹہ منہ میں دابے میرا منتظر رہتا تھا کہ کب میں آؤں اور اُسے نزدیکی جنگل میں سیر کروانے کے لیے لے جاؤں اور جب سرما کی پہلی بھاری برفباری ہوئی تھی اور ہم دونوں اُس سفید ہو چکے جنگل میں اُترے تھے تو وِسکی برف میں دھنستا جاتا تھا اُس سے چلا نہیں جاتا تھا اور میں اسے گود میں اٹھا کر گھر لایا تھا اور آتش دان کے سامنے رکھ دیا تھا تا کہ اس کے سیاہ بالوں کے ساتھ جو برف لپٹ گئی ہے وہ پگھل سکے..

ایک نزدیکی قصبے میں فلم دیکھ کر جب میں رات گئے گھر لوٹتا تھا تو فرینک سناٹرا کا گیت ''آل دے وے'' گنگناتا جاتا تھا تا کہ تاریکی میں ڈر نہ لگے..میری محبت..گہری ہے نیلے سمندروں سے بھی گہری..اگر تم مجھ سے راستے کے آخر تک محبت کرو گے تو میں بھی وہاں تک تم سے محبت کروں گا..آل دے وے..

اور اسی 1012 راشڈیل روڈ والے گھر سے نکل کر میں نے پہلی بار لیک ڈسٹرکٹ جانے کے لیے بچ ہائکنگ کی تھی..آل دے وے..

تھوڑی دیر بعد جہاز کے نیچے ایک وسیع نیلی جھیل سرکنے لگی جو شاید ونڈرمیر تھی جس کے ہوش ربا کناروں پر میں پیدل چلا تھا اور ولیم ورڈز ورتھ کے ''ڈو کاٹج'' تک جا پہنچا تھا اور اُس کے قصبے گراس میر میں کچھ روز بسر کیے تھے..تقریباً چھیالیس برس پہلے..

یہ میرا ماضی تھا..جو بہت ہی پیچھے رہ گیا تھا..وہاں رہ گیا تھا جہاں ابھی پنکھوں والے جہاز چلتے تھے اور پہلی شیو کیے ہوئے مجھے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا..اور لمحۂ موجود میرا حال تھا۔

اور میری عمر کے مطابق یہ حال کچھ اتنا برا نہ تھا..اگرچہ دانت جھڑتے جاتے تھے پر

بقیہ بدن ابھی تک میرا ساتھ دیتا تھا۔ مجھ میں ابھی سکت تھی طویل مسافتوں کو سہنے کی اور بے وجہ محبت سہنے کی..

تو میں اس شہر مانچسٹر کے اوپر اڑان کرتا ہوا نیویارک کی جانب جاتا تھا..اور وہ بچہ پھر سے اپنی ماں کی گود میں ٹُھمکتا اُس کے بال کھینچتا ہنس ہنس کر بے حال ہوتا تھا اور اُس کی ماں اپنے بال چھڑانے کی کوشش نہیں کرتی تھی..

برابر میں جو نوجوان ڈرامائی داڑھی والے مولانا تھے وہ کب سے خراٹے لے رہے تھے..اور نیند میں جانے کیا بڑبڑا رہے تھے..

اور نیچے..

جہاز کے نیچے اب زمین نہ تھی..سمندر تھا..بحرِ اوقیانوس تھا..

بول میری مچھلی کتنا پانی..

بس اتنا پانی کہ کہیں بہت دور سمندر پار..بحرِ اوقیانوس کے پار نیویارک۔ نیویارک!

جہاز بیٹھتا چلا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ میرا دل بیٹھتا چلا جا رہا تھا کہ جونہی جہاز بلندی کم کرتا ہے اس کے ساتھ آپ کا بدن بلندی کم نہیں کرتا البتہ آپ کا دل گرنے لگتا ہے' بیٹھنے لگتا ہے اور آپ اپنی نشست کے بازو تھام لیتے ہیں کہ کہیں دل کے ساتھ ہی نہ گر جائیں..

جہاز اس لیے بیٹھتا چلا جا رہا تھا کہ ہم نیویارک کے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اُترنے کو تھے...

مجھ میں پھر وہی حیرت کروٹیں لینے لگی' جاگنے لگی جسے اب تک تو دھیما ہو کر فنا ہو جانا چاہیے تھا کہ میں تو عمر رسیدگی کی جانب مائل تھا ایک بچہ نہ تھا جو پہلی بار ایک انجانی بستی میں داخل ہونے کو ہے..اُس کا منہ کھلا ہوا ہے، آنکھوں میں تجسس اور تمنا کی کشتیاں ڈولتی ہیں جن کے بادبان کھلے ہوئے ہیں اور وہ اُسے ایک اجنبی سرزمین کی جانب لیے جا رہی ہیں..ایک اَن دیکھی بستی کے قریب ہو رہی ہیں..وہاں کے مکین اور مکان کیسے ہوں گے..میں نہیں جانتا تھا کہ حیرت کا طلسم ابھی تک ایک خزاں رسیدہ پتوں والے چنار کے کھوکھلے ماضی کی آگ میں جل چکے تنے میں موجود ہے اور وہ موجود تھا..

جہاز کی بلندی جوں جوں کم ہوتی گئی اس کے ساتھ ساتھ نیچے جو ذرّے اور دھبّے دکھائی دے رہے تھے وہ دھیرے دھیرے فوکس میں آنے لگے، اُن کی شکلیں، شباہتیں، صورتیں واضح ہونے لگیں...دھوپ کے جزیرے تھے، چھاؤں کی خلیجیں تھیں...جھیلیں اور تالاب تھے جن میں سورج چمکتا تھا اور ہمارے ساتھ ساتھ سفر کرتا تھا...رہائشی علاقے تھے جن کا طرز تعمیر یورپ سے قدرے مختلف تھا اگرچہ خوش نظر تھا اور گالف کورسز کے گھاس بھرے ٹیلے اور تالاب تھے..ایک آبنائے میں بادبانی کشتیاں نیلاہٹ پر منجمد تھیں..نیچے گھنی دم گھونٹتی آبادی اور سکائی سکریپرز کا کوئی شہر نہ تھا جو میرے تصور میں نیویارک تھا..سفید بادبانی کشتیاں پانیوں کی نیلاہٹ میں منجمد..گالف کورس، جھیلیں..اور ایک سمندری وسعت..

امریکی امیگریشن افسر اپنے شیشے کے گھر میں براجمان مجھے نہ دیکھتا تھا اپنے کمپیوٹر کی سکرین میں مجھ سے لاتعلق گم تھا..مجھے معلوم تھا کہ اس سکرین پر میری زندگی کے شب و روز تھے، میری چارج شیٹ تھی کہ میں کون تھا..میرا پیشہ کیا ہے، میں نے آج تک کیا لکھا ہے، کس کے حق میں اور کس کے خلاف لکھا ہے..میں کس مقصد کے لیے امریکہ آیا تھا..اُس سکرین پر شاید میری زندگی کے وہ گوشے بھی نظر آ رہے تھے جو میری نظر سے بھی اوجھل تھے..

''آپ کی عمر کیا ہے؟'' اُس نے سکرین سے نظریں ہٹائے بغیر سوال کیا..

''چھیاسٹھ برس..''

اُس نے پہلی بار سکرین سے نظریں ہٹائیں ''لگتا نہیں..آپ کس میڈیا یا ادارے سے منسلک ہیں؟'' میرے پاسپورٹ میں پیشے کے خانے میں ادیب اور ٹیلی ویژن میزبان درج تھا..

''میں ایک فری لانس ادیب، صحافی اور میڈیا پرسن ہوں..کسی کا ملازم نہیں ہوں..''

''امریکہ کس مقصد کے لیے آئے ہیں؟''

''اپنے بیٹے سے ملنے جو کولمبیا یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے اور بیٹی سے ملنے جو آئرلینڈ میں رہتی ہے اور اپنے نواسے کی پہلی سالگرہ میں شرکت کرنے کے لیے اور شاید مجھے یہاں ایک کتاب کے لیے یا اخباری کالموں کے لیے بھی کچھ مواد مل جائے..''

''آپ یہاں کسی یونیورسٹی میں لیکچر دیں گے؟''

''جی نہیں..''

''کیا آپ ایک مشہور شخصیت ہیں؟''

''زیادہ نہیں..''

میں بے حد احتیاط کر رہا تھا..ایک امریکی امیگریشن افسر کے پاس ملک کے صدر سے زیادہ اختیارات ہوتے ہیں..وہ جو بھی فیصلہ کر دے اُسے کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا..وہ بغیر کسی وجہ کے باقاعدہ ویزے کے باوجود آپ کو امریکہ میں داخل ہونے سے روک سکتا ہے چنانچہ میں نے اپنی حس مزاح کو بھی منجمد کر دیا تھا کہ یہ اس افسر سے سراسر مختلف ہو سکتی تھی اور مجھے مسائل سے دوچار کر سکتی تھی..اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ ایک شگفتہ مزاج شخص ہے تو میں، کیا آپ ایک مشہور شخصیت ہیں؟ کے جواب میں ذرا جعلی تکبر سے کہتا کہ آفیسر میں اتنا جانا پہچانا ہوں کہ اگر یہاں آس پاس کوئی پاکستانی ہوا اور وہ مجھے نہ جانتا ہو تو تم بے شک مجھے ڈیپورٹ کر دینا۔ میں نے یہ خطرہ اس لیے مول نہ لیا کہ عین ممکن تھا کہ اگر درجن بھر پاکستانی آس پاس ہوتے اور ان میں سے کوئی بھی مجھے نہ پہچانتا تو میں ایک احمقانہ تفریحی بیان کی پاداش میں امریکہ بدر ہو جاتا..لیکن کہیں غیب سے پی آئی اے کا ایک اہلکار نمودار ہوا اور اُس نے یہ احساس کیے بغیر کہ میں اُس لمحے کے درمیان معلق ہوں جب مجھے یا اِدھر یا اُدھر کیا جا سکتا ہے..مجھ سے ہاتھ ملایا کہ آہا..تارڑ صاحب آپ کہاں؟..

''تو آپ مشہور ہو..'' امیگریشن افسر کے پتھر چہرے پر ایک مسکراہٹ پگھلی..

''محض اتفاق ہے کہ یہ شخص مجھے جانتا تھا..''

''کیا پاویز مشاروف تمہیں جانتا ہے؟''

اب یہ مشاروف پتا نہیں کون تھا..کوئی رُوسی زار یا بیلے ڈانسر تھا تو وہ مجھے کیسے جان سکتا تھا..''معاف کیجیے گا میں سمجھا نہیں۔''

''پاویز مشاروف..یوَر پریزیڈنٹ..''

''اچھا وہ والا پاویز مشاروف..آپ کہہ رہے ہیں کہ کیا وہ مجھے جانتا ہے..ابھی چند ہفتے پیشتر اُس نے مجھے صدارتی محل میں خصوصی طور پر ڈنر کے لیے مدعو کیا تھا..'' یہ بیان سراسر حقیقت پر مبنی تھا اگرچہ کچھ حقائق قدرے مخفی رکھے گئے تھے یعنی صدر پاکستان نے میرے علاوہ تین چار سو

مزید ادیبوں اور دانشوروں کو بھی کھانے پر بلایا تھا.. جن میں سے بیشتر کو نہ میں جانتا تھا اور نہ وہ مجھ سے واقف تھے.. کون کہتا ہے کہ پاکستان میں دانشوروں کی کمی ہے..

''اوہ..'' امیگریشن افسر کی مسکراہٹ سے ظاہر ہو گیا کہ وہ متاثر ہو چکا ہے..

''نیویارک میں کہاں قیام کرو گے؟''

''اپنے بیٹے کے فلیٹ میں.. براڈوے پر کہیں..''

''کونسی سٹریٹ؟''

''مجھے علم نہیں.. اسے ایئرپورٹ کے باہر موجود ہونا چاہیے..''

''کیا وہ ہوگا؟''

''وہ میرا بیٹا ہے.. ہوگا..''

''شکریہ سَر.. انجائے یُورسٹے اِن یو ایس اے'' اُس نے پاسپورٹ کے ساتھ ایک چِٹ منسلک کر دی جو I.94 کہلاتی ہے اور مہر لگا کر مجھے واپس کر دیا۔

''میں کتنا عرصہ امریکہ میں قیام کر سکتا ہوں..''

''جتنے عرصے کے لیے تمہارا ویزا کارآمد ہے.. تقریباً ساڑھے چار برس.. تب تک..''

یہ سوال جواب صرف چار پانچ منٹ میں مکمل ہو گئے.. میں منتظر رہا کہ کب میرے کپڑے اُتروائے جائیں گے.. میرے بوٹ اور میری بیلٹ اُتروا کر بدنی تلاشی لی جائے گی پر ایسا کچھ نہ ہوا.. شنید تھی کہ یہاں پاکستانی وزیروں اور جرنیلوں کی بھی پتلونیں اُتروالی جاتی ہیں اور کیا ہی اچھا کیا جاتا ہے.. اور ہر مسلمان کو ایک دہشت پسند اور اُسامہ بن لادن کا پھوپھی زاد سمجھا جاتا ہے پر ایسا کچھ نہ ہوا..

اس پُل صراط کو پار کر کے میں سامان کی دھڑ دھڑ کرتی متحرک بیلٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا لیکن اس سے پیشتر تین ڈالر کی ادائیگی کر کے اپنے سامان کے لیے ایک ٹرالی حاصل کر لی..

سامان لاد کر جب میں ٹرالی دھکیلتا یو۔ ایس کسٹم کی جانب روانہ ہوا تو وہاں وردیوں میں ملبوس چند نہایت موٹی موٹی بے ڈول حبشنیں اور اتنے ہی موٹے گورے کسٹم اہلکار استراحت فرما رہے تھے.. میں اپنے سامان کی چیکنگ کے لیے اُن کے قریب جا رُکا تو ان میں سے ایک نے دفع دور قسم کا اشارہ کیا کہ جاؤ جاؤ ہم درویشوں کے آرام میں کیوں مخل ہوتے ہو.. مجھے اتنی آسانی

سے سرخرو ہو جانے پر شدید مایوسی ہوئی کہ میں وطن واپسی پر اپنے اخباری کالموں میں امریکہ کی اسلام دشمنی اور ایئرپورٹ پر پاکستانیوں سے بدسلوکی کے رونے نہیں رو سکتا تھا.. بے شک چند ایک ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہوں گے لیکن میرا تجربہ سراسر مختلف تھا..

جہاز سے باہر قدم رکھنے کے پورے دس منٹ بعد میں جے ایف کے ایئرپورٹ سے باہر نیویارک میں سانس لے رہا تھا.. بلکہ سانس لینے کا موقع بھی نہ ملا کہ باہر سلجوق اور اس کا بچپن کا دوست علی محمود پریشان شکلیں بنائے کھڑے تھے کہ پتا نہیں والد بزرگوار کے ساتھ اندر کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے اور وہ کب اپنے جوتوں کے تسمے باندھتے.. بیلٹ کستے باہر آتے ہیں.. اگر آتے ہیں تو..

سلجوق اور علی کیتھڈرل سکول لاہور میں اپنی ڈھلکتی نیکروں کو اُڑستے چُھٹی ٹائم ایک دوسرے کے گلے میں بازو ڈالے ''یار یار'' کرتے بچے ہوا کرتے تھے.. اور اب علی محمود ایک عرصے سے نیویارک میں تھا.. جب اُس کے بینک اکاؤنٹ میں پہلی بار ایک ایسے صفر کا اضافہ ہوا جس نے اُسے ایک ملینیئر بنا دیا تو اُس نے سب سے پہلے سلجوق کو فون کیا کہ یار میں ملینیئر ہو گیا ہوں.. سلجوق فارن سروس میں چلا گیا اور اب اس لمحۂ موجود میں یہ کیسا اتفاق تھا کہ وہ دونوں نیویارک میں تھے..

مجھے تو وہ اب بھی نیکروں میں ملبوس چھوٹے بچے نظر آ رہے تھے جو چُھٹی ٹائم منتظر تھے کہ کب اُن کے والدین انہیں لینے آئیں۔ اگرچہ پانسہ پلٹ چکا تھا.. میں اُنہیں نہیں، وہ مجھے لینے آئے تھے۔ بلکہ سلجوق نے.. جو عام حالات میں ایک شرمیلا اور نمایاں نہ ہونے کی کوشش کرتا نوجوان ہے، گلے لگا کر مجھے چوما بھی.. جیسے وہ نہیں.. میں اُس کا بیٹا ہوں..

تو یہ نیویارک تھا..



''زرد شیطان کا شہر''

''شہر اور سمندر پر ایک دُھند ہے جس میں دھواں گھلا ہوا ہے.. ایک باریک پھوار شہر کی عمارتوں اور گلیوں کے کیچڑ بھرے پانیوں پر گر رہی ہے.. تارکین وطن جہاز کے ایک کونے میں جمع خاموشی سے، پُراشتیاق اُمید بھرے شکوک سے بجھی آنکھوں سے آس پاس دیکھ رہے ہیں.. اُن میں خوف بھی ہے اور خوشی بھی..

''وہ کیا ہے؟'' ایک پولش لڑکی مجسمۂ آزادی کو دیکھ کر حیرت سے سرگوشی کرتی ہے..

''یہ امریکی خدا ہے'' کوئی جواب دیتا ہے..

تانبے کی یہ عورت.. اُس کا چہرہ اندھی آنکھوں سے دُھند کے پار سمندر کی وسعت کو دیکھتا ہے جیسے اُس کا تانبے کا چہرہ سورج کے طلوع ہونے کا منتظر ہو تا کہ اُس کی اندھی آنکھوں کو بینائی مل سکے.. اس مجسّمے کے پاؤں تلے خشک زمین بہت کم ہے' یوں محسوس ہوتا ہے یہ عورت سمندر کی منجمد لہروں کے درمیان میں سے نمودار ہو رہی ہے.. اُس کے سمندر پر سایہ کیے ہوئے بازو کے نیچے سے گزرتے ہوئے جہاز اسے ایک شاہانہ حسن عطا کرتے ہیں.. مشعل جو اس کے ہاتھ میں پیوست ہے یوں لگتا ہے ابھی روشن ہو جائے گی اور اُس کی روشنی سے دُھند چھٹ جائے گی.. اور ہر کوئی جو اس کی روشنی میں آئے گا ایک وحشی مسرت سے سرشار ہو جائے گا..''

میکسم گورکی بھی میری طرح نیویارک آیا تھا..

مجھ سے ٹھیک ایک سو برس پیشتر..

میری طرح اس لیے کہ وہ ایک ادیب تھا اور مجھے بھی کچھ دعویٰ ہے صرف یہ کہ اگر چہ

اس نے بھی میری طرح بہت سی بے رُوح تحریریں لکھیں لیکن پھر ''ماں'' ایسا ناول لکھا جو زمانوں پر اثر انداز ہوا اور میں ابھی تک اُنہی بے رُوح تحریروں میں الجھا ہو ہوں..

گورکی 1906ء میں امریکہ آیا اور یہاں کچھ مدت قیام کیا..

اس قیام کی روئداد اُس نے اپنے بے مثل مارکسی انداز میں ایک مختصر اور غیر معروف کتاب ''سٹی آف دی ییلو ڈیول'' یعنی ''زرد شیطان کا شہر'' میں بیان کی۔ امریکہ کے سفرنامے کے علاوہ اس کتاب میں اُس کے چند مضامین جو اُس نے امریکی اخباروں کے لیے تحریر کیے.. انٹرویو اور دوستوں کے نام لکھے گئے خطوط شامل ہیں.. سفرنامہ وہ صنف ہے جسے اردو ادب کے بیشتر نقادوں نے ایک عرصہ تک ادب کی ایک صنف کے طور پر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا.. اُن کے نزدیک یہ محض تاریخ اور جغرافیہ تھا ادب نہیں تھا.. شاید اُن کے علم میں نہیں تھا کہ دوستوسکی، ڈی ایچ لارنس اور گورکی بھی سفرنامے لکھ چکے ہیں.. ان بڑے ادیبوں کی کسی بھی تحریر کو.. چاہے وہ خطوط ہوں غالب کی مانند کون ہے جو ادب میں شمار نہ کرنے کی جرأت کرے.. سفرنامہ تو پھر تخلیق کا انوکھا سفر ہے..

میکسم گورکی جسے ہم بچپن میں میکسیم گورکی پڑھ جاتے تھے سوشلسٹ عقیدے پر دل و جان سے ایمان رکھنے والا ایک شخص تھا.. اگر چہ 1917ء کا انقلاب ابھی گیارہ برس دور تھا.. نیویارک کو اُس نے اپنے مخصوص عقیدے کی عینک سے دیکھا.. اُس کا رویّہ کافی حد تک متعصب اور قنوطی ہے.. لیکن ہم اُس کی تخلیقی ایمانداری پر شک نہیں کر سکتے کہ 1906ء میں نیویارک شاید ایسا ہی ہوگا جیسا کہ گورکی نے بیان کیا.. اگر چہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت میں شدید متعصب ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود کہیں نہ کہیں وہ امریکیوں کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میں نے تو آج تک نیویارک کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے وہ سب کا سب گورکی کی تحریر کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے..

وہ کہتا ہے..

نیویارک سونے کا.. زرد شیطان کا شہر ہے.. اس شیطان کا مندر ہے اور یہاں کے باسی اُس کے اندھے پجاری ہیں..

زرد شیطان کا شہر.. جس کے درمیان میں ایک ایسا شجر ہے جس کی ہر شاخ پر کونپلیں یا

پھول نہیں بلکہ ڈالر کھلتے ہیں۔صبح ہوتی ہے تو پورا شہر اس شجر کی جانب چل پڑتا ہے..اس کے گرد ہجوم کرتا ہے اور پھر اُچھل اُچھل کر..ایک دوسرے کو بے رحمی سے دھکیل کر..دھکم پیل کر کے اس کی شاخوں سے ڈالروں کے نوٹ توڑ کر اُن سے اپنی جیبیں بھرتا ہے..شام ہوتی ہے تو یہ شجر خالی ہو جاتا ہے..ایک بھی ڈالر اس کی کسی شاخ پر نظر نہیں آتا..پھر یہ مخلوق نیویارک کی ڈالروں سے لبریز جیبیں لے کر شہر کے مے خانوں، کلبوں، تفریح گاہوں اور ریستورانوں میں سما جاتی ہے اور وہاں یہ جیبیں خالی کر دیتی ہے۔گھر لوٹتی ہے تو تہی دامن ہوتی ہے۔اگلی سویر یہ مخلوق پھر سے اُس شجر کا رخ کر لیتی ہے کہ وہ سب ڈالر جو اُس نے پچھلی شب لٹا دیئے تھے پھر سے اُس شجر کی شاخوں میں سے کونپلوں کی طرح نمودار ہو جاتے ہیں..اور یہ سلسلہ یوں ہی روز وشب جاری رہتا ہے..

آج سے بیس برس پیشتر جب میں نے گورکی کا نیویارک کے بارے میں یہ تاثر پڑھا تھا تو ڈالروں سے لدے ایک شجر کا استعارہ میرے دل کو اتنا لگا تھا کہ میں نے اس تھیم کو مستعار لے کر ٹیلی ویژن کے لیے ایک ڈرامہ تحریر کیا تھا۔گورکی اس شہر کو ایک پُر اثر تخلیقی ادیب کے طور پر کیسے دیکھتا ہے..کچھ مزید حوالے پیش کرتا ہوں..

''یہ ایک شہر ہے..یہ نیویارک ہے..بیس منزلہ عمارتیں..(سو برس پیشتر ابھی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر وجود میں نہیں آئے تھے..تب بیس منزلیں بھی ایک عجوبہ تھیں) سرمئی اور خاموش سکائی سکریپر چوکور شکلوں والے خوبصورتی سے یکسر اجتناب کرتے ہوئے..اپنی بلندی پر تکبر کرتے ہوئے اور اپنی بدشکلی سے لاعلم..کسی ایک کھڑکی میں بھی پھول دکھائی نہیں دیتے اور نہ ہی بچے کھیلتے نظر آتے ہیں۔''

''دُور سے یہ شہر ایک دیوزاد جبڑا لگتا ہے جس کے غیر ہموار دانت دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دھوئیں کے سیاہ بادل آسمان میں اُگلتا ہے اور ایک پیٹو شخص کی مانند ہانپتا ہے۔تم شہر میں داخل ہوتے ہو تو گویا پتھر اور لوہے کے شکم میں چلے گئے ہو..ایک ایسا شکم جس نے لاکھوں انسانوں کو نگل لیا ہے اور اب چبا چبا کر اُنہیں ہضم کر رہا ہے۔''

''ایک امریکی کبھی بھی ڈالر قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا چاہے اُسے مرے ہوئے دو دن گزر چکے ہوں۔''

گورکی نے جی بھر کے نیویارک اور امریکہ کو لتاڑا..بے عزت کیا..اور گورکی حیرت زدہ ہو کر کہتا ہے یہ امریکی کیسے لوگ ہیں کہ اس کے باوجود ان کے اخبارات مجھ سے فرمائش کرتے ہیں کہ میں اسی نوعیت کے مضامین ان کے لیے لکھوں..اُن کے خلاف لکھوں۔

گورکی کو ایک سو برس پیشتر ایسے مضامین لکھنے کی رائلٹی ایک ہزار ڈالر فی مضمون ادا کی گئی تھی..

''امریکہ ایک ایسا ملک ہے کہ انسان خواہش کرتا ہے کہ اس کے چار سر ہوں..بتیس ہاتھ ہوں تاکہ وہ مزید محنت کرے..کام کرے..کام، کام اور کام (شاید قائداعظم نے بھی گورکی کا سفرنامہ پڑھا تھا)..یہ ایک حیرت انگیز ملک ہے ان لوگوں کے لیے جو محنت کرنا چاہتے ہوں۔''

''میں نے اپنے انٹرویو پانچ ہزار ڈالر میں فروخت کر دیئے ہیں۔''

''کیا دلچسپ ملک ہے..آپ کو ان شیطانوں کو دیکھنا چاہیے وہ کیا کر رہے ہیں اتنی سر توڑ محنت کرتے ہیں..ان میں کیسی قوت اور محنت کرنے کی صلاحیت ہے..اس کے علاوہ جہالت اور بربریت کی صلاحیت ہے..میں ان کی توصیف بھی کرتا ہوں اور ملامت بھی یہ ایسے لوگ ہیں.. دراصل جو لوگ یہاں آتے ہیں وہ احمق ہو جاتے ہیں، لالچی جانوروں میں بدل جاتے ہیں، یہاں جتنی دولت ہے اسے دیکھ کر ان کے دانت باہر آ جاتے ہیں اور پھر یا تو وہ کروڑ پتی ہیں اور یا پھر مشقت کرتے کرتے مر جاتے ہیں۔''

''امریکہ، بیکار اور بے مصرف لوگوں کے لیے کیسی خوشی سے ہمکنار کرنے والی جگہ ہے۔''

''یہ لوگ حیرت انگیز ہیں۔''

''انگریز ثقافت ایک بہت دلچسپ عجوبہ ہے۔ میں حیرت زدہ ہوں کہ یہاں سیاسی آزادی بھی ہے اور روحانی غلامی بھی..لاشیں انکے لیے زندگی کے سانس ہیں۔ یہ وحشیوں کی مانند اپنی حکومت کی پرستش کرتے ہیں۔''

''یہ ایک حیرت انگیز ملک ہے..اور یہ ایک حیرت انگیز شہر ہے۔ نیویارک۔''

یہ تو گورکی کا نکتہ نظر تھا۔ اُس کا تاثر تھا۔ اب دیکھتے ہیں کہ مجھ پر یہ ملک اور یہ شہر کیسے وارد ہوتا ہے..کہ میں ایک ادیب سے زیادہ ایک آوارہ گرد ہوں اور کسی بھی نظریئے کی قید میں نہیں ہوں۔



''ٹائمز سکوئر کا کھیل تماشا''

یہ آوازوں کی کبھی مدھم..کبھی اُبلتی..کبھی سُریلی اور کبھی بے سُری سمفنی..یہ شور آزادی اور مسرت کی آبشاروں کے پانیوں کا بلندی سے بے خودی کی چٹانوں پر گرنے کا شور..

کہیں اس شور میں کسی سیکسا فون کی مدھر اُداس دُھن اس شور میں اُبھرتی اور دل میں اتر جاتی..ڈوبتی تو دل کو ساتھ لے ڈوبتی..

اور کبھی کوئی ٹرمپٹ اتنی سریلی کہ بدن کے ایک مدت سے بند کواڑوں پر دستک دیتی ہوئی جیسے لوئی آمسٹرانگ کا سانس اسے زندہ کر رہا ہو..

ایک گٹار کے تار جیسے نا امیدی اور یاس کی شریانوں سے بنے ہوں..پر اُن تاروں کو چھیڑنے والا ان میں سے صرف مسرت کے گیت تلاش کرتا تھا..

میرے پُر ہیجان اور مسرت سے دمکتے چہرے پر..اُس چنار پر جس کے پتے سرخ ہو کر گرنے کو ہیں..اُس چہرے پر ٹائمز سکوئر نیویارک کے متحرک نیون سائن جو آس پاس کی عمارتوں پر رنگوں کی پچکاریاں چلا رہے ہیں، ہولی کھیل رہے ہیں، جل رہے ہیں..بجھ کر بھڑک رہے ہیں..میری آنکھوں میں اترتے ہیں تو گل جی کی تصویر ہو جاتے ہیں..وہیں نقش ہو جاتے ہیں لیکن پینٹ کی مانند میری آنکھوں کے کینوس پر جامد نہیں ہو جاتے بلکہ مسلسل رنگ بدلتے نت نئی تصویریں بناتے چلے جاتے ہیں۔ میں جو سناٹوں اور خاموشی کے دیس سے آیا تھا، اس مسرت اور بے خودی کی موسیقی سے آشنا نہ تھا..زندگی کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ایسی سمفنی سے ناواقف تھا..

کہ میں اپنے وطن میں اپنے آس پاس جس سمفنی کو سننے کا عادی تھا اس میں مسرت اور بے خودی کی ممانعت تھی..وہ ماتم کے سُروں میں ایک ڈیتھ مارچ کی مانند موت کے بعد مرنے کا

منظر پیش کرتی تھی.. ایک ایسی سمفنی جس میں زُہد کے تکبر اور قہر کے سندیسے تھے.. جہاں پُرخشونت اور غصیلے چہرے ہی شرافت کے معیار تھے اور مسکراہٹ یا خوشی حرام تھی..

اُس سمفنی میں بل بورڈز اور اشتہاروں پر نقش ماں اور بچے کی تصویر برداشت نہیں کی جاتی تھی اور ماں کے چہرے پر سیاہی پھینک کر عریانی اور فحاشی کو مٹایا جاتا تھا.. کہ کسی بھی نسوانی چہرے کو بے شک وہ ایک ماں ہی کیوں نہ ہو عریاں اور فحش قرار دیا جاتا تھا.. چنانچہ میں جو خاموشی اور سناٹوں کے دیس سے آیا تھا.. جہاں صرف قہر اور تکبر کی موت کے بعد مرنے کے منظر کی سمفنی ہی سنائی دیتی تھی اس شور اور بے خود آزادی اور زندگی سے بھرپور حظ اٹھانے والی سمفنی سے آشنا نہ تھا.. بے شک یہ پُرمسرت لوگ نارِ جہنم کا ایندھن بننے والوں میں سے تھے۔

میں نے ٹائمز سکوئر میں خوشی سے لبریز اور بے خود مسرت میں بھیگے ہوئے لوگ کم ہی دیکھے تھے.. ان میں صرف نیویارکر ہی نہیں تھے بلکہ امریکہ بھر سے آئے ہوئے دنیا بھر سے آئے لوگ تھے جو سب کے سب ٹائمز سکوئر کے رنگ میں رنگے گئے تھے۔

اور میں یہاں تنہا نہیں چلا آیا تھا..

نیویارک میں اپنی پہلی شب میں تنہا نہیں تھا..

سلجوق تھا جس کی عینک کے شیشوں پر اشتہاروں کے رنگین وڈیو چل رہے تھے.. میری بہو رابعہ تھی جس کی سبز آنکھوں میں کبھی کوکا کولا کی بوتل تیرتی اور کبھی براڈوے کی میوزیکل ''ماما میا'' کا اشتہار چلنے لگتا.. اور علی محمود تھا ایک مدت سے اس شہر کا باسی.. وہ نہ لاہور کو بھول سکتا تھا اور نہ نیویارک سے جدا ہو سکتا تھا.. وہ لاہور یارکر ہو چکا تھا.. یہ اس کی ہوم گراؤنڈ تھی جہاں وہ صرف اپنے انکل تارڑ کی نیویارک میں پہلی شام کو رنگ دینے آیا تھا..

ایسے گل رنگ اور بھڑکیلے مقامات پر جہاں آپ کے دائیں جانب بہو اور بیٹا تعینات ہوں اور بائیں جانب بیٹے کا بیسٹ فرینڈ تو وہاں ظاہر ہے آپ ایک نعرۂ مستانہ بلند کر کے جشن میں شامل نہیں ہو سکتے بلکہ احتیاط کرنی پڑتی ہے.. سنجیدگی اور بزرگی برقرار رکھنی پڑتی ہے کہ یہ فرشتے آپ پر.. ایک خزاں رسیدہ چنار پر کڑی نظر رکھتے ہیں کہ کہیں یہ چنار بھٹک نہ جائے.. اس کے پتے پھر سے ہرے نہ ہو جائیں' وہ آتشِ چنار جو کب کی بجھ چکی ہے کہیں پھر سے بھڑک نہ اٹھے.. اس لئے احتیاط کرنی پڑتی ہے.. خاص طور پر سلجوق کی موجودگی میں.. مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میں اور

مرحوم احمد داؤد اسلام آباد سے پشاور جا رہے تھے جہاں ہم نے ایک تقریب میں شرکت کرنی تھی.. سلجوق بھی شریک سفر تھا اور تمام عرصہ وہ اور داؤد گپیں لگاتے رہے.. واپسی پر احمد داؤد نے بڑی سنجیدگی سے کہا' تارڑ تمہارا یہ بیٹا درویش ہے.. اس کا خیال رکھا کرو.. سلجوق ان زمانوں میں ابھی نیشنل کالج آف آرٹس میں زیر تعلیم تھا۔ اور سوائے اس کے کہ اس نے اپنے بال شانوں تک بڑھا رکھے تھے اور مونا کبھی کبھار اس کی چٹیا بنا کر کہا کرتی تھی کہ صرف عینی ہی نہیں سلجوق بھی میری بیٹی ہے۔ تو ان دنوں سوائے دراز گیسوؤں کے اُس میں درویشی کی کوئی علامت نہ تھی.. البتہ فارن سروس جائن کرنے کے بعد جدّہ میں پوسٹنگ کے دوران وہ قدرے ''بنیاد پرست'' ہو گیا.. جب کبھی اسے کوئی دنیاوی کامیابی نصیب ہوتی اور یار دوست پوچھتے کہ تمہارا کون سا نیٹ ورک ہے تو وہ ہمیشہ کہتا میرا نیٹ ورک مکّہ اور مدینہ ہے وہیں سے میرے سارے کام ہوتے ہیں..

تو سلجوق ایسے مولوی کی موجودگی میں میں بہت احتیاط برتتا تھا کہ نظر کسی بھی خوش نظر بدن کے اسلوب پر.. اور کسی چہرے کی خوشنمائی اور کشش پر تادیر نہ ٹھہرے..

باپ اور بیٹے کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہے۔

میں شاید آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا جب لکشمی مینشن میں ہمارے فلیٹ کے سامنے.. ریگل چوک کے پار.. ریگل سینما میں مشہور زمانہ فلم ''سیمسن اینڈ ڈیلائلہ'' دکھائی جا رہی تھی' اس فلم کی بہت دھوم تھی اور کہا جاتا تھا کہ سیمسن کا کردار ادا کرنے والے اداکار وکٹر میچور نے اس کے ایک منظر میں بالکل اصل اور زندہ شیر کے ساتھ دست پنجہ کر کے اس کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا تھا.. یہ پہلی انگریزی فلم تھی جو میں نے دیکھی اور اپنے اباجی کے ساتھ دیکھی۔ پہلے تو خیریت گزری لیکن جب ایک منظر میں سیمسن صاحب نے جنہیں ایک پیغمبر بیان کیا جاتا ہے انہوں نے اینجلا لانسبری کے نہایت گورے گورے اور تقریباً برہنہ بدن کے گرد بازو حائل کر کے خاتون کے گلابی ہونٹوں پر.. تو یہ میری اس وقت تک کی حیات کا سب سے بڑا شاک تھا.. میرا چودہ برس کا بدن دہکنے لگا' پور پور میں گرم چیونٹیاں رینگنے لگیں اور شرمندگی کا پسینہ میری نشست بھگونے لگا.. کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہو گیا ہے.. اگر میں تنہا یہ فلم دیکھ رہا ہوتا تو شاید میرا بدنی ردعمل اس سے مختلف نہ ہوتا لیکن برابر کی نشست میں اباجی بیٹھے تھے تو ان کی موجودگی نے مجھے کہیں کا نہ رکھا.. میں شرمندگی سے اپنی نشست میں تقریباً دفن ہو گیا۔ یقیناً اباجی بھی اس لمحے اسی حالت غیر میں تھے کہ میں اپنے

چودہ برس کے بیٹے کے پہلو میں بیٹھا یہ کیا دیکھ رہا ہوں اور میں اسے یہ فلم دکھانے کے لیے کیوں لے آیا! ٹائمنر سکوئر کے رنگوں کی ہولی میں بھیگتے کچھ مقامات ایسے آئے کہ میں نے وہی خجالت اور شرمندگی محسوس کی جو پچاس برس پیشتر ریگل سینما میں بیٹھے ہوئے ''سیمسن اینڈ ڈیلائلہ'' کے پہلے بوسے کو سکرین پر نمودار ہوتے دیکھ کر محسوس کی تھی..وہاں اپنے باپ سے شرمندہ ہوا تھا اور یہاں اپنے بیٹے سے.. چنانچہ میں احتیاط کرتا تھا.نظر کو بھٹکنے سے باز تو نہیں رکھ سکتا تھا لیکن اسے کسی بھی خوشنما لباس یا بدن پر تادیر ٹھہرنے نہ دیتا تھا..

ٹائمنر سکوئر.. پکاڈلی سرکس' شانزے لیزے یا ریڈ سکوئر کی مانند ہمیشہ سے اپنے شہر کا دل نہ تھا.. یہ علاقہ جو انیسویں صدی میں ''لونگ ایکٹر'' کہلاتا تھا گھوڑوں کے سوداگروں..لوہاروں اور گرہ کٹ حضرات کا گڑھ تھا.. یہ ابھی 1904ء کا قصہ ہے جب اخبار ''نیویارک ٹائمنر'' کی بلند عمارت اس علاقے میں ابھری تو اس کی مناسبت سے اسے ''ٹائمنر سکوئر'' کہا جانے لگا.. نام کی اس معزز تبدیلی کے باوجود یہ اپنی خصلت میں معزز نہ ہوا اور نیویارکر یعنی معزز نیویارکر دائیں بائیں ہو کر اس سے کترا کر نکل جاتے تھے کہ یہ فحاشی اور عریانی کا مرکز تھا.. جسے دل و جان عزیز ہوتے تھے وہ اس گلی میں نہ آتا تھا کہ جان لینے والے بھی یہاں بکثرت پائے جاتے تھے.. یہاں گینگسٹر حضرات کا راج تھا اور مختلف مافیا اپنی من مانی کرتے تھے.. پھر چند برس پیشتر ایک شخص جولیانو نام کا نیویارک کا میئر منتخب ہوا..وہی جولیانو جس نے نو ستمبر کے صدمے سے نیویارکرز کو نکالا تھا..اس نے اس علاقے کو یوں سدھارا.. جان کی پروا کیے بغیر اطالوی مافیا کے روبرو ہو کر اسے یوں پسپا ہونے پر مجبور کیا کہ یہ علاقہ عوام الناس کا پسندیدہ ہو گیا.. نیو ائیر کی آمد پر دنیا میں سب سے بڑا جشن جس میں لاکھوں لوگ شریک ہوتے ہیں ٹائمنر سکوئر میں برپا کیا جاتا ہے جب رات کے پورے بارہ بجے اس کے مرکز سے ایک بہت بڑا گیند روشنیاں بکھیرتا نیچے آتا ہے اور لاکھوں لوگ مسرت سے بے خود ہو کر نعرے لگاتے ہیں.. سلجوق نے بھی ایک نئے سال کو اس ٹائمنر سکوئر میں خوش آمدید کہا تھا اگرچہ اس نے اپنی ''بنیاد پرستی'' سے مجبور ہو کر نعرۂ تکبیر لگایا تھا اور خود ہی ''اللہ اکبر'' کہا تھا..شاید اسے ہی قدیم روایات کا عہد جدید سے ملاپ کہتے ہیں..

نیویارک کے جے ایف کینیڈی ایئر پورٹ کے باہر سلجوق اور علی میرے منتظر تھے..

علی کی مرسڈیز میں.. ایک آسودگی اور راحت میں کہ میں ایک طویل سفر کی بے پناہ تھکاوٹ کے بعد اپنے بیٹے کے سایۂ عاطفت میں تھا.. بہت سے پُل پار کر کے..سمندر اور گھنی ٹریفک اور اجنبیت اور اس کا سرور.. ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم کولمبیا یونیورسٹی کے برابر میں براڈوے سٹریٹ نمبر 112 میں سلجوق کے فلیٹ پر پہنچ گئے..

یہاں پہنچ کر بچہ لوگ نے میری بزرگی اور سفر کی تھکاوٹ کے پیش نظر مجھے مشورہ دیا کہ آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے.. کھانا تناول فرمایئے اور کمر سیدھی کرنے کی خاطر استراحت فرمایئے۔

بے شک میں ایک بزرگ تھا.. یا ہونے کے قریب تھا لیکن کیا کیجیے کہ باہر تو نیویارک تھا اور شام ہو رہی تھی تو میں انکاری ہو گیا اور اب ہم ٹائمنر سکوئر میں تھے..

ٹائمنر سکوئر میں لوگوں کو خوش کر کے اپنا رزق کمانے والے بڑے بڑے باکمال لوگ تھے..سٹورز کے سامنے..فٹ پاتھوں پر..اور کبھی سڑک کے عین درمیان میں کیسے کیسے عجوبۂ روزگار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ایک چینی مصور سیاحوں کے کیری کیچر بنا کر مناسب ڈالر وصول کر رہا تھا..

مغربی کلاسیکی موسیقی بجانے والا ایک آرکسٹرا فٹ پاتھ پر کرسیاں لگائے اپنے آگے سٹینڈز پر میوزیکل سکورز آویزاں کیے نہایت مگن حالت میں بیتھوون کی کوئی سحر انگیز سمفنی بجا رہا تھا.. آرکسٹرا میں شامل تمام موسیقار باقاعدہ سیاہ ڈنر سوٹوں میں تھے.. یہ لوگ پیشہ ور نہ تھے محض اپنے شوق کی خاطر موسیقی بجاتے تھے.. ان کی نمائندہ ایک خاتون راہ چلتے لوگوں..ملکی اور غیر ملکی سیاحوں' گوروں' کالوں اور زرد رنگت والوں سے گزارش کر رہی تھی کہ آپ براہ کرم اس آرکسٹرا کی ترتیب شدہ موسیقی کی ایک سی ڈی خرید کر ان کی حوصلہ افزائی کریں.. امریکہ اور کینیڈا میں یہ رواج عام ہے کہ کوئی بھی سنجیدہ فنکار پہلے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر اپنے ساز پر کچھ دھنیں پیش کرے گا اور پھر انہی دھنوں کی سی ڈی فروخت کرنے لگے گا..

متعدد پرشکوہ بنی ٹھنی بگھیاں تھیں جن کے گھوڑے بھی سجے ہوئے تھے لیکن ان میں سے ایک کی کوچوان ایسی گلیمرس تھی کہ مارلن منرو کی سوتیلی بہن لگتی تھی۔ صرف پچاس ڈالر میں آپ اس

''یکے والی'' کی خدمات حاصل کر سکتے تھے.. خدمات کے زمرے میں اور کچھ نہیں آتا وہ آپ کو اپنی بگھی میں بٹھا کر تیس منٹ کے لیے ٹائمز سکوئر کی سیر کروائے گی اور اس کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت بیان کرے گی.. موڈ میں ہوئی تو کوئی لوک گیت بھی الاپ دے گی..

ایسے دائرہ نما سائیکل بھی تھے جن پر نصف درجن سیاح سوار ہو کر پیڈل چلاتے اور چیخیں مارتے تھے.. سائیکل کا ڈرائیور صرف یہ اہتمام کرتا تھا کہ وہ کوئی حادثہ نہ کر بیٹھیں۔

براڈوے کے ایک تھیٹر کے سامنے ایک بڑے سفید کاؤبوائے ہیٹ اور مختصر سکرٹ میں ملبوس ایک درمیانی عمر کی نہایت خوش شکل خاتون ہر آنے جانے والے کو روک کر سوال کرتی تھیں کہ آپ سمجھتے ہیں کہ بش نے عراق پر حملہ کر کے ایک جرم کا ارتکاب کیا ہے.. کیا اس پر جنگی جرائم کے سلسلے میں مقدمہ چلنا چاہئے اور کیا امریکیوں کو عراق سے واپس آ جانا چاہئے.. اور کیسے؟

ایک گنجے حضرت ٹی شرٹ کے بجائے آہنی زرہ بکتر پہنے فٹ پاتھ اور سڑک کے درمیان جو ریلنگ تھی اس پر اپنے آپ کو بمشکل قائم رکھے مسکرا رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ مسکراتے مسکراتے ذرا جھولے اور فٹ پاتھ پر گر گئے.. اسی حالتِ مسکراہٹ میں اٹھے زرہ بکتر جھاڑی اور پھر سے ریلنگ پر براجمان ہو گئے۔ جانے کون سے جہان کی سیر کر رہے تھے۔

رابعہ ظاہر ہے متعدد بار یہاں آ چکی تھی اور اُس کی سبز آنکھوں میں حیرت تھی کہ میں جس بندے سے بیاہی ہوئی ہوں وہ تو نہایت متین اور سنجیدہ خصلت کا مالک ہے لیکن اس کا باپ عجیب ہے۔ آنکھوں میں سے مسرت کی پھلجھڑیاں پھوٹتی ہیں۔ ہر دو قدم کے بعد رک جاتا ہے.. کبھی کسی شوکیس کے سامنے اور کبھی کسی موسیقار کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے.. اور کبھی کسی تھیٹر کے بل بورڈ اس کے قدم روک لیتے ہیں..

ٹائمز سکوئر کی سب سے مسکراہٹ آمیز یادگار سفید رنگ کی ایک طویل لیموزین ہے..

دوبئی میں قیام کے دوران میرے ایک آدھے پٹھان' آدھے عرب دوست سہیل اَل زارونی نے اپنی کاروں کی فلیٹ میں سے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلانے کے لیے ایک ایسی ہی لیموزین روانہ کی تھی جس میں بیٹھ کر میں بہت بے آرام ہوا تھا کہ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں ہم ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے.. ہلکے سروں میں عربی موسیقی بج رہی تھی' نہ ڈرائیور دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی پتہ

چلتا تھا کہ یہ چل رہی ہے یا کھڑی ہے اگرچہ ڈیڑھ سو کلومیٹر کی رفتار سے فراٹے بھر رہی ہوتی تھی۔ سچی بات ہے کار والا لطف نہ آیا.. جیسے ایک جھونپڑے میں رہنے والے کو ایک شاہی محل میں فروکش کر دیا جائے تو وہ اس کی وسعت میں بے آرام ہوتا ہے.. تو اسی نوعیت کی ایک سفید لیموزین ٹائمز سکوئر میں ایک سفید اژدھے کی مانند ہولے ہولے سرکتی جاتی تھی.. کھڑکیاں کھلی تھیں اور ان میں سے چار پانچ سیاہ فام لڑکیاں اپنے متناسب بالائی دھڑ باہر نکالے.. لٹکی ہوئیں.. دانتوں کی سفیدی اور بدن کی سیاہی نمایاں.. اور وہ سب مسلسل چیخیں مار رہی تھیں.. ہر راہ گیر کو متوجہ کر رہی تھیں.. دیوانوں کی مانند ہاتھ ہلاتیں ہر شخص کی جانب منہ سکیڑ کر اس پر ہتھیلی لگا کر ہوائی بوسے نچھاور کر رہی تھیں.. گویا اعلان کر رہی تھیں دیکھو ہمیں دیکھو ہم ایک طویل لیموزین میں سوار ٹائمز سکوئر میں ہیں تو تم ہی کہو کہ زندگی میں اس سے بڑی مسرت کیا ہوگی.. میرا قیاس تھا کہ زندگی نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہ کیا تھا اور انہوں نے اپنی پس ماندگی چند لمحوں کے لیے فراموش کر دینے کی خاطر جانے کتنے جتن کئے اور اتنے ڈالر جمع کئے کہ وہ مشترکہ طور پر صرف آدھے گھنٹے کے لیے یہ لیموزین کرائے پر حاصل کریں اور پھر دنیا سے مخاطب ہو کر کہیں' دیکھو ہمیں دیکھو..

تو یہاں ٹائمز سکوئر میں خوشی کا تعلق چار مرغابیوں سے نہ تھا ایک سفید اور طویل لیموزین سے تھا.. میری آنکھوں میں آج بھی ٹائمز سکوئر کی کوئی تصویر ابھرتی ہے تو اس میں سب سے نمایاں عکس ان سیاہ فام لڑکیوں کا ہے.. اپنی مسرت میں ٹائمز سکوئر میں جتنے بھی ہزار ہا لوگ تھے انہیں شامل کرتیں.. شور مچاتیں.. چیختی چلاتیں پاگل ہوتیں.. کہ دیکھو.. ہمیں دیکھو..

اور یہیں ٹائمز سکوئر میں اور اس کے پہلو میں براڈوے کا علاقہ ہے۔ جس کے تھیٹرز اور کھیل گھروں کی یکتائی دنیا بھر میں اس کی پہچان ہے.. یہ وہ ٹکسال ہے جہاں اگر کسی بھی ڈرامہ نویس کے ڈرامے کا سکہ ڈھل جائے تو وہ امر ہو جاتا ہے.. یہاں ابھی تک ایسے کھیل بھی کامیابی سے کھیلے جا رہے تھے جن کا تذکرہ میں ایک عرصے سے آرٹ میگزینوں میں پڑھتا چلا آیا تھا.. ''فینٹم آف دی آپرا'' ''لائٹ ان دی پیازہ'' ''فڈلر آن دی روف'' اور ''چٹی چٹی بینگ بینگ'' وغیرہ.. تازہ ترین کھیل جن کا دنیا بھر میں شہرہ تھا ان میں آباز میوزیکل گروپ کے گائے ہوئے گانوں پر مبنی ''مامامیا'' تھا.. میوزیکل ''شکاگو'' اگرچہ ایک عرصے سے دکھایا جا رہا تھا لیکن اب بھی اس کا سستا ترین ٹکٹ سو ڈالر سے زیادہ مالیت کا ملتا تھا.. اگر مل جائے تو.. اور اگر آپ ''لائن کنگ''

میں دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ کو کم از کم دو ماہ انتظار کرنا ہوگا..

فنون لطیفہ کے ساتھ وابستگی کسی بھی قوم کی حسِ جمال کا پیمانہ ہوتی ہے..

میں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ براڈوے پر کوئی نہ کوئی کھیل ہر صورت دیکھنا ہے چاہے اس کے لیے مجھے اپنے ڈالروں کو فن کی اس چتا میں جلانا ہی کیوں نہ پڑے..

باہر کے کسی شہر یا ملک سے اگر کوئی مہمان آ جائے تو آپ بہر طور اُسے اپنا شہر دکھاتے ہیں..شاہی قلعہ، شالیمار، مقبرہ جہانگیر لے جاتے ہیں..اور وہاں ہر محراب، ہر سرو اور ہر فوارے کو درجنوں بار دیکھ چکے ہیں چنانچہ ایسے موقعوں پر آپ ان محرابوں، سرو کے درختوں یا فواروں کو نہیں دیکھتے بلکہ اپنے مہمان کے چہرے کو دیکھتے ہیں کہ اس پر حیرت اور خوشی کے کیسے تاثرات ہیں..اور اگر وہ یعنی مہمان آپ کے چہرے کو دیکھے تو اس پر بوریت اور اکتاہٹ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے گا..سلجوق اور رابعہ عارضی طور پر نیویارکر تھے اور علی تو تھا ہی یہاں کا باسی..تو میں وہ مہمان تھا جسے وہ اپنا شہر دکھانے کے لیے لائے تھے..ان کے لیے ٹائمز سکوئر روٹین تھا اور میرے لیے پہلی ملاقات..تو وہ ٹائمز سکوئر کی بجائے مجھے دیکھتے تھے اور میں انہیں دیکھتا تھا تو ان کے چہروں پر بوریت اور اکتاہٹ دیکھتا تھا۔

میمونہ کہا کرتی ہے کہ آپ جھوٹ نہیں بول سکتے تو نہ بولا کریں آپ کا چہرہ ساتھ نہیں دیتا۔ تقریباً چار سو ٹیلی ویژن ڈراموں میں مرکزی کردار ادا کرنے کے بعد بھی کہ اداکاری جھوٹ کا بیوپار ہی تو ہوتی ہے اصل زندگی میں کبھی کبھار کچھ پوشیدہ رکھنے کے لیے کوئی جھوٹ بولتا ہوں تو چہرہ کبھی ساتھ نہیں دیتا۔ پکڑا جاتا ہوں۔ تو وہ تینوں بھی میرے اس چہرے کو دیکھ رہے تھے جو میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا.. میں اپنے تئیں ایک بزرگ اور متین شخص کی اداکاری کر رہا تھا جسے اس لہو ولعب سے چنداں دلچسپی نہیں ہے لیکن میں اپنے چہرے کا کیا کرتا جس پر نیویارک میں میری پہلی شام کی رنگین کتھا نیون سائن کی مانند روشن ہو رہی تھی۔ میرے راز افشا کر رہی تھی کہ یہ بابا جی اندر سے کچھ اور ہیں اور باہر سے کچھ اور.. وہ دیکھتے تھے کہ یہ ابا جی یا انکل کیسے ہیں کہ اس عمر میں بھی پہلی بار میلہ دیکھنے والے بچے کی مانند ہیجان آمیز مسرت میں مبتلا ہیں اور ہم بچوں کی موجودگی کا کچھ خیال نہیں کرتے۔ وہ کیسے جان سکتے تھے کہ یہ سب آوازیں، موسیقی، متناسب بدن، زندگی کی گلابی شیمپیئن میں سے پھوٹتے بلبلے جو ایک عرصے سے مر چکے تھے۔ وہ سب زندہ ہو رہے ہیں

اور ان کے ساتھ میں زندہ ہو رہا ہوں۔

ٹائمز سکوئر صرف سرمایہ داری نظام اور دولت کی مصنوعی چمک دمک کا ایک کھوکھلا سا منظر ہے.. یہاں نیون سائنوں کی رنگیلی بھڑک کے سوا اور کیا رکھا ہے..ان رنگین اور پوری عمارتوں کو ڈھکتے روشن اشتہاروں میں اُن ماڈلوں، کھلاڑیوں اور موسیقاروں کے چہرے نمودار ہوتے ہیں جو امریکہ کے خدا ہیں..دیوتا ہیں..دنیا بھر کی قدیم تہذیبوں کے اپنے اپنے دیوتا تھے اور ان کے پاس سوائے کاؤ بوائز اور گینگسٹرز کے اور کچھ نہ تھا چنانچہ انہوں نے اپنے دیوتا اپنی مرضی سے تراش لیے....ایک لحاظ سے یہ رویہ بہت منفرد اور قابل ستائش بھی ہے کہ پتھروں کو پوجنے اور ان دیکھے خداؤں کے آگے جھکنے کی بجائے انہوں نے اپنے جیسے انسانوں کو دیوتا بنا لیا..

ٹائمز سکوئر ایسے ہی انسانی دیوتاؤں کا ایک بھڑکتا ہوا معبد ہے..

بے شک یہ سکوئر روشنیوں رنگوں اور دولت کے انباروں کا ایک سرکس تھا..ایک دھوکا تھا..اور پھر بھی آپ کو اپنی بھڑکیلی گرفت میں لے لیتا تھا کہ یہ دنیا بھی تو ایک سرکس کے سوا اور کیا ہے..جہاں ہم سب کرتب دکھاتے ہیں۔ شب و روز کے تنے ہوئے رسّے پر لڑکھڑاتے سنبھلتے چلتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اسے پار کر جائیں۔ ہم میں سے اکثر کا بدن قابو میں نہیں رہتا۔ پاؤں رسّے کے تناؤ کو سہار نہیں سکتے اور گر جاتے ہیں۔ فنا کے اندھے کنوئیں میں گر جاتے ہیں..چند ایک جو اس تنے ہوئے شب و روز کے رسّے پر اپنے آپ کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اُن گر جانے والوں کے لیے رکتے نہیں اپنی بقاء کو عزیز رکھتے ہیں اور چلتے جاتے ہیں۔ رسّے کے اختتام پر سرکس کے تماشائی تالیاں بجاتے ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے اور نہیں جانتے کہ لامحالہ اگلا قدم ہمیں بھی فنا کے اسی کنوئیں میں گرا دے گا۔

ہم میں سے کچھ جھولے جھولتے..دنیاوی کامیابی، علم اور عبادت کے پُرتکبر جھولے جھولتے قلابازیاں لگاتے ہیں۔ اپنے جھولے کے رسّے پر بھینچی مٹھیاں کھول کر سامنے سے آتے دوسرے جھولے کی جانب ہوا میں لپکتے ہیں یہاں بھی کچھ گر جاتے ہیں اور کچھ اُس جھولے کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اس سرکس میں جوکر بھی بہت ہیں جنہوں نے شہرت ناموری اور زُہد کے مضحکہ خیز لبادے اوڑھ رکھے ہیں..خودستائی کی پُھندنوں والی لمبی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں اور لوگ انہیں دیکھ کر

ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ان کے فن اور لیاقت کی داد مل رہی ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ وہ محض مسخرے ہیں..

یقیناً میں بھی انہیں میں سے ایک ہوں..

یہ دنیا ایک سرکس ہے..قرآن پاک بھی تو یہی کہتا ہے کہ یہ ایک کھیل تماشا ہے..تو اگر ٹائمز سکوئر بھی اس دنیا کی مانند ایک سرکس ہے ایک کھیل تماشا ہے..ایک دھوکا ہے تو اس سرکس اور کھیل تماشے سے لطف اندوز ہونا جائز ٹھہرتا ہے۔

اس شور شرابے زندگی کے خرابے میں سے کبھی ڈوبتی کبھی اس شور میں سے ابھرتی ایک ٹرمپٹ کی آواز ہے..دکھ بھری اور درد سے شرابور..

ٹائمز سکوئر میں مجھے لوئی آمسٹرانگ کی ٹرمپٹ کی دُکھ اور درد کی لہروں پر ہچکولے لیتی کبھی ڈوبتی کبھی ابھرتی آواز سنائی دے رہی تھی..اگرچہ اس ٹرمپٹ میں سانس پھونکنے والا آمسٹرانگ نہ تھا ایک مفلوک الحال سیاہ فام بوڑھا تھا جو اپنا ہیٹ فٹ پاتھ پر رکھے اپنے فن کی داد چند سکوں کی صورت میں چاہتا تھا..مجھ میں سُر کو سمجھنے کی اہلیت نہیں ہے لیکن اگر ایک گلوکار یا ایک ساز سُر میں ہو تو کہیں نہ کہیں میرے بدن کے ساتھ وہ ہم سُر ہو جاتا ہے..یہ بے نشان بوڑھا موسیقار جو ٹائمز سکوئر میں اپنے فن کی بھیک مانگ رہا تھا آمسٹرانگ کے معیار سے ہرگز کم نہ تھا لیکن اسے زندگی میں وہ مواقع نہ ملے یا وہ ان کی پہچان نہ کر سکا..یا اس میں جھجک تھی آگے بڑھ کر ایسے کسی موقع کو گرفت میں لے لینے کی چنانچہ وہ آمسٹرانگ نہ بن سکا اور آج ٹائمز سکوئر میں کھڑا چند سکّوں کی خواہش میں ٹرمپٹ بجا رہا تھا..اس کے قریب ایک درمیانی عمر کا شائستہ لباس میں ملبوس خوش شکل امریکی کسی حد تک خمار میں سیل فون اپنے کان پر چپکائے بہت دیر سے باتیں کر رہا تھا اور اس کے بدن کی زبان اور چہرے کی خوشی سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ ایک بزنس کال نہیں ہے اور نہ ہی وہ اپنی بیوی سے بات کر رہا ہے..بلکہ اس سے بات کر رہا ہے جس کی آواز سن کر اس کا چہرہ عشق آتش سے دمکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے عشق نے ٹائمز سکوئر کے پس منظر میں سنائی دیتی اس ٹرمپٹ کی آواز سن کر اس کی توصیف کی تو وہ شائستہ لباس امریکی مسکراتا باتیں کرتا اس سیاہ فام بوڑھے موسیقار کے قریب آ گیا اور اپنا سیل فون کان سے ہٹا کر ٹرمپٹ کے دہانے کے قریب لے جا کر معلق کر دیا۔ موسیقار ان معاملات کو خوب جانتا تھا اور اس نے اپنے نا تواں پھیپھڑوں کا

کچھ لحاظ نہ کیا اور اپنے سارے دکھ اور درد کے سانس ٹرمپٹ میں بھر دیئے۔ وہ امریکی کبھی کبھار سیل فون اپنے کان تک لے جا کر اس خاتون کو شاید یہ کہتا کہ سن رہی ہو اور اسے پھر ٹرمپٹ کے قریب کر دیتا۔ آخر کار اس نے باقاعدہ جھک کر بوڑھے موسیقار کا شکریہ ادا کیا اور اس کے فٹ پاتھ پر پڑے ہیٹ میں کچھ ڈالر ڈال دیئے۔ یہ محبت کی سمفنی بجانے کا معاوضہ تھا۔ بدن کے تنے سے لپٹی ہوئی محبت کی بیل میں سے کونپلیں جبھی پھوٹتی ہیں جب ان تک سُروں کی حدّت پہنچے۔

ٹائمز سکوئر میں اتنے بے شمار جاپانی سیاح تھے کہ یہ ٹوکیو کی گنزا سٹریٹ بھی ہو سکتی تھی۔

ہر جانب جاپانی تھے..

جیسے ایک زمانے میں ہر جانب امریکی سیاح ہوا کرتے تھے..

اپنے مختصر ملک کی مانند قد بُت میں بھی مختصر لیکن ایسے خوش لباس اور خوش رنگ کہ دل میں اترتے تھے..

میں نے جاپانیوں کو جہاں کہیں بھی دیکھا..ہیروشیما اور ناگاساکی کے باوجود وہاں خوش، چہچہاتے زندگی کے پانیوں پر ہچکولے لیتے پرندوں کی مانند دیکھا..

جو لوگ ازل سے خوش چلے آتے ہوں تو وہ ٹائمز سکوئر میں پہنچ کر کیسے مزید خوش ہو جاتے ہوں گے۔ اُن دنوں امریکہ اور کینیڈا میں جب موسم گرما کے آخر میں سیاحتی موسموں کا اختتام ہو رہا ہوتا ہے اور بیشتر موٹل، ہوٹل، ریستوران وغیرہ موسم سرما کے لیے بند ہونے لگتے ہیں تو ان جاپانیوں کو باقاعدہ دھکے دے کر یہاں سے رخصت کیا جاتا ہے کہ پلیز اب تو چلے جاؤ..

نہایت فضول خرچ..بے پروا..یہ جاپانی سیاح، ٹائمز سکوئر کے سب سے پُرمسرت تماشائی تھے..

ٹرمپٹ سے زیادہ پیچیدہ اور بجانے میں زیادہ دشوار مغربی ساز سیکسافون ہے جس میں موسیقار پھونک بھرے تو اس کے پھیپھڑے اور چہرے پر ابھرنے والی رگیں پھٹنے کو آتی ہیں..اس ساز کی لے میں جدائی، سوگواری اور بے چارگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں..وچھوڑے کے درد کے سوا کوئی پکار نہیں..ایک اور سیاہ فام فٹ پاتھ پر کھڑا سیکسافون بجا رہا تھا اگر میں بھی اس لمحے اس امریکی کی مانند اپنے سیل فون پر کسی عشق خاص سے بات کر رہا ہوتا..کسی ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی کرلاہٹ سن رہا ہوتا تو میں بھی اپنا سیل فون اس سیکسافون کے منہ کے آگے معلق کر کے کہتا..

سنو.. جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ میں نہیں صرف اس کی اداس لے بیان کر سکتی ہے..

ہم اس سرکس میں.. ٹائمز سکوئر کے کھیل تماشے میں کہاں تک ٹھہرتے کہ میرے میزبانوں کے چہروں پر اکتاہٹ تھی اور میرے تن بدن میں لاہور سے نیویارک تک کے ہوائی سفر کی تھکاوٹ تھی جو بدن سے اتر کر میرے پاؤں کے تلوؤں میں سے ہوتی ہوئی اس فٹ پاتھ کو بھی تھکاتی تھی جو میرے قدموں تلے آ رہا تھا۔



''جوگنگ کرتی... پونی ٹیل ہلاتی... وہ ایک لڑکی''

نیویارک کی گلیوں اور بازاروں میں.. فٹ پاتھوں پر.. ایونیوز پر.. صبح بھی.. دوپہر' شام.. کبھی رات گئے بھی آپ کو اکثر ایک لڑکی نظر آتی ہے.. ہجوم میں سے راستہ بناتی.. کبھی سڑک پار کرتی ایک لڑکی جو کسے ہوئے متناسب بدن کی ہے.. عام طور پر نیکر اور ٹی شرٹ میں.. کانوں میں ایئر پلگ لگائے.. باہر کی دنیا کی آوازیں منقطع کر کے صرف اپنی من پسند موسیقی سنتی وہ ایک لڑکی نپے تلے قدم اٹھاتی بھاگ رہی ہے.. جوگنگ کر رہی ہے.. ایک کمپیوٹر کی مانند میکانکی انداز میں ایک ہی رفتار سے آہستہ آہستہ دوڑتی ہوئی.. اس کے بال ہمیشہ بندھے ہوتے ہیں ایک پونی ٹیل کی صورت میں اور اس کی یہ پونی ٹیل بھی اسی رفتار سے ہم آہنگ دائیں بائیں اچھلتی جاتی ہے..

اس لڑکی کو کچھ پروا نہیں کہ لوگ اُسے دیکھتے ہیں یا نہیں وہ اپنے آپ میں مگن ہے اور لوگ اسے دیکھیں بھی کیوں کہ وہ ہمیشہ وہاں ہوتی ہے.. ایک ہی رفتار سے جوگنگ کرتی بھاگتی پونی ٹیل ہلاتی.. وہ ایک لڑکی۔

یہ لڑکی اگرچہ ایک ہی لگتی ہے ایک ہوتی نہیں.. ایک ہی اس لیے لگتی ہے کہ اس کا بدن' لباس اور چال ایک جیسے ہوتے ہیں..

یہ لڑکی ایک طالب علم' ایک آفس ورکر' ایک کاروباری عورت' ایک گھریلو خاتون یا ایک طوائف بھی ہو سکتی ہے۔ نیویارک کی شدید گرمی' منجمد سردی یا خزاں کے موسموں میں ایک ہی رفتار سے بھاگتی ہوئی.. نپے تلے قدموں سے دوڑتی' پونی ٹیل لہراتی..

نیویارک میں جوگنگ کرنے کا..ورزش کے لیے دوڑنے کا کوئی وقت نہیں.. چنانچہ اس لڑکی کو جب وقت ملتا ہے وہ اپنا گھریلو یا کاروباری لباس تبدیل کرکے نیکر اور ٹی شرٹ کے ساتھ جوگر پہن کر.. کانوں میں پلگ ٹھونس کر اپنی پسندیدہ موسیقی پر وجد میں آتی.. بالوں کو باندھ کر پونی ٹیل بناتی' اپنے مخصوص ماحول سے نکل کر فٹ پاتھوں' روشوں اور ایونیوز میں بھاگنے لگتی ہے۔اس کی پونی ٹیل ایک مخصوص ردھم کے ساتھ لہراتی جاتی ہے۔

نیویارک کی گہما گہمی میں..اس کے پُرہجوم مناظر میں سب سے پہلے جو شے نمایاں ہو کر سامنے آئی وہ یہی لڑکی تھی..

وہی لڑکی بار بار میرے پاس سے گزر کر آگے چلی جاتی تھی..اور میں اس کے بدن کو بھول کر اس کی پونی ٹیل کی ردھم کو مسکراتے ہوئے دیکھتا جاتا تھا..

لیکن میں نیویارک کی گہما گہمی اور ہجوم میں نہ تھا بلکہ اس افراتفری کے عین درمیان میں سکون کے اس ہرے جزیرے میں تھا جسے سنٹرل پارک کہتے ہیں..

نیویارک میں یہ میری پہلی سویر تھی..

112' براڈوے سٹریٹ سے نکل کر میں ایمسٹرڈیم ایونیو اور کولمبس ایونیو سے ہوتا ہوا سنٹرل پارک میں داخل ہو چکا تھا..

مجھے صبح کی سیر کی عادت نہیں علت ہے.. بیماری ہے۔ میں بنیادی طور پر نہایت کاہل شخص ہوں بلکہ بحرالکاہل ہوں لیکن صبح کی سیر وہ طوطا ہے جس میں میری جان ہے..اور یہ طوطا چاہے میں صبح تین بجے بستر پر لیٹوں دو گھنٹے کے بعد ٹیں ٹیں کرنے لگتا ہے.. یہ میری مجبوری بھی ہے' جو شخص سارا دن گھر میں پڑا اینٹھتا رہے.. نہ اسے کسی ملازمت پر جانا ہو اور نہ ہی وہ کسی سے ملاقات کا متمنی ہو..بقول میری چھوٹی سالی جمیلہ کے بھائی جان کے بارے میں یہ کبھی نہیں پوچھنا پڑتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں.. یا تو وہ اپنے مخصوص صوفے پر بائیں جانب بیٹھے ٹیلیویژن دیکھ رہے ہوں گے یا کوئی کتاب پڑھ رہے ہوں گے یا پھر اپنی سٹڈی ٹیبل کے سامنے گھومنے والی کرسی پر براجمان کچھ لکھ رہے ہوں گے.. تو ایک ایسا بندہ اگر صبح کے وقت سیر کے لیے بھی نہ نکلے تو اس کی ٹانگیں..ایک صوفے پر اور ایک کرسی پر مسلسل بیٹھ بیٹھ کر.. پڑھتے پڑھتے' قلم گھساتے گھساتے جُڑ

جائیں..وہ اپاہج ہو جائے..میں کسی بھی دیار میں چلا جاؤں..صبح کی سیر کا یہ طوطا مجھے جگا کر کہتا ہے کہ اٹھئے اب خواب لذت سحر گئی..شی آن ہو یا دمشق..بے شک کھٹمنڈو ہو یہ طوطا مجھے سونے نہیں دیتا..اس نے نیویارک میں بھی مجھے سونے نہیں دیا..

میں جب سانس روکے جوگر پہنے سلجوق کے فلیٹ کے چوبی فرش پر دھیرے دھیرے قدم رکھتا باہر جانے کو تھا تو اُس کو خبر اس لیے ہو گئی کہ مختصر فلیٹ کا واحد بستر مجھے زبردستی الاٹ کر دیا گیا تھا اور دونوں میاں بیوی فرش پر گدّے ڈال کر سو رہے تھے۔

''ابو کیا ہے؟''

''کچھ نہیں..''

''کہاں جا رہے ہیں؟''

''وہ..میں ذرا ہوا خوری کر آؤں..''

''ابو سو جائیں..آپ تھکے ہوئے ہیں..جیٹ لیگ بھی ہو گا..کل صبح چلے جائیے گا..''

اُس کے نیند سے مخمور لہجے میں کچھ بیزاری تھی..

''یار میں صرف ایک چکر لگا آؤں براڈوے سٹریٹ کا..ابھی آ جاؤں گا..تم سو جاؤ۔''

وہ نیند سے جھولتا اٹھ کر بیٹھ گیا ''اگر آپ نے ضرور جانا ہے تو فلیٹ سے اتر کر دائیں جانب اتریں گے تو دو بلاک کے بعد دریائے ہڈسن کے کناروں پر جو پارک ہے وہاں پہنچ جائیں گے اور اگر بائیں ہاتھ پر ہو جائیں گے ایمسٹرڈیم ایونیو کی جانب تو کولمبس ایونیو سے ذرا آگے سنٹرل پارک آ جائے گا..جدھر جی چاہے چلے جائیں لیکن میرا موبائل جیب میں رکھ لیں..''

نئی نسل یہ موبائل اپنے بزرگوں کی جیبوں میں ایک محافظ کے طور پر رکھ دیتی ہے تاکہ چلتے چلتے اگر باباجی کا دیہانت ہو جائے تو ان کی شناخت میں آسانی ہو..میرے ایک بہت پیارے اور قریبی دوست صابر قاضی وزیرآباد سے واپس لاہور آ رہے تھے..ان کی آمد میں تاخیر ہو گئی تو ان کی بیٹی عنبرا نے فون کیا تو دوسری جانب سے کسی اجنبی کی آواز آئی کہ یہاں گوجرانوالہ میں ایک شخص چارپائی پر مرا پڑا ہے..یہ سیل فون اس کی جیب میں بج رہا تھا..آپ کون ہیں..عنبرا کا کہنا تھا کہ انکل جونہی مجھے ابو کے سیل فون پر کسی اور کی آواز سنائی دی مجھے معلوم ہو گیا کہ ابو نہیں ہیں! چنانچہ میں نے بھی چپکے سے سلجوق کا موبائل اپنی جیب میں رکھ لیا..

میں نے دریائے ہڈسن کے بجائے سنٹرل پارک کا رُخ کر لیا کہ میں نے مین ہاٹن کے جزیرے میں دنیا کی بلند ترین عمارتوں میں گھرے گھنے جنگلوں' جھیلوں' چٹانوں' سیر گاہوں اور پُلوں کے ایک اور جزیرے کے بارے میں بہت کچھ نہ صرف سن رکھا تھا بلکہ ہالی ووڈ کی ہر دوسری فلم میں دیکھ رکھا تھا.. یہ جزیرہ موسم گرما میں سرسبز اور بہار کے خمار میں ہوتا ہے' خزاں اترتی ہے تو اس کے درختوں کی زردی حسن بیمار کے رخساروں کی زردی سے بڑھ کر خوش نظر ہو جاتی ہے..اور جب برف گرتی ہے تو اس کی جھیلیں منجمد ہو جاتی ہیں اور نیویارکران پر سکیٹنگ کرتے ہیں۔

چنانچہ میں نے سنٹرل پارک کا رُخ کیا جہاں وہی ایک لڑکی بار بار میرے پاس سے گذرتی پونی ٹیل لہراتی چلی جاتی تھی..

یقیناً اُن درجنوں پاس سے گزرتی لڑکیوں نے مجھ بے ڈھب کو بھی دیکھا ہوگا..لیکن امریکہ میں کوئی شخص بھی چاہے وہ نوّے برس کو عبور کر رہا ہو بے ڈھب اور بوڑھا نہیں ہوتا..وہ محض ایک مرد ہوتا ہے..اور ایک نوخیز لڑکی بھی اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو ہلکان کر سکتی ہے کیونکہ وہ محض ایک مرد ہے.. پاکستان میں جونہی آپ ساٹھ برس کی دہلیز پار کرتے ہیں تو آپ کے لیے سفید لٹھے' مشک کافور اور عرق گلاب کا بندوست شروع کر دیا جاتا ہے..ایک بزرگ کے طور پر آپ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں یہ لڑھک ہی نہ جائیں..امریکہ میں بزرگی اور بڑھاپے نام کی کوئی شے نہیں..ان کا احترام نہیں کیا جاتا بلکہ آپ اپنے آپ کو بزرگ ثابت کرنے کی کوشش کریں تو آپ کو منافق سمجھا جاتا ہے۔امریکہ کے قیام کے دوران حرام ہے اگر کسی نے مجھ سے پوچھا ہو کہ آپ کی صحت کیسی ہے..جب کہ پاکستان میں ہر شخص کا پہلا سوال ہی یہی ہوگا جی تارڑ صاحب آپ کی صحت تو ٹھیک ہے ناں..کوئی مسئلہ تو نہیں ہے..اور جب آپ کہتے ہیں کہ جی نہیں کوئی مسئلہ نہیں صحت آپ دیکھ رہے ہیں ٹھیک ہے تو اکثر لوگ ذرا خفا ہو جاتے ہیں۔ مایوس ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں آپ سے کچھ بیماریوں کے تذکرے سنیں اور پھر آپ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کچھ دواؤں اور ڈاکٹروں کے نام گنوائیں..آپ بے شک حلفیہ بیان دے دیں کہ جی فی الحال اللہ کے فضل سے کوئی بیماری نہیں تو بھی وہ رخصت ہوتے ہوئے کہیں گے ''ویسے اس عمر میں کچھ پتا نہیں ہوتا..اپنا خیال رکھا کیجیے۔''

امریکہ کی بیشتر یادگار عمارتیں' پارک' رفاہی اور تعلیمی ادارے' میوزیم وغیرہ کسی حکومت

کے کارنامے نہیں ہوتے بلکہ صاحب ثروت اور صاحب ہمت لوگوں کی اپنے وطن اور معاشرے کی بہبود کی کاوش کے زمرے میں آتے ہیں۔ سنٹرل پارک بھی ایک ایسا ہی ذاتی نوعیت کا تحفہ ہے جو فریڈرک اور کیلورٹ نامی حضرات کا پیش کردہ ہے..انہوں نے ایک ایسے علاقے کو جہاں اینٹوں کے بھٹے..سؤروں کے فارم' جھونپڑے اور دلدلیں تھیں لاکھوں ٹن مٹی اور پتھر ڈال کر اسے دنیا کی ایک عظیم ترین سیر گاہ میں تبدیل کر دیا جس کا رقبہ تقریباً ساڑھے آٹھ سو ایکڑ کے قریب ہے۔اس میں وہ سب کچھ ہے جو قدرت تخلیق کرتی ہے.. پہاڑیاں' جھیلیں' جنگل' ندیاں اور گھنے جھنڈ' ان کے سوا اوپن ایئر سٹیڈیم' چڑیا گھر' مصنوعی قلعے اور خوبصورت پل.. دنیا کے بہترین میوزیکل کانسرٹ یہاں ہوتے ہیں۔ نیویارک کے دل میں واقع اس پارک کی زمین بھی اتنی ہی مہنگی ہے جتنا ایک دل مہنگا ہوتا ہے..اور اس کے باوجود اگر امریکی صدر بھی چاہے کہ اس کی دو گز زمین دفن ہونے کے لیے مجھے نصیب ہو جائے تو ایسا ہونا بھی ناممکن ہے.. پارک کی خصوصی گھڑ سوار پولیس بھی اس کی زیبائش میں اضافہ کرتی ہے..ویسے یہ اتنا وسیع اور ویران ہے کہ یہاں پر تنہا شخص کا لُٹ جانا بھی ممکن ہے..

سنٹرل پارک میں سیر کرنے والوں میں صرف پونی ٹیل والی بھاگتی ہوئی لڑکیاں ہی نہیں تھیں بلکہ ہر نوعیت اور ہر عمر کے لوگ تھے۔اپنے بچّے کی پریم دھکیلتے اور ساتھ ساتھ جوگنگ کرتے جوڑے..مجھ سے بھی کہیں عمر رسیدہ خواتین و حضرات اور مجھ سے کہیں زیادہ چاق و چوبند.. اور ان میں خدا جھوٹ نہ بلوائے اسّی کے پیٹے میں آئی ہوئی خواتین بھی تھیں جو مجھ سے آگے نکلی جاتی تھیں..جب آگے نکل جاتی تھیں پیچھے سے ان کے بدن کی درستگی آپ کو شک میں مبتلا کر دیتی تھی کہ یہ تو کوئی متناسب کرتوتوں کی دوشیزہ ہے۔

خاموشی بہت تھی.. پارک کی خصوصی گھڑ سوار پولیس کے گھوڑوں کی ٹاپیں ہی تھیں جو خاموشی کے اس جزیرے میں ارتعاش پیدا کرتی تھیں..

میں ابھی کل ہی تو پاکستان سے آیا تھا اور آج صبح نیویارک کے سنٹرل پارک میں سیر کر رہا تھا تو کیسے اجنبی محسوس نہ کرتا..ادھر ماڈل ٹاؤن پارک میں سیر کرنے والا ہر دوسرا شخص میرا شناسا تھا اور قریب سے گزرتے مجھ سے ہم کلام ہوتا تھا..سلام کرتا تھا کوئی فقرہ کستا تھا اور کوئی میری نیکر یا ٹی شرٹ کے رنگ کو موضوع بناتا تھا..

اور یہاں کوئی بھی کلام نہ کرتا تھا..

میں یہاں اجنبی اور بے نشان تھا.

میں تو خیر اجنبی تھا. مختلف رنگ کا تھا لیکن جو ہم رنگ تھے اسی شہر کے تھے وہ بھی سب کے سب سنت سادھو تھے اپنی سیر اور ورزش کے دھیان گیان میں گم تھے.. یوں بھی نیویارکر ذرا لیے دیئے رہتے ہیں۔ ان کی بھنویں ذرا تنی رہتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو دیگر امریکیوں سے قدرے سپیریئر سمجھتے ہیں.. ویسے اگر سمجھتے ہیں تو بھی کیا برا کرتے ہیں..

نہ صرف یہ کہ میں اجنبی تھا بلکہ آس پاس جو شجر اور بوٹے تھے وہ بھی میرے لیے اجنبی تھے.. ان کے پتے اور بناوٹ وہ ہرگز نہ تھی جو جناح باغ یا ماڈل ٹاؤن پارک کے گل بوٹوں کی تھی.. ان کی تو کیسی کیسی مہک تھی کہ میں آنکھیں بند کر کے بھی چلتا تو جان سکتا تھا کہ اب کس شجر کے قریب سے گزرتا ہوں اور کون سی جھاڑی کی مُشک دھوم مچاتی ہیں۔ جب کہ سنٹرل پارک کا پتہ پتہ بوٹا بوٹا میرے لیے بے روح اور خالی تھا.. اس اجنبیت اور بیگانگی کے باوجود میرے وجود میں ایک بے چین سنسنی تھی جو ایک نامعلوم جنگل میں داخل ہوتے ہوئے جنم لیتی ہے۔ میں کسی اور جہان میں ہوں.. ایک ایسا جہان جس کے خواب تیسری دنیا کا ہر باسی دیکھتا ہے.. وہ اس خواب میں جانا چاہتا ہے وہاں آباد ہونا چاہتا ہے.. وہ اس ملک کے پرچم نذر آتش کرتا ہے اور پھر اسی پرچم کو سلام کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا کر اکثر غیر قانونی طریقوں سے وہاں پہنچنا بھی چاہتا ہے..

یہ جہان، ہم جیسے لوگوں پر مختلف شکلوں اور صورتوں میں وارد ہوتا ہے..

ایک شکل ہالی ووڈ کی فلموں، ٹیلی ویژن سیریلز اور والٹ ڈزنی سے وجود میں آتی ہے..

ایک وہ صورت ہے جس نے کل دنیا کو برگر اور کوکا کولا سے تسخیر کر لیا ہے.. بیجنگ کے تھیان من چوک میں حنوط شدہ ماؤزے تنگ کے چہرے پر آج میکڈونلڈ کے نیون سائنز کی روشنیاں جلتی بجھتی ہیں.. وہ ماؤ جو امریکہ کو ''پیپر ٹائیگر'' کہتا تھا اور اس نے ثابت بھی کر دیا تھا وہی ماؤ ایک برگر اور ایک کوکا کولا سے مار کھا گیا ہے۔

ایک شکل ویت نام، عراق اور افغانستان میں سے اُبھرتی ہے جو کیسی ناپسندیدہ ہے اس میں.. بیگ ڈاڈ اِز برننگ.. وہاؤ.. فک بیگ ڈاڈ اینڈ اسامہ.. ابوغریب جیل، فلوجہ، غزہ، لبنان اور صلیبی جنگ کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ ایک اور تصویر ہیروشیما اور ناگاساکی کی ہے..

لیکن امریکہ کی وہ شکل کیوں مبہم ہو جاتی ہے جس میں وہ دوسری جنگ عظیم میں تباہ شدہ یورپ کو اپنے بے پناہ وسائل بروئے کار لا کر پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیتا ہے.. تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کو مالی امداد فراہم کرتا ہے..

میرے جیسے لوگوں کے لیے امریکہ.. ایڈگر ایلن پو، مارک ٹوین، والٹ وہٹ مین، جان سٹائن بیک، جیمز مشنر، ٹونی ماریسن اور ہیمنگوے کا ایک ایسا جہان ہے جو میرے دل میں آباد ہے.. کل جہان کو مسخر کر لینے والی جاز موسیقی ہے.. لوئی آمسٹرانگ، ڈیوک ایلنگٹن، مارتھا کٹ، ایلا فزجیرلڈ، رے چارلز، ڈیو بروبک ایسے گلوکار اور موسیقار ہیں.. کسی حد تک ایلوس پریسلے اور لٹل رچرڈز ہے..

گیری کوپر، جان وین اور گلین فورڈ کی وہ کاؤبوائے فلمیں تھیں جو ہمارا بچپن تھیں.. ہم اپنی نیکروں کی جیبوں میں انگوٹھے اڑس کر منہ ٹیڑھا کر کے کاؤبوائے لہجے کی نقل کرتے ہوئے ایک دوسرے کو ''ہاؤڈی'' کہتے تھے اور ملاقات پر پوچھتے تھے ''یو آر نیو آراؤنڈ ہیئر''.. اور کیسا عجیب اتفاق ہے کہ بہت بعد میں مصطفیٰ قریشی نے شاید اسی کا پنجابی ترجمہ کیا اور ''نواں آیاں ایں سوہنیا'' کو اپنے مخصوص لہجے میں ادا کر کے شہرت حاصل کی..

پھر وہ اداکار تھے جو ہمارے بچپن میں ہمارے حواس پر سوار تھے.. اور ان کے انداز ہمیں جینے نہ دیتے تھے.. جواں مرگ جیمز ڈین کو ''ریبل وداؤٹ اے کاز'' میں دیکھ کر کون ہے جو نارمل زندگی کی جانب لوٹ جائے اور بغاوت نہ کر دے.. مارلن برانڈو کی ''سٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر'' ہو یا ''ڈیزری''.. ''جولیس سیزر'' ہو ''سائیونارا'' کون ایسا ہوگا جو یہ فلمیں دیکھ کر برانڈو کے انداز اختیار نہ کرے اور ناقابل فہم بڑبڑاہٹ کو نہ اپنا لے۔ ''فرام ہیئر ٹو ایٹرنٹی'' کے آخر میں جب منٹگمری کلفٹ بگل بجاتا تھا تو فلم کو ساتویں بار مسلسل دیکھتے ہوئے بھی ہماری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے.. ٹینیسی ولیمز کی ''کیٹ آن اے ہاٹ ٹن روف'' میں الزبتھ ٹیلر.. ''کم سپٹمبر'' کا راک ہڈسن، گریگوری پیک، انتھونی کوئن.. اور یہ فہرست بہت طویل ہے.. اور ان سب کے سوا مارلن منرو تھی..

جس کسی نے بھی مارلن کی فلم ''نیاگرا'' دیکھی ہے یا کم از کم وہ تصویر دیکھی ہے جس میں وہ زیر زمین گزرنے والی ٹرین میں سے برآمد ہونے والی تیز ہوا کے زور سے اپنے بے قابو ہوتے ہوئے سفید سکرٹ کو ہنستی ہوئی ذرا جھکی ہوئی.. سکرٹ کو ہاتھ سے روکتی ہوئی یوں سنبھالتی ہے کہ کہیں اس کا زیر جامہ نہ دکھائی دے جائے.. تو وہ امریکہ کے ساتوں گناہ معاف کر دے گا کہ اس

ملک میں مارلن منرو نے جنم لیا تھا.. اگر نہیں کرے گا تو خود گناہگار ہوگا.. مارلن منرو کو نیاگرا کی پھوار میں بھیگتے دیکھا تھا تو ان زمانوں میں راتوں کو ہم خود بھیگ جاتے تھے.. تین بلیک اینڈ وائٹ تصویریں بھی ایسی تھیں جو امریکہ کی کل تصویروں پر حاوی ہو جاتی تھیں.. مارٹن لوتھر کنگ' شہباز میلکم ایکس اور محمد علی..

اور پھر امریکہ کے سب سے پرمزاح اور دلچسپ کردار.. امریکی صدر.. نہ تب ہمیں سمجھ آتی تھی اور نہ اب آتی ہے کہ یہ امریکی کیسے لوگ ہیں جو بہ رضا و رغبت اپنی من مرضی سے.. ایسے لوگوں کو اپنا صدر بنا لیتے ہیں.. جانسن' کینیڈی' کارٹر ریگن اور ہر دو بش حضرات ایسے لوگوں کو... صرف رچرڈ نکسن ایک بلند پائے کا سیاسی مفکر تھا لیکن اسے واٹر گیٹ کے ذریعے فارغ کر دیا گیا کہ ایسا ذہین شخص امریکی صدارت کے لیے سخت ناموزوں تھا.. نہ تب ہمیں سمجھ آتی تھی اور اب تو بالکل نہیں آتی کہ امریکی جمہوری اور معاشی ادارے اتنی مضبوط بنیادوں پر استوار ہیں کہ انہیں محض دو ٹریڈ ٹاورز نہیں ڈھا سکتے.. ان کی ایک اینٹ بھی نہیں ہلا سکتے اس لئے صدارت کے عہدے پر کسی بھی ٹام' ڈک یا ہیری کو فائز کر دیا جائے تو اس سے امریکہ کے استحکام کو کچھ فرق نہیں پڑتا.. اگر عراق پر حملہ ایک بڑا جرم تھا تو اس جرم کی تلافی کے لیے نومبر 2006ء کے انتخابات میں امریکی عوام بش کو مسترد کر کے ڈیموکریٹس کو منتخب کر لیتے ہیں تاکہ وہ عراق سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کریں۔

تو امریکہ کی یہ کچھ شکلیں' تصویریں اور شبیہیں تھیں جنہیں میں اپنی یادداشت کے سُوٹ کیس میں پیک کر کے پاکستان سے اپنے ساتھ لایا تھا.. آئندہ چند ہفتوں میں مجھے یہ جاننے اور پہچاننے کی سعی کرنا تھی کہ یادداشت کے اس میوزیم میں جتنی بھی تصویریں آویزاں ہیں ان میں سے کون سی محض خواب و خیال تھیں اور کونسی حقیقت کی ترجمانی کرتی تھیں.. ویسے میں یہاں پرکھنے اور فیصلہ سنانے نہیں آیا تھا کہ ایک آوارہ گرد کا یہ منصب نہیں ہوتا کہ وہ حتمی فیصلہ کرتا پھرے.. نہ ہی میں تہذیب مغرب کی عریانی اور فحاشی کو بے نقاب کرنے اور اپنی تہذیب کی برتری کے گُن گانے آیا تھا.. میں صرف دیکھنے آیا تھا' فیصلے کرنا میرے منشور میں شامل نہیں..

میرا اوّلین صدمہ تو خود نیویارک تھا..

میں بے شک ایک آوارہ گرد اور خود ساختہ درویش تھا لیکن میں اس شہر کے لیے ایک

بُغض پال کر آیا تھا.. کہ یہ تو ''زرد شیطان کا شہر'' ہے.. اسے امریکی دنیا کا دل کہتے ہیں.. بھئی یہ کیسا دل ہے جس میں کنکریٹ' لوہے اور شیشے کے سوا کچھ نہیں.. پیسے کی ہوس کے سوا کچھ نہیں.. ایک مجسمۂ آزادی ہے اور وہ بھی فرانس والوں کا تحفہ ہے.. دو چار بلند ترین عمارتیں ہیں یعنی ایمپائر سٹیٹ اور کرائسلر وغیرہ.. کچھ ایونیو ہیں پارک ایونیو اور ففتھ ایونیو وغیرہ.. کچھ سٹریٹ ہیں وال سٹریٹ اور براڈوے سٹریٹ وغیرہ.. یا پھر فحش رسالے ''پلے بوائے'' کا دفتر ہے.. جی نہیں آپ مجھے اور میری قدیم روح کو جو لنڈن' پیرس' روم' ماسکو' میڈرڈ اور برلن وغیرہ کی تاریخی اور ثقافتی قدامت میں بھیگ چکی ہے آپ اسے صرف کنکریٹ' لوہے اور شیشے سے تو پگھلا نہیں سکتے نقل اگر بہ مطابق اصل ہو بھی جائے تو نقل ہی رہتی ہے..

لیکن یہ کیا کہ ابھی کل دوپہر میں ایئرپورٹ سے براڈوے تک آتے اس شہر سے سرسری گزرا تھا.. پچھلی شب ٹائمز سکوئر میں بسر کی تھی اور اس کے باوجود میری سرد مہری کی برف قدرے پگھلنے لگی تھی..

یہ شہر صرف کنکریٹ' لوہا اور شیشہ نہ تھا بلکہ اس میں لنڈن' پیرس اور روم کی روح تیرتی تھی.. اور اس کے باشندوں میں یورپی اقوام کی بے رخی اور ناک چڑھی خصلت کا کچھ شائبہ نہ تھا..

یہ قطعی طور پر ایک نہایت جدید اور صرف بلند عمارتوں اور امارت کا شہر نہ تھا..

اس کی جاذبیت تو اسیر کرتی تھی..

کوئی بھی عمارت حسن جمال سے عاری نہ تھی.. اس کی بناوٹ اور تزئین میں کوئی نہ کوئی گوشہ دل پذیر ضرور تھا.. دل پر اثر کرتا تھا.. بے شک کہیں نہ کہیں جسے ہم دولت کا چھچھورا پن کہہ کر اپنی غربت کو دلاسے دیتے ہیں آپ کے سامنے آ جاتا تھا جیسے ٹرمپ ٹاور لیکن وہاں بھی ایک دل نشین کیفیت کہیں نہ کہیں ظاہر ہو جاتی تھی.. اس کے مختصر باغ' چوک' عمارتوں میں گھرے ہریاول کے ٹکڑے.. اثر کرتے تھے.. میری بیگم اور چھوٹے بھائی کرنل مبشر کا کہنا ہے کہ میں آسانی سے متاثر ہو جانے والوں میں سے ہوں اور میرا کچھ اعتبار نہیں.. نہایت شدت سے کسی نہ کسی منظر' شہر یا چہرے کی الفت میں مبتلا ہو جاتا ہوں اور یہ شدت عارضی ہوتی ہے.. میں ان کے ساتھ بحث تو نہیں کر سکتا کہ شاید وہ مجھ سے بہتر جانتے ہیں لیکن میں بلاوجہ کسی منظر' شہر یا چہرے کا اسیر نہیں ہوتا..

وہ منظر اللہ تعالیٰ کی یکتائی کی گواہی دینے والا ہی کوئی منظر ہوتا ہے..

وہ شہر کہیں نہ کہیں ایک ابدی رُوح کا حامل ہوتا ہے..

اور وہ چہرہ اس لائق ہوتا ہے کہ اُسے بے شک عارضی طور پر ہی سہی لیکن چاہا جائے..

اگرچہ وہ نہیں جانتے کہ جب میں اسیر ہوتا ہوں تو ہمیشہ کے لیے ہو جاتا ہوں.. مبتلا ہوتا ہوں تو آخری دموں تک ہوتا ہوں.. بے شک رہین ستم ہائے روزگار ہونے کے باعث شدت میں بظاہر کمی بیشی ہوتی رہتی ہے لیکن اسیری کی پُرلطف کیفیت قائم رہتی ہے.. ویسے بھی دوام تو صرف زمانے کو ہے جس نے میری خاک سے کہیں آگے نکل جانا ہے تو میں دوام کا آرزومند کیسے ہو سکتا ہوں.. مجھ سے یہ توقع کرنا عبث ہے کہ ہر منظر، شہر اور چہرے کی اثر انگیزی ابد تک قائم رہے گی..

وہی لڑکی.. پونی ٹیل لہراتی مختصر بلاؤز اور نیکر میں پسینے سے بھیگی ہوئی ایک روبوٹ کی مانند نپے تلے قدم اٹھاتی میرے قریب سے گزر گئی..

اور میں صرف تیز تیز چلنے سے ہانپ رہا تھا..

سنٹرل پارک میں حبس بہت تھا.. اور پرندے بھی نہیں تھے..



''جو بھی نیویارک کے فقیر ہوتے ہیں''

میں نیویارک میں پہلی بار تنہا ہوا تھا.

سب وے کے گڑگڑاتے ڈبوں کی گونج میں.. نیویارک کی بسوں میں.. ایونیوز پر اور سٹریٹس کے فٹ پاتھوں پر آج میں پہلی بار اتنا اکیلا ہوا تھا.. اور ہمہ وقت اِدھر اُدھر دیکھتا ٹھٹکتا خوفزدہ آنکھیں لیے چلتا تھا جیسے ایک پالتو جانور پہلی بار گھر کی عافیت میں سے اتفاقاً باہر آ جائے تو وہ لوگوں میں اور سڑکوں پر خوفزدہ چلتا ہے.

پاکستان سے آیا تو پی آئی اے کی پرواز میں پاکستانی لدے ہوئے تھے.. نیویارک پہنچا تو سلجوق، رابعہ اور علی نے میرا پیچھا نہ چھوڑا.. ٹائمز سکوئر میں.. براڈوے پر.. کولمبس سٹریٹ کے ریستورانوں میں وہ میرے ساتھ چپکے رہے.. اور پھر جیسا کہ ہونا تھا ان کو اپنے اپنے کام یاد آ گئے.. وہ میرے راستے پر کب تک چلتے انہوں نے اپنے راستوں پر چلنا تھا..

سلجوق نے آج صبح سنٹرل پارک کی سیر سے واپسی پر مجھے سب وے اور بس سروس کے راستوں کے نقشے سرخ نشان لگا کر تھما دیئے تھے کہ ابا اب آپ آزاد ہو.. یہ رہا سب وے اور بس سروس کا ایک ہفتے کا سیزن ٹکٹ. جتنی بار مرضی ہے اتریں اور سوار ہو جائیں.. بے شک سارا دن اترتے اور سوار ہوتے رہیں بلکہ جی نہ چاہے تو بالکل نہ اتریں اور سارا دن بس میں بیٹھے نظارے کرتے رہیں.. مجھے کولمبیا میں کلاسز اٹینڈ کرنی ہیں.. رابعہ کے لیے زیادہ بھاگ دوڑ اچھی نہیں اور کیوں اچھی نہیں تو مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی ہے اور علی نے اپنے گیس سٹیشن کی دیکھ بھال کرنی ہے تو ابا جی آپ آزاد ہیں.. جو کچھ آپ ہم سے نظریں چرا چرا کر دیکھتے تھے وہ کچھ بے دھڑک دیکھیں..

میں یہ تو بخوبی سمجھتا تھا کہ سلجوق میرے قیام کے دوران دن رات میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے گود میں اٹھائے نیویارک تو گھما نہیں سکتا.. کہ ابا دیکھو دیکھو بارہ من کی دھوبن دیکھو ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ دیکھو. مجسمۂ آزادی دیکھو.. میں بخوبی سمجھ تو سکتا تھا لیکن پھر بھی نہیں سمجھ سکتا تھا.. جیسے وہ تقریباً ہر صبح دوہائی دیا کرتا تھا کہ ابّو میں نے سکول نہیں جانا.. اتنی دوہائی دیتا تھا کہ ہمسائے بھی آبدیدہ ہو جاتے تھے کہ کیسے سنگ دل ماں باپ ہیں بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے تو آج اسے نہ بھیجیں سکول. تو ایسے میں بھی آج دوہائی دینا چاہتا تھا کہ.. بیٹے میں نے نیویارک نہیں دیکھنا.. میں نے نہیں جانا.. مجھے اس زرد شیطان کے شہر میں تنہا اترنے سے ڈر لگتا ہے۔

وہ جو صدیوں پیشتر ایک آوارہ گرد ہوا کرتا تھا. ہمیشہ تنہا سفر کرتا تھا.. اپنی تنہائی کی حفاظت کرتا اسے دل و جان سے عزیز رکھتا تھا.. وہ اب تنہا نہیں ہونا چاہتا تھا.. اس پر زمانے کی دھول اثر انداز ہو چکی تھی. خزاں کی آمد نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا اور ایک ایسا بچہ بنا دیا تھا جسے تنہا ہو جانے سے ڈر آتا تھا۔

میں پہلی بار سلجوق کے دسویں منزل پر واقع فلیٹ سے نیچے آ کر براڈوے کے فٹ پاتھ پر تنہا چلا تو مجھے بلاؤں نے اور عفریتوں نے گھیر لیا.. اونچی عمارتیں جیسے مجھ پر گرنے والی تھیں. فٹ پاتھ پر چلتے لوگ مجھے روندنے والے تھے اور میں اسی پالتو جانور کی مانند دبکا ہوا چلتا تھا جو گھر کا گیٹ کھلا رہ جانے کے باعث باہر سڑک پر آ گیا تھا..

میں اُس دبکی ہوئی حالت خوف میں زیر زمین اترتی ہوئی سیڑھیوں سے اترتا سب وے سٹیشن کے پیٹ میں چلا گیا اور پھر ٹرین میں سوار ہو گیا..

ٹرین حرکت کرنے لگی.. تاریکی کی ایک گپھا میں داخل ہو کر تیز ہوتی گئی. سینکڑوں مسافر تھے.. بھانت بھانت کے چہرے اور بولیاں تھیں اور ان میں ایک میں ایسا چہرہ تھا جو سب سے الگ اور تنہا تھا اور میری بولی کوئی نہیں سمجھتا تھا.. میرے برابر میں مجھ سے لاتعلق بیٹھے مسافر.. ڈبے میں کھڑے منزل کے منتظر مسافر.. میرے وجود اور میری موجودگی سے آگاہ نہیں تھے.. کہ یہ کون ہے.. کہاں سے آیا.. کیوں آیا.. میں ان کے لیے اتنا ہی بے جان اور بے روح تھا جتنے کہ ڈبے میں آویزاں کمرشل اشتہار یا وہ آہنی ڈنڈے جنہیں وہ تھامے کھڑے تھے.. اشتہاروں اور اس آہنی ڈنڈے کی پھر بھی کچھ افادیت ہو گی، میری کچھ نہ تھی..

صرف اس لیے کہ امریکی کسی کو دیکھتے نہیں..

یعنی ان کے سامنے آپ موجود تو ہیں لیکن وہ آپ کو دیکھتے نہیں.. اور یہ رویہ یورپی اقوام کا بھی ہے کہ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذات میں آزاد اور خودمختار ہو لیکن اسے یہ حق ہرگز حاصل نہیں کہ وہ خواہ مخواہ اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھے کہ اس شخص کی بھی اپنی پرائیویسی ہے جسے مجروح نہیں کیا جا سکتا.. یوں ایک بڑی تنہائی جنم لیتی ہے جو ایک مشرقی شخص کے لیے بے حد اذیت ناک ہوتی ہے.. اسے عادت ہوتی ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو آس پاس کے لوگ ٹوہ لگاتے رہیں کہ یہ کون ہے.. یہاں کیوں آیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور اس کے ساتھ اگر ایک خاتون ہے تو معاملہ گڑبڑ ہے.. میں لاہور میں منہ اندھیرے سیر کے لیے نکلنے کی خاطر اپنا گیٹ کھولتا ہوں تو اس کے کھلنے کی آواز سے سامنے کے مختصر پارک میں یونہی ٹہلتے ایک نوجوان مولانا ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور میری حرکات کا جائزہ لینے لگتے ہیں کہ یہ صبح صبح کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے.. اور جب میں زچ ہو کر پوچھتا ہوں کہ مولوی جی آپ چہل قدمی کرو اِدھر منہ اٹھا کر کیا دیکھے چلے جا رہے ہو تو وہ مسکرا کر کہتے ہیں.. بس جی یونہی..

تو امریکہ میں.. بس جی یونہی.. کوئی نہیں دیکھتا..

پاکستان میں آپ جب تنہا ہونا چاہیں تو بھی نہیں ہو سکتے اور امریکہ میں تنہا نہ ہونا چاہیں تو بھی نہیں ہو سکتے.. میں اگر ترنگ میں آ کر وہاں اپنی نیلی جین اتار دیتا تو بھی کوئی شخص متوجہ نہ ہوتا اور اگر کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی لیتا تو شرمندہ ہو جاتا کہ یہ تو اس کا ذاتی معاملہ ہے میں نے کیوں آنکھ اٹھا کر دیکھا..

یوں ایک بڑی تنہائی جنم لیتی ہے جو آپ کو چاٹ لیتی ہے..

نیویارک ایک شہر ہے..

اور نیویارک سب وے اس شہر کی شریانوں میں حرکت کرنے والا ایک اور شہر ہے۔ زیر زمین.. آپس میں بھڑتے.. متحرک ڈبوں میں بند ایک نابینا شہر کہ اس کے باسی دیکھ نہیں سکتے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں.. اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں.. سب وے کے یہ ڈبے بھی اندھے ہیں جو نیویارک کی گہرائی میں ایک اندھیری سرنگ میں اندھا دھند لڑھکتے چلے جا رہے ہیں اور ان میں سوار لوگ اجنبیت اور مغائرت کے بُت ہیں.. سب کے سب پتھر کے ہیں.. اپنی

اپنی ذات میں تھمے ہوئے منجمد.. بے حس اور ساکت ..اور جب ٹرین آہستہ ہونے لگتی ہے' ہولے ہوتی جاتی ہے تو ان میں جان پڑنے لگتی ہے لیکن صرف ان میں جنہوں نے اگلے سٹیشن پر اترنا ہوتا ہے..

ان اجنبی پتھریلے مجسموں میں صرف آپ ہیں جو دیکھ رہے ہیں..

یورپ کے کسی بھی ملک میں قدم رکھنے کے چند روز بعد آپ اس ملک کے شناسا ہو جاتے ہیں.. وہاں کے چہروں کی ساخت، بناوٹ، وہاں کی زبان، خوراک، ثقافت، گھروں، شرابوں اور عورتوں کے شناسا ہو جاتے ہیں.. شناسا ہوتے ہیں تو ذہنی طور پر آرام دہ محسوس کرتے ہیں۔ آپ کے آس پاس جو کچھ ہے وہ ایک جرمن روایت کا تسلسل ہے.. آپ جانتے ہیں کہ یہ ہرمن ہیسے، گنتھر گراس، گوئٹے، بسمارک، ہٹلر، شدید تنظیم، میونخ بیئر، ساسجز اور بلیک فارسٹ والے لوگ ہیں..

اگر آپ اطالیہ میں ہیں تو.. ظاہر ہے وہاں اطالوی ہونگے اور فرانس میں تو فرانسیسی ہوتے ہی ہیں..

لیکن امریکہ میں امریکی نہیں ہوتے.. کم از کم نیویارک میں تو نہیں ہوتے.. اگر ہوتے تو وہ سب وے کے زیرزمین متحرک نابینا شہر میں میرے ہمسفر ہوتے.. سب وے کے ڈبوں میں پیک شدہ سب کی سب مچھلیاں مختلف نسلوں کی تھیں، جدا رنگتوں اور شکلوں کی تھیں۔ چینی، ہسپانوی، یورپی، افریقی، ایشیائی، دودھیا بدن بھی اور آبنوسی جسم بھی پستہ قد، دراز قامت، سنہری بال، سیاہ بال، گھنگھریالے گیسو.. ناکوں کی مکمل ورائٹی ہولناک شکلوں والے اور دل پذیر صورتوں والے بھی.. یہ ایک مکسڈ سلاد تھی.. دنیا بھر کی نسلوں کا ایک سپر سٹور تھا.. اگر ہر کوئی اپنی آبائی اور مادری زبان بولتا تو شاید اس ڈبے میں کوئی بھی انگریزی نہ بولتا..

لباس بھی کوئی ایک نہ تھا.. جس کے جی میں جو آیا تھا وہ اس نے پہن لیا تھا.. اگر جی میں نہیں آیا تھا تو صرف وہاں وہاں پہنا تھا جہاں جہاں مجبوری تھی.. لوگ چار گرہ میں بھی تھے اور تھری پیس سوٹوں میں بھی.. البتہ نیلی جینوں کی اکثریت تھی.. اسی طور امریکہ میں پائی جانے والی خوراک کا بھی کوئی خاص عقیدہ یا دین ایمان نہ تھا.. اگرچہ برگر اور فرنچ فرائز ہم تیسری دنیا والے امریکی

خوراک جان کر نہایت عقیدت سے کھاتے ہیں پر برگر کا تصور جرمنی کے شہر ہیمبرگ سے آیا اور ظاہر ہے فرنچ فرائز.. فرانس سے.. یہاں جتنے بھی چہرے، رنگتیں اور شباہتیں پائی جاتی تھیں اتنی ہی خوراکیں تھیں اور آپ کسی بھی خوراک پر انگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ امریکی خوراک ہے۔ وہ چینی، فرانسیسی، کوریائی، افریقی یا اطالوی بھی ہو سکتی ہے.. پیزا اور پاستا کی مثال ہی کافی ہے..

چنانچہ اس ملک میں وارد ہونے والا شخص ایک عجیب اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ آخر میں کہاں ہوں.. جرمنی یا اطالیہ یا انگلستان کا تو تعین ہو جاتا ہے پر امریکہ کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ کیا ہے.. نہ چہرے ایک جیسے ہیں نہ خوراک اور نہ ثقافت.. بس ایک ملا جلا پروگرام ہے.. البتہ ایک خصوصی رویہ ہے جو سامنے آتا ہے کہ جہاں کوئی سیاہ فام دین و دنیا سے بے پروا ٹانگیں پھیلائے کانوں میں ایئر پلگ ٹھونسے بیٹھا جھومتا ہے اس کے برابر میں بیٹھنے سے ہر کوئی اجتناب کرتا ہے.. اور اگر رش کی وجہ سے کوئی بیٹھنے کی جسارت کرنا چاہے تو وہ اپنے پھیلاؤ سے سمٹتا نہیں پھیلا رہتا ہے کسی سفید فام کے لیے جگہ نہیں بناتا کہ اس کے آباؤ اجداد نے مدتوں تک نہ صرف ان کے لیے جگہ بنائی تھی بلکہ اس جگہ کو جھاڑ پونچھ کر اپنی جبینوں سے صاف کر کے انہیں پیش کرتے رہے تھے تو اب اس کی باری تھی..

نیویارک کی سب وے میں سفر کرتے ہوئے آپ اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتے.. بے شک آپ ایک بڑی تنہائی کا شکار ہوتے ہیں لیکن وہاں کوئی نہ کوئی ایسا ہنگامہ ہوتا رہتا ہے جس پر گھر کی رونق کا انحصار ہوتا ہے۔ یہاں منگتوں کی بہتات ہوتی ہے.. گداگر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں دیہاتی راستوں پر چلنے والی بسوں میں کر بھلا ہو بھلا ایسے منگتے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ فقیر باقاعدہ فقیروں کے فینسی ڈریس میں ملبوس ہوتے ہیں تاکہ وہ دور سے پہچانے جائیں اور قریب آ کر انہیں اپنی شناخت نہ کروانی پڑے کہ جناب عالی میں فقیر ہوں.. امریکہ میں یہ سہولت میسر نہیں یہاں وہ اسی پیراہن میں ہوتے ہیں جو آپ کا ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات وہ بہتر لباس میں ہوتے ہیں..

یہ عین ممکن ہے کہ برابر میں تشریف فرما ایک صاحب جو شکل سے ہارورڈ یونیورسٹی کے فلسفے کے پروفیسر دکھائی دیتے ہیں وہ زیر مطالعہ کتاب کو بند کر کے عینک اتار کر کھڑے ہو جائیں اور کر بھلا ہو بھلا کی صدائیں دینے لگیں..

اور یہاں بھی بھیک مانگنے کے لیے دنیا بھر میں سب سے آزمودہ اور کارآمد نسخہ آزمایا جاتا ہے کہ ایک صاحب جو سفید فام ہیں کاغذوں اور رپورٹوں کا ایک پلندہ تھامے تقریر کرنے لگتے ہیں کہ صاحبان، قدردان، مہربان میں ایک ہاتھ پھیلانے والا اپنی عزت نفس کو مجروح کرنے والا شخص نہیں ہوں لیکن کیا کروں بیماری نے مجھے لاچار کر دیا ہے..اور بیماری بھی ایسی کہ جس کی دوائیاں اتنی مہنگی ہیں کہ میں انہیں خرید نہیں سکتا..میں روزانہ درجنوں کیپسول پھانکتا ہوں تو زندہ رہتا ہوں اور اگر ناغہ ہو جائے تو ایک ہفتے کے اندر اندر میری موت یقینی ہے..اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو یہ میڈیکل رپورٹس آپ خود دیکھ لیجیے یہ کہہ کر وہ اپنی رپورٹس کی کچھ فوٹوسٹیٹ کاپیاں نزدیکی مسافروں کو تھما دیتے ہیں اور پھر ایک گلوگیر آواز میں کہتے ہیں اگر اب بھی یقین نہیں آتا تو میرے چہرے کی طرف دیکھئے اور وہ اپنا چہرہ ملاحظے کے لیے ہر مسافر کے قریب لے جاتے ہیں اور پھر ایک مردہ آواز میں کہتے ہیں کیا آپ کو میرے چہرے پر موت لکھی ہوئی نظر نہیں آتی..کیا آپ مجھے مر جانے دیں گے..؟ یہ تقریر نہایت جذباتی اور ڈرامائی انداز میں تب تک جاری رہتی ہے جب تک گاڑی اگلے سٹیشن پر رکنے کے لیے رفتار مدھم نہیں کر دیتی اور تقریر کے دوران وہ ایک ڈبہ ہر مسافر کے آگے کرتے جاتے ہیں کہ آپ بے شک مجھے نوٹ عنایت نہ کریں..جو بچی کھچی ریزگاری آپ کے بٹوے میں بوجھ ہو رہی ہے اس سے نجات حاصل کریں آپ جتنے سکے مجھے دیں گے گویا اتنے ہی زندگی کے لمحے عطا کریں گے..

سب وے میں سفر کے دوران ایسا کم ہی ہوا کہ کوئی نہ کوئی اس نوعیت کا مانگنے والا دلچسپ کردار نمودار نہ ہوا ہو..

ایک حضرت..بہت ساری کتابیں اٹھائے نہایت سنجیدگی سے اور کسی حد تک آپ پر حقارت کی نگاہ ڈالتے ہوئے کھوئے کھوئے سے باتیں کرنے لگتے ہیں...آپ لوگ میرے ایک سوال کا جواب دیں..کیا یہ ضروری ہے کہ امریکہ میں سب لوگ روٹی کمانے کے لیے دن رات کام کریں..کچھ لوگ تو ایسے ہونے چاہئیں جو کام نہ کریں اور میں ان میں سے ایک ہوں..میں تنہا رہ کر بیکار رہ کر صرف سوچنا چاہتا ہوں..سوچنے والوں کو صرف سوچنا چاہیے اور اگر وہ کام کریں گے تو سوچیں گے کیسے..کیونکہ آپ لوگ بے حد مصروف ہیں اور سوچ نہیں سکتے اس لیے جو کچھ آپ کا فرض ہے وہ میں سرانجام دوں گا..میں صرف تب سوچ سکتا ہوں اگر آپ مجھے کچھ ڈالر عنایت کریں..

میں سوچنا چاہتا ہوں کہ یہ معاشرہ کیا ہے۔خدا کیا ہے اور امریکہ کیا ہے..اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ میری کفالت کریں ورنہ امریکی تاریخ آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔میں کچھ بھی قبول کر سکتا ہوں..انکی اس فلسفیانہ تقریر کے دوران میرے سامنے بیٹھی ایک فلی پینو لڑکی نہایت انہماک سے سینڈوچ کھا رہی تھی تو یہ حضرت اس کے پاس جا کر کہتے ہیں میں یہ سینڈوچ بھی قبول کر سکتا ہوں..عنایت کر دیجیے..اور وہ فلی پینو یکدم بڑبڑا کر انہیں ادھ کھایا سینڈوچ تھما دیتی ہے..اور وہ حضرت اس ادھ کھائے سینڈوچ کو نہایت رغبت سے کھانے لگتے ہیں۔

ایک اور صاحب..درخواست گزار نہیں ہوتے باقاعدہ دھونس جما کر بھیک طلب کر رہے ہیں کہ آپ کو کیا پتا زندگی نے میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھا ہے۔دوستوں اور رشتے داروں نے مجھے کیا کیا دھوکے دیئے ہیں..میری نیک خصلت سے کیا کیا فائدے اٹھائے ہیں اور پھر مجھے ترک کر دیا ہے۔میں معاشرے کے ظلم کا شکار ہوں اور ذہنی طور پر اتنا دکھی ہو چکا ہوں کہ کام کرنے کے قابل نہیں رہا..دوستوں اور رشتے داروں کے سلوک سے ایک نفسیاتی مریض بن چکا ہوں..آپ کا فرض ہے کہ آپ کم از کم آج رات کے لیے مجھے کچھ رقم عطا کریں اور جب ڈبے کے مسافر ان کی درد بھری داستان سے متاثر نہیں ہوتے..کتابوں اور رسالوں پر جھکے رہتے ہیں ان کی جانب نگاہ نہیں کرتے تو وہ طیش میں آ جاتے ہیں..باقاعدہ کوسنے دینے لگتے ہیں..آپ نے سنا نہیں..بہرے ہو گئے ہیں..ایک ستم رسیدہ انسان آپ سے مدد کی درخواست کر رہا ہے اور آپ سب چپ بیٹھے ہیں۔سر جھکائے اپنے اخبار پڑھ رہے ہیں..کیسے بے حس اور بے مروت لوگ ہیں.....یہ صاحب قدرے مختصر قدوقامت کے ہیں..گھنگھریالے بالوں والے غالباً اطالوی یا ہسپانوی ہیں اور ہر مسافر کے سامنے کھڑے ہو کر اس پر لعن طعن کرتے ہیں اور اس کے باوجود انہیں ایک ڈائم یا ایک دمڑی بھی بھیک میں نہیں ملتی..شاید وہ مسافر گھر سے یہ طے کر کے آئے تھے کہ آج اگر کوئی شخص بے شک ہمارے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے دے تو بھی جیب سے ایک ڈالر بھی نہیں نکالیں گے تو ان صاحب کو ایک سینٹ کی بھی آمدنی نہ ہوئی تب وہ چپ ہو جاتے ہیں اور پھر بلند آواز میں بڑبڑانے لگتے ہیں تاکہ سب کو سنائی دے جو وہ کہتے ہیں اور وہ سب مسافروں کو گالیاں دینے لگتے ہیں..ان کی طرف دیکھو کیسے بے شرم لوگ ہیں..باسٹرڈز..میرا وقت ضائع کیا ہے..کتیا کے بچے..حرام کی اولادیں..

ان کی گالیوں کا کچھ ردِّعمل نہیں ہوتا سب لوگ اپنے اپنے دھیان میں مگن رہتے ہیں..
گاڑی اگلے سٹیشن پر رکتی ہے تو وہ صاحب باہر نکل جاتے ہیں اور پھر پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر بڑبڑانے لگتے ہیں..کتیا کے بچّے سب کے سب..

درجنوں ایسے بے مثل کرداروں میں سے سب سے ڈرامائی اور چہرے پر ایک شرمندہ مسکراہٹ لانے والا کردار ایک سیاہ فام خاتون کا تھا جو ماشاءاللہ دکھائی پڑتا تھا کہ کچھ نہ کچھ جنم دینے کا ارادہ رکھتی ہیں، ساتویں مہینے میں لگتی ہیں اور اپنے بھرے ہوئے پیٹ کو مزید آگے کر کے یہ ظاہر کرتی ہیں کہ جو ہونا ہے عین ممکن ہے ابھی آپ کے سامنے ہو جائے اور وہ کہتی ہیں'' کوئی بھی کتیا کا بچہ دیکھ سکتا ہے کہ مجھے بچہ ہونے والا ہے..یہ کس کا بچہ ہے میں اُس حرامزادے کو نہیں جانتی ورنہ اسے تلاش کر کے اس کا گلا گھونٹ دیتی کہ وہ مجھے بے آسرا چھوڑ گیا ہے..اب آپ لوگ بتائیں کہ محبت کے نام پر مجھ پر جو ظلم ہوا ہے اس کی تلافی کون کرے گا..اور میرے پاس ہیلتھ انشورنس نہیں ہے تو میں اس بچّے کو کہاں جنم دوں گی..کسی فٹ پاتھ پر..ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی آخری منزل پر..مجسمۂ آزادی کے قدموں میں..اور پھر میں اس بچّے کا کیا کروں گی کیونکہ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں اسے ایک وقت کا دودھ پلا سکوں تو پھر کیا میں اسے ہڈسن ریور میں ڈبو دوں گی کیا کروں گی..مجھے نہیں معلوم کہ یہ کس کا بچہ ہے..یہ تمہارا بھی ہو سکتا ہے..'' وہ ایک نہایت فربہ بوڑھے کی جانب انگلی سیدھی کر کے کہتی ہے جو سر جھکائے پاپ کارن کھانے میں مصروف ہے اور وہ بڑبڑا کر اوپر دیکھتا ہے..اور پھر شرمندہ سا ہو کر سر جھکا لیتا ہے..''یا شاید تمہارا ہو''..وہ ایک نوجوان طالب علم کے قریب چلی جاتی ہے..''تم لوگ فری سیکس پر یقین رکھتے ہو یہ تمہارا ہو سکتا ہے''..نوجوان طالب علم برابر میں بیٹھی اپنی گرل فرینڈ کو خجالت سے دیکھتا ہے اور وہ مسکرانے لگتی ہے کہ اچھا تم تو بڑے چھپے رستم نکلے..پھر وہ ایک لمبے تڑنگے سیاہ فام کو مخاطب کر کے کہتی ہے'' تم تو میرے ہم نسل ہو..یہ بچہ تمہارا بھی تو ہو سکتا ہے''..اور یہ جو الزام تراشی کا سلسلہ جاری ہے اس دوران وہ خاتون از حد سنجیدہ اور رنجیدہ ہیں..کوئی بھی شخص ان کے الزام کے جواب میں مسکرا نہیں سکتا وہ اتنی سنجیدہ ہیں..پھر وہ ذرا پیچھے ہو کر ڈبے میں سوار تمام مسافروں سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں..''کیا تم سب میں سے کوئی ایک شخص ایسا ہے جو اس لمحے بے حد مجرم محسوس کر رہا ہے..یہ بچہ آپ سب لوگوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے..''

اُس ڈبے میں میں وہ واحد شخص تھا جسے اس نیک بی بی نے اپنے بچّے کا ممکنہ باپ نہ ٹھہرایا..اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے کچھ قلق سا بھی ہوا کہ کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں..

نیویارک میں جو بھی فقیر ہوتے ہیں بقول عدم..آدمی بے نظیر ہوتے ہیں..ان کے سوا ایک اور مخلوق بھی ہوتی ہے جو فقیر ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی یہ مخلوق..فٹ پاتھوں پر خوابیدہ..سب وے سٹیشنوں پر استراحت فرماتی..پلوں کے نیچے راتیں بسر کرتی..ہڈسن کے کناروں پر..سنٹرل پارک کے بنچوں پر..اور صرف نیویارک میں ہی نہیں امریکہ کے طول و عرض میں پائی جاتی ہے..یہ لوگ مکمل ہوش میں بھی ہو سکتے ہیں اور مکمل مدہوش بھی ہو سکتے ہیں..لیکن یہ لوگ سب وے کے منگتوں کی مانند دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر تقریریں نہیں کرتے..

یہ اور طرح کے فقیر ہوتے ہیں..

بلکہ میری نظر میں ایک طرح کے درویش ہوتے ہیں..

عُرف عام میں انہیں ''ہوم لیس اینڈ ہنگری'' یعنی بے گھر بھوکے کہا جاتا ہے..

رابعہ میری بڑی بہو ایک پگھل جانے والا دل رکھتی ہے..اگر کوئی بہروپیا فقیر بھی اس کے آگے ہاتھ پھیلا دے تو وہ اپنے پرس میں جو کچھ موجود ہو گا وہ اس کی ہتھیلی پر الٹ دے گی بے شک یہ اس کے خاوند کی پورے مہینے کی تنخواہ ہو..چنانچہ جب وہ نیویارک میں تازہ تازہ وارد ہوئی تو وہ ابھی کچھ ڈالر اپنے پرس میں ڈال کر ہفتے بھر کی گھریلو ضروریات کی شاپنگ کے لیے نکلی ہے اور اگلے لمحے ہاتھ لٹکاتی ہوئی واپس آ گئی ہے کہ..سلجوق میں تمہیں کیا بتاؤں کہ راستے میں مجھے ایک ''ہوم لیس اینڈ ہنگری'' مل گیا..وہ بے چارہ فٹ پاتھ پر پڑا تھا اور خراٹے لے رہا تھا..اور سلجوق اس کا سویٹر پھٹا ہوا تھا اور لگتا تھا وہ بھوک سے مرنے والا ہے تو میں نے اس کے آگے رکھے ہوئے ڈبے میں وہ تمام ڈالر ڈال دیئے جو تم نے مجھے شاپنگ کے لیے دیئے تھے..بہت ترس آیا مجھے..پتا نہیں کتنا بھوکا تھا..

ایک دو مرتبہ تو سلجوق نے اپنی موڈی بیگم کی اس خیرات کا برا نہ مانا اور پھر ایک روز اس نے کہا'' رابعہ اگر تم اسی طور گھر کے اخراجات کی رقم بے گھر اور بھوکوں کے ڈبّوں میں ڈالتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب ہم دونوں بھی بے گھر اور بھوکے ہو جائیں گے..''

یہ بھوکے تو اتنے نہیں ہوتے جتنے بے گھر ہوتے ہیں..

یہ دراصل وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں لکھنؤ کی طوائف امراؤ جان نے کہا تھا کہ آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی.. یہ اپنا گھر اپنی کمر پر بوجھ کیے یا ایک ٹرالی پر لادے زمانے کی سیر کرتے ہیں.. یہ امریکی معاشرے کی جکڑ بندیوں اور پابندیوں سے آزاد واحد آزاد لوگ ہوتے ہیں.. ان میں سے بہت سے دست سوال دراز نہیں کرتے.. جو لوگ فٹ پاتھوں پر یا ریستورانوں کے باہر پڑے ہوتے ہیں وہ بھی آپ کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ لیں گے یا کچھ بڑبڑا دیں گے کہ اگر کچھ ریزگاری ہے تو دے جاؤ تاکہ میں ایک بیئر خرید لوں..

اگر ہمت ہے اور عمر ہے تو اپنی کل کائنات اپنا مکمل گھر پُشت پر لادے پھرتے ہیں.. یا کسی ٹرالی پر اپنی حیات کا کل سامان دھکیلتے چلے جا رہے ہیں.. گھر کا یہ سامان کیا ہوتا ہے.. پرانے پھٹے ہوئے گرم کوٹ.. بوسیدہ کمبل.. جرابیں، بوٹ، کوڑے کے ڈھیروں میں سے نکالے ہوئے برتن، فرائنگ پین، سویٹر، پرانے اخبار جو بچھونے کا کام دے سکتے ہیں اور کبھی کچھ پھٹی ہوئی کتابیں اگر وہ مطالعے کے شوقین ہیں..

یہ کون لوگ ہوتے ہیں؟

ان میں سے کچھ تو پیدائشی نکمے ہوتے ہیں..

اتنے نکمے کہ وہ ایک تنکا دوہرا کرنے کے بھی روادار نہیں ہو سکتے.. ہمارے ہاں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر زمینداروں، وڈیروں اور سیاستدانوں کی اولاد ہوتے ہیں اور انہیں ایک تنکا بھی دوہرا کرنے کی حاجت نہیں ہوتی.. لیکن امریکی معاشرہ ایک گلا کاٹ کر رکھ دینے والا مقابلے کا معاشرہ ہے.. یہاں رزق کمانے کے لیے مسلسل مشقت درکار ہوتی ہے ورنہ آپ بھوکے مر جاتے ہیں.. ہر ایک کو اپنا اپنا تنکا دوہرا کرنا پڑتا ہے چنانچہ ایک پیدائشی نکمے کے لیے بس فرار کی یہی صورت ہے کہ وہ بے گھر اور بھوکوں میں شامل ہو جائے..

ان میں سے کچھ منشیات اور الکوحل کے ہاتھوں لاچار ہو چکے ہیں.. بے حس اور عزتِ نفس سے عاری ہو چکے ہوتے ہیں..

کچھ ایسے بوڑھے ہوتے ہیں جن کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا..

اور عینی نے مجھے بتایا تھا کہ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو امریکہ کے ایک

انسان کو ذبح کر دینے والے معاشی نظام کا شکار ہو جاتے ہیں.. ان کا قطعی کوئی ارادہ نہیں ہوتا دربدر ہونے کا.. بے گھر اور بھوکے ہو جانے کا پر ان کو ہو جانا پڑتا ہے اس کے سوا ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہوتا.. خودکشی کے سوا صرف یہی راستہ ہوتا ہے.. وہ ایک زمانے میں ایک معمول کی معزز اور نارمل زندگی گزارتے تھے.. ملازمت کرتے تھے یا کاروبار کرتے تھے.. آرام دہ گھروں میں رہائش کرتے تھے اور کسی بے گھر بھوکے کے آگے رکھے ڈبے میں کچھ سکّے ڈال دیتے تھے.. پھر یہ ہوا کہ ایک صبح وہ شخص اپنے آفس جاتا ہے تو اسے ملازمت سے جواب مل جاتا ہے.. کہ امریکہ میں ہائر اینڈ فائر کا اصول کارفرما ہے.. ملازمت میں برخواستگی ایک ایسی تلوار ہے جو ہر لمحے ہر ملازم پر لٹکتی رہتی ہے.. مجھے اس سے پیشتر اس نظام کا علم نہ تھا کہ اگر ایک شخص ایک عہدے پر پچھلے بیس برس سے کام کر رہا ہے.. اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے تو کسی ایک صبح وہ حسب معمول ٹائی کی گرہ درست کرتا دفتر کے ساتھیوں کو ہیلو ہائے کرتا اپنے آفس میں جاتا ہے تو اس کا دروازہ مقفل ہے.. اس کا کمپیوٹر بھی مقفل ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ باس آپ کو یاد کر رہا ہے اور باس صرف ایک فقرہ کہتا ہے ''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو جانے دیا جائے'' اور آپ یکدم بیکار ہو گئے ہیں اور سڑک پر آ گئے ہیں آپ کو فائر کرنے کا کوئی جواز نہیں دیا جاتا.. کوئی چارج شیٹ نہیں دی جاتی.. قانونی چارہ جوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور آپ اپنے دفتر کی چابیاں، اپنی کمپنی کا شناختی کارڈ وغیرہ جمع کروا کے سڑک پر آ جاتے ہیں اور پھر ایک اور ملازمت کے حصول کے لیے تگ و دو کرنے لگتے ہیں.. اکثر اوقات آپ کو ایک نئی ملازمت مل ہی جاتی ہے اور آپ کی معمول کی زندگی ایک جھٹکے کے بعد پھر سے رواں ہو جاتی ہے لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ دن رات ایک کر دیتے ہیں اپنے معیار سے کم تر ملازمت کے لیے بھی تگ و دو کرتے ہیں لیکن آپ بے مراد رہتے ہیں..

کاروبار میں بھی اسی نوعیت کے پل صراط ہوتے ہیں.. بینک کے قرضے، ادھار کے کھاتے جن کے بل بوتے پر ایک کاروبار قائم ہے.. یکدم وہ کاروبار کسی معاشی تبدیلی یا محض بدقسمتی کے باعث مسمار ہو جاتا ہے اور آپ اپنی ناک تک مقروض ہو جاتے ہیں اور یاد رہے کہ امریکہ میں کوئی بھی شے خریدی نہیں جاتی قسطوں پر حاصل کی جاتی ہے.. یہاں تک کہ آپ کا پلازما ٹیلیویژن، صوفے، بستر، کاریں اور گھاس کاٹنے والی مشین بھی.. اور جس گھر میں آپ رہائش

رکھتے ہیں تو وہ تو ہو گا ہی قسطوں پر..اور گالف کلب کی رکنیت بھی..تو آپ کی پوری حیات قسطوں میں جکڑی ہوئی مقروض ہے اور اس دوران ملازمت سے جواب مل جاتا ہے..ایک اور ملازمت حاصل نہیں ہوتی..کاروبار ڈھے جاتا ہے..تو آپ کیا کریں گے..بیشتر لوگ اس گرداب سے نکل جاتے ہیں لیکن معدودے چند ایسے بھی ہوتے ہیں جو نکل نہیں پاتے اور وہ بے گھر اور بھوکے ہو جاتے ہیں کہ ان کے پاس حیات کا کوئی اور متبادل نہیں ہوتا..

اور ان کے سوا....ان میں کچھ ایسے نفس بھی ہوتے ہیں اور وہ میرے پسندیدہ ہیں جو حقیقی معنوں میں آزادی کے متلاشی ہوتے ہیں..

اُن کی طبع کسی ایک مقام پر ٹھہرنا گوارا نہیں کرتی..وہ گھر بنا کر نہیں رہ سکتے..وہ دنیا کے ساتھ جُڑ نہیں سکتے اس لیے وہ اپنی من مرضی سے یہ بے گھر بھوکی حیات اختیار کرتے ہیں..اور یہ جون ایلیا کے اس فلسفے پر یقین رکھتے ہیں کہ.. جہاں رہیو وہاں اکثر نہ رہیو.. یہ اکثر کہیں نہیں رہتے..کسی ایک جگہ پر نہیں ٹکتے..حرکت کرتے رہتے ہیں..ان بے گھر اور بھوکوں کے لیے موسم گرما کے چند ماہ ہی فرصت کے وہ رات دن ہوتے ہیں جن میں وہ تصور جاناں کئے پڑے رہتے ہیں اور جونہی سنٹرل پارک کے کسی شجر کا پہلا پتہ زرد ہوتا ہے تو وہ آنے والے برفانی موسموں کی شدت کا پہلا پتا دیتا ہے..یہ جو برف بھرے منجمد روز و شب شہر پر اترنے والے ہیں ان میں اگر آپ کھلی فضا میں تصور جاناں کیے پڑے رہیں تو جان سے جاتے ہیں اور یہ پہلا زرد پتہ انہیں گویا ان کا وہ چہرہ دکھاتا ہے جو موت کے بعد اس کی مانند زرد ہو جائے گا..ان میں سے کچھ جو بہت بوڑھے، لاچار یا کم ہمت ہوتے ہیں وہ اپنے سامان میں سٹور شدہ پرانے کمبل اور سویٹر اوڑھ کر کسی سب وے سٹیشن میں راتیں گزارنے کا فیصلہ کرتے ہیں یا کسی پل کے نیچے برفیلی ہواؤں سے بچاؤ کی خاطر پناہ لیتے ہیں..کچھ دکانوں کے برآمدوں میں پڑے رہتے ہیں اور کچھ ویران گلیوں میں کوڑے کے ڈرموں میں کاٹھ کباڑ ڈال کر اسے آگ لگا کر ان کے گرد کھڑے ہو کر راتیں گزار دیتے ہیں..اور کبھی بہار کا منہ نہیں دیکھتے ان میں سے بہت سے مر جاتے ہیں اور یہ ایک معمول ہے..اور بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں ابھی سکت ہوتی ہے اور وہ افغانستان کے کوچی خانہ بدوشوں کی مانند بہار کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں..وہ نیویارک' شکاگو' بوسٹن وغیرہ کے سرد خانوں سے فرار ہو کر جنوب کی جانب کوچ کرنے لگتے ہیں..اپنی کل متاع بدن پر بوجھ کئے

یا ایک ٹرالی پر لادے ان میں سے بیشتر پیدل سفر کرتے ہیں..اکثر رحم دل ڈرائیور انہیں اپنے ٹرکوں اور جہازی سائز کے مال ڈھونے والے ٹرالروں میں لفٹ دے دیتے ہیں..عام طور پر ان کی منزل فلوریڈا کے گرم خطے ہوتے ہیں جہاں وہ کھلے آسمان تلے ایک بوسیدہ ٹی شرٹ' ایک پھٹی ہوئی جین اور اپنے بدن پر جمی ہوئی میل کی موٹی تہہ کے ساتھ آرام سے راتیں گزار سکتے ہیں..

ستمبر کے آخری دنوں میں میں فلوریڈا میں تھا اور وہاں میں نے ان امریکی خانہ بدوشوں کو سفر میں دیکھا..

یہ میرے من پسند لوگ ہیں..نکمّے' آوارہ گرد' معاشرے کے دھتکارے ہوئے بھی اور اس کے باغی بھی..نہ کوئی دوست نہ کوئی رشتے دار..نہ کوئی بندھن اور نہ کوئی جذباتی وابستگی..یہ ہمارے ہاں ہوتے ہیں تو پیر' فقیر اور ملامتی صوفی ہو جاتے ہیں..وارث شاہ بھی تو انہی کو بیان کرتا ہوا کہتا ہے کہ شیر' سانپ اور درویش کا نہ کوئی بھیس ہوتا ہے اور نہ کوئی دیس..اور جیسے پتھروں کو گوند سے نہیں جوڑا جا سکتا ایسے یہ لوگ بھی دنیا کے ساتھ نہیں جڑ سکتے..

براڈوے سٹریٹ کے ایک سُوشی ریستوران کے برآمدے میں میں ہمیشہ ایک ایسے ہی سیاہ فام درویش کو پڑا دیکھتا تھا..وہ کسی سے کچھ طلب نہ کرتا تھا..اگر کوئی اسے چند سکے دے جاتا تھا تو وہ اسے ایک معصوم سی مسکراہٹ سے نواز دیتا تھا..وہ قطعی طور پر نشے کا شوقین نہ لگتا تھا..فٹ پاتھ پر سے گزرنے والے جہان کا تماشا دیکھتا رہتا تھا اور کسی سوچ میں گم رہتا تھا..میں جب بھی وہاں سے گزرتا تو مجھے دیکھ کر وہ ہمیشہ مسکراتا اور میں بھی مسکرا دیتا..وہ مجھے دور سے آتے ہوئے دیکھ کر اپنی توجہ میری جانب مبذول کر لیتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتا تھا..شاید اپنے جیسا جانتا تھا کہ تم اندر سے میرے جیسے ہو تو کیوں اس دنیا کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ایک غلام زندگی گزار رہے ہو..

میرے ساتھ آ بیٹھو خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے..

ایک روز میں میٹروپالیٹن میوزیم میں سارا دن بسر کر کے سنٹرل پارک کے برابر میں ایک دیدہ زیب فٹ پاتھ پر چلتا ہوا جا رہا تھا جب میں نے پارک کے ایک بینچ سے اٹھتی ہوئی ایک سفید فام درمیانی عمر کی خاتون کو دیکھا..وہ ایک افغانی قسم کے پھولدار چوغے میں ملبوس تھی اور اس نے اپنی کڑی کمان کمر پر اپنی حیات کا کل سامان بوجھ کیا ہوا تھا اور ایک پر تمکنت چال سے چلتی تھی..وہ ایک نہایت پرکشش سفید بالوں والی صحت مند عورت تھی اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اس نے کبھی

کسی کے آگے دست سوال دراز کیا ہو کہ وہ اتنی پروقار اور شاندار تھی.. یقیناً یہ طرز زندگی اس کا ذاتی چناؤ تھا.. ہم جو اس کے آس پاس' براڈوے اور ففتھ ایونیو پر چلتے.. حرص و ہوس کے بندے.. اور اِن میں بندھے.. اپنے کاروباروں' ملازمتوں اور تفریح گاہوں کی جانب پاگلوں کی طرح اس زرد شیطان کے شہر میں بڑھتے تھے تو ہم بندھے ہوئے جکڑے ہوئے تھے ان آسائشوں' راحتوں' ٹفنی کے زیورات.. پارک ایونیو کے ملبوسات کے حرص میں گرفتار غلام تھے.. اور صرف وہ آزاد تھی' حرص و ہوس سے آزاد..

اُس کی کمر پر اتنا بوجھ تھا کہ اگر کسی بلتی پورٹر کی پشت پر لاد دیا جائے تو وہ چلنا تو کجا اسی مقام پر کبڑا ہو جائے لیکن وہ.. چاندی کے تاروں ایسے بالوں والی' تیکھے ناک نقشے کی پرکشش عورت اپنی حیات کے کل سامان کے بوجھ کے ساتھ' سرو کے ایک بُوٹے کی مانند سیدھی.. حرکت کرتی جا رہی تھی.. نیو یارک اگرچہ نسوانی کشش اور بدنی تناسب کا ایک یوم آخر تھا لیکن یہ پہلی عورت تھی جسے دیکھ کر میرے دل کی آہٹ یکدم مدھم ہو گئی اور وہ اس میں اترتی چلی گئی.. میں اُس عمر میں تھا جب دل کی آہٹ کسی عارضے سے تو بے ربط ہو سکتی ہے لیکن کسی عورت کو دیکھ کر یوں مدھم نہیں ہوتی.. میرا بہت جی چاہا کہ میں آگے بڑھ کر اس سے بات کروں.. اس کی کہانی سنوں.. اس جیسی شاہانہ خدوخال اور چال رکھنے والی عورت نے معاشرے کو کیوں تیاگ دیا.. ایک جوگن کیوں ہو گئی.. اگر ہوئی تو کیا کسی کے عشق میں ہوئی.. میرا جی چاہتا تھا کہ میں اسے شام کے کھانے کے لیے مدعو کروں.. بے شک لوگ میرا ٹھٹھا اڑائیں کہ یہ شخص ایک میلی کچیلی بے گھر بھوکی عورت کے ہمراہ ریستوران میں آ گیا ہے اور بے شک انتظامیہ مجھے ''رائٹس آف ایڈمشن ریزروڈ'' کا بورڈ دکھا کر خوراک پیش کرنے سے انکار کر دے لیکن میں پھر بھی اسے رات کے کھانے کے لیے مدعو کرنا چاہتا تھا.. کہ اس کی آزاد روح میرے دل کو جکڑتی تھی.. وہ اپنے پھولدار افغانی چوغے میں ایک متروک شہزادی کی مانند چلتی جاتی تھی.. سنٹرل پارک کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں چلتی جب کبھی وہ ان درختوں میں سے اترتی سورج کی کرنوں تلے آتی تو اس کے سفید بال چاندی کے ایک چاند کی مانند آنکھوں کو خیرہ کرنے لگتے..

میرا جی تو بہت چاہا اس سے بات کرنے کو.. راہ و رسم بڑھانے کو.. لیکن مجھے ہمت نہ ہوئی.. جانے وہ مجھے کیا سمجھتی' شاید مجھے دھتکار دیتی' مجھے ایک حریص بوڑھا جان کر خاموشی سے

آگے بڑھ جاتی..

وہ.. سوشی ریستوران کے برآمدے میں براجمان سیاہ فام مسکراتا ہوا بوڑھا تو جانتا تھا پر وہ نہیں جانتی تھی کہ میں بھی ایک ایسی ہی آزاد حیات کا تمنائی ہوں.. بے شک دنیا کی حرص اور ہوس میں مبتلا ہوں لیکن اس کی مانند میں بھی ''بھوکا اور بے گھر'' ہونے کا تمنائی ہوں..

جہاں رہتا ہوں.. وہاں اکثر نہیں رہنا چاہتا.. لیکن رہنا پڑتا ہے..



''ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ایک حاجی کاؤبوائے''

نیویارک کا مین ہیٹن جزیرہ جب مختصر ہوتا بالآخر ساؤتھ فیری کے مقام سے آگے بیٹری پارک پر اختتام پذیر ہوتا ہے تو وہاں سے سمندر شروع ہو جاتا ہے اور سمندر کے درمیان ایستادہ مجسمۂ آزادی نظر آنے لگتا ہے..

کہتے ہیں کہ لوئر مین ہیٹن کے اس علاقے میں نیویارک شہر نے جنم لیا تھا..

اور جنم کہانی کچھ یوں ہے کہ 1626ء میں ہالینڈ کے ایک باشندے پیٹر نے یہاں تاریخ کا سب سے بڑا سودا کیا تھا.. کسی بھی شے کی خرید وفروخت کے لیے اگر انصاف کا ترازو موجود ہو تو گاہک اور صاحب جائیداد خود مختار حیثیت کے مالک ہوتے ہیں یعنی صاحب جائیداد اگر اپنی جائیداد فروخت کرنا چاہے تو کر دے اور گاہک اگر قیمت مناسب سمجھے تو خرید لے.. مجھے شک ہے اس تاریخی خریداری میں صاحب جائیداد مجبور تھا اور گاہک مختار..وہ اپنی جائیداد فروخت نہ بھی کرنا چاہتا تو بھی اسے فروخت کرنا تھی اور گاہک نے بہر طور اسے اپنی طے کردہ ''مناسب'' قیمت پر خریدنا تھا.. چنانچہ اس انصاف پسند ولندیزی نے یہ جزیرہ جو ان دنوں اپنے آبائی انڈین نام ''مین..اے..ہاٹ..ٹا'' سے جانا جاتا تھا اس کے مالک انڈین قبیلے الگنوکین سے چند منکوں اور موتیوں کے بدلے میں خرید لیا جن کی کل قیمت چوبیس ڈالر سے بھی کم تھی..اور اس کے باوجود کہا جاتا ہے گوری اقوام نے انڈین قبیلوں کی سرزمین پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا حالانکہ انہوں نے تو باقاعدہ چند منکے اور موتی جن کی قیمت پورے چوبیس ڈالر بنتی ہے ادا کر کے قانونی طور پر یہ جزیرہ حاصل کیا تھا.. آپ اسے ایمانداری اور انصاف پسندی کی ایک درخشاں مثال نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے..

آج وہی ''مین-اے-ہاٹ-ٹا'' مین ہیٹن ہے جہاں کُل کائنات کے معاشی دل دھڑکتے تھے..وال سٹریٹ‘ فیڈرل ریزرو بینک‘ نیویارک سٹاک ایکسچینج اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر..ان میں سے پہلے تین تو ابھی تک دھڑکتے ہیں اور چوتھا دھڑکتا دھڑکتا تھم گیا ہے..وال سٹریٹ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں جب باہر کے ملکوں سے آئے ہوئے تہذیب یافتہ لوگ آباد ہوئے تو انہوں نے مقامی وحشی لوگوں سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی خاطر یہاں ایک دیوار تعمیر کر لی..کیونکہ وحشی لوگوں کا کیا اعتبار وہ ایک قانونی سودے سے منحرف ہو جائیں اور چوبیس ڈالر منہ پر مار کر اپنے جزیرے کی واپسی کا مطالبہ کر دیں..اس کے باوجود کہ ان کی سرزمین کی مناسب قیمت ادا کر دی گئی تھی وہ احسان فراموش اپنا سرسبز جزیرہ حاصل کرنے کے لیے کلہاڑیوں اور تیر کمانوں سے مسلح ہو کر امن پسند اور انصاف پسند لوگوں پر حملہ آور ہو جائیں..اسی فلسفے پر عمل کرتے ہوئے آج کے دور میں اسرائیل نے بھی مقامی وحشیوں سے بچاؤ کے لیے ایک سینکڑوں کلومیٹر طویل اور بلند دیوار تعمیر کی ہے..یہ انصاف پسند تاریخ کا تسلسل ہے..

فیڈرل ریزرو بینک دراصل دنیا بھر کے بینکوں کا بینک ہے..اس میں سونے کی شکل میں جو سرمایہ محفوظ ہے ہم تیسری دنیا کے لوگ اس کی مالیت اور حجم کا اندازا بھی نہیں لگا سکتے..یوں جانیے کہ یہ جو قدیم طرز کا ایک محل سا نظر آتا ہے جو فیڈرل ریزرو بینک ہے اس کی کھڑکیاں کھل جائیں تو ان میں سے سونے کی لاکھوں اینٹیں ابل ابل کر وال سٹریٹ میں چلنے والوں کو انارکلی کی مانند زندہ درگور کر دیں‘ صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہاں مٹی کی اینٹوں میں وہ چنی گئی اور یہاں سونے کی اینٹوں کی دیواروں میں وہ دفن ہو جائیں اور کون سا ایسا امریکی ہے جو اس قسم کی تدفین پسند نہ کرے..ویسے اس بینک سے کبھی کبھار ایک آدھ اینٹ ایشیا اور افریقہ کو بھی امداد کے طور پر عطا کر دی جاتی ہے..اور پھر بھی ہم ان نعمتوں کے لیے امریکہ کے شکر گزار نہیں ہوتے..

نیویارک سٹاک ایکسچینج ایک اور امریکی خدا ہے جو دنیا بھر کی معیشت کے فیصلے کرتا ہے..میں حساب کے مضمون میں ہمیشہ سے پھسڈی رہا ہوں..اس پرچے میں اگر کبھی پاس ہوتا تھا تو رعایتی نمبر حاصل کر کے..یہ معاملہ صرف طالب علمی کے دنوں تک ہی محدود نہ رہا بلکہ بعد میں دنیاوی اور دینی حساب کتاب میں بھی کورا رہا تو اس کے باوجود میں خصوصی طور پر اس حساب کتاب کی عمارت کو دیکھنے کے لیے کیوں گیا..صرف اس لئے کہ ہم جیسوں کی قسمت کے فیصلے

آسمانوں پر نہیں یہاں ہوتے تھے.. یہاں سے ڈور ہلتی ہے تو ہمارے ہاں پٹرول مہنگا ہو جاتا ہے.. ڈبل روٹی کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور آٹے کا تھیلا ہمارے بس سے باہر ہو جاتا ہے..

وال سٹریٹ میں داخل ہوں تو یکدم مخلوق بدل جاتی ہے.. فٹ پاتھوں پر چلتے' بینکوں اور معاشی اداروں سے نکلنے والے لوگ بدلنے لگتے ہیں.. مہنگے سیاہ سوٹوں اور نفیس ترین ٹائیوں میں ملبوس.. بال چمکتے اور جمے ہوئے' ہاتھوں میں چمڑے کے سیاہ بریف کیس.. وہ دنیا جہان سے بلند گردنیں اکڑائے چلتے نظر آتے ہیں.. سٹاک ایکسچینج کے صدر دروازے پر چند مسلح پہریدار تنے کھڑے تھے اور کسی ایرے غیرے کو قریب نہ پھٹکنے دیتے تھے.. میں نے ایک یادگاری تصویر اتارنے کی خاطر کیمرہ کیس میں سے نکالا اور پھر ڈر مجھ پر غالب آ گیا.. ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد کوئی بھی غیر ملکی اور عرب دکھائی دیتا شخص اور ان دنوں ہر وہ شخص جس کا رنگ مختلف ہو اور وہ عرب نہ بھی ہو تو انہیں عرب ہی دکھائی دیتا ہے تو ان دنوں اگر ایک ایسا بندہ اپنے کیمرے کا رخ نیویارک سٹاک ایکسچینج کے صدر دروازے کی جانب کر لے تو عین ممکن تھا وہ بندہ فوری طور پر دھر لیا جاتا تھا کہ اچھا ٹریڈ سنٹر کے بعد دھر کا ارادہ ہے..

وال سٹریٹ کے اس عظیم معاشی ہنگامے میں سب سے خوبصورت کردار ایک تانبے کے بُل یعنی بھینسے کا ہے..

حساب کتاب کے سیانے جانتے ہیں سٹاک ایکسچینج میں بُل اور بیئرز کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں.. مجھ دائمی طور پر حساب میں فیل ہو جانے والے کو آج تک علم نہیں ہو سکا کہ یہ بُل کون ہوتے ہیں اور بیئرز کی اصطلاح کہاں لاگو ہوتی ہے.. وال سٹریٹ کے دہانے پر آویزاں تانبے میں ڈھلا' پونچھ اونچی کئے.. نتھنے پھلائے.. اپنے خمدار سینگوں پر کل دنیا کو اٹھائے رکھنے کا عزم کئے.. ٹانگیں پھیلائے.. پھنکارتا ہوا یہ بھینسا اس سٹریٹ کا امتیازی نشان ہے اور اس کی زیارت کو ایک دنیا آتی ہے.. وال سٹریٹ کے اس بھینسے کے ساتھ تصویر کھنچوانا اتنا ہی احسن ہے جتنا ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ یا مجسمہ آزادی کے سامنے کھڑے ہو کر تصویر اتروانا.. بدقسمتی سے میرے ڈیجیٹل کیمرے کی بیٹری عین وقت پر جواب دے گئی اور میں اس لاجواب بھینسے کے ساتھ تصویر اتروانے کی سعادت سے محروم رہ گیا چنانچہ میں نے اس کے تانبے کے بدن کو چھو کر ہی خاصا نروان حاصل کر لیا.. وہاں اس کے آس پاس ہجوم کرنے والے سیاحوں کے کیمروں کی بیٹریاں

چونکہ زندہ اور روشن تھیں چنانچہ وہ خوش نصیب دھڑا دھڑ اس بھینسے کے ساتھ تصویریں اتروا رہے تھے اور سیاحوں کے تصویریں اتروانے کے مختلف انداز اور پوز تھے.. اس کے سینگ تھام کر.. اس کی پسلیوں کو سہلاتے ہوئے.. اس کے نتھنوں میں انگلیاں گھسیڑ کر.. اُس کے وسیع تن و توش کے نیچے بیٹھ کر.. لیکن ان سب میں سے خواتین سیاحوں کا جو پسندیدہ ترین پوز تھا وہ اس بھینسے کی مردانہ خصلت کے دونوں لٹکتے ہوئے مقامات وآہ وفغاں کو تھام کر.. اگرچہ وہ پیتل کے تھے پھر بھی انہیں گوشت پوست کا محسوس کرتے ہوئے ایک مخصوص ہیجان آمیز چہرہ بنائے تصویر اُتروانا تھا.. بے شرمی کی انتہا تو تب ہوئی جب ایک عمر رسیدہ خاتون نے انہیں چومتے ہوئے فوٹو بنوائی. لیکن اس فوٹو سیشن کا سب سے یادگار لمحہ میرے لیے وہ ہے جب ایک نوخیز لڑکی شاید امریکہ کی کسی دور دراز ریاست سے پہلی مرتبہ نیویارک آئی ہوئی لڑکی کی تصویر اُس کی ایک سہیلی اُتار رہی تھی اور وہ سہیلی کیمرے سے ناک لگائے اُسے بھینسے کے دونوں مقاماتِ آہ وفغاں تھامنے کو کہہ رہی ہے اور وہ قدرے شرمیلی ہے ہچکچا رہی ہے تو سہیلی اُسے کہتی ہے ''سِلی.. گریب دیم بالز.. انہیں پکڑ لو.. کیا اتنے بڑے سائز سے بھی تمہاری تسلی نہیں ہوتی۔''

یہ نیویارک میں میرا ابھی دوسرا دن تھا..

سفر کی کچھ تھکاوٹ بھی بے چین کرتی تھی.. اور سنٹرل پارک میں سیر کی وجہ سے بھی بدن قدرے اکڑا ہوا تھا.. سلجوق مجھے جُوس پلا کر' آملیٹ کھلا کر یونیورسٹی میں کلاسیں اٹینڈ کرنے کے لیے جا چکا تھا اور میں بستر پر لیٹا فلیٹ کی وسیع کھڑکی کے پار نیویارک کی عمارتوں کو بے دھیانی سے دیکھتا جا رہا تھا.. ابھی مجھے دو دن ہوئے تھے نیویارک آئے ہوئے جب ایک منظر نے مجھے ایک دھچکے سے دوچار کیا کچھ پریشان کر دیا اور میں جان نہ سکا کہ ایسا کیوں ہوا ہے..

سلجوق یونیورسٹی جا چکا تھا اور میں فلیٹ کی وسیع کھڑکی کے پار بے دھیانی میں شہر کی عمارتوں اور ان پر پھیلے آسمان کو تکتے جا رہا تھا اور تب میں نے دیکھا اس آسمان پر نیویارک کے سکائی سکریپرز کے عین اوپر ایک جہاز نہایت آہستگی سے جیسے سلوموشن میں کر دیا گیا ہو پرواز کر رہا ہے.. وہ جہاز جو ایک طویل فاصلے پر تھا سوچ سوچ کر حرکت کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا' یہ سوچ کر کہ مجھے کہاں اور کس زاویے پر جانا ہے.. وہ میرے اندازے کے مطابق قدرے سست رفتار تھا تو

کیوں تھا.. یہ ایک معمول کا منظر تھا.. کوئی ایک جہاز کسی بھی شہر پر اڑان کرتا ہوا.. لیکن یہ کوئی شہر نہ تھا نیویارک تھا اور اس پر اڑتا ہوا کوئی بھی جہاز.. کوئی بھی نہیں ہو سکتا تھا.. یہ ایک خاص جہاز تھا بلکہ اس کی ایک علامت تھا.. اس معمول کے منظر نے مجھے کیوں ڈسٹرب کیا.. الجھن میں کیوں مبتلا کیا اس لمحے میں نہ جان سکا..

آئندہ دنوں میں جب بھی میں نے نیویارک کے آسمان پر کسی بھی جہاز کو پرواز کرتے دیکھا تو وہ ہمیشہ مجھے نہایت آہستہ رو اور دھیرے دھیرے آگے ہوتا لگا.. سوچتا ہوا' ایک منزل کا تعین کرتا ہوا لگا.. اور پھر جہاز کی آہستگی کے انداز میں یہ گتھی آہستہ آہستہ سلجھنے لگی.. یہ جہاز دیکھا ہوا تھا.. اس جہاز کی پرواز کے بعد دنیا وہ نہ رہی جو وہ پہلے تھی..

نیویارک کے آسمان پر جب کوئی بھی جہاز دکھائی دیتا تھا تو مجھے وہی دکھائی دیتا تھا اور اسی لئے یہ منظر مجھ میں خوف بھرتا تھا..

وہی جہاز.. ٹیلی ویژن کی سکرین پر اسی آہستگی اور سوچ سوچ کر اڑان کرنے کے انداز میں حرکت کرتا ہوا ایک جہاز دکھائی دے رہا تھا.. گیارہ ستمبر 2001ء..

میں ایک معمول کی زندگی گزارتا شخص ایک معمول کی شام کو گزارنے کے بارے میں سوچ رہا تھا.. سوچ رہا تھا کہ ٹیلی ویژن کے سامنے سے اٹھ کر ابھی اپنی سٹڈی میں چلا جاؤں' جہاں لکھنے کی مشقت شروع ہو جائے گی یا ابھی کچھ دیر ٹیلی ویژن پر چلنے والے ایک بے ہودہ پروگرام کو یونہی بے دھیانی سے دیکھتا رہوں جب فلوریڈا سے میری بیٹی عینی کا ٹیلی فون آ گیا اور اس کی آواز میں شدید گھبراہٹ تھی ''ابھی ٹیلی ویژن آن کریں.. ابھی.. نیویارک پر حملہ ہو گیا ہے''.. میں قطعی طور پر اس خبر کو سن کر سناٹے میں نہیں آیا' پریشان نہیں ہوا' یہی دھیان میں آیا کہ عینی نیویارک کے بارے میں کوئی فلم دیکھ رہی ہے جس میں نیویارک پر حملہ ہو جاتا ہے اور وہ چاہتی ہے میں بھی دیکھ لوں.. ورنہ تمام عظیم جنگیں تو امریکہ سے دور دور لڑی جاتی ہیں اور ان کی زیادہ سے زیادہ حدّت پرل ہاربر تک آ جاتی ہے.. نیویارک یا شکاگو تک تو آج تک نہیں' میں نے ریموٹ کے بٹن مسلسل دبا کر چینل بدلنے شروع کر دیئے اور یکدم ٹیلی ویژن سکرین پر ایک جیٹ ہوائی جہاز ہولے ہولے نیویارک کی بلند عمارتوں میں سے جتنا آسمان دکھائی دے رہا ہے اس میں آہستگی سے تیرتا

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی جانب بڑھ رہا ہے لیکن یہ ٹریڈ سنٹر کی عمارت کے دل کی جانب کیوں بڑھ رہا ہے.. کیا پائلٹ کو دکھائی نہیں دے رہا کہ یہ چند لمحوں کے بعد اس میں جا ٹکرائے گا.. مجھے دکھائی دے رہا ہے تو اسے کیوں نہیں دکھائی دے رہا..

اس آہستہ رو جہاز کی اڑان میں ایک عجیب سا جادو ٹونا تھا.. جیسے وہ سحر زدہ ہو..

ٹریڈ سنٹر کی عمارت کے حجم کو تیزی سے اپنے قریب آتے دیکھ کر.. یہاں تک کہ جہاز کی ونڈ سکرین میں آسمان نہ تھا ٹریڈ سنٹر کی کھڑکیاں اور منزلیں تھیں تو اس لمحے پائلٹ پر کیا گزری ہوگی.. مسافروں پر کیا بیتی ہوگی' ماؤں نے اپنے بچوں کو کیسے یقینی موت سے بچانے کے لیے اپنے سینے سے لگایا ہوگا.. انہیں اپنے قریب آتی موت کی کچھ سمجھ نہ آئی ہوگی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے.. جو بے قصور ہوتے ہیں ان کی سمجھ میں یہ کیسے آئے کہ وہ جو قصوروار ہیں ان کے اعمال کی سزا ہمیں ملنے والی ہے.. تو اس لمحے اس جہاز کے پائلٹ پر کیا گزری جو زندگی سے منہ موڑ کر یقینی موت کی جانب بڑھ رہا تھا.. جو پائلٹ اس جہاز کا رخ موڑ کر زبردستی اسے ٹریڈ سینٹر کی جانب لے جا رہا تھا تو ٹریڈ سنٹر کو اپنی آنکھوں کے قریب آتے اس کی کھڑکیوں اور منزلوں کو جہاز کی ونڈ سکرین پر چھاتے.. اور قریب آتے دیکھ کر.. چند لمحوں بعد اپنی بھسم ہو جانے والی موت کو قریب تر ہوتے دیکھتے ہوئے اس پائلٹ کے چہرے پر کیا تھا.. خوف تھا.. طمانیت تھی.. پچھتاوا تھا یا ایک مسکراہٹ تھی.. کیا تھا..

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ گیارہ ستمبر کے بعد دنیا وہ نہ رہی جو کبھی تھی..

نہ امریکہ وہ رہا اور نہ ہم مسلمان وہ رہے.. ہم سب بلا تخصیص دھتکارے گئے سب کے سب مجرم اور دہشت گرد ہو گئے.. گوانتا موبے کے قیدی ہو گئے.. کسی نے یہ نہ سوچا کہ بیشتر ہائی جیکر سعودی عرب کے باشندے تھے' امریکہ کا لاڈلا اور دُم ہلاتا ملک اور سزا کن کو مل رہی ہے.. پاکستان' انڈونیشیا' افغانستان' سری لنکا' سوڈان یا حبشہ کے ایک شخص کو جو مسلمان ہے.. ایسے لوگ جو دہشت گردی کے ہجوں سے بھی ناواقف ہیں..

محض دو عمارتوں کو ڈھا کر.. ہم نے اپنے دو ملک برباد کروا لئے اور کیسا گھاٹے کا سودا کیا..

مارا بہ غمزہ کشت و قضا را بہانہ ساز

نیویارک کا ہجوم اُس ویرانے..اُس کھنڈر کے آس پاس ایک منہ زور دریا کی مانند زرد شیطان کے حصول کی خاطر بہتا رہتا ہے..

اُس ایک کھنڈر نے ہزاروں بستیوں کو کھنڈر کر دیا..کیسا گھاٹے کا سودا تھا..

نیویارک کی سر بہ فلک عمارتوں کے گھنے پن میں ایک وسیع میدان ہے ایک گھاؤ کی مانند جہاں کبھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی ناقابل تسخیر سر بلندی تھی..میدان نہیں ایک کھنڈر ہے جو ایک بلند آہنی جنگلے کے اندر آثار قدیمہ کے ایک کھنڈر کی مانند دکھائی دے رہا ہے..آپ اس کے اندر نہیں جا سکتے البتہ آہنی تاروں سے بنے ہوئے ایک جال سے ناک لگا کر اس کا منظر دیکھ سکتے ہیں..اس کے اندر اس عمارت کے اینٹ لوہے کے کچھ آثار باقی نہیں ہیں، کوئی ملبہ نہیں، جس کے ساتھ وہ آہستگی سے حرکت کرتے جیٹ ہوائی جہاز جا ٹکرائے تھے..

یہاں نیویارکر کم ہی آتے ہیں کہ وہ جتنا ماتم کر سکتے تھے کر چکے..اس ایک کھنڈر کے بدلے میں ہزاروں بستیوں کو کھنڈر کر کے کسی حد تک مطمئن ہو چکے.. یہاں صرف غیر ملکی سیاح آتے ہیں..

وہ آہنی جالیوں سے ناکیں چسپاں کیے اندر دیکھتے ہیں..اور اندر کچھ بھی نہیں..سوائے ایک وسیع اور ویران میدان کے جہاں کہیں کہیں گھاس اُگ رہی ہے..

آہنی جنگلے کے ساتھ وہ بورڈ آویزاں ہیں جن پر گیارہ ستمبر کے ہر لمحے کی تفصیل با تصویر اور لمحہ بہ لمحہ درج ہے..تب کیا وقت تھا جب پہلا جیٹ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرایا تھا..گھڑی کی سوئیاں کہاں تھیں جب یہ آسمانی عمارتیں یکدم مسمار ہونے لگی تھیں اور لوگ ان کی کھڑکیوں میں سے یقینی موت کے باوجود سراسیمگی میں چھلانگیں لگا رہے تھے..ایک اور بورڈ پر ان لوگوں کے نام درج تھے جو ٹریڈ سینٹر میں جل کر راکھ ہوئے یا اس کے ملبے میں دفن ہو گئے..اور مجھے کم از کم تین نام ایسے دکھائی دیئے جو میرے ہم وطن اور ہم مذہب تھے..اس بورڈ تلے ان رخصت ہو جانے والوں کی یاد میں چند پھول پڑے تھے..جانے ان میں سے کوئی ایک ایسا پھول بھی تھا جو وہاں ہلاک ہونے والے کسی پاکستانی یا مسلمان کی یاد میں بھی رکھا گیا ہو..

ہر انسان کی مانند ہر قوم کے المیے کا معیار الگ الگ ہوتا ہے..بھوک اور افلاس کے مارے ایک شخص کے لیے فاقہ زدہ بچوں کو مرتے دیکھنا ایک معمول ہو جاتا ہے..وہ بے بس اور مجبور

انہیں دیکھتا رہتا ہے کچھ کر نہیں سکتا..اور ایک متمول انسان جب زندگی میں پہلی بار بھوک سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اس کا سب سے بڑا المیہ ہوتا ہے..ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی امریکیوں کی مختصر تاریخ کا ان کے لیے سب سے بڑا المیہ ہے..جیسے یہودیوں کا بیت المقدس سے نکلنا اور مسلمانوں کا غرناطہ سے نکال دیا جانا ان ہر دو قوموں کو نہیں بھولتا اگرچہ یہودیوں نے اپنی دانش اور حکمت عملی سے بیت المقدس حاصل کر لیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہزاروں برس پیشتر کی اس رسوائی کو نہیں بھولتے..بے شک یہ محض دو بلند عمارتیں تھیں لیکن ان کا چھن جانا کہ آج تک امریکہ سے کوئی تنکا بھی نہیں چھین سکا ان کے لیے بیت المقدس اور غرناطہ کے چھن جانے کے مترادف ہے..یہ یونانی دیو مالا کے بہادر ترین ہیرو اکلیس کی وہ ایڑھی تھی جس پر جہازوں کے تیر لگنے سے اس کا ناقابل تسخیر بدن زمیں بوس ہو گیا..کوئی بھی غیر امریکی ان کے دکھ اور رنج کو نہیں سمجھ سکتا..اس دھچکے کو نہیں جان سکتا جو ان کی عزت نفس کو لگا ہے..ایک بچے داؤد نے گوپیے کے ایک پتھر سے جو یہاں ایک جہاز کی صورت میں گھمایا گیا تھا ایک دیو گولائتھ کو مار گرایا تھا..امریکی ایک منظم اور زیادہ مدت تک جذبات میں نہ بہنے والی قوم ہیں وہ اس کا ماتم کرنے کے بعد اپنے صدمے سے باہر آ گئے لیکن ان کی قیادت انہیں مسلسل اس صدمے میں دھکیلتی رہی یہاں تک کہ بش ایسے معمولی قابلیت کے شخص نے بھی دہشت گردی کا سیاہ پرچم بلند کر کے امریکہ کو مظلوم ثابت کر کے دوبارہ صدارت حاصل کر لی..اس المیے کی آڑ میں افغانستان اور عراق کو برباد کر دیا، اور انہیں..امریکیوں کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کی ایک ایسی ڈھال مل گئی جس کی اوٹ سے وہ دنیا کی کسی بھی قوم یا فرد پر وار کر سکتے تھے..اسامہ بن لادن کو دنیا کا سب سے بڑا جنگی جینئس ثابت کر دیا گیا جو دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے..اسے ایک ایسا اساتیری کردار بنا دیا گیا جو حیرت انگیز جادوئی صلاحیتوں کا مالک ہے..سرد جنگ کے زمانے میں سوویت یونین کے ہزاروں ایٹمی اور ہائیڈروجن بم..میزائل اور نصف کروڑ فوج امریکیوں کے لیے کچھ معنی نہ رکھتی تھی لیکن ایک خچر پر سوار، غاروں میں دبکا، ایک لاغر اور بیمار شخص..شاید مر چکا شخص جدید ترین سائنس، ٹیکنالوجی اور تباہ کن ہتھیاروں کا ایکسپرٹ بنا دیا گیا..اور اسے ایسا امریکہ نے بنایا..وہ ہر دو چار ماہ بعد مغربی میڈیا پر لندن، نیویارک یا شکاگو پر القاعدہ کے تباہ کن حملوں کی نوید سنا کر سراسیمگی پھیلا دیتا ہے لیکن گیارہ ستمبر کے بعد آج تک ایسا ہوا نہیں..اگر اسامہ نہ ہوتا تو شاید کبھی احتمال ہوتا کہ امریکہ زوال

پذیر ہونے لگا ہے لیکن گیارہ ستمبر اور اسامہ کی داستانوں نے اسے وہ قوت دی کہ وہ مزید مستحکم ہو گیا.. یہ امریکہ کی شاطر دانشمندی کا کمال ہے..

دو عمارتوں کے بدلے میں دو ملک گنوا کر ہم اب بھی گھاٹے کا سودا کئے جا رہے ہیں..

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی سائٹ پر.. ملبے کی ایک اینٹ بھی باقی نہیں ہے.. کوئی یادگار' کوئی آثار نہیں' جیسے ہیروشیما کے ایک تباہ شدہ حصے کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا گیا ہے کہ امریکی اس سانحے کو فراموش کر دینا چاہتے ہیں.. جو لوگ آہنی جالیوں پر ماتھے رکھے اندر دیکھتے ہیں تو انہیں ایک ویران قطعہ زمین دکھائی دیتا ہے.. ایک ایسا مقام دکھائی دیتا ہے جہاں پر کبھی دو بلند عمارتیں ہوا کرتی تھیں.. ان کی بربادی کا ان لوگوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا' آس پاس نیو یارک رواں دواں ہے اور یہ قطعہ محض ایک تاریخی حوالہ ہے.. جیسے ہیروشیما کے کھنڈرات دیکھ کر ہر آنکھ میں آنسو آ جاتے ہیں.. امریکی یہ نہیں چاہتے.. میں نے بھی وہاں کھڑے ہو کر کچھ بھی محسوس نہ کیا سوائے اس لمحے جب میں نے ان عمارتوں میں ہلاک ہو جانے والوں کی طویل فہرست پر ایک نظر ڈالی کہ یہ سب لوگ بے قصور تھے.. مجھے ان کی موت کا دکھ بہت ہوا.. نہ میں نے وہاں کھڑے ہو کر یہ تصور کیا کہ وہ جہاز کدھر سے آئے تھے.. آسمان کا وہ کون سا ٹکڑا تھا جہاں وہ ٹریڈ سنٹر کی عمارتوں کی جانب ہولے ہولے چلے آتے تھے اور وہ کون سی سٹریٹ ہے جس میں ان عمارتوں کے ڈھے جانے سے ملبے اور دھول کے بادل اڈتے آتے تھے اور ان میں پریشان حال شہری بھاگ رہے تھے.. اس لئے بھی کہ امریکی قہر کا ملبہ اور بے وجہ تہمتوں کی دھول تو ہم پر اڈتی آتی ہے اور ہم بھاگ رہے ہیں.. ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں.. بقول میاں محمد.. ؎ ماڑے دا کی کم محمد.. نٹس جانا یا رونا.. ایک ناتواں شخص اور کر بھی کیا سکتا ہے.. بھاگ جائے گا یا بیٹھ کر روئے گا..

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی سائٹ کے ایک کونے پر ایک ایسا سُپر سٹور ہے جہاں مشہور عالم فیشن گھروں اور ڈیزائنرز کے خصوصی ملبوسات مردانہ، زنانہ و بچگانہ رعائتی قیمت پر دستیاب ہوتے ہیں اور وہاں بے پناہ رش ہوتا ہے.. میں اس سُپر سٹور کے فٹ پاتھ پر اپنے دھیان میں گم کہ کیا کھویا کیا پایا واپس آ رہا تھا جب نیو یارک کے گھنے ہجوم میں سے.. کولھوں پر سے کھسکتی جینوں اور باریک لیس کے بلاؤزوں میں خوش بدن ہوتی عورتوں.. مہنگی ٹائیوں اور سوٹوں میں حرکت کرتے مردوں.. اور جھومتے ہوئے سیاہ فاموں اور کھوئے کھوئے چینی، جاپانی سیاحوں کے ہجوم میں سے ایک موٹا تازہ

گورا چٹا کاؤبوائے نمودار ہوا.. نیکر اور ٹی شرٹ میں پھنسا ایک بڑا ہیٹ پہنے وہ نمودار ہوا اور مجھے دیکھ کر یکدم عجیب سا نعرہ لگایا.''یا حاجی طریق.. حاجی صاحب ورلڈ ٹریڈ سنٹر دیکھ کر آ رہے ہیں.. خود ہی سب کچھ کیا ہے اور اب دیکھ کر آ رہے ہو کہ کیا کِیا ہے؟'' یہ فقرہ گویا میری موت کا سندیسہ بھی ہو سکتا تھا.. یعنی یہ کاؤبوائے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی سائٹ کے قریب بلند آواز میں مجھے مبارک دے رہا تھا کہ خود ہی سارا منصوبہ تیار کیا تھا.. اور اب دیکھنے آ گئے ہو کہ کیا کِیا تھا..

اُن دنوں امریکی اتنے حساس اور بیوقوف ہو رہے تھے کہ نیو یارک میں ایک سری لنکا کی لڑکی ایک بنگلہ دیشی لڑکی کے ساتھ کمپیوٹر پر چیٹ کر رہی تھی جس کے دوران وہ دہشت گردی کا تذکرہ کر بیٹھیں.. نہ صرف انہیں گرفتار کر لیا گیا بلکہ ملک بدر کر دیا گیا.. اور میں بھی اپنے نام کی وجہ سے ڈرا ڈرا رہتا تھا کہ اگر کسی نے رپورٹ کر دی کہ اس شخص کا تو نام ہی ''ٹیرر'' ہے تو میں عمر بھر گوانتاناموبے میں پڑا سڑتا رہوں گا اور ایسے حالات میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے قریب وہ کاؤبوائے شور مچا رہا ہے کہ یہ سب تو تمہارا کیا دھرا ہے.. میری سراسیمگی بے جا تو نہ تھی..

اس کاؤبوائے نے صرف اس پر اکتفا نہ کیا اور مجھے جپھا مار کر بولا'' حاجی برادر کیا حال ہے''.. اور تب میں نے اس کاؤبوائے حاجی برادر کو پہچان لیا.. ہم دونوں نے دو برس بیشتر اکٹھے حج کیا تھا.. میں نے انہیں صرف احرام میں لپٹے، عبادت کرتے، تسبیح پھرولتے، آنسو بہاتے دیکھا تھا اور ان کی لطیف حس مزاح اور سادگی سے لطف اندوز ہوا تھا.. یوسف شاہ اُن دنوں برما میں پاکستان کے سفیر تھے اور اس کے باوجود اتنے کھلنڈرے اور خوشگوار تھے.. وہ دنیا کی کسی شے سے نہیں ڈرتے تھے سوائے اپنی بیگم کے جو بے شمار پڑھی لکھی اور مغربی انداز کی ہونے کے باوجود محض اس لیے آبدیدہ ہو جایا کرتی تھیں کہ تارڑ صاحب ہمارے آس پاس جو پہاڑیاں گزر رہی ہیں یہ بھی رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوں گی، جنہیں ہم دیکھ رہے ہیں وہ بھی تو انہیں دیکھتے ہوں گے.. تو یہی حاجی برادر مکّہ کے بعد یہاں نیو یارک میں ایک کاؤبوائے آؤٹ فٹ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی سائٹ کے قریب نمودار ہو جاتے ہیں.. یہ دنیا کتنی مختصر ہے..

شاہ صاحب بیگم کے ہمراہ اپنی بیٹی کی گریجویشن کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے نیو یارک آئے ہوئے تھے اور بیگم اس سپر سٹور کی چھٹی منزل پر شاپنگ میں مصروف تھیں اور وہ ایک فرمانبردار شوہر کی حیثیت سے نیچے فٹ پاتھ پر پچھلے ایک گھنٹے سے چہل قدمی میں

مصروف تھے..

اس ہمدم دیریں سے ملاقات نے مجھے خوش کر دیا اور میں نے شکایت کی کہ قبلہ آپ نے نمودار ہوتے ہی کیا بیان داغ دیا کہ یہ سب میرا ہی کیا دھرا ہے..اور ٹریڈ سنٹر کی تباہی میں میرا ہاتھ ہے..آس پاس اگر نیشنل سکیورٹی کا کوئی اہلکار ہوتا تو یہ بندہ تو جان سے گیا تھا..وہ ایک مرتبہ پھر مجھ سے بغلگیر ہوئے اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے ''تارڑ صاحب انگریزی میں تھوڑا کہا تھا..پنجابی میں کہا تھا..اور ٹھیٹھ پنجابی میں کہا تھا جو پنجابیوں کو بھی سمجھ نہیں آتی تو امریکیوں کو خاک پلے پڑے گی..اور سنائیں حاجی برادر..وہ جو سلیٹ صاف کروا کے آئے تھے حج پر تو وہ ابھی تک صاف ہے یا اس پر مزید گناہوں کا اندراج ہو چکا ہے؟''

میں نے اس کاؤبوائے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''شاہ جی..اگر سلیٹ کوری اور صاف ہی رہے تو پھر ایک اور حج کی گنجائش کیسے نکلے گی۔''

''تو آپ دوبارہ حج کے لیے آئیں گے؟''

''جی تو چاہتا ہے..''

''تو پھر مجھے اطلاع کر دیجیے گا..میں اب فارن سروس سے ریٹائر ہو چکا ہوں اور میری سلیٹ پر بھی کچھ دھبے ہیں تو اکٹھے حج کریں گے''..

اس دوران موبائل پر اُن کی بیگم کا، وہ اُس سٹور میں جہاں کہیں بھی تھیں پیغام آ گیا کہ..دیکھو میں ابھی ایک دو گھنٹے خریداری میں لگاؤں گی..میرا انتظار کرنا..اِدھر اُدھر نہ ہو جانا..''

چنانچہ یوسف شاہ صاحب سٹور کے صدر دروازے کے سامنے اپنا کاؤبوائے ہیٹ ذرا ترچھا کر کے پھر سے تعینات ہو گئے..

یہ دنیا کیسی مختصر ہے کہ جس میں منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کے برابر میں نیویارک آ جاتا ہے..ایک احرام..ٹی شرٹ، نیکر اور کاؤبوائے ہیٹ میں بدل جاتا ہے..یہ دنیا ایسی ہی مختصر ہے..



''امریکہ کا شاہی خاندان..
بوڑھے، بچے، اپاہج اور کُتے''

کہا تو یہی جاتا ہے کہ امریکہ ایک مکمل جمہوریت ہے جس میں رائلٹی یا بادشاہی کی کوئی گنجائش نہیں..امریکی تو ایسے مسخرے مزاج کے ہیں کہ وہ رسمی لباس تک پسند نہیں کرتے..

میرے ایک دوست امریکہ میں قیام پذیر ہوئے تو کسی امریکی کے ہاں ڈنر پر گئے تو ذرا بن ٹھن کر گئے اور ایک عدد سیاہ سوٹ زیب تن کر گئے..ان کو دیکھتے ہی میزبان نے جو ایک جین اور بوسیدہ ٹی شرٹ میں ملبوس تھا نہایت رنجیدہ ہو کر کہا ''کیا تم کسی کے جنازے میں شریک ہونے کے بعد سیدھے ہمارے ہاں آ رہے ہو۔''..ایسے لوگوں کے سامنے اگر ایک عدد بادشاہ اپنے شاہی لباس میں سر پر تاج رکھے سامنے آ جائے تو وہ یقیناً اس سے پوچھیں گے کہ ہیلو فنی مین..کیا کسی فینسی ڈریس میں شامل ہونے کے لیے جا رہے ہو..لیکن اس رویئے کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکی شدید طور پر اس احساس کمتری میں مبتلا ہیں کہ آخر ہم دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور ہیں اور روئے زمین پر صرف ایک ہی ملک ہے امریکہ..باقی سب تو کاٹھ کباڑ ہے اور اس کے باوجود ہمارے ہاں نہ کوئی بادشاہ ہے اور نہ کوئی ملکہ..چنانچہ وہ ہمہ وقت کسی ہیرو..بادشاہ یا ملکہ کی تلاش میں رہتے ہیں..یہاں تک کہ کبھی تو وہ ایک سوکھی سڑی جیکولین کینیڈی کو ملکہ بنا لیتے ہیں جس کے بدن پر ہر لباس ایسے نظر آتا تھا جیسے ایک ہینگر سے لٹک رہا ہو بلکہ ہینگر سے لٹکے ہوئے لباس میں پھر بھی کچھ جاذبیت ہوتی ہے اور کبھی وہ جیک کینیڈی کو بادشاہ بنا لیتے ہیں جس نے امریکی تاریخ کی سب سے بڑی فاش غلطیاں کیں..بے آف پگز کا کیوبا پر حملہ اور کیوبن میزائل مسئلے پر

دنیا کو ایٹمی جنگ کے قریب لے آنا اس کی واضح مثالیں ہیں..

جب انہیں سچ مچ کی رائلٹی نہیں ملتی تو وہ اپنی رائلٹی خود تخلیق کر لیتے ہیں..اپنے ہیروز کو خدا بنا لیتے ہیں..کھلاڑی..اداکار' گلوکار' ٹیلی ویژن میزبان' فیشن ماڈل' باورچی' کارٹون کردار' بلند عمارتیں' موسیقار' کالم نگار' ارب پتی' فائر فائٹر' فیشن گھر..یہ سب ان کی رائلٹی ہیں اخباروں' رسالوں' ٹیلی ویژن اور بل بورڈز پر یہ بادشاہ اور ملکائیں راج کرتی ہیں..ایلوس پر سلے ایسے بے سُرے گلوکار کا گھر ''گریس لینڈ'' ان کے مقاماتِ مقدسہ میں سے ایک ہے..وہ وہاں پھولوں کے چڑھاوے چڑھا کر منتیں مانتے ہیں اور آنسو بہاتے ہیں..

بیٹلز گروپ کے جان لینن کو وہ روسی لینن سے زیادہ جانتے اور مانتے ہیں..اس نے ایک بار اپنی بوڑھی اور بدہیئت جاپانی بیوی یوکو کے ساتھ سنٹرل پارک میں سیر کی تو پارک کا وہ حصہ اس کے نام سے پہچانا جانے لگا..

اس امریکی رائلٹی میں آپ کو دور دور تک کوئی فلسفی' شاعر' ادیب' مصور یا کلاسیکی گلوکار یا موسیقار نظر نہیں آئے گا..کوئی چومسکی' وِہٹ مین' سٹائن بیک اینڈریو وہائتھ یا روبنسٹائن نظر نہیں آئے گا..

ویسے تو اپنے گریبان میں جھانکنے سے بھی ہمیں وہاں یہی معاملہ ملے گا..البتہ ہمارے ہاں ہیرو کے پیمانے ذرا بدل جاتے ہیں..اور ان میں سے بیشتر قتل و غارت کرنے والے مذہبی جنونی 'تلوار باز' ایٹم بم بنانے والے اور قوم کو بے وقوف بنانے والے ہوں گے..ڈاکٹر عبدالسلام' فیض' منٹو' چغتائی' صادقین یا بڑے غلام علی خان اور روشن آراء بیگم نہ ہوں گے..ایدھی تو ہرگز نہ ہوں گے..لیکن ہم کیوں اپنے گریبان میں جھانکیں ہم نے تو امریکہ کو مطعون کر کے کیڑے نکالنے ہیں..

ان سب کے سوا دراصل امریکہ کی اصل رائلٹی..اصل شاہی مخلوق کوئی اور ہے..جن کے لیے ٹریفک رک جاتی ہے..لوگ ایک جانب ہو کر مؤدب کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ وہ گزر جائیں ان کی شان میں گستاخی نہیں کی جا سکتی..یعنی بوڑھے' بچے' اپاہج اور کتے..بلکہ اول نمبر پر کتے ہیں اور بقیہ شہزادگی ان کے بعد آتی ہے..

بوڑھے اور اپاہج لوگ یہاں وی آئی پی ہیں..

جہاں امریکی صدر یا ریاست کے گورنر کے لیے کچھ بھی نہیں رُکتا وہاں ان کے لیے

ٹریفک رک جاتی ہے..نیویارک کے ففتھ ایونیو پر فٹ پاتھ پر چلتا ہوا ایک نیم اپاہج شخص ہاتھ کا اشارہ کرتا ہے کہ میں سڑک کے پار جانا چاہتا ہوں تو ہر شے تھم جاتی ہے اور وہ لنگڑاتا ہوا اطمینان سے دوسری جانب چلا جاتا ہے یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے..لوگ ان کو راستہ دیتے ہیں..جہاں آس پاس میلوں تک کار پارک کرنے کے لیے جگہ نہیں ہوتی وہاں اپاہج لوگوں کے لیے پارکنگ مخصوص ہے..بسوں میں عقبی دروازہ ان کے لیے وقف ہے..ڈرائیور اپنی نشست سے اٹھ کر کسی بوڑھے یا اپاہج شخص کو سہارا دے کر اندر لاتا ہے..اگر وہیل چیئر پر ہے تو وہ اسے اٹھا کر بس میں رکھتا ہے اور پھر اس شخص کو بٹھا کر اپنی نشست پر واپس جاتا ہے..اور یاد رہے کہ نیویارک بس سسٹم کا ڈرائیور اپنی ذات میں ایک وی آئی پی ہے..اس کی وردی مقدس ہے اور اختیارات لامحدود ہیں جیسے ہمارے ہاں عام طور پر صدر مملکت کے ہوتے ہیں..اگر آپ اس کے ساتھ بحث کریں گے یا شومئی قسمت سے اسے کوئی دھمکی دیں گے تو اگلے دس برس آپ کی قسمت میں قید ہو گی..

ایک اپاہج شخص کسی بھی وقت فون پر اطلاع کر سکتا ہے کہ میں نے شہر میں فلاں مقام پر کسی دوست سے ملاقات کرنی ہے یا کسی ضرورت کے تحت جانا ہے اور یہ فاصلہ اتنا طویل ہے کہ بس یا میٹرو میں سفر کرنا میرے بس کی بات نہیں تو اس کے گھر ایک گاڑی ڈرائیور سمیت پہنچ جائے گی کہ عالی جاہ حکم کیجیے کہاں جانا ہے..

بوڑھوں کے لیے بھی اسی نوعیت کی بے شمار سہولتیں ہیں..

تیسری رائلٹی بچوں کی ہے..

وہ بے شک کتنے ہی بدتمیز اور ناقابل برداشت کیوں نہ ہوں اور وہ اکثر ہوتے ہیں آپ انہیں جھڑک نہیں سکتے..ڈانٹ ڈپٹ نہیں کر سکتے..اور اگر آپ نے انہیں ایک ہلکی سی چپت رسید کر دی اور کسی ہمسائے نے پولیس کو رپورٹ کر دی یا اس بچے نے کر دی تو آپ جیل کی ہوا کے مزے لوٹ سکتے ہیں..

آپ نہایت اطمینان سے نزدیکی شاپنگ سنٹر یا کسی ریستوران کی طرف کار میں جا رہے ہیں تو یکدم آپ کے آس پاس ٹریفک مدھم ہونے لگتی ہے..ایک سراسیمگی سی پھیل جاتی ہے..کاروں کی بریکیں لگ رہی ہیں اور ایک عجیب سی مخلوق پیلی جیکٹیں پہنے ہاتھ میں بورڈ اٹھائے

جن پر جلی حروف میں ''سٹاپ'' لکھا ہوتا ہے آپ کا راستہ روک لیتی ہے..لگتا ہے یہ خلائی مخلوق ہے جو ''سٹاپ'' کا بورڈ دکھا کر آپ کو اغواء کر کے اپنے سیّارے پر لے جائے گی..

ہر نوعیت کی ٹریفک اس مخلوق کو دیکھتے ہی رُک جاتی ہے..

کھلتا یہ ہے کہ یہ بچوں کے کسی سکول کا چھٹی ٹائم ہے..

یہ مخلوق.. پیلی جیکٹوں والی دراصل پارٹ ٹائم مخلوق ہے یعنی ٹریفک روک کر سکول سے ابلتے ہوئے بچوں کو سڑک پار کروانے والے لوگ ہیں..ان میں سے بیشتر بوڑھے ہیں..کچھ گھریلو خواتین ہیں جو چند ڈالر کمانے کے لیے آ گئی ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو مقامی جیل سے آئے ہیں.. جن کی سزا میں چند ماہ رہ گئے ہیں تو انہیں باہر کی ہوا لگوانے کے لیے یہ ڈیوٹی سونپ دی جاتی ہے..

اور جن چھوٹے شیطانوں کے لیے یہ تردّد کیا جا رہا ہے..وہ بیشتر نہایت بدتمیز' سائیکلوں پر' رولر سکیٹس پر..کانوں پر پلگ لگائے موسیقی سنتے اور سر دھنتے..چیونگم چباتے..شہزادوں کی مانند اپنی من مرضی سے کہیں سے بھی سڑک پار کرنے لگتے ہیں..ایک کار سوار کے لیے یہ سب سے بڑا خطرہ ہوتے ہیں کہ آپ کی کار آپ کے بس سے باہر بے قابو ہو کر اگر امریکی صدر کو جا ٹکرائے اور اسے زندگی بھر کے لیے اپاہج کر دے تو بھی آپ کے بچ نکلنے کے امکانات ہو سکتے ہیں لیکن اگر آپ کی کار ایک بچے کو چھو بھی گئی ہے تو آپ زندگی بھر کے لیے گئے..

اسی طور امریکہ میں سکول کی پیلی بس بھی خطرے کا سب سے بڑا نشان ہے..یہ بس بچوں کو بٹھانے کے لیے کہیں بھی رک سکتی ہے..رکتی ہے تو اس کے پہلوؤں میں سے ''سٹاپ'' کے سرخ نشان برآمد ہو جاتے ہیں اور پھر آس پاس کی ہر شے تھم جاتی ہے جب تک وہ رکی رہے گی ٹریفک کی کائنات رکی رہے گی..وہ چلے گی تو نظامِ ہستی اس کے پیچھے پیچھے چلے گا..

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں امریکی بچے اپنے ان حقوق سے آگاہ ہونے کے باعث خاصے بدتمیز اور بے ہودہ ہوتے ہیں..میں اُس روز مجسمہ آزادی کی جانب جانے والی فیری پر سوار تھا اور وہاں ایک صاحب ہیں جن کا لہجہ غیر ملکی ہے لیکن ان کے بچوں کا لہجہ سراسر امریکی ہے تو ان میں ایک دس برس کی بچی ایسی ہے کہ خواہ مخواہ اس کی پٹائی کرنے کو جی چاہے..بے وجہ ضد کر رہی ہے..ریں ریں کرتی منہ بسورتی مسافروں کو زچ کر رہی ہے اور چپ ہونے کا نام نہیں لیتی..چپس کے پیکٹ اپنے والد صاحب کے منہ پر مار رہی ہے اور والد صاحب ہیں کہ دانت پیستے کچکچاتے

تحمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں..میرے سامنے اس بچی نے ابا جی کے پاؤں پر اپنا پاؤں اس زور سے پٹخا کہ وہ بلبلا اٹھے..لیکن اس کے باوجود نہ اسے ڈانٹا اور نہ ہی جھانپڑ رسید کرنے کے لیے ہاتھ کو خفیف سی بھی حرکت دی جب کہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس بچی کی مناسب پٹائی کر دوں..اس کے باوجود والد صاحب کبھی مسکراتے ہیں کبھی اس کی منت سماجت کرتے ہیں پر نہ ڈانٹتے ہیں اور نہ ہاتھ اٹھاتے ہیں..اگر وہ ایسا کرتے تو پولیس تو شاید بعد میں آتی پہلے فیری میں سوار مسافر نہ صرف انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے کہ ہائے ہائے ایک بچی کو ڈانٹتے ہو بلکہ شاید زدوکوب بھی کرتے..

بچوں کے حقوق کی انتہا یہ ہے کہ اگر ایک سکول جانے والا بچہ فون اٹھا کر مقامی پولیس کو اطلاع کر دے کہ جناب دوہائی ہے میرے ابا جی میری پٹائی کرنے کی خاطر ہاتھ اٹھانے کا ارادہ کر رہے ہیں تو ابا جی فوراً اندر..

اسی سلسلے میں ابھی کچھ عرصہ پیشتر کراچی ائیرپورٹ پر ایک ایسا منظر نظر آیا تھا جو اپنے پاکستان میں ایک معمول کی بات ہے اور اس منظر کی ریہرسل گلی محلوں اور گھروں میں ہوتی ہی رہتی ہے..البتہ یورپ سے آنے والی فلائٹ پر سے اترنے والے ایک باپ بیٹے کے درمیان ایسا منظر قدرے غیر معمولی تھا..یعنی یہ باپ بیٹا نہایت نارمل انداز میں جہاز سے اترے لیکن جونہی وہ کسٹم اور پاسپورٹ وغیرہ کی چیکنگ کے بعد ائیرپورٹ کے لاؤنج میں پہنچنے لگے تو والد صاحب بنا کسی تردّد کے اپنے ٹین ایج برخوردار کو دھما دھم پیٹنے لگے..برخوردار آگے آگے اور بزرگوار نہایت غضبناک حالت میں چنگھاڑتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے اور اسے للکار رہے ہیں کہ..کم بخت اب بلا پولیس کو..خبیث..دیوث کے بچّے..برطانوی شہری بنا پھرتا ہے..برخوردار جب قابو آ جاتا تو اسے ایک اور جھانپڑ رسید کر کے کہتے اب بلا پولیس کو..بچّے اب ہم پاکستان میں ہیں تمہارے برطانیہ میں نہیں ہیں ناخلف..اس ناخلف کی جب مناسب مرمت ہو چکی تو اس منظر کے تماشائیوں نے مناسب جانا کہ کافی ہو چکی ہے چنانچہ انہوں نے معاملہ رفع دفع کرانے کی کوشش کی تو والد صاحب نے باقاعدہ آنسو بہاتے ہوئے کہا دیکھئے ہم انگلینڈ میں رہتے ہیں اس ناخلف کو میں ہلکا سا تھپڑ بھی رسید کر دیتا تھا تو یہ مجھے دھمکیاں دیتا تھا میں پولیس کو بلا لوں گا اور ایک بار اس نے فون کر کے بلا بھی لیا اور مجھے پولیس سٹیشن لے گئے اور ایک رات حوالات میں رکھا کہ شاید یہ کوئی نفسیاتی مریض ہے..یہ ہے آج کل کی اولاد..

چنانچہ قابل فہم طور پر امریکہ میں آباد پاکستانی اپنے بچوں پر ہاتھ اٹھانے سے گریز کرتے ہیں اور ان میں سے بعض اس دن کا انتظار کرتے ہیں جب وہ کراچی یا لاہور ائیرپورٹ پر اپنے برخوردار کے ہمراہ اتریں گے.. اور پھر دل کے ارمان پورے کریں گے.. لیکن جیسا میں نے عرض کیا اصل رائلٹی کتے ہیں..

آپ بے شک ایک انسان کے منہ لگیں نہ لگیں ایک کتے کے منہ لگنا ایک اعزاز ہے.. ہر گوری اتنی بار اپنے بوائے فرینڈ یا خاوند کے منہ نہیں لگتی جتنی بار وہ اپنے کتے کے منہ لگتی ہے.. اور کتے کو منہ لگا کر جب وہ اپنے بوائے فرینڈ یا خاوند سے رجوع کرتی ہے تو اسے کہتی ہے کہ سویٹ ہارٹ تم ذرا اپنے دانتوں کو اچھی طرح برش کر کے آؤ تمہارے منہ سے بو آ رہی ہے.. اسے اس نوعیت کی شکایت کبھی کتے سے نہیں ہوتی اور اس قسم کی کتا بوسی بر سر عام ہوتی ہے.. آپ نہایت آسانی سے سنٹرل پارک یا پارک ایونیو میں ٹہلائے جانے والے کتوں کے منہ پر دنیا کی مہنگی ترین لپ سٹکوں کے نشان ملاحظہ کر سکتے ہیں.. ہمارے زمانوں میں یعنی نوجوانی کے زمانوں میں گلوکارہ کونی فرانسس کا ایک گیت ''لپ سٹک آن یور کالر'' بہت مشہور ہوا تھا اور یار لوگ اس کی دھن پر رقص کرتے پاگل ہو جاتے تھے.. اور کوشش کرتے تھے کہ ان کی قمیص کی کالر پر بھی لپ سٹک کا سرخ نشان ہو جو تبھی ہو سکتا تھا اگر خاتون اناڑی ہو ورنہ نشانہ کہاں چوکتا ہے.. ہم بھولے بادشاہ تو یہ سمجھتے تھے کالر سے مراد قمیص کا کالر ہے.. اب جا کر کھلا ہے کہ کالر تو کتے کا ہوتا ہے.. اس کے گلے کا پٹہ' کالر ہی تو کہلاتا ہے.. چنانچہ سنٹرل پارک اور پارک ایونیو میں ٹہلائے جانے والے کتوں کو دیکھ کر وہ گیت پھر سے یاد آتا تھا.. لپ سٹک آن یور کالر..

کتوں کے بیوٹی سیلون اور نہلانے دھلانے' ناخن کاٹنے.. شیمپو کر کے بال سنوارنے اور سجانے کے قصے تو پرانے ہو چکے.. ابھی پچھلے دنوں سی این این پر مختلف منافع بخش پیشوں کے حوالے سے ایک پروگرام دکھایا جا رہا تھا اور اس میں ایک آٹھ ماہ کا کورس تھا جس کے دوران آپ صرف کتوں کی نفسیاتی الجھنوں کو حل کرنے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں.. ایک طالب علم کا کہنا تھا کہ اگرچہ اسے کتے اتنے پسند نہیں لیکن اتنے مختصر کورس کے بعد اتنی زیادہ کمائی کسی اور پیشے میں نہیں.. مثلاً ایک کتا صبح سویرے رنجیدہ نظر آ رہا ہے.. چھت کو گھورتا جا رہا ہے شاید زندگی کی بے ثباتی پر غور کر رہا ہے یا اپنی خودی کو بلند کر رہا ہے.. آپ اسے گدگدیاں کرتے ہیں' چومتے ہیں.. گردن کے

نیچے سہلاتے ہیں اور اس کے باوجود وہ رنجیدہ اور اداس رہتا ہے تو آپ اتنے کٹھور تو نہیں ہوں گے کہ چند سو ڈالر بچانے کے لیے اس کا نفسیاتی علاج کروانے سے گریز کریں یا پھر آپ کی ڈارلنگ کتیا ایک نہایت ہینڈسم کتے کے قریب سے گزرتی ہے اور ہیجان میں آ کر اپنی دم بھی کھڑی نہیں کرتی تو نفسیاتی چارہ گروں کے پاس اس کا بھی تو کوئی علاج ہو گا..

امریکہ اور یورپ میں جہاں انسانی حقوق کی تنظیمیں ہیں وہاں کتوں کے حقوق کے لیے بھی متعدد سوسائٹیاں ہیں جو ہمہ وقت سرگرم عمل رہتی ہیں اور ان کی تنقید کا نشانہ زیادہ تر کوریا کے لوگ ہوتے ہیں کیونکہ وہ کتوں کو کھاتے ہیں.. چشمہ بیراج کی تعمیر کے دوران ایک کوریائی کمپنی بھی اس پروجیکٹ میں شریک ہوئی.. جہاں اس کمپنی کی رہائشی کالونی تھی چند ہفتوں میں ان کے آس پاس کے دیہات میں کتوں نے بھونکنا بند کر دیا صرف اس لئے کہ وہ کورین اُن سب کتوں کو نوش کر گئے.. یہ خبر کچھ دور دراز کے دیہات تک پہنچی تو وہاں سے دیہاتیوں کے ڈیلی گیشن آنے لگے کہ پلیز کبھی ہمارے گاؤں میں بھی قدم رنجہ فرمائیے ہم آوارہ کتوں سے بہت تنگ آ چکے ہیں.. مجھے نہیں معلوم کوریائی لوگ کتوں کو کیسے کھاتے ہیں.. کون سی ڈشیں بناتے ہیں.. کتا کڑاہی.. کتا روسٹ.. کتا پالک' کتا گوبھی یا کتا برگر بناتے ہیں لیکن مجھے یہ معلوم ہے وہ نوڈل سوپ کے بجائے پوڈل سوپ بناتے ہیں..

بلھے شاہ نے اگر یہ کہا تھا کہ.. کتے تیتھوں اتے.. تو امریکی کتوں کے بارے میں کہا تھا جو انسانوں سے کہیں بلند درجات پر فائز ہیں..

نیویارک میں میرے سب سے پسندیدہ.. خوش نما اور آرٹسٹک علاقے گرین اچ ولیج میں آوارہ گردی کی ایک شام میں ایک دکان ایسی دیکھی جس کے شوکیس میں طرح طرح کے ماڈل کتے تھے جو نہایت دیدہ زیب سویٹر پہنے نمائش پر تھے ان کے چمڑے کے پٹے بھی سویٹروں کے رنگوں سے میچ کرتے تھے.. نیویارک میں اگر گرمی آتی ہے تو ائیر کنڈیشنر دن رات چلتے ہیں اور اگر سردی پڑتی ہے تو قیامت کی پڑتی ہے چنانچہ اس سردی کو سہارنے کے لیے کتوں کے کیسے کیسے خوش نظر رنگوں کے اونی سویٹر ڈیزائن کئے گئے تھے.. ان سویٹروں کی قیمت اتنی ہوش ربا تھی کہ انہیں انسان نہیں صرف کتے پہن سکتے تھے.. ادھر ہماری پسماندگی ملاحظہ کیجیے کہ اگر اتفاق سے ہمارے گھر میں ایک پالتو کتا ہے اور سردی شدید ہے اور ہم اس کے لیے بہت ہی رقیق القلب ہو

جائیں تو زیادہ سے زیادہ اسے لنڈے بازار سے خرید کر کوئی پرانا سویٹر چڑھا دیتے ہیں.. یوں بھی ہم تیسری دنیا کی اقوام کا امریکہ اور یورپ سے کیا موازنہ.. ان کے کتے بھی ہم سے اچھے.. ہم سے اوپر.. ان کے کتوں کے کالروں پر دنیا کی مہنگی ترین لپ سٹک کے نشان اور ہمارے کتے ہم جیسے.. گلیوں کے آوارہ بے کار کتے.. پاکستان بھر کے کتے.. فیض کے کتے..

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوق گدائی
زمانہ کی پھٹکار سرمایہ ان کا
جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی
نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اکتا کر مر جانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے۔

یہ کتے جن کی شان میں بیان کر رہا ہوں.. یہ ہماری گلیوں کے.. جن گلیوں میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں.. آوارہ اور بے کار کتے نہیں..

نہ ہی یہ ذوق گدائی سے آشنا ہیں کہ انہیں تو چاندی کی طشتری میں ہر شے پیش کی جاتی ہے.. ذوق گدائی تو ہماری قسمت میں لکھا گیا..

زمانے کی پھٹکار بھی ہم پر..
جہاں بھر کی دھتکار بھی ہم پر..

غلاظت میں گھر ہم کرتے ہیں.. نالیوں میں بسیرے ہمارے ہیں، ٹھوکریں ہم کھاتے ہیں اور فاقوں سے اکتا کر ہم مرجاتے ہیں..

کوئی احساس ذلت دلانے کے لیے آتا ہی نہیں.. کوئی ہماری سوئی ہوئی دم ہلاتا ہی نہیں.. اور شاید کوئی آئے بھی نہ.. اگر آنا ہوتا تو آچکا ہوتا..

تو ہم کیا.. ہمارے کتے کیا!

ویسے امریکہ میں بھی مظلوم کتے ہیں اور اُن پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے جاتے ہیں کہ دل خون ہوتا ہے.. میرے امریکی تصویری البم میں ٹائمز سکوئر میں کھینچی ہوئی ایک ایسے ہی مظلوم السیشن کتے کی تصویر چسپاں ہے جو رنجیدہ اور المناک بُوتھی بنائے فٹ پاتھ پر سے گزرنے والوں کو بے چارگی سے تک رہا ہے.. آنکھیں بجھی ہوئی.. شکل پر اُن مظالم کی پرچھائیاں جو اس پر ڈھائے گئے.. اس کے برابر میں ایک بورڈ پر ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر اس کا نوحہ بیان کرتی ہے..

''یہ کتا کوڑے کے ایک ڈھیر پر لاچار پڑا سسک رہا تھا.. یہ کئی روز سے بھوکا تھا اور مرنے کے قریب تھا.. کوئی تہذیب سے عاری وحشی شخص اسے وہاں اکیلا چھوڑ گیا تھا.. اس بے چارے کتے کو کوڑے کے ڈھیر سے نکال کر اس کی تیمارداری کی گئی.. اس کا علاج کیا گیا اور کھلایا پلایا گیا.. نہلایا گیا لیکن یہ ابھی تک سکتے کی حالت میں ہے.. بھونکتا تک نہیں.. دُم بھی نہیں ہلاتا.. ایسے ہولناک تجربے کے بعد یہ نارمل نہیں ہوسکا.. دُم تک نہیں ہلاتا.. اور ایک نفسیاتی مریض بن گیا ہے جو اپنا ماضی نہیں بھول سکتا.. اس کا علاج کروانے کے لیے.. اسے نارمل زندگی کی طرف لوٹانے کے لیے محض ڈھائی ہزار ڈالر درکار ہیں.. آپ بے شک دو تین ڈالر عنایت کر دیں.. آپ یہ تو نہیں چاہیں گے ایک معصوم کتا ہمیشہ کے لیے ایک نفسیاتی مریض بن جائے اور کبھی نہ بھونکے.. کبھی دُم نہ ہلائے.. اگر آپ یہ نہیں چاہتے تو دل کھول کر اس مظلوم کی مدد کیجیے..''

کتے کے آگے ایک چھوٹا سا ڈبّہ دھرا ہے..

فٹ پاتھ پر چلتے لوگ کتے کو ایک پُرملال کیفیت میں لاچار دیکھ کر رکتے ہیں..اس کی حالتِ زار کے بارے میں بورڈ پر پڑھتے ہیں اور ہر دوسرا شخص محض اس کا نفسیاتی علاج کروانے کی خاطر حسبِ مقدور چند ڈالر ڈبّے میں ڈال دیتا ہے..قریب ہی کتے کا رکھوالا آہنی جنگلے کے ساتھ ٹیک لگائے بیئر کے ایک ٹن میں سے گھونٹ بھر رہا ہے اور ڈالروں سے لبریز ہوتے ڈبّے پر نظر رکھے ہوئے ہے..میں ایسا کٹھور دل تھا کہ اس مظلوم کتے پر ترس نہ کھا سکا..اس جیسے لاکھوں کتے ہمارے ہاں مظلوم تھے..فٹ پاتھوں' گلیوں' کوٹھڑیوں میں بجھی بجھی آنکھوں والے' بھوکے اور بے بس..اگرچہ وہ کہلاتے انسان تھے..تو اس لمحے ٹائمز سکوئر کے فٹ پاتھ پر بٹھائے گئے اس کتے کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک عجیب سوال آیا کہ اگر اس فٹ پاتھ پر تیسری دنیا کے ایک سچ مچ کے بھوکے' ناتواں اور بیمار بچے کو بٹھا دیا جائے جو اپنی قحط زدہ بڑی بڑی آنکھوں اور پچکے پیٹ کے ساتھ لوگوں کو دیکھے تو اس کے برابر میں جو بورڈ آویزاں ہو اس پر کیا عبارت ہوگی..

''یہ بچہ کوڑے کے ایک ڈھیر پر پڑا سسک رہا تھا..چونکہ قحط زدہ علاقوں کے کتے بھی فاقہ زدہ ہوتے ہیں اس لیے چند ایسے کتے اسے سونگھ رہے تھے..یہ کئی روز سے بھوکا تھا..ویسے یہ دس برس کا ہے لیکن مسلسل بھوک کی وجہ سے سکڑ کر پانچ برس کا ہو گیا ہے..اس کے والدین اسے وہاں پھینک گئے تھے کیونکہ وہ اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے..یوں بھی مرنے کے بعد اس کی لاش کو دبانے کے لیے ایک گڑھا کھودنا ان کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ وہ بھی بھوکے تھے..اسے کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر اس کی تیمارداری کی گئی ہے..کھلایا پلایا گیا ہے لیکن سب کچھ اگل دیتا ہے کہ اس کے معدے کو خوراک قبول کرنے کی عادت نہیں رہی..اس ہولناک تجربے نے اُسے ایک نفسیاتی مریض بنا دیا ہے چنانچہ اس کا علاج کروانے کے لیے..''

سوال میرے ذہن میں آیا کہ کیا تب بھی اس فٹ پاتھ پر چلنے والے خوش باش اور بے فکرے لوگ اس کے سامنے دھرے ڈبّے میں کچھ ڈالیں گے یا گزر جائیں گے کہ یہ تو ایک بچہ ہے کتا نہیں..یوں بھی یہ ایک بچہ تو نہیں لاکھوں کروڑوں ہیں تو اتنے ڈھیر سارے بچوں کی بھوک

اور بیماری کون دور کرے..فرض کیجیے اس بچے کے سامنے دھرے ڈبّے میں لاکھوں' ڈالر ڈال دیئے جاتے ہیں تو بھی کیا گارنٹی ہے کہ یہ رقم اس کی بہبود پر صرف کی جائے گی..اس کے آبائی ملک کے بے ایمان لیڈر اسے اپنے سوئس اکاؤنٹ میں جمع نہیں کروا دیں گے..یہ بھی تو ممکن ہے اس بچے کو انہی لیڈروں نے وہاں بٹھا رکھا ہو تاکہ وہ ان کے لیے ''کمائی'' کرتا رہے..

یہاں اُس عراقی بچے کو بھی بٹھایا جا سکتا ہے جس کی دونوں ٹانگیں اور دونوں ہاتھ امریکی حملے کے دوران اس کے بدن سے الگ ہو کر اس کے گھر کے کھنڈر میں ایک دیوار کے ساتھ چپک گئے تھے..جانے وہ بچ کیسے گیا تھا اور اب گوشت کا بنا ہوا نامکمل لوتھڑا سا لگتا تھا..تو اگر اس بچے کو یہاں بٹھا دیا جائے..نہیں وہ بیٹھ تو نہیں سکے گا البتہ اسے ریلنگ کے سہارے وہاں چند لمحوں کے لیے قائم کیا جا سکتا تھا....وہ لڑھک کر اوندھے منہ گر جائے تو یہ بھی ایک دردناک پوز ہوگا..تو اس کے برابر میں جو بورڈ آویزاں کیا جائے گا اس پر کیا عبارت ہوگی..سب جانتے ہیں کہ کیا عبارت ہوگی..تو کیا اس کے سامنے رکھے ڈبّے میں بھی کچھ ڈالر ڈالے جائیں گے یا نہیں..ویسے یہ مفروضہ کہ ٹائمز سکوئر کے فٹ پاتھ پر ایک لوتھڑے بچے کی نمائش کی جائے قابلِ عمل نہیں کیونکہ اسے انسانیت کی تذلیل قرار دے کر اسے فوری طور پر وہاں سے ہٹا دیا جائے گا..یہ مفروضہ میں نے بہت بعد میں ایک پاکستانی نژاد امریکی کے سامنے رکھا تو وہ کہنے لگا ''تارڑ صاحب یقین کیجیے عام امریکی نہایت ہی حساس اور نرم دل کا مالک ہے..وہ اس بچے کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیں گے..آپ جانتے ہیں کہ عراق جنگ کے خلاف امریکہ میں مظاہرے ہوتے رہتے ہیں جن میں لاکھوں لوگ شرکت کرتے ہیں جو صدر بش کو ایک جنگی مجرم گردانتے ہیں اس پر جنگی جرائم کے ارتکاب کا مقدمہ چلانا چاہتے ہیں..بے شمار ایسی تنظیمیں ہیں جو اس جنگ کی ہولناکیوں کے شکار بچوں کے لیے فنڈز جمع کرتی ہیں..ایسے بچوں کے اخراجات برداشت کر کے انہیں امریکہ لا کر علاج کرواتی ہیں..'' جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے..چاہے ایک کتے کے لیے کرے چاہے ایک عراقی بچے کے لیے کرے..

چنانچہ امریکہ میں کتوں کا سٹیٹس ایک رائلٹی کا ہے..

مجھے شاید کسی نے انتباہ کیا تھا یا یونہی یہ خیال میرے ذہن میں جڑیں پکڑ گیا تھا کہ اگر امریکہ میں آپ کسی کتے کی جانب گھور کر دیکھیں تو اس کا مالک آپ پر ہتکِ عزت کا دعویٰ کر سکتا

ہے یعنی کتے کی ہتک عزت کا.. کہ اس کا دل دکھایا گیا چنانچہ جب میں اپنی بیٹی کے ہاں اور لینڈو گیا تو صبح کی سیر کے دوران احتیاطاً ہر کتے کو نہایت الفت بھری نظروں سے دیکھتا اور پھر بعد میں اس کے مالک یا مالکن کو واجبی سا ''گڈ مارننگ'' وغیرہ کہہ دیتا.. بلکہ اکثر اوقات جی چاہتا ہے کہ کتے کو عزت مآب کہہ کر مخاطب کیا جائے کہیں عزت میں کوئی کسر نہ رہ جائے..

آرلینڈو میں صبح کی سیر اپنے کتوں کے ہمراہ کرنے والے امریکیوں میں میری مقبولیت کا بنیادی سبب یہی تھا..

میرے داماد بلال کو جب خبر ہوئی کہ اس کے سسر صاحب سیر کرتے ہوئے ہر کتے کو جھک جھک کر ملتے ہیں تو وہ کہنے لگا ''انکل ہمارے قانون میں کہیں کوئی ایسی شق نہیں ہے جس کے تحت کتے کو محض گھورنے سے آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جا سکے آپ کو کس نے بتایا تھا؟''

''پتا نہیں..''

''انکل آپ بے شک کتوں کو گھور کر دیکھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا..''

اور یہ مجھ سے نہ ہو سکا کہ اس دوران مجھے ''کتوں کی عزت کرنے کی عادت ہو چکی تھی..

صرف گھورنے سے تو نہیں البتہ اگر آپ اپنے پالتو جانور کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں.. اس کی بہبود سے لاپروائی برتتے ہیں اور کوئی ہمسایہ شکایت کر دیتا ہے تو مظلوم جانوروں کی مدد کرنے والے سرکاری اہلکار آپ کے گھر پر چھاپہ مار کر آپ کو گرفتار کر سکتے ہیں.. یعنی ایک لاغر بلی آپ کو جیل بھجوانے کے لیے کافی ہے..

کتے مجھے بھی پسند ہیں..

ہمارا اولین اور نہایت ہی دل پسند کتا سیاہ رنگ کا ایک السیشن تھا جس کا نام میں نے شیری یعنی ڈارلنگ رکھا تھا.. شکل سے نہایت خونخوار اور چیر پھاڑ جانے والی خصلت کا کتا تھا.. ایک بار میرے ایک عزیز دوست میرے گھر میں جھانک کر اور شیری کو وہاں ٹہلتے دیکھ کر فوری طور پر جھنگ واپس چلے گئے اور وہاں سے مجھے خط لکھا تارڑ بھائی فلاں روز میں خصوصی طور پر آپ سے ملنے کے لیے حاضر ہوا تھا لیکن آپ نے جو سیاہ رنگ کا بھیڑیا پال رکھا ہے اس کی غرّاہٹ نے مجھے

خوفزدہ کر دیا اور میں واپس چلا آیا.. میں نے بعد میں قریشی صاحب کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ بھائی جان وہ تو محض ایک سیاہ بالوں والا کتا ہے بھیڑیا ہرگز نہیں لیکن قریشی صاحب نے مجھے ایک طنزیہ مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے کہا ''تارڑ صاحب.. میں پرنسپل رہا ہوں کالجوں کا.. ڈائریکٹر رہا ہوں محکمہ تعلیم کا.. کیا آپ مجھے اتنا گاؤدی سمجھتے ہیں کہ میں ایک کتے اور بھیڑیئے میں بھی تمیز نہیں کر سکتا.. بھیڑیا تھا..''

اور یہ نامعقول بھیڑیا ایسا تھا کہ گھر کی چوکیداری کے فرائض تو خیر کیا سرانجام دیتا.. گلی محلے میں کہیں ایک خفیف سا پٹاخا بھی چل جاتا تو موصوف فی الفور لرزتے ہوئے پلنگ کے نیچے گھس جاتے.. اور بچوں کے لاکھ بہلانے.. پیار کرنے پچکارنے کے باوجود باہر نہ آتے.. نہایت خوفزدہ اور معصوم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے رہتے کہ ہماری جان پر بنی ہے اور تم ہمیں باہر آنے کو کہتے ہو.. چنانچہ اپنی پناہ گاہ میں دبکے رہتے.. تو ایک روز ایک نہایت خوش ادا' متموّل اور انگریزی میں نہائی دھوئی بیگم صاحبہ نے ہمارے شیری کو دیکھ کر بے اختیار ''ہاؤ کیوٹ'' کہا اور وہ اسے چوم بھی سکتی تھیں اور انہوں نے میری شدید دیسی بیوی کو جو اب بھی دال چاول ہاتھ سے کھاتی ہے کہا کہ جی میں تو اپنے کتے کو صرف امپورٹڈ ٹن فوڈ پر پالتی ہوں تو آپ کس چیز پر پالتی ہیں تو میری بیگم نے ناک چڑھا کر کہا کہ میں تو اسے بچی کھچی روٹیوں اور سالن پر پالتی ہوں اور اگر نخرے کرے تو دو جوتے لگا دیتی ہوں' سیدھا ہو جاتا ہے اس طرح پالتی ہوں.. صد شکر کہ میری بیوی امریکہ میں نہیں ہے ورنہ کب کی جانوروں پر ظلم ڈھانے کے جرم میں اندر ہو چکی ہوتی.. ایک مرتبہ میرے ایک سکول فیلو شوکت اسلام اپنی متعدد انگریز بیٹیوں کے ہمراہ میرے گھر تشریف لائے اور ان کی بیٹیاں شیری پر یوں نچھاور ہوئیں کہ اسے ہمہ وقت چومتی رہیں.. وہ تو چلی گئیں لیکن شیری صاحب کو چسکا پڑ گیا اور انہیں جب بھی موقع ملتا ہم سے بوس و کنار کی کوشش کرتے.. چنانچہ بیگم نے انہیں پھر جوتے لگائے اور وہ سیدھے ہو گئے..

میں نے جو اپنی ''شیری کہانی'' سنائی ہے تو میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مجھے کتوں سے چنداں بغض نہیں.. اپنے ہم عصروں سے بے شک ہو لیکن ان وفادار جانوروں کا میں بے حد مداح ہوں لیکن.. امریکہ میں ایک منظر ہر مقام ہر شہر ہر پارک میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مجھے ابکائیاں آنے لگتی تھیں..

آپ اپنے کتے کو بے شک روزانہ سیر پر لے جائیے تاکہ اس کی ورزش ہو سکے وہ درختوں کے تنوں' کھمبوں کو سونگھ اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر ان پر چھڑکاؤ کرے لیکن قانونی طور پر وہ عوامی جگہوں پر پاٹی نہیں کر سکتا.. اب کسی بھی کتے کو چاہے کہ وہ کتنا ہی تہذیب یافتہ کیوں نہ ہو یہاں تک کہ امریکی ہو تب ہی اتنی تربیت تو نہیں دے سکتے کہ وہ حوائج ضروریہ سے فارغ ہونا ہی ترک کر دے..

چنانچہ ہر عوامی مقام پر' بڑے چوکوں میں اور خاص طور پر پارکوں میں ایک ڈبہ آویزاں ہوگا جس میں کتے کی پاٹی کے لیے مناسب پلاسٹک بیگ مفت مہیا ہوگا.. یعنی اگر آپ گھر سے لانا بھول گئے ہیں تو..

اب یہ شاندار منظر کچھ یوں بنتا ہے کہ جیسے' جب سے تو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے اور سنگ ہر شخص نے اٹھا رکھا ہے تو ایسے یہاں کتوں کے جتنے دیوانے ہیں انہوں نے اپنے ہاتھوں میں پلاسٹک کے بیگ اٹھا رکھے ہیں جن میں وہ کالے بھورے موتی جوان کا کتا جھاڑیوں' فٹ پاتھوں اور پارکوں میں بکھیرتا ہے صاف دکھائی دیتے ہیں وہ ان موتیوں کو اٹھا اٹھا کر اس بیگ میں جمع کرتے رہتے ہیں اور وہاں وہ اتنے غیر تہذیب یافتہ بھی ہرگز نہیں کہ یہ لیسدار موتی ننگے ہاتھوں سے چنیں بلکہ وہ پلاسٹک کے دستانے پہنے ہوئے ہوتے ہیں..

اگرچہ اس قانون کی خلاف ورزی بھی ہوتی رہتی ہے یعنی اگر آس پاس کوئی دیکھنے والا نہیں تو ایک اچھے امریکی کی طرح آپ اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان انمول ہیروں کو جمع نہیں کرتے جھاڑیوں اور فٹ پاتھوں پر پڑا رہنے دیتے ہیں..

مجھے اس طریقۂ کار سے قطعی طور پر اختلاف نہیں.. یہ امریکیوں کی سماجی شعور کی دلیل ہے لیکن میں ایک نہایت دل پذیر' ہزاروں ڈالر کے لباس میں خوش بدن ایک نیویارکر کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کے ہاتھوں میں پلاسٹک کا ایک بیگ ہے جس میں سے اس کے ذاتی کتے کی پاٹی کے کوفتے سے دکھائی دے رہے ہیں..

یہ نیویارکر خاتون بے شک مارلن منرو کی جڑواں بہن ہو اگر بفرض محال مجھ عمر رسیدہ گرزلی ریچھ پر دل و جان سے فدا ہو جائے اور مجھے اپنے سنٹرل پارک پر کھلتے پینٹ ہاؤس میں لے جا کر جو چاہے اپنے حسن کرشمہ ساز سے کرنے کی پیشکش کرے تو بھی میں نہایت ناآسودگی

کے باوجود انکار کر دوں کہ اس کے ایک ہاتھ میں میرا ہاتھ ہوگا اور دوسرے ہاتھ میں وہ کوفتوں والا پلاسٹک بیگ.. یہ تو ہو سکتا ہے انگریزی محاورے کے مطابق کہ مجھ سے محبت کرو اور میرے کتے سے بھی.. لیکن اس کے آگے جانے میں دو چار سخت کام آتے ہیں اور وہ اتنے سخت نہیں ہوتے قدرے لیسدار اور بدبودار ہوتے ہیں..



''ہارلم.. بلیک اِز بیوٹی فل''

''ایک غلام.. نیلام گھر میں..
میں بولی لگانے والے کی مدد کر سکتا ہوں..
حضرات' آپ اس عجیب وغریب شے کو دیکھئے..
آپ جتنی بھی بولی لگائیں گے اس کے لیے کم ہوگی.
ذرا اعضاء تو ملاحظہ کیجیے..
نہایت چالاک' تنے ہوئے' پھڑکتے ہوئے..
میں انہیں برہنہ کردوں گا آپ کے ملاحظہ کیلئے..
ایک غلام.. نیلام گھر میں''

(والٹ وِہٹ مین)

''ایک گٹھڑی.. (بستہ) نوجوان تنومند نیگرو مردوں کی جن میں سے ایک مرکّب شراب بنانے کا ماہر ہے اور دو نوجوان چھوکریاں فاحشہ قسم کی اور دو لڑکیاں جن میں سے ایک سلائی کڑھائی کی ماہر ہے اور اس کی سفارش کی جاسکتی ہے کہ یہ خریدنے کے لائق ہے.. یہ سب برائے فروخت ہیں..''

(نیویارک جرنل 23 جون 1768ء میں شائع شدہ ایک اشتہار)

یہی نیگرو جنہیں دو چار کی صورت میں گروپ نہیں کہا جاتا تھا ایک گٹھڑی کہا جاتا تھا جیسے

بے جان اور بے روح اشیاء کی ایک گٹھڑی ہوتی ہے.. یہی تنومند نیگرو اور نوجوان چھوکریاں جنہیں بازار میں.. نیلام گھروں میں فروخت کیا جاتا تھا' جو انہیں خریدتے تھے ان کے آقا تھے' یہی تنومند نیگرو.. انہی گوروں کو فروخت کر رہے ہیں.. خود بلیک ہیں تو انہیں بلیک میل کر رہے ہیں.. سب وے یا کسی پبلک ٹرانسپورٹ میں بیٹھتے ہیں تو جان بوجھ کر اپنا تنومند بدن پھیلا کر بدتمیزی سے بیٹھتے ہیں اور کوئی بھی گوری رنگت والا یہ جرأت نہیں کرتا کہ وہ ان کے برابر میں بیٹھ جائے یا انہیں ذرا سرکنے کے لیے کہے تاکہ وہ بھی نشست پر بیٹھ جائے.. گوری رنگت والے سب وے یا بس میں کھڑے رہیں گے لیکن ایک پوری نشست پر براجمان کسی نیگرو کے ساتھ بیٹھنے سے اجتناب کریں گے.. یہ نہیں کہ وہ سیاہ فام ان کو کھا جائے گا یا چھرا گھونپ دے گا.. نہیں.. بس وہ ان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھے گا.. وہ مجرم محسوس کرتے ہوئے اس کی نظروں کی تاب نہیں لاسکیں گے کہ ان کی روح کی گہرائیوں میں وہ اب بھی حقیر اور بے توقیر ہے.. ابھی تک ایک گٹھڑی.. برائے فروخت شے ہے لیکن اب وہ اسے فروخت نہیں کر سکتے.. اس کے برابر میں بیٹھنے سے ان کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے..

یہی تنومند نیگرو نا آسودہ گوریوں کی کمائی پر شراب پیتے ہیں.. بیکار پڑے رہتے ہیں اور راتوں کو ایسے باکار ہوتے ہیں کہ گوریاں عش عش کر اٹھتی ہیں بلکہ اٹھتی نہیں لیٹی رہتی ہیں.. نہ صرف ان کے اَن گھڑے' غیر تہذیب یافتہ جانور بدنوں میں جادو ہے بلکہ ان کی زبانیں بھی کُھردری لذّت سے یوں لبریز ہیں کہ گوریاں پھر سے عش عش کرنے لگتی ہیں' گویا وہ بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں بلکہ اہل زبان ہیں.. بلکہ اکثر اوقات وہ کانوں' ناک اور گالوں کے علاوہ زبان میں بھی چھید کر بالیاں ڈال لیتے ہیں تاکہ یہ جادو سر چڑھ کر بولے.. جو بھی اس جادو کو اپنے بطون میں محسوس کر کے آہ آہ کر اٹھے تو پکار اٹھے.. ساجنا تیری زبان کا بالا رے.. ن.م.. راشد نے ایک گوری نسل کی عورت سے اپنی غلامی اور محرومی کا کیا بدلہ لیا ہوگا جو یہ تنومند نیگرو لیتے ہیں..

اور وہ جو نیویارک جرنل کے بقول چھوکریاں اور فاحشہ قسم کی لڑکیاں برائے فروخت ہوا کرتی تھیں، ان کے تو ڈھنگ ہی نرالے ہیں.. ان میں سے بیشتر نہایت فربہ' تھل تھل کرتی' گوشت کے کوہ گراں لڑکیاں ہیں کہ ایک بار دیکھ لو تو دوسری بار دیکھنے کی ہوس نہیں رہتی.. جانے وہ

کیسے لوگ ہوں گے' بے شک انہی کی نسل کے ہوں گے جو ان کی ہوس پوری کرتے ہوں گے.. ہوس کے ایسے ہمالیاتی پھیلاؤ کو کیونکر پورا کرتے ہوں گے لیکن وہ سب کی سب سیاہ تودوں کے موافق نہیں ہوتیں.. کچھ تو ایسی ہوتی ہیں جو سیاہ سامری جادوگرنیاں ہوتی ہیں جن کے بدن ہوس اور حرص کے سارے ٹونے ٹوٹکے اور منتر جانتے ہیں اور وہ آگاہ ہوتی ہیں اپنے اس سیاہ سحر سے جو کسی بھی مرد کو مسخر کر کے غلام بنا سکتا ہے.. وہ گوروں یا دیگر امریکیوں پر ڈورے نہیں ڈالتیں بلکہ ان کی پرکشش آنکھیں اور آبنوسی بدن ایسے ہوتے ہیں کہ کچے ڈورے سے جو بھی سرکار ہوتی ہے بندھی چلی آتی ہے..

گویا یہ بھی ایک طرح سے انتقام لیتی ہیں کہ تم ہمیں فروخت کرتے تھے.. تم ہمیں خریدتے تھے.. ہم تمہاری غلامی میں تمہارے کپاس کے کھیتوں میں دن بھر مشقت کرتی تھیں.. اپنے بدن پر تمہارے درّے سہتی تھیں.. اگر بھوک پیاس سے مر جاتی تھیں تو ہمیں دفن کرنے کی بجائے کسی کھائی میں پھینک دیتے تھے اور راتوں میں ہم تمہاری سواری تھیں اور ہم میں سے جو بچے تمہارے بیج سے پیدا ہوتے تھے وہ بھی تمہاری ملکیت ہوتے تھے' تمہارے غلام ہوتے تھے.. ان بچوں کو تم اپنے نام دیتے تھے' ایک باپ کے طور پر نہیں ایک آقا کی شناخت کے طور پر کہ یہ جو جان کیمبل ہے تو یہ کیمبل کا غلام ہے اور یہ جو کیٹس کلے ہے تو اس کے آقا کا نام کلے ہے اور جب ہم میں سے کوئی دکھ کے وہ دن سہہ نہیں سکتا تھا اور بھاگ نکلتا تھا تو پھر اسے کہیں بھی پناہ نہیں ملتی تھی.. کتّوں کے ساتھ اس کا شکار کیا جاتا تھا اور پھر برسرِ عام یا تو اسے جلا دیا جاتا تھا اور اگر آقا بہت رحم دل ہو تو ایک درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی جاتی تھی..

آج کے امریکی سیاہ فام کے بدتہذیب رویّے کو تب تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ ان کی غلامی کے دور کو نہ سمجھا جائے.. اس دور کو سمجھنے کے لیے ٹونی ماریسن کے ناول دیکھ لیں' چلئے ایک فلم ''کلر پرپل'' ہی دیکھ لیں.. چلئے.. جب غلامی ایک قصۂ پارینہ ہوئی.... کوئی تیس پینتیس برس پیشتر کی سڈنی پائٹر اور سپنسر ٹریسی کی ''گیس ہو از کمنگ فار ڈنر'' ہی دیکھ لیجیے تو آپ آج کے سیاہ فاموں کے رویّے کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں.. تو یہ آج کی سیاہ فام سامری جادوگرنیاں بھی انتقام لیتی ہیں.. انہیں نیگرس کہنا جائز نہیں ٹھہرتا کہ اب وہ افرو امریکن کہلاتی ہیں اور یہ خواتین جو جی میں آئے پہنتی ہیں اور جی میں نہ آئے تو کچھ بھی نہیں پہنتیں..

سب وے میں.. کسی ایک سفر کے دوران.. میرے عین سامنے ایک ایسی ہی سامری ساحرہ دنیا جہان سے لاتعلق بیٹھی تھی بلکہ دنیا جہان کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتی تھی اور باقاعدہ سر سے پاؤں تک طرح طرح کے زیورات سے ڈھکی ہوئی تھی..

اُس کے تسمے دار جوتوں میں جو پاؤں دکھائی دے رہے تھے ان کی تمام انگلیوں میں چھلّے اور انگوٹھیاں پروئی ہوئی تھیں.. رانوں میں بھی چاندی کے بالے سجے تھے.. آبنوسی چھاتیوں پر چاندی کی جھالروں کی آرائش تھی.. پوری ناک میں نتھلیوں کا ایک ہجوم تھا.. کانوں میں سے متعدد جھمکے اور کانٹے چھلک رہے تھے.. اور کیا ہے کہ اس کے چوڑے سیاہ ماتھے پر ایک بڑا جھومر آویزاں تھا.. گھنگھریالے بال بھی زیورات میں پروئے ہوئے تھے.. جانے اس نے اس کے سوا کہاں کہاں کیا کیا ٹانک رکھا تھا جو دکھائی نہ دیتا تھا..

یہ ساری اس کے پورے بدن پر لشکتی گھنی آرائش' محرومی اور احتجاج کا ایک اظہار تھا کہ تم مجھے ایک قابلِ فروخت جانور سمجھتے تھے.. میں تمہارے پاؤں چاٹتی تھی' سارا دن تمہارے عالی شان گھروں اور کھیتوں میں جھکی رہتی تھی اور راتوں کو تم میرے بھوکے اور مشقت سے ڈھے چکے بدن کو ہلکائے ہوئے کتّوں کی مانند نوچتے تھے تو اب میری طرف دیکھو.. میں آزاد ہو چکی ہوں.. میں اتنی آزاد ہوں کہ جہاں میرا جی چاہے وہاں جو میرا جی چاہتا ہے' پہنتی ہوں.. کیا تم جو میرے خریدار ہوا کرتے تھے میرے اس پہناوے پر اعتراض کر سکتے ہو؟ اعتراض کرو تو میں تمہارا منہ توڑ کر رکھ دوں..

سیاہ فاموں کے اسی نوعیت کے عجیب و غریب پہناوے اور موج مستی کے زیورات دراصل سفید فاموں کو اشتعال دلانے کے بہانے ہیں..

کہا جاتا ہے کہ امریکہ کی سب سے بڑی پہچان تین چیزیں ہیں.. ہالی ووڈ کی فلمیں' جنک فوڈ اور موسیقی..

وہ آج تک اپنے زورِ بازو سے کوئی بھی ملک فتح نہیں کر سکا لیکن انہی ملکوں کو اُس نے ان تینوں چیزوں کے زور سے زیر کر لیا..

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ امریکہ کو ''کاغذی شیر'' قرار دینے والے اور پھر ثابت کر دینے والے ماؤزے تنگ کے مقبرے پر آج میکڈونلڈ کے اشتہار کی روشنیاں جلتی بجھتی ہیں..

بیجنگ جہاں ایک زمانے میں ہر نوجوان کے ہاتھوں میں ماؤ کی سرخ کتاب ہوا کرتی تھی آج ان کے ہاتھوں میں کے ایف سی کے چکن ہوتے ہیں.. ویت نام میں بھی امریکی فوڈ آؤٹ لیٹ دھڑا دھڑ کھل رہے ہیں اور ویت کانگ گوریلوں کی اولادیں بندوق کی بجائے برگر تھامے ہوئے ملتی ہیں..

پیٹ کی غذا اپنی جگہ لیکن امریکہ کی میری رائے میں جو اتنی ناقص نہیں ہے سب سے اہم اور خوبصورت کنٹری بیوشن اس کی موسیقی ہے اور وہ بھی بنیادی طور پر نیگرو موسیقی کیونکہ موسیقی تو ہمیشہ کسی عظیم دکھ کے جمال اور کسی المیے کے جلال میں سے جنم لیتی ہے.. آسودہ حال روحوں میں کبھی رُومی کی نَے کی لے نہیں گونجتی.

ایک سیاہ فام موسیقار نے کہا تھا کہ ''ہم لوگوں کے پاس اور تھا ہی کیا.. اپنی غلامی اور دُکھ کو ایک ٹرمپٹ یا ڈرم میں گھول دینا..''

چنانچہ امریکی جنوب جہاں ڈھور ڈنگر رکھنے کی بجائے سیاہ فام غلام رکھے جاتے تھے، وہاں کے تاحدِ نظر پھیلے کپاس کے کھیتوں میں سے ذلت، دربدری اور دکھوں کے سینے سے جو آہیں نکلتی تھیں ان سے ''بلوز'' موسیقی کے دھارے پھوٹے، انہیں ہم نوحے اور مرثیے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر قوم اور نسل کی ایک کربلا ہوتی ہے.. ''بلوز'' موسیقی سیاہ فاموں کے دکھوں کی ایک پُراثر تاریخ بھی ہے..

امریکی خانہ جنگی کے اختتام پر جنوب کے جنگ کے میدانوں میں جہاں لاشیں بکھری ہوئی تھیں وہاں فوجیوں کے وہ ساز بھی پڑے تھے جو ان کے بینڈز میں بجائے جاتے تھے.. سیاہ فاموں نے یہی ساز اٹھائے اور ان میں اپنی غلام روحیں اور دکھی سانس پھونک کر ''جاز'' ایسی عظیم موسیقی کو جنم دیا.. جس نے بحر اوقیانوس کو پار کر کے پورے یورپ اور پھر پوری دنیا کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیا..

برائے فروخت سیاہ غلاموں کے سانس امریکہ کی واحد پہچان بن گئے..

کاؤنٹ بیسی، بیسی سمتھ، بلی ہالیڈے، ڈینا واشنگٹن اور ڈیوک ایلنگٹن ایسے لوگ تھے جن کے سُر کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا.. یہی ڈیوک ایلنگٹن اپنے نیگرو آرکسٹرا کے ہمراہ کبھی لاہور آئے تھے اور باغ جناح کے اوپن ایئر تھیٹر میں.. اپنی نوعمری کے زمانہ میں، میں نے ڈیوک اور اس

کے ساتھیوں کی روح پر اثر کرنے والی جاز موسیقی سنی تھی..

انگلستان کے قیام کے دوران جسے اب پچاس برس ہونے کو ہیں ایلا فزجیرلڈ ایسی موٹی اور بھدی خاتون نے مجھ ایسے شخص پر بھی جو گُن رس نہیں رکھتا تھا سحر طاری کر دیا تھا.. وہ کیسی والہانہ بے خودی کے ساتھ دکھ کے گیت الاپتی تھی.. پھر گریٹ نیٹ کنگ کول تھا جس کے گیت ''پارٹی اِز اوور مائی فرینڈز'' اور خاص طور پر ''ٹرُو لَو'' یورپ کی نوجوان نسل کے خون میں رچ گیا تھا.. اور پھر گہری جنسی آواز میں گانے والی ارتھا کٹ جس کے بیشتر گانے اس کی آواز کی ترجمانی کرتے تھے.. ''فیور'' اور ''وہاں ایک آگ ہے نیچے.. نیچے میرے دل میں'' ہمارے نوخیز بدنوں کو آگ لگا دیتے تھے.. اور اس عہد کی سب سے پسندیدہ موسیقی راک اینڈ رول بھی سیاہ فاموں کے تھرکتے بدنوں میں سے پھوٹی.. اگرچہ سفید فام امریکہ نے اپنے ہم نسل ایلوس پریسلے کو اس کا بادشاہ بنا دیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ پیانو پر کُودنے والے لٹل رچرڈ نے ''گڈ گالی مس مالی'' گا کر اس صنف کا آغاز کیا.. ہیری بیلافونٹے کے گانے ''ڈے او.. ڈے لائٹ کمز اینڈ آئی وانٹ ٹو گو ہوم'' اور خاص طور پر ''ریڈ سیلز اِن دے سن سیٹ'' رومانوی ماحول کا ایک اہم جز تھے اور یہ گیت بازاروں میں گائے جاتے تھے.. بے شک اُن دنوں سیمی ڈیوس جونیئر بھی تھا جس کی ایک ٹانگ لکڑی کی تھی اور ایک آنکھ بھی نہیں تھی اور اس کے باوجود وہ ایک زبردست رقاص اور گلوکار تھا.. وہ فرینک سناٹرا اور ڈین مارٹن ایسے گلوکاروں کا جگری یار تھا اور ان سے کہیں بڑھ کر لوگوں کا پسندیدہ تھا.. اور یہ ایک طویل فہرست ہے، میں سب نام نہیں گنوا سکتا.. اور یہ آج سے پچاس برس پیشتر کے لوگ ہیں، اُن کے بعد اور بھی بہت سے آئے.. رے چارلز کے بعد ان دنوں لائنل رچی اور سٹیوی ونڈر کو جب سنتے ہیں ''ہیلو.. کیا یہ تم ہو جس سے میں بات کر رہا ہوں''.. اور ''میں نے صرف یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں..'' کو سنتے ہیں تو اُن کے بول کیسے ایک اداسی کے ساتھ دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں اور پھر ان دنوں نشیلی آنکھوں والی وِٹنی ہیوسٹن نے اپنی آواز کے سریلے اتار چڑھاؤ سے کیسا غدر مچایا ہوا ہے..

ٹیلی ویژن کے برسوں میں اور یہ بہت سارے برس ہو رہے ہیں تقریباً چالیس کے قریب جن کے دوران میں نے موسیقی کی بہت سی محفلوں کی میزبانی کی.. نصرت فتح علی خان کی زندگی کے آخری دو پروگرام بھی ''تیرے نام'' شو میں ریکارڈ ہوئے.. ان محفلوں کی میزبانی کے

دوران جب موسیقی کے حوالے سے مکالمہ ہوتا تو بیشتر بڑے گلوکاروں کی تان اس بات پر ٹوٹتی کہ مغرب میں تو پاپ موسیقی کا شور ہے جب کہ صرف ہمارے ہاں ہی سُر اور لے کا راج ہے.. اور میں ہمیشہ گزارش کرتا رہتا کہ خان صاحب آپ کلاسیکی' یا نیم کلاسیکی موسیقی کی نمائندگی کرتے ہیں.. آپ اپنا موازنہ مغرب کی پاپ موسیقی سے نہ کریں.. وہاں بھی بیتھوون موتزارٹ اور چائکوسکی وغیرہ شدہ کلاسیکی ہیں اور آپرا اسی روایت کی نمائندگی آج کرتا ہے چنانچہ مغرب کلاسیکی حوالے سے کسی طور ہم سے کمتر نہیں ہے.. اس دوران حسین بخش گلو جو میرے بہت ہی پسندیدہ ہیں انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا ''تارڑ صاحب.. ویسے مجھے مغرب کے کلاسیکی موسیقاروں کا کچھ پتا نہیں لیکن میری ایک شاگرد نے پچھلے دنوں کسی ہوسٹن بی بی کا گانا سنوایا تھا اور میں حیران رہ گیا تھا کہ وہ سُر کو کتنی بلندی پر لے جاتی ہے اور تب بھی بے سُری نہیں ہوتی..''

یہ ہوسٹن بی بی.. وہی نشیلی آنکھوں والی وٹنی ہیوسٹن ہے جو ''آئی ول آلویز لو یو'' گاتے ہوئے جب تان لگاتی ہے تو آپ کا دم رکنے کو آتا ہے پر اس کی تان نہیں ٹوٹتی..

اُن گئے زمانوں میں جاز موسیقی کا سراغ لگاتے ہوئے اگر کسی ایک موسیقار کا نام لینا ہو تو وہ لوئی آمسٹرانگ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا. کہنا تو نہیں چاہیے کہ سب شکلوں کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے پر معدودے چند شکلیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ نہ بھی بناتا تو کیا برا ہوتا اور ان میں لوئی آمسٹرانگ کی شکل سرفہرست ہوگی.. وہ بنیادی طور پر ایک بگل بجانے والا تھا یعنی ٹرمپٹ پلیئر لیکن اپنے فن میں ایسا یکتا تھا کہ اسے ''مین وِدا ے گولڈن ٹرمپٹ'' کہا جاتا تھا.. ٹرمپٹ ایک نہایت مشکل ساز ہے' اسے بجانے کے لیے بہت سارا سانس اور قوت درکار ہوتی ہے اور پھر بھی یہ ساز آپ کے تابع نہیں ہوتا' بے سُرا ہی بجتا ہے.. لوئی آمسٹرانگ جب ٹرمپٹ بجاتا تھا تو زور لگانے سے اس کے خدوخال نہایت خوفناک ہو جاتے تھے.. سیاہ چہرے پر نمودار ہوتا پسینہ بھی سیاہ رنگ کا لگتا تھا اور اس کی آنکھیں ابل کر باہر آتی تھیں.. اُس کی جانب دیکھتے رہنے کے لیے بہت ہمت درکار ہوتی تھی اور اس کے باوجود وہ ٹرمپٹ سے ایسے نئے جہان تخلیق کرتا تھا.. ایسی طرزیں نکالتا تھا کہ اگر روز حشر فرشتے رب کی مخلوق کو خوش آمدید کہنے کے لیے ٹرمپٹ بجائیں گے تو لامحالہ لوئی آمسٹرانگ کو ہی کاپی کریں گے اور وہ صرف ٹرمپٹ بجانے پر ہی اکتفا نہ کرتا تھا بلکہ ایک انتہائی پھٹی ہوئی ہولناک آواز میں گاتا بھی تھا.. کہ ''وین دی سینٹ گو مارچنگ اِن'' اور ہر مصرعے

کے بعد وہ دانت نکال کر ''اوہ یا'' بھی شامل کر دیتا تھا.. اور یہی اس کی بیٹھی ہوئی بے سُری اور بھدی لگتی ہوئی آواز جاز موسیقی کی پہچان بن گئی' یورپ میں اور بعد میں ایشیا اور افریقہ میں جہاں کہیں جاز موسیقی کی دھنیں جنم لیتیں وہاں کے گلوکار کوشش کر کے اپنی آواز اسی طور بے سُری اور بھدی کر کے گاتے اور اس پر فخر کرتے..

اُن زمانوں میں جب تقریباً ہر برس میں اپنے خاندان کے ہمراہ کار پر سوار شمال کی جانب رخ کر لیتا تھا اور اس دوران یہ طے ہو جاتا تھا کہ کار کے ٹیپ ریکارڈر پر ایک ٹیپ والد صاحب کی کوئی یبوست زدہ موسیقی دل پر پتھر رکھ کر سنی جائے گی اور دوسری ٹیپ بچہ لوگ کی من پسند ہوگی تو اس دوران میری ٹیپ پر اسی لوئی آمسٹرانگ کا ایک گیت ''وہاٹ اے ونڈر فل ورلڈ'' وادئ ہنزہ کی جانب سفر کرتے ہوئے کار کے اندرون میں گونجنے لگا.. میرے بچے اپنے مائیکل جیکسن اور میڈونا کو بھول گئے اور کہنے لگے ابو.. یہ کون ہے جو یہ جانتا تھا کہ کبھی ہم شاہراہ ریشم پر سفر کرتے ہوئے خوبانیوں سے لدے ہوئے درختوں اور راکاپوشی کی برفوں کے سائے میں سانس لیں گے اور تب یہ دنیا کتنی خوبصورت ہوگی.. وہ کیسے جانتا تھا.. اس میں کوئی شک نہیں کہ لوئی آمسٹرانگ کا یہ گیت سن کر دنیا کی خوبصورتی کا اعتبار آ جاتا ہے..

اگرچہ یقین نہیں آتا کہ ہماری دنیا میں.. اللہ کی سیاہ مخلوق کو ہزاروں برس پیشتر نہیں بلکہ چند برس پیشتر تک اور وہ بھی امریکہ ایسے روشن خیال اور تہذیب یافتہ ملک میں تقریباً جانور سمجھا جاتا تھا اور میں جانوروں کی فہرست میں کتوں کو شامل نہیں کر رہا کہ وہ تو مراعات یافتہ طبقہ ہے.. یہ بہت دن پہلے کا قصہ نہیں ہے جب سیاہ فام روزا پارکر ایک بس میں ایک گورے کے داخل ہونے پر اسے جگہ دینے کے لیے کہ وہ ایک سپیریئر نسل سے تھا' اپنی نشست سے اٹھی نہیں بیٹھی رہی تھی اور اس کی سزا بھگتی تھی.. روزا کا انتقال ابھی پچھلے دنوں ہوا ہے.. اور نہ ہی اس روز کو زیادہ عرصہ ہوا ہے جب میں نے ٹیلی ویژن پر لٹل راک میں ایک نیگرو لڑکی کو کمانڈوز کی حفاظت میں ایک سکول میں جاتے دیکھا تھا جو صرف گوروں کے لیے مخصوص تھا اور وہ امریکی دستور کی پناہ میں اس میں داخل ہوئی تھی.. نہ ہی عالی جاہ محمد کی ''نیشن آف اسلام'' کا ظہور ہوا تھا اور نہ میلکم ایکس کا.. ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے سفید چوغوں میں روپوش مخروطی ٹوپیوں والی نسل پرست جماعت کلوکلکس کلین کو نیگروز کے گھر جلاتے.. بلکہ انہیں ان کے سمیت جلاتے اور انہیں درختوں سے لٹکا کر

پھانسیاں دیتے اور صلیب پر گاڑ کر نذرِ آتش کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا.. ابھی کچھ عرصہ پہلے.. یہ سینکڑوں برس پہلے کے قصے نہیں ہیں..

میں نے اس بیکار حیات کا جتنا عرصہ کتابوں اور کاغذوں پر جھکے گزارا ہے، تقریباً اتنا ہی حصہ سلور سکرین کو گھورتے گنوایا ہے.. ایک زمانے میں خوراک کی بھوک جتنی ہی بھوک مجھے فلم کے لیے بھی لگتی تھی اور اگر میں ہر ماہ تیس فلمیں نہ سہی بیس پچیس تو ضرور ہی دیکھتا، بعد میں میرے ادب پر ان فلموں کے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور وہ میرے لیے مناظر کو بیان کرنے اور انسانی جذبات کی نمائندگی کرنے میں بہت معاون ثابت ہوئیں.. ان میں اگرچہ روسی، چیک، پولش، فرانسیسی اور اطالوی کلاسیکی فلموں کا بہت عمل دخل تھا لیکن بہرطور یہ امریکی فلمیں تھیں جن کا میں شیدائی تھا..

اُن دنوں امریکی فلمیں سراسر سفید ہوتی تھیں یعنی آل وہائٹ اور ان میں دور دور تک کسی سیاہ چہرے کا نام ونشان نہ ہوتا تھا.. صرف گورے اور گوریاں ہوتی تھیں اور اگر کوئی سیاہ چہرہ نظر آتا تھا تو کسی موٹی قدرے بیوقوف گھریلو ملازمہ یا ریستوران کے ویٹر یا کسی وفادار بوٹ پالش کرنے والے خادم کی صورت میں.. یہ تو نہیں کہ ان دنوں نیگرو اداکار نہیں ہوا کرتے تھے.. وہ ہوا کرتے تھے ہارلم کے گلوب تھیٹر میں، حبشی آبادی کے اپنے مخصوص کھیل گھروں میں، لیکن آل وہائٹ فلموں میں نہ صرف ان کا داخلہ ممنوع تھا بلکہ وہ فلم کی کمرشل کامیابی کیلئے مضر سمجھے جاتے تھے.. وہ سب اداکار اور تخلیق کار وہیں تھے جہاں امریکہ کے سارے نیگرو تھے، یعنی نسل پرستی کے گٹر میں اور اس گٹر کے ڈھکنے پر پوری سفید نسل براجمان تھی تا کہ وہ کبھی باہر نہ آسکیں.. وہ اسّی برس کے بزرگ بھی ہو جاتے تو انہیں ''مسٹر'' نہیں ''بوائے'' کہا جاتا تھا..

سب سے پہلا صدمہ سفید فام نسل پرستوں کو تب ہوا جب برلن اولمپکس میں اڈولف ہٹلر کی موجودگی میں.. جو صرف نیلی آنکھوں اور گوری رنگت والوں کو ہی انسان سمجھتا تھا اور اس نسل کو پوتر رکھنے کیلئے سیاہ بالوں والوں کو بھی نذرِ آتش کر دیتا تھا تو اس کی موجودگی میں ایک سیاہ ترین لشکتی رنگت والے امریکی حبشی نے ٹریک فیلڈ پر تمام گوری رنگت والوں کو مات دے کر گولڈ میڈل جیتا تو صرف ہٹلر کو ہی نہیں بیشتر امریکیوں کو بھی بے حد صدمہ ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک حبشی میں اتنی قابلیت ہو کہ وہ گوروں کو شکست دے دے.. بہت بعد میں یہ تھیوری پیش کی گئی کہ اتھلیٹکس میں

چونکہ صرف بدنی قوت کا عمل دخل ہے اس میں سوچ کا کوئی حصہ نہیں ہوتا اس لیے سیاہ فام کھلاڑی جیت جاتے ہیں جب کہ جن کھیلوں میں سوچ سمجھ درکار ہے یعنی ٹینس وغیرہ تو ذرا دیکھئے وہاں آپ کو دور دور تک کوئی سیاہ فام نظر نہیں آئے گا.. تب وہ لمبی تڑنگی ولیم سسٹرز نمودار ہوئیں جن کا باپ تماشائیوں کی رو میں بیٹھا اپنی بیٹیوں کو بلند آواز میں شاباش دیتا، ان کی ہمت بڑھاتا تھا اور وہ ٹینس کی دنیا پر نہ صرف چھا گئیں بلکہ وہ دن بھی آیا کہ ورلڈ چیمپئن شپ کے فائنل میں وہ ایک دوسرے کی مدمقابل تھیں اور ان کے والد کو سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ کس بیٹی کی ہمت بڑھائے چنانچہ وہ چپ بیٹھا رہتا تھا....

تو اس ہالی ووڈ فلموں کے ''آل وہائٹ'' عہد میں بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ایک سیاہ فام اداکار سڈنی پائٹر آیا جس نے گوروں کے اس سفید تاج محل میں سیاہ رنگ کے گل بوٹے تخلیق کر کے اسے مکمل کر دیا.. ''دے ڈیفائیٹ ونز'' میں وہ ٹونی کرٹس کے ہمراہ تھا جو اس عہد کا گولڈن بوائے تھا لیکن وہ سڈنی پائٹر کے بلیک گولڈ کے سامنے ماند پڑ گیا.. سپنسر ٹریسی جیسے شاندار اور سینئر اداکار کے ساتھ جب وہ ''گیس ہواز کمنگ فار ڈنر'' میں آیا تو لوگوں کو بہت حیرت ہوئی.. ایک سفید فام اور بہت خوش شکل لڑکی ایک انتہائی قابل اور گہری سوچ رکھنے والے نیگرو نوجوان کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے.. وہ اسے اپنے والدین سے ملانے کے لیے اپنے گھر ڈنر پر مدعو کرتی ہے اور والدین کو زندگی میں سب سے بڑا صدمہ تب ہوتا ہے جب ان کی بیٹی ایک نیگرو کا بازو تھامے اس کو متعارف کرواتی ہے کہ ڈیڈی یہ ہے وہ شخص جس کے ساتھ میں اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہوں.. اور سڈنی پائٹر کی فلم ''ٹو سَر وِدلَو'' نے تو دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا یہاں تک کہ لاہور کے الفلاح سینما میں ریلیز ہوئی تو لاہوریوں کو اس کا تھیم سانگ اتنا دل پسند ہوا کہ ان زمانوں میں شہر کی گلیوں میں وہ ہر سُو سنائی دیتا تھا.. سڈنی کی یہ تینوں فلمیں اب کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہیں.. یہ صرف سڈنی پائٹر کی دین ہے کہ آج ہالی ووڈ میں ہر سُو سیاہ فام اداکار راج کرتے ہیں.. ایک سراسر سفید فلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا.. باکس آفس پر وہ فلم کامیاب ہی نہیں ہو سکتی جس میں کوئی سیاہ فام چہرہ نظر نہ آئے.. چاہے وہ میٹرکس ہو یا رابرٹ ڈی نیرو کی کوئی فلم.. یہاں تک کہ جیمز بونڈ کی فلم میں بھی آپ کو ہیلی بیری ہیروئن نظر آئے گی.. ڈینزل واشنگٹن کے سامنے ہالی ووڈ کے سپر سٹار ماند پڑ جاتے ہیں اور اس نے اپنا پہلا آسکر ایوارڈ وصول کرتے ہوئے سڈنی پائٹر کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین

پیش کیا تھا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو آج میں بھی نہ ہوتا..ایڈی مرفی کی کامیڈی کے سامنے کوئی نہیں ٹھہرتا اور رے چارلز کا نابینا کردار ادا کرنے والا اداکار جیمی فاکس اُس کردار میں ایسے ڈھل جاتا ہے کہ بعد کی فلموں میں بھی وہ آپ کو نابینا لگتا ہے..اُسے فلم کے پہلے منظر میں دیکھ کر آپ جان جاتے تھے کہ آسکر ایوارڈ اسی کا منتظر ہے..اور پھر وِل سمتھ ایسا گہرا اداکار جس نے باکسر محمد علی کے کردار کو یوں نبھایا کہ محمد علی نے اسے ہاتھ لگا کر پوچھا کہ یہ تم ہو یا میں ہوں..مارگن فری مین ایک ایسا کردار ساز اداکار جسے نیلسن منڈیلا کے رول کے لیے منتخب کیا جا چکا ہے..اور ایسے لاجواب سیاہ فام اداکاروں کی فہرست بہت طویل ہے..بے شک ایسے سیاہ فام اداکاروں نے اور مارٹن لوتھر کنگ..میلکم ایکس، حاجی شہباز، نیلسن منڈیلا اور محمد علی نے سیاہ فاموں کے جائز حقوق کے لیے تاریخی جدوجہد کی لیکن صرف ایک تخلیقی شاہکار نے..صرف ایک کتاب نے..جیمز بالڈون کی کتاب ''دی رُوٹس'' نے انہیں وہ عزت نفس عطا کی جس نے انہیں گورے امریکیوں کے برابر نہیں بلکہ تہذیب وتمدن اور تاریخ میں ان سے کہیں آگے لا کھڑا کیا..اس کتاب سے پیشتر سیاہ فام..اکثر گوروں کی نظر میں افریقہ کے جنگلوں میں ایک درخت سے دوسرے درخت پر کودنے والے وہ بندر تھے جنہیں اگر غلام بنا کر امریکہ لایا گیا اور انہیں تہذیب یافتہ بنایا گیا تو گویا ان پر احسان کیا گیا..لیکن ''دی رُوٹس'' نے یہ ثابت کر دیا کہ ان میں سے بیشتر ایک تہذیب یافتہ اور بااخلاق معاشرے کے افراد تھے..وہ سینکڑوں برس قدیم بستیوں میں رہتے تھے، کھیتی باڑی کرتے تھے، کاروبار کرتے تھے اور ان کے لباس مغرب والوں سے کہیں زیادہ ستر پوش تھے..ان کے رسوم ورواج کی بنیاد محبت اور اخلاقیات پر تھی..''دی روٹس'' جیمز بالڈون کی اپنی کہانی ہے کہ وہ کیسے متجسس ہوا کہ آخر ہم لوگ کہاں سے آئے تھے' کیسے آئے تھے اور کیا ہم واقعی وحشی اور جانور تھے..وہ اپنے شجرہ نسب کو تلاش کرتا..بالآخر ایک شخص کِنتا کنتے تک پہنچتا ہے جسے ایک سمندری جہاز میں افریقہ سے امریکہ لایا گیا تھا..یہ کھوج اسے افریقہ کے اس گاؤں میں لے جاتی ہے جہاں سے کِنتا کنتے کو یورپی لٹیرے تب ایک جال میں قید کر کے غلام بنا لیتے ہیں جب وہ گاؤں سے کچھ دور جنگل میں شکار کے لیے گیا ہوتا ہے، وہ گاؤں تقریباً پنجاب کے موجودہ کسی گاؤں سے مشابہ ہے یعنی ایک مکمل معاشرہ ہے..اور یہ لوگ مسلمان ہیں..ان کی مسجد سے پانچ وقت موذن کی صدا گونجتی ہے..بچّے قرآن پاک پڑھنے میں مصروف ہیں..لوگ کھیتی باڑی اور کاروبار سے رزق کماتے ہیں اور اکثر

دور کے شہروں سے مسلمان عالم وہاں آ کر علم کی روشنی عطا کرتے ہیں..کِنتا کنتے کے بارے میں بھی یہ لوگ آگاہ ہیں کہ بہت سارے دوسرے گاؤں والوں کی مانند ان کے ایک بڑے کِنتا کنتے کو بھی سفید فام سوداگر اغوا کر کے لے گئے تھے..وہ لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کے ملک میں کوئی شخص جنگل میں بھی رہائش رکھتا ہے..یہ ایک الگ داستان ہے کہ کِنتا کنتے کو جب بیڑیوں میں جکڑ کر امریکہ لایا جاتا ہے اور ایک غلام کے طور پر فروخت کر دیا جاتا ہے تو وہ خود کو کتنا بے بس اور بے آسرا محسوس کرتا ہے..وہ کچھ عرصہ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہتا ہے اور باقاعدگی سے عبادت کرتا ہے اور پھر اسے ایک نیا نام اور نیا مذہب الاٹ کر دیا جاتا ہے..کِنتا کنتے حیران ہوتا ہے کہ یہ کیسے غیر تہذیب یافتہ اور پست اخلاق کے لوگ ہیں جو انسانوں کو جانور بنا کر رکھتے ہیں..
افریقہ کو ہمیشہ ایک تاریک براعظم کہا گیا یعنی جہاں تک تہذیب کی روشنی نہیں پہنچی اور اسے سفید فاموں کا بوجھ قرار دیا گیا جن کے ذمے ان وحشیوں کو تہذیب سکھانا تھا..اس رویّے کا موازنہ آسانی سے آج کی صورت حال میں عراق سے کیا جا سکتا ہے..جہاں سے تہذیب انسانی کا آغاز ہوا..بابل، نینوا' بصرہ اور بغداد ایسے شہروں کی ماں..خلیفہ ہارون الرشید نے جب فرانس کے فرمانروا شارلیمان کو خیرسگالی کے طور پر متعدد تحائف روانہ کیے تو ان میں ایک کلاک بھی تھا اور اہل یورپ اسے حیرت سے تکتے تھے کہ وہ وقت جاننے کا کیسا عجوبہ ہے کیونکہ وہ ابھی سورج کے حساب سے وقت کو ناپتے تھے..تو اسی عراق پر یورپ اور امریکہ حملہ کر کے..اس پر قابض ہو کر یہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں صرف تہذیب سکھانے آئے ہیں..اس دوران اگر سات لاکھ عراقی شہری مارے جاتے ہیں تو تہذیب کے لیے یہ کوئی بڑی قیمت نہیں..افریقہ کے بیشتر خطے اُن دنوں بھی انتہائی تہذیب یافتہ تھے جب یورپ مکمل تاریکی میں تھا..وہاں بڑی سلطنتوں اور ثقافتوں نے جنم لیا..بے شک اس کے کچھ حصوں میں آزاد اور اپنی من مرضی سے حیات بسر کرنے والے قبیلے تھے جن کے رسوم ورواج یورپ سے مختلف تھے لیکن وہ وحشی تو ہرگز نہ تھے کہ یورپ کے نزدیک ہر وہ معاشرہ جو اس کی اقدار سے جدا اقدار پر عمل پیرا ہو وحشی گردانا جاتا ہے..انہیں اپنی تہذیبی برتری جتانے کے لیے بہر طور افریقہ اور ایشیا کو غیر مہذب ثابت کرنا تھا..افریقہ کے درمیان میں صدیوں پیشتر ٹمبکٹو کا جادوئی شہر ملک مالی میں ایسا آباد تھا کہ وہاں تک پہنچنا، اسے دیکھنا اور وہاں کے اداروں میں تعلیم حاصل کرنا ایک خواب ہوا کرتا تھا..ابھی پچھلے دنوں میں نے ''نیشنل جیوگرافک''

چینل پر اس قدیم شہر کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری دیکھی..اس زوال شدہ شہر میں بے شمار قدیم خاندان ایسے ہیں جنہوں نے ہزاروں برس پرانے مخطوطے اور کتابیں سنبھال رکھی ہیں جو اس شہر کے روشن عہد کی نشانیاں ہیں..سفید براق چوغے میں ملبوس ایک حبشی بزرگ اپنے کتب خانے کی ایک قدیم کتاب دکھا رہا ہے جو فلکیات کے بارے میں ہے اور اس میں سورج اور سیاروں کی گردش کی قلمی تصویریں ہیں..''نیشنل جیوگرافک'' کا نمائندہ بتا رہا ہے کہ ان میں یہ نظریہ ثابت کیا گیا تھا کہ تمام سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں اور اس کتاب کی تصنیف کے تقریباً دو سو برس بعد یورپی سائنس دان جن میں کوپرنکس شامل تھا اس نظریے سے واقف ہوئے تھے..اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یورپ سائنسی اور صنعتی ترقی میں ایشیاء اور افریقہ سے کہیں آگے نکل گیا اور یہ علاقے زوال کا شکار ہو کر واقعی تاریک براعظم ہو گئے لیکن..یہ وحشی تو نہ تھے..

یہ اس کتاب ''دی رُوٹس'' کا کمال ہے کہ آج بہت سے امریکی سیاہ فام اس آگہی کے بعد کہ وہ کبھی تہذیب یافتہ مسلمان ہوا کرتے تھے..عیسائی ہونے کے باوجود اپنے بچوں کے نام مسلمانوں ایسے رکھتے ہیں..میرے داماد بلال کے ایک قریبی دوست جان جو سیاہ فام عیسائی ہیں انہوں نے اپنے بیٹے کا نام مالک رکھا ہے اور بیٹی کا مدیحہ..سیاہ فام جانتے ہیں کہ ان کے موجودہ نام دراصل ان کے کسی زمانے کے گورے آقاؤں کے نام تھے..تو عالی جاہ محمد کی ''نیشن آف اسلام'' کے زمانے میں یہ تحریک چلی کہ سابقہ آقاؤں کے نام سے پکارا جانا ایک تضحیک ہے..اگر آپ کا آخری نام بالڈون، براؤن یا آمسٹرانگ ہے تو یہ اس گورے کا نام ہے جو کبھی آپ کا آقا ہوا کرتا تھا..تو تحریک یہ چلی کہ ان آخری ناموں کے بجائے اپنے آپ کو ''ایکس'' لکھا جائے..یہ ثابت کرنے کے لیے اب ہم آزاد ہیں اور اپنے مالکوں کے ناموں کو ترک کر رہے ہیں..چنانچہ میلکم ایکس..اور وہ جو روم اولمپکس میں باکسنگ کا گولڈ میڈل حاصل کرنے والا کھلنڈرا اور تتلی کی طرح اڑنے والا مگر شہد کی مکھی کی مانند ڈنک مارنے والا چلبلا باکسر کیسیس کلے ہے تو ''کلے'' اس کے سابقہ مالک کا نام ہے چنانچہ وہ بھی کیسیس ایکس ہو جاتا ہے اور بالآخر محمد علی ہو جاتا ہے..

''نیشن آف اسلام'' کا تذکرہ چلے تو عالی جاہ محمد کی متنازعہ شخصیت سامنے آجاتی ہے..

اس نے اسلام کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد اپنے موجودہ حالات اور محرومیوں کو مدنظر رکھ کر ایک اپنا اسلام تخلیق کر لیا..بلکہ اپنے آپ کو ایک پیغمبر کے روپ میں متعارف کروایا..اس نے سفید

فاموں سے برابری کے دعوے کو رد کر کے سیاہ فاموں کو ان سے بھی برتر اور اعلیٰ قرار دیا..اس انتہا پسند نسلی رویے کے باوجود..عالی جاہ محمد ایک ایسا انقلابی تھا جس نے سفید فاموں کے قدموں سے اُن کی نسلی برتری کا قالین کھینچ کر انہیں ننگے فرش پر پاؤں رکھنے پر مجبور کر دیا..ظاہر ہے وہ اسے ایک جنونی سمجھتے تھے لیکن کہاں وہ سیاہ فاموں کو اپنے برابر میں بٹھانے سے گریز کرتے' ناک بھوں چڑھاتے تھے اور کہاں یہ شخص تھا جو ان گوروں کے برابر میں بیٹھنے کو بھی تیار نہ تھا اور اپنے آپ کو اور دیگر سیاہ فاموں کو ان سے برتر سمجھتا تھا..اس صدمے نے بہت سے سفید فاموں کو ہلا کر رکھ دیا..

عالی جاہ کا کمال یہ تھا اور یہ ایک معجزہ بھی ہو سکتا تھا اگر وہ پیغمبر ہوتا کہ اس کے جتنے بھی پیروکار یا مرید تھے وہ سب جیلوں میں بدترین جرائم کی سزائیں بھگتنے والے..قاتل، لٹیرے، منشیات فروش اور زناکار تھے..اور پھر وہ اس کی ''تبلیغ'' کے نتیجے میں..کہ عالی جاہ ہمیشہ جیلوں میں جا کر اپنے ''مذہب'' کا پرچار کیا کرتا تھا، یہ مجرم اس کے ہاتھوں پر بیعت کر کے ''اسلام'' قبول کرتے ہیں اور جب جیل سے باہر آتے ہیں تو امریکی معاشرے کی ابتری اور لاقانونیت میں وہ انتہائی امن پسند، اشتعال میں نہ آنے والے..صابر و شاکر اور صوفی لوگ ہو جاتے ہیں..شراب، جرم، منشیات، جنس اور تشدد یوں ترک کر دیتے ہیں جیسے انہوں نے ایک نیا جنم لے لیا ہو..نیویارک اور شکاگو کے بازاروں میں کھڑے اپنے عقیدے کے پمفلٹ بانٹ رہے ہیں..خواتین کو ''سسٹر'' اور مردوں کو ''برادر'' کہہ کر مخاطب ہو رہے ہیں اور اگر کوئی ان پر ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ گردن خم کر دیتے ہیں..اسی طور نہایت عادی اور جرائم پیشہ بار بار جیل کی ہوا کھانے والی سیاہ فام عورتیں لمبے چوغے پہن لیتی ہیں..حجاب میں چلی جاتی ہیں اور نظریں جھکا کر بات کرتی ہیں..اور کیا یہ ایک معجزے سے کم ہے..

بے شک آج ہم اس عالی جاہ محمد کو مطعون کر سکتے ہیں کہ اس نے کیسے سیاہ فاموں کو گوری رنگت والوں سے برتر اور بہتر ہونے کا پرتکبر دعویٰ اسلام کے حوالے سے کیا جب کہ یہ تو اسلام کی اصل روح سے سراسر بغاوت ہے جس میں گورے اور کالے کی کچھ تفریق نہیں لیکن اُس عہد میں نفرت، حقارت اور پسماندگی میں پستے ہوئے سیاہ فاموں کے لیے..سفید فام برتری کے زعم کا مقابلہ کرنے کے لیے شاید ایسے ہی دعوے کی ضرورت تھی..کہ انتہا پسندی کا مقابلہ بردباری اور تحمل سے نہیں کیا جا سکتا..صرف جواب میں انتہا پسندی سے کیا جا سکتا ہے کہ ہر کوئی نیلسن منڈیلا نہیں ہو سکتا..

میلکم ایکس بھی ابتدائی ایام میں اسی عالی جاہ محمد کی شخصیت اور پرچار کا اسیر ہو کر ''نیشن آف اسلام'' میں داخل ہو جاتا ہے.. اور وہ کسی بھی پیمانے سے معاشرے کا بدترین شخص ہے.. ان پڑھ، عادی مجرم، ڈاکے ڈالنے والا.. نہ صرف خود منشیات کا رسیا بلکہ گلی کوچوں میں انہیں فروخت کرنے والا.. جسم فروش عورتوں کی دلالی کرنے والا اور ان کے ساتھ ہم بستری کرنے والا.. جسکے ہاتھوں پر خون کے دھبے بھی ہیں تو یہ شخص کیا سے کیا ہو جاتا ہے.. عالی جاہ محمد کا پیروکار ہوتا ہے تو یہ سب عادتیں، جرم اور نشے ترک کر کے سر جھکا کر ایک امن پسند شہری ہو جاتا ہے.. تعلیم حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ ایک دانشور کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے.. گلی کوچوں میں اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتا ہے، پمفلٹ تقسیم کرتا ہے اور اگر کوئی سفید فام اسے گالی دیتا تو وہ سر جھکا لیتا ہے..

یہ ایک ایسی ماہیت قلبی ہے جس کی تاریخ میں مثال تلاش کیجیے تو نہیں ملے گی.. وہ متجسس ہے اسلام کی اصل روح تک پہنچنے کے لیے چنانچہ وہ قرآن پاک کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہے.. علماء کرام سے ملاقاتیں کرتا ہے اور بالآخر وہ حج کرنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے.. اور یہ حج ایک مرتبہ پھر اس کے اندر ایک بڑی تبدیلی لاتا ہے.. کچھ اور کا اور کر دیتا ہے اور اس پر آشکار ہوتا ہے کہ وہ تو اب تک اسلام کی ایک مسخ شدہ صورت کی پیروی کرتا رہا ہے.. اسلام کے پیغام میں تو رنگ و نسل کی برتری کی گنجائش ہی نہیں.. وہ میلکم ایکس سے حاجی شہباز ہو جاتا ہے.. امریکہ واپس آتا ہے اور عالی جاہ محمد اور اس کے پیروکاروں سے اختلاف کرتا ہے کہ اسلام تو یہ نہیں جس کا پرچار تم لوگ کر رہے ہو.. اسلام میں تو سارے انسان برابر ہیں.. اگر گورے کو کالے پر برتری نہیں تو کالے کو بھی گورے پر برتری نہیں جو تم سکھا رہے ہو..

میں نے حاجی شہباز کے بارے میں جو دستاویزی فلمیں دیکھی ہیں ان میں جب وہ سٹیج پر کھڑا ہوتا ہے تو اس کی تقریر سیدھی دل میں اترتی ہے.. جیسے ایک مفکر اپنی فکر کی ترویج کر رہا ہو.. جیسے یہ خیالات اور افکار اس پر اتر رہے ہوں.. وہ ایسا سحر بیان شخص ہے.. بے شک وہ ایک سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ہے.. اس کی آنکھوں پر ایک دبیز چشمہ ہے لیکن وہ ایک درویش دکھائی دیتا ہے.. اس کی خودنوشت کا مطالعہ کیجیے تو وہ اس میں اپنی گزشتہ زندگی کے جرائم اور خباثتوں کا کھل کر اقرار کرتا ہے.. اور پھر امریکہ کی نسلی اور سیاسی صورت حال کا ایک مفکرانہ تجزیہ کرتا ہے.. عالی جاہ محمد کے پیروکار اس کے اختلاف کو برداشت نہیں کر سکتے.. وہ اسے اپنے لیڈر کے لیے ایک خطرہ

سمجھتے ہیں اور ایک تقریر کے دوران اسے گولیوں سے چھلنی کر دیتے ہیں.. وہ بیشتر سیاہ فاموں کے لیے ایک شہید کا درجہ رکھتا ہے..

کولمبیا یونیورسٹی کی قربت میں.. جہاں براڈوے سٹریٹ کا اختتام ہوتا ہے وہاں سے ایک ایونیو کا آغاز ہوتا ہے جو سینٹرل پارک تک چلا جاتا ہے اور یہ ''میلکم ایکس بولیوارڈ'' ہے اور وہیں سے ہارلم کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے..

ویلکم ٹو ہیونلی ہارلم..

ہارلم بھی نیویارک کے اولین قبضہ گروپ ڈچ باشندوں کی زبان کا ایک لفظ ہے..

اور ہارلم ہے کیا؟

نیویارک کی سفید ثقافت کے درمیان میں سیاہ زندگی کا ہمکتا ہوا.. پرجوش، ابلتا ہوا ایک سیاہ جزیرہ جس کے موسم، لباس، بولیاں اور شکلیں منفرد ہیں اور بقیہ شہر سے جدا ہیں.. آپ کولمبیا یونیورسٹی کی جانب سے جب اس علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو واضح طور پر ایک تبدیلی کا احساس ہوتا ہے جیسے ایک سرحد عبور کر کے کسی اور ملک میں داخل ہو گئے ہوں.. ہر شے بدل جاتی ہے.. یہاں تک کہ ہوا میں جو مہک ہے وہ بھی بدل جاتی ہے..

یہاں کی صبحیں خوابیدہ ہیں.. دوپہریں اونگھتی ہیں اور راتیں جاگتی ہیں..

یہاں کے لباس انوکھے اور شوخ ہیں.. ایک سیاہ فام چلی آ رہی ہے اور اس نے دو چار دھجیوں اور چند زیورات کے سوا کچھ نہیں پہنا ہوا اور اس کے برابر میں جو سیاہ فام عورت ہے وہ حجاب میں ہے.. اگر کچھ حضرات صرف نیکروں میں گھوم رہے ہیں تو کچھ ایسے بھی ہیں جو سر پر ٹوپیاں جمائے لمبے چوغوں میں ملبوس ہیں.. جس کا جو جی چاہتا ہے پہنتا ہے اور.. لیکن جتنے بھی پہناوے ہیں ان کے رنگ بھڑکیلے اور شوخ ہیں..

یہاں کی بولی کے انداز اور لہجے جداگانہ ہیں.. ان کے اپنے محاورے اور استعارے ہیں جو نیویارک اور امریکہ میں مقبول ہوتے ہیں اور پھر پوری دنیا کی زبانوں میں جگہ پا کر نوجوانوں، موسیقاروں اور بے پرواہ روحوں کا اظہار بن جاتے ہیں.... ہے مین.. دوستوں کے لیے ایک طرز تخاطب ہے.. اور محبوبہ کے لیے ''ہے بی بی'' پسندیدہ ہے.. اور اگر کچھ ''کول'' ہے تو آخری

توصیف ہے اور اگر لطف اٹھانا ہے تو ''چل'' کرنا ہے.. یہاں کی شکلوں میں بھی بے پناہ تنوع ہے.. وہ اتنی سیاہ بھی ہوسکتی ہیں کہ ان کے سامنے اندھیرا روشنی لگے.. ایسی آبنوسی کشش والی بھی ہوسکتی ہیں کہ ان کے قریب سے گزرنے والا ان کے سحر کا شکار ہو کر وہیں فٹ پاتھ پر گر کر جان دے دے.. اور اسی طور اتنی ہولناک بھی ہوسکتی ہیں کہ انہیں دیکھتے ہی دہشت زدہ ہو کر فوت ہو جائے.. بہت سی شکلوں میں سفیدی کی گھلاوٹ ہے تو یہ اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ پچھلے زمانوں میں ان کے سفید فام آقاؤں نے ان کے خون میں اپنے خون کی گردش کی تھی کہ وہ قانونی طور پر اپنی غلام نیگرو عورتوں کے بدن بھرنے کا اختیار رکھتے تھے..

اگر کسی بھی نیگرو عورت یا مرد میں سفیدی کا عنصر نمایاں ہے تو یہ اس کی آبائی مجبوری اور بے بسی کی دلیل ہے..

ایک عرصے تک سفید فاموں اور ان کے پادریوں نے کھلے عام یہ تبلیغ کی کہ سیاہ فام لوگ دراصل خدا کے بھی دھتکارے ہوئے ہیں اور اگر ہم انہیں اپنے کلیساؤں میں عبادت کرنے کے لیے بھی داخل نہیں ہونے دیتے تو یہ مشیت ایزدی ہے کہ ہم خدا کو دکھی نہیں کرنا چاہتے ''خانہ بدوش'' میں میں نے فلارنس کا ایک قصہ بیان کیا ہے..

اُس شہر میں ایک مشہور زمانہ ''جنت کا دروازہ'' ہے جس کے چوکھٹوں میں بائبل کی مختلف کہانیاں کندہ کی گئی ہیں.. میرے ہمراہ ایک امریکی لڑکی وینڈی تھی اور سیاحوں کے ہجوم میں ایک ادھیڑ عمر امریکی جو میری اور اُس کی رفاقت کو ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اُس نے خاص طور پر وینڈی سے مخاطب ہو کر دروازے کے ایک چوکھٹے میں کندہ بائبل کی ایک کہانی یوں بیان کی '' یہ حضرت نوح کی حکایت کو بیان کرتی ہے.. کہ وہ کیسے طوفان کے تھمنے کے بعد زمین پر اُترے.. سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہاں انگور کی بیلیں کاشت کیں پھر اُن انگوروں سے رَس کشید کر کے اتنا پیا کہ مخمور ہو کر اپنے خیمے میں اپنے لباس سے لاپروا جا لیٹے.. اُن کا بیٹا ہیم خیمے میں داخل ہوا تو اپنے باپ کو برہنہ حالت میں دیکھ کر باہر آ گیا.. پھر شیم اندر گیا تو اُس نے یہ احتیاط کی کہ ایک چادر اپنے اور اپنے باپ کے درمیان تان کر اُس سے گفتگو کی.. چونکہ ہیم نے اپنے والد کو برہنہ دیکھ لیا تھا اس لیے نوح نے بددعا کہ اُس پر ابد تک خدا کی پھٹکار ہوگی.. اس بددعا سے ہیم کا رنگ سیاہ ہو گیا.. تو یہ سب لوگ جو سیاہ فام ہیں ہیم کی اولاد میں سے ہیں اور انہیں ناپسند کرنا بائبل اور خدائی

احکام کے عین مطابق ہے..''

وہ ایک جنوبی سفید فام تھا اور پورے امریکہ کی نمائندگی کرتا تھا پھر بھی ایسے عقیدے کے لوگ بھی موجود ہیں.. وینڈی نے معذرت کرتے ہوئے مجھے اس حقیقت سے آشنا کیا۔

اسلام کی جانب نیگروز کی رغبت کا بنیادی سبب یہی ہے کہ اس میں رنگ اور نسل میں کسی کو برتری حاصل نہیں.. اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں اور صرف وہ برتر ہیں جو پرہیزگار اور اطاعت گزار ہیں.. اس حوالے سے اگر ان کے لیے سب سے بڑی کشش حضرت بلال حبشیؓ ہیں تو یہ ایک قدرتی ردعمل ہے.. جنہوں نے ساری حیات نہ کسی آسائش کی اور نہ کسی عہدے کی خواہش کی.. صرف رسول اللہ کی قربت کے خمار میں گم رہے.. فتح مکہ کے بعد خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر وہاں پہلی اذان دینے کی سعادت بھی بلالؓ کے نصیب میں آئی اور عشق ایسا تھا کہ اپنے محبوب کے وصال کے بعد اذان دینے کو بھی جی نہ چاہا اور گوشہ نشیں ہو گئے جب کہ اُن کے آس پاس عہدوں کی تگ و دو جاری تھی.. البتہ ایک روایت ہے.. میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ مصدقہ ہے یا نہیں کہ اس کے بعد صرف ایک بار حضرت فاطمہؓ کی منت سماجت کرنے پر مدینے میں اذان دی تو لوگ ان کی آواز سن کر دیوانے ہو گئے.. اپنے رسولؐ کی یاد میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگے.. کہا جاتا ہے کہ اہل مکہ نے ایک بار حضرت بلالؓ کے لہجے پر اعتراض کیا کہ وہ ''اشہدان لا الہ'' کی بجائے ''اسہدان لا الہ'' کہتے ہیں تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بلال کی ''اسہدان لا الہ'' تم سب لوگوں کی ''اشہدان لا الہ'' پر بھاری ہے.. بلال کے سامنے خلفائے راشدین میں سے بھی کوئی سر اٹھا کر بات نہیں کرتا تھا.. مؤدب ہو کر ہم کلام ہوتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ جنہوں نے انہیں خرید کر غلامی سے نجات دلائی تھی وہ بھی اُن کی موجودگی میں مؤدب ہو جاتے..

جب حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو معزول کیا تو انہیں خدشہ تھا کہ کہیں وہ مشتعل ہو کر اپنی وفادار فوج کے ساتھ مدینے پر حملہ نہ کر دیں تو انہوں نے معزولی کا یہ پروانہ دمشق لے جانے کے لیے حضرت بلالؓ کو منتخب کیا اور حضرت خالدؓ بن ولید نے ان کے سامنے اپنا سر جھکا دیا.. خلیفہ وقت کے حکم کے مطابق پوری فوج کے سامنے ان کی دستار اتار کر اس سے ان کی مشکیں کسی گئیں اور پھر معزولی کا حکم سنایا گیا.. اس کے بعد حضرت بلالؓ نے کہا ''اے خالد.. یہ سب کچھ میں نے خلیفہ کے حکم کے تابع کیا جو میرا فرض تھا اور اب میں وہ کروں گا جو میری آرزو

ہے'' انہوں نے خالدؓ کی مشکیں کھول کر ان کے سر پر وہی دستار باندھی اور ان کے لیے دعا کی..

حضرت بلالؓ آخری عمر میں دمشق میں گوشہ نشین ہوئے اور وہیں باب الصغیر قبرستان میں دفن ہوئے.. اور مجھے اپنے من موہنے صحابی کی مرقد پر فاتحہ پڑھنے اور کچھ لمحے ان کی قربت میں گزارنے کا شرف حاصل ہوا..

ان کی شخصیت آج امریکہ کے سیاہ فاموں کو اسیر کر رہی ہے..

بہت کم لوگوں نے.. یہاں تک کہ جید علمائے کرام نے بھی اسلام کے سیاہ فام کردار پر غور نہیں کیا وہ حضرت بلال حبشیؓ سے آگے نہیں جاتے.. وہ بہت کم غور کرتے ہیں یا بہت کم ذکر کرتے ہیں کہ رسول اللہ کی رگوں میں بھی سیاہ خون کی آمیزش تھی.. اماں ہاجرہ کا تعلق قبطی نسل سے تھا اور ان کی رنگت میں سیاہی تھی.. ہماری ماں حضرت ماریہ قبطیہ کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ بھی سیاہی مائل رنگت کی تھیں اور میرے بابا کے آخری اور چہیتے بیٹے حضرت ابراہیمؑ انہی کے بطن سے تھے جن کی شباہت دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے فرمایا تھا کہ جب یہ رسول اللہ کی عمر کو پہنچیں گے تو اتنی مشابہت ہوگی کہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ وہ رسول اللہؐ ہیں.. اتنی مشابہت تھی.. اور اس شباہت میں ظاہر ہے ہماری ماں ماریا قبطیہ کی سیاہ رنگت کی آمیزش تھی..

میں دنیا کے بارے میں بہت ہی کم علم رکھتا ہوں.. لیکن میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اگر اسلام کا یہ پہلو.. جہاں حضرت بلالؓ کے علاوہ.. اماں ہاجرہ اور ماریہ قبطیہؓ اور حضرت ابراہیمؑ کی صورت میں جو سیاہ طلسم گھلا ہوا تھا اسے بھی امریکی سیاہ فاموں کے سامنے لایا جائے تو یہ دین کی ترویج میں بے حد معاون ثابت ہوگا.. اور حضورؐ نے بھی وصیت فرمائی تھی کہ جب تم ان علاقوں کو فتح کرو جو اماں ہاجرہ اور ماریہ کے آباؤ اجداد کے ہیں تو ان سے اچھا سلوک کرنا کہ وہ میرے ننھیال میں سے ہیں اور ان کے ساتھ میرا سمدھیانہ رشتہ ہے..

جن دنوں سیاہ رنگت بہت معتوب تھی' راندۂ درگاہ تھی.. بدشکلی' غلامی' گنوار پن اور جہالت کی علامت تھی ان دنوں کے سفید فام نسلی تفاخر کے مقابلے میں ایک نعرہ' ایک سلوگن وجود میں آیا کہ.. بلیک از بیوٹی فل..

بلیک میوزک' بلیک رنگت' بلیک چہرے' بلیک ثقافت.. یہاں تک کہ منرل واٹر کی بوتلیں

فروخت کرنے والا بھی ''بلیک واٹر'' کا نعرہ لگا رہا ہے..

فیشن کے رسائل' بل بورڈ' نیون سائن جن پر صرف گوریوں کی شکلیں ہوتی تھیں اور یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ سیاہ فام عورتوں میں بھی کشش ہو سکتی ہے' وہ سب سیاہ ماڈلز کے چہروں سے بھر گئے.. آج بھی امریکہ کی سب سے مہنگی ماڈل نومی کیمبل ہے جو کم از کم ارب پتی ہو چکی ہے اور وہ سیاہ فام ہے..

ایک وہ دن تھے جب نیگرو اپنے آقاؤں کے لباس اور بولی کی نقل کر کے ان جیسا ہو جانے میں فخر محسوس کرتے تھے.. اپنے آپ کو گورا کرنے کے چکر میں رہتے تھے لیکن اب یہ انقلاب آیا کہ وہ اپنی رنگت پر ناز کرنے لگے.. یہاں تک کہ جن سیاہ فاموں کی رنگت میں کچھ سفیدی گھلی ہوئی تھی ان کی نسبت جو سراسر گھٹا ٹوپ اندھیرے والے سیاہ رنگ کے تھے انہیں بیوٹی فل کہا جانے لگا..

مختلف سماجی نفرتوں کے ردعمل کے علاوہ ایک مرتبہ پھر یہ ناول ''دی روٹس'' کا اعجاز تھا کہ وہ اپنے رنگ' افریقی پس منظر اور ثقافت پر فخر کرنے لگے.. اپنے افریقی ماضی کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے انہوں نے نیگرو اور امریکی نیگرو کا لاحقہ ترک کر کے اپنے آپ کو ''افرو امریکی'' قرار دیا.. انہوں نے افریقی پہناوے اپنائے' افریقہ جا کر اپنی آبائی دُھنوں کو تلاش کر کے انہیں امریکہ میں رائج کیا.. ڈُلو اور مسائی قبیلوں کے رواج اپنائے.. بالوں کو مینڈھیوں میں گوندھ کر سجایا اور ڈُلو سرداروں کی مانند ہاتھ میں رنگین چھڑیاں تھام کر چلنے لگے.. صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ درختوں پر کودتے بندر نہ تھے جنہیں سفید فام ترس کھا کر تہذیب سکھانے کے لیے لے آئے تھے بلکہ ایک انتہائی تہذیب یافتہ معاشرے کے افراد تھے جس کی اپنی ثقافتی شناخت تھی اور تب سے تھی جب امریکیوں کے بزرگ حضرات یورپ میں وحشیوں ایسی زندگی بسر کرتے تھے' اپنے بدن پر مختلف اشکال' بیل بوٹے' جانور اور نعرے وغیرہ گندھوانے کا رواج بھی افریقہ سے آیا.. آج امریکہ یا کینیڈا وغیرہ کی کوئی سٹریٹ ہو وہاں بہر طور دو چار دکانیں ''ٹیٹو'' کی ہوں گی..

ہمارے ہاں بھی پرانے زمانوں میں یہ رواج عام تھا.. میرے ابا جی کے دائیں بازو پر ایک سیاہ دھبہ ہوا کرتا تھا.. وہ بتایا کرتے تھے کہ بچپن میں' میں اپنے ایک دوست چودھری منظور کے ہمراہ ایک دیہاتی میلے پر گیا تھا تو میں نے بھی دوسرے بچوں کی مانند بے حد اذیت سہہ کر اپنے

بازو پر انگریزی میں اپنا نام ’’رحمت خان‘‘ گندھوایا لیکن جب میں ذرا بڑا ہوا تو مجھے یہ عمل بہت برا لگا اور میں نے پھر اذیت سہہ کر اسے مٹوا دیا.. اباجی کو آخری غسل دیتے ہوئے ان کے بازو پر وہ سیاہ دھبہ مجھے اب تک یاد ہے اور اداس کرتا ہے.. میرا خیال ہے کہ ’’ٹیٹو‘‘ کا یہ رواج ہمارے ہاں افریقہ سے نہیں آیا تھا‘ یہ اسی برصغیر کی قدامت کا ایک پرتو تھا..

’’ٹیٹو‘‘ ہمارے ہاں کب کا متروک ہو چکا لیکن مغرب میں یہ تازہ ترین کشش اور فیشن ہے.. بہت کم ایسے لوگ ہوں گے.. نوجوانوں میں اور بوڑھوں میں بھی جن کے بدنوں پر ٹیٹو کا کوئی گل بوٹا یا نقش نہ گندھا ہو.. بلکہ میں نے کینیڈا میں ایک نہایت سنجیدہ پڑھی لکھی دراز قامت اور شلوار قمیض میں ملبوس ایک پاکستانی لڑکی کو دیکھا کہ ان کی آستین ذرا سرکی تو کندھے کے قریب ایک مزاحیہ سا ہاتھی بچہ جھول رہا ہے‘ معلوم ہوا کہ ہاتھی ان کی کمزوری ہیں اور وہ ان کی ہر ادا پر مرتی ہیں..

میرے ایک ٹیلیویژن شو میں مانچسٹر میں مقیم ایک پاکستانی خاتون نے شرکت کی تو ان کی گردن کے نیچے ایک نازک مقام کی قربت میں جو ایک گل بوٹا گندھا تھا اس کی وجہ سے بار بار ریکارڈنگ روکنی پڑی اور ان درمیانی عمر کی قدرے چنچل خاتون سے بار بار درخواست کی گئی کہ براہ کرم اس گل بوٹے کو ذرا پردہ پوش کر دیجیے‘ ہماری سنسر کوڈ اس سے مجروح ہو جائے گی.. اور انہیں اس لطیف نکتے کی سمجھ نہیں آتی تھی.. ہماری میک اپ آرٹسٹ نے بعد میں مجھے اطلاع کی کہ ان خاتون کے بدن پر صرف وہی تنہا گل بوٹا نہ تھا اور انہوں نے نہایت رازداری سے مجھے بتایا کہ مقامات آہ و فغاں کی قربت میں بھی کچھ ایسے گل کھلے ہیں..

ہارلم میں بھی ’’ٹیٹو‘‘ کی دکانیں افراط میں ہیں..

میری عمر میں آ کر نہایت معزز اور قابل تعظیم کیسے لگا جا سکتا ہے اس کے بارے میں بھی شاید بہت سے لوگوں سے بہتر جانتا ہوں لیکن اکثر اوقات میں غیر معزز ہونا چاہتا ہوں وہ کرنا چاہتا ہوں جو میرا دل چاہتا ہے‘ چاہے میرا مذاق ہی کیوں نہ اڑایا جائے.. ان دنوں بہت سے مرد کانوں میں بالیاں پہنتے ہیں.. ہمارے ہاں تو ایک مدت سے خاندانی موسیقار بالیاں پہنتے آئے ہیں تو ایک بار بہت جی چاہا کہ میں بھی اپنے کانوں کو بالیوں سے آراستہ کروں لیکن فساد خلق کے خوف سے باز رہا.. حالانکہ پنجاب کی قدیم ثقافت میں جو محبوب گھر میں آتا تھا وہ ہمیشہ سونے کے کینٹھے

کو گلے میں ڈالے ایک مہمان ہوا کرتا تھا اور کانوں میں سونے کی بالیاں بھی ہوتی تھیں.. لیکن معزز ہونے کے معیار بدلتے رہتے ہیں اور وہ بدل گئے.. اسی طور میرا بہت جی چاہا کہ میں بھی اپنے بدن کے کسی حصے پر کوئی نقش‘ کوئی شکل‘ کوئی منظر گندھواؤں.. لیکن مجھے پاکستان واپس جانا تھا.. بیگم اور بال بچوں کا سامنا کرنا تھا‘ صرف اس لیے اجتناب کیا..

ویسے میں نے اس امکان پر غور بہت کیا کہ اگر میں اپنے بدن کے کسی حصے پر ’’ٹیٹو‘‘ گندھواتا تو میری پسند کیا ہوتی.. کون سی پسند ہوتی جس سے میں عمر بھر چھٹکارا حاصل نہ کر سکتا اور وہ میری من پسند ہوتی‘ میرے بدن کا دائمی حصہ بن جاتی اور مجھے پشیمانی نہ ہوتی..

شاہ گوری کا کوئی نقش.. جو مدھم پڑتا جاتا تھا..

جھیل کرومبر کی نیلاہٹ جو بھولتی جاتی تھی..

شاید ایک موٹا اور بھدا گرزلی ریچھ.. جو نہایت وزنی ہوتا ہے اور کینیڈا کی راکی ماؤنٹینز کی ندیوں میں تیرتی کنواری مچھلیاں پکڑتا ہے..

شاید ایک پُرمزاح ہاتھی کا بچہ..

یا وہ سمندری پرندہ جو ساحلی شہر وکٹوریہ کے آسمانوں پر شور مچاتا گزرتا تھا.. جس کی چونچ کھلی تھی اور وہ ہانپتا پسینے سے بھیگتا تھا..

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں جہاں کولمبیا یونیورسٹی کے علاقے اختتام کو پہنچتے ہیں اور براڈوے سٹریٹ کی آخری گلی آتی ہے وہیں سے سیاہ ساجن کی گلیوں کا آغاز ہو جاتا ہے.. ہارلم شروع ہو جاتا ہے.. ان سیاہ ساجنوں کے فرشتوں کو بھی جو یقیناً سیاہ رنگ کے ہوں گے یہ گمان نہیں ہوگا کہ بہت دور پاکستان کے ایک قصبے قصور میں جنم لینے والی.. اپنے زمانے کی پرکشش ترین گائکہ نے جس کا نام نور جہاں تھا تاریخ میں پہلی مرتبہ ’’بلیک از بیوٹی فل‘‘ کا سلوگن ایجاد کیا تھا اور کالوں کو گوروں پر فوقیت دیتے ہوئے ’’کالا شاہ کالا.. میرا کالا اے دلدار.. تے گوریاں نوں پرے کرو‘‘ گایا تھا..

اگر کالوں کو نور جہاں کے اس گیت کا علم ہوتا تو وہ بلاشبہ اسے کالوں کا قومی ترانہ قرار دے کر اس کی گانے والی کے قدموں میں بچھ جاتے..

ہارلم میں داخل ہوتے ہی مجھے چمڑے کے ملبوسات کی ایک دکان دکھائی دی جہاں عورتوں کے بگ بگ سائز کی جیکٹیں اور زیر جامہ فروخت ہوتے تھے البتہ اس کا شٹر گرا ہوا تھا اور اس شٹر کی آہنی چادر پر ایک پینٹنگ دکھائی دیتی تھی جس کی مصوری کا معیار ہماری ٹرک پینٹنگ سے ذرا کمتر تھا۔ شٹر کے نچلے حصے میں نیویارک شہر کی بلند عمارتوں کے ہیولے ہیں اور ان پر ایک جادوئی سفید آسمان ہے جس پر نیلسن منڈیلا بازو پھیلائے مسکرا رہا ہے.. اس کے ایک جانب مارٹن لوتھر کنگ کسی سوچ میں غرق تصویر ہے اور دوسری جانب میلکوم ایکس کا چہرہ ہے.. یعنی یہ تین شخصیتیں اہل ہارلم کی ہیرو ہیں.. وہ نیلسن منڈیلا کو اپنا ''بابا'' مانتے ہیں' وہ کیا کل جہان مانتا ہے اور اس میں' میں بھی شامل ہوں.. اور پھر مارٹن لوتھر کنگ اور حاجی شہباز ہیں جنہیں وہ اپنے نجات دہندہ مانتے ہیں.. منڈیلا کے سر کے عین اوپر ''آیئے ایک خواب میں شریک ہوتے ہیں'' لکھا ہے.. اور خواب وہی' انصاف پر مبنی برابری کی سطح پر ایک بہتر اور روشن مستقبل کا خواب..

منڈیلا کے لبادے پر ایک تحریر ہے ''وَیلکم ٹُو ہَیونلی ہارلم۔''

اس بند شٹر سے ٹیک لگائے ایک تنومند نیگرو بیئر پینے میں مگن تھا.. اس نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے گھورا کہ میں نے شٹر کی تصویر اتارتے ہوئے اسے بھی شامل کر لیا تھا..

اور سلجوق نے بھی مجھے برابر کی خشمگیں نگاہوں سے گھورا کہ ابو کیا کر رہے ہیں.. ہارلم میں اس طرح تصویریں نہ اتاریں' ان کالوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا.. اب یہاں میں اپنے لئے اچنبھے کا باعث بننے والے ایک اور مسئلے کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں.. میرا خیال تھا کہ ایشیائی باشندے بشمول پاکستانیوں کے امریکی نیگروز کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہوں گے جب کہ ایسا نہیں ہے.. اسی طور یہ بھی میرا خیال تھا کہ کالے حضرات ان نیم کالوں' ایشیائی لوگوں کو اپنا ہم رنگ بھائی سمجھ کر ان کے ساتھ الفت کی پینگیں بڑھاتے ہوں گے جب کہ ایسا بھی نہیں ہے.. کالے ان ایشیائی لوگوں کو اپنا حریف تصور کرتے ہیں کہ جتنے بھی معمولی اور گوروں کے نزدیک ناپسندیدہ جاب ہوتے ہیں' ان کے لیے یہی دو نسلیں امیدوار ہوتی ہیں اور چونکہ ایشیائی قدرے فرمانبردار یعنی ''یس سر'' اور ''جو حکم جناب عالی'' قسم کے ہوتے ہیں اور ادھر کالے ''فک یُو'' اور ''گو ٹو ہیل'' خصلت کے مالک ہوتے ہیں اس لئے اس نوعیت کے خاکروبی' کوڑے کے ڈرم اٹھانے والے.. گندگی جمع کرنے والے' فٹ پاتھ پر جھاڑو لگانے والے یا ریستورانوں میں برتن دھونے والے

جتنے جاب ہوتے ہیں ان کے لیے عام طور پر گورے ایشیائی لوگوں کو منتخب کرتے ہیں.. چنانچہ قابل فہم طور پر کالے انہیں عزیز نہیں رکھتے..

یہاں تک کہ جو پڑھے لکھے' متمول اور روشن خیال ایشیائی ہیں وہ بھی کالوں سے دور دور رہتے ہیں.. ان کے نزدیک وہ کم تہذیب یافتہ اور سرکش ہیں اور وہ گوروں کے نزدیک ہو کر بیٹھتے ہیں.. اگرچہ یہ گورے انہیں کم ہی نزدیک آنے دیتے ہیں اور اس کے باوجود وہ زبردستی اپنی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچا کر ان کے نزدیک ہو کر بیٹھتے ہیں.. اس صورتِ حال میں کچھ کالوں کا بھی قصور ہو سکتا ہے کہ ان کے غلامی کے ادوار کی محرومیاں اور ذلتیں ابھی تک ان کی روح کے گھاؤ ہیں جو مندمل نہیں ہو رہے.. ماضی کی سیاہ بختیوں نے انہیں کسی حد تک قنوطی اور بدتمیز بنا دیا ہے.. اگر وہ گوروں کو نہیں بخشتے تو یہ ایشیائی کس باغ کی مولی ہیں.. اگرچہ وہ خود تو سراسر اس امریکی باغ کی اگرچہ کڑوی مولی ہیں تو یہ ایشیائی کسی اور باغ کی مولی ہوتے ہوئے بھی اس باغ میں آ گئے ہیں تو کیوں آئے ہیں.. اگر آ ہی گئے ہیں تو اپنی اوقات پہچانیں.. امریکہ ہم ہیں.. ادھر ایشیا کے طویل کولونیئل ماضی کا بھی کچھ قصور ہے کہ یہ لوگ اقدار کے حوالے سے اور نفسیاتی طور پر ''کالے انگریز'' ہو چکے ہیں اور اپنے سابق آقاؤں کے نکتۂ نظر کے قریب ہیں کہ کالے ہیں ہی کمتر.. اور وہ ان کی موجودگی میں آرامدہ نہیں محسوس کرتے.. یہاں ہمیں ایک عجیب تاریخی تضاد نظر آتا ہے.. یعنی سیاہ فام تو اپنے آقاؤں کے رسوم و رواج ترک کر کے اپنی الگ شناخت پر فخر کرتے ہیں جب کہ ایشیائی آج بھی اپنے سابق آقاؤں کے نقشِ قدم پر چلنا عین سعادت سمجھتے ہیں.. اگر بس ڈرائیور ایک سیاہ فام ہے تو برابر میں براجمان ایشیائی کہے گا.. ان کالوں کا کچھ پتا نہیں.. جانے یہ بس سیدھی بھی چلا سکتا ہے کہ نہیں..

اور جواب میں اگر یہ گزارش کی جائے کہ اگر یہ سیاہ فام اتنا اناڑی ہوتا تو نیویارک بس سروس کے ڈرائیور کے طور پر کبھی نہ چنا جا سکتا..

اُدھر سے ایک طنزیہ مسکراہٹ.. جناب آپ نہیں جانتے.. ایک خاص پالیسی کے تحت گورے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ بے شک سیاہ فام نالائق ہوں لیکن انہیں اس معاشرے میں گھل مل جانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں تاکہ انہیں اپنی محرومی کا احساس نہ ہو تو یہ رعایتی لوگ ہیں..

ایسے موقعوں پر ایک خیال ہمیشہ مجھے ستاتا ہے کہ ہم نے پاکستان میں بہت سے ہم وطنوں کو.. جن میں بنگالی بھی شامل تھے اپنے سے کمتر جانا اور اب بھی کچھ اور قومیتوں کو جانتے ہیں تو کیا ہم بھی انہیں معاشرے میں برابری کے مواقع فراہم کر کے ان کی محرومیاں دور نہیں کر سکتے تھے.. یہ تو سراسر الگ قصہ ہے کہ بنگالیوں نے ایک تباہ حال بنگال کو کیسے اپنی دانش سے تعمیر کیا.. جمہوریت قائم کی.. یونس ایسے جواہر پیدا کئے اور ملکوں کی برادری میں ہم سے کہیں معتبر ٹھہرے.. چنانچہ یہ تاریخ ہے جو فیصلہ کرتی ہے کہ کون کمتر ہے اور کون برتر..

ایک واقف کار نوجوان جو جائیداد کی خرید و فروخت کے علاوہ ایک گیس سٹیشن خریدتا ہے تو اُس کا عملہ بھرتی کرتے ہوئے احتیاط کرتا ہے کہ ان میں کوئی سیاہ فام نہ ہو.. وہ ایک نیپالی گورکھے' ایک سکھ یا سری لنکن کو بخوشی ملازم رکھ لیتا ہے لیکن ایک نیگرو کو ہرگز نہیں..

کیوں؟

''انکل.. یہ کالے لوگ دھونس جماتے ہیں.. کام بھی نہیں کرتے اور دھمکیاں دیتے رہتے ہیں.. میں نے بزنس کرنا ہے' کالوں کے حقوق کے لیے جدوجہد تو نہیں کرنی.. یہ جو نیپالی سری لنکن یا سکھ ہوتے ہیں یہ لوگ کام بھی دل لگا کے کرتے ہیں اور شکر گزار بھی ہوتے ہیں.. البتہ میرا ایک سکھ ملازم جو ہے وہ کبھی کبھار دارو پی کر اودھم مچاتا ہے لیکن اگلی سویر ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتا ہے..''

تو کیا سیاہ فاموں کو روزی کمانے کا کوئی حق نہیں ہے؟

''انکل..'' وہ پاکستانی نوجوان یکدم ہنسنے لگتا ہے' وہ یہ حق ہم سے چھین لیتے ہیں.. چند ہفتوں کے بعد بڑی باقاعدگی سے میرے گیس سٹیشن پر مسلح کالے آتے ہیں اور نقدی لوٹ کر لے جاتے ہیں..''

اُدھر فلوریڈا میں میری بیٹی عینی کا رویہ بھی اتنا دوستانہ نہیں.. سیاہ بالوں اور گوری رنگت کی وجہ سے اسے وہاں ہسپانوی سمجھا جاتا ہے اور وہ صرف اس لئے تھوڑی سی خوش ہو جاتی ہے کہ اس کے فیورٹ انکل تلمیذ حقانی کا فیورٹ ملک ہسپانیہ تھا اور اس کے ابّو نے ایک کتاب ''اندلس میں اجنبی'' لکھی تھی.. ورنہ وہ فوراً اس واہمے کی تردید کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے.. ''نو.. آئی ایم اے پاکستانی.. اینڈ آئی ایم پراؤڈ ٹو بی اے پاکستانی''.. اگرچہ اس کے چند نہایت قریبی دوست سیاہ فام

ہیں لیکن اس کے باوجود وہ سیاہ فاموں کے لیے میری محبت اور ہمدردی کے جذبات کو سمجھنے سے عاری ہے.. اور کبھی کبھار کہتی تھی کہ ابو آپ تو یہاں چند روز کے لیے آتے ہیں' اگر یہاں آپ کا قیام کچھ برسوں پر محیط ہو تو شاید آپ بھی ایسا محسوس نہ کریں..

عین ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو.. اور ایسا نہ بھی ہو..

میں نے امریکہ میں اپنے مختصر قیام کے دوران.. اور میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ جس شخص نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا سے کسی گھاٹ سے ایک طویل عرصہ پانی پیتے رہنے کے بعد یہ آشکار نہیں ہوتا کہ پانی میٹھا ہے یا کڑوا.. چند ایک گھونٹ ہی کافی ہوتے ہیں.. تو اس مختصر قیام کے دوران اگرچہ معدودے چند سیاہ فاموں کو میں نے کم تعلیم یافتہ اور قدرے بدتمیز پایا.. اور اتنی ہی مقدار میں گوروں کو بھی کم تعلیم یافتہ اور قدرے بدتمیز پایا.. لیکن یہ ہے کہ سیاہ فاموں کے دل تک رسائی کے راستے ذرا الگ ہیں.. آپ انہیں ایک روایتی ''کیا حال ہے؟'' سے اسیر نہیں کر سکتے.. ہاں آپ ان کی محرومیوں اور یونانی المیہ ڈراموں سے کہیں بڑھ کر رنج زدہ زندگی کو نظر میں رکھتے ہوئے ان کی جانب بڑھیں تو وہ کھلے دل سے آپ کی جانب کھنچے چلے آئیں گے.. وہ گورا ثقافت .. جو ہماری ثقافت ہے.. اس سے بہت الگ اور جدا ہیں.. لیکن اتنے ہی اچھے اور ہمدرد انسان ہیں جتنے کہ گورے.. بلکہ کبھی کبھار ان سے کہیں بڑھ کر.. جس نسل نے نیلسن منڈیلا' میلکم ایکس' پیٹرس لومبا' ٹونی ماریسن' سیونیکا' محمد علی اور ہماری ماؤں.. ہاجرہ اور ماریہ قبطیہ جیسے لوگ جنم دیے ہوں وہ بھلا کسی بھی نسل کے مقابلے میں کیسے کمتر ہو سکتی ہے.. اور جس نسل سے میرے آقا بلال حبشیؓ ہوں تو اس نسل کی تمام تر کوتاہیاں اور گناہ تو بس ان کے وجود کی برکت سے دھل جاتے ہیں.. صرف ایک بلال اس نسل کی برتری کے لیے کافی ہیں.. اگر اسلام میں رنگ و نسل کی برتری ہوتی تو...

میں نیویارک کے اس سیاہ جزیرے سے ہارلم میں تنہا تو نہیں چلتا تھا' میرے آگے دنیا کا خوبصورت ترین جوڑا بھی چلتا جاتا تھا..

سلجوق اور رابعہ آگے آگے چلے جا رہے تھے..

اور دنیا میں وہ کون سا باپ ہے جسے اپنا بیٹا اور بہو دنیا کا خوبصورت ترین جوڑا نہیں لگتے..

وہ دونوں میری تعظیم میں ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر نہیں چل رہے تھے اگرچہ ان

کے درمیان جو رشتہ تھا وہ ان کی مسکراہٹوں اور ایک دوسرے کی قربت کی مسرت سے.. دریا کنارے کی ریت میں سے پھوٹنے والی نمی کی مانند ظاہر ہو رہا تھا. سلجوق ایک نیلی رالف لارین کی ٹی شرٹ اور جین میں.. مجھے تو کم از کم ہارلم بھر میں سب سے ہینڈسم لڑکا لگ رہا تھا اور رابعہ سرخ مرچ ایسی تیزی والے سُرخ کُرتے اور سیاہ جین میں.. بھورے بالوں اور سبز آنکھوں کے ساتھ اس ہارلم تو کیا اس کے پار بھی جو جہان تھے ان سب میں سے پیاری لڑکی لگ رہی تھی.. اگرچہ یہ پیاری لڑکی ہارلم کی سیاہ ثقافت اور کشش سے زیادہ یہاں کے سپر سٹورز میں دلچسپی رکھتی تھی جہاں نیویارک شہر کی نسبت کم قیمتوں پر گھریلو سامان میسر تھا، خاص طور پر باتھ روم کے لیے رنگا رنگ تولیے.. بے شک وہ میڈان پاکستان ہوں.. ہارلم کے باسیوں کی مانند یہاں جتنے بھی سٹورز اور شاپنگ مالز ہیں ان کے رنگ نرالے ہیں..

ایسے رنگ ہیں جو آپ کو بقیہ نیویارک میں کہیں دکھائی نہیں دیں گے..

ان میں فروخت ہونے والے ملبوسات' جوتے' گھریلو سامان اور فرنیچر.. نرالے رنگوں کے ہیں. شوخ' بھڑکیلے اور ہماری نظر میں قدرے واہیات ہیں لیکن یہی سیاہ فاموں کے من پسند رنگ ہیں اور اگر آپ کو یہ رنگ پسند نہیں تو آپ بھاڑ میں جا سکتے ہیں کہ آپ کو کس نے دعوت دی تھی کہ آپ ہارلم میں تشریف لائیں.. ہر نسل اور ہر قوم کا رنگوں کا انتخاب جدا ہوتا ہے جو دوسری نسل اور قوم کو نہیں بھاتا کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ جو رنگ ہمارے پسندیدہ ہیں وہی بہترین اور خوش نظر ہیں..

ہارلم کا سیاہ جزیرہ ابھی حال ہی میں ''محفوظ'' ہوا ہے..

ورنہ یہاں تو کوئی بھی غیر ملکی یعنی امریکی ہو یا نیویارکر قدم دھرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا.. اگر کوئی قدم دھرتا تھا تو جان ہتھیلی پر رکھ کر آتا تھا اور اس کی وہ جان تادیر ہتھیلی پر دھری نہیں رہتی تھی' اُچک لی جاتی تھی..

شنید ہے کہ گیارہ ستمبر کے سانحے کے بعد نیویارک کے شہریوں کی دلجوئی کرنے والے میئر جولیانی نے اپنے دور میں ایک تو ٹائمز سکوئر کو تمام تر قباحتوں اور مافیا سے پاک کر کے اتنا معزز بنا دیا کہ اب وہ نیویارک کی سب سے بڑی سیاحتی کشش ہے اور دوسرا یہ کہ ہارلم کو پاک صاف کر کے ''محفوظ'' بنا دیا..

میرے ایک قریبی اور مرحوم ہو چکے دوست مشتاق بٹ جنہیں ہم ان کے وسیع تن و توش کی وجہ سے ''کنگ کانگ آف جلال پور جٹاں'' کہتے تھے کہ یہی ان کا آبائی وطن تھا. تو وہ تقریباً تیس برس پیشتر امریکہ میں منتقل ہو گئے اور کینیڈا کی سرحد کے قریب ایک شہر ''بفلو'' میں مقیم ہو گئے.. اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ گورے کیسے لوگ ہیں کہ اپنے شہر کا نام ''بھینس'' رکھ دیا ہے.. ہم جلال پور جٹاں کی بھینسوں سے فرار ہو کر امریکہ آئے تھے اور یہاں بھی ایک ''بفلو'' یعنی بھینس سے پالا پڑ گیا. مشتاق بٹ ایسے یار طرح دار تھے کہ بھولتے ہی نہیں.. ہر برس پاکستان صرف دوستوں سے باتیں کرنے آتے.. ملتے ہی کہتے' اوئے.. اوئے میرے ساتھ باتیں کرو وہاں امریکہ میں نہ کوئی بات کرتا ہے نہ سنتا ہے' مجھے تو اپھارہ ہو رہا ہے. مجھ سے باتیں کر کے اسے ذرا کم کرو اور پھر بس میری سنو.. ہم اکثر انہیں بلیک میل کرتے کہ بھا مشتاق ہم مفت میں تمہاری باتیں نہیں سنیں گے نہ کریں گے، ہمیں ذرا کھلاؤ پلاؤ.. اور وہ ہمیں خوب کھلاتے پلاتے.. جو دوست کھاتے انہیں کھلاتے اور جو پیتے انہیں پلاتے اور جی بھر کے اگلے ایک برس کے لیے خوب باتیں کر کے ہلکے ہو جاتے..

وہ ہمیں امریکہ کی.. نیویارک کی اور خاص طور پر ہارلم کی کہانیاں سناتے کہ یار مستنصر ہارلم میں غروب آفتاب کے بعد جانا گویا اپنی موت کو دعوت دینے جانا ہے.. چنانچہ میں تو کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو شام یا رات کے وقت ہارلم گیا ہو.. دن کے وقت بھی جب ادھر سے گزر ہوتا ہے تو کار کی رفتار تیز کر کے شتابی سے گزر جاتے ہیں اور اگر وہاں اتر کر چہل قدمی کا ارادہ ہو تو اپنے ڈالر بٹوے سے نکال کر جرابوں میں پوشیدہ کر لیتے ہیں لیکن اس احتیاط کے ساتھ بٹوا بالکل خالی نہ ہو اس میں چند ڈالر ضرور ہوں کیونکہ لامحالہ جو سیاہ فام اطمینان سے آپ کو لوٹنے کے لیے آئے گا اور آپ کے سراپے کی تلاشی لے گا اور وہاں سے ایک ڈالر بھی برآمد نہ ہو تو طیش میں آ کر آپ کو چھرا گھونپ دے گا.. چنانچہ تم اگر کبھی نیویارک آؤ اور ہارلم جاؤ تو خالی جیب نہ جانا..

لیکن وہ زمانے گئے.. ان زمانوں میں ہارلم کی صورتِ حال بدل چکی ہے.. آپ بے خطر وہاں جا سکتے ہیں.. گھوم پھر سکتے ہیں.. شاپنگ کر سکتے ہیں.. صرف یہ ہے کہ وہ جو سیاہ فام ہے جو فٹ پاتھ پر چلنے والے لوگوں سے لاتعلق نہایت بردباری سے ایک پارکنگ میٹر کو کھول کر اس میں سے سکے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے تو ذرا چشم پوشی کریں' اپنے کام سے کام رکھیں اور چلتے جائیں.. یا ایک اور صاحب پبلک ٹیلی فون بوتھ کو ایک ہتھوڑی سے پبلک میں ہی سرعام ضربیں لگا کر اس

میں جمع شدہ کچھ رزق حلال حاصل کرنے کی چاہت میں ہیں تو آپ درگزر کریں اور گزر جائیں ورنہ وہ رزق حلال آپ سے بھی وصول کیا جا سکتا ہے.. پارکنگ میٹر اور ٹیلی فون بوتھ سے یہ چھیڑ چھاڑ میرا ذاتی مشاہدہ ہے..

آج ہفتہ تھا' چھٹی کا دن تھا اور ہارلم کے کوچۂ و بازار میں جو رنگین رونقیں اور بے خودی تھی وہ دیکھنے کے لائق تھی..اس رونق میں وہ تنک چڑھی احتیاط اور گریز نہ تھا جو ففتھ ایونیو یا پارک ایونیو کا خاصہ ہے.. یہاں گھومنے پھرنے میں جو ایک ڈر تھا اگرچہ اب اس کا کچھ جواز نہ تھا' لُٹ جانے کا' وہ بھی لطف دیتا تھا کہ ہائے کوئی ہمیں لوٹ ہی لے تو کیا مزا آئے..اور آپ ہر دوسرے سیاہ فام کو شک اور امید کی نظروں سے بھی تکتے ہیں کہ بھائی صاحب آپ ہمیں لوٹیں گے تو نہیں..یعنی مجھے تمہارا کچھ اعتبار نہیں' تم یقیناً مجھے چھیڑو گے..چھیڑو گے تو کتنا مزا آئے گا!

یہاں فٹ پاتھوں پر مصر کا بازار لگا تھا.

اور ہر شے ''بلیک'' تھی.. جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں منرل واٹر بھی ''بلیک واٹر'' تھا..

ایک کھچڑی داڑھی اور الجھے ہوئے بالوں والا بوڑھا دونوں ہاتھوں میں پانی کی بوتلیں تھامے راہ گیروں کو متوجہ کر رہا تھا ''دوستو..ٹھنڈا یخ پانی اور وہ بھی بلیک پانی'' یہ جو مصر کا بازار لگا تھا.. فٹ پاتھوں پر..سٹال' کھوکھے' زمین پر اشیاء کتابیں سجائے..عطر کی بوتلیں سجائے..یہاں وہ سب کچھ برائے فروخت تھا جو نیویارک میں فروخت نہیں ہو سکتا تھا..

افریقی جڑی بوٹیاں جو جانے کن عارضوں کیلئے مفید تھیں..عجیب سے محلول اور شربت، دو نمبری ڈیز کے انبار، سیاہ فام کھلاڑیوں، اداکاروں اور راہنماؤں کے پوسٹر، گھریلو طور پر تیار کردہ عطریات و خوشبویات جو کم از کم ہمیں تو سر درد کے سوا کچھ اور نہ دے سکتے تھے اور ادھر سیاہ فام خواتین انہیں اپنے وسیع اجسام پر مل مل کر نہال ہوتی تھیں اور جو انہیں سونگھتا تھا وہ نڈھال ہو جاتا تھا..ہر برانڈ کی جعلی ٹی شرٹس..پرانے جوتے اور جیکٹس..ان کے علاوہ وہاں نہایت منفرد کتابوں، پمفلٹوں اور جرائد کے سٹال تھے اور ان کی انفرادیت یہ تھی کہ ان سب کا موضوع سیاہ فام تھے..ان پر ہونے والے مظالم کے بیان اور ان زمانوں کے گیت جب وہ کپاس کے کھیتوں میں روتے بھی تھے اور گاتے بھی تھے..ان میں سے بیشتر کے سرورق پر افریقہ کے نقشے تھے..کہیں کہیں بائبل کے نسخے اور عیسائیت کی ترویج کی کتابیں اور مذہبی گیت ہیں اور دکاندار لہک لہک کر کسی پمفلٹ کو

سامنے رکھے وہ گیت اپنی ترنگ میں گا رہا ہے..جیسے ہمارے ہاں ایک زمانے میں کشمیری بازار میں تازہ ترین خبروں کے حوالے سے لکھے گئے عوامی گیتوں کے پمفلٹ دو دو آنے میں فروخت کرنے والے عوام الناس کو متوجہ کرنے کی خاطر وہ گیت گا گا کر سنایا کرتے تھے..

اور کہیں میزوں پر سجے قرآن پاک کے نسخے ہیں..ان دکانداروں کا حلیہ جدا ہے..اکثر نے لمبے افریقی چوغے' جو نائجیریا کے مسلمان پہنتے ہیں زیب تن کیے ہوئے ہیں اور سروں پر افریقی ٹوپیاں..کسی سے مخاطب ہوتے ہیں تو السلام علیکم سے آغاز کرتے ہیں اور گفتگو کے دوران الحمدللہ اور ماشاءاللہ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں اور ایسا صرف اسلام کے بارے میں کتابیں فروخت کرنے والے ہی نہیں کرتے بلکہ پرانے کپڑے بیچنے والا بھی اگر آپ کوئی کوٹ یا جیکٹ پہن کر دیکھ رہے ہیں تو وہ بھی آپ کو دیکھتے ہوئے ''ماشاءاللہ'' کہے گا..یہاں اسلام کا اثر خاصا گہرا ہے اگرچہ انہوں نے اسلام کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اور اس میں کچھ قباحت بھی نہیں کہ دنیا کی ہر قوم نے اسلام کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اور یہی اس کی رنگینی اور خوبصورتی ہے..رنگ ریجوا سے ہر کوئی فرمائش کرتا ہے کہ مجھے رنگ دے..اور اپنے اپنے عقیدے کے رنگ میں رنگے جانے کی درخواست کرتا ہے..ان میں ایک درخواست گزار امیر خسرو بھی ہیں..

تو ہارلم کے سیاہ جزیرے کو یوں پرکھیے تو اس میں سبھی رنگ اور عقیدے ہیں اور ان کا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں..ایک دوسرے سے کوئی بغض نہیں کہ وہاں بائبل بھی ہے، قرآن بھی ہے اور کہیں کچھ بھی نہیں ہے یعنی ہارلم حقیقی معنوں میں ایک سیکولر دنیا ہے جس کا ترجمہ کچھ احمق لوگ لامذہبی یا لادینیت کرتے ہیں..بے شک اب ہارلم محفوظ ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود ہفتے کے روز کی اس روشن دوپہر میں جو ہجوم تھے ان میں ہم جیسے خال خال تھے اور سینکڑوں چہروں میں سے کبھی کبھار کوئی سفید فام چہرہ نظر آ جاتا تھا..انہیں اب بھی اس سیاہ فام جزیرے میں قدم دھرنے سے خوف آتا تھا..

یہاں سب سے زیادہ دلچسپ اور پیارے کردار وہ حبشی بوڑھے تھے جو یہیں پیدا ہوئے تھے..پلے بڑھے تھے اور بوڑھے ہو گئے تھے اور عین ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ نے ساری عمر ہارلم سے باہر قدم نہ رکھا ہو..یہ بوڑھے ادھر ادھر منڈلاتے پھرتے تھے..کہیں دھوپ سینکتے تھے..اگر کچھ رقم جیب میں ہو تو بیئر کی ایک بوتل حاصل کر کے اسے پورا دن سینے سے لگائے رکھتے تھے اور خوش رہتے تھے..راہگیروں، دکانداروں اور فٹ پاتھوں پر چلتے لوگوں پر پُرمزاح فقرے

کہتے تھے اور وہ سب ان کے جانے پہچانے مقامی باشندے تھے.. یہ باشندے بھی رک کر کسی بوڑھے پر کوئی فقرہ کستے اور ہنستے ہوئے آگے چلے جاتے.. ایک بوڑھا قریب سے گزرتی ایک نہایت فربہ اور ادھیڑ عمر خاتون سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ''ہے بے بی.. یو آر سیکسی بے بی..''

تو وہ خاتون اپنے موٹاپے کے باوجود ذرا لچک کر.. ایک ٹھمکا سا لگا کر کہتی ہے ''یو لائک دس بے بی''..

اور بوڑھا اس پر نچھاور ہوتے ہوئے کہتا ہے ''اوہ آئی لو اٹ..''

بڑے سُپر سٹورز کے علاوہ ہارلم میں جو دکانیں پُرہجوم تھیں وہ یا تو نائیوں کی تھیں جنہیں ہم ہیئر ڈریسر بھی کہہ سکتے ہیں جو اکڑے ہوئے لوہے کی تاروں کی مانند سخت گھنگھریالے بالوں کو سیدھا کر سکتے تھے یا ان کی مینڈھیاں بنا کر گوندھ سکتے تھے یا پھر استرے چلا کر سر میں طرح طرح کے نقش و نگار بنا سکتے تھے... بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ایک سیاہ فام مرد یا عورت اپنے بالوں کی آرائش کی خاطر کیسی مسلسل اذیتوں سے گزرتے ہیں ان کے گھنگھریالے بال واقعی لوہے کی تاروں کی مانند سخت ہوتے ہیں جنہیں سنوارنے کی خاطر وہ پلاسٹک یا لکڑی کی کنگھی استعمال نہیں کر سکتے کہ وہ ان میں الجھ کر ٹوٹ سکتی ہے چنانچہ ان کی کنگھیاں اکثر لوہے کی ہوتی ہیں.. ان بالوں کو مروجہ فیشن کے مطابق سنوارنے کے لیے انہیں بہت تگ و دو کرنی پڑتی ہے.. بہت اذیت سہنی پڑتی ہے.. خاص طور پر مینڈھیاں گندھوانے کیلئے اور انہیں برقرار رکھنے کے لیے..

ان نائیوں کے علاوہ صرف ناخنوں کو پینٹ کرنے والے.. انہیں مصور کرنے والے پارلر بھی بہتات میں تھے..

ہمارے ہاں تو یہ رواج ہے کہ ایک ناخن پر کوئی مقدس عبارت پوری کی پوری لکھنا کمال فن کی معراج ہے لیکن ہارلم میں یہ فن اپنی بلندیوں کو چھوتا نظر آتا ہے.. یہاں ایک ناخن پر پوری مونالیزا پینٹ کروائی جا سکتی ہے جو ہو بہو اصل کے مطابق ہو گی اگرچہ اس کی رنگت قدرے سیاہ ہو گی اور اگر آپ پسند کریں تو دس ناخنوں پر دس مونالیزائیں جلوہ گر ہو سکتی ہیں.. یعنی منی ایچر پینٹنگ کا کمال اگر مغل منی ایچر کے بعد دیکھنا ہے تو ہارلم میں دیکھئے.. مونالیزا کے علاوہ سینکڑوں مزید پیش کشیں ہیں.. سیاہ فام اداکاروں، ماڈلز اور کھلاڑیوں کے چہرے، قدرتی مناظر، جانور اور ہیجان خیز جنسی مناظر جن میں جانور بھی ہو سکتے ہیں اگرچہ وہ انسانی شکل کے ہوتے ہیں.. یہ مناظر

اور شکلیں ناخنوں پر پینٹ کرنے والے زیادہ تر چینی ہوتے ہیں.. رابعہ حیران ہوتی تھی کہ آخر انکل خواتین کے ناخن پینٹ کرنے والے پارلرز کے شوکیسوں کے سامنے تا دیر محو کیوں رہتے ہیں.. صرف اس لیے کہ وہاں ایک مختصر سے ناخن پر پینٹ کیے جانے والے مناظر، چہروں اور گل بوٹوں یہاں تک کہ مذہبی اشکال کی اتنی وسیع ورائٹی تھی کہ انکل نہ صرف حیران ہو رہے تھے بلکہ پریشان بھی ہو رہے تھے کہ کیا اتنا تنوع ممکن ہے..

ہارلم کے زمانوں کی سیر کرتے ہم اس کے ایک تاریخی لینڈ مارک سے بھی شناسا ہوئے اور یہ مشہور زمانہ سیاہ فام اپالو تھیٹر تھا.. اپالو تھیٹر کا نام سنتے ہی ذہن میں سیاہ فام اداکار پرفارم کرنے لگتے ہیں، گلوکاروں کے گیت گونجنے لگتے ہیں اور نیگرو ڈراموں کے منظر سامنے آنے لگتے ہیں.. اگرچہ جب 1914ء میں یہ تھیٹر قائم ہوا یہ ایک ایسا آپرا ہاؤس تھا جس پر کسی سیاہ فام کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا جاتا تھا.. یہ صرف سفید فام لوگوں کے لیے مخصوص تھا.. پھر یہ ایک صاحب فرینک شف مین کی ملکیت میں آیا جو نام سے تو یہودی لگتے ہیں اور اسی لیے رنگ و نسل سے ماورا ہو کر صرف کاروبار پر یقین رکھتے تھے، انہوں نے اس آپرا ہاؤس کے صدر دروازے پر آویزاں ''صرف سفید فاموں کیلئے'' کی تختی اتار کر اس کے دروازے سب کے لیے کھول دیئے.. آہستہ آہستہ گورے لوگ شاید اس لیے کم ہوتے گئے کہ وہ سیاہ فاموں کے برابر میں بیٹھ کر تھیٹر دیکھنا بھی اپنی توہین سمجھتے تھے اور بالآخر یہ تھیٹر صرف سیاہ فام تخلیق کاروں کا ایک مرکز بن گیا.. اپالو تھیٹر آج بھی ہارلم کی سب سے بڑی پہچان ہے.. ان دنوں یہ تھیٹر تعمیر نو کی منازل سے گزر رہا تھا اس لیے عارضی طور پر بند تھا. تقریباً ایک ماہ کے بعد جب ہارلم سے پھر گزر ہوا تو یہ کھل چکا تھا.. اس کے ماتھے پر سیاہ فام اداکاروں کے بل بورڈ روشن تھے اور وہاں ٹکٹ حاصل کرنے والوں کی قطاریں ہارلم کے فٹ پاتھ پر ایک سست رو کینچوے کی مانند سرسراتی براڈوے سٹریٹ تک پہنچ رہی تھیں.. ایک بات میں نے خصوصی طور پر نوٹ کی کہ ان طویل قطاروں میں میں نے صرف دو یا تین سفید فام تماشائیوں کو کھڑے دیکھا اور شاید وہ بھی امریکی نہیں غیر ملکی سیاح تھے ورنہ ہر سُو سیاہ فام امڈے پڑتے تھے جیسے اپالو ایک سفید فام یونانی دیوتا نہ ہو ایک نیگرو دیوتا ہو جس کے معبد میں وہ پرستش کے لیے جاتے تھے، وہ اتنے پر اشتیاق تھے..

ہارلم کی بیشتر عمارتیں اور گھر بہت قدیم طرز کے اور پرانے ہیں اور ان میں زندگی کی

سہولتیں بھی ظاہر ہے پرانے زمانوں کی ہیں، صرف اس لیے کہ یہاں کے مکین ایک تو جدید علاقوں میں منتقل ہونے کی مالی سکت نہیں رکھتے تھے اور اس کے علاوہ وہ اپنے مخصوص ماحول سے جدا ہونا بھی پسند نہیں کرتے تھے.. یہاں بقیہ نیویارک کی نسبت جائیداد کی قیمتیں بہت ہی کم تھیں کیونکہ سفید فام اپنی دولت ہارلم ایسے خطرناک، گندے اور جرائم سے کلبلاتے نیگرو علاقے میں کیوں صرف کرتے.. اور دولت صرف کرنے کے لیے صرف ان کے پاس تھی.. لیکن ان دنوں علی محمود کے مطابق جو نیویارک میں جائیداد کی خرید وفروخت کے حوالے سے بہت سمجھ بوجھ رکھتا ہے.. ہارلم میں یہ صورتِ حال تیزی سے بدل رہی ہے اور جائیداد کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے..

سوئٹزرلینڈ میں جپسی کا بھائی برن شہر سے دور ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک قدیم طرز کے گھر میں رہتا تھا جس کے لیے اس نے برن میں میسر نہایت جدید ترین رہائش گاہ کی نسبت کم از کم چار گنا قیمت ادا کی تھی.. کیونکہ یورپی لوگ کلاسیکی طرزِ تعمیر کے شیدائی ہیں اور وہ اس کے لیے کوئی بھی قیمت ادا کر سکتے ہیں.. اسی طور ہارلم کا پرانا طرزِ تعمیر، گئے زمانوں کی کھڑکیاں دروازے اور قدیم رہائش گاہیں بھی کلاسیک کا درجہ اختیار کر رہی ہیں اور ان کی مانگ میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے یہاں تک کہ ایک معمولی سے بوسیدہ گھر یا عمارت کے لیے اتنی قیمت ادا کی جا رہی ہے کہ اس رقم سے سیاہ فام مالک بڑی آسانی سے لونگ آئی لینڈ میں ایک پرتعیش گھر خرید سکتا ہے یا سنٹرل پارک پر کھلتا کوئی پینٹ ہاؤس افورڈ کر سکتا ہے.. بقول علی وہ دن دور نہیں جب ہارلم کی منفرد سیاہ شناخت ختم ہو جائے گی.. یہاں جدید عمارتیں کھڑی ہو جائیں گی اور صرف امیر نیویارکر یہاں رہائش پذیر ہو جائیں گے اور یہ سیاہ جزیرہ نیویارک میں مدغم ہو کر ایک قصۂ پارینہ ہو جائے گا..

سابق صدر بل کلنٹن نے بھی اپنے رفاہی ادارے کا دفتر اسی علاقے میں قائم کر رکھا ہے اور وہ اکثر ہارلم کے فٹ پاتھوں پر ٹہلتے نظر آ جاتے ہیں..

لیکن ہارلم ابھی تاریخ کی کتابوں میں منتقل نہیں ہوا.. ابھی وہ سیاہ فام تاریخ کا ایک جیتا جاگتا عجائب گھر ہے.. وہاں حاجی شہباز اور ان کے نام پر ''میلکم ایکس بولیوارڈ'' پر ایک شاندار مسجد تعمیر کی گئی جہاں سلجوق جمعہ کی نماز ادا کرنے جاتا ہے.. اور مارٹن لوتھر کنگ، نیٹ کنگ کول، لوئی آمسٹرانگ، سڈنی پائٹر، مارتھا کٹ، ڈیوک ایلنگٹن، ایلا فزجیرلڈ، محمد علی، رے چارلز اور لٹل رچرڈز کی شباہتیں نظر آتی تھیں.. اگرچہ ان سب کا تعلق ہارلم سے تو نہ تھا لیکن ہارلم کی ثقافت

اور اپنی پہچان کی جدوجہد انہی عظیم سیاہ فاموں کی نمائندگی کرتی تھی.. بے شک آئندہ زمانوں میں زرد شیطان کے شہر نیویارک نے اس رنگا رنگ اور زندگی سے ہمکتی ہوئی دنیا کو بھی نگل جانا تھا اور اسے اپنی طرح بے رنگ کر دینا تھا.. لیکن فی الحال تو یہ ایک سیاہ سلطنت تھی جس میں سیاہ فیشن، سیاہ ادب اور سیاہ ثقافت کا راج تھا.. اور اس کے کوچہ و بازار میں جب کوئی گورا دکھائی دیتا تھا تو وہ اس کی سیاہی کے تناظر میں ایک سفید بدنما دھبہ لگتا تھا جس کی اپنی کوئی شناخت نہیں..

ہم نے ہارلم کے مرکزی ایونیو میں سے آہستگی سے گزرتی متعدد سرخ ڈبل ڈیکر بسیں دیکھیں جو سفید فام سیاحوں سے لبریز تھیں.. بسوں کے بدنوں پر مجسمہ آزادی کے پوسٹر نمایاں تھے اور ان پر ''نیویارک سائٹ سی انگ'' لکھا ہوا تھا.. جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ''محفوظ'' ہونے کے باوجود اب بھی بیشتر گورے اس علاقے میں داخل ہونے سے گریز کرتے ہیں اور اگر وہ اس سیاہ جنت میں داخل ہوتے ہیں تو ''محفوظ'' سرخ ڈبل ڈیکر بسوں میں سوار ہو کر داخل ہوتے ہیں اور وہ اس جہان رنگ و بو میں سے آرامدہ نشستوں پر بیٹھے سرسری گزر جاتے ہیں.. جیسے ایک عجائب گھر میں سے گزرتے ہوں، ایک چڑیا گھر میں سے گزرتے ہوں.. جہاں سیاہ رنگ کے پنچھی جو خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں.. رنگ رنگ کی بولیاں بول رہے ہیں، چہچہا رہے ہیں اور ان کے گائیڈ انہیں معلومات فراہم کر رہے ہیں کہ دیکھئے دیکھئے خواتین و حضرات.. اس بوڑھے نیگرو کو دیکھئے جو امریکی جنوب کے کپاس کے کھیتوں میں کام کرنے والے غلاموں سے کتنی مشابہت رکھتا ہے.. اور وہ دو سیاہ فام لڑکیاں دیکھ رہے ہیں جو بے وجہ فٹ پاتھ پر ناچ رہی ہیں اور لوگ تالیاں بجا رہے ہیں.. ان کے ہیئر ڈو ملاحظہ کیجیے.. ان کے پہناوے تو دیکھئے کیا یہ ایک عجوبہ نہیں ہیں.. لیکن انہیں پیار سے دیکھئے.. گھور کر دیکھیں گے تو شاید یہ لوگ اس آہستہ رو بس پر چڑھ کر آپ کا ٹینٹوا دبا دیں.. اور ہاں آپ نے نوٹ کیا ہے کہ ان میں سے کچھ موزلمز بھی ہیں تو ان سے بچ کر رہنا چاہیئے.. ذرا تصور کریں کہ ایک نیگرو لڑکی جہاں فٹ پاتھ پر ناچتی ہے وہاں ایک اور نیگرو لڑکی حجاب پہنے نظریں جھکائے چلتی جا رہی ہے.. یہ عجیب سے لوگ ہیں.. اگرچہ دکھائی تو ہم جیسے دیتے ہیں.. ہماری طرح کے انسان ہی تو ہو سکتے ہیں بلکہ ہیں.. لیکن ذرا عجیب سے ہیں..

لیکن اس تصویر کا ایک اور رخ بھی تو ہو سکتا ہے..

جو تماشا دیکھنے آئے ہیں وہ شاید خود ہی تماشا ہوں..

یعنی جب آپ اپنے تئیں ایک چڑیا گھر میں جاتے ہیں تو آپ خود بھی تو چڑیا گھر ہو سکتے ہیں.. آپ اپنے آپ کو انسان سمجھ رہے ہیں اور آپ جانور ہوں.. جن کو آپ جانور جان رہے ہیں وہ انسان ہوں..

تو تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے کیونکہ ہارلم میں سے گزرنے والی سفید فام سیاحوں کی سرخ ڈبل ڈیکر بسوں کی جانب اول تو کوئی سیاہ فام نگاہ ہی نہیں کرتا اور اگر آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو وہ بے حد محظوظ ہوتا ہے کہ ان کی شکلیں کیسی عجیب ہیں' ان کے چہرے کتنے پھیکے ہوئے بے رنگ اور بے کشش ہیں جب کہ ہم کتنے شاندار ہیں.. ہمارے بدن ان کی نسبت کتنے آبنوسی اور کسرتی ہیں.. یہ کتنے ڈرپوک لوگ ہیں.. ڈرے ڈرے سے اور سہمے ہوئے.. حالانکہ یہ پیدل چلتے ہوئے بھی یہاں آ جاتے تو ہم نے ان سے کیا کہنا تھا.. اپنی غلامی کا بدلہ تو نہیں لینا تھا..

اس ہفتے کی دوپہر کو.. ہارلم میں گھومتے ہوئے.. نیویارک شہر کی بھاگ دوڑ اور خودکشی کی حد تک تیز رفتاری کے مقابلے میں یہاں یہ محسوس ہوتا تھا جیسے پورے علاقے میں کوئی گھڑی نہیں ہے.. نہ کسی نے کہیں جانا ہے اور نہ آنا ہے. بس جو جہاں ہے اس نے وہیں رہنا ہے.. اور یہی لگتا تھا کہ ہارلم میں کوئی بھی مرد کام نہیں کرتا.. سب بیکار بیٹھے ہیں.. گپیں ہانکتے ہیں.. دھوپ سینکتے ہیں.. بیئر پیتے ہیں اور آوازے کستے ہیں جب کہ عورتیں سوائے فیشن کرنے کے.. بال سنوارنے اور عطر لگانے کے اور شاپنگ کرنے کے اور اپنے جہازی جسموں کو بے پناہ خوراک سپلائی کرنے کے اور کچھ نہیں کرتیں.. لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے..

یہ چھٹی کا دن ہے اور اس کی بیکاری اور مدہوشی کا ہی تو مزا ہے جو گورے لوگوں کے نصیب میں نہیں ہے..

بے شک ان لوگوں کے کچھ مشغلے بھی ہیں.. وہ شغل کے طور پر اور وہ یہ شغل کبھی کبھار کر ہی لیتے ہیں' کسی گورے کو لوٹ لیا.. کسی گیس سٹیشن میں چہل قدمی کے دوران گزر اوقات کے لیے کچھ ڈالر حاصل کر لئے اور بہت ہی ایمرجنسی ہوئی تو کسی کو زدوکوب کر کے رزق حلال وصول کر لیا..

تو ان کبھی کبھار مشاغل کے علاوہ بیشتر سیاہ فام مرد واقعی رزق حلال کمانے کی خاطر جان لیوا مشقت کرتے ہیں.. اور یاد رہے کہ اس نوعیت کے ''مشغلے'' گورے حضرات بھی بکثرت کرتے ہیں لیکن یہاں بد اچھا اور بدنام برا کا حوالہ کچھ نامناسب نہ ہوگا.. گورا اپنے معاشرے کی سفیدی میں

نمایاں نہیں ہوتا جبکہ کالا دور سے نظر آ جاتا ہے.. ایک سروے کے مطابق اگرچہ معمولی جرائم کا پلڑا کالوں کی جانب جھکتا ہے لیکن انسانیت سوز جرائم میں گورے حضرات ان سے کہیں آگے ہیں.. سیریل کلرز یعنی مسلسل قتل کرنے والوں میں کوئی سیاہ فام کم ہی ہوگا.. خواتین سے زبردستی کر کے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والوں میں شاید ہی کوئی سیاہ فام ہو.. اور اس کے باوجود برق گرتی ہے تو بے چارے سیاہ فاموں پر!

مجھے نیویارک پسند آ گیا تھا..

اس نے زبردستی مجھے اپنے آپ کو پسند کروانے پر مجبور کر دیا تھا ورنہ میں تو یہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ زرد شیطان کے اس شہر کو ناپسند کرنا ہے.. بے شک روم.. پیرس' لندن اور برلن میرے دیکھے بھالے تھے لیکن کہیں بھی وہ رنگارنگی' بے خودی' ثقافتی تنوع اور موسیقی اور مسرت نہ تھی جو اس شہر کے کوچہ و بازار میں تھی بلکہ میں نے اپنے آپ پر بہت ضبط کیا کہ کہیں میں کوئی سستی قسم کی وہ سفید ٹی شرٹ خرید کر نہ پہن لوں جس پر ایک سرخ دل پر ''آئی لو نیویارک'' نمایاں ہوتا ہے.. لیکن میں نے اپنے آپ کو ایسی اوچھی حرکت کرنے سے باز رکھا.. اگرچہ میں ہرگز ضبط نہ کر سکتا.. باز نہ رہ سکتا اگر مجھے ہارلم میں کہیں بھی کوئی ایسی ٹی شرٹ نظر آ جاتی جس پر ''آئی لو ہارلم'' لکھا ہوتا.. اگر ایک ایسی ٹی شرٹ نظر آ جاتی تو میں اسے خرید کر فی الفور پہن لیتا' بے شک سلجوق مجھے گھورتا کہ یہ ابا جی کیا کر رہے ہیں اور رابعہ اپنی ناراض سبز آنکھیں مجھ پر جما دیتی کہ ایسے سسر صاحب میرے ہی نصیب میں تھے لیکن میں ''آئی لو ہارلم'' کی ٹی شرٹ ضرور زیب تن کر لیتا کہ نیویارک بھر میں گرین اچ ولیج کے سوا یہ ہارلم ہی تھا جس نے مجھے اپنے سیاہ سحر میں گرفتار کر لیا تھا..

میں ففتھ ایونیو' پارک ایونیو یا براڈوے اور کسی بھی وے کو تو فراموش کر سکتا تھا لیکن ہارلم کے سیاہ ٹونے ٹوٹکے مجھ پر اثر کر گئے تھے.. میرے دل پر نقش ہو گئے تھے اور میں اسے اس لئے بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ ہماری نور جہاں نے ہی تو تاریخ میں پہلی بار سیاہ فاموں کی سفید فاموں پر برتری کا گیت گایا تھا..

کالا شاہ کالا.. میرا کالا اے دلدار.. تے گوریاں نوں پراں کرو..



''چوہے کا بچّہ''

وہ غالباً نیویارک کا سب سے معصوم اور نٹ کھٹ چوہا تھا..

باقاعدہ چوہا بھی نہ تھا...

سلجوق کے فلیٹ میں مقیم تھا لیکن اُس نے کبھی فلیٹ کے کرائے میں شریک ہونے کا سوچا بھی نہ تھا۔ مفت میں مقیم تھا..

وہ اس فلیٹ میں بے خطر ایسے سیر کرتا تھا جیسے میں ہر صبح بے خطر سنٹرل پارک میں سیر کرتا تھا۔ اور وہ نہایت بے خوفی سے بُک شیلف پر براجمان ہو کر کبھی سلجوق کو اور اکثر رابعہ کو تکتا رہتا تھا۔ آنکھیں گھماتا رہتا تھا..

یہ ہمارے ہاں کا نہایت بے ڈول اور بھدا سا دیسی قسم کا چوہا نہ تھا بلکہ چھریرے بدن کا مختصر سا چوہا تھا اور قدرے سفید فام تھا..

صرف اس نیویارکی چوہے کی وجہ سے میری بہو بہت دن سوگوار رہی..

اگرچہ کولمبیا یونیورسٹی کے کیمپس میں بھی طالب علموں کے لیے متعدد اقامت گاہیں موجود ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی طالب علموں کی کثیر تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے یونیورسٹی کے آس پاس' قربت میں' براڈوے سٹریٹ پر یا ذیلی سڑکوں پر چند عمارتیں ایسی ہیں جنہیں انتظامیہ نے رہائش گاہوں کے طور پر مختص کیا ہوا ہے.. ان میں سے ایک عمارت نمبر 412 ہے جس کی آخری اور دسویں منزل پر سلجوق کا فلیٹ نمبر 10.M واقع ہے.. یہ ایک سٹوڈیو اپارٹمنٹ قسم کی رہائش گاہ ہے.. ایک خاصا وسیع کمرہ جس کی کھڑکی بھی وسیع ہے اور اُس کے پار دیکھیے تو نظر نیویارک کی عمارتوں پر تیرتی چلی جاتی ہے.. جھانکیے تو بہت نیچے براڈوے سٹریٹ کی رونقیں ایک

متحرک مختصر تصویر لگتی ہیں.. کھڑکی کے برابر میں ایک ڈبل بیڈ۔ بُک شیلف اور ایک خاصا کھلا لونگ ایریا.. واش روم اور الگ کچن.. یہ جغرافیہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ چوہے کا بچہ اس منظرنامے میں چہل قدمی کرتا رہتا ہے.. ان فلیٹس کا کرایہ نیویارک کے دیگر علاقوں کی نسبت قدرے نہیں بہت زیادہ ہے.. مثلاً سلجوق کے اس سٹوڈیو اپارٹمنٹ کا کرایہ تقریباً بارہ سو ڈالر ہے اور اس کی ادائیگی کے بعد اس کا ورلڈ بینک کا سکالرشپ قلاش ہو جاتا ہے.. وہ نہایت آسانی سے اس سے نصف قیمت پر جیکسن ہائٹ یا لونگ آئی لینڈ میں رہائش اختیار کر سکتا ہے لیکن اتنے طویل فاصلے سے روزانہ کولمبیا یونیورسٹی آنے جانے میں جتنا کرایہ لگتا ہے اور جتنا وقت ضائع ہوتا ہے اور سفر کی تھکاوٹ ہوتی ہے اس کے پیش نظر چند سو ڈالر کی فضول خرچی کر کے یونیورسٹی کے پہلو میں رہائش اختیار کرنا زیادہ سودمند ثابت ہوتا ہے۔

ان فلیٹس میں صفائی ستھرائی بہت ہے اور اگر آپ کو کہیں ایک مکوڑا.. یا کوئی چھپکلی وغیرہ نظر آ جاتی ہے تو آپ فوری طور پر یونیورسٹی انتظامیہ کو مطلع کر دیتے ہیں اور اس کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک ٹیم پہنچ جاتی ہے.. اگر ایک لال بیگ کچن کے آس پاس رینگ رہا ہو تو باقاعدہ ایمرجنسی ڈیکلیئر ہو جاتی ہے.. اب آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اگر ایک چوہے کا بچہ فلیٹ میں مٹرگشت کرتا دکھائی دے جائے تو پھر کیسی قیامت برپا ہوتی ہوگی..

گراؤنڈ فلور پر لفٹوں کے برابر میں ایک روز ایک نوٹس چسپاں نظر آیا..

''ٹرمینیشن بلیک وارنٹ''

کولمبیا یونیورسٹی کی انتظامیہ کے نوٹس میں لایا گیا ہے کہ مندرجہ ذیل فلیٹوں میں کچھ ناپسندیدہ جانور اور حشرات الارض پائے گئے ہیں جن کی مکمل تفصیل مندرجہ ذیل ہے..

1-فلیٹ نمبر 8 دوسری منزل باورچی خانے میں دو لال بیگ دیکھے گئے۔

2-فلیٹ نمبر 10 چوتھی منزل فلیٹ میں کچھ ہے لیکن تعین نہیں کیا جا سکا کہ کیا ہے۔

3-فلیٹ نمبر 6 آٹھویں منزل غسل خانے میں ایک مکوڑا.. سیاہ رنگ کا۔

4-فلیٹ نمبر 7 آٹھویں منزل رات کو کوئی شے فرش پر رینگتی ہے۔

5-فلیٹ نمبر 10 آٹھویں منزل کسی چوہے کا شائبہ ہے لیکن وہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔

6- فلیٹ نمبر 5 نویں منزل چند بڑے بڑے مچھر۔

7- فلیٹ نمبر 9 نویں منزل متعدد چوہے یا چوہے کے بچے۔

8- فلیٹ نمبر 8 دسویں منزل ایک چھپکلی۔

9- فلیٹ نمبر 9 دسویں منزل کوئی ناپسندیدہ شے۔

10- فلیٹ نمبر 2 دسویں منزل شاید ایک لال بیگ۔

11- فلیٹ نمبر 1 دسویں منزل کوئی چمگادڑ نما شے یا شاید چمگادڑ۔

ان فلیٹوں کے مکینوں کی رپورٹ پر یہ معلومات ہم تک پہنچی ہیں۔ ہر خاص و عام کو اطلاع کی جا سکتی ہے کہ ان ناپسندیدہ جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کو تلف کرنے کے لیے موت کا بلیک وارنٹ جاری کیا جا رہا ہے.. ان کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک ٹیم حرکت میں آ گئی ہے۔ یہ ٹیم ہفتے اور اتوار کے روز صبح سات بجے سے بارہ بجے تک آپ کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے.. آپ سے درخواست ہے کہ براہ کرم اس سے تعاون کیجیے۔ شکریہ۔

ازطرف انتظامیہ کولمبیا یونیورسٹی۔ نیویارک

سلجوق اور رابعہ نے یہ مناسب نہ جانا کہ اتنے کیوٹ سے اور معصوم سے چوہے کے بچے کی رپورٹ کروا کے اسے ہلاک کروا دیں۔ اس لیے ان کا چوہے کا بچہ اس بلیک وارنٹ میں شامل نہ تھا..

وہ تقریباً ایک فیملی ممبر ہو چکا تھا.. اُنہیں بھی اُس کی موجودگی کی عادت ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ جب رابعہ ہارلم میں شاپنگ کے بعد وزنی بیگ اٹھائے جن میں زیادہ تر تولیے ہوتے تھے فلیٹ میں داخل ہوتی تو وہ اپنے چوہے کے بچے کے لیے بے تاب نظریں متلاشی کرتی اور سلجوق بھی جب یونیورسٹی سے واپس آتا تو پہلا سوال یہی پوچھتا کہ.. چوہے کا بچہ نظر آیا..

پھر یہ ہوا کہ وہ چوہے کا بچہ قدرے بدتمیز ہو گیا.. اُسے اندازہ ہو گیا کہ یہ میاں بیوی میرے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں اور اُس گوشے میں میں رہتا ہوں۔ چنانچہ وہ ہر سو دندنانے لگا.. بیباک ہو کر قدرے نہیں خاصا بدتمیز ہو گیا.. اتنا نڈر ہو گیا کہ سرِ شام وہ جہاں کہیں بھی پوشیدہ ہوتا تھا وہاں سے برآمد ہوتا، کھڑکی کی چوکھٹ میں بیٹھ کر نیویارک کی عمارتوں کا نظارہ

کرتا۔ پھر اطمینان سے ٹہلتا ہوا بک شیلف میں رکھی کتابوں کے آگے مٹر گشت کرتا۔ اُنہیں سونگھتا.. اور خاص طور پر فلسطینی ایڈورڈ سعید کی کتابوں کو تادیر سونگھتا کہ سعید اسی کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر رہے تھے۔ وہ ہنری کسنجر کی ''ڈپلومیسی'' کو ذرا سا سونگھتا اور بک شیلف سے اُتر کر ایک صوفے پر براجمان ہو کر ٹیلی ویژن دیکھنے لگتا.. یہاں تک کہ چینل تبدیل کر دینے پر اپنی ناگواری کا اظہار بھی کرتا..

اُسے برداشت کر لیا گیا..

لیکن اُس نے بالآخر بہ قلم خود اپنی موت کے وارنٹ پر تب دستخط کر دیے جب وہ ایک شب نیند میں ڈوبی ہوئی رابعہ کے بائیں پاؤں کے انگوٹھے کو نہایت رغبت اور دلجمعی سے اپنے پوپلے منہ سے پپولنے لگا.. رابعہ نے ایک دلدوز چیخ مار کر اور وہ دہشت سے ساکت ہو گئی تھی.. سلجوق کو بیدار کیا تو اس کے باوجود چوہے کا بچہ قطعی طور پر ڈسٹرب نہ ہوا اور اُس کا انگوٹھا پپولنے میں مشغول رہا..

اس سانحے کے بعد رابعہ فلیٹ میں چلنے پھرنے سے گریز کرنے لگی اور ہمہ وقت اپنے بستر پر یا صوفے پر ٹانگیں سمیٹے خوفزدہ حالت میں بیٹھی رہتی..

رابعہ مکمل طور پر آؤٹ آف ایکشن ہو گئی۔

اگر فلیٹ کی گھنٹی بجتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتی، گھنٹی بجانے والا یہی سمجھتا کہ اندر کوئی نہیں ہے اور واپس چلا جاتا.. یہاں تک کہ جب سلجوق آتا اور گھنٹی بجانے کے علاوہ دستک دیتا تو بھی رابعہ اپنی محفوظ پوزیشن سے اُچھل کر باہر آتی اور دوڑتی ہوئی.. یوں جیسے اُس کے پاؤں تلے کوئی لینڈ مائن پھٹ جانے کو ہو۔ وہ دوڑتی ہوئی دروازے تک جاتی اُسے کھول کر پھر اُسی رفتار سے بھاگتی ہوئی صوفے پر جا براجمان ہوتی۔

چونکہ جہاں وہ بیٹھ جاتی تھی وہاں سے اُترنے کا نام نہ لیتی تھی یہاں تک کہ کچن تک بھی نہ جاتی تھی اس لیے مجبوراً سلجوق کو کچن سنبھالنا پڑ گیا.. وہ ناشتہ تیار کر کے بستر پر اکڑوں بیٹھی اپنی بیوی کی خدمت میں پیش کرتا اور رات کا کھانا بازار سے لے آتا.. وہ ایک دو روز میں ہی تنگ آ گیا کہ آخر کوئی حد ہوتی ہے جانوروں سے شفقت سے پیش آنے کی.. معاملہ اُس کی چہیتی بیوی اور چوہے کے ایک بچے کے درمیان میں تھا اور اُس کے لیے فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ اُس نے اپنی

بیوی کو ترجیح دی.. اُس نے یونیورسٹی انتظامیہ سے شکایت نہ کی کہ رابعہ بھی اُس حوالے سے چوہے کے بچّے کے ساتھ ہمدردی رکھتی تھی کہ جانے انتظامیہ کا بلیک وارنٹ سکواڈ اُس معصوم جان کو کیسی اذیّت دے کر ہلاک کر ڈالے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ اُسے ایسے طریقے سے مارا جائے جس کے تحت اُس بے چارے کو کم سے کم اذیّت ہو.. نیویارک کے ایک سٹور میں ایک لیسدار چپک جانے والی ٹیپ اگرچہ نہایت مہنگی ٹیپ میسر تھی اور اس کے بارے میں گارنٹی دی گئی تھی کہ اس میں سے ایک ایسی بھینی بھینی مہک اُٹھتی ہے کہ چوہا جہاں بھی ہو اپنی ناک سکیڑتا بے اختیار اُس کی جانب کھنچتا چلا آتا ہے اور پھر اس ٹیپ پر پاؤں رکھتا ہے تو اُس کے ساتھ یوں چپک جاتا ہے کہ اُس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا اور پھر اُس بھینی بھینی مہک میں جو ایک زہر ہوتا ہے اُس کے زیر اثر پہلے تو وہ ذرا مست سا ہو جاتا ہے اور پھر ابدی نیند میں چلا جاتا ہے.. اذیّت نہیں ہوتی!

اور ایسا ہی ہوا..

چوہے کا بچہ اپنے کسی خفیہ ٹھکانے سے یہ مہک سونگھتا باہر آیا اور فرش پر چپکی اُس ٹیپ پر ایک حالت خمار میں قدم رکھا اور وہیں رکھا رہ گیا.. چپک گیا..

لیکن وہ فوری طور پر ابدی نیند نہ اُترا.. بہت دیر حالت نزاع میں تڑپا اور اس دوران رابعہ صوفے پر براجمان اُسے دیکھتی رہی اور بہت پچھتاتی رہی.. کہ ہم نے ایسا کیوں کیا..

وہ بہت روز تک سوگوار رہی اور اُس کی رنگین آنکھوں میں سفید آنسو چھلکتے رہے.. وہ سسکیاں بھرتی ہوئی کہتی.. ''انکل.. ہم نے اُس کے ساتھ دھوکا کیا.. وہ ہمارے سامنے ہمارے فلیٹ میں بے خطر اپنی گول گول آنکھیں گھماتا سیر کرتا رہتا تھا اور ہم نے کبھی اُسے کچھ نہ کہا تو وہ ہم پر اعتماد کرتا تھا.. اس لیے وہ چہل قدمی کرتا اُس ٹیپ کی خوشبو سونگھتا اُس تک چلا گیا اور اُس کے ننھے ننھے پاؤں اُس میں چپک گئے.. وہ اپنے آپ کو چھڑا نہ سکا.. اور انکل جب وہ تڑپ رہا تھا اور میں صوفے پر بیٹھی اُسے دیکھے جا رہی تھی تو اُس کی گول گول آنکھوں میں شکایتیں تھیں جو صرف مجھے تک رہی تھیں کہ یہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا.. میں تو تم پر اعتماد کرتا تھا.. میرے ساتھ فریب کیا' دھوکا کیا.. اور انکل پھر وہ میری آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر گیا.. پہلے اُس کی آنکھیں مردہ ہوئیں اور سب سے آخر میں اُس کی دُم میں سے دَم نکلا.. وہ مر گیا۔''

میں رابعہ کو کیا بتاتا اور اُس چوہے کے بچّے کو بھی کیا بتاتا کہ ہم تو اپنے ہم نفسوں کے

ساتھ بھی یہی سلوک کرتے ہیں.. اپنے دوستوں.. عزیزوں بلکہ اپنے ہم عصر ادیبوں کو بھی یونہی تلف کرتے ہیں.. بلکہ پوری قوم کو تلف کر دیتے ہیں..

سکندر مرزا.. ایک عام سا سول سرونٹ.. خواجہ ناظم الدین کو تلف کر دیتا ہے..

مرزا صاحب کو ایک جنرل بلکہ کسی بھی بیٹل فیلڈ میں جائے بغیر فیلڈ مارشل ہو جانے والا ایوب خان تلف کر دیتا ہے.. اور پھر اُس کا چہیتا بھٹو جو اُسے ڈیڈی کہتا ہے تاشقند معاہدے کے افشا کی لیس دار ٹیپ میں اُسے چپکا کر تلف کر دیتا ہے.. اور پھر اُس بھٹو کو ایک ایسا کاسہ لیس مل جاتا ہے جو آگے بڑھ کر اُس کے جوتے سیدھے کرتا ہے تو وہی ضیاء الحق اُسے تارا مسیح سے تلف کروا دیتا ہے.. کبھی لغاری کے ہاتھوں خود پسند بے نظیر تلف ہوتی ہے اور کبھی نواز شریف خود سے یہ اہتمام کرتے ہیں کہ منتظر پرویز مشرف کو ایک لیس دار ٹیپ مہیا کر دیتے ہیں کہ ہم تو خود تلف ہونے کو تیار ہیں..

درد کی اس زنجیر کا سلسلہ ابھی تک تو نہیں ٹوٹا.. تو دیکھیے کب پرویز مشرف اس زنجیر کی کڑیوں میں جکڑے جاتے ہیں.. کہ اس زنجیر کے ٹوٹنے کے ابھی تو کچھ آثار نظر نہیں آتے..

یہ سب اُسی اعتماد میں مارے جاتے ہیں.... جیسے نیویارک کا وہ چوہے کا بچہ مارا گیا..

لیکن ایک فرق کے ساتھ...

اُس چوہے کے بچّے کی موت نے میری پیاری بہو کو کئی دن تک سوگوار رکھا..

جب کہ.. یہ جو دوسری نوعیت کے چوہے کے بچّے ہوتے ہیں اُن کی موت پر بہت کم لوگ سوگوار ہوتے ہیں..



''راک فیلر سنٹر اور لِنکن سنٹر''

میں نیویارک میں چین سے نہیں بیٹھا بلکہ نیویارک نے مجھے چین سے بیٹھنے نہ دیا کہ یار نے مجھے.. میں نے یار کو سونے نہ دیا.. یہ شہر میرے لئے ایک ونڈر لینڈ تھا اور میں اس میں ایک حیرت زدہ اَلیس تھا.. میں ہمہ وقت ایک حالت اضطراب میں رہتا' سراسیمگی میں رہتا کہ میں کسی حیرت کو دیکھنے سے نہ رہ جاؤں.. اور وہاں حیرتیں بے شمار تھیں.. ان حیرتوں کی فہرست ختم ہونے میں نہ آتی تھی.. سلجوق صرف ویک اینڈ پر میرا ساتھ دے سکتا تھا باقی دنوں میں وہ مجھ شکستہ بادبانی کشتی کو حیرت کے اس سمندر میں تنہا دھکیل دیتا.. اور میں کبھی بے خطر روانی سے تیرتا اور کبھی ذرا ہچکولے کھاتا ڈوبنے کو آتا اور پھر سنبھل جاتا..

اس دوران رابعہ کچھ روز کے لیے اپنی بہن کے ہاں فلاڈیلفیا چلی گئی..

وہ ہمہ وقت چہچہاتی رہتی تھی اور اُس کے دم قدم سے براڈوے کا وہ فلیٹ ایک چھوٹا سا جنگل لگتا جہاں دنیا جہان کے رنگا رنگ پکھیرو اڑتے پھرتے.. اپنی اپنی بولیاں بولتے لیکن وہ گئی تو جنگل خاموش ہو گیا..

ایک سبز آنکھوں والی گڑیا لڑکی کی محض موجودگی اس فلیٹ میں زندگی کی رُوح پھونک دیتی..

وہ چپ ہو جاتی تو جنگل چپ ہو جاتا..
وہ بولنے لگتی تو ہر جانب پرندے کوکنے لگتے.. گیت گانے لگتے..

ایک ایسی شام آئی جب ہم سب راک فیلر سنٹر میں تھے..

سلجوق اور رابعہ.. اور علی جس نے اپنے آپ کو اور اپنی سیاہ مرسیڈیز کو اپنے بیسٹ فرینڈ کے اباجی کے لیے وقف کر دیا تھا..

دُنیا کے ہر بڑے شہر میں.. کوئی نہ کوئی یادگار.. کوئی چوک یا تاریخی مقام ایسا ہوتا ہے جس کے بارے میں روایت ہوتی ہے کہ اس شہر میں جو بھی آئے گا وہ آپ کو وہاں مل جائے گا.. اگر آپ.. کسی بچھڑے ہوئے دوست کو.. کسی آشنا چہرے کو.. جس کے بارے میں شنید ہو کہ وہ اس شہر میں ہے.. ملنا چاہیں تو قوی امکان ہے کہ وہ آپ کو اس یادگار یا چوک کے آس پاس مل ہی جائے گا..

جیسے لنڈن کا پکاڈلی سرکس.. جہاں صدیق چوہدری مجھے تلاش کرتا ہوا پہنچ گیا تھا.. وہ اور ناصر فوکس واگن کے ڈبے پر سوار کسی نہ کسی طرح لنڈن پہنچ گئے تھے اور وہ یہ جانتے تھے کہ میں بھی انہی دنوں میں وہاں ہو سکتا ہوں لیکن کہاں ہو سکتا ہوں وہ یہ نہیں جانتے تھے.. البتہ وہ یہ جانتے تھے کہ میری خصلت میں آوارگی اور اضطراب بہت ہے اور مجھ ایسے لوگ عام طور پر پکاڈلی سرکس میں ایروز کے مجسمے تلے سیڑھیوں پر بیٹھے پائے جاتے ہیں اور وہ دونوں وہاں پہنچے.. سرِ شام پہنچے اور میں واقعی ایروز کے مجسمے تلے چند ہپّیوں کے ہمراہ بیٹھا.. بے مقصد بیٹھا ہوا تھا.. جب میری سفرنامہ نگاری کا آغاز ہوا تھا تو ٹی ہاؤسوں میں اور ادبی محفلوں میں قید زندگی گزارنے والے بہت سے ادیبوں نے نہایت تضحیک آمیز مسکراہٹوں کے ساتھ یہ بیان دیا تھا کہ.. یہ شخص تو فرضی کہانیاں اور قصے بیان کرتا ہے بھلا یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو سکتا ہے.. جھوٹ لکھتا ہے.. صرف اس لئے کہ وہ دنیا اور دنیا کو دیکھنے کی وحشت اور اس کے انوکھے تجربوں سے ناآشنا اور لاعلم تھے.. اب یہی قصہ لے لیجیے کہ لنڈن ایسے دنیا کے پُرہجوم ترین شہر میں کیا یہ ممکن ہے کہ دو شخص یہ سوچیں کہ ہمارا دوست شاید پکاڈلی سرکس کی سیڑھیوں پر بیٹھا مل جائے.. اور وہ مل جائے.. کسی ایک شام میں.. کسی ایک وقت میں وہ واقعی وہاں موجود ہو.. یہ ایک بڑے جھوٹ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے.. صرف یہ کہ صدیق چوہدری اور ناصر حیات شاید اس جھوٹ پر یقین نہ کریں کہ وہ مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کر بے تحاشا ہنسنے لگے تھے کہ یہ تو واقعی یہاں بیٹھا ہوا ہے..

اسی طور کابل میں ایک دوست نے مجھے ایک فٹ پاتھ پر رک سیک سرہانے رکھے اونگھتا ہوا پایا اور کہنے لگا.. مجھے معلوم تھا کہ تم اسی حالت میں کہیں مل جاؤ گے..

جیسے پورے پیرس میں آئفل ٹاور کے سائے میں پاسکل ہو سکتی تھی..

روم کے تریوی فوارے میں سکّے ڈالتے ہوئے کوئی چہرہ آپ کو تلاش کر لیتا ہے..

تو نیویارک میں راک فیلر سینٹر بھی ایک ایسا ہی مقام ہے..

جہاں کرسمس کے دنوں میں نیویارک کا سب سے شاندار اور سربلند کرسمس ٹری جگمگاتا ہے..اور جہاں موسم سرما میں لوگ سکیٹنگ کرتے ہیں.. چونکہ ابھی گرمیوں کے دن تھے اس لئے وہاں جہاں برف پر نیویارکر سکیٹنگ کرتے تھے اس نشیب میں.. بلند و بالا عمارتوں میں گھرے ہوئے نشیب میں ایک ریستوران کی رونقیں زندگی کی شمپیئن شراب کے بلبلوں کی مانند اُبلتی تھیں..

مجھے یہاں کوئی بچھڑا ہوا دوست تو نہیں ملا البتہ کچھ پاکستانی خاندان ملے..اور ان میں سے ایک خاندان جو غالباً پشاور کا تھا ایسے ملا جیسے جانے کب سے بچھڑا ہوا تھا..اور خوب گلے لگا کر اور اس اچانک ملاقات کی تصویریں دھڑا دھڑ اتار کر ملا.. یہی لوگ اگر پاکستان میں کہیں ملتے تو دور سے ’’وہی ہے‘‘ کے اشارے کرتے اجتناب کرتے چلے جاتے لیکن یہ تو امریکہ تھا چنانچہ انہوں نے امریکی انداز میں مجھ سے قریب ہو کر گلے ملتے ہوئے تصویریں اُتروائیں..

1985ء میں راک فیلر سنٹر کو نیویارک کا ایک لینڈ مارک قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر نیویارک کا دل تلاش کرتے ہو بس یہی تو دل ہے.. یہ وہ مقام ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں جبکہ آس پاس کے مین ہاٹن میں افراتفری کے سوا کچھ نہیں اور وہاں لوگ ایک دوسرے سے کتراتے ہیں..

یہ دنیا کی سب سے بڑی اور بلند ترین عمارتوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے ڈیزائن اور خوش نظری کو دنیا کے بہت سے شہروں نے اپنانے کی سعی کی لیکن ناکام ہوئے..اور حیرت یہ ہے کہ امریکہ کے دیگر بڑے فلاحی اور علمی اداروں کی مانند راک فیلر سنٹر بھی کسی امریکی حکومت کی دین نہیں ہے.. بلکہ ایک خاندان..راک فیلر خاندان کی ذاتی کاوش اور ملکیت ہے.. یہاں ایک زمانے میں جیسے ہمارے گورنمنٹ کالج کا نباتاتی باغ جناح باغ کے ایک گوشے میں ہے ویسے کولمبیا یونیورسٹی کا بوٹانیکل گارڈن ہوا کرتا تھا..اس نسبت سے سلجوق ذرا پرفخر ہو کر ہمیں وہاں لے کر گیا تھا کہ وہ بھی تو اسی یونیورسٹی کا ایک طالب علم تھا..

نیویارک کی انیس بلند ترین عمارتیں اس سنٹر کو آغوش میں لئے ہوئے ہیں جن میں سوا دو لاکھ سے زائد افراد کام کرتے ہیں..

ان عمارتوں کے سائے میں..ایک نشیب میں ایک سنہری مجسمے کے گرد آبشاریں گرتی ہیں اور ایک وسیع ریستوران ہے جہاں رونقیں مسکراتی اور کھلکھلاتی ہیں اور جب موسم سرما اترتا ہے تو یہی نشیب ایک سکیٹنگ رنک میں بدل جاتا ہے اور نیویارکر یہاں برف پر سکیٹنگ کے چاؤ پورے کرتے ہیں..

مجھے راک فیلر سنٹر کی بے پناہ روشنیوں اور رونقوں سے الگ تین مقامات نے اسیر کیا..

ایک تو کتابوں اور تصویروں کا وہ وسیع شوروم تھا جہاں صرف اور صرف جاپان تھا.. جاپانی ادب..تصاویر' پوسٹر' خوراک' روایات' تاریخ' غرض کہ سینکڑوں کی تعداد میں ان موضوعات پر کتابیں اور جرائد..نہ صرف انگریزی میں بلکہ جاپانی میں بھی اور یہ شوروم جاپانیوں کی منفرد حسِ جمال کی ایک تصویر تھا..اور اس مقام نے خصوصی طور پر مجھے کیوں اسیر کیا..سبب صرف جاپان نہ تھا پاکستان بھی تھا.. یہ بھی تو ممکن تھا کہ نیویارک میں ایک ایسا ہی شاندار اور دیدہ زیب شوروم ہو جو صرف اور صرف پاکستان ہو.. پاکستانی ادب' تصاویر' پوسٹر' خوراک' روایات' تاریخ اور ان موضوعات پر کتابیں اور جرائد.. یہ عین ممکن تھا اگر ایک ایم پی اے یا ضلعی ناظم جتنی دولت سمیٹتا ہے اس سے آدھی ایسے شوروم پر صرف کر دی جائے.. پر کیوں صرف کی جائے.. ہاں اگر یہ کبھی ممکن ہو جائے تو میں بخوشی ایسے شوروم میں ایک عام سیلز مین کی حیثیت سے کاؤنٹر پر کھڑا ہو سکتا ہوں..

دوسرا مقام بھی ایک شوروم تھا اور میں یہاں بھی ملازمت کرنے کو تیار تھا..

یہ میٹروپالٹین میوزیم آف آرٹس کی ایک دکان تھی جہاں دنیا کے اُس وسیع ترین عجائب گھر میں نمائش شدہ فنون لطیفہ کے شاہکار نمونوں' تصویروں' مجسّموں' ظروف اور زیورات کی ہو بہو نقلیں اور پوسٹر فروخت ہوتے تھے..سوونیئر اور جرائد فروخت ہوتے تھے.. مجھے اس شوروم نے اس لئے اسیر کیا ہے کہ وہاں شیشے کی راک فیلر سنٹر کی عمارتوں کو چھوتی کھڑکی پر ایک سادہ سا اعلان چسپاں تھا ’’یہاں کچھ آسامیاں خالی ہیں آپ درخواست دے سکتے ہیں‘‘.. میں نے زندگی بھر..چند برس کے کاروبار کے بعد لکھنے پڑھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا اور نہ ہی مجھے اور کوئی کام آتا ہے اور نہ ہی میں اس قابل ہوں اور نہ ہی اب مجھ میں اتنی سکت ہے لیکن میرا بے تحاشا جی چاہا کہ میں یہاں درخواست پیش کر دوں.. کہ اس شوروم میں ایک سیلز مین کی حیثیت میں سارا دن لوگوں کو آرٹ کے شاہکار فروخت کرنا..انہیں مائل کرنا کیسی انوکھی اور کمال کی نوکری ہوگی کہ سر یہ

میگڈنیل کی سرخ رنگوں میں ڈوبی نیوڈ کے بدن کو تو دیکھئے.. شاگال کی تصویر ''محبت کرنے والے'' کا بچوں ایسی معصومیت والا بھولپن اور تو من شدی من تو شدی کا تجریدی انداز تو ملاحظہ کیجیے.. مانے کے نیلے کنول.. گوگین کی تاہیٹی جزیرے کی سیاہ فام سفید پھولوں میں گھری موٹی عورتیں' فان گوگ کی ''ستاروں بھری رات''.. ان سب کے پوسٹر.. ری پروڈکشنز حاضر خدمت ہیں.. اس کے سوا پکاسو اور روڈین کے محبت بھرے مجسموں کے ریپلیکا ز بھی آپ خرید سکتے ہیں.. کچھ تو خیال کیجیے.. کچھ تو خرید لیجیے.. تو یہ کیسی کمال کی ملازمت ہوگی..'

اور تیسری عمارت جس نے راک فیلر سنٹر میں باقاعدہ میرے پاؤں پکڑ لئے وہ سی بی این کا ٹیلی ویژن سٹوڈیو تھا' پوشیدہ نہیں تھا' شیشے کی دیواروں میں سے دکھائی دیتا تھا.. رات کے اس پہر تو یہ ویران پڑا تھا.. کیمرے بے جان اور چپ.. روشنیاں بجھی ہوئی.. کیبلز اور سیاہ دبیز بجلی کی تاروں کا ایک جنگل اور میزبان کی نشست خالی!

یہیں سے ''گڈ مارننگ امریکہ'' کا مارننگ شو براہ راست نشر ہوتا تھا اور اب بھی دنیا بھر میں ایک الگ نام سے دکھایا جاتا ہے.

رات کے اس پہر تو یہ مقام اجڑا ہوا تھا اور خلق خدا راک فیلر سنٹر کی رونقوں میں رونق ہوئی جاتی تھی اور اس جانب کوئی دھیان نہ کرتا تھا لیکن میرا دھیان اُدھر ہی تھا کہ یہ میرے لئے ایک خصوصی اہمیت کا تاریخی مقام تھا..

یہ اُن دنوں کا قصہ ہے بلکہ فروری 88ء کا قصہ ہے جب مجھے پاکستان ٹیلی ویژن سے شروع کئے جانے والے پہلے مارننگ شو اور پہلی براہ راست نشریات کے پہلے میزبان کی حیثیت سے چنا گیا.. تو ایسی صبح کی نشریات کا کوئی نمونہ' کوئی ڈیزائن کوئی راستہ پہلے سے موجود نہ تھا جس پر ہم چل سکتے.. تو کون سا انداز اپنانا ہے.. کیا اور کس طریقے سے کہنا ہے اور چونکہ نشریات بھی براہ راست تھیں اگرچہ یہ انداز اب تو معمول ہو چکا ہے لیکن ان دنوں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا.. ٹیلی ویژن کے ابتدائی زمانے کے علاوہ چند ایک دیگر پروگراموں کے سوا ایک روزانہ براہ راست پروگرام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا.. میزبان نے جو کچھ کہنا ہے اس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی.. اور جو منہ سے نکل گیا وہ گیا.. سنسر کی کچھ گنجائش نہ تھی تو کیسے احتیاط کرنی ہے کہ کوئی بھی مجروح نہ ہو.. نہ ناظرین اور نہ ہی حکومت وقت.. اور حکومت وقت بھی ضیاء الحق کی یعنی مرے کو

مارے شاہ مدار..

میں اپنے طور پر غور و خوض کرتا رہا.. تو خواجہ نثار حسین جنہیں اگرچہ میں پہلے سے ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا اور جنہوں نے ٹیلی ویژن کے دیگر میزبانوں کی نسبت مجھے فوقیت دی تھی انہوں نے ایک روز دنیا بھر میں ہونے والے بریک فاسٹ شوز کے کیسٹ میرے سامنے ڈھیر کئے کہ تارڑ صاحب ذرا انہیں ایک نظر دیکھ لیجیے کہ امریکہ اور یورپ میں میزبان ایسی نشریات کے لیے کیا انداز اختیار کرتے ہیں تو شاید کوئی راستہ سجھائی دے جائے اور ان میں اسی راک فیلر سنٹر میں واقع میری نظروں کے سامنے جو سی این بی سٹوڈیو تھا یہاں سے براہ راست نشر کئے جانے والے بریکفاسٹ شو کی بھی دو تین کیسٹیں تھیں..

میں نے ان کیسٹس کو نہایت تفصیل سے دیکھا اور ان سے بہت کچھ سیکھا.. تکنیکی حوالے سے.. کہ کیسے اپنے آپ کو ہمہ وقت خوشگوار رکھنا ہے.. افلاطونی گفتگو جو ان دنوں میزبانوں کا خاصا تھی اس سے پرہیز لازم ہے.. عام آدمی کی سطح پر آ کر اس سے ایک دوست ایک عزیز کی مانند گفتگو کرنی ہے لیکن اس کے باوجود میں نے نثار حسین سے کہا ''خواجہ جی.. یہ امریکہ اور یورپ کی باتیں ہیں میرے پاکستان کی ثقافت مزاج اور بولیاں اور ہیں تو میں ان کیسٹوں سے کچھ سیکھ تو سکتا ہوں لیکن ان میزبانوں کی کاپی نہیں کر سکتا.. میں اپنی بولی بولنے کی کوشش کروں گا..''

پھر آٹھ برس تک مسلسل میں اس پہلے مارننگ شو کے میزبان کی حیثیت سے اپنی بولیاں بولتا رہا.. صبح سویرے پاکستان کے ہر خاندان کے دروازے پر دستک دیتا کہ السلام وعلیکم پاکستان اور پیارے پاکستان.. کیا میں اندر آ سکتا ہوں..

تو یہ مقام.. سی بی این کا یہ سٹوڈیو کسی حد تک میری میڈیا تربیت کا ایک حصہ تھا اور میرے لئے ایک خاص مقام تھا..

سلجوق کہنے لگا کہ ابو اگر آپ کسی بھی صبح آٹھ بجے یہاں پہنچ جائیں تو سٹوڈیو میں یہ مارننگ شو براہ راست نشر ہو رہا ہوتا ہے اور شیشے کی دیواروں کے پار دکھائی دے رہا ہوتا ہے.. یہاں باہر درجنوں لوگ جمع ہو جاتے ہیں جو میزبان کے پس منظر میں نظر آ رہے ہوتے ہیں بلکہ میزبان باہر آ کر ان میں سے دو چار کے ساتھ گفتگو بھی کرتا ہے.. تو اگر آپ کسی روز اتنی صبح بیدار ہو کر ادھر آ جائیں تو عین ممکن ہے کہ میزبان آپ کو ''ہیلو'' کہہ دے اور کیمرہ آپ پر چلا جائے..

بہت سی سویریں آئیں جب سلجوق کے فلیٹ میں صبح سویرے بیدار ہو کر میں نے سوچا کہ آج سنٹرل پارک میں سیر کرنے کی بجائے راک فیلر سنٹر کا رُخ کر لوں اور جا کر دیکھوں تو سہی کہ مارننگ شو یہاں کیسے آن ائیر جاتا ہے.. باہر کھڑے ہجوم میں شامل ہو کر ذرا غور تو کروں کہ یہ گورے کیا کمال کرتے ہیں جو ہم نہیں کر سکتے..اور میں بہت چاہتے ہوئے بھی جان بوجھ کر وہاں نہیں گیا کہ وہاں میں ایک بڑے ہجوم میں شامل ایک بے ثقافت پاکستانی ہوں گا اور اگر نشریات کا میزبان مجھے ''ہیلو'' کہہ بھی دیتا ہے تو بھی کیا..اور اگر میری شکل پورے امریکہ اور یورپ میں دکھائی دے بھی جاتی ہے تو بھی کیا..کُل جہاں میں بھی دکھائی دے جائے تو بھی کیا کہ میرا جہاں تو پاکستان ہے اور میں کُل پاکستان ہوں اور یہی میری ثقافت ہے یہ بہت حقیر اور پسماندہ سہی لیکن وہاں تو میں ایک جہان ہوں.. چنانچہ وہ اپنی بڑی دنیا میں خوش اور میں اپنی چھوٹی سی دنیا میں ان سے کہیں زیادہ خوش!

''ہم ابھی آتے ہیں..'' سلجوق نے کہا..

''ہاں انکل ہم ابھی آتے ہیں'' علی بولا..

''کچھ پیٹ پوجا بھی تو کرنی ہے..سنٹر کے قریب دوسرے بلاک میں کچھ عرب اور لبنانی ٹھیلے والے ہیں جو حلال گوشت کے تکّے اور شوارما فروخت کرتے ہیں اور وہ اتنے پسندیدہ ہیں کہ وہاں مسلمانوں سے زیادہ امریکیوں کا رش ہوتا ہے تو ہم وہاں سے کھانے کے لیے کچھ لاتے ہیں..''

وہ چلنے لگے تو رابعہ ان کے ساتھ چلتے چلتے ٹھہر گئی ''میں انکل کے پاس ٹھہرتی ہوں..''

''نہیں بیٹے..تم بھی ہو آؤ..''

اور رابعہ پہلے سے ہی اپنے میاں کے ساتھ نتھی ہو کر کہیں ہو آنے کے موڈ میں تھی..

''ابو آپ اِدھر اُدھر نہ ہونا..ہم ابھی آتے ہیں..''

وہ چلے گئے تو میں اپنی یادوں کے لیے کچھ عکس اپنے کیمرے میں محفوظ کرنے لگا..

میں تنہا تھا..

عبداللہ حسین سے میں نے ایک مرتبہ کہا..اور یہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں میں نے ایک مشہور مصورہ جو کہ اس کی بہت شیدائی تھی سے کہا تھا کہ عبداللہ کو کسی بھی انسان کی ضرورت نہیں..نہ بال بچوں کی اور نہ دوستوں کی..وہ یکسر تنہا رہنے پر اور اپنے آپ میں مگن رہنے پر قادر

ہے تو مصورہ ایک دکھ بھرے سناٹے میں چلی گئی.. بہر حال عبداللہ حسین سے میں نے کہا..خان صاحب تم اکثر تنہا رہتے ہو..لنڈن میں یا لاہور میں..اکثر کئی کئی ماہ تک تمہیں انسانی رفاقت کی خواہش نہیں ہوتی تو ایسا کیوں ہے..تو اس نے کہا تھا..مستنصر انسان اگر تنہا ہو تبھی سوچتا ہے.. اگرچہ ہم ان کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن یورپی اقوام کی ترقی کا راز بھی فرد کی تنہائی میں ہے..آپ کا جتنا زیادہ میل جول ہوگا..محفل بازی ہوگی تو وہ وقت کا زیاں ہوگا..کہ اس دوران آپ بولتے ہیں.. دوسرے بولتے ہیں اور آپ کا ذہن خالی رہتا ہے آپ سوچتے نہیں..

میری آوارہ گردیوں کا ایک سبب تنہائی کی تلاش بھی ہے..

شمال کی کوہ نوردیوں میں اگرچہ میں کچھ ساتھیوں کی رفاقت میں ہوتا ہوں کہ بلندیوں کے اُس نشیمن میں تن تنہا سفر کرنا ممکن نہیں ہوتا لیکن یہ رفاقت صرف شب بھر کے لیے ہوتی ہے.. جب صبح سویرے آپ کسی درّے کو عبور کرنے کے لیے خیموں سے نکلتے ہیں..کسی برفانی جھیل پر پہلا قدم رکھتے ہیں تو سب کوہ نورد تنہا ہو جاتے ہیں..ایک دوسرے سے فاصلے پر..اپنی چال اور سکت کے مطابق چلتے جاتے ہیں..اس کے علاوہ یورپ یا ایشیا کے زمینی سفروں کے دوران میں اکثر تنہا ہی ہوتا تھا..تنہائی ہی میں..کسی منظر کی..افغانستان کی عظیم بیابان وسعتوں کی..ایران کے دشتِ مرگ کی..نوح کے پہاڑ آرارات..سویڈن کی ان جھیلوں کی جو رات کے سمے بھی سورج کی کرنوں سے روشن رہتی ہیں..جرمنی کے سیاہ جنگلوں کی..کی پیغمبری آپ پر اترتی ہے..دھیان رہے کہ پیغمبری بھی ہمیشہ تنہائی میں اُترتی ہے..

تو میں تنہا تھا..راک فیلر سنٹر کی رونقوں والی خوشی سے اُبلتی رات کی تصویریں اتارتا تھا جب مجھے خیال آیا کہ ان میں سے کسی ایک تصویر میں مجھے بھی تو ہونا چاہئے تو میں تاک میں رہا کہ کوئی ایسا دکھائی دے..جسے میں درخواست کر سکوں کہ پلیز..آس پاس نگاہ کرتا رہا اور پھر کچھ دیر بعد اس نگاہ میں ایک خاتون آئی جو اپنے کیمرے کو سانس نہ لینے دیتی تھی' دھڑا دھڑ تصویریں اتار رہی تھی تو میں نے اس سے درخواست کی کہ کیا آپ ایک تصویر میرے لئے بھی اتار سکتی ہیں..پلیز..

''وہائی ناٹ..'' اس نے کہا..اور میرا کیمرہ تھام لیا..

وہ نیویارکر نہ لگتی تھی ورنہ وہ اتنے اشتیاق سے نیویارک کی تصویریں نہ کھینچ رہی ہوتی..

میں بھی بچوں کی غیر موجودگی میں قدرے بے باک ہوا جاتا تھا تو میں نے پوچھا کہ آپ نیویارک

کی تو نہیں ہیں؟..

نہیں نہیں..میں..اُس نے جانے کون سی ریاست کے کس شہر کا نام لیا کہ میں تو زندگی میں پہلی بار نیویارک آئی ہوں اور اس کے ساتھ محبت میں مبتلا ہوگئی ہوں اور تم کہاں سے آئے ہو اور کیا کرتے ہو..

میں نے بتایا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کیا کرتا ہوں..

ہاں پاکستان..اُس نے ذرا سا ہراساں ہو کر کہا..

اوہ واقعی..یہ اُس کا ردعمل تھا جب میں نے بتایا کہ میں کیا کرتا ہوں..

ہمارے ہاں اگر شرفاء میں یہ بتایا جائے کہ جی میں ایک لکھنے والا ہوں..ادیب ہوں..تو عوام الناس آپ سے ایسے گریز کرتے ہیں جیسے آپ کی قربت سے انہیں کوئی چھوت کی بیماری لاحق ہو جائے گی جیسے فیض صاحب نے ایک میمن سیٹھ کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ جی میں شاعری کرتا ہوں تو اس نے کہا تھا کہ یہ تو ٹھیک ہے پر دھندہ کیا کرتے ہو..اچھا تو کتابیں لکھتے ہو تو ایک دو بوری بھیج دینا..لیکن یورپ اور امریکہ میں آپ یہی اقرار کرتے ہیں تو لوگ آپ کے گلے پڑ جاتے ہیں اور اکثر اوقات لگ بھی جاتے ہیں..اس خاتون نے بھی اس قسم کی پُرمسرت حیرت کا اظہار کیا..اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ کیا لکھتے ہو..فلاں امریکی ادیب سے واقف ہو..کہاں ٹھہرے ہو اور کتنے دن کے لیے آئے ہو..میں تو اتنے دن کے لیے آئی ہوں..

یہ نیم آشنائی بھی ابھی ابتدائی مراحل میں تھی جب مجھے راک فیلر سنٹر کی دوسری گلی میں سے نمودار ہوتے ہوئے بچہ لوگ نظر آ گئے..میں نے فوری طور پر شدید معذرت کے ساتھ اور کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ کوئی بہانہ بنا کر اس خاتون کو رخصت کیا اور اس کی شکل ایسی تو نہ تھی کہ اسے یوں رخصت کر دیا جائے اور وہ بھی قدرے حیران تھی کہ اس عمر رسیدہ ادیب کو یکلخت سے دورہ سا کیوں پڑ گیا ہے لیکن یہ تو میں جانتا تھا کہ بچے اگر مجھے اس نوجوان خاتون کے ساتھ چُہلیں کرتے دیکھ لیتے تو کم از کم سلجوق یہ ضرور سوچتا کہ اس ابا جی کا کیا کروں یہ اب بھی باز نہیں آتے..

حالانکہ میں کب کا باز آنے پر نہ صرف مجبور بلکہ معذور ہو چکا تھا..

لبنانی تکے کباب' سلاد اور چاول..راک فیلر کی شام میں..

چلیے اس شام کا سب سے سحر انگیز اور میرے ذہن پر نقش ہو چکا جو منظر ہے میں اس

میں آپ کو شریک کرتا ہوں..

ہم بنچوں پر براجمان لبنانی کھانے کے ذائقے میں محو تھے تو ایک جوڑا ہمارے پاس سے گزرا..وہ غالباً نہیں یقیناً ٹیکساس سے آئے تھے نیویارک دیکھنے کے لیے..مرد دراز قامت اور خوش شباہت..نہایت نفیس اور مہنگا سفید کوٹ..بھڑکیلی قمیض' چست نیلی پتلون میں..کاؤبوائے بوٹ جو راک فیلر سنٹر کی روشنیوں سے لشک رہے تھے اور سر پر ایک ترچھا سفید رنگ کا کاؤبوائے ہیٹ..اور وہ ایک سرو کی مانند سیدھا اور خوش نما چلتا تھا..اور اس کے پہلو میں اس کی عورت..ایک چمکیلے گوٹے کناری والے بلاؤز اور نہایت ٹائٹ جین میں اور اونچی ایڑھی کی جوتیاں جن پر موتی جڑے ہوئے تھے اور اس کی کمر کے گرد ان دنوں کی ذرا شوخ خواتین کا مرغوب فیشن ایک دھاتی بیلٹ..جس کے آہنی پھندنے پازیبوں کی مانند چھنکتے تھے..

یہ منظر تو ایک معمول کا منظر ہو سکتا تھا..ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کے حوالے سے تو ہو سکتا تھا لیکن وہ منظر سحر انگیز صرف ان کی عمروں کی وجہ سے ہوا کہ وہ دونوں یقیناً اسّی برس سے تجاوز کرنے والے تھے یا کر چکے تھے لیکن ان کے دل جوان تھے اور زندگی کے لطف اور ایک دوسرے کی قربت کے کیف میں ڈوبے ہوئے تھے..انہیں جو پسند تھا وہ انہوں نے پہنا ہوا تھا اور کچھ پرواہ نہ تھی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اس عمر میں یہ چونچلے کہ ان خطوں میں لوگ کچھ کہتے ہی نہیں..بلکہ وہ تحسین کی نگاہوں سے تکتے ہیں..لوگ تو ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ وہاں لوگوں کا کام ہے کہنا..کہ ذرا ان بڈھے کھوسٹوں کو دیکھو..ان کے بے شرم چونچلے دیکھو' قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں..پوتے پوتیاں بھی بیاہ چکے ہیں اور یوں اک دوجے کے ساتھ جڑ کر چلتے ہیں اور کیسے لفنگوں ایسے لباس میں گھومتے ہیں..

نہ صرف وہ اپنے لباس کی بھڑکیلے پن کی نوخیزی میں بے پرواہ چلتے تھے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر چلتے تھے اور جب ایک دوسرے کی جانب دیکھتے تھے تو پہلی بار محبت میں مبتلا ہونے والے ٹین ایجروں کی مانند دیکھتے تھے..

مجھے وہ جوڑا بہت اچھا لگا..راک فیلر سنٹر کا سب سے پیارا اور سحر طراز منظر لگا..

سلجوق ظاہر ہے اپنے ابا جی کی رگ رگ سے آگاہ تھا بلکہ کچھ ایسی رگوں سے بھی آگاہ

تھا جن سے اُسے ایک برخوردار کے طور پر آگاہ نہیں ہونا چاہیے تھا تو وہ خوب جانتا تھا کہ یہ جوابا جی ہیں یہ آرٹ شارٹ کے بے حد شیدائی ہیں.. موسیقی میں کھو جائیں تو اتنے کھو جاتے ہیں کہ تلاش گمشدہ کا اشتہار دینا پڑتا ہے.. کوئی فلم یا ڈرامہ اثر کر جائے تو دن رات اسی کا تذکرہ کرتے جائیں گے.. کوئی پینٹنگ دل کو لگ جائے تو اسے دل دے بیٹھتے ہیں اور اس کے سامنے دھونی رما کے پہروں اسے ہی تکتے جاتے ہیں چنانچہ ایک دوپہر وہ مجھے لنکن سنٹر فار پرفارمنگ آرٹس لے گیا جہاں ہر نوعیت ہر قسم اور ہر قومیت کے آرٹ شارٹ کی گنگا مسلسل بہتی رہتی ہے.. اور وہاں جو یاتری ہوتے ہیں وہ اس بہتی گنگا میں صرف ہاتھ دھونے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس میں ڈبکیاں لگاتے اپنے آپ کو پوتر کرتے رہتے ہیں.. سٹیج ڈرامے' آپرا' موسیقی کے کانسرٹ' فلمیں' ادبی تقریبات' تصویروں کی نمائشیں' رقص کے مظاہرے اور اسی نوعیت کے پرفارمنگ آرٹس اتنی بہتات سے پیش کیے جاتے ہیں کہ بندہ احتیاط نہ کرے تو اس گنگا میں ڈبکیاں لگاتا غڑاپ سے ڈوب جائے.. رابعہ بھی ساتھ تھی لیکن اس بچی کو آرٹ وارٹ سے کچھ شغف نہ تھا.. وہ محض میرا دل رکھنے کی خاطر اور اپنے خاوند کے ساتھ لاڈ کرنے کے لیے ساتھ چلی آئی تھی..

لنکن سنٹر کی تعمیر کا آغاز 1959ء میں ہوا جب صدر جنرل آئزن ہاور نے بہ نفسِ نفیس ایک کدال سے بنیاد کے لیے زمین کی کھدائی کا کام شروع کیا.. اور یہ فوجی صدر خود نہیں آیا تھا.. ووٹوں کے ذریعے لایا گیا تھا.. ہمارے ہاں تو فوجی صدر خود سے آتے ہیں اور پھر عوامی ریفرنڈم کرواتے ہیں کہ بولو میں قبول ہوں یا اسلام یا روشن خیالی کے نام پر تمہاری گردن اتار دوں چنانچہ عوام الناس قبول ہے قبول ہے کہ فلک شگاف نعرے لگانے لگتے ہیں.. لنکن سنٹر کی تعمیر کا افتتاح ہوا تو اس موقع پر اس زمانے میں دنیا کے سب سے بڑے کنڈکٹر موسیقار' لیونارڈ برنسٹائن نے نیویارک فل ہارمونیک آرکسٹرا کی خصوصی دھنوں سے لوگوں کو مسحور کیا.. آج لنکن سنٹر کے برابر میں ایک اہم شاہراہ کا نام اسی یہودی کمپوزر پر ہے.. ہم میں سے یعنی ہماری نسل کے بہت سے لوگوں نے یقیناً برنسٹائن کی کلاسیک فلم ''ویسٹ سائیڈ سٹوری'' دیکھی ہوگی جس کے گیتوں کی گنگناہٹ کبھی زوال پذیر نہ ہوگی..

رابعہ ایک سیاہ چشمے' سیاہ کوٹ اور سیاہ ٹراؤزر میں اور اُس کے بھورے بال ہوا میں بکھرتے ہوئے.. اور رابعہ قدرے اُکتائی ہوئی اور بور!

اور سلجوق ایک آدھی آستین کی کالی ٹی شرٹ اور نیلی جین میں نہایت پُرشوق.. ابو وہ تالاب سے پرے بلند ہوتی ہوئی عمارت دنیا کا جانا ہوا جولین سکول آف ایکٹنگ ہے.. ادھر آپرا ہاؤس ہے جس کا بڑا فانوس دیکھنے کے لائق ہے اور ادھر تھیٹر ہال ہے اور تالاب کے کنارے اوپن ایئر میوزیکل کانسرٹ جو بالکل مفت ہے.. یہ گورے کمال کرتے ہیں ابو..

ہم نے سنٹر کے معلوماتی مرکز سے جو ڈھیر سارے کتابچے حاصل کیے اُن میں پورے برس کے پروگراموں کی مکمل تفصیل تھی.. بقیہ پروگراموں کو تو چھوڑیئے سنٹر کے میٹروپالٹین آپرا میں آئندہ برس جو آپرا سٹیج کیے جانے تھے وہ ایسے کمال کے پوری دنیا میں شہرت رکھنے والے تھے کہ مجھ ایسا کچھ شدھ بدھ نہ رکھنے والا شخص بھی ان کے ناموں سے خوب واقف تھا.. مثلاً کارمن' آئیڈا اور سرانو ڈی برگراک جیسے آپرا جنہیں میں ٹیلی ویژن کے توسط سے دیکھ چکا تھا.. جی ہاں وہی ہسپانوی کارمن لڑکی اور سرانو وہ لمبی ناک والا نپوکی.. ان کے علاوہ رومیو اینڈ جولیٹ.. سیمسن اینڈ ڈیلائلہ.. ریگولیٹو' امریکن ٹریجڈی وغیرہ.. میں ان کی کہانیاں جانتا تھا.. آئیڈا میں گائے جانے والے چند گیتوں کی دھنیں پہچانتا تھا لیکن مجھے ان لازوال آپراز کو کبھی سٹیج پر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا.. اتفاق تو تب ہوتا جب میں اپنے کنوئیں سے باہر نکل کر دیکھتا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے.. میں جس کنوئیں میں تھا اس میں میرے ساتھ ہر قسم کی موسیقی' رقص' مصوری' ڈرامہ' آپرا' سب کے سب میرے ساتھ دفن تھے.. اگر ان میں سے کوئی بھی اپنا سر اٹھانے کی جسارت کرتا تو فوری طور پر اس کی سرکوبی کر دی جاتی تھی.. یقین کیجیے کہ آپ دنیا کے بہترین میوزیکل' سٹیج ڈرامے اور آپرا بیشتر مسلمان ملکوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں.. تہران میں بھی ایک آپرا ہاؤس تھا جانے اب ہے یا اس کی بھی سرکوبی کر دی گئی ہے.. ترکی' شام' عراق' ملائیشیا' انڈونیشیا' اُردن.. ہر کہیں آپ ایک شام کوئی بین الاقوامی سٹیج ڈرامہ دیکھ سکتے ہیں.. آپرا اگر آپ کا ذوق ہے تو وہ بھی دیکھ سکتے ہیں.. لیکن پاکستان میں تو آپ ایک میراتھن دوڑ کو بھی نہیں دیکھ سکتے یہاں تک کے عید کے چاند کو بھی نہیں دیکھ سکتے..

مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ میرے پڑھنے والے اس آرٹ شارٹ کی ٹاک شاک سے بہت بور ہو چکے ہوں گے.. جمائیاں لے رہے ہوں گے.. لیکن وہ نہیں جانتے کہ ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا.. اصل رونا دھونا اور بوریت تو تب شروع ہوگی جب میں میٹروپالٹین میوزیم' میوزیم

آف ماڈرن آرٹ' میوزیم آف نیچرل ہسٹری' میوزیم آف ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن اور گوگن ہائم میوزیم کے بارے میں دفتر کے دفتر کھول دوں گا..ان میں نمائش شدہ تصویروں' مجسموں' قدیم ثقافتوں' ڈائنا سورس کے ڈھانچوں وغیرہ کے بارے میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دوں گا.. بوریت تو تب شروع ہوگی' کیسے بھولے قارئین ہیں کہ آپ راکے چند ناموں سے ہی جمائیاں لینے لگے ہیں.. وہ جو نقاد کہتے ہیں اور قارئین محسوس کرتے ہیں کہ تارڑ کے سفرناموں میں اور کچھ ہو نہ ہو ریڈابلٹی بہت ہوتی ہے تو وہ سب سر پیٹ کے رہ جائیں گے جب میں فان گوگ کی تصویر ''تاروں بھری رات'' کی اثر اندازی اور سحر طرازی کو بیان کرتا چلا جاؤں گا..اصل بوریت تو تب ہوگی..لگ پتا جائے گا..قارئین میں نے ہمیشہ آپ کا خیال رکھا ہے..نیویارک کے اس سفرنامے کو پڑھتے ہوئے کچھ میرا خیال رکھ لیجیے..یعنی ہو سکے تو جمائیاں کم سے کم لیجیے..جب آپ ان ابواب تک پہنچیں گے جہاں میں اپنے سمیت آپ کو بھی عجائب گھروں میں دفن کر دوں گا..

فی الحال ہم لنکن سنٹر میں آوارہ پھرتے ہیں..

اگرچہ ہم اپنے ساتھ کچھ سامان خوردنوش لائے ہوئے ہیں لیکن سلجوق کی تسلی نہیں ہو رہی کہ وہ ایک لاہوریا ہے اور عمدہ خوراک کے بغیر دفتر خارجہ میں ایک ڈیسک پر بیٹھے ہوئے بین الاقوامی امور کے بارے میں بھی کچھ فیصلے نہیں کر سکتا تھا چنانچہ وہ کہتا ہے ''ابو.. یہاں بھی.. راک فیلر سنٹر کی مانند..ادھر قریب ہی ایک عربی برادر اپنے ٹھیلے پر حلال فوڈ لگائے بیٹھا ہے..میں ابھی آیا..اور آپ اس دوران تالاب کے کنارے آرام سے کرسیوں پر دراز ہو کر امریکی لوک موسیقی کا یہ کانسرٹ سنیں..''

نیویارک کی اس دوپہر میں درختوں کی چھاؤں میں سینکڑوں لوگ نہایت مؤدب اور متوجہ ہو کر سامنے سٹیج پر امریکی لوک ثقافت کے نمائندہ گلوکاروں کو دیکھ رہے تھے اور نہایت انہماک سے سن بھی رہے تھے..بلکہ سر بھی دھن رہے تھے..ان میں نوجوان کم ہی تھے کہ یہ ایک ورکنگ ڈے تھا اور کام سے ایک دن کی چھٹی کر لینا آپ کو زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے کر دیتا ہے.. باس کی ناراضی الگ لیکن صرف ایک دن کی تنخواہ کی کمی سے آپ اگلے دو ماہ تک جانبر نہیں ہوتے اور آپ کے بجٹ کا خانہ خراب ہو جاتا ہے چنانچہ سامعین میں جو لوگ تھے وہ تھے جو زندگی کی دوڑ سے الگ ہو چکے تھے..ریٹائر ہو چکے تھے' دوڑ سے الگ ہو چکے تھے لیکن زندگی سے الگ نہیں ہوئے

تھے..ان میں نیویارک کے وہی عجوبہ بوڑھے اور بوڑھیاں تھے..بنے ٹھنے اور عمدہ ستھرے لباسوں میں..ان میں سے چند تو ابھی بدنی طور پر صحت مند تھے اور چند ایک لڑکھڑاتے ہوئے آتے تھے اور کرسی کی پشت کو تھام کر نہایت سلوموشن میں اس پر خاصی دیر کے بعد بیٹھنے میں کامیاب ہو جاتے تھے..اور ایسے بھی تھے جو وہیل چیئر کے پہیوں کو گھماتے چلے آتے تھے..اور جو اتنی سکت بھی نہ رکھتے تھے ان کے ہمراہ انکے مددگار تھے جو ان کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے انہیں سامعین کے برابر میں لا کر خود پیچھے ہو جاتے تھے..اور ہاں ان میں سے چند ایک کے سر ہلتے ہوئے دیکھ کر یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ وہ سٹیج پر برپا امریکی موسیقی کی تال پر ہل رہے ہیں بلکہ وہ تو رعشے کی وجہ سے ہل رہے ہیں اور اس کے باوجود وہ زندگی کی مسرتوں کا دامن چھوڑ کر مرنے کے انتظار میں گوشہ نشین نہیں ہو جاتے.. سانسوں کے جام کو وہ آخری قطرے تک پیتے ہیں اور اس کے خمار سے لطف اندوز ہوتے ہیں..

جب تک قضا نہیں آ جاتی وہ یہ جام اپنے لبوں سے نہیں ہٹاتے..بے شک اُن کے سر ہلتے رہیں..

سچی بات ہے مجھے امریکی لوک موسیقی سے کچھ زیادہ رغبت نہیں رہی..یعنی یہ جسے کنٹری میوزک کہا جاتا ہے اس سے زیادہ شغف نہیں رہا جس میں گٹار کی اکتا دینے والی دھن پر ایک جاہل سا شخص کاؤبوائے ڈریس میں..ایک بڑا سارا ہیٹ سر پر سجائے تقریباً رونے کے انداز میں اور قدرے بے سرے انداز میں یوڈلنگ کرتا ''یا ہو..ہے ہے..ہو ہو'' قسم کی آوازیں نکالتا یا تو اپنی محبوبہ کی جدائی بیان کرتا ہے یا پتا نہیں کیا کرتا ہے..اور اگر کنٹری میوزک گانے والی ایک خاتون ہے تو وہ خاصی مردمار قسم کی خاتون ہوگی..مجھے زندگی بھر صرف دو ایسے لوک گیت پسند آئے..ایک تو وہی ''ہینگ ڈاؤن یور ہیڈ ٹام ڈولی'' جس کا میں اکثر حوالہ دیتا ہوں اور دوسرا ایک کلاسیک اور روح میں اتر جانے والا ''ہوٹل کیلی فورنیا''..ان کے سوا کنٹری میوزک سے مجھے کچھ سروکار نہیں..لیکن لنکن سنٹر کے کھلے شجر ہائے سایہ دار صحن میں..اس دوپہر میں..یہ موسیقی مجھے اچھی لگنے لگی..سٹیج پر مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے لوک فنکار آتے رہے اور اُن میں سے کچھ کی آوازوں میں جو درد تھا وہ ان کی گٹاروں میں بھی منتقل ہوتا تھا اور آواز اور گٹار دونوں مجھ پر اثر کرتے تھے..

دراصل کھلی فضا میں بیٹھے ہوئے ایک اوپن ائیر کانسرٹ سننا..کسی بند تھیٹر میں بیٹھ کر موسیقی سننے سے ایک بالکل جدا تجربہ ہے..تھیٹر کے اندر آپ ایک مصنوعی موسم میں اپنی نشستوں پر

براجمان نہایت دھیان سے موسیقی سنتے ہیں اور ایک وائلن کی لے بھی دیر تک ہال میں گونجتی رہتی ہے اور پھر آپ کے کانوں میں اُترتی ہے جبکہ کھلی فضا میں جب آپ موسیقی سنتے ہیں تو وہ قید نہیں ہوتی.. کسی تھیٹر یا ہال کی دیواروں کے اندر بند نہیں ہوتی.. وہ آزاد ہوتی ہے اور وہ مختلف سنائی دیتی ہے کہ اس میں آپ کے سر پر سایہ فگن درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ شامل ہوتی ہے.. جو ہوائیں چلتی ہیں ان کا ہلکا شور ہوتا ہے.. جو لوگ دھیان سے نہیں سن رہے ان کی باتوں کا شور ہوتا ہے.. اگر ایک اسّی برس کا بوڑھا اپنی رعشے سے سرہلاتی شریک حیات کا ہاتھ بمشکل تھام کر کہتا ہے کہ.. ہنی آئی لو یو.. تو اس کی بھی آمیزش ہوتی ہے.. تو کھلی فضا میں سنی جانے والی موسیقی قدرتی اور زندگی کے قریب تر ہوتی ہے..

میرے برابر میں بیٹھی رابعہ.. نہایت معصومیت سے.. لگتا یہی تھا کہ موسیقی سن کر ایک حالت وجدان میں آنکھیں بند کئے ہوئے ہے لیکن وہ اپنی نیند پوری کر رہی تھی.. یہاں تک کہ ایک لوک موسیقار گلا پھاڑ پھاڑ کر یوڈلنگ ایسے کرتا رہا کہ ہمارے سروں پر سایہ کرنے والے درختوں میں جو حساس قسم کے پرندے تھے وہ بھی خوفزدہ ہو کر اڑ گئے لیکن مجال ہے کہ رابعہ کو کچھ خبر ہوئی ہو.. وہ شانت سوتی رہی..

ان درختوں کے برابر میں جو تالاب تھا اسے کسی فلپ جانسن نے تخلیق کیا تھا لیکن اس تالاب کو زمانے بھر میں اگر شہرت ملی تو ہنری مور کے اس مجسمے کے طفیل ملی جو اس کے درمیان میں ایستادہ اپنا آہنی عکس اس کے پانیوں میں تیراتا تھا..

ہنری مور کے مجسمے کا نام ''لپٹا ہوا وجود'' ہے..

جو لوگ بے خودی' بے اختیاری اور بے بس محبت میں مبتلا ہو کر جب لپٹتے ہیں تو شاید اسی طور.. لپٹے ہوئے وجود ہو جاتے ہیں..

اس شاندار تالاب میں صرف ہنری مور کے مجسمے کا عکس ہی نہیں تیرتا بلکہ لنکن سنٹر کے پس منظر میں نیویارک کی جو چند ذی شان نہایت بلند درجات کی حامل عمارتیں ہیں وہ بھی اس لپٹے ہوئے وجود کے ہمراہ تیرا کی کرتی ہیں..

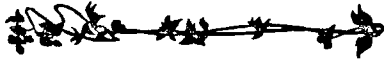
سلجوق.. لمبے لمبے ڈگ بھرتا عین ہمارے سروں پر نمودار ہوا اور کہنے لگا.. ''ابو کھانا..''

ہم نے وہ سامان خوردونوش جو گھر سے لائے تھے اور وہ جو سلجوق لے کر آیا تھا تالاب

کے دوسرے کنارے جا کر ایک بنچ پر براجمان ہو کر کھایا.. سکول آف ایکٹنگ کی عمارت کے سائے میں.. میں کسی زمانے میں ایک ایکٹر بھی تھا اور چار سو کے لگ بھگ ڈراموں میں مرکزی کردار کر چکا تھا لیکن بغیر کسی باقاعدہ ٹریننگ کے.. یونہی انکل پچو.. کبھی جیمز ڈین کے انداز کی پیروی کر کے اور کبھی مارلن برانڈو کے تتبع میں ناک سے نہ سمجھ میں آنے والی بڑبڑاہٹ کے انداز میں.. اگر وہی دن پھر سے لوٹ آتے تو میں اس سکول میں داخل ہو کر شاید واقعی اداکاری کے فن میں ماہر ہو جاتا..

''انکل آپ نے ابھی وہ بور سی موسیقی سننی ہے یا گھر چلیں؟'' رابعہ نے پوچھا.

اور فلپ جانسن کے تخلیق کردہ تالاب کے درمیان میں ایستادہ ہنری مور کا ''لپٹا ہوا وجود'' جو ساکت پتھر تھا اُس میں کچھ حرکت سی پیدا ہوئی رابعہ کی یہ بات سن کر کہ انکل آپ نے ابھی وہ بور سی موسیقی سننی ہے یا گھر چلیں.. وہ مجسمہ کچھ محظوظ ہوا کہ یہ رنگین آنکھوں اور بھورے بالوں والی خوش نظر لڑکی کیسے بے دھڑک اپنا اظہار کرتی ہے.. میرا خیال ہے کہ ہنری مور کا وہ مجسمہ بھی شاید امریکی لوک موسیقی کی تاب نہ لا کر بیزار ہو چکا تھا اور رابعہ کو اپنا ہم نوا اور غم خوار پا کر خوش ہوا تھا.. اسی لئے پل بھر کے لیے پتھر میں حرکت ہوئی تھی اور اگلے لمحے وہ پھر سے پتھر ہو گیا تھا..



''میٹروپالٹن' میوزیم آف آرٹ''

دے میٹروپالٹن میوزیم آف آرٹ...

اگر نیویارک ایک صحرا کا نام ہوتا.. یہ ایک بیاباں ہوتا اور میں یہاں آتا... کوئی ٹائمز سکوئر۔ مجسمۂ آزادی۔ ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ یا اس کی رونقوں میں نمایاں ہونے والے دل کش چہرے نہ دیکھتا.. کچھ بھی نہ دیکھتا اور صرف میٹروپالٹن دیکھ لیتا تو یہ شہر اس لائق تھا کہ اس کے پاس آنے کے لیے دور کی مسافتیں جائز ٹھہرتیں..

جیسے ہندوستان میں اور کچھ نہ ہوتا صرف تاج محل ہوتا.. مصر میں سوائے اہراموں کے اور کوئی عمارت نہ ہوتی اور چین میں صرف دیوار چین ہوتی تب بھی اُن کی روایت اور ثقافت مکمل ہوتی.. کچھ یہی معاملہ نیویارک میں میٹرو کے ہونے کا ہے. تھوڑے سے فرق کے ساتھ کہ تاج محل' اہرام مصر اور دیوار چین صرف اور صرف اپنی تہذیب کی شناخت ہیں جبکہ یہ میوزم دنیا بھر کی قدیم تہذیبوں کا امین ہے..

میں اس میوزیم کی حیثیت کے بارے میں مبالغے سے کام نہیں لے رہا..

یہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جسے آپ پڑھتے نہیں بلکہ دیکھتے ہیں اور اس میں سانس لیتے ہیں۔ دنیا بھر کے فنون کی.. ہر ثقافت ہر خطے کی قدیم تاریخ کی. فلارنس اطالیہ سے لے کر نیو گنی انڈونیشیا تک اور ازمنۂ قدیم سے تقریباً عہد حال تک.. اس کے کثیر التعداد ہال کمروں' برآمدوں اور راہداریوں میں نمائش پر ہے.. بیس لاکھ مربع فٹ کے ڈھکے ہوئے علاقے کی چھتوں تلے... ہر ہال میں نوادرات اور عجائبات کے ایسے جواہر ہیں جن کے الگ الگ میوزیم بن سکتے ہیں۔ صرف قدیم مصر کے چھتیس ہزار نوادر نمائش پر ہیں. مختلف فنون کے نمونوں کی تعداد تیس لاکھ سے بھی تجاوز

کر جاتی ہے۔ اگرچہ جگہ کی کمی کے باعث یہ سب کے سب دکھائے نہیں جا سکتے..

میٹروپالٹن کی داغ بیل نیویارک میں نہیں پیرس میں ڈالی گئی.. 1866ء میں چند بااثر امریکی چار جولائی کا جشن منانے کے لیے بوئے ڈی بولون میں اکٹھے ہوئے.. اُس سمے تک امریکہ کی شناخت بے حساب دولت اور کاؤبوائز تھے.. یورپی اُسے فنون لطیفہ اور اخلاقیات سے سراسر کورا سمجھتے تھے.. ان امریکیوں نے سوچا کہ بے شک ہم ایک نئی دنیا ہیں.. اور ہمارے ہاں فن اور ثقافت کے بوٹے ابھی نہیں پھوٹے تو کیوں نہ ہم اپنی ثروت مندی کو دنیا بھر کے فنون اور قدیم ثقافتوں کو جمع کرنے کے لیے استعمال میں لائیں.. ایک یکتا آرٹ گیلری وجود میں لائیں۔ چنانچہ ان ترجیحات کو عملی شکل دینے کی خاطر 1870ء میں ایک ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا..

موجودہ عمارت 1880ء میں سنٹرل پارک کے کنارے ففتھ ایونیو کی بیاسویں سٹریٹ پر تعمیر کی گئی..

میں نے نیویارک کی زندگی کے بہترین دن میٹرو میں گزارے.. اگرچہ میوزم آف ماڈرن آرٹ یا موما۔ نیچرل ہسٹری میوزیم۔ گوگن ہائم میوزیم اور میوزیم آف ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن میں بسر کیے جانے والے لمحے بھی کچھ کم انمول نہ تھے لیکن میٹرو کا حیرت کا جہان سب سے الگ تھا.. آپ کو احساس ہو گیا ہو گا کہ نیویارک میں میں آسمان تلے کم رہا اور عجائب گھروں کی چھتوں کے نیچے زیادہ..

عجائب گھر اور قدیم کھنڈر.. مٹ چکی تہذیبیں اور اُن کے آثار.. اور دوسری جانب قدرت کے مناظر اور چہرے.. ہمیشہ سے میرے تنِ مُردہ میں روح بھر دیتے.. مجھے زندہ کر دیتے ہیں۔ یہ ایک انہونا سا کمبی نیشن ہے کہ جو لوگ عجائب گھروں اور کھنڈروں میں کھوئے رہتے ہیں وہ مناظر اور چہروں سے لاتعلق رہتے ہیں اور جو مناظر اور چہروں کے شیدائی ہوتے ہیں وہ عجائب گھروں میں بند ہونا پسند نہیں کرتے اور کھنڈروں کے پاس نہیں پھٹکتے.. اب اگر بیک وقت میں تخت بائی کے راہب خانے کے کھنڈروں میں بھی روشنی دیکھتا مسحور ہوتا ہوں اور ذرا آگے سوات میں اُتر کر زرد پھولوں کے ایک کھیت کی زردی سے بھی مسخر ہو جاتا ہوں.. اور پھر کوئی ایک چہرہ پل بھر میں گزر جاتا ہے پر تا حیات میرے بدن میں ٹھہرا رہتا ہے تو کیا میں عقلی طور پر ماؤف ہوں..

مجھے فنون لطیفہ کے رازداں ہونے کا کچھ دعویٰ نہیں.. اپنے ذوق جمال کے بارے میں

بھی زیادہ مطمئن نہیں ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا اور میں وہ نہیں ہوں جس پر بھید آشکار ہوتے ہیں..

اوائل عمری میں..ایک کچی اور ٹین ایج حالت میں بھی.. مجھے عجائب گھروں کے اندر کی راز بھری خاموشی اور قدیم مہک کی لت پڑ چکی تھی.. سمجھ بوجھ نہ رکھتا تھا اور اس کے باوجود شوق آوارگی میں جس شہر میں بھی ہوتا منیر نیازی کی مانند تب تک اُکتائے ہوتے رہتا جب تک کہ کوئی میوزیم نہ دیکھ لیتا.. اگرچہ میری ذہنی بلوغت ابتدائی مراحل پر تھی لیکن میں نہایت شوق سے اور کبھی اپنے آپ پر جبر کر کے دنیا میں یکتائے روزگار سینکڑوں شاہکاروں کو دیکھتا رہا جو انسان نے اپنے رب کی سطح پر آنے کی کوشش میں تخلیق کیے تھے.. اُس کی ہم سری کی خواہش میں بنائے تھے.. اور یاد رہے کہ کسی بھی تخلیق کو اپنے اندر اُتارنے کے لیے.. چاہے وہ تحریر میں ہو یا تصویر میں.. جبر ضروری ہے.. آپ کو دوستو وسکی یا کافکا پڑھنے کے لیے پہلے پہل تو دل پر پتھر رکھنا پڑتا ہے.. مونا لیزا کو اپنے آپ پر جبر کر کے تا دیر دیکھنا تو پڑتا ہے..

ایک زمانہ گزرا جب میں پہلی بار صرف مونا لیزا دیکھنے کی چاہت میں پیرس کے شہرۂ آفاق لُوور میوزیم میں داخل ہوا تھا.. ایک بار برلن کے سفر کا قصد اس لیے کیا کہ وہاں ریمبرانت کی تصویر ''سنہری خود میں ایک شخص'' آویزاں ہے.. فلارنس کی اوفیزی گیلری میں کیسے کیسے شاہکار تھے.. اکیڈمی میں مائیکل انجلو کا ''ڈیوڈ'' ایک برہنہ سنگ مرمری سفیدی کے جاہ و جمال میں کیسے آپ پر سایہ فگن ہوتا ہے.. روم کے سینٹ پیٹرز میں ''پائتا'' اور سستین چیپل کی چھت پر اسی مائیکل انجلو کا بارِیش اللہ میاں اپنے آدم میں ایک اُنگلی سے رُوح پھونکتا ہوا.. میڈرڈ کا پراڈو.. جو گویا کی جنگ کی ہولناکیوں کی تصاویر سے سوگوار لگتا تھا.. لندن کی سٹیٹ گیلری.. نیشنل گیلری جہاں کانسٹیبل کے زمینی مناظر جلوہ گر ہیں.. ایمسٹرڈیم کا رائک میوزیم جہاں ریمبرانت کی ایک پوری دیوار پر حاوی ''نائٹ واچ'' آویزاں ہے اور اس شہر میں جب آپ میوزیم آف ماڈرن آرٹ میں قدم رکھتے ہیں تو آپ کی آنکھیں سورج اور سورج مکھی کے پھولوں کی زرد کرنوں سے چندھیا جاتی ہیں اور یہ کمال فان گوگ ایسے دیوانے کا ہے جس کی تصویروں کے رنگ ابھی تازہ اور گیلے لگتے ہیں.. اگر آپ اُن کو چھو لیں تو آپ کی انگلیوں میں سے سورج مکھی کے پھول پھوٹنے لگیں گے..

تو میرا یہ روگ بہت پرانا ہے..

یہ علّت بہت قدیم ہے..

یہ آشفتہ سری کچھ نئی تو نہ تھی..

تقریباً نصف صدی پرانی تھی..

چنانچہ میٹروپالٹن میوزیم نے اگر مجھے زیر کر لیا.. ڈھا لیا تو اس میں اُس کا کچھ کمال نہ تھا کہ میں تو ایک عرصے سے زیر ہو جانے والوں میں سے تھا اور بخوشی ڈھایا جانا چاہتا تھا..

میٹرو سے پہلی ملاقات تو سلجوق کے کہنے پر ہوئی کہ وہ بھی اپنی فارغ دوپہریں اسی عجائب گھر میں بسر کرتا تھا.. نیویارک کی گائڈ بک نے بھی نہایت سختی سے تنبیہ کی کہ ہر سیاح پر لازم ہے کہ وہ میٹروپالٹن میوزیم میں ایک بار تو جھانک کر دیکھ لے.. میں نے ایک بار جھانک کر دیکھا تو پھر مجبوری اور اسیری کے زمانے آ گئے.. میری ترجیح اول یہی عجائب گھر ہو گیا.. بلکہ اکثر سلجوق بھی خفا ہو جاتا کہ والد صاحب نیویارک میں اور بھی بہت کچھ ہے.. آج میٹرو نہ جائیں تو کونسی قیامت آ جائے گی..

مجھے خوب معلوم تھا کہ سلجوق کے فلیٹ سے اُتر کر براڈوے سٹریٹ کو پار کر کے کس بس سٹاپ تک جانا ہے جہاں سے ایک نمبر کی بس مجھے سیدھی.. سنٹرل پارک کے کناروں پر رواں بس.. مجھے اس عجائب گھر کی سیڑھیوں کی قُربت میں لے جائے گی اور یہاں میں ایک نہایت کارآمد اور خفیہ انکشاف کرنا چاہتا ہوں جو مستقبل کے اُن سیّاحوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہو گا جو اس میوزیم میں داخلے کی تمنا رکھیں گے..

میوزیم میں داخلے کے ٹکٹ کی شرح بارہ ڈالر تجویز کی گئی ہے..

میں جتنی کثرت سے اس میوزیم میں آیا تھا اگر ہر بار اتنے ڈالر خرچ کرتا تو میرے مختصر ڈالروں کا بُھرکس نکل جاتا..

میں تو صرف ایک ڈالر ادا کر کے سرخرو ہو جاتا تھا.. اور اذن باریابی پا جاتا تھا..

کیسے؟

ایسے کہ سلجوق نے مجھے اپنا رازداں کیا ''والد صاحب.. جب کسی بھی میوزیم کے داخلے پر یہ عبارت لکھی ہو کہ اس میوزیم کو دیکھنے کے لیے اتنے ڈالر کا ٹکٹ تجویز کیا جاتا ہے تو اس کا صرف

یہ مطلب ہوتا ہے کہ انتظامیہ کی یہ خواہش ہے کہ آپ اتنی رقم ادا کر کے میوزیم میں داخل ہوں.. یہ محض ایک تجویز ہے..آپ اس پر عمل کریں نہ کریں یہ آپ کی مرضی ہے..آپ میٹرو پالٹن جائیے اور صرف ایک ڈالر ادا کیجیے تو آپ کو داخلے کا ٹکٹ مل جائے گا.. یہ قانونی نکتہ بہت کم لوگ جانتے ہیں..میں ہمیشہ ایک ڈالر ادا کر کے اندر چلا جاتا ہوں..''

ویسے جب میں ٹکٹ کاؤنٹر پر پہنچا تو مجھے یہ تجویز ماننے میں بہت تامل ہوا کیونکہ قطار میں کھڑے درجنوں لوگ کیا سفید کیا سیاہ کیا زرد سب کے سب دھڑا دھڑ بارہ ڈالر ادا کرتے چلے جا رہے ہیں. میں نے بہت جھجکتے ہوئے بہت شرمندگی سے ایک ڈالر آگے بڑھایا اور اس یقین کے ساتھ کہ کاؤنٹر پر ٹکٹ فروخت کرنے والی خاتون یہ ڈالر میرے منہ پر دے مارے گی اور کہے گی اندھے ہو دیکھ نہیں سکتے بورڈ پر داخلے کی شرح بارہ ڈالر لکھی ہوئی ہے اور ہر کوئی اتنی ہی رقم ادا کر رہا ہے..چکّر چلانا چاہتے ہو..لیکن اُس نے تو آنکھ تک نہ جھپکی..ایک ڈالر وصول کر کے مجھے ٹکٹ عنایت کر دیا..

ویسے یہ تکنیکی نکتہ میں نے دیگر عجائب گھر میں بھی کارآمد پایا.یعنی جہاں ''تجویز'' کا لفظ درج تھا اور ایک ڈالر سے ہی بخوبی کام چلایا..ویسے آپ یہ راز افشا نہ کیجیے گا ورنہ میٹرو پالٹن دیوالیہ ہو جائے گا..

نیویارک بس سروس کی ایک نمبر بس آپ کو میوزیم کی سیڑھیوں کے آگے نہیں اتارتی' یا تو دو فرلانگ پیچھے اُتارتی ہے اور یا پھر فراٹے بھرتی ہوئی میوزیم کے سامنے سے گزر کر دو فرلانگ آگے جا اتارتی ہے..اس میں اللہ جانے کیا مصلحت ہے اور یاد رہے کہ میٹرو ففتھ ایونیو پر اُس ایک میل کے علاقے میں واقع ہے جسے ''میوزیم مائل'' یعنی عجائب گھروں کا میل کہا جاتا ہے اور اس میل کے اندر اندر کم از کم ایک درجن عجائب گھر موجود ہیں..ان میں گوگن ہائم اور یہودی تاریخ کا عجائب گھر اہم ترین ہیں۔ بہر حال آپ بس سے اُتر کر سنٹرل پارک کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر چلتے میٹرو کی جانب بڑھتے ہیں لیکن آپ کے قدم ہر قدم پر رکتے ہیں کہ اس فٹ پاتھ پر بھی آرٹ ہی آرٹ ہے..

آرٹ کے خوانچے لگے ہیں ایک مینا بازار سجا ہے..

اور خوانچہ فروش فٹ پاتھ پر چلتے سیاحوں کو پکار پکار کر متوجہ کر رہے ہیں..

''آپ کی پورٹریٹ صرف دس ڈالر میں بناؤں گا..اور صرف دس منٹ میں..جو کہ لیونارڈو بھی نہیں بنا سکتا تھا.اُس نے مونا لیزا دس منٹ میں تو نہیں بنائی تھی..''

''اپنا کیری کیچر بنوائیے..اور جان جائیے کہ آپ کی شکل کتنی مزاحیہ ہے..''

''سنٹرل پارک کا منظر آپ کے سامنے پینٹ کیا جائے گا.صرف آپ کے لیے..''

''منکے..موتی..انڈیا کے..جاپان کے اور افریقہ کے..''

''پوسٹرز..فنی پوسٹرز..ڈرٹی پوسٹرز..سیکسی پوسٹرز..''

یہ تو میں نے قدرے مبالغہ کیا ہے کہ یہ خوانچہ فروش پکار پکار کر راہگیروں کو متوجہ کر رہے تھے..البتہ وہ اُن سے مخاطب ضرور ہوتے تھے..وہ یہ جانتے تھے یہ لوگ اگر آرٹ کے شیدائی نہ ہوتے تو میٹرو پالٹن کی جانب کیوں بڑھ رہے ہوتے..براڈوے کے کسی شراب خانے میں بیٹھتے..پارک ایونیو پر ٹہلتے..اگر ادھر آئے ہیں تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئے ہیں اور یہ دل کہتا ہے کہ یہ دنیا تو خدا نے بنائی ہے تو اسے چھوڑ کر کچھ لمحوں کے لیے ایک ایسی دنیا میں چلے جائیں جو انسان کے ہاتھوں نے بنائی ہے..

لگا ہے آرٹ کا بازار دیکھو..

اسی آرٹی فٹ پاتھ پر مجھے قدیم مسکنوں کی ایک بھولی ہوئی سراسر فراموش شدہ یاد آئی..

اِک گورکھ دھندا اور اُسے فروخت کرنے والا ایک شخص یاد آ گیا..

اس فٹ پاتھ پر ایک خوانچہ فروش لوہے کی تاروں سے تخلیق کردہ بھول بھلیاں یا گورکھ دھندے سجائے بیٹھا تھا..آہنی تاروں کو مختلف شکلیں دی گئی تھیں.طرح طرح کے نمونے بنائے گئے تھے جو زیور سے لگتے تھے ''حضرات آپ کی ذہنی صلاحیتوں کا امتحان ہے..تاروں کے اس پیچیدہ جال میں سے اگر آپ یہ تکون الگ کر لیں تو آپ ایک جینئس ہیں..یہ دیکھیے میں کر کے دکھاتا ہوں.'' وہ شتابی سے اُس تکون کو آگے پیچھے کر کے گورکھ دھندے سے نکال کر سب کو دکھاتا اور پھر اُس میں واپس ڈال کر لوگوں کو دعوت دیتا کہ اب آپ کوشش کر دیکھیں..

یہ گورکھ دھندے آہنی تاروں کے..ایک صلیب نما بانس سے لٹکائے انار کلی بازار میں..

میرے بچپن میں..ایک بڑھی ہوئی سفید داڑھی والا شخص فروخت کیا کرتا تھا..اسی طرز اور انہی نمونوں کے گورکھ دھندے..تاروں کو جوڑ توڑ کر موڑ کر ایک پیچیدہ شکل دی جاتی تھی اور اُن میں ایک تاروں سے ہی ساختہ تکون یا دائرہ قید کر دیا جاتا تھا..اور یہی امتحان تھا کہ اُسے کیسے باہر نکالا جائے..اور میں ہمیشہ اس نوعیت کا گورکھ دھندا خرید لیتا اور اُس کی قیمت بھی ایک اُٹھنّی سے بڑھ کر نہ ہوتی تھی اور گھر آ کر ہلکان ہو جاتا تھا پر وہ تکون مجھ سے تو تاروں کی بھول بھلیوں میں سے نہ نکلتی تھی..

اور وہ شخص اُنہیں سر بازار بیچنے والا کوئی جینئس نہ تھا..کوئی ان پڑھ اندرون شہر کا ایک ڈھلتی ہوئی عمر کا زندگی میں ناکام ایک شخص..اور ایسے شخص اُن زمانوں میں بہت ہوتے تھے..جس نے دو وقت کی روٹی کی خاطر بہت سے کسب کیے تھے..پر پھر بھی پوری نہ پڑتی تھی..کبھی مرغ چنے فروخت کیے..کبھی برف کے گولے بنا کر رزق کمانے کی کوشش کی..کبھی میٹھی گولیاں بنانے کے تجربے کیے..کبھی ڈور پر مانجھا لگانے کا کام سیکھا اور ہاتھ لہولہان کروائے پر پوری نہ پڑی..اور پھر شاید یوں ہوا کہ کسی اندھیری کوٹھڑی میں نابینا ہوتا ایک استاد مل جاتا ہے جو اُسے یہ عجیب سا فن سکھا دیتا ہے جس کے لیے زیادہ سرمایہ درکار نہیں..لوہے کی چند گز تاریں درکار ہیں۔اُنہیں موڑ توڑ کر..کہیں جھکا کر اور کہیں گانٹھ لگا کر ایک پُرپیچ ڈیزائن بنانا ہے اور اُس میں اُنہی تاروں سے بنا ہوا ایک دائرہ یا تکون اُلجھا دینا ہے۔ایسے کہ اس کے باہر نکالنے کا کوئی امکان نظر نہ آئے اور آپ نے اُسے باہر نکال کر لوگوں کو دکھانا ہے کہ یہ ممکن ہے..اس دھندے سے روزی کمائی جا سکتی ہے..

پورے انار کلی بازار میں بس وہ ایک ہی ہوتا تھا..کڑی دھوپ میں کھڑا اپنی روزی کی صلیب اُٹھائے جس پر وہ مختلف نمونوں کے گورکھ دھندے سجے ہوتے تھے اور وہ ہر راہگیر کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتا اُسے تکون یا دائروں کو تاروں کی بھول بھلیوں میں سے نکال کر دعوت دیتا کہ صرف ایک اُٹھنّی خرچ دیجیے اور پھر دوستوں اور عزیزوں کو یہ جادو دکھا کر حیران کر دیجیے..تو میں ہمیشہ ایک گورکھ دھندا خرید لیتا اور تکون کیسے باہر آئے گی اُس سے بار بار سمجھ کر ذہن نشین کر لیتا اور گھر پہنچتا تو سب کچھ بھول بھال جاتا اور مجھ سے تو وہ تکون باہر نہ نکلتی..

بچپن بیت گیا اور جب حیات کے طویل راستوں پر قدم رکھے تو ہر قدم پر ایک نہ ایک گورکھ دھندا تھا..جو نہ سلجھتا تھا نہ سمجھ میں آتا تھا بلکہ مزید الجھاتا تھا..اور یوں ایسے بہت سے گورکھ

دھندے جمع ہوتے گئے جنہیں میں حل نہ کر سکا..ان کی تکونیں اور دائرے کوشش بسیار کے باوجود باہر نہ لا سکا..

میں نے ان گورکھ دھندوں کو کسی بازار سے خریدا نہیں تھا یہ زبردستی مجھ پر مسلط کر دیئے گئے اور کس نے کیے؟..وہ جو سب سے بڑا گورکھ دھندا ہے..

کتنے زمانوں میں..کائناتوں میں..کیسے کیسے لوگوں نے..رومی۔عطار۔سرمد۔حلاج۔کبیر اور بلھے شاہ نے اُس گورکھ دھندے کو سلجھانے اور جان جانے کے لیے اپنی جان دی پر وہ سلجھا نہیں..اُلجھا ہی رہا..اور مجھے اس حوالے سے ہمیشہ اپنے ابا جی کا پسندیدہ شاعر..جس کی کئی نظمیں اُنہیں زبانی یاد تھیں..پروفیسر موہن سنگھ یاد آتا ہے اور میرے قیاس کے مطابق یہ لفظ گورکھ دھندا اس لیے وجود میں آیا تھا کہ صرف موہن سنگھ اس کو معانی عطا کرے..

''رَب اِک گورکھ دھندا...
جدھیاں گُتھیاں کھول کھول کے..
کافر ہو جائے بندا..
اور...لائی لگ مومن کولوں کھوجی کافر چنگا..
رَب اِک گورکھ دھندا..''

یہ رَب بھلا کیسا گورکھ دھندا ہے جس کی گُتھیاں کھولنے سے بندہ کافر ہو جاتا ہے..ایک کھوج لگانے والا کافر..کیسے ایک آنکھیں بند کر کے فوری طور پر ایمان لے آنے والے مومن سے بلند مرتبے پر فائز ہو جاتا ہے..کیسے؟

ایک بندے کی بھی کیا مجبوری ہے..کیسی بے بسی ہے کہ کھوج لگائے تو کافر ہو جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لے تو مومن کہلاتا ہے..

کیا یہ ایک عجوبہ نہیں کہ آج سے پچاس برس پیشتر انارکلی بازار میں ایک ڈھلتی عمر کا اَن پڑھ شخص لوہے کی تاروں سے یہی گورکھ دھندے..یہی ڈیزائن اور شکلیں بنایا کرتا تھا اور آج نیویارک میں ایک اور شخص..ہو بہو وہی گورکھ دھندے اپنے ہاتھوں سے بنا کر بازار میں لے آیا ہے..یہ شخص

ایک اتفاق نہیں بلکہ دنیا بھر میں.. کسی بھی خطے میں مقیم انسانوں کے ذہنی اشتراک کا ایک ثبوت ہے..

حیات کے گورکھ دھندے سب کی مشترکہ وراثت ہیں..

اور یہ کبھی نہیں سلجھنے والے!

وہاں.. فٹ پاتھ پر ایک پریشان حال.. بے ترتیب داڑھی اور کندھے تک آتی لٹوں والا مصور بھی اپنی چند تصویریں سجائے بیٹھا تھا.. لیکن وہ راہگیروں کو متوجہ نہیں کرتا تھا.. پشیمانگی سے کبھی اپنی داڑھی کو سنوارنے کی سعیٔ لاحاصل کرتا تھا اور کبھی قریب سے گزرنے والوں سے نظریں چراتا بے وجہ سنٹرل پارک کے گھنے درختوں کو تادیر گھورتا رہتا تھا.. اُس کی تصویریں.. ایک اناڑی.. ایک شعبدہ باز کی تصویریں نہ تھیں.. وہ ایک مکمل اور باکمال مصور تھا.. شاید نصیب نے ساتھ نہیں دیا تھا.. زمانے کے بازار میں اس کا مول نہیں پڑا تھا' وہ کھوج لگانے والا تھا اس لیے کافر ہو گیا تھا.. وہ شاید میٹروپالٹن میوزیم میں آویزاں چند مصوروں سے اگر برتر نہ تھا تو اُن سے کمتر بھی نہ تھا.. لیکن نصیب نے اُس کا ساتھ نہیں دیا تھا اور وہ فٹ پاتھ پر آ بیٹھا تھا.. اسی لیے نہ تو وہ کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتا تھا اور نہ اپنی تصویریں خریدنے کی ترغیب دیتا تھا.. شرمندہ اور خجل اپنی داڑھی کھجاتا بیٹھا تھا.. مجبور تھا.. زمانے نے اُس کی قدر نہ کی تھی.

جو بھی نامور ہوتے ہیں وہ سب کے سب نابغۂ روزگار نہیں ہوتے.. اُن میں سے بیشتر صرف نصیب اور ذاتی کاوشوں کے بل بوتے پر اُبھرتے ہیں.. ادب' مصوری اور موسیقی میں سارے سکّے کھرے نہیں ہوتے.. بہت سے سخت کھوٹے ہوتے ہیں پر وہ مسلسل بھاگ دوڑ اور کاسہ لیسی سے اپنے آپ کو کھرا ثابت کر دیتے ہیں...

قسمت کے یہی انوکھے کھیل بیشتر مصوروں' ادیبوں اور موسیقاروں کو ٹائمز سکوئر یا میٹروپالٹن کے فٹ پاتھ پر لے آتے ہیں اور یہی کھیل اُنہیں ناموری کی بلند ترین چوٹی پر جا براجمان کرتے ہیں.. اگر نصیب یاوری کرے تو.. کوئی گوگین یا فان گوگ ہو جاتا ہے اور اُن جیسی صلاحیت رکھنے والا کوئی فٹ پاتھ پر آ بیٹھتا ہے..

یہ بھی ایک گورکھ دھندا ہے.. ویسے عافیت تو اسی میں ہے کہ اُس کی گتھیاں نہ سلجھائی جائیں.. اور کافر ہونے کا خطرہ نہ مول لیا جائے..

ایک اور خوانچہ فروش مارلن منرو اور آڈرے ہیپ برن کے حُسن کا بازار گرم کیے بیٹھا

تھا.. منرو کی تو وہی آل ٹائم فیورٹ فٹ پاتھ پر نیویارک کی سب وے کی جالی پر کھڑی اور اُس میں سے نیچے ٹرین کے گزرنے سے جو تیز ہوا یکدم آتی ہے اُس کے زور سے اُس کا سفید لباس ٹانگوں سے اوپر اٹھتا ہوا اور وہ مسکراتی ہوئی جھکتی ہوئی لباس کو تھامتی ہوئی کہ کہیں وہ ہوا کے زور سے کمر سے اونچا نہ ہو جائے.. اور آڈری ایک سگریٹ ہولڈر لبوں میں بھینچے یا ٹفنی جیولرز کے شوکیس کے سامنے ایک انداز میں.. جاپانی ان پوسٹرز کو نہایت جاں فشانی سے دھڑا دھڑ خرید رہے تھے..

ایک کھوکھا مختلف سووینئرز اور ٹی شرٹس کا تھا جس کے اندر ایک لاپروا نوجوان کندھوں پر ٹیٹو کھدوائے گلے میں منکے اور مالائیں ڈالے کھڑا تھا اور باہر جو جوان تھا باریش اور بیزار سا تھا.. دونوں دیسی لگتے تھے اور تھے کیونکہ ان میں سے جو باریش تھا اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملا لیا کہ آپ ہی ہیں ناں!

مجھے اس غیر متوقع پہچان پر خوشی ہوئی اور میں نے بخوشی بتایا کہ میں ہی ہوں۔

''ادھر کیسے آئے ہیں؟''

میں نے بتایا کہ ادھر ایسے آیا ہوں.. میوزیم دیکھنے کے لیے.. ''یہ آپ کا کھوکھا ہے؟''

''جی نہیں.. یہ تو کمپنی کا مال ہے.. ہم صرف ملازم ہیں. تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے پارٹ ٹائم جاب کر رہے ہیں.. بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر.. آپ اگر ان میں سے دو تین ٹی شرٹس اپنے لیے پسند کر لیں تو ہمیں مزید خوشی ہو گی۔''

''آپ کی محبت کا شکریہ لیکن میرا بدن ایسا نہیں رہا کہ ایسی ٹی شرٹس سہار سکے..''

''نہیں نہیں۔'' اب منکوں' مالاؤں والا نوجوان اصرار کرنے لگا ''آپ کم از کم یہ ''آئی لو یو نیویارک'' والی ٹی شرٹ تو قبول کر لیں۔''

یہ خصوصی لوگو یا موٹو نیویارک کی پہچان بن چکا ہے.. آئی.. پھر ایک سرخ دل.. اور پھر نیویارک.. اس ڈیزائن کا خالق ابھی ایک برس پیشتر فوت ہوا تو اُس کا بہت سوگ منایا گیا تھا کہ شہر کو پہچان دینے والا شخص چلا گیا ہے..

میں اس خصوصی ''آئی لو نیویارک'' ٹی شرٹ جس میں لو کی جگہ ایک سرخ دل بنا ہوا تھا کو خوب جانتا تھا.. ماڈل ٹاؤن پارک میں جوگنگ کرتے ہوئے کسی نوجوان کے بدن پر.. ایک محفل میں ایک سگریٹ پھونکتی لڑکی کے تن پر.. اور میرے گھر کے باہر جو جمعدار جھاڑو لگاتا ہے

اُسے بھی میں نے یہ ٹی شرٹ زیب تن کیے ہوئے دیکھا تھا.. میں نے اُن محبت بھرے نوجوانوں سے مسکراتے ہوئے معذرت کی اور پھر ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گیا..

ایک اور خوانچہ فروش ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کو عرش سے فرش پر بلکہ فٹ پاتھ پر لے آئے تھے.. اور اُن کی بولی لگا رہے تھے.. پتہ نہیں اُن صاحب نے یہ مجسمے خود اپنے گھر میں بنائے تھے اور یہ اُن کا پہلا تجربہ تھا خدا بنانے کا اس لیے وہ خدا ذرا بھدّے اور مزاحیہ سے لگ رہے تھے.. ان میں گنیش۔ پاربتی۔ شِو۔ ہنومان۔ کرشن مہاراج اور کالی دیوی کے چھوٹے چھوٹے مجسمے تھے.. میں ان کے قریب رکا نہیں کہ یہ میرے ماضی کے خدا تھے.. مجھے مسلمان ہوئے ابھی چند روز گزرے تھے اور میں اس سے پیشتر صدیوں سے ہندو رہا تھا تو مجھے خدشہ تھا کہ میرا ایمان کہیں ڈول نہ جائے اور میں پھر سے ان کے چرنوں میں سر نہ رکھ دوں اس لیے رُکا نہیں..... ویسے اب میرے ایمان کے ڈولنے کا مزید کچھ امکان نہ تھا.. یہ پہلے سے ہی اتنا ڈانواں ڈول تھا کہ اب اور کیا ڈولے گا.. اس آخری عمر میں اگر بندے نے کسی بُت کے سامنے سجدہ ریز ہونا ہی ہے تو وینس ڈی میلو کے قدموں پر سر رکھ دے یا مائیکل انجلو کے ''داؤد'' کے سامنے ہاتھ جوڑ دے یا روڈین کے کسی مجسمے کی بیعت کر لے تا کہ دیکھنے والے بھی داد دیں کہ اگر بُت پرست ہو گیا ہے تو کیسے بُتوں کے لیے بُت پرستی اختیار کی ہے.. یہ تو کچھ گھاٹے کا سودا نہیں ہے.. کم از کم لمبی سونڈھ والے گنیش مہاراج کے قدموں میں تو نہیں لوٹا..

میٹرو کی نیم کلاسیکی طرز کی عمارت یونانی ستونوں کے کندھوں پر آرام کرتی ہے اور اُس کے صدر دروازے تک پہنچنے کے لیے جو سیڑھیاں ہیں وہ اتنی بہتات میں ہیں کہ اگر آس پاس کوئی بشر نہ ہو اور آپ تن تنہا ان پر چڑھتے جا رہے ہوں تو ایک رومی شہنشاہ کی مانند محسوس کریں گے اور اوپر پہنچ کر اپنا لبادہ اور تاج سنبھالتے ہوئے پلٹ کر ان سیڑھیوں کے نیچے جمع رومی جمِ غفیر کو مخاطب کر کے کہیں گے ''فرینڈز۔ کنٹری مین اور رومنز'' اور تقریر شروع کر دیں گے.. لیکن ان سیڑھیوں پر چڑھنے والوں کا اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ اگر آپ پلٹ کر تقریر کرنا چاہیں گے تو روندے جائیں گے..

صدر دروازے میں داخل ہونے پر آپ کی ہلکی پھلکی تلاشی ہوتی ہے اور آپ اس کے مرکزی ہال میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس شاندار آوازوں سے گونجتے ہال کی شان ہی نرالی ہے.. دیواروں میں جو طاقچے اور محراب ہیں اُن میں تازہ پھولوں اور بُوٹوں اور پتّوں کے اتنے

بڑے گلدستے سجے ہیں کہ ہر گلدستے کے لیے ایک پورا چمن اجڑ گیا ہو گا.. اور روزانہ اجڑتا ہو گا.. گُل بوٹوں کی یہ متعدد سجاوٹیں ایک گمنام خاتون روزانہ میوزیم کی بھینٹ کرتی ہے.. وہ اپنی خواہش سے گمنام رہنا چاہتی ہے اور صرف اس خواہش کی اسیر ہے کہ میٹرو میں قدم رکھنے والے ہزاروں تخلیق کے پرستاروں کی نظریں ہال میں داخل ہوتے ہی چند لمحوں کے لیے اُس کے پیش کردہ پھولوں پر ٹھہریں..

درمیان میں معلومات کا ایک گول دائرہ کاؤنٹر ہے جہاں سے آپ بلا معاوضہ میوزیم میں سجی ہوئی نوادرات' آئندہ کی نمائشوں کی تفصیل اور خصوصی لیکچروں کی تاریخوں کے کتابچے حاصل کر سکتے ہیں.. اور اس عجائب گھر کے تفصیلی نقشے بھی جن کے بغیر آپ نہایت آسانی سے اس کے طویل برآمدوں' پے در پے کمروں' راہداریوں' منزلوں اور ہالوں وغیرہ میں گمشدہ ہو سکتے ہیں.... بلکہ ان نقشوں کے باوجود بھی ہو جاتے ہیں..

یہ محض ایک عجائب گھر نہیں ہے جس کے اندر قدم رکھنا ایک دنیا میں قدم رکھنے کے مترادف ہے.. جہاں رنگوں کی بھڑکیلی بھی اور مدھم بھی وادیاں ہیں ایسی کہ آپ اُن میں اُترتے ہیں تو اُن کے رنگوں میں یوں رنگے جاتے ہیں کہ سب جان لیں کہ یہ شخص تو اُس وادی سے ہو کر آیا ہے.. اور مجسموں کے جنگل ہیں.. آپ کے من چاہے صنم کے سوا کہ وہ یہاں کہاں ہو گا.. تبت' چین' افریقہ کے.. یونانی' رومی اور پاکستانی گندھارا کے ایسے مجسمے ہیں کہ اگر آپ لائی لگ مومن ہیں تو بھی قوی امکان ہے کہ کسی ایک بُت کے اسیر تو ہو جائیں گے... یہاں میدان کارزار بھی ہیں.. جنگ وجدل کے قدیم ہتھیار' تلواریں' زرہ بکتر اور ڈھالیں بھی سجی ہیں.. موسیقی کے سمندر بھی ہیں جن میں دنیا بھر میں آج تک بجائے جانے والے پرانے ساز اب بھی سانس لیتے مترنم ہیں۔ دنیا بھر کے ملبوسات کی سجاوٹ اور خوش نمائی ہے اور ایک چینی گھر ہزاروں برسوں قدیم ثقافت کے سکون میں ٹھہرا ہوا ہے۔ جاپان کی کوئی پرانی بستی ہے.. کہیں ایک فرانسیسی محل دمک رہا ہے.. اس دنیا میں یہ سب کچھ ہے.. کفار کا غلبہ تو ہے پر ان سیاہ بادلوں کے کناروں پر اسلام کی سنہری کرنیں بھی ایک اسلامک سیکشن میں منور ہوتی ہیں.. تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس حیرت کی قدیم دنیا میں اگر آپ تفصیلی نقشے کے بغیر اُتر جاتے ہیں.. گم ہو جاتے ہیں اور راستہ نہیں ملتا تو پھر ذرا تصور کیجیے کہ آپ پر کیا بیتے گی.. آپ راستہ بھول بھٹک جاتے ہیں یا کسی تصویر کے پریم نگر میں کھو جاتے ہیں..

کسی صنم کے اسیر ہو کر اپنا آپ فراموش کر دیتے ہیں اور اس دوران میوزیم کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں.. طے شدہ وقت کے مطابق سب ناظر اور شائق چلے جاتے ہیں اور آپ اپنے آپ میں گم اُس دنیا میں تنہا رہ جاتے ہیں.. تو کیا ہو گا..

ایک تو وقت اور زمانہ دونوں معدوم ہو جائیں گے..

کچھ خبر نہ ہو گی کہ برس کون سا ہے اور کونسی صدی ہے جس میں آپ سانس لے رہے ہیں.. یوں آپ تمام گزرے ہوئے زمانوں کے باسی ہوں گے.. اور اُن زمانوں کے جتنے بھی کاریگر تھے.. ہنرمند.. مصوّر اور مجسمہ ساز تھے وہ آپ کے ہم عصر ہو جائیں گے.. اُن کا اور آپ کا زمانہ ایک ہو جائے گا..

آپ کا ذاتی عقیدہ اور تاریخ دونوں موقوف ہو جائیں گے..

آپ بیک وقت ایک مظاہر پرست.. بابل.. نینوا.. تبت اور مصر کے خداؤں کے پجاری ہو جاتے ہیں.. ایک بُدھ' ہندو' یہودی' عیسائی اور مسلمان ہو جاتے ہیں.. آپ کی ذاتی تاریخ اور عقیدہ منسوخ نہیں ہوتے اُن پر دیگر تاریخوں اور دوسرے عقیدوں کا بوجھ پڑ جاتا ہے.. اور آپ کو قلق ہوتا ہے کہ آپ کیوں اپنے عقیدے' روایت اور تاریخ کی محدود قید میں رہے.. کہ آپ کا سچ ہی تو آخری اور بلاتردید سچ تو نہیں ہے.. اس دنیا میں اور بھی سچ ہیں اور ہم اُن کو گوارا نہیں کرتے.. گناہ جانتے ہیں اور کان بند رکھتے ہیں کہ کہیں بھٹک نہ جائیں.. ہم لائی لگ مومن رہنا ہی پسند کرتے ہیں پر اندر سے ڈول جاتے ہیں.. گم ہو جاتے ہیں..

ویسے انسان اگر گُم ہو تو بے شک رومی اور یونانی یا جاپانی زمانوں میں گم ہو جائے.. لیکن قدیم مصر میں تنہا نہ رہ جائے کہ وہاں تو ہر سُو ''موت کے بعد مرنے کا منظر کیا ہو گا'' دکھائی دیتا ہے..

ویسے ہماری موجودہ تہذیب بھی قدیم مصری تہذیب سے کم نہیں بلکہ اُس سے کہیں بلند مقام پر فائز ہے کہ ہمارے عہد میں ایک مقبول ترین کتاب یہی تھی کہ موت کے بعد مرنے کا منظر کیا ہو گا.. میں نے اس کے ایک باب ''موت کے بعد فوٹو گرافروں کا کیا انجام ہو گا'' کو ایک نظر دیکھا اور جان گیا کہ زندگی بھر میں اگر کوئی ایک شخص کیمرے سے ایک تصویر اتارے گا تو موت کے بعد کیسے عذابوں سے دوچار ہو گا.. اور میں نے تو ہزاروں تصویریں اتاری تھیں تو میری بخشش کا کوئی امکان نہ تھا.. چنانچہ اگر جہنم کی آگ میں ہی جلایا جانا ہے تو کم از کم تصویریں تو جی بھر کے اُتار

لو.. اس شہرۂ آفاق کتاب کے مصنف سے میری ملاقات سنگ میل پبلی کیشنز کے شوروم میں نیاز احمد کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ یہ مصنف ایک نہایت باکمال شخص تھے.. کراچی سے ایک بائیسکل پر سوار رنگوں کے ڈبوں اور کوچیوں سے لیس وہ ایک طویل سفر پر پیڈل مارتے ہوئے نکلے.. کراچی اور لاہور کے درمیان ہر دیوار پر ''موت کے بعد مرنے کا کیا منظر ہو گا'' بہ نفس نفیس پینٹ کرتے جانے کتنے عرصے کے بعد لاہور میں داخل ہوئے اور اُس کے بعد یہ کتاب ایک مقدس صحیفے کی مانند فروخت ہونے لگی اور وہ کروڑ پتی ہو گئے۔ کوئی بھی شخص جو لاہور سے کراچی بذریعہ ریل گاڑی جاتا تھا اور کھڑکی کے باہر نظر کرتا تھا تو اُسے ہر دیوار پر موت لکھی نظر آتی تھی اور وہ تھر تھر کانپتا توبہ استغفار کرتا جب منزل پر پہنچتا تھا تو پہلا کام یہ کرتا تھا کہ اس کتاب کو خریدتا تھا..

مصنف کو کویت' انگلستان' دوبئی اور امریکہ سے دردمند دینی پاکستانی خطیر رقمیں روانہ کرتے تھے کہ ہماری جانب سے کتاب کے ایک ہزار نسخے شائع کیے جائیں اور مُفت تقسیم کیے جائیں تاکہ ہماری مغفرت کا کچھ سامان ہو..

چنانچہ ہم اس حوالے سے قدیم مصریوں پر سبقت رکھتے ہیں.. اُن سے کہیں بڑھ کر موت کے بعد منظر دکھانے پر قادر ہیں..

بے شک وہاں مصری حصے میں جو اتنا بڑا ہے کہ الگ سے ایک میوزیم کہلا سکتا ہے.. حیرت انگیز شبیہیں اور مجسمے ہیں۔ قدیم مصریوں کی روزمرہ زندگی کے آثار ہیں لیکن وہاں بنیادی طور پر موت کی حکمرانی ہے۔ نہایت بھاری چٹانی پتھریلے تابوت ہیں جن میں سے ایک کا وزن تو سینکڑوں من ہو گا.. اگر اُس زمانے میں تابوت اُٹھا کر قبرستان جانے کا رواج تھا تو یقیناً اس تابوت میں تاابد آرام کرتے مصری صاحب کے جنازے کو تو کسی نے کاندھا نہیں دیا ہو گا۔ یہاں کفن کے سُوتی لبادے ہیں.. ایک مُردے کو نہلانے' کفنانے اس کا پیٹ چاک کر کے اُس کی ممی بنانے کے تمام مراحل ہیں اور تابوت اس کثرت سے ہیں اور اُن میں بند حضرات کی پورٹریٹیں تابوتوں کے ڈھکنوں پر بھی اس کثرت سے ہیں کہ اگر آپ غور کریں تو ان میں کوئی نہ کوئی چہرہ شناسا لگے گا بلکہ اپنا لگے گا.. یہ تو میرا ناک نقشہ ہے.. ہو بہو میری شکل ہے تو کیا میں ہوں جو اس تابوت میں حنوط ہوں.. اگر نہیں ہوں تو ان کاریگروں اور مصوروں کی شکر گزاری میں جنہوں نے چار ہزار برس پیشتر میری شبیہہ بنا دی تو میں ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے بہ رضا و رغبت رضاکارانہ طور پر

اپنے اس تابوت میں لیٹ جاؤں اور پرلوک سدھاروں..

اسی لیے اس میوزیم میں گم ہو جانا اور تنہا رہ جانا مناسب نہیں..

چنانچہ میوزیم کی مرکزی عمارت کی بھول بھلیوں میں قدم رکھنے سے پیشتر ناگہانی گمشدگی کا سدباب کرنے کے لیے تفصیلی نقشہ ضرور حاصل کر لیجیے..اب آپ ایک مخمصے میں ہیں کہ سب سے پہلے انسانی تاریخ اور فنون کے کس سمندر میں اُترا جائے..کونسی وادی کی سیاحت کی جائے اور کس صحرا میں سفر کیا جائے..میں نے سوچا کہ نیویارک سے یکدم پانچ ہزار برس پیشتر کے زمانوں میں چلے جانے سے بندہ کچھ غتربود ہو جائے گا اس لیے پہلے ماضی قریب کے رنگوں کو آنکھوں میں اُتارا جائے..

لیکن اس سے پیشتر کہ میں میوزیم میں مکمل طور پر گمشدہ ہو جاؤں' چاہتا ہوں کہ اس عجائب کی بستی کے اندر جو ماحول ہے..اسے دیکھنے کو جو لوگ آتے ہیں' اس دنیائے قدیم کے جو شیدائی ہیں اُن کے بارے میں کچھ بیان کروں۔

یہاں بھانت بھانت کے لوگ ہیں..

پورے خاندان...سیاحوں کے غول۔سکولوں کے بچے۔اپاہج' لاچار' تنہا لوگ اور ایسے ہی بھانت بھانت کے لوگ..

ان میں سے بیشتر کو آرٹ اور ثقافت وغیرہ سے کچھ غرض نہیں' وہ ایک فرض کی ادائیگی کے لیے آئے ہیں کہ اگر نیویارک آئے ہیں تو مجسمہ آزادی یا ایمپائر سٹیٹ کی طرح میٹرو بھی دیکھنا ہے تو وہ ایک اضطراب میں ہیں..شتابی اور جلدی میں ہیں..کم سے کم وقت میں اس میوزیم کو بھگتا دینا چاہتے ہیں..یہ اُسی نوعیت کی مخلوق ہے جو پیرس کے لوور میں ٹکٹ خرید کر بھاگتی ہوئی مونا لیزا تک جاتی ہے..اسے دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھرتی ہے اور دس منٹ کے اندر اندر باہر آ جاتی ہے..

یورپی اور جاپانی سیاح ہیں..بلکہ یورپی بھی کیا صرف جاپانی ہی جاپانی ہیں..

اور جاپانی یقیناً حسِ جمال رکھتے ہیں..تصاویر اور نوادرات کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کی باریکیوں میں کھو کر بے خبر پہروں اُن کے سامنے کھڑے رہتے ہیں..ان میں سے بیشتر کے ہاتھوں میں سکیچ بکس ہوتی ہیں جن پر وہ شاہکار تصویروں کے نقش اتارنے کی سعی کرتے ہیں..آپ ذرا آگے ہو کر ان کے کندھوں پر سے جھانک کر دیکھیے تو سہی کہ وہ سکیچ بکس پر کیا سکیچ کر رہے

ہیں اور جاپانیوں کے قد کندھے پر سے جھانکنے کے لیے نہایت معاون ثابت ہوتے ہیں..اور آپ دیکھیں گے کہ..مثال کے طور پر اگر وہ مونا لیزا کو سکیچ کر رہے ہیں تو وہ ایک باریک آنکھوں اور چپٹی ناک والی جاپانی مونا لیزا ہو گی' ایک گیشا گرل کا روپ دھار لے گی کہ ان کے نزدیک ہر قوم کی طرح خوبصورتی کے پیمانے مختلف ہیں..اگر وہ کوئی لینڈ سکیپ نقل کر رہے ہیں تو بے شک وہ یورپ کا منظر ہو..کانسٹیبل یا فان گوگ کا ہو..وہ اسے بھی جاپانی رنگ میں رنگ دیں گے..اُن کے اندر ان کی کلاسیکی روایت اتنی توانا ہے کہ یورپی پھول' دریا اور کھیت جب اُن کی سکیچ بک پر اترتے ہیں تو جاپانی ہو جاتے ہیں جیسے مغل اور ایرانی مختصر تصویروں میں چہرے' جانور اور جنگل چاہے ہندوستان کے ہوں' عرب یا ایران کے ہوں وہ منگول ہو جاتے ہیں..یہاں تک کہ جب وہ ان منی ایچر تصویروں میں حضرت جبرئیل اور رسول اللہ کی فرضی شبیہیں پینٹ کرتے ہیں تو ناک نقشے منگول ہوتے ہیں..

یہاں امریکی خاندان ہیں اپنے بچوں سمیت..والد صاحب ہر تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے پانچ سالہ بچے کو زبردستی پکاسو یا مانے کی تصاویر کے رموز سمجھا رہے ہیں اور وہ بچہ بور ہو کر رونے کی تیاری کر رہا ہے..لیکن یہ اُس کی ابتدائی تربیت میں شامل ہے۔اس بچے کو جاننا چاہیے کہ انسان کیا کیا کچھ تخلیق کرنے پر قادر ہے..

بوڑھے بہت ہیں اور کچھ لاچار بھی..

وہیل چیئر پر بمشکل اپنے آپ کو سہارتے لرزتے عمر رسیدہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی عمر کے آگے ہتھیار ڈال کر گوشہ نشینی اختیار نہیں کی..قربت مرگ میں خوفزدہ ہو کر عبادت اختیار نہیں کی بلکہ زندگی کی رسّی تھام کر لرزتے ہوئے یہاں تک آ گئے ہیں..کوئی ایک افریقی یا چینی مجسمہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس میں کوئی جہان دریافت کر لیتے ہیں اور یوں مسکرانے لگتے ہیں جیسے انہیں ایک اور زندگی مل گئی ہے..

ان میں دو کردار ایسے تھے..وہ شاید اب نہ ہوں..اگر ہیں تو میں اُن کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کرتا ہوں..

ایک صاحب..نوے برس سے کم تو ہرگز نہ ہوں گے..تقریباً نابینا ہو چکے تھے..ہر تصویر کے اتنے قریب ہوتے تھے کہ اُن کی ناک اُس کے رنگوں سے جا لگتی تھی۔اگرچہ وہ از حد احتیاط

کرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کیونکہ میوزیم میں کسی بھی تصویر یا فن کے نمونے کو چھونے کی اجازت نہیں..ناک سے بھی نہیں..تو وہ پوری تصویر کو اس قربت سے اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں کی پلکوں سے دستک دیتے ہوئے دیکھتے تھے..اُس پر اپنی آنکھیں بچھاتے تھے..اور جیسے ایک تحریر کو پڑھتے ہیں وہ تصویر کے ایک کونے پر آنکھیں قریب کیے ہولے ہولے دوسرے کونے تک جاتے تھے پھر ذرا جھک کر اگلی سطر پڑھنے لگتے تھے اور بالآخر جب تصویر کے آخری کونے پر جہاں مصور کے دستخط ہوتے تھے وہاں پہنچ کر ان کے جھرّیوں بھرے چہرے پر ایک عجیب سرخوشی ہلکورے لینے لگتی تھی۔

اور میوزیم دیکھنے والے ہزار ہا افراد میں وہ دوسرا کردار ایسا ہے جو میرے ذہن کے کینوس میں یوں نقش ہے جیسے گوگین یا ڈیگاس نے اس کی تصویر بنادی ہو...یہ صاحب بھی عمر رسیدہ تو تھے لیکن کسی عارضے کے باعث وہ کمر کے اوپر کے بدن کو سیدھا نہیں کر سکتے تھے..دائمی جھکے ہوئے تھے..میں نے طواف کے دوران خانہ کعبہ کے گرد پھیرے لگاتے اسی حالت کے ایک شخص کو بھی دیکھا تھا..جو کعبہ کو نہ دیکھ سکتا تھا صرف حرم کے فرش کو دیکھ سکتا تھا اور میں نے اُس پر رشک کیا تھا..اور میں نے یہاں بھی اس شخص پر رشک کیا..وہ جھکے ہوئے ایسے تھے کہ ان کی آنکھیں صرف میوزیم کے فرش کو دیکھتی تھیں..یعنی اگر کوئی تصویر فرش پر رکھ دی جاتی تو وہ صرف اسی صورت میں اسے دیکھ سکتے تھے..تو پھر یہ صاحب یہاں کیا کرنے آئے تھے..کیا دیکھنے آئے تھے..کیا صرف اپنی جھکی ہوئی حالت میں میوزیم کا فرش دیکھنے آئے تھے؟

مجھے محسوس ہوا کہ وہ کسی ایک تصویر کے سامنے اپنی خمیدہ حالت میں کچھ دیر کھڑے رہتے ہیں اور پھر ہولے ہولے چلتے اگلی تصویر کے سامنے جا کھڑے ہوتے ہیں یعنی وہ تصویریں دیکھ رہے تھے..کیسے؟..ان کی اکڑی ہوئی گردن کا زاویہ یہ ایسا تھا کہ ان کی آنکھیں اُن کے بائیں ہاتھ کی مٹھی کو دیکھتی تھیں اور مجھے گمان ہے یقین نہیں کہ ان کے بائیں ہاتھ میں کوئی خاص قسم کا آئینہ تھا..وہ اس آئینے کو ایک خاص زاویے پر تصویر کے مقابل ساکت کرتے تھے..تصویر اس پر عکس ہوتی تھی اور وہ اس عکس کو تادیر دیکھتے تھے اور اپنے بدن اور روح کو تصویر کے رنگوں سے سیراب کرتے تھے..

ایک تصویر کو دیکھنے کے لیے اتنا تردّد..اتنی آرزو..
یہ ہم ایسے ایشیائی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا..

درست کہ میں بھی موما میں فان گوگ کی ''سٹاری نائٹ'' کے سامنے کچھ دیر مبہوت کھڑا رہا تھا..اس کے ستاروں کے سحر‘ چاند کی کشش اور آسمان کے رنگوں کے اندر چلا گیا تھا‘ آبدیدہ ہو گیا تھا..لیکن..اگر میں اتنی عمر رسیدگی اور کبڑے پن میں ہوتا تو کیا میں اتنا تردد کرتا..یقیناً نہیں..میں ایک رنجیدہ بیزار اپنے آپ پر ترس کھاتا کمر خمیدہ لاچار بوڑھا ہوتا..اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتا..موت کا منتظر کسی تصویر کو تو کیا کسی انسان کو بھی دیکھنا پسند نہ کرتا..یہی چاہتا کہ ہر کوئی مجھ پر ترس کھائے کہ ہائے ہائے یہ بے چارہ کمان ہو گیا ہے..کبڑا اور اپاہج ہو گیا ہے..کسی کام کا نہیں رہا..اللہ اس کی مشکل آسان کر دے اور جلد از جلد اپنے پاس بلا لے..

بس یہ فرق تھا مجھ میں اور اس کمر خمیدہ شخص میں کہ میں موت کا منتظر رہتا اور وہ اٹھائے جانے سے پیشتر شاگال‘ ورمیر اور کنڈسکی کی ایک تصویر دیکھ لینا چاہتا تھا..

اپنی مٹھی میں پکڑے ہوئے ایک آئینے میں..
ہم ایشیائی لوگوں کی سمجھ میں یہ دیوانگی ہرگز نہ آتی تھی..

میں نے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں نیویارک کے آسمان تلے کم دن گزارے اور مختلف عجائب گھروں کی چھتوں تلے زیادہ وقت صرف کیا‘ تو کیا آپ یقین کریں گے کہ اس دوران شائقین کے ہجوم میں حرام ہے جو مجھے ایک پاکستانی بھی نظر آیا ہو..

نیویارک میں اگرچہ بیشتر پاکستانی غم روزگار کے ستائے ہوئے ہیں اور تجھ سے بھی..میٹرو سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے..ایک ٹیکسی ڈرائیور گیس سٹیشن کے ملازم یا کسی فیکٹری میں دن رات کرنے والے شخص سے آپ یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی چھٹی کا کوئی دن ایک میوزیم میں ضائع کرے..لیکن وہاں ان گنت وکیل‘ کاروباری‘ ادیب اور بے شمار پڑھے لکھے پاکستانی بھی تو ہیں تو ان میں سے کوئی ایک مجھے کسی عجائب گھر میں کیوں نظر نہیں آیا..

صرف ایک پاکستانی میوزیم آف ماڈرن میں نظر آیا..وہ وہاں کیا کر رہا تھا یہ آپ ''موما'' کے باب میں ملاحظہ کیجیے..

پاکستانی ہی نہیں‘ ہندوستانی جوان سے تعداد میں کئی گنا زیادہ ہیں‘ وہ بھی دکھائی نہ دیئے بلکہ خالص امریکی سیاہ فام بھی کم کم ہی دکھائی دیتے..

اس لاتعلقی..فنون لطیفہ سے اجتناب کا سبب کیا ہے..

کیا صرف گوری رنگت والے اور چند جاپانی ہی آرٹ کی پرکھ کر سکتے ہیں..اور ہم سب کورے ہیں..کیا ہیں..

جب کہ ہم ہمیشہ سے تو کورے نہیں تھے..

امریکہ تو ابھی نومولود ہے.. یورپ کے باسی برفانی موسموں سے بچاؤ کی خاطر کھالیں اوڑھے ہوئے اور گوشت کو دانتوں سے نوچتے ہوئے..اُدھر حیرت سے بغداد اور قرطبہ کو دیکھتے تھے..ان کے لبادوں' خوراکوں اور لائبریریوں کو دیکھتے تھے..اندلس کے زریاب کو دیکھتے تھے جو بیک وقت ایک نابغۂ روزگار موسیقار' گلوکار' ڈریس ڈیزائنر اور شاعر تھا..وہ بغداد چھوڑ کر قرطبہ پہنچا تو وہاں کے سلطان نے اپنے قصر سے باہر آ کر اس کا اور اس کے ہم رکابوں کا استقبال کیا اور ایک ہفتے کے لیے اسے اپنا محل رہائش کے لیے دیا اور خود کسی اور قصر میں منتقل ہو گیا..زریاب ہر موسم کی مناسبت سے ملبوسات تخلیق کرتا تھا اور یہ ملبوسات ماڈل خواتین اور مرد زیب تن کر کے ان کی نمائش کرتے تھے یعنی دنیا میں پہلی کیٹ واک قرطبہ میں ہوئی..اس کی آمد سے پیشتر کھانا لکڑی کی میزوں پر بیٹھ کر کھایا جاتا تھا..اس نے اسے حسِ جمال کی توہین جانا اور میز پوش کی اختراع کی..نہ صرف یہ بلکہ چھری اور کانٹے سے خوراک کھانے کا رواج بھی اس نے ایجاد کیا.مصوروں' موسیقاروں اور خطاطوں کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا..

اگر ہرات میں مصور بہزاد ''تیمور نامہ'' مصور کرتا تھا تو تیمور کی آل اولاد اُس کی اُنگلیاں چومنے آتی تھی..

ادھر چین میں کئی ہزار برس پیشتر جب ایک مصور کسی منظر کو کاغذ پر نقش کرتا تھا وہ شہنشاہ کے تخت کے قریب ترین بٹھایا جاتا تھا.. یورپ ان دنوں کاغذ کے تصور سے بھی ناآشنا تھا..ابھی بہت برس نہیں گزرے جب اطالوی مارکوپولو نے چین سے واپس آ کر وہاں کے ملبوسات کا تذکرہ کیا تو اسے دروغ گو قرار دیا گیا کہ اس نے کیڑوں کے لعاب سے تیار کردہ کسی کپڑے ریشم کا حوالہ دیا تھا..

اور یہ فہرست بہت طویل ہے.. یوں بھی صرف احمق ماضی کا ماتم کرتے ہیں اور دانا اپنے حال پر نظر رکھتے ہیں..

اگرچہ ہم ہمیشہ سے کورے نہیں تھے لیکن اب ہو گئے ہیں.

پچھلے سینکڑوں برسوں سے حسن اور تخلیق کو پرکھنے اور جانچنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں..البتہ سنگ زنی میں مہارت حاصل کر چکے ہیں..ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے کہ تصویر بنانا تو کیا تصویر اُتروانا بھی جائز ہے کہ نہیں..میں سمجھتا ہوں کہ ہم نابینا ہو چکے ہیں..کم از کم فنون لطیفہ کی پرکھ اور لطف اندوزی کے حوالے سے..اور یہ صرف گورے ہیں جو دیدۂ بینا رکھتے ہیں..

میٹرو میں میں نے بہت صبحیں اور بہت دوپہریں بسر کیں..اور میں انہیں ترتیب وار بیان نہیں کروں گا..بلکہ ایک مجموعی تاثر کو تصویر کرنے کی سعی کروں گا.. یاد میں جو نقش ابھرا' وہ کاغذ پر اتار دوں گا..کونسے دن کونسی تصویر..کونسا مجسمہ یا کونسی قدیم ثقافت دیکھی تھی یہ تو کچھ یاد نہیں..تو فنون لطیفہ کی بوریت میں اترنے سے پیشتر میں آپ کو محظوظ کرنے کی خاطر آپ کو ایک ہیجان خیز مشاہدے میں شریک کرتا ہوں..

جب میں میٹرو کی دنیا میں..ایک مدت تک حسن تخلیق کے صحراؤں اور وادیوں میں سیر کرتا تھک جاتا تو مجھے کسی مشروب اور خاص طور پر ایک سگریٹ کی خواہش ہوتی..اور ان دونوں کا استعمال میوزیم میں منع تھا..

ٹکٹ حاصل کرتے ہوئے آپ کو ایک چھوٹا سا بیج بھی دیا جاتا جسے آپ اپنے لباس پر ٹانک کر بے خطر باہر جا سکتے تھے اور پھر واپس آ سکتے تھے..

میں پیاس اور نکوٹین کی طلب بجھانے باہر آ کر سیڑھیوں پر براجمان ہو جاتا..

ان سیڑھیوں پر خوب ہجوم ہوتا..دنیا جہان کی پُشتیں ان پر آرام کر رہی ہوتیں..

امریکیوں کے علاوہ دنیا جہان کی قومیتیں ذرا تازہ ہوا پھانکنے کے لیے اور کچھ پیٹ پوجا کے لیے یہاں براجمان ہوتیں..

اور جیسے وہ کمر خمیدہ مصوری کا شیدائی شخص میرے ذہن پر ایک تصویر ہو چکا ہے۔ویسے ہی ان سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی..میرے آگے بیٹھی ہوئی خواتین نقش ہو چکی ہیں..

اور اس نقش میں محض ایک لکیر ہے..

دو متناسب چاندوں کے درمیان ایک گھاؤ' ایک لکیر ہے..

میں..سگریٹ کے کش لگاتا..ایک اجنبی..ایک بے نشان..چپ بیٹھا جب اپنے آگے

کی سیڑھی پر براجمان ایک جین یا کھلے پاجامے میں ملبوس کسی خاتون کو بے دھیان تکتا تھا اور پھر فوراً دھیان سے تکتا تھا.. کہ یوں سیڑھی پر بیٹھنے سے اس خاتون کی جین کھنچاؤ سے اس کے کولہوں سے ذرا نیچے ہو جاتی تھی.. اور یوں پشت کے درمیان میں وہ لکیر نظر آنے لگتی تھی جو نظر نہیں آنی چاہیے..

شاید کسی اور کا دھیان یوں میری طرح متزلزل نہیں ہوا شاید نہیں.... یقیناً میں ایک ڈرٹی اولڈ مین ہو چکا تھا..

میں بہت توبہ استغفار کرتا.. اپنی نظر کو اِدھر اُدھر بھٹکاتا.. سامنے گلی کے کونے پر جو ایک نہایت ہی دیدہ زیب مختصر سا گھر تھا جسے خریدنے کے لیے آج کے اخبار میں کسی عرب بھائی نے کروڑوں ڈالر کی بولی لگائی تھی اپنی نظر اُدھر کرتا لیکن میں بے دید ایسا تھا کہ نظر فوراً واپس آ کر دودھیا چاندوں کے درمیان واضح ہوتی اس لکیر پر آ ٹھہرتی..

البتہ کبھی کبھی افاقہ ہو جاتا جب خاتون نے جین کے نیچے کوئی زیر جامہ پہنا ہوتا تو وہ لکیر قدرے پوشیدہ ہو جاتی..

بہت بعد میں جب میں نے محض اپنے علم میں اضافہ کرنے کی خاطر ایک خاتون سے اس لکیر کی انگریزی پوچھی تو اس علم دوست خاتون نے بے دھڑک بتایا کہ.. اسے.. ''بٹ کریک..'' کہتے ہیں.. بے حد حیرت ہوئی کہ گوروں کو کیسے پتہ چل گیا کہ بٹ حضرات کریک ہوتے ہیں..

سگریٹ کے چند کش لگا کر.. چند لکیریں دیکھ کر اور اُن سے مسرت حاصل کر کے میں پھر سے میٹرو کے جنگل میں اُتر جاتا...

میٹرو میں گھومتے ہوئے میں متعدد بار ایک عجیب شناسائی کی کیفیت سے دوچار ہوا.. جو دیکھا وہ پہلے سے دیکھا ہوا لگا..

یعنی میں راہداری میں چلتے ہوئے کسی ایک کمرے میں داخل ہوتا اور اس کی دیواروں پر آویزاں تصویر کو سامنے پا کر لوٹ جانے کو ہوا کہ او ہو اس کمرے میں میں پہلے بھی آ چکا ہوں.. گھوم پھر کر بھٹک کر پھر سے اُدھر آ نکلا ہوں کہ یہ تصاویر تو میری دیکھی بھالی ہیں اور پھر فوراً ہی کچھ اور تصاویر ان دیکھی لگتیں اور مجھے احساس ہوتا کہ نہیں.. میں اس کمرے میں پہلی بار داخل ہوا ہوں.. قصہ صرف یہ ہے کہ میں ان تصاویر کو.. ان شاہکار پینٹنگز کو.. سو بار.. آرٹ میگزینوں اور

کتابوں میں.. قہوہ خانوں میں اور رہائش گاہوں میں دیکھ چکا ہوں اور اتنے تسلسل سے دیکھ چکا ہوں کہ اب جب کہ وہ اپنی اوریجنل اور خالص شکل میں.. جیسا کہ انہیں مصور نے پینٹ کیا تھا.. میرے سامنے آئی ہیں تو وہ دیکھی ہوئی اور شناسا لگتی ہیں..

جیسے فان گوگ کی ''شوز''.. ''تنکوں کا ہیٹ پہنے ہوئے پورٹریٹ'' یا پھر سحر انگیز ''سرو کے درخت..''

سیزان کی ''تاش کے کھلاڑی''

گوگین کی ''مریم اور عیسیٰ''

پکاسو کی ''نابینا شخص کا کھانا'' اور درجنوں تصویریں..

ریمبرانت کی ''ارسطو، ہومر کے مجسمے کے ساتھ..''

اَل گریکو کی ''ٹولیڈو کا منظر''

اور یہ فہرست بہت ہی طویل ہے..

بے شک آپ لاکھ بار اپنے عشق خاص کی تصویر دیکھ لیں.. اور بس ایک بار اسے اپنے سامنے دیکھ لیں.. تو یہی کیفیت بہت بار دیکھی ہوئی پینٹنگ کو اپنے سامنے اصلی حالت میں پا کر طاری ہوتی ہے.. انسان چپ ہو جاتا ہے، بس دیکھتا رہتا ہے..

کہا جاتا ہے کہ ایک بڑا مصنف بننے کے لیے دس فیصد ٹیلنٹ اور نوّے فیصد استقامت اور مشقت درکار ہوتی ہے.. کچھ ایسے ہی میٹرو ایسے مصوری اور فنون اور قدیم تہذیبوں کی ترجمانی کرنے والے آثار کو دیکھنے کے لیے دس فیصد شوق درکار ہے اور اس شوق سے کہیں اہم نوّے فیصد مشقت اور ڈھٹائی درکار ہے.. اور کوہ نوردی کا بھی یہی معاملہ ہے کہ بے شک بدن تھکن سے ریزہ ریزہ ہو رہا ہے، ٹانگوں میں سکت نہیں ہے لیکن تھوڑی سی ہمت کرلو تمہیں ایک اور منظر دکھائی دے گا.. اپنے آپ پر جبر کر کے چلتے رہو.. اس ٹیلے کے پرے ایک اَن دیکھی جھیل ہماری منتظر ہو گی.. اور یہاں بھی.. ذرا یہ سیڑھیاں طے کر لو.. ہمت کر کے اس راہداری کے آخر تک چلتے جاؤ.. وہاں مصوری کے شاہکار منتظر ہوں گے اور اَن دیکھے مجسمے اور تہذیبیں ہوں گی..

اس تھکن اور بے ہمتی کو دور کرنے کے بھی کچھ علاج ہیں..

ایک تو میں بیان کر چکا ہوں کہ میوزیم سے باہر جا کر سیڑھیوں پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش

لگاتے ہوئے اگلی سیڑھی پر براجمان خاتون کے بُت کریک کو قدرے رغبت سے دیکھنا اور دوسرا یہ کہ ..فرانسیسی مجسمہ ساز آگسٹ روڈین کے مجسمے دیکھنا..

بلند چھتوں والی ایک پُرشکوہ راہداری میں روڈین کے مجسموں کی دنیا سانس لیتی ہے..

سنگ مرمر سے تراشے ہوئے ایسے بُت جنہیں دیکھ کر بے اختیار.. یہ بُت ہے یا خدا ہے دیکھا نہ جائے پکار اٹھنے کو جی چاہتا ہے..

اس راہداری میں قدم رکھنے سے پیشتر میں روڈین کے نام سے تو واقف تھا کام سے واقف نہ تھا سوائے ان کے مشہور زمانہ ''آدم'' کے مجسمے کے.. اور نام سے یوں بھی واقف تھا کہ وہ ترگنوف کے ناول ''رودین'' کے ہیرو کا نام بھی تھا اور میرے ناول ''ڈاکیہ اور جولاہا'' کی نتالیہ بھی اپنے ان دیکھے عشق کو خطوں میں رودین ہی لکھتی تھی.. تو اس راہداری میں روڈین کے تراشے ہوئے متعدد مجسمے ایستادہ تھے..

ایک نقاد نے کہا تھا کہ اگر مجھے دوبارہ زندگی مل جائے تو مجھے سب سے زیادہ اس لمحے کا انتظار ہوگا جب میں ٹالسٹائی کا ''وار اینڈ پیس'' پہلی مرتبہ پڑھوں گا کہ اس سے بڑا رومانی اور جسمانی تجربہ اور کوئی نہیں' اس ناول کو پہلی بار پڑھنا..

مجھ پر بھی یہ کیفیت غالب آرہی تھی کہ میں روڈین کے مجسموں کو زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا اور یہ میری روح اور بدن پر ایسے اثر انداز ہو رہے تھے جیسے مجھ پر کوئی آسمانی صحیفہ اُترنے کو ہے..

اگر مجھے دوبارہ زندگی مل جائے تو شاید میں بھی روڈین کے مجسموں کو پہلی بار دیکھنے کے تجربے کا منتظر رہوں..

وہ محض پتھر نہ تھے جذبات تھے جو پتھر کو بھی سیال کرتے تھے..

ان میں سے بیشتر نہیں بلکہ تمام برہنہ تھے.. اور انہیں ہونا بھی چاہیے تھا.. روڈین' مائیکل انجلو سے بے پناہ متاثر تھا اور اسی نے کہا تھا کہ مجسموں کو لباس وہی مجسمہ ساز پہناتے ہیں جو انسانی بدن کے پُرکشش پیچ و خم پتھر سے تراشنے میں ناکام ہو جاتے ہیں اور علم البدن سے ناواقف ہوتے ہیں' وہ اپنے اس عیب کو چھپانے کی خاطر مجسمے کو لباس سے روپوش کر دیتے ہیں..

روڈین روپوش کرنے والوں میں سے نہیں تھا' وہ عیاں کرنے والوں میں سے تھا کہ

وہ نہ صرف علم البدن پر عبور رکھتا تھا بلکہ اس بدن میں جب جذبات سرایت کرتے ہیں تو اُس میں کون سی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کو تراشنے پر بھی دسترس رکھتا تھا..... جب ایک بدن کو عشق کا ہاتھی روندتا ہے تو اس میں کونسی تبدیلیاں رونما ہو کر اسے باقی بدنوں سے الگ کر دیتی ہیں.. یہ روڈین ہے..

راہداری میں ایستادہ مجسموں میں شاید مائیکل انجلو کی کاملیت نہیں لیکن یہ کیا ہے کہ وہ اس کے باوجود کہیں کہیں اپنے استاد سے آگے بھی چلا جاتا ہے..

مائیکل انجلو کا ''ڈیوڈ'' ''موسے'' ''پائیتا'' یا ''انجیریں توڑتا ایک نابینا'' علم البدن کی کاملیت کے شاہکار ہیں لیکن وہ پھر بھی مجسمے ہیں.. جب کہ روڈین کے مجسموں کے چہروں اور بدنوں میں احساس اور جذبات کی وہ شدت نمایاں ہوتی ہے کہ وہ زندہ لگنے لگتے ہیں.. پتھر کے نہیں گوشت پوست کے لگتے ہیں.. دکھ' درد' اذیت' تھکن اور محبت کی لذت نہ صرف ان کے چہروں پر بلکہ بدنوں پر یوں متحرک ہوتی ہے کہ وہ سانس لینے لگتے ہیں..

میں اکثر مصوری کے بارے میں معمولی سوجھ بوجھ رکھنے کے باوجود یہ دعویٰ کیا کرتا ہوں کہ آپ مجھے خالد اقبال کی کسی لینڈ سکیپ کا ڈاک کے ٹکٹ جتنا ایک حصہ دکھا دیجیے تو میں جان جاؤں گا کہ ان کی پوری تصویر میں کونسے موسم مصور کیے گئے ہیں۔ خزاں ہے.. بہار ہے.. سرما کی دھند ہے یا گرمی کی شدت ہے اور دن کا کونسا سمے ہے.. صبح' دوپہر یا ڈھلتی شام۔ کچھ اسی طور روڈین کے مجسموں کے بدن کا کوئی ایک حصہ بھی منکشف کر دیتا ہے کہ بقیہ بدن پر کیا گزری ہے.. دکھ میں ہے.. لذت میں ہے یا محبت میں ڈوبا ہوا ہے..

ایک عورت.. سنگ مرمر میں سے ظاہر ہوتی.. اور اس کے بال پریشان اور لہراتے ہوئے اگرچہ پتھر کے.. اپنے مرد کو اپنے عشق خاص کو جو منہ موڑے ماتھے پر ہاتھ رکھے پریشان کھڑا ہے.. عقب سے.. اُس کے قریب ہو کر.. اُس کے بدن کے گرد اپنے سنگ مرمری بازو حمائل کیے اسے بوسہ دینا چاہتی ہے.. اس کے ہونٹوں میں خفیف سی لرزش اور بے تابی ہے اور اس کی سفید اور کچی چھاتیاں مرد کی پشت سے جڑی ہوئی قدرے ہموار ہوتی ہیں اور وہ دونوں زندہ لگتے ہیں..

ہر مرد کی حیات میں.. اگر وہ مرد ہے تو کوئی ایک ایسا لمحہ تو آتا ہے.. جب اس کی ریڑھ کی ہڈی کے آس پاس ایسے لمس بوجھ ڈالتے ہیں تو صرف وہی روڈین کے اس مجسمے کے سحر سے

آ گاہ ہوسکتا ہے کہ اسے دیکھتے ہوئے وہ اپنی پشت پر وہی محبت بھرا دباؤ محسوس کرنے لگتا ہے..

ایک اور مجسمہ ہے جس کا عنوان ''بوسہ'' ہے..

سنگ مرمر کی سفیدی میں مرد اپنی عورت کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھے یکجا ہو رہا ہے.. دونوں کے ہونٹ پگھل کر..اگرچہ پتھر کے ہیں' ایک ہو رہے ہیں..سنگ مرمر کی عورت کا ہاتھ مرد کی گردن کے ساتھ لپٹا ہوا ہے کہ تم نے اپنے ہونٹ مجھ سے جدا نہیں کرنے..اور بوسے کی لذت کی شدت مرد کے پاؤں کے انگوٹھوں میں یوں سرایت کر رہی ہے کہ وہ پتھر میں بھنچے ہوئے ہیں اور اس کی پشت میں ایک ہلکا سا تناؤ ہے..

لیکن ان دودھیا سفید سنگ مرمری شفاف مجسموں میں سے جس ایک مجسمے نے مجھے بھی ایک مجسمہ کر دیا' وہ ''خدا کا ہاتھ'' تھا..

یہ ایک نہایت چھوٹا سا مجسمہ ہے اور میٹرو میں آنے والے بیشتر شائقین اس کے وجود سے بھی آگاہ نہیں ہوتے کہ وہ اتنا مختصر ہے اور آگے بڑھ جاتے ہیں..

سنگ مرمر کی سفیدی میں محبت کرنے والوں کے دو چہرے نمایاں ہو رہے ہیں جو آپس میں جڑے ہوئے ہیں..عشق کے خمار میں ایک ہو چکے ہیں..من تو شدی اور تو من شدی کی پتھریلی تصویر ہیں اور ان چہروں کے اوپر ان پر سایہ کرتا..ان کی حفاظت کرتا ایک ہاتھ ہے اور وہ ''خدا کا ہاتھ'' ہے..

ایک دوجے میں پیوست' آپس میں جُڑے ہوئے..دیوانگیٔ محبت میں ایک ہو چکے..یہ عشق میں فنا اور مدغم ایک ایسا مجسمہ تھا کہ میٹرو کے برآمدوں میں چلتے ہوئے یکدم مجھے اس کا خیال آ جاتا' ایک ہول سا اٹھتا کہ میں اسے ایک بار اور دیکھ لوں اور میں پھر اس راہداری کا رخ کر لیتا.. اور میری تھکن اُتر جاتی..

شاید کوئی وابستگی ایسی تھی..جو مجھے بار بار بلاتی تھی کہ آؤ مجھے دیکھو..اپنے آپ کو دیکھو..جو تم بھول چکے تھے وہ ایک مجسمے کی صورت اختیار کر چکا ہے..یہ مختصر سا مجسمہ..صرف دو چہرے..ان کے بدن نہ تھے اور ان پر سنگ مرمر کی سفیدی سے تراشا ہوا سایہ فگن ایک ہاتھ ''ہینڈ آف گاڈ''..جو روڈین کا شاہکار نہیں ہے..ایک غیر معروف مجسمہ ہے جس کا تذکرہ کسی گائیڈ بک یا آرٹ کی نوٹ بک میں نہیں ملتا اور اس کے باوجود میرا جی چاہتا ہے کہ صرف اُسے دیکھنے کی

خاطر میں ایک مرتبہ پھر نیویارک کے سفر کا قصد کروں..

میں نے اپنے تئیں بہت تجزیہ کیا ہے..سوچ بچار سے کام لیا ہے کہ یہی مختصر سا مجسمہ ہی کیوں میرے حواس پر بے پناہ اثر انداز ہوا ہے..اس کی کشش کا سبب کیا ہے لیکن میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہا ہوں..شاید اس میں محبت کے جذبے کی پاکیزگی اور وحشت کا اظہار ہے اور ایک قرار بھی ہے..اور وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا والی کیفیت جو میں اپنے ناولوں اور سفرناموں میں بیان کرنا چاہتا تھا..''بہاؤ''''راکھ''''قربت مرگ میں محبت'' یا ''ڈاکیہ اور جولاہا'' میں بیان تو کرنا چاہتا تھا پر نہ کر پایا تو اس مختصر سے مجسمے نے وہ کچھ بیان کر دیا جو میرے دل میں تھا..گویا جو کچھ میں روشنائی سے کاغذ پر اُتارنا چاہتا تھا وہ روڈین نے اپنے تیشے سے سنگ مرمر پر لکھ دیا..

ایک مصور نے کہا تھا کہ اہم وہ نہیں ہوتا جو کینوس پر پینٹ کیا جاتا ہے' اہم وہ ہوتا ہے جو پینٹ نہیں کیا جاتا..

اس ''ہینڈ آف گاڈ'' میں بھی اہم وہ نہ تھا جو دکھائی دے رہا تھا..اہم وہ تھا جسے آپ محسوس کرتے تھے..

اپنی شناخت کھوتے ہوئے دو چہرے..محبت کے اُلجھاؤ میں اُلجھے ہوئے اور اِک دوجے میں پگھلتے ہوئے..محبت کی شدت اور قرار بھی!

اور اُن پر سایہ کرتا خدا کا ہاتھ!

میٹرو میں گزارے جانے والے دن اور اُن میں نظر کے سامنے آنے والے معجزاتِ فن میں کسی ترتیب یا منصوبہ بندی کے تحت بیان نہیں کروں گا بلکہ من کی موج میں جو آ جائے اسے ''دھپّل'' میں بیان کرتا جاؤں گا..

اور یہ ''دھپّل'' کیا ہے..آپ پوچھ سکتے ہیں..

اور میں بتا سکتا ہوں..1974ء کے زمانوں میں عجائب گھر لاہور سے منسلک ایک کمرے میں جب صادقین میری اولین کتاب ''نکلے تری تلاش میں'' کو مصور کر رہے تھے..تو ایک شب خمار میں..کہ اُن کی ہر شب..شبِ خمار ہوا کرتی تھی میں نے پوچھا ''صادقین..یہ جو شاہکار تخلیق ہوتے ہیں مصوری اور مجسمہ سازی کے..یہ جو مونا لیزا یا ڈیوڈ ہوتے ہیں یہ کیسے وجود میں

آ جاتے ہیں..کیا مصور یا مجسمہ ساز کسی قسم کی منصوبہ بندی کرتا ہے اور کیا وہ اُس لمحے جانتا ہے کہ وہ ایک شاہکار تخلیق کر رہا ہے؟''

صادقین نے پہلے تو اپنی لٹیں سنواریں..پھر برسوں سے دن رات تصویریں بناتی.. خطاطی کرتی انگلیوں کو..جو اس دن رات کی مشقت سے واقعی ٹیڑھی ہو چکی تھی اور وہ ان انگلیوں کو نہایت جھومتے ہوئے دکھاتے تھے کہ دیکھو تارڑ یہ سیدھی انگلی ''الف'' ہو چکی ہے اور یہ والی ''لام'' ہو گئی ہے اور دیکھو کہ یوں میری انگلیوں سے ''اللہ'' بنتا ہے یا نہیں..اور یہ حقیقت ہے کہ ان کی ٹیڑھی میڑھی انگلیوں کی نشست و برخواست ایسی ہو چکی تھی کہ وہ انہیں آپ کی آنکھوں کے سامنے لاتے تو ''اللہ'' کے لفظ کی صورت دکھائی دینے لگتی..تو انہوں نے کہا ''تارڑ میاں ایک شاہکار تخلیق کرنے کی کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوتی..اور نہ ہی مصور یہ جانتا ہے کہ اس لحہ موجود میں جو تصویر میں بنا رہا ہوں یہ شاہکار ہو گی..تارڑ میاں شاہکار تو بس ''دھپّل'' میں بن جایا کرتے ہیں..''

یہ ''دھپّل'' یقیناً اہل امروہہ کا کوئی مقامی اظہار ہو گا جو مجھ لاہوری کے پلے نہ پڑا۔ البتہ اتنا ضرور پلّے پڑ گیا کہ دُھپّل سے مراد...اچانک..بے وجہ..یکدم..یونہی..بنا منصوبہ بندی کے..اتفاقاً وغیرہ ہو سکتا ہے..

تو یوں کرتے ہیں کہ معاملہ آرٹ کا ہے اس لیے کسی ایک شاہکار کی جانب رجوع کرنے کی بجائے میٹرو میں یونہی دھپّل میں گھومتے پھرتے ہیں اور کچھ مضائقہ نہیں اگر موت سے آغاز کر لیا جائے بلکہ وہی موت کے بعد مرنے کا منظر کیا ہو گا وہاں سے آغاز کر لیا جائے یعنی قدیم مصر کی تہذیب سے..

صرف اس سیکشن میں چھتیس ہزار کے قریب مجسّمے..نوادرات..تابوت اور تصاویر آپ کے سامنے آتے ہیں جنہیں دیکھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ سارے کا سارا قدیم مصر تو یہ لوگ اُٹھا لائے ہیں دنیا کے باقی عجائب گھر تو بھائیں بھائیں کر رہے ہوں گے یہاں تک کہ قاہرہ میوزیم میں بھی کارٹر کے دریافت کردہ توتن خامن کے مقبرے کے عجائبات کے سوا اور کیا ہو گا..

بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اگر کل کلاں حشر دیہاڑے جیسا حشر یہاں ہو جائے اور تمام فنا ہو چکی تہذیبیں' بابل' نینوا' ٹرائے' موہنجو داڑو وغیرہ جی اٹھیں تو قدیم مصر پورے کا پورا

نیویارک میں زندہ ہو جائے گا..ذرا غور کیجیے یہ بھی ایک عجیب امکان ہے کہ..میٹرو میں نمائش کردہ مصری حصے کے تمام مجسّمے..حنوط شدہ ممیاں وغیرہ زندہ ہو جاتے ہیں اور نیویارک شہر میں چہل قدمی کر رہے ہیں..سیر کر رہے ہیں..فرعون ریمیسس دوئم یا نہم وغیرہ نیویارک کی سب وے میں سوار ہے اور ٹکٹ چیکر اس کا ٹکٹ طلب کرتا ہے تو وہ کہتا ہے ''جانتے نہیں میں کون ہوں..میں وہ فرعون ہوں جس کے دادا نے موسیٰ کی قوم کو غلام بنا رکھا تھا..اور پھر اس نے کچھ شعبدے وغیرہ دکھا کر دادا جان مرحوم کو پریشان سا کر دیا اور انہوں نے اس کی قوم بنی اسرائیل کو مصر چھوڑ دینے کی اجازت دے دی..دادا جان ان کے تعاقب میں گئے اور چونکہ سوئمنگ نہیں جانتے تھے' اس لیے بے چارے نیل میں ڈوب گئے..''

اور ٹکٹ چیکر کہتا ہے ''کیا تم یُل برینز ہو جس نے ''ٹین کمانڈمنٹس'' میں فرعون کا کردار ادا کیا تھا..''

فرعون حیران ہو کر کہتا ہے ''نہیں..میں تو خود فرعون ہوں۔''

ٹکٹ چیکر غصے میں آ جاتا ہے ''تم جو بھی ہو اگر تمہاری جیب میں ڈالر نہیں ہیں تو نیویارک کیا کرنے آئے تھے..ٹکٹ خریدو۔''

اور وہ فرعون رنجیدہ ہو کر کہتا ہے..''کمال ہے تم ایک فرعون کا احترام بھی نہیں کرتے۔''

اس پر ٹکٹ چیکر جھلاّ جاتا ہے ''ہم فرعونوں کے معاملے میں خود کفیل ہیں..ہمارے صدر کیا تم سے کم فرعون ہیں..ٹکٹ خریدو۔''

اور یہ امکان بھی کیسا پُرلطف ہے کہ تمام مصری اور وہ جانور بھی جنہیں حنوط کیا گیا تھا ٹائمز سکوئر میں نیو ایئر نائٹ کے موقع پر غل غپاڑہ کر رہے ہیں۔

مخمور ہو کر امریکی خواتین کو ''ہیپی نیو ایئر'' کہہ کر اُن کے بوسے لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جانوروں میں چونکہ سب سے زیادہ بلّیاں حنوط کی گئی تھیں اس لیے یہ مصری بلّیاں ٹائمز سکوئر میں میاؤں میاؤں کرتی پھر رہی ہیں اور امریکی بلّے ان پر فدا ہو رہے ہیں کہ کیسی پُرکشش اور جنسی بلّیاں ہیں..ایسی تو آج تک نہیں دیکھیں..

چونکہ تمام مصری اپنے قدیم لباسوں میں ہیں' اس لیے ٹائمز سکوئر میں جمع شدہ لاکھوں کا ہجوم یہی سمجھتا ہے کہ وہ نئے سال کی خوشی میں فینسی ڈریس میں آئے ہیں..البتہ کچھ امریکی فرعونوں

کی ٹھوڑیوں سے جھولتی داڑھیاں دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور ایک بیئر چڑھاتے جھومتے فرعون سے پوچھتے ہیں ''آر یو موزلمز؟''

اور وہ فرعون کہتا ہے ''وہ کیا ہوتے ہیں.. میرے زمانے میں تو یہودی ہوا کرتے تھے اور میں جب کبھی بور ہو جاتا تھا تو شغل کے طور پر ان کا قتل عام کیا کرتا تھا۔''

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوتا ہے کہ.. اسے لطف اندوز ہونے دو، یہ شخص تو ڈرنک ہو چکا ہے.. البتہ ملکہ نفرتیتی کے گرد مداحوں کا ایک ہجوم ہے..

''لیڈی تم کون ہو؟''

''میں مصر کی سب سے حسین اور طاقتور ملکہ نفرتیتی ہوں۔''

''لیکن تم نے اپنی آنکھوں میں اتنا سرمہ کیوں ڈال رکھا ہے.. ملکہ... اور یہ تمہارے ماتھے پر ایک سانپ کیوں پھن اٹھائے کھڑا ہے..''

ملکہ نفرتیتی ایسے احمقانہ سوالوں کے جواب دینا مناسب نہیں سمجھتی.. کوکا کولا کا ایک گھونٹ بھرتی ہے اور قریبی حبشی کو اپنا غلام سمجھ کر اُس کے ساتھ رقص کرنے لگتی ہے..

ان ممکنات میں اتنے ممکن ہیں کہ ان پر الگ سے ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس لیے یہیں پر اجتناب کر لیا جائے.. البتہ آخر میں ذرا یہ تصور میں لے آئیے کہ ایک ابوالہول.. براڈوے سٹریٹ پر چلا جا رہا ہے.. چیونگم چبا رہا ہے اور فرنچ فرائز کھا رہا ہے.. ''فینٹم آف دے آپرا'' کھیل کا ٹکٹ خریدنے کے لیے قطار میں کھڑا ہوا ہے تو عام امریکیوں کا ردعمل کیا ہوگا.. میرا خیال ہے وہ قطعی طور پر پریشان یا حیران نہیں ہوں گے بلکہ آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملائیں گے اور کہیں گے ''ہے فنی گائے.. میرا خیال ہے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہوا ہے۔''

مصری سیکشن میں سب سے پُرشکوہ اور قدامت میں ڈوبی عمارت.. پرناب کا مقبرہ ہے.. جس کے لیے خصوصی طور پر ایک وسیع ہال تعمیر کیا گیا تھا..

ابوالہول کے بُت اور معروف ترین اہراموں کی قیام گاہ غزہ سے بیس میل جنوب میں سقارہ کا علاقہ ہے جہاں کبھی اس فرعونی عُہدے دار کا یہی مقبرہ ہوا کرتا تھا.. امریکیوں نے 1913ء میں اس مقبرے کی بولی لگا کر اسے خرید لیا.. اور مصری حکومت نے اسے بخوشی فروخت کر دیا کہ اس

نوعیت کے سینکڑوں مقبرے اس سرزمین پر بکھرے پڑے تھے.. مقامی دیہاتی ان کے پتھر اکھاڑ کر اپنے گھر بناتے تھے اور بے راہرو نوجوان ان مقبروں میں اپنی چاہتوں سے ملاقات کرتے تھے.. ان میں اہل مقبرہ کی روح کے علاوہ صرف چمگادڑیں رہتی تھیں اور حکومت ان کی کثرت سے عاجز آئی ہوئی تھی کہ جہاں قدم رکھتے نیچے سے ایک فرعون کی ممی ظاہر ہو جاتی تھی، جہاں کوئی کسان اپنا گھر بناتا تھا تو بنیادوں کی کھدائی کرتے ہی نیچے سے ایک مقبرہ نکل آتا تھا.. چنانچہ پرناب کے مقبرے کو ہنسی خوشی فروخت کر دیا گیا..

اس مقبرے کو جوں کا توں.. ہر پتھر.. ہر تصویر.. ہر نقش کو جوں کا توں امریکہ منتقل کر کے اسے میٹرو میں پھر سے تعمیر کر دیا گیا..

یہ دراصل پرناب نامی شاہی اہلکار کی خوش بختی تھی کہ اس جیسے یوں تو ہزاروں اہلکار فرعونوں کے آگے سجدہ ریز ہوتے تھے لیکن اُن میں سے صرف وہ.. اور اس کا مقبرہ نیویارک میں منتقل ہو کر امر ہو گیا.. اسے موت کے بعد نیویارک کا منظر دیکھنے کو مل گیا..

مقبرے کے اندرون میں نہایت نفیس اور نازک فرعون کے دربار اُس کے اہلکاروں کی تصویریں پتھر میں کندہ ہیں.. اگرچہ پتھر میں ہے پر زندہ لگتی ہیں.. اور یہ چیمبر اتنا تنگ اور مختصر ہے کہ اس میں دم گھٹتا ہے.. بیک وقت دو تین لوگوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں.. اور اگر کوئی بھرے بدن کی خاتون اندر داخل ہو جائے تو کچھ گنجائش باقی نہیں رہتی..

پرناب ایسے سینکڑوں درباری مصر کی ریت میں روپوش ہیں.. اور جو نمایاں ہیں ان میں سے بھی کوئی واقف نہیں ہے اور صرف اسے امریکہ کا گرین کارڈ مل گیا ہے اس لیے ہر کوئی اسے جانتا ہے..

مصری سیکشن میں اُس عہد کے عجائبات کو ایک نہایت مدھم اور پُراسرار روشنی میں نمایاں کیا گیا ہے.. انہیں دیکھ کر جہاں انسان تین چار ہزار سال پیچھے چلا جاتا ہے وہاں دل میں ایک ہول سا بھی اٹھتا ہے کہ یہ کیا لوگ تھے.. کیسے لوگ تھے جو ہزاروں برس پہلے ہم سے کہیں زیادہ تہذیب یافتہ اور ذوق جمال رکھنے والے تھے.. بے شک دنیا کے کسی بھی خطے میں آج تک کسی ایک نسل نے اتنے سو برس حکمرانی نہیں کی جتنی کہ فرعونوں نے کی.. یہ تعداد میں تقریباً دو سو کے لگ

بھگ تھے اور ان میں سے ایک فرعون جس نے ہمارے پیارے حضرت موسیٰ سے بہت بدتمیزی کی تھی اور وہ یقیناً ایک ذلیل فرعون تھا اس کے سوا بقیہ فرعون حضرات تو لگتا ہے کہ نہایت تہذیب یافتہ..متمدن..ذوق جمال رکھنے والے اور فلسفی قسم کے تھے..

ایک ہول اس لیے بھی اٹھتا ہے کہ وہاں متعدد ابوالہول بھی ہیں جو شیر بنے بیٹھے ہیں۔ ڈر کے ان باپوں سے اب کوئی نہیں ڈرتا کہ وہ صرف اپنے ماننے والوں کو ڈراتے ہیں اور ماننے والے کب کے خاک ہو چکے..

کہتے ہیں کہ کہیں بنارس وغیرہ میں دو ہندو بھائی کالی دیوی کے پجاری تھے..ان میں سے ایک مسلمان ہو گیا..جو ہندو رہ گیا اسے کالی ماتا روز خوابوں میں آ کر کھوپڑیاں کھنکھناتی خوب ڈراتی اور وہ غریب ساری رات سو نہ سکتا اور خوف کے مارے کانپتا رہتا..ادھر جو مسلمان بھائی تھا وہ چین کی نیند سوتا اور خراٹے مارتا' خوب مزے کرتا..ایک روز اس ہندو نے اسے ڈراتی کالی ماتا سے کہا..ماتا تم روزانہ ڈرا ڈرا کر میری نیندیں حرام کرتی ہو..اُسے کیوں نہیں ڈراتی جو کمبخت مسلمان ہو گیا ہے تو کالی ماتا نے کہا..اُسے میں نہیں ڈرا سکتی کیونکہ وہ مجھے مانتا نہیں..

چنانچہ جو مانتا ہے اُسے ہی ڈرایا جاتا ہے..

ابوالہول کے ماننے والے نہیں رہے اس لیے وہ اب کسی کو ڈرا نہیں سکتا..بچہ لوگ میوزیم کے پہرے داروں کے اِدھر اُدھر ہوتے ہی اس پر سواری کر کے نخ نخ کرنے لگتے ہیں کہ چل میرے ابوالہول چل..

متروک خداؤں کا یہی حشر ہوتا ہے..اکثر خدا زمانے گزرنے سے متروک ہو جاتے ہیں اور پھر ان سے کوئی نہیں ڈرتا..

جیسے چین میں ہر عمارت اور عبادت گاہ کے باہر چپٹی ناکوں والے چینی شیر مجسموں کی شکل میں بٹھا دیئے جاتے ہیں کہ ان کے عقیدے کے مطابق وہ اُس عمارت کو بلاؤں سے محفوظ رکھیں گے اور اُس کی حفاظت کریں گے۔اس طور قدیم مصر میں ہر محل یا معبد کے باہر یہ ابوالہول سکیورٹی گارڈز تعینات کر دیئے جاتے تھے..

اب ان میں سے بیشتر نیویارک کے میٹرو میں بیٹھے ہیں اور اُلٹی ان کی حفاظت کی جا رہی ہے..ایک پوری چٹان میں سے تراشا گیا ایک ایسا پتھریلا تابوت تھا جس کا تذکرہ میں کر چکا

ہوں..وہ ایک بڑے کمرے میں مشکل سے سماتا تھا..وہ تابوت اتنا بڑا تھا کہ اس کا دو چار ٹن وزنی ڈھکن جانے کیسے اٹھا کر اس میں مردہ فرعون کو رکھتے ہوں گے..اور ایک بار ڈھک کر جانے اس کا منہ دیکھنے کے لیے وہ ڈھکن دوبارہ کیسے اٹھاتے ہوں گے..یقیناً ان دنوں منہ دیکھنے کا رواج نہیں ہو گا..

ایک بلّی کا تابوت بھی تھا جو خود بھی ایک بلّی تھا یعنی بلّی کی شکل کا تھا..اور اس پر علامتی شکلیں کندہ تھیں جن کا مطلب تھا کہ..یہ ایک مقدس بلّی کا تابوت ہے..

وہ کیسی ماؤں بلّی ہو گی جس کے لیے اتنا پُرشکوہ اور مصور تابوت بنایا گیا اور اس پر اس کی پورٹریٹ بنائی گئی..ہمارے ہاں کی گلیوں اور گھروں میں پھرنے والی آوارہ بلّیاں اگر یہ تابوت دیکھ لیں تو کیسا رشک کریں کہ یہ نہ تھی ہماری قسمت..

اگرچہ قدیم مصر میں مگرمچھ' سانپ اور گیدڑ کے علاوہ بلّی کو بھی ایک مقدس جانور مانا جاتا تھا..لیکن ان زمانوں میں ایک شہر بوباسٹائٹ نام کا ہوا کرتا تھا جہاں کے باشندے ہر بلّی کو ایک دیوی مانتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے..انہیں دودھ پلاتے تھے..ان کی مونچھیں سنوارتے تھے..ان سے مرادیں مانگتے تھے..ان کی میاؤں میاؤں سن کر عقیدت سے سر جھکا کر اپنی خوش بختی پر ناز کرتے تھے کہ یہ جو میاؤں میاؤں ہے تو یقیناً آسمان سے اترنے والی ایک میاؤں میاؤں ہے یعنی ہوئے وہ ہم سے ہم کلام..بلّی بلّی! پھر کچھ یوں ہوا کہ اس بلّی پرست شہر کے ایک خاندان کے لوگ مصر کے بادشاہ ہو گئے تو ظاہر ہے ہر جانب بلّیاں ہی بلّیاں ہو گئیں..لوگ جوق در جوق بلّیوں پر ایمان لانے لگے اور یہ سلسلہ آج تک چلا آتا ہے..جو بھی حاکم وقت ہوتا ہے وہ اپنی بلّی کو تھیلے میں سے باہر لے آتا ہے اور اس کی قربت کے خواہش مند حریص اس کی بلّی کو خدا مان لیتے ہیں تو ان بادشاہوں کے عہد میں ہر جانب بلّیوں کا راج ہو گیا..ان کے جشن منائے جاتے..ان کے لیے معبد تعمیر کیے گئے اور انہیں دفن کرنے کے لیے خصوصی قبرستان تعمیر کیے گئے..ایک بلّی کو محض ایک بلّی سمجھنا اور اسے صرف بلّی کہنا خلاف قانون قرار دیا گیا..یہاں تک کہ ہتک بلّی کی سزا بھی نہایت شدید تھی..یہ میرا گمان ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو گا کیونکہ ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے..

یہی وجہ ہے مصر کے مقابر اور زیر زمین مدفنوں میں سے انسانوں کی نسبت بلّیوں کی

حنوط شدہ لاشیں زیادہ برآمد ہوئیں..

یعنی قدیم مصر میں انسان ہونے سے بہتر تھا بلّی ہونا!

یہ نہیں کہ انسان کو بھی میسر نہیں انسان ہونا بلکہ.. بلی کو بھی میسر نہیں بلّی ہونا..

ویسے ہم لوگ جو ہیں مسلمان لوگ تو ہم بھی ایک طرح سے بلّیوں کے پجاری ہیں شرط صرف یہ ہے کہ وہ بلّیوں کے باپ.. ابوہریرہ.. کی بلّیاں ہوں..

یہ عجوبے مجسموں.. تابوتوں اور تصویروں کے بہت پر ہول اور متاثر کرنے والے تھے لیکن مجھے اس سیکشن میں لکڑی سے بنائے گئے اور انہی زمانوں میں تراشے گئے وہ چھوٹے چھوٹے ماڈل بہت پسند آئے جن میں قدیم مصر کی روزمرہ کی زندگی کی عکاسی کی گئی تھی.. یہ ماڈل ویسے ہی تھے جیسے ہمارے ہاں لوک ورثہ میوزیم یا سندھیالوجی شعبے میں اپنی ثقافت کو پیش کرنے کے لیے بنائے جاتے تھے۔ ان ماڈلوں کی کل تعداد تیرہ تھی.. جی ہاں میں نے انہیں بہت غور سے گنا تھا.. ان میں کھیتی باڑی کے طریقے دکھائے گئے تھے.. خوراک کونسی اور کیسے تیار کی جاتی تھی.. مویشیوں کی دیکھ بھال.. کشتیاں کیسے بنائی جاتی تھیں اور ان زمانوں میں تفریح کے کون سے کھیل تھے.. یہ سب ماڈلوں کی صورت میں نمائش پر تھیں اور میں ایک مرتبہ پھر یہ بتادوں کہ یہ ماڈل آج نہیں ہزاروں برس پیشتر بنائے گئے تھے۔ ان میں ایک چھوٹا سا عام مصری گھر بھی بنایا گیا تھا.. اور وہ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ ہمارے ہاں ایک دور افتادہ گاؤں میں ہوتا ہے.. ایک مستطیل صحن جس کے آخر میں چند کمرے جو منقش ستونوں کے سہارے کھڑے ہیں۔ صحن میں چند درخت اور درمیان میں ایک تالاب.. اور درخت انجیر اور سیاہ شہتوت کے ہیں..

میری بیگم اگر اس ماڈل مصری گھر کو دیکھ لیتی تو میری شامت آجاتی کہ اسے انجیر بے حد مرغوب ہیں اور میں نہایت ہمدردی اور گہرے غور وخوض کے باوجود یہ نہیں سمجھ سکا کہ آخر اسے انجیر ایسا.. بیجوں سے بھرا.. بے ذائقہ میوہ کیوں پسند ہے۔ میں دوبئی سے فون کر کے اسے پوچھتا ہوں کہ مُونا یہاں سے تمہارے لیے کیا لے کر آؤں اور وہ گہنے موتی نہیں مانگتی صرف انجیر مانگتی ہے.. یہاں تک کینیڈا سے فون کر کے پوچھا تو بھی یہی فرمائش اور جب میں نے خفت کا اظہار کیا کہ بیگم یہاں تو انجیر نہیں ہوتے تو کہنے لگی.. کیسے واہیات ملک میں چلے گئے ہو جہاں

انجیر بھی نہیں ہوتے..

اگر مُونا یہ چار ہزار برس قدیم گھریلو ماڈل دیکھ لیتی تو مجھے سرزنش کرتی کہ دیکھو نسل انسانی کا سب سے پسندیدہ اور قدیمی میوہ یہی انجیر ہی تو رہا ہے۔

انجیر کے علاوہ سیاہ شہتوت کے درختوں کی موجودگی بھی ظاہر کرتی ہے کہ قدیم مصری اس پھل سے بھی رغبت رکھتے تھے اور وہ بھی یقیناً کھانسی کے لیے شربت سیاہ تُوت استعمال کرتے ہوں گے.. آج کے لاہور کی گلیوں کی مانند چار ہزار برس پیشتر کے مصر کے بازاروں میں بھی خوانچہ فروش ''آ ٹھنڈا ٹھارائے'' کے آوازے لگا کر گاہکوں کو متوجہ کرتے ہوں گے.. کہتے ہیں کہ ایک ایسے ہی شہتوت فروش نے قریب سے گزرتے جنازے کو کندھا دیتے ہوئے کلمہ شہادت کہنے کے بجائے ''آ ٹھنڈا ٹھارائے'' کا نعرہ لگا دیا تھا..

روزمرہ کے استعمال کی اشیاء میں لکڑی اور ہاتھی دانت سے ساختہ ایک منقش کُرسی بھی ہے جس پر شاہی فرمان تحریر کرنے والا میر منشی بیٹھا کرتا تھا' یقین مانیئے ہمارے ہاں آج بھی ہو بہو ایسی کرسیاں استعمال ہوتی ہیں.. سنہرے رنگ کی زنانہ چپلیں بھی ایسی ہیں کہ شک گزرتا ہے کہ انہیں بانو بازار لاہور سے خرید کر یہاں رکھ دیا گیا ہے..

ایک شکستہ ہو چکے سفید پتھر سے تراشے ہوئے مجسمے کے صرف ہونٹ باقی رہ گئے تھے اور اسے دُودھیا روشنی سے نمایاں کیا گیا تھا.. صرف ہونٹ.. اُن کے سوا اور کوئی نقش سلامت نہ تھا.. پتھر کے وہ ہونٹ اتنے نازک اور پرکشش تھے کہ اُن پر زندہ ہونٹ رکھ دینے کو جی چاہتا تھا.. وہ باریک اور ترشے ہوئے نہیں تھے بلکہ افریقی نسل کے قدرے موٹے اور بھرے بھرے ہونٹ تھے.. پنکھڑی اِک گلاب کی ہرگز نہ تھے.. وہ شب وصال کی سویر والے ذرا سوجے ہوئے ہونٹ تھے.. اور یہ ہونٹ شناسا سے لگتے تھے.. میں نے انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا تھا.. اگر دیکھا تھا تو دیکھتے ہی اُنہیں اگر پتھر میں تراش دیتا تو وہ بھی ہوبہو ایسے ہی ہوتے..

ان ہونٹوں کے سوا ایک مختصر سا بالشت بھر کا مجسمہ تھا.. ایک بے لباس عورت کا.. چاندی سے تخلیق کردہ.. اور اس کی دل فریبی اور صناعی ایسی تھی کہ میں بہت دیر تک شیشے کے شوکیس سے ناک چپائے اسے تکتا رہا کہ اب یہ کون ہے جو شناسا لگتی ہے... مجسمے کے بال اور گہنے الگ سے بنا کر اُسے پہنائے گئے تھے..

قدیم مصر کے ذوق جمال اور مہارت کی یہ مختصر ترین مگر بلیغ مثال تھی..

اگرچہ اُس تہذیب کی نمائندگی کرنے والے مظاہر حجم اور ہیبت میں بہت بڑے بڑے تھے۔ فلک سے چھوتے ہوئے اہرام اور صحراؤں میں براجمان ابوالہول..بے شک یہ دنگ کر دینے والے مظاہر نہ بھی ہوتے تو بھی چاندی کی یہ مختصر عورت قدیم مصر کی تہذیب کی مکمل نمائندگی کر سکتی تھی..

چاندی کی یہ مختصر عورت بھی زندہ لگتی تھی..چھریرے بدن کی..لمبی ٹانگوں والی جس کے کولہے بھاری نہ تھے سبک تھے جیسے وہی سفید پتھر کے موٹے ہونٹ قدرے بڑے ہو گئے ہوں..دُبلی اگرچہ وہ ناکافی لگتی تھیں لیکن کامنی چھاتیاں..گلے میں ہار..پاؤں میں جھانجھریں..اور ایک بھید بھری مسکراہٹ کہ ''تم مجھے چھو نہیں سکتے..'' پوچھیے کہ کیوں نہیں؟ تو جواب میں صرف یہ کہا جائے کہ ''کیونکہ....'' اس کے سوا کچھ نہیں..آنکھوں میں شرارت کے سوا کچھ نہیں..

مصری گیلری کا نکتہ عروج..جسے گرینڈ فنالے بھی کہا جاتا ہے..ڈنیڈور کا معبد ہے..یہ ایک مختصر ماڈل نہیں جو مصری تہذیب کی عکاسی کے لیے نمائش پر ہو..کوئی نقش، کوئی مجسمہ یا تصویر نہیں..وہ جیسا تھا ہزاروں برس پیشتر مصر کے ویرانوں میں تھا وہ ویسا ہی اب میٹرو کے ایک وسیع ہال میں ایستادہ ہے..

دو ہزار برس پیشتر مصر پر قبضہ کرنے کے بعد رُومی شہنشاہ آگسٹس نے اسے جب تعمیر کروایا تھا یہ اب اسی مکمل حالت میں آپ کی نظروں کے سامنے ہے..

اسوان ڈیم کی تعمیر کے بعد جب جھیل ناصر کو نمودار ہونا تھا تو قدیم مصر کی بہت سی عجوبہ عمارتیں اور معبد اور کھنڈرز زیر آب ہو جانے تھے..انہیں محفوظ کر لینے کے لیے بین الاقوامی سطح پر منصوبہ بندی کی گئی اور انہیں بچانے کی خاطر اتنی رقم خرچ کی گئی جو ان کی تعمیر پر بھی خرچ نہ ہوئی ہو گی..نوبیا کے پرشکوہ محلات اور معبد ایک ایک پتھر کر کے مسمار کیے گئے..اور ہر پتھر پر نشان لگے..ہندسے نقش ہوتے اور پھر انہیں جھیل ناصر کے پار لے جا کر جوں کا توں تعمیر کر دیا گیا کہ تہذیب کسی ایک ملک کی نہیں ہوتی، وہ ایک مشترکہ وراثت ہوتی ہے..ان کوششوں میں امریکہ کا بھی بہت بڑا حصہ تھا چنانچہ مصری حکومت نے تشکر کا اظہار کچھ یوں کیا کہ کسی صحرا میں اجڑتے

ہوئے اس معبد کو ایک تحفے کے طور پر عنایت کر دیا..امریکی تو انگلستان اور فرانس کے قلعے اور پرانی رہائش گاہیں مسمار کر کے ان کے پتھروں اور اینٹوں کو جہازوں میں لاد کر اپنے ملک میں دوبارہ تعمیر کر لیتے ہیں تو یہ تو ایک چھوٹا سا مصری معبد تھا..

ڈنیڈور کے معبد کے داخلے پر ایک تختی پر کندہ ہے ''ریاست ہائے متحدہ کو 1965ء میں عطیہ کیا گیا اور پھر حکومت نے 1967ء میں اسے میٹروپالٹن میوزیم کو عنایت کر دیا۔''

حسب روایت دو ابوالہول اس معبد کی حفاظت کے لیے ایستادہ ہیں..پس منظر میں ایک وسیع تالاب ہے..اس سے پرے بھاری پتھروں کا ایک صدر دروازہ ہے اور اس کے آگے ڈنیڈور کا معبد روشنیوں سے منور دو بلند اور منقش ستونوں کے سہارے قائم ہے..

ایک پوری بلند چھت تک جاتی شیشے کی دیوار ہے جو سنٹرل پارک کے منظر پر کھلتی ہے اور اس کے درختوں کی ہریاول کو عجائب گھر کے اندر تک لے آتی ہے..آپ جھانکیے تو سنٹرل پارک میں سیر کرتے لوگ نظر آئیں گے اور ان میں وہ پونی ٹیل لڑکی بھی جاگنگ کرتی ہوئی نظر آ جائے گی..

سلجوق نے بتایا کہ جب یہ معبد پتھر پتھر کر کے اس ہال میں دوبارہ تعمیر کیا جا رہا تھا تو اُن زمانوں کی منحنی، بے ڈھنگی اور معمولی شکل اگرچہ غیر معمولی لباسوں والی..خاتونِ اوّل کو خبر ہو گئی جس کا نام جیکولین کینیڈی تھا اور وہ اس میوزیم کے پار سنٹرل پارک کے کناروں پر اٹھتی ہوئی ایک عمارت کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھی اور یہ فلیٹ میوزیم کے روبرو تھا..جیکولین کینیڈی نے پیشکش کی کہ اگر ایک اینٹوں کی دیوار کی بجائے..میرے فلیٹ کے رُخ پر شیشے کی ایک ایسی دیوار بنا دی جائے کہ میں اپنے فلیٹ میں بیٹھی مصر کے اس حیرت کدے کو دیکھ سکوں تو میں اس مہربانی کے معاوضے کے طور پر اتنے لاکھ ڈالر میوزیم کے قدموں میں نچھاور کر دوں گی..یہ پیشکش بخوشی قبول کر لی گئی..جیکولین جو ایک محفلوں میں پہنچ کر مہمانوں کی تصویریں اُتارنے والی معمولی فوٹوگرافر اور اس سے بھی معمولی شکل کی فاقہ زدہ لڑکی تھی جس نے نوجوان جیک کینیڈی کو اسیر کر کے امریکہ کی خاتونِ اوّل کا رتبہ حاصل کیا اور پھر اُس کے قتل پر اتنی غمناک ہوئی کہ ایک ایسے یونانی سے شادی رچالی جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا لیکن وہ قبر دولت سے لبریز تھی اور اس شخص کا نام ارسطائل اوناسس تھا..تو وہ خاتون اپنے فلیٹ میں برپا پارٹیوں کے دوران جب نہایت ڈرامائی

انداز میں کھڑکیوں کے پردے وا کرتی ہوگی تو مہمانوں کو ایک قدیم مصری مندر یکدم اپنے سامنے یوں نظر آنے لگتا ہوگا جیسے وہ اُمڈ کر جیکولین کے فلیٹ کے اندر چلا آ رہا ہو اور وہ کیسے جیکولین کو ایک دیوی کی مانند چاہنے لگتے ہوں گے.. ایسے کسی رت جگے کے بعد جب وہ رات کے پچھلے پہر غسل خانے میں پچھلی شب کی تھکاوٹیں اور خمار اپنے بدن سے اُتارتی ہوگی تو بھی یہ شاندار معبد اس کی نظروں کے سامنے آتا ہوگا اور وہ یقین کر لیتی ہوگی کہ وہ ایک معمولی سی فوٹو گرافر لڑکی نہیں ہے.. اس قدیم معبد کی ایک دیوی ہے..

ویسے جیکولین کینیڈی کے سنٹرل پارک کے فلیٹ سے نظر آنے والا یہ قدیم معبد اپنی جگہ.. بے شک وہ امریکہ کی خاتون اول تھی.. امریکیوں کے لیے ان کا رائل خاندان.. ایک شہزادی تھی لیکن اس کے نصیب میں بھی وہ منظر نہیں لکھا گیا تھا جو میرے نصیب میں تھا.. اور میں نے اُسے دیکھنے کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ نہیں کیے تھے محض ایک کتاب ''نانگا پربت'' لکھی تھی.. برسوں پیشتر بولڈر رِج کے راستے ایک گمنام فیری میڈو میں پہنچا تھا اور اپنے ہم وطنوں کو خبر کی تھی کہ یہاں نانگا پربت کے دامن میں دنیا کا سب سے خوبصورت منظر پریوں کی ایک چراگاہ میں پوشیدہ ہے... اور اب وہ پوشیدگی یوں ظاہر ہوئی ہے کہ مقامی لوگوں کے بقول لوگ ''نانگا پربت'' کے راستوں پر چلتے ہوئے یہاں تک آتے ہیں اور اتنے آتے ہیں کہ فیری میڈو میں گنجائش نہیں رہتی اور ہر کوئی پہلا سوال یہی کرتا ہے کہ تارڑ نے اپنا خیمہ کہاں لگایا تھا. تو انہوں نے وہ مقام جو کہ ایک پہاڑی پر تھا' جہاں سے نانگا پربت کا ایک بدن کو شل کر دینے والا منظر تھا کہ اس پہاڑ کو بھی شل مکھی یعنی سو چہروں والی بھی کہا جاتا تھا تو اس نے شَل تو کرنا تھا.. تو وہ مقام انہوں نے محفوظ کر لیا ہے.. قریبی جھیل کو ''تارڑ جھیل'' کا نام دیا ہے اور رحمت نبی کی پر آسائش کیمپنگ کے اوپر تعمیر کیے جانے والے پہلے جھونپڑے یا ہَٹ کو بھی ''تارڑ ہٹ'' کہا ہے.. یہ جب میں آخری مرتبہ فیری میڈو گیا تھا تو اس کے جنگلوں میں بوسیدہ ہو کر گرنے والے درختوں کی لکڑی سے تعمیر شدہ ایک سحر انگیز رہائش تھی.. رحمت نبی نے مجھ پر کیسا کرم کیا.. کیسی بے مثال اُلفت کی کہ میں وہ پہلا مہمان تھا جو اُس تازہ تراشیدہ لکڑی کی مہک والے جھونپڑے میں ٹھہرا.. اور اُس کی کھڑکی نانگا پربت کی برفوں پر کھلتی تھی.. صبح سویرے سردی کی شدت سے جب میں جاگ جاتا تو ناگہاں نظر اس منظر کی سفیدی کے اندر دور تک چلی جاتی اور میں سوچتا کہ یہ حقیقت نہیں ہے ایک سفید برفوں بھرا خواب

ہے جو میں دیکھ رہا ہوں..

بس یہی منظر ہے جو جیکولین کے نصیب میں ہو نہیں سکتا تھا پر میرے نصیب میں تھا.. نانگا پربت کا سفید برفانی معبد تو ازل سے تھا.. اور یہ مصری معبد تو بس دو ہزار برس پہلے وجود میں آیا تھا تو ان کا کیا تقابل..

اور یہ معبد تو اس میوزیم میں مردہ پڑا ہے.. اس کا کوئی پجاری نہیں جبکہ نانگا پربت کے چاہنے والے کبھی کم نہ ہوں گے..

اکثر خدا زمانے گزرنے سے متروک ہو جاتے ہیں.. وہ مصر کے ہوں.. بابلؔ.. نینوا.. موہنجوڈارو.. مہر گڑھ یا گندھارا کے ہوں خدا سے پتھر ہو جاتے ہیں لیکن... لیکن منظر کبھی متروک نہیں ہوتے.. یوں وہ ایسے عارضی خداؤں سے برتر ہوتے ہیں.. اور ہاں میں نے اس بازارِ مصر کو بیان کرتے ہوئے اس تابوت کا تو تذکرہ ہی نہیں کیا جو میرا تھا.. جس کے ڈھکن پر میری تصویر نقش تھی.. میں مختلف تابوتوں پر سرسری نظر ڈالتا چلا جا رہا تھا جب اُس ڈھکن پر بنی میری تصویر نے میرے قدم روک دیئے.. میں مبالغہ نہیں کر رہا.. وہ میری طرح گندمی رنگ کا تھا' بال گھنگھریالے تھے' ناک سیدھی اور تیکھی تھی اور اُس کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں.. سعید اختر کی بنائی ہوئی میری وہ پورٹریٹ جو ''خانہ بدوش'' کے پہلے ایڈیشن کے سرورق پر شائع ہوئی تھی ڈھکن پر بنی یہ تصویر تقریباً اس جیسی تھی..

تین چار ہزار پیشتر یہ کون تھا جو میرا ہم شکل تھا.. یا یہ میں ہی تھا جو اُن زمانوں میں زندہ تھا.. البتہ یہ تصویر.. یہ گاڑھے اور شوخ رنگوں سے بنائی گئی تابوت پر یہ تصویر.. میری نوجوانی کے زمانے کی شکل تھی..

تو کیا یہ میں تھا جو ہزاروں برس پیشتر عالم جوانی میں مر گیا تھا اور اس تابوت میں دفن کیا گیا تھا.. اور اب پھر زندہ ہوا ہوں اور اپنے اسی تابوت کو دیکھنے کی خاطر لاہور سے نیویارک کا طویل سفر طے کر کے آیا ہوں.. صرف اپنے آپ کو دیکھنے کے لیے اور ڈھکن پر اپنی شکل کو سامنے پا کر کہتا ہوں.. مستنصر تم وہاں بھی تھے ہزاروں برس پیشتر اور اب یہاں بھی ہو تو کیوں ہو..

ایک بلّی جو مقدس تھی اور چاندی کی بنی ہوئی ایک مختصر عورت.. اور ایک تابوت جس میں دفن ہوا تھا..

سردیوں کی ایک شام ایک یخ بستہ اور دھندآلود رات میں اُتر رہی تھی..

بازار کی بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں اور اُن کے تھڑوں پر آوارہ کتے لوٹتے تھے..

پرانی سبزی منڈی کی ایک شکستہ دیوار کے ساتھ دو خاکروب دن بھر کے کوڑے کرکٹ کو جلا کر آگ تاپ رہے تھے اور پھر بھی اپنے سیاہ جُسوں میں ٹھٹھر رہے تھے.. چرس کا ایک سلگتا سگریٹ ہی اُن کی واحد اور مشترکہ خوشی تھا.. جو کش لگا رہا ہوتا وہ اس گندگی سے لتھڑی ہوئی ذلت آمیز حیات سے چند لمحوں کے لیے فرار حاصل کر کے قرار میں چلا جاتا اور دوسرا اپنا بے چین ہاتھ آگے بڑھائے اپنی باری کا انتظار کرتا تا کہ وہ بھی غلاظت کے ایک کیڑے سے ذرا بلند ہو کر آدمیت کے کچھ سانس لے لے..

خوانچہ فروش بھی رخصت ہو چکے تھے، صرف مونگ پھلی فروخت کرنے والا اپنے آپ پر جبر کرتا ابھی تک اُس بدن میں چھید کرتی سردی کی شدت سہتا تھا جو اُس کے رگ و پے میں اُتر کر خون کو بھی برف کر رہی تھی.. مونگ پھلی کے ڈھیر پر رکھے ایک کچے کُجّے میں سلگتے.. کبھی جو کوئلے سلگتے تھے اور اب راکھ ہونے کو تھے، اُن پر اپنی ہتھیلیاں پھیلائے ''مونگ پھلی جے.. گرما گرم جے'' کی صدا لگاتا تھا.. اور یہ صدا بھی منہ سے برآمد ہوتے ہی ٹھٹھرنے لگتی تھی..

میرے ملازم کب کے جا چکے تھے اور میں اپنی دکان کا شٹر نیچے کر کے ایک تنہائی تخلیق کر کے اپنا سفرنامہ ''خانہ بدوش'' لکھ رہا تھا اور میرے سامنے یونانی دیومالا کی انسائیکلوپیڈیا کھلی پڑی تھی اور میں اُس کے حوالے اپنے سفرنامے میں شامل کر رہا تھا..

میں یونانی دیومالا کے سمندر ایجئین میں ایک تُرک جہاز پر نیپلز کی جانب سفر کر رہا تھا..

ہر سُو خاموشی تھی اور میں اطمینان سے گوالمنڈی میں بیٹھا یونانی دیومالا کی ایک رتھ پر سوار ایجئین سمندر کے جادوئی جزیروں میں اُتر رہا تھا.. اوڈیسیس کے ہمراہ ''سنہری کھال'' کی تلاش میں سفر کر رہا تھا.. ابھی جادوگرنیوں کا وہ جزیرہ گزرا تھا جس میں آباد پُرکشش، بدنوں اور آوازوں والی جادوگرنیاں ملاحوں کو اپنے گیت سنا کر مسحور کر لیتی تھیں اور وہ اپنے جہازوں سے چھلانگ لگا کر اُن تک پہنچتے ہیں اور اُن سے ہم آغوش ہوتے ہی موت کے منہ میں چلے جاتے تھے..

میرے کانوں میں ''مونگ پھلی جے.. گرما گرم جے'' کی صدا کی بجائے سائرنز کے سحر انگیز گیت اُتر رہے تھے..

تو میں وہاں یونانی دیومالا کے سمندروں میں تھا.. جب ایک شخص نے گرے ہوئے شٹر کے نیچے سے جھانک کر کہا ''تارڑ صاحب.. شاید میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا ہے.. لیکن میں شرقپور سے آ رہا ہوں، موٹر سائیکل پر.... اس لیے اتنی دیر سے یہاں پہنچا ہوں.. مجھے سبزیوں اور پھولوں کے کچھ بیج درکار ہیں اور آپ کے والد صاحب کی کتاب ''پھولوں کی دنیا'' بھی.. تو کیا آپ مہربانی کریں گے.. سوری ٹُو ڈسٹرب یُو..

بے شک وہ ایک گاہک تھا اور بے شک اُس کی آمد میں کچھ مالی منفعت کا بھی امکان تھا لیکن مجھے ایجئین سمندر کے جزیروں میں گیت گانے والی برہنہ بدن جادوگرنیوں کے آغوش میں سے یکدم گوالمنڈی میں آ جانا کچھ بھلا نہ لگا لیکن میں اُسے ایک گاہک کو دھتکار تو نہ سکتا تھا.. میں اپنی نشست سے اٹھا اور ایک دکاندار کی خوشامدی مسکراہٹ چہرے پر سجائے ''کیوں نہیں.. کیوں نہیں'' کہتا.. اس کا استقبال کیا اور اسے مطلوبہ بیج اور کتاب فراہم کر دیئے.. میرا خیال تھا کہ وہ ادائیگی کر کے فوراً رخصت ہو جائے گا پر وہ نہ ہوا.. باتیں کرنے لگا.. یہ بھی نہیں کہ خود بخود زبردستی باتیں کرنے لگا، میں اپنی کھوج اور ٹوہ کی حس سے مجبور ہو کر اُس سے پوچھ بیٹھا تھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں.. کیا کرتے ہیں..

میں نے جانا کہ وہ بھی ایک ساحر ہے.. ایک جادوگر ہے جو لوگوں کو راہ راست سے بھٹکاتا ہے.. یونانی دیومالا کے کسی جزیرے میں مقیم ہے اور آس پاس سے گزرنے والی کشتیوں کے ملاحوں کو گیتوں سے نہیں باتوں سے بے راہ رو کرتا ہے.. وہ ایک عجیب اور کم از کم ہمارے معاشرے میں ناقابل فہم رویئے کا پرچارک تھا.. اُس کی توجیہہ اور منطق سراسر مجھے قبول نہ تھی اور نہ میں اس کے نقطۂ نظر سے مکمل طور پر متفق ہو سکتا تھا.. لیکن میں نے اسے صبر سے اور دلچسپی سے سنا..

ایک لکھنے والے کو وہ کچھ بھی سننا چاہیے جس کے سننے سے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُنڈیل دیا جاتا ہے.. وہ رک رک کر جیسے ایک عالم خمار میں بات کرتا تھا اور نقل کفر کرنا تو کفر نہیں ہے تو ایسی باتیں اگر نقل کر دوں تو اس میں کچھ قباحت نہیں...

اس کا نظریہ تھا کہ یہ دنیا آج کہیں زیادہ پُرامن، مہذب، متمدن اور ترقی یافتہ ہوتی.. اگر مذہب نہ ہوتے.. پیغمبر نہ ہوتے..

میں نے اپنے محدود علم کو بروئے کار لا کر مقدور بھر اس سے اختلاف کرنے کی سعی کی..

لیکن اس کے دل پر قفل لگ چکے تھے جو کھل نہ سکتے تھے..

اس کا کہنا تھا کہ دنیا کے عظیم ترین مذہب.. یہودی' عیسائیت اور اسلام جب آئے تب دنیا بود و باش' علم' سائنس' فن تعمیر' ادب' فلسفے اور سوچ کے حوالے سے عروج پر تھی..اور اس عروج کو مذہب نے زوال میں بدل دیا..

بابل اور نینوا کی عظیم الشان تہذیب.. جہاں حروف تہجی ایجاد ہوئے اور جہاں مٹی کی تختیوں کی صورت میں کتابیں لکھی گئیں.. کہیں بابل کے معلّق باغ ہیں اور کہیں اُس کے بلند دروازے.. عالی شان رہائش گاہیں' درسگاہیں اور متموّل تاجر جن کے تجارتی جہاز دور دراز کے سمندروں میں جاتے تھے..ایسی سپاہ جو اپنی رتھوں پر سوار دنیا کو زیر کر سکتی تھی.. یہاں حضرت ابراہیمؑ آئے اور اپنے باپ آذر سے بغاوت کر کے بتوں کو توڑ ڈالا اور توحید کی دعوت دی..

بابل اور نینوا زوال کا شکار ہوئے..کھنڈر ہو گئے..

پھر قدیم مصر کی شان و شوکت اور جاہ و جلال..اُن کے محلات اور عظیم معبد' اہرام.. فن سنگ تراشی اور مصوری.. آج کے نیویارک اور ٹوکیو سے کہیں بڑھ کر متمدن اور پُرشکوہ شہر..اور یہ تہذیب چند برس نہیں تقریباً ایک ہزار برس کے عرصے پر محیط رہی..دنیا کی کوئی اور تہذیب ایسی نہ تھی اور نہ ہوئی جو اتنے طویل عرصے تک قائم رہی.. آج بھی سائنس دان اور محقق نہ اہرام کی حقیقت جان سکے ہیں اور نہ اُن کی تعمیر کی گتھی سلجھا سکے ہیں..کرناک اور ابوسنبل کے معبدوں کے ستون کیسے ایستادہ کیے گئے اور زیر زمین مقابر کیسے وجود میں آئے..اور وہاں حضرت موسیٰ کا نزول ہو گیا..قدیم مصر اور اُس کی تہذیب زوال میں چلے گئے..

اور اب ہم حضرت عیسیٰ کے زمانوں میں آجاتے ہیں..

امپریل روم نصف دنیا پر حکمران ہے..روم ایک طرح سے یونانی تہذیب کا ہی ایک پھیلاؤ تھا..بیت اللحم اور نزرتھ..آج کا فلسطین رومیوں کی سلطنت کا ہی سینکڑوں میں سے ایک صوبہ تھا..برطانیہ سے شروع ہو کر..پورا یورپ..افریقہ اور مشرق وسطیٰ کا کونسا علاقہ تھا جو اُن کے تسلّط میں نہ تھا..اور اُن زمانوں کی اس نصف متمدن دنیا میں کونسا ایسا خطہ ہے..کوئی ایک گوشہ ہے جہاں اُن کی پُرشکوہ تہذیب کے آثار..آج بھی اجڑے ہوئے محلات..معبدوں کھیلوں کے سٹیڈیم اور باغات کی صورت میں نہ ملتے ہوں..ہسپانیہ' فرانس' مراکو' لبنان' اردن' مصر' ترکی..کہیں بھی چلے

جایئے رومی تہذیب کے کھنڈر ماضی کی یادگاریں ہیں..تو یہ تہذیب بھی اپنے روم' رہوڈز' سکندریہ' ہرات اور ٹرائے سمیت سرنگوں ہو گئی..اس تہذیب نے چند عیسائیوں کو شیروں کے آگے ڈال کر یہ سمجھ لیا کہ شاید یوں ان کا زوال رُک جائے گا پر ایسا نہ ہوا..

مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ ان پراسرار صاحب کا نام سعید تھا اور وہ شرقپور جانے والی سڑک کے کنارے ایک ویرانے میں چند ایکڑ زمین گھیرے..چوروں اور ڈاکوؤں سے بچاؤ کی خاطر اس زمین کے گرد دیوار تعمیر کر کے اُس میں بجلی چھوڑے رہائش رکھتے تھے..وہاں اُن کے کھیت اور تالاب تھے..پھلدار درخت اور دودھ دینے والے جانور تھے اور اُس قدرتی ماحول میں ان کے بچّے وحشیوں کی مانند قلیلیں بھرتے پھرتے تھے کہ سعید صاحب اُنہیں خود تعلیم دیتے تھے' سکول نہ بھیجتے تھے تاکہ وہ روایتی تعلیم سے آزاد ہو کر اپنی سوچ کے مطابق زندگی گزار سکیں..مجھے بعد میں اپنی بیگم کے ہمراہ اُن کے اس نیم تہذیب یافتہ جنگل ٹھکانے میں جانے کا اتفاق ہوا اور میرے بچّے باغی ہو گئے کہ آخر ہم ایسے آزاد ماحول میں کیوں نہیں رہتے..سعید صاحب اور اُن کی بیگم نے..شکر ہے کہ وہ نکاح پر یقین رکھتے تھے..ہمیں اپنے تالاب میں سے پکڑی جانے والی مچھلیاں اور اِدھر اُدھر گھومتی کچھ مرغیوں میں سے چند ایک مرغیاں اور اپنے کھیت کی سبزیاں خوراک کے طور پر پیش کیں..

سعید صاحب جب اس سرد شام میں جب کہ..گوالمنڈی کے بازاروں میں ایک سرد خاموشی کا راج تھا..ان کی گفتگو کے دوران آگ تاپتے خاکروب چرس کا آخری سگریٹ پی کر چلے گئے اور مونگ پھلی والا بھی کب کا اپنا ٹھیلہ دھکیلتا ہوا گھر لوٹ چکا تھا..اور تب وہ اپنی عجیب اور یکطرفہ منطق پیش کرتے حضرت ابراہیم سے شروع ہو کر آخر تک ہم تک یعنی ہم مسلمانوں تک آ گئے اور میں نے دم روک لیا اور اب یہ بھٹکے اور بہکے ہوئے حضرت جانے کیا گل کھلائیں گے..

یہاں بھی اُنہوں نے وہی گل کھلائے جو پہلے کھلاتے چلے آئے تھے..

آپ کو تو یہ علم ہے کہ اُن زمانوں میں پوری متمدن دنیا میں سب سے زیادہ تہذیب یافتہ..علم دوست' بہادر اور حسن جمال رکھنے والی دو سلطنتیں تھیں..ایک رومی اور دوسری ایرانی..روم کے زوال کے بعد یہ کانسٹنٹائن کا آباد کردہ شہر قسطنطنیہ تھا جسے دوسرا روم کہا گیا..یہ بازنطائن سلطنت تھی جس کے عروج میں آیا صوفیہ ایسا فن تعمیر کا ایک عجوبہ ظہور میں آیا اور لوگوں نے کہا کہ یہ

عمارت اہرام مصر سے بڑھ کر شاندار اور پرشکوہ ہے.. ماہر تعمیر آج تک حیرت میں چلے جاتے ہیں کہ آخر اتنا بڑا آسمانی گنبد ہزاروں برس گزرنے کے باوجود چند ستونوں کے سہارے کیسے قائم ہے.. بازنطینی ہنرمندی اتنے کمال کی تھی کہ جب مسجد قرطبہ کی محراب کو دنیا بھر میں منفرد اور پرکشش تعمیر کرنے کے بارے میں سوچا گیا تو اس کے لیے بازنطینی عیسائی کاریگر آئے اور یہ وہ تھے جن کا موذیک یعنی چھوٹے پتھروں سے زیبائش کا کام آج بھی آپ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے.. جی ہاں مسجد قرطبہ کا سب سے خوبصورت حصہ بازنطائن کے عیسائی ہنرمندوں کا کمال فن ہے.. اور ان کے برابر میں بقول آپ کے کچھ گونگے بھی تھے.. اہل عجم بھی تھے.. دارا' سائرس' کے خسرو اور نوشیرواں کا ایران بھی تھا جس کی عسکری قوت ایسی تھی کہ اُنھوں نے یونان کے دارالسلطنت ایتھنز کو فتح کر کے اُسے جلا کر راکھ کر دیا تھا. سکندر ادھر ہماری جانب تو یونہی شغل کے طور پر آ گیا تھا ورنہ وہ تو صرف اور صرف ایرانیوں سے یونانیوں کی توہین کا بدلہ لینے کے لیے گھر سے نکلا تھا.. اور تب ایران کا دارالسلطنت پرس پالس یونانیوں کے ایتھنز سے کہیں بڑھ کر شاندار اور پرشکوہ تھا جسے سکندر اعظم کی ایک رقاصہ تھائیس نے آگ لگا دی تھی.. آج بھی پرس پالس کے کھنڈر گواہی دیتے ہیں کہ روئے زمین پر ایسی تہذیب کم ہی اُبھری ہوگی.. ان ایرانیوں کی وسیع سلطنت گندھارا اور ملتان تک پھیلی ہوئی تھی.. وہ تہذیب و تمدن' شاعری' فن تعمیر میں ایسے یکتا تھے کہ یونان کو بھی احساس کمتری میں مبتلا کرتے تھے..

''ایسی عظیم تہذیب کا آپ لوگوں نے کیا حشر کیا؟''

''ہم لوگوں نے..''

''جی ہاں.. آپ لوگوں نے..''

''ہم مسلمانوں نے؟''

''جی ہاں.. آپ نے.. آپ آج بھی فخر کرتے ہیں کہ ہمارا ایک سالار اپنا نیزہ یوں ٹیکتا ہوا ایرانی شہنشاہ کے دربار میں گیا تھا۔ اس شان سے کہ اس نے فرش پر بچھے بیش قیمت قالین میں سوراخ کر دیئے تھے.. یہ شان تھی.. اور ایران کو زیر کرنے کے بعد جب ایک اور قالین جس کی کاریگری اور خوش نمائی کا آج تک کوئی ثانی نہیں ہو سکا اور جسے جنت کا قالین کہتے تھے کیونکہ اُس پر انسان کے خیال کی بہشت کے سرو و ثمن.. پرندے.. شبیہیں اور گل بوٹے نقش تھے' مال غنیمت

کے طور پر آپ لوگ اٹھا کر لے گئے اور جب اس کی ملکیت پر جھگڑا ہونے لگا تو اس کا آسان حل یہ تلاش کیا گیا کہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے فاتحین میں تقسیم کر دیئے گئے اور آپ نے اسے انصاف اور مساوات قرار دے کر خوب فخر کیا... یہ اسی طرح ہے جیسے مونالیزا کی تصویر کو کاٹ کر برابر میں تقسیم کر دیا جائے اور اُس پر فخر کیا جائے..

سعید صاحب ایک راہ پر چل نکلے تھے اور اُسے ہی صراط مستقیم سمجھتے تھے.. اپنے نقطۂ نظر میں ایک قسم کے بنیاد پرست ہو چکے تھے اس لیے اُن کے ساتھ بحث نہیں کی جا سکتی تھی.. جیسے ایک خودکش حملہ آور سے بحث نہیں کی جا سکتی کہ اس عمل سے معصوم مسلمان لوگ ہلاک ہو جائیں گے تو آپ جنّت میں کیسے جائیں گے.. میں نے کچھ وضاحت کرنی چاہی کہ بابل اور نینوا کی تہذیب اگر کھنڈر ہو گئی تو اس میں کسی کا دوش نہ تھا' عروج کی آخری سیڑھی آ جائے تو پھر اگلا قدم زوال میں ہی گرتا ہے اور یہی قانون قدرت ہے.. حضرت موسیٰ کے بعد بھی سینکڑوں برسوں تک فرعون آتے رہے اور مصری تہذیب دنیا بھر میں یکتا اور منفرد رہی.. بلکہ تمام عظیم معبد اور محلات اور سائنسی ترقی حضرت موسیٰ کے بعد کے زمانوں میں ہوئی.. حضرت عیسیٰ بھی رومی تہذیب کے انحطاط کا سبب نہ بنے کہ اس کی جڑیں پہلے سے ہی کھوکھلی ہو چکی تھیں اور ان کا ورود نہ بھی ہوتا تو بھی اُس کا قدرتی زوال ناگزیر تھا.. اسی طور بازنطائن اور ایران کے بھی آخری دن آ چکے تھے اور ان کی تباہی کے ہم ذمہ دار نہ تھے.. ذرا یہ بھی تو غور کیجیے کہ ان مذاہب کے ظہور کے صدقے نسل انسانی کو کیسے کیسے شاندار زمانے نصیب ہوئے.. حضرت سلیمان اور حضرت داؤد ایسے بادشاہ نصیب ہوئے جو انسانوں کے علاوہ کل جہان کے پرندوں اور جانوروں پر حکمران کرتے تھے اور گولائتھ ایسے دیو کو ایک غلیل سے زیر کر لیتے تھے.. عہد حاضر میں دنیا بھر میں جو عجوبے ہوئے ہیں وہ عیسائیت کی کرشمہ گری ہے.. اور بقول آپ کے ہم لوگوں کے سارے گناہ صرف تہذیب اندلس کی بنیاد رکھنے پر ہی معاف کیے جا سکتے ہیں.. بنو امیہ' عباسی اور مغل ادوار بھی تو ہم لوگوں کے ہی تھے.. قرطبہ' بغداد' دمشق اور ٹمبکٹو.. دلّی.. بخارا. سمرقند.. کاشغر اور بصرہ آخر کس کے بسیرے تھے.. آپ آیا صوفیہ کا حوالہ دیتے ہیں تو مسجد قرطبہ اور تاج محل کا بھی تو شمار کر لیجیے..

سعید صاحب سر جھکائے نہایت تحمل سے میری باتیں سنتے رہے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے ''ایمان'' پر قائم تھے.. انہیں ورغلایا نہیں جا سکتا تھا..

میں فیصلہ نہ کر پایا کہ ہم دونوں میں سے کون بھٹکا ہوا ہے.. میں یا وہ.. اور اس مکالمے کے بعد کون اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہتا ہے.. وہ یا میں..

جب وہ اس گفتگو کے دوران متعدد بار ''آپ لوگ'' کہہ چکے اور میں نے پوچھ لیا کہ ہم مسلمانوں نے.. اور انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو میں نے پوچھا ''تو آپ مسلمان نہیں ہیں؟''

''میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا.'' یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے..

''تو پھر آپ مسلمان تو ہیں ناں..''

''یہ طے کرنا کیا ضروری ہے؟.. میں بر سرِ عام اقرار نہیں کرتا.. چپ رہتا ہوں کہ آپ لوگ ایک مختلف توجیہہ سن کر بھڑک اٹھتے ہیں اور ٹھنڈے دماغ سے جواب نہیں دیتے' خنجر اٹھا لیتے ہیں اور میرے جیسوں کو بقول آپ کے جہنم رسید کر کے خود جنت کا ٹکٹ کٹوا لیتے ہیں' شہید اور غازی کہلاتے ہیں.. آپ کے ساتھ میں نے یہ باتیں صرف اس لیے کر لی ہیں کہ آپ کی تحریروں کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ آپ میں اتنا حوصلہ اور فراخ دلی ہے کہ آپ مجھے سن لیں گے.. بھڑک کر مجھے ملاؤں کے حوالے نہیں کر دیں گے..''

سعید صاحب شاید تیس برس پیشتر ایک سرد شام کی سرد خاموشی میں میری دکان کے ادھ کھلے شٹر کے نیچے سے ہو کر اندر آئے تھے.. اور میں صرف ایک بار ان کے ہاں شرقپور کے راستے میں واقع ان کے نیم وحشی بسیرے پر گیا تھا اور اس کے بعد مجھے کچھ علم نہیں کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں.. اگر ہیں تو کہاں ہیں اور اگر فوت ہو چکے ہیں تو یقیناً وہ جہنم کی آگ کے سب سے زیادہ جلنے والے ایندھن ہوں گے اور اس ایندھن کو فرشتے گرز مار رہے ہوں گے..

اس گُرز مارنے سے یاد آیا کہ میری کوہ نوردیوں کے ایک نہایت ہی قریبی اور بہت عزیز ساتھی اور ایک نفیس انسان سے.. جن کا عقیدہ ذرا مختلف اور میری نظر میں بھٹکا ہوا تھا میں نے ایک شب سنولیک کی برفوں میں منجمد ہوتے ہوئے کہا تھا کہ یار تم اتنے نفیس شخص ہو اور مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ ہم لوگ تو براہ راست جنت میں چلے جائیں گے اور تمہیں فرشتے دوزخ میں ڈال کر گرز مار رہے ہوں گے.. تم اتنے اچھے انسان ہو کہ تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے لیکن تمہاری

برگشتگی کے باعث ہو گا.. تو وہ ساتھی کوہ نورد نہایت اطمینان اور گہرے یقین کے ساتھ کہنے لگا ''تارڑ صاحب.. یہ تو روزِ آخرت پتہ چلے گا کہ فرشتے کسے گرز مارتے ہیں۔ مجھے یا آپ کو..''

تو ہر شخص یہی یقین رکھتا ہے کہ گرز مجھے نہیں مجھ سے اختلاف رکھنے والے عقیدے کے شخص کو مارے جائیں گے..

میں نے ایک تیس برس پیشتر کی سردرات کا قصہ اگر آپ کو سنایا ہے اور اس کی تفصیل میں چلا گیا ہوں تو صرف اس لیے کہ ان قدیم تہذیبوں کی شانداری دیکھ کر مجھے وہ سعید صاحب بے طرح یاد آئے.. اپنے آپ کو ایک تابوت کے ڈھکن پر پہچانتے ہوئے.. قدیم بابل' نینوا' سمارا' ایران' یونان' روم کے نقش اور آثار دیکھتے ہوئے.. مجھے وہ سعید صاحب بہت یاد آئے.. جو میرا ایمان ہے کہ اگر فوت ہو چکے ہیں تو جہنم کے کسی بھڑکتے ہوئے گوشے میں اپنی سوچ کی پاداش میں جل رہے ہوں گے.. تو میں اُن جہانوں میں داخل ہوتا ہوں جو اُس سردیلی رات میں سعید صاحب نے بیان کیے تھے.. اور اُن کے زوال کا ذمہ دار مذہب کو ٹھہرایا تھا.. میں ان تہذیبوں کو ایک اُکتا دینے والی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہوں.. آپ پر لازمی نہیں کہ آپ یہ تفصیل دل پر جبر کر کے پڑھیں.. اگر آپ کو فنونِ لطیفہ اور تہذیب کے ارتقاء سے چنداں دلچسپی نہیں ہے تو بے شک بیزار ہو کر ورق پلٹتے جائیں.. اور جب یہ بیان اختتام کو پہنچے تب اطمینان کا سانس لیں..

یہ ایک.. میں اقرار کرتا ہوں.. ایک اُکتا دینے والی تفصیل ہے..

میٹرو پالٹن کے ٹکٹ کاؤنٹر سے اندر داخل ہوتے ہی آپ ایک بلند نیم بیضوی چھت تلے آ جاتے ہیں جہاں رومی اور یونانی زمانوں کے تراشیدہ متعدد پُرشکوہ اور شاندار مجسمے آویزاں ہیں.. وہ تو ظاہر ہے خاموش ہیں کچھ بیان نہیں کر سکتے البتہ میوزیم گائیڈ اُن کی تاریخ اور فنی باریکیوں کے بارے میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں.. یہاں نمائش شدہ نوادر. مجسموں' برتنوں اور مرتبانوں کی آسمانی خوبصورتی اور کاریگری کی تفصیل میں کیا جانا کہ آپ کی آنکھیں نہ صرف اُن عجائب کو دیکھتی ہیں بلکہ ان کے سامنے پوری یونانی دیومالا کے کردار بھی زندہ ہونے لگتے ہیں..

چلیے میں ان میں سے صرف دو مجسموں کا انتخاب کرتا ہوں جو کسی دیوتا یا شہنشاہ کے نہیں

بلکہ عام ہمارے جیسے گلیوں میں بھٹکنے والے لوگوں کے ہیں.. پہلا مجسمہ ایک بوڑھی اور ضعیف عورت کا ہے..ڈھائی ہزار پیشتر کے سکندریہ میں بھٹکنے والی بوڑھی عورت..تھکاوٹ اور ضُعف اس کی شباہت پر اور بدن میں ایسا کہ وہ جھکی جا رہی ہے.. ہاتھ میں تھامی ٹوکری میں کچھ سبزیاں اور چند مرغیاں ہیں جنہیں فروخت کرنے کی خاطر اسے منڈی میں جانا ہے اور وہ چل نہیں سکتی.. بے شک وہ تہذیب اعلیٰ اور ارفع تھی لیکن اس مجسّمے کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ تب بھی بندۂ مزدور کے اوقات سخت بہت تھے..

دوسرا مجسمہ ''پردہ پوش رقاصہ'' نام کا ہے..سیاہ پتھر سے تراشا ہوا ایک نسوانی بدن جو ایک چادر میں ڈھکا ہوا ہے سر سے پاؤں تک..روپوش ہے..اور اس چادر کی سلوٹیں گویا زندہ ہیں..حرکت میں ہیں..اُس کے اندر جو بدن ہے اُس کے ہر سانس سے چادر میں سلوٹ پڑتی ہے..اور اُس کے اندر جو روپوش بدن تحرک میں ہے وہ یوں چادر میں نمایاں ہو رہا ہے کہ کچھ دیر اپنی توجہ کو بھٹکنے نہ دیجیے اس سیاہ مجسّمے پر مرکوز رکھیے تو چادر اوجھل ہو جاتی ہے اور رقاصہ کا بل کھاتا بدن بے لباس آپ کے سامنے آ جاتا ہے..

رومی حصّے میں ایک اور حیرت منتظر تھی.. پومپی آئی کا شہر جو دسوویس کے آتش فشاں کے پھٹنے سے مکمل طور پر لاوے میں دفن ہو گیا تھا وہاں کی ایک شاہانہ رہائش گاہ کی ایک خوابگاہ اپنی اصلی حالت میں جوں کی توں موجود ہے اور آپ اس کے اندر داخل ہو سکتے ہیں.. پگھلے ہوئے لاوے نے اس خوابگاہ کو بھی بقیہ شہر کی مانند آگ کی قبر میں دفن کر دیا تھا..اور جب ہزاروں برس بعد اس شہر کی کھدائی کی گئی تو حیرت انگیز طور پر بالکل محفوظ تھی..

تو یہ خواب گاہ اپنی اصلی حالت میں پومپی آئی کی بجائے نیویارک شہر میں ہے.. دیواروں پر اُس عہد کی تصاویر آویزاں ہیں جن میں لوگ بھی ہیں اور شہر کی عمارتیں بھی..فرش کی تزئین موزیک کے ٹکڑوں سے کی گئی ہے اور یہ ایسا دلفریب نقش و نگار والا فرش ہے کہ اس پر قدم رکھنے سے گناہ ہوتا ہے..میں جب اس خواب گاہوں کی قدامت میں داخل ہوا تو یکسر تنہا تھا.. چونکہ یہ ایک نیم تاریک کونے میں قدرے پوشیدہ تھی اس لیے بیشتر سیاح اس کے وجود سے غافل آگے بڑھ جاتے تھے..اس کے اندر میں نے ایک سکوت ٹھہرا ہوا محسوس کیا جو آتش فشاں کے لاوے میں دفن ہونے کے بعد اس میں ہزاروں برس تک ٹھہرا رہا..سلگتی راکھ کی ایک مہک موجود تھی..

ایسی خواب گاہوں میں تا دیر ٹھہرنا مناسب نہیں ہوتا' کیا جانیے کب کوئی منتظر آتش فشاں پھٹ جائے اُور لاوا آپ کو بھی راکھ کر کے اس میں دفن کر دے..ویسے دفن کر دے تو آپ یوں گمنام تو نہ رہیں.. ہزاروں برس بعد کسی میٹرو پالٹن میوزیم میں اس خواب گاہ میں آپ کا سوختہ ڈھانچہ بھی آرام کرتا نمائش پر ہو کہ..یہ کوئی آوارہ گرد ادیب تھا..اس خواب گاہ میں زیادہ دیر ٹھہرا رہا..فرش کے نقش و نگار میں کھویا رہا اور یوں آتش فشاں کے پھٹنے کی آواز اور پومپی آئی کے لوگوں کی چیخ و پکار بھی نہ سن سکا اور بے خبر دفن ہو گیا..اس کے نام کا علم نہیں ہو سکا..سنا ہے بہت مشکل تھا..

ویسے میں نے اپنی آنکھوں سے دسوویس کے آتش فشاں کو پھٹتے دیکھا ہے..اُس کو لاوا اُگلتے دیکھا ہے..

رات کا وقت تھا..آس پاس کا سمندر اتھاہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا..ہمارا جہاز ''اکڈینیز'' سسلی کی تنگنائے میں سے گزر رہا تھا اور دونوں جانب مہیب چٹانوں کے سائے تھے..تب تاریکی میں سے ایک پہاڑ کی چوٹی سلگتی دکھائی دی اور پھر اُس کے اندر سے جیسے آتشیں انار پھوٹ رہے ہوں' لاوا بلند ہونے لگا.. جہاز پر سوار عرب مسافروں نے ''النار..النار'' کے نعرے لگائے..اس منظر میں ایک عجیب ہیبت تھی..سمندر میں ہولے ہولے سرکتا جہاز اور اُس کے عین اوپر گھپ اندھیرے کے سیاہ کینوس پر آگ کی بارش..آنکھوں کو خیرہ کرتی ہوئی پُھلجھڑیاں..کبھی وہاں بالکل تاریکی چھا جاتی..چپ ہو جاتی اور ایک مختصر وقفے کے بعد یکدم تاریکی کے پردے کو اناروں کی آگ روشن کرنے لگتی..اُبلتے ہوئے..آسمان کی جانب چھوٹتے ہوئے لاوے کی آگ روشنی پورے عرشے کو روشن کر دیتی..مسافروں کے چہرے دکھائی دینے لگتے..

یہ وہی دسوویس تھا جس نے اس خواب گاہ کو جس کے اندر میں تنہائی میں تھا اپنے لاوے میں ہزاروں برس پیشتر دفن کر دیا تھا

روم اور یونان کو میں نے شتابی سے فارغ کر دیا اور پھر اُس سیکشن کا سراغ لگایا جہاں اُن سے بھی کہیں قدیم تہذیبوں کے آثار تھے..ایسی تخلیقی حیرتیں نمائش پر تھیں جو پانچ چھ ہزار برس

پیشتر وجود میں آئی تھیں.. اور انہوں نے آج کی دنیا کے پس ماندہ علاقوں میں جنم لیا تھا.. ایران عراق' شام' ترکی اور دریائے سندھ کے کناروں پر پاکستان میں.. انہی خطوں نے انسانی تمدن کی اولین بنیاد رکھی تھی.. حروف تہجی.. مجسمہ سازی.. زراعت.. فن تعمیر اور وہ سب کچھ جو انسان کو ایک جانور سے ممتاز کرتا ہے اُسے اشرف المخلوقات بناتا ہے وہ سب کچھ انہی خطوں کے باسیوں کے معجزے تھے.. اور آج یہی خطے نفرت اور جنگ کا شکار ہیں.. مغرب کی جانب سے اکثر یہ آواز اٹھتی ہے کہ ہم اپنی تہذیب کا دفاع کر رہے ہیں.. ان لوگوں کو تہذیب سے روشناس کروا رہے ہیں.. یہ نیم وحشی لوگ جو جمہوریت سے واقف نہیں.. یہ دہشت گرد..

میرا خیال ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ آئندہ چند برسوں میں یورپ اور امریکہ کے عجائب گھروں میں.. شاید میٹرو پالٹن میوزیم میں بھی کچھ گرانقدر اضافے ہوں گے.. بابل شہر کے دروازوں میں سے کوئی ایک.. اُس کے معلّق باغوں کا کوئی ایک شجر.. کوئی چھ ہزار برس پرانا منقش مرتبان.. کوئی شراب کا شاہی جام.. نمرود کے محل کا کوئی ستون.. نینوا کا کوئی شاہانہ گھر.. ہارون الرشید کے عہد کے لبادے.. الف لیلٰے کی کوئی کہانی.. بنوامیہ کے کسی محل کی زیبائش آئندہ چند برسوں میں نمائش پر ہوں گے کہ امریکی حملے کے بعد بغداد کا بے مثال میوزیم لوٹ لیا گیا تھا.. امریکی فوج اس لوٹ مار کے خاموش تماشائی تھے.. وہ لوٹا گیا انسانی تہذیب کے ارتقاء کا امین خزانہ ابھی تک اوجھل ہے.. ذرا دھیرے دھیرے دس بیس برس بعد ظاہر ہوگا اور واپس بغداد نہ جائے گا.. یہیں کہیں مغرب یا امریکہ میں نمائش پر ہوگا..

اس قدیم ترین تہذیبوں کے سیکشن میں مجھے ایک گھڑے نے متوجہ کیا.. پانی کا ایک گھڑا کچی مٹی کا.. جو چھ ہزار برس پیشتر کسی سوہنی کمہارن نے بنایا تھا اور کہیں ایران کے قرب و جوار میں یا دریائے سندھ کے کناروں پر بنایا تھا.. اس کی مٹی کی رنگت وہی تھی جو آج بھی گجرات اور بہاولپور کے کمہاروں کے چاکوں سے اُترنے والے گھڑوں کی ہوتی ہے.. اُن پر نقش بھی ویسے ہی تھے جو ''بہاؤ'' کی پکلی اپنے گھڑوں پر ایک ٹہنی سے الیکتی تھی اور پاروشنی کے پنڈے پر بناتی تھی.. یہ طے ہے کہ اس گھڑے کے سہارے چھ ہزار برس قبل نہ کسی سوہنی نے اور نہ پاروشنی نے.. نہ چناب اور نہ سرسوتی پار کیا.. ورنہ یہ گھڑا آج نیویارک میں کاہے کو ہوتا.. ان دریاؤں میں گُھل چکا ہوتا..

دمکتے سونے کا ایک تین ہزار برس پرانا زریں جام.. جس پر سوہنے غزال چوکڑیاں بھرتے تھے.. اور ان کے سنہری سینگ جام سے باہر آتے تھے.. وہ کیسے لوگ تھے جو ایسے سنہری جاموں میں چھلکتی آگ کے گھونٹ بھرتے ہوں گے.. سخت پس ماندہ اور تہذیب سے بے بہرہ لوگ ہوں گے.. یہاں ایک ساسانی بادشاہ کا چاندی میں ڈھلا ہوا ڈھائی ہزار برس پیشتر ڈھالا ہوا ایک پر ہیبت ایسا مجسمہ ہے کہ اسے دیر تک دیکھیے تو سرنگوں ہونے کو جی چاہتا ہے.. اُس کے چہرے پر ایسا جلال اور ہیبت ہے..

ایک سُمیرین شخص کا مجسمہ ہے.. بڑی بڑی آنکھوں والا جو سُرمے کی کثرت سے سیاہ ہو رہی ہیں.. گھنگھریالے بالوں اور گھنی داڑھی والا اور یہ ابھی صرف پانچ ہزار سال پیشتر بغداد کے نواح میں اسمار کے مشہور زمانہ شہر میں زندگی بسر کرتا تھا..

ایک شیر ہے.. نمرود کے زمانوں کا.. سر انسان کا ہے.. پانچ ٹانگیں ہیں اور پَر پھیلائے کھڑا ہے جیسے پرواز کر جانے کو ہے.. کیا یہ نمرود کی خدائی تھی..

یہاں ایک پرندے کے سَر والا دیوتا بھی براجمان ہے جو پَر پھیلائے ہوئے ہے..
اگرچہ اسیریا کی حکمرانی اُن زمانوں میں کل تہذیب یافتہ دنیا پر تھی لیکن اُس کا مرکز شمالی عراق میں تیل کے شہر مسول کی قربت میں شہر نمرود تھا.. اور یہ دیوتا پرندہ نمرود شہر کے ایک شاہی محل کے باہر اسے بلاؤں سے محفوظ رکھنے کی خاطر پہرا دیا کرتا تھا..

اب یہاں نیویارک میں بیکار بیٹھا اُنگلیاں چٹخا رہا ہے.. یہاں اس کی دال نہیں گلتی کہ یہاں اُس سے بھی بڑے زرد شیطان کا راج ہے..

لیکن اس سیکشن میں بقول منیر نیازی.. جس نے میرے دل کو.. دد یا اُس شکل کو میں نے بھلایا نہیں.. تو وہ شکل بابل کے ایک شیر کی تھی جو بھولتی نہیں.. دُم سیدھی کیے دھاڑتا ہوا.. بڑی بڑی آنکھوں اور دانتوں کے ساتھ.. ایسی منقش اور خوش نظر نیلی اینٹوں سے بنا ہوا جو اپنے ملتان کی لگتی تھیں..

یہ ایک اُبھرواں کام تھا.. اینٹوں میں سے اُبھارا ہوا شیر کا نقش تھا.. اور یہ اُبھرواں نیلا شیر کہاں ہوا کرتا تھا؟

شہر بابل میں.. وہاں کے باسیوں کے لیے جو ایک تفریح گاہ تعمیر کی گئی تھی موج میلہ

کرنے کے لیے یہ اُس کے راستے میں آویزاں تھا.. اور اہم ترین دروازے ''اِشترگیٹ'' کے نواح میں تھا.. یہ ''اشترگیٹ'' نوتعمیر کردہ آج بھی برلن کے میوزیم میں سربلند ہے.. میں نے تب اسے نہیں دیکھا تھا اور جب اگلے برس جرمن حکومت نے مجھے پاکستانی نثر کی نمائندگی کے لیے خصوصی دعوت نامہ روانہ کیا اور میرے ناول ''راکھ'' کے کچھ باب جرمن زبان میں ترجمہ کر کے مجھے ایک محفل میں مدعو کیا تو برلن میں مدعو کیا اور تب میں نے یہ اشترگیٹ دیکھا.. اور اس کی بلندی اور صناعی نے عہد حاضر کی تہذیب کو حقیر کر کے رکھ دیا..

بابل کا شہر.. جہاں سکندراعظم ملتان کے آس پاس ایک قلعے کی دیوار پر چڑھتے ہوئے گھائل ہوا تھا اور وہ اسی گھاؤ کی تاب نہ لاتے ہوئے اس شہر میں آ کر دم توڑ گیا تھا اور وہیں کہیں دفن تھا.. اگرچہ روایت یہ بھی ہے کہ اسے کسی گمنام مقام پر دفن کیا گیا تھا.. استنبول کے ایک عجائب گھر میں سکندراعظم کا ایک تابوت میں نے بھی دیکھا ہے..

بابل.. قدیم ترین حکایتوں اور داستانوں کا شہر.. جہاں سے یہود نکالے گئے اور وہ آج بھی نیویارک میں ہوں یا تل ابیب میں اپنے بابل سے نکالے جانے کا نوحہ بیان کرتے ہیں۔ عیسائی حضرات ''بائی دے رِور آف بیبی لان'' کے گیت الاپتے ہیں اور ہم لوگ اس شہر کے سحر میں ایسے گرفتار ہیں کہ پنجاب کی بیٹیاں اپنے باپ کو بابل کے نام سے پکارتی ہیں.. بابل دا ویہڑا اور بابل کی گلیاں ہمارے لوک گیتوں کی گونج میں ہے.. اور ہم صرف بابل کو ہی نہیں نینوا کو بھی یاد کرتے ہیں.. یعنی بے ایمان تورے نینوا سندیا نہ آئے وغیرہ..

کہا جاتا تھا کہ بابل.. بے بی لان.. عراق کے صحراؤں کے کینوس پر سفید، سرخ، زرد اور خاص طور پر نیلے رنگوں کی ایک تصویر شہر تھا.. یہ رنگ اُن اینٹوں کے تھے جو نواح میں واقع بھٹوں میں پکائی جاتی تھیں اور پھر ان سے اس شہر بے مثال کے دروازے، گزرگاہیں اور معبد تعمیر کیے جاتے تھے.. انہی اینٹوں کی مصورانہ کاریگری سے وہ شیر اور مختلف جانور تخلیق کیے جاتے تھے جو دروازوں کی محرابوں میں سے اُبھرتے تھے.. یہ وہ شہر تھا جس نے انسان کو پڑھنا لکھنا سکھایا، مٹی کی تختیوں پر حروف تہجی ترتیب دے کر اولین کتابیں بنائیں اور ان کے لیے الگ کمرے مخصوص کیے جو کسی بھی کتب خانے کی پہلی شکل تھی..

ہزاروں برسوں سے اجڑ چکا بابل اب بھی اس میوزیم میں دھڑکتا اور تہذیب یافتہ

ہے.. کیا آج سے ہزاروں برس بعد آج کا نیویارک، لنڈن، پیرس یا ٹوکیو بھی کسی آئندہ کی تہذیب کے شہر میں کسی میٹروپالٹن میوزیم میں نمائش پر ہوگا اور اپنے دھڑکنے اور تہذیب یافتہ ہونے کی گواہی دے گا..

اور ان شہروں کے کھنڈروں سے کیا برآمد ہوگا.. اگر ان کے کھنڈر دریافت ہو گئے تو.. سوائے حرص، لالچ اور منافقت کے.. پیسے کی ہوس کے.. اور چند عمارتوں کے اور وہ بھی ایسی کہ محض دو جہازوں کے ٹکرانے سے منہدم ہو جائیں.. مشینوں کے، آلات کے.. اور کیا برآمد ہوگا.. کوئی لاہور کوئی پشاور بھی برآمد ہوگا.. تو کیا ان کے کھنڈروں سے نفرت اور تعصب کے.. اور چند زنگ آلود جہادی تلواروں کے.. کچھ اور بھی برآمد ہوگا.. البتہ یہ قوی امکان ہے کہ آئندہ زمانوں کے لوگ شاید ہڑپہ، موہنجوڈارو، مہرگڑھ، ٹیکسلا اور تخت بائی کے کھنڈروں کو دوبارہ دریافت کر لیں اور ہم انہی کے حوالے سے پہچانے جائیں اور ہماری کچھ عزت رہ جائے۔ البتہ وہ ایک مخمصے میں ضرور پڑ جائیں گے کہ ایسے حیرت بھرے شہر بسانے والے اور مجسموں کے لیے ایسا ذوق جمال رکھنے والے لوگوں کو بعد میں کیا ہوا.. درمیان کے ہزاروں برسوں میں یہ لوگ کیا کرتے رہے..

کیا وہ شخص سعید نام کا.. اگر اُس کا نام یہی تھا.. سچ کہتا تھا کہ مذہب نے ان تہذیبوں کو ملیامیٹ کر دیا اور اُس کے بدلے میں صرف نفرت اور تعصب کو فروغ دیا.. اور یوں ہم تاریکی میں چلے گئے.. اُسے کیا ضرورت تھی کہ ایک سرد رات میں دکان کے گرے ہوئے شٹر میں سے جھک کر اندر داخل ہو جاتا اور میرے طے شدہ نظریات کو ٹھیس پہنچا کر مجھے بھی برگشتہ کرنے کی کوشش کرتا.. شک شبے میں مبتلا کر دیتا.. کیا ضرورت تھی..

میرا ایمان ہے کہ وہ ایک بھٹکا ہوا شخص تھا اور اُسے یوں کھلے عام گھومنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے تھی تاکہ وہ معاشرے میں انتشار نہ پھیلا سکے۔ اس کا اصل گھر ذہنی امراض کا کوئی کلینک ہونا چاہیے تھا جہاں وہ دل کھول کر اس قسم کے پاگل پن کا اظہار کرے اور کسی کے نظریات پر اثر انداز نہ ہو.. اور اس کا اصل ٹھکانہ تو جہنم ہے لیکن شاید اس کی آگ بھی ایسی بے راہرو اور برگشتہ روح کو قبول کرنے سے انکاری ہو جائے..

تہذیب اور تاریخ دراصل جڑواں بہنیں ہیں جن کا آپس میں سوکنوں ایسا سلوک ہے اور وہ کبھی ایک دوسرے کو معاف نہیں کرتیں..

میں نے ابھی کچھ دیر پہلے پومپی آئی شہر میں لاوے میں دفن ہو جانے والی ایک ایسی رہائش گاہ کا تذکرہ کیا تھا جو اپنی اصلی حالت میں میٹرو میں موجود ہے..

صرف یہی ایک رہائش گاہ جوں کی توں موجود نہیں ہے.. مختلف قوموں اور تہذیبوں کے گھر. مکمل حالتوں میں.. آرائش اور زیبائش سمیت' آتشدانوں' فانوسوں اور مجسموں سمیت.. جیسے ان کے مکین ابھی کہیں باہر گئے ہیں واپس آئیں گے تو آپ کو اپنے گھر میں.. کسی ڈرائنگ روم میں.. صحن میں بیٹھا دیکھ کر حیران ہوں گے کہ یہ کون ہے جو بلا اجازت ادھر آ نکلا ہے.. مثلاً لانس ڈاؤن ہاؤس انگلستان کا پورا ڈائننگ روم.. میز پر نایاب کراکری سجی ہوئی.. پیرس کی ایک دکان کا بیرونی حصہ اور ہوٹل ڈی ٹسے کا گرینڈ سیلون' ہسپانوی گھر پاتیو کے باغ سمیت اطالیہ کے ایک ڈیوک کا گھر.. وینس کے ایک نواب کا نوابانہ بیڈروم.. ہسپانیہ کے ایک راہب خانے کا صحن.. دمشق کے کسی نورالدین کا عثمانی طرز کا گھر.. ایک مکمل جاپانی باغ اور ایک چینی صحن..

یہ چینی صحن.. سوچو کے شہر میں مچھلیوں کے جال بنانے والے ایک کاریگر کے گھر کا صحن ہے.. جس میں گل بوٹے بھی ہیں اور آپ اسے ایک باغ بھی کہہ سکتے ہیں.. اس کی چھتیں.. جالیاں.. پتھر اور سنگریزے یہاں تک کہ پودے بھی چین سے لائے گئے اور پھر چینی ہنرمندوں نے نیویارک آ کر اسے میٹرو کے ایک حصے میں تعمیر کیا.. اس چینی باغ کی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے کہ یہ امریکہ اور چین کے مابین سب سے پہلا ثقافتی تبادلہ تھا جو ان زمانوں میں ہوا جب امریکہ' چین کا سب سے بڑا دشمن تھا اور چین اسے ایک کاغذی شیر قرار دے کر طیش دلاتا رہتا تھا اور امریکہ کا نام لینے سے بھی ایک معزز چینی کی زبان ناپاک ہو جاتی تھی..

یہ چینی صحن بھی ایسا ہے کہ آپ اس کے امن اور خاموشی میں پہروں بیٹھ سکتے ہیں اور غور کریں تو گل بوٹوں اور سنگریزوں کی آوازیں سن سکتے ہیں..

ایک دیوار پر آویزاں اس پہلے ثقافتی تبادلے کی تفصیل ایک تختی پر کندہ ہے..

ہم تو ابھی ابھی نیویارک کے گھنے عمارتوں کے جنگل اور اس کے شہریوں کی یاجوج ماجوج میں سے اندر آئے تھے لیکن کسی بھی شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہاں لے آئیے تو پٹی کھولنے پر وہ کبھی فرانس میں ہوگا اور کبھی چین یا شام میں.. اسے آپ لاکھ تاویلیں دیں کہ آپ تو

نیویارک کے ایک میوزیم میں ہیں پر وہ کبھی نہیں مانے گا اور آپ کو فاترالعقل جانے گا.. یہ فرانس' چین اور جاپان اتنے حقیقی ہیں.. فرینک لائیڈ رائٹ جو یوں کہہ لیجیے کہ جدید فن تعمیر کا ایک پیغمبر مانا گیا اور جو نہ صرف عمارت کا نقشہ تخلیق کرتا تھا بلکہ اس کے اندر کی آرائش.. یہاں تک کہ اس کی میزوں پر رکھے جانے والے جرائد اور کتابیں بھی خود تجویز کرتا تھا.. اسی فرینک لائیڈ رائٹ نے منے سوٹا ریاست میں ایک رہائش گاہ ''لٹل ہاؤس'' کے نام سے ڈیزائن کی تھی جو کہ فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے.. اس رہائش گاہ کا لونگ روم بھی جوں کا توں میٹرو میں تخلیق کیا گیا ہے..

اس میوزیم نے جہاں مجھے اپنی زندگی کے سب سے پرکیف اور تخلیقی طور پر ہیجان خیز لمحوں سے سرشار کیا وہاں ایک لمحہ ایسا بھی آیا جس نے مجھے رنجیدہ بہت کیا..

میوزیم کا اسلامی نوادرات کا سیکشن از سرنو تعمیر ہو رہا تھا اور اس کی توسیع کی جا رہی تھی۔ اس کی نمائش عام ہونے میں ابھی کچھ ماہ باقی تھے.. یہ میرے لیے نیویارک اگلے برس واپس آنے کا کیسا معقول بہانہ ہو سکتا تھا..

میں نے اس بے مثال سرمائے کو اپنی آنکھوں سے تو نہ دیکھا صرف میٹرو میں نمائش شدہ نوادرات کے بارے میں جو ایک پانچ چھ سو صفحات پر مشتمل ایک دبیز کتاب ہے۔ اس میں شائع شدہ تصویروں کی صورت دیکھا.. اس میں سینکڑوں عجائبات درج ہیں اور میں ان میں سے صرف تین عجوبے بیان کروں گا..

ایک:۔ اصفہان کی کسی قدیم مسجد کی نیلی اینٹوں سے ترتیب شدہ ایک ایسی محراب جو آسمان سے اتری ہوئی لگتی تھی۔ اس کی نیلاہٹ میں ایسا کمال.. ایسا سحر تھا..

دوسرا:۔ بیجاپور کے کسی مصور کی ایک منی ایچر تصویر ''ایک صُوفی کی پورٹریٹ.. ایک افیونی سا شخص۔ کانوں میں بالے۔ بدن کے گرد اُون کا لبادہ کہ.. سُوف سے صُوفی.. ٹانگیں سمیٹے اور اس کی بے اعتنائی کے آگے ایک کشکول دھرا ہے جس پر ''یا محمدؐ.. بنی ہاشم کے سردار.. میں تجھ سے ہی درد کا طالب ہوں'' نقش ہے..

اور تیسرا عجوبہ بھی ایک مختصر ایرانی تصویر ہے.. ''پرندوں کا اجتماع'' اور یہ تصویر ظاہر ہے فریدالدین عطار کی کتاب ''منطق الطیر'' کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ کتاب میری حیات میں ایک

منشور کی حیثیت رکھتی ہے اور اس نے مجھے بہت بھٹکایا ہے. صراط مستقیم پر چلتے چلتے اکثر یوں بھٹکایا ہے کہ ذرا ادھر تو نظر کرو' یہ جو تاریک گلی ہے اس کے آخر میں کیا ہے' ذرا پتہ کرو اور یہ جو ایک الگ راستہ جدا ہوتا ہے تو ذرا کھوج کرو کہ یہ کہاں جاتا ہے' ذرا بھٹک جانے کے مزے بھی تو چکھو.. یوں میری تقریباً ہر تحریر میں.. ہر کتاب میں عطار کے پرندے اُڑتے ہوئے آجاتے ہیں اور میں جس راستے پر چل رہا ہوتا ہوں' وہ مجھے ورغلا کر کسی اور منزل کی جانب لے جاتے ہیں..

خاص طور پر میرا ناول ''پکھیرو' عطار کے ''منطق الطائر'' کا ایک پنجابی پرتو ہے.

''پرندوں کا اجتماع'' میری حیات کے منشور کی ترجمانی کرتی ہے. یہ تصویر مصور بہزاد کی روایت کی پیروی میں تخلیق کی گئی ہے.. بہزاد جو آج سے چھ سو برس پیشتر ہرات میں ایسی تصویریں بنا رہا تھا جن کی نزاکت اور تفصیل بے مثل تھی.. اگرچہ اس نے ''تیمور نامہ'' بھی مصور کیا لیکن وہ عام طور پر درباری اور شہنشاہی مناظر کی بجائے عام لوگوں اور قدرتی مناظر کی تصویریں زیادہ پرشوق ہو کر بناتا تھا.. پرندوں کے اجتماع والی یہ تصویر شاہ عباس کے عہد میں حبیب اللہ نامی مصور نے اپنے مرشد بہزاد کے رنگ میں بنائی اور کیا خوب بنائی. عطار کے پرندے روحانی جستجو میں.. سچ کے متلاشی انسان کی نمائندگی کرتے ہوئے.. پروردگار تک پہنچنے کے راستے تلاش کرنے والے.. انواع و اقسام کے رنگا رنگ پرندے.. مور.. طوطے.. نیل کنٹھ.. سارس.. مرغابیاں.. کبوتر.. سب کے سب ایک چٹان پر براجمان تاجدار نامی پرندے کی گفتگو ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے ہیں' روایت کے مطابق یہ پرندہ مافوق الفطرت علوم سے آشنا ہے.. عطار کی کتاب میں اسے ''سی مُرغ'' کا نام دیا گیا ہے.. ایک اور روایت کے مطابق رسول اللہؐ نے اس پرندے کے شکار کی ممانعت فرمائی ہے..

اب مجھے امتحانوں کے بارے میں کچھ کہنا ہے..

دو امتحانوں کے بارے میں..

ایک تو یہ کہ اس طولانی اور تخلیقی تفصیل نے آپ کو بور کر کے آپ کے صبر کا جو امتحان لیا ہے.. اس کے لیے معذرت خواہ ہوں.. یہ اُنہی پڑھنے والوں کے لیے ہے جنہوں نے میرا کچھ لحاظ کیا اور ٹھہر گئے ورنہ مجھے یقین ہے کہ بیشتر تو یہ اوراق پلٹ کر کہیں آگے جا چکے ہوں گے.. مجھے ان سے بھی کچھ شکایت نہیں' اُن کی جگہ اگر میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا..

اور دوسرا امتحان وہ والا ہے جس میں ایک پرجوش طالب علم پرچہ سامنے رکھ کر نہایت ہی تفصیل سے سوالوں کے جواب لکھنا شروع کر دیتا ہے اور جب ممتحن اعلان کرتا ہے کہ صرف دس منٹ باقی رہ گئے ہیں تو وہ اپنی مگن کیفیت میں سے ہڑبڑا کر باہر آجاتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ تو ابھی تک دس سوالوں میں سے صرف دو تین کے جوابات لکھ سکا ہے. چنانچہ وہ ہراساں ہو کر بقیہ سوالوں کے جواب نہایت مختصر کرتا چلا جاتا ہے تاکہ فیل ہو جانے سے بچ جائے..

مجھے ابھی ابھی احساس ہوا ہے کہ میں بھی چند نوادرات کی بے جا تفصیل میں مگن ہو گیا اور بہت سا وقت ضائع کر دیا. تو میں فیل ہونے کے ڈر سے اپنے بقیہ جواب مختصر کرتا ہوں.. صرف چیدہ چیدہ تصاویر اور نوادرات کا تذکرہ اور وہ بھی مختصر کروں گا..

یورپی شاہکاروں میں ہسپانیہ کے مصور اَل گریکو کی سب سے شہرت یافتہ تصویر ''شہر ٹولیڈو کا منظر'' بھی یہاں نمائش پر ہے.. میں اس تصویر میں پینٹ کیے ہوئے اُس پُل کو شناخت کر سکتا تھا جو عربوں نے دریائے تاگوس پر تعمیر کیا تھا اور آج تک موجود ہے..

یہاں گویا.. ولاسکوئز.. مُریلو کی نمائندگی بھی بھرپور ہے اور روبنز بھی ہے جس کی عورتوں کے بدن ضرورت سے زیادہ بھرے بھرے اور شہوت انگیز ہوتے ہیں..

انگریز مصوروں میں سے جان کانسٹیبل اور ٹرنر اپنے کلاسیکی انداز کے زمینی مناظر یعنی لینڈ سکیپس کے ساتھ موجود ہیں..

آپ چلتے چلتے کوربٹ کی تصویر ''عورت ایک طوطے کے ساتھ'' دیکھ کر ٹھٹک جاتے ہیں کہ کیا ہی خوش بخت طوطا ہے جو ایک نہایت آسودہ برہنہ دودھیا بدن عورت کی اُنگلیوں پر پھڑ پھڑا رہا ہے.. کاش ہم بھی طوطے ہوتے..

فرانسیسی مصور ڈیگاس کی پہچان نوخیز بیلے رقاصائیں ہیں اور وہ اس میوزیم میں بھی اپنی نزاکت اور کوملتا کے ساتھ آپ کے سامنے آتی ہیں..

سیزان کی مشہور تصویر ''تاش کھیلنے والے'' بھی آپ کو روکتی ہے..

فرانس ہی کا مانے بھی.. اور مونے بھی.. جو دونوں مانے ہوئے مصوّر ہیں اور لینڈ سکیپ کو رنگوں میں زندہ کرنے پر قادر ہیں..

اور اب جگر تھام کے بیٹھو کہ میری باری آئی.. ونسنٹ فان گوگ..

ایک ایسا مصور ہے جس کی تصویروں نے اوائل عمری میں ہی میرے بدن کے کنوار پن میں خواہشوں کے عجیب فتور بھر دیئے تھے.. اب بھی میرا من پسند مصور جو مصور نہ تھا دراصل ایک رنگ ریز تھا کہ جو آنکھ بھی اُس کی تصویر پر ٹھہری رنگی گئی.. ایمسٹرڈیم کے فان گوگ میوزیم کے بعد.. ایک مدت گزر گئی اور آج پھر میں اُس کی تصویروں کو دیکھتا تھا تو ایک ہیجان میں مبتلا ہوتا تھا.. اُس کا پاگل پن مجھ پر اثر کرتا تھا..

یہاں اُس کی سیلف پورٹریٹ ہے تنکوں کے ہیٹ کے ساتھ..

وہ اپنے عزیز بھائی لیو کو... فان گوگ اور لیو میں جو اُلفت اور شدید وابستگی کا رشتہ تھا وہ سراسر مشرقی مزاج کا تھا.. وہ اُسے کہتا تھا... تمہیں پتہ ہے کہ میں عظیم الشان کلیساؤں کو پینٹ کرنے کی بجائے عام لوگوں کی آنکھیں پینٹ کرنا پسند کرتا ہوں.. کیونکہ آنکھوں میں کچھ ایسا ہے جو کلیساؤں میں نہیں ہوتا.. بے شک کلیسا نہایت رعب دار اور گھمبیر ہوتے ہیں.. لیکن ایک انسان کی روح.. بے شک وہ ایک گلیوں میں دربدر ہونے والے مفلس انسان کی روح ہو... ایک کلیسا سے زیادہ اہم ہوتی ہے..

فان گوگ کی یہ پورٹریٹ تنکوں کے ہیٹ والی کسی دیوار پر آویزاں نہ تھی بلکہ ہال کے درمیان میں ایک سٹینڈ پر ایستادہ تھی صرف اس لیے کہ اسی کینوس کی پشت پر اس نے ایک اور تصویر بھی پینٹ کر دی تھی..

فان گوگ ایسا حیرت ناک مصور ہے کہ اس نے زمینی مناظر کو کانسٹیبل اور ٹرنر کی مانند حقیقت کے قریب جوں کا توں پینٹ نہیں کیا بلکہ ان میں اپنے پاگل پن کے خواب بھر دیئے.. ''سرو کے درخت'' ایک ایسی ہی تصویر ہے.. اس میں یہ شجر کیسے گنجلک اور آپس میں گتھے ہوئے اور ہوا میں مخمور سیاہ ہریاول سے نچڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں.. اُن پر جو آسمان ہے وہ بھی کیسا متحرک گھمسن گھیریاں کھاتا ہوا نیلا اور سفید آسمان ہے.. یہ تصویر اس نے 1889ء میں پینٹ کی تھی جب کہ وہ اپنی مرضی سے سینٹ ریمے کے پاگل خانے میں داخل ہو چکا تھا..

ایک پاگل اور وہ بھی فان گوگ ایسا پاگل سرو کے درختوں کو کیسے ویسا ہی دیکھ سکتا ہے جیسا کہ ہم جیسے عام لوگ دیکھتے ہیں..

ہم تو سرو کو سرو وسمن یا سرو قد کے حوالے سے ہی دیکھ سکتے ہیں..

وہ لیو سے ان سرو کے درختوں کے بارے میں کہتا ہے ''تیز دھوپ سے سلگتے ہوئے ایک منظر میں یہ سرو مجھے سیاہ رنگ کی ایک بوچھاڑ دکھائی دیئے اور ذرا غور کرنا کہ یہ سیاہی ایسی ہے کہ اسے کینوس پر اتارنا نہایت ہی مشکل ہے۔''

سن ساٹھ کی دہائی میں جب ہر نوعیت کی کتابیں دن رات پڑھنے کا جنون ایک مرض کی صورت اختیار کر گیا تھا.. اور ضخیم ترین کتابیں پڑھنا مقصد حیات صرف اس لیے ہو گیا تھا تا کہ دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر تکبر کیا جا سکے کہ اچھا.. مارکس کی ''داس کیپیٹل'' کارلائل کی ''فرنچ ریولوشن''.. اور ہاں نطشے کی ''دس سپوک زرتشتا''.. اور وہ جو صرف دس جلدوں پر محیط فریزر کی ''گولڈن باؤ'' یا ایڈورڈ گبن کی آٹھ جلدوں والی ''ڈیکلائن اینڈ فال آف دے رومن ایمپائر'' ہے تو یار کیا ہے ابھی کل شام ہی تو ختم کی ہے.. اور اب عمر کی شام ہو رہی ہے تو یہ اعتراف کرنے میں کچھ حرج نہیں کہ ان کتابوں کا بیشتر حصہ سر پر سے گزر گیا.. بہت کم پلے پڑا.. پر جتنا بھی پڑھا آئندہ حیات میں بہت کام آیا..

اُن دنوں مصوروں کی حیات پر مبنی ناول نما تحریریں مجھے بہت ہی اشتیاق آور کرتی تھی.. ان میں فان گوگ کی ''لسٹ فار لائف'' سرفہرست تھی.. مائیکل انجلو کو میں نے ''ایگونی اینڈ ایکسٹسی'' کے حوالے سے جانا... پال گوگین کو سمرسیٹ ماہم کے ناول ''مون اینڈ سکس پنس'' سے پہچانا.. میرے لیے ایک نسبتاً کم معروف اپاہج فرانسیسی مصور ہنری تولوس لاٹرک کی زندگی کی تصویریں جو ''مالن رُوژ'' میں دکھائی گئی تھیں، مجھے انہوں نے بھی متاثر کیا..

لاٹرک.. بنیادی طور پر طوائفوں کا مصور تھا کہ اُس کی حیات کا بیشتر حصہ انہی بدنام عورتوں کی قربت میں گزرا.. اگرچہ اُس کی شہرت کا سبب وہ عام سے پوسٹر بھی ہیں جو اُس نے مختلف نائٹ کلبوں اور قہوہ خانوں کی تشہیر کے لیے بنائے..

یہاں.. میٹروپالٹن میں اُس کی ایک تصویر ''صوفہ'' نام کی ہے..

دو بدن فروش ایک صوفے پر نیم دراز گپ لگا رہی ہیں.. اس تصویر میں عورت کے بدن کی کچھ کشش نہیں ہے بلکہ ایک گناہ بھری اداسی ہے.. ایک بے روح اور بے رنگ زندگی کی ترجمانی ہے.. اور یہ دل کو چھو لیتی ہے..

اپنے پاکستان میں اقبال حسین بھی دراصل لاٹرک کا ایک روحانی شاگرد ہے..اس کے تتبع میں پینٹ کرتا ہے..اور ہیرا منڈی کی طوائفوں اور رقاصاؤں کو کینوس پر اس انداز میں اُتارتا ہے کہ وہ دکھ اور سوگواری اور بدنصیبی کی تصویریں لگتی ہیں..اُنہیں ہیجان خیز اور شہوت کی پُتلیاں نہیں بناتا اور لاٹرک سے برعکس یہ اس کا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ خود ان میں سے ہے..وہ اس کی اپنی خالائیں..پھوپھیاں اور بہنیں ہیں..چنانچہ کہیں کہیں وہ لاٹرک سے زیادہ مؤثر دکھائی دیتا ہے..البتہ کبھی کبھی یہ تاثر بھی صرف ایک لمحے کے لیے اُبھرتا ہے کہ وہ شہرت کی خاطر..اُن کا..اپنے عزیزوں کا..استحصال کرتا ہے جو پہلے سے ہی استحصال کی گرفت میں ہیں..

جونہی ذہن میں تخریب کاری..بدن کو بخیوں میں اُدھیڑ کر ناک کہیں' کان کہیں کا تصور ذہن میں آتا ہے..ماڈرن آرٹ کا خیال آتا ہے تو صرف پکاسو کا خیال آتا ہے..پکاسو یونہی بے راہرو نہیں ہو گیا تھا..

وہ زندگی کے ابتدائی ایام میں ایک صراط مستقیم پر چلا تھا..میں نے اپنی آنکھوں سے بارسلونا کے شہر میں پکاسو کی بنائی ہوئی وہ پورٹریٹس دیکھی ہیں جو کلاسیکی انداز میں کاملیت کے درجے پر فائز ہیں..لیکن پھر وہ بھٹک جاتا ہے..بے راہرو ہو جاتا ہے..کوئی ’’بلو پیریڈ‘‘ آ جاتا ہے اور وہ روایتی مصوری سے بغاوت کر کے اشیاء کو اُن کی ظاہری شکل میں پینٹ کرنے کی بجائے اپنی مرضی سے شکلیں تشکیل کرنے لگتا ہے..

لیکن یہ تو پکاسو کا ایک عمومی اور روایتی تصور ہے..کہ اُس کے تجریدی شاہکار سمجھ میں نہیں آتے..

میٹرو میں آویزاں ایک ایسی تصویر ہے جس کے دُکھ اور رنج کو ایک ان پڑھ فقیر بھی جان سکتا ہے..اور اس تصویر کا نام ہے ’’ایک نابینا شخص کا کھانا‘‘..

1903ء میں پینٹ کی گئی یہ تصویر غربت اور مایوسی کا ایک ایسا نقش ہے جو دیکھنے والوں کے دل پر ثبت ہو جاتا ہے..ایک اندھا آدمی...ایک ہاتھ میں ایک باسی ڈبل روٹی اور دوسرے ہاتھ میں ایک جگ..اور وہ آدمی اس روٹی کے ٹٹولتے ہوئے اُس جگ کو چھوتے ہوئے یہ جاننے کی سعی کر رہا ہے کہ وہ کیسے ان دونوں میں توازن قائم رکھ کر کھانا کھا سکتا ہے..اُس کے آگے میز پر ایک خالی برتن دھرا ہے..اُس شخص کی انگلیاں ٹٹولتی ہوئی لگتی ہیں..اندھی لگتی ہیں...یہ کیا کمال ہے

کہ نابینائی کو ایک بینا رنگوں کے چھینٹوں سے کینوس پر نمایاں کر دے..

پکاسو کی بنائی ہوئی..جسے میں بہت بار آرٹ کے جرائد میں دیکھ چکا تھا..امریکی مصنفہ گرٹ روڈ سٹین کی کسی حد تک بدشکل اور بے چین کر دینے والی پورٹریٹ ہے..سٹین پیرس کی سوسائٹی میں نئے مصوروں اور ادیبوں کے لیے ایک ہمدرد اور رہنما شخصیت تھی..ہمینگوے کے سفرنامے ’’اے موو ایبل فیسٹ‘‘ میں سٹین کا بہت ذکر ہے..جب یہ پورٹریٹ پینٹ کی گئی تو اس کی عمر صرف بتیس برس تھی لیکن پورٹریٹ میں خاصی عمر رسیدہ اور بدشکل لگتی تھی..بلکہ اُس کی مشابہت بھی واجبی سی تھی تو پکاسو سے پوچھا گیا تھا کہ..یہ تو سٹین نہیں لگتی تو اُس نے مسکرا کر کہا تھا..وہ لگے گی بالآخر!

پکاسو کے بعد تصویر میں تجرید بہت آگے چلی گئی..وہ تو پھر ناک' منہ یا آنکھیں وغیرہ بنا دیتا تھا چاہے وہ انہیں اپنے مقام کی بجائے اپنی مرضی کے مطابق کہیں بھی بنا دیتا تھا لیکن اس کے بعد جو ماڈرن مصور آئے انہوں نے اتنا تکلف کرنا بھی چھوڑ دیا..اور اس کے باوجود اُن کی تصویروں میں اثر انگیزی ہے' خاص طور پر کانڈنسکی۔ پولاک۔ گورکی۔ کوننگ اور پال کلی کے کینوس حیرت سے بھرے ہیں..ہنری مور کے مجسمے بھی اسی قبیل کے ہیں..

میں یہاں ہنری روسو کی عجیب وغریب غیر قدرتی مگر پُرکشش تصویروں کا ضرور ذکر کروں گا..ایک ایسا زمانہ آیا کہ پیرس کے مصوروں کو گل بوٹے پینٹ کرنے کا خبط ہو گیا..وہ شہر کے نباتاتی باغوں میں جا کر خاص طور پر مشرقی پھولوں' بوٹوں اور پتوں کی بناوٹ اور رنگوں پر غور کرتے اور پھر انہیں اپنی تصویروں کا حصّہ بناتے..رُوسو کی بیشتر تصاویر ایسی ہی جنگل کہانیاں ہیں جن میں اجنبی اور نامانوس پھول کھلتے ہیں..اور ان کا حجم اور بناوٹ مصور کے موڈ کے مطابق کسی بھی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں..اس کی تصویر ’’ایک شیر‘‘ میں بھی ایک عجیب جادوئی جنگل ہے جس کے درمیان میں ایک بہت بڑا نیلے رنگ کا پھول کھلا ہے اور ایک شیر ایک چیتے کو ہڑپ کر رہا ہے..

یہاں میٹرو میں بھی دنیا بھر کے عجائب گھروں کی مانند سیاحوں کو کنگال کر دینے کی خاطر ایک وسیع سووینئر شاپ ہے جہاں اس میوزیم سے متعلق سینکڑوں یادگاری اشیاء فروخت ہوتی ہیں..ان میں شاہکار تصویروں کے پرنٹ' کیلنڈر' پوسٹ کارڈ' مجسّمے' کی رنگ' بیگ اور جانے کیا کیا شامل ہے..سیّاح بے چارے میوزیم میں ایک دن گزار کر ذرا مخبوط الحواس ہو چکے ہوتے ہیں

اور دیکھے گئے شاہکاروں کے سحر میں ہوتے ہیں اور اس شاپ میں داخل ہو کر اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں تا کہ وہ اِس دن کو گھر جا کر یاد کر سکیں.. ان سووینئرز کو اپنے ڈرائنگ روم میں سجائیں اور پرنٹس کو فریم کروا کے دیواروں پر آویزاں کر کے انہیں دیکھیں اور ہر دوست اور عزیز کو ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہیں ''تمہیں پتہ ہے میں میٹرو میں تھا.. میں نے یہ تصویر اپنی اوریجنل حالت میں ان آنکھوں سے دیکھی ہے..''

میں نے بھی اپنے قلیل ڈالروں کا حساب کتاب کر کے چند تصاویر کے پرنٹ خریدے جو خاصے مہنگے تھے.. جتنی قیمت ان تصاویر کی اوریجنل حالت میں لگی تھی اگر لگی تھی تو.. اس سے کہیں زیادہ قیمت میں آج اُن کے پرنٹ فروخت ہو رہے تھے..

میں نے پانچ سات پرنٹ خریدے اور ان میں سے ایک روسو کی تصویر ''خواب'' تھی' میں نے اس خواب کا چناؤ ہی کیوں کیا' یہ میرا خواب تو نہ تھا.. اول تو مجھے سرے سے خواب آتے ہی نہیں اگر آتے ہیں تو عجیب اوٹ پٹانگ خواب آتے ہیں.. شرمناک خواب بھی آتے ہیں اور صبح تک وہ بھول جاتا ہوں..

یہ ''خواب'' کسی اور شخص کا خواب ہے اور میری خواہش ہے کہ یہ میرا خواب ہو سکتا..

ایک جنگل ہے وہم و گمان کا' اتنا گھنا اور بھرا ہوا کہ آسمان کی نیلاہٹ کہیں کہیں اس کے چرواں پتوں میں سے جھلکتی ہے اور ایک سورج سا ہے ہریاول میں گھرا ہوا وہ چاند بھی ہو سکتا ہے.. جو پھول کھلے ہیں اور جو پتے ہیں جانے کس کائنات کے ہیں اور سیاہ سحر انگیز گوشے ہیں جن کا حقیقت سے کچھ لگاؤ نہیں کہ یہ سب رُوسو کے ذہن کے جنگل میں کھلے ہیں.. جھاڑیوں اور درختوں کی گھناوٹ میں سے کچھ شکلیں جھانکتی ہیں.. دو شیر ہیں حیرت زدہ.. ایک آنکھ ہے.. ایک پرندہ ہے.. اور ایک دیوان پر نیم دراز ایک عورت ہے جسے وہ شیر.. وہ آنکھ.. وہ پرندہ اور جنگل کے گل بوٹے تک رہے ہیں... یہ ایک ایسی تصویر ہے جسے سامنے رکھ کر اس کے اندر اُتر کر ایک خوابناک' غیر حقیقی' بے وجہ اور لاحاصل قسم کا ناول لکھنے کی خواہش بدن میں اُبھرتی ہے..

وان گوگ کی ''زیتون کا درخت'' کے علاوہ گوگین کی ''چاند اور دنیا'' کا پرنٹ بھی میں نے حاصل کیا.. تاہیٹی کے جزیرے میں ایک مقامی عورت بالوں میں پھول سجائے ایک باریش مرد کو دیکھ رہی ہے.. اس کی پشت کچھ زیادہ ہی بھاری ہے' ناک بھی پھیلی ہوئی ہے اور اُس میں نسوانی

کشش نام کو بھی نہیں..

اور چوتھا پرنٹ میں نے اس تصویر کا حاصل کیا جسے میں نے آج سے شاید پچاس برس پیشتر دیکھا اور امریکی مصوری کا نہ صرف قائل ہوا بلکہ مداح ہو گیا.. یہ تصویر اینڈریو وائتھ کی ''کرسٹینا کی دنیا'' تھی.. اُن دنوں کے ایک ڈاکٹر دوست مصوری سے شغف رکھتے تھے اور انہوں نے جب مجھے اپنی تازہ ترین تصویر دکھائی تو میں نے کہا کہ اس میں جو گھاس تم نے پینٹ کی ہے لگتا ہے کہ وہ ''کرسٹینا کی دنیا'' میں جو گھاس ہے اُس کے قریب ہے.. تو اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں کہ کیا میرے بُرش میں وہ کمال ہے کہ میں اینڈریو وائتھ کے بُرش کے کمال کی قربت میں ہو جاؤں..

اور میرے لیے یہاں ایک دکھ دینے والا حیرت کا سامان منتظر تھا..

میٹرو کی پونے پانچ سو صفحات پر محیط گائڈ بک میں کہیں بھی نہ اس مصوّر کا اور نہ اس کی تصویر کا ذکر تھا.. یہاں تک کہ میوزیم کے کمروں میں تعینات محافظ جو رہنمائی بھی کرتے ہیں' اُن میں سے کسی ایک کو بھی اس مصور کے نام سے واقفیت نہ تھی..

''کرسٹینا کی دنیا'' کیا ہے؟..

ایک خزاں رسیدہ پیلی گھاس بھرا ڈھلواں میدان ہے اور ایک اپاہج لڑکی کرسٹینا گھاس پر گری ہوئی.. گھسٹتی ہوئی.. میدان کے آخر میں دکھائی دیتے پرانے چوبی فارم ہاؤس تک پہنچنے کی اذیت ناک کوشش میں مگن.. اُس کے ہاتھ بھی اُس کے اپاہج پن کو نمایاں کرتے ہیں کہ وہ گھاس پر بے جان زور لگاتے ہیں.. اُس کے بازوؤں میں بھی کچھ سکت نہیں.. لیکن اُس کے مہاندرے پر اذیت نہیں اطمینان ہے اور وہ ہمت نہیں ہار رہی.. اپنے بدن کو گھسیٹتے ہوئے اپنے گھر کی جانب بڑھنے کی سعی کر رہی ہے..

اس تصویر میں جہاں مجھے اس لڑکی کرسٹینا کی بے چارگی اور بے بسی نے متاثر کیا وہاں اس میدان کی گھاس کی پتیوں نے مجھے اس مصوّر کا معترف کیا..

کیا یہ امر حیرت ناک نہیں ہے کہ نہ اس تصویر کا اور نہ اس کے مصوّر کا.. کچھ تذکرہ نہیں ہوتا.. میٹرو کی ضخیم گائیڈ بک میں بھی نہیں..

بالآخر متعدد لوگوں کے انکار سن کر میوزیم کے ایک رکھوالے نے اثبات میں سر ہلایا ''تم کرسٹینا

کی دنیا دیکھنا چاہتے ہو.. سیدھے چلے جاؤ.. بائیں ہاتھ پر جو گیلری ہے وہاں یہ دوسری تصویر ہے۔''

''کرسٹیناز ورلڈ'' کو دیکھنے کے لیے بہت کم لوگ ٹھہرتے تھے.. بس دیکھتے تھے اور گزر جاتے تھے.. میں اس کے سامنے کھڑا ہوا اسے کچھ دیر دیکھا تو میری آنکھوں میں نمی آنے لگی.. اور یہ نمی اس عمر میں آنے لگتی ہے.. فان گوگ کی ''ستاروں بھری رات'' دیکھ کر ''نکول کِڈ مین کو ورجینیا وولف کے روپ میں'' دے آورز'' میں دیکھ کر.. ماں باپ کی قبروں کو دیکھ کر.. دُھند میں سے جھانکتے سورج کے زرد تھال کو صبح کی سیر کے بعد پارک میں دیکھ کر.. کسی دل میں کسک بھر جانے والے چہرے کو دیکھ کر.. اپنی بیٹی کی ٹیلی فون پر آواز سُن کر.. اپنی پوتی کی مسکراہٹ دیکھ کر.. کوئی ایسا فقرہ لکھ کر جو اپنا لکھا ہوا نہیں لگتا اور روضۂ رسولؐ کا سبز گنبد دیکھ کر.. یہ نمی آنکھوں میں آنے لگتی ہے..

اکثر پڑھتے تھے کہ فلاں شاعر' بزرگ.. علامہ اقبال آخری عمر میں بہت رقیق القلب ہو گئے تھے' روتے بہت تھے.. تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اچھے بھلے سیانے بیانے لوگ بے وقوفوں اور بچوں کی مانند آخری عمر میں روتے کیوں ہیں.. اب جا کر احساس ہوا ہے کہ آنکھوں میں نمی آ جانے کے بعد اگلا مرحلہ رونے دھونے کا ہے..

چلیے چھوڑیئے اس المناک اور غمناک صورتِ حال سے گریز کرتے ہوئے ذرا فحاشی اور عریانی کے تذکروں سے زندگی کو رنگین کرتے ہیں..

وطن واپسی پر جب میمونہ نے میرے سامان میں سے شاہکار تصاویر کے پرنٹ برآمد کیے تو لاحول پڑھ کر کہنے لگی.. یہ کیا ننگی ننگی عورتوں کی تصاویر لے کر آ گئے ہو.. اس گھر میں لگاؤ گے.. بچے کیا کہیں گے کہ والد صاحب کی پسند اتنی فحش ہے۔''

اور مجھے واقعی پہلی بار احساس ہوا کہ رُوسو کے ''خواب'' میں اور گوگین کی ''چاند اور زمین'' میں جو عورتیں ہیں' بے لباس ہیں..

میں ایک اچھے اور مطیع خاوند کی مانند کھسیانا ہو کر مسکرا دیا اور چپ رہا..

اگر کہہ سکتا تو یہی کہتا کہ بھلی مانس تم کیا جانو کہ میں تمہارے اور اس معاشرے کے ڈر سے کیسی کیسی ننگی عورتیں چھوڑ آیا ہوں.. اس ڈر کی وجہ سے میں میگا ڈلنی کی سرخی میں نہائی ہوئی وہ نیوڈ چھوڑ آیا ہوں جس پر سے پاکیزہ ترین نظر بھی نہیں ہٹتی.. وہ مصوری کی تاریخ میں سب سے مؤثر ننگی عورت ہے.. ایک اور تصویر تھی.. سمندر کی لہروں پر کروٹیں بدلتی دودھیا بدن کی.. ایسی عورت

جس پر ننھے منے معصوم فرشتے فریفتہ اور نچھاور ہو رہے تھے اور وہ فوری طور پر جوان ہو جانا چاہتے تھے.. اور تم نہیں جانتیں کہ اگرچہ ایک شاہکار لیکن اس برانگیختہ کرنے والی برہنہ عورت کے متناسب بدن کو میں نے پہلے بھی کبھی دیکھا تھا..

وصال کے خمار میں.. ایسے اسی انداز میں کسی بستر میں نہیں اپنے عزیز از جان دوست خالد بشیر تارڑ کے غسل خانہ میں دیکھا تھا.. ہاں میمونہ' ایک غسل خانے میں.. اور جب میں نے میٹرو پالٹن میوزیم میں روڈین کے ایک مجسمے کے عقب میں دیوار پر آویزاں یکدم اپنی آنکھوں کے سامنے اصل حالت میں اسے دیکھا تو میرا پہلا ردعمل یہی تھا کہ میں خالد بشیر کے غسل خانے میں چلا آیا ہوں.. تو میں اس تصویر کا پرنٹ بھی نہیں لایا تمہارے اور معاشرے کے ڈر سے..

اور مجھے اس شوق برہنگی کے لیے نیویارک بھی نہ جانا پڑتا اگر ڈر نہ ہوتا.. یہیں لاہور میں سعید اختر کی وہ لاجواب نیوڈ ہے ایک عورت کی دلآویز پشت ہے جسے وہ اپنے زہد اور نمازوں سے چھپاتا پھرتا ہے اور میں اس نیوڈ کو آسانی سے حاصل کر سکتا تھا.. کالن ڈیوڈ کا تو یہ امتیاز ہے لیکن حاجی سعید اختر جیسی نیوڈز بنا سکتا ہے اور کوئی نہیں بناتا.. ڈر سے.. ویسی رافیل یا روبنز بھی کہاں بناتے ہوں گے..

ایک اور پوسٹر اُس بظاہر بچگانہ تصویریں بنانے والے فرانسیسی مصور شاگال کا ہے اور تصویر کا نام ہے ''برتھ ڈے پارٹی''..

میں نے اس تصویر کو محض اس لیے خریدا کہ شاگال کی کوئی نشانی تو پاس ہو کیونکہ جانے کیوں اس کی تصویر ''محبت کرنے والے'' کا پرنٹ وہاں میسر نہ تھا اور میں ایک قربت مرگ میں محبت لکھنے والا اس تصویر کے محبت کرنے والے جوڑے کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا..

اس نیم تجریدی تصویر کے رنگوں اور جذبوں کو صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جسے عشق کے ہاتھی نے کبھی روندا ہو.. اس تصویر کے سامنے میں بہت دیر تک سانس روکے کھڑا رہا.. کبھی ذہن میں کوئی پرچھائیں تیر جاتی جس میں محبت کا کوئی دیا جل رہا ہوتا اور میں مسکرانے لگتا اور کبھی وہ دیا بجھ جاتا تو میں دکھ میں چلا جاتا.. اور کبھی ایک گہرا سانس بھرتا کہ ہاں میں بھی کچھ واقف ہوں کہ تم پر.. تم محبت کرنے والوں پر کیا گزر رہی ہے.. روڈین کے ''خدا کے ہاتھ'' مجسمے کی مانند اس تصویر میں کچھ تعین نہیں ہوتا کہ عشق کرنے والا کہاں ہے اور جس سے عشق کیا گیا ہے وہ کہاں ہے.. نہ کوئی آغاز

نظر آتا ہے اور نہ کوئی انجام کہ عشق میں یہ دونوں معدوم ہو جاتے ہیں' بے شناخت ہو کر یکجا ہو جاتے ہیں..ایک خون سرخ رنگ کی میز اور اس پر عجیب رنگوں کے پودے اور پھولوں والا ایک گملا..پس منظر میں ایک رنگوں سے بھڑکتی کھڑکی اور ان میں لُورز..محبت کرنے والے..عورت ایک نیلے پیراہن میں اور مرد اُسے آغوش میں لیتا ہوا ایسے کہ وہ دونوں اک دوجے میں گھل رہے ہیں..

اتنی عریانی اور بے حیائی کے بعد یہ مناسب ہوگا کہ میں میٹروپالٹن میں گزارے ہوئے شب و روز کے طویل اور کسی حد تک غیر دلچسپ بیان کا اختتام ایک ایسی تصویر پر کروں جو گمنام ہے..ہزار ہا تصاویر جو نمائش پر ہیں اُن میں سے ایک تصویر جس کا تذکرہ نہ میٹرو کی گائیڈ بک میں ہے اور نہ ہی کسی بھی مصوری کی کتاب میں اُس کا حوالہ ہے..اگرچہ ہم جیسوں کے لیے دنیا کا سب سے بڑا حوالہ ہے..

آپ ان ہزار ہا تصاویر میں سے چند ایک کو ٹھہر کر دیکھتے ہیں..دو چار کو تادیر دیکھتے ہیں اور بقیہ کو بہ نظر غور دیکھے بغیر گزر جاتے تھے..چنانچہ میں بھی اس کارجہاں سے جو دراز تھا' سرسری گزرتا تھا..اور اس سرسری گزرنے کے دوران ایک تصویر کا عنوان آنکھوں کے سامنے آیا..آیا اور وہ عنوان میرے دل میں اُتر کر مجھے ایک کپکپاتے سناٹے میں لے گیا..تصویر کا عنوان تھا..

''ہاجرہ صحرا میں''..

ایک ویرانہ ہے جس میں چند چٹانیں سورج کی تپش میں سلگتی ہیں..ایک دو چھدرے شجر ہیں..گرمی سے نچڑے ہوئے سفید آسمان پر ایک پرندہ اڑان میں ہے..اور ایک سیاہ پوش سفید بالوں والی خاتون ماتھے پر ہاتھ رکھے آسمان سے مخاطب ہو کر فریاد کر رہی ہے اور اُس کے آگے سنگلاخ زمین پر سفید چادر میں لپٹا ایک بچہ خوابیدہ ہے یا نڈھال ہے اور نیم بے ہوش ہے..

یہ اماں ہاجرہ ہے اور وہ حضرت اسماعیلؑ ہیں..

علی شریعتی کہتا ہے کہ..کل انسانیت میں سے ایک عورت..اور تمام عورتوں میں سے ایک سیاہ فام اور غلام عورت جس کا نام ہاجرہ تھا..وہ نہ ہوتیں تو کچھ بھی نہ ہوتا..نہ خانہ کعبہ ہوتا اور نہ ہی اس کعبے کو بتوں سے پاک کرنے والا ہوتا..حج بھی اُسی ہاجرہ کو خراج تحسین پیش کرنے کا نام ہے..روایت کے مطابق وہ خانہ کعبہ کے دوسرے ستون کے قریب دفن ہیں تو جتنی خدائی خانہ کعبہ

کے گرد طواف کرتی ہے' وہ ہاجرہ کی قبر کے گرد بھی طواف کرتی ہے..

سب لوگ..گزرتے جاتے تھے اور میں بھی سرسری گزرتا جا رہا تھا جب اس تصویر نے مجھے روک لیا..میں رُکا تو رُکا ہی رہا..

کون اپنی ماں کی تصویر کے سامنے سے..بے شک وہ خیالی ہی ہو..سرسری گزر سکتا ہے..کون ایک شیر خوار بچے کو بلکتا چھوڑ کر آگے جا سکتا ہے..

اور کون اُس ویرانے سے نظریں ہٹا سکتا ہے جہاں شہروں کے شہر مکہ کا ظہور ہونا تھا اور پھر وہاں میرے حضورؐ کا ظہور ہونا تھا..

بے شک یہ ایک خیالاتی..تصور تھا..شاید جائز بھی نہیں تھا..

پھر بھی جہاں ذرہ بھر شائبہ ہو کہ یہاں حضورؐ کا ظہور ہوا تھا تو وہاں سے سرسری تو نہیں گزرا جا سکتا..



''نیویارک سٹریٹ تھیٹر''

میوزیم کے بلند دروازوں کے کواڑ ایک مؤدب آہستگی سے بند ہونے لگے..

محافظ اعلان کر رہے تھے کہ خواتین وحضرات میوزیم کے بند ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے ہیں.. براہ مہربانی صدر دروازے کی جانب چلنا شروع کر دیں..دس منٹ.. پانچ منٹ..

بلند ہالوں اور کمروں میں جہاں ناظرین کے قدموں کی سرسراہٹ اور سرگوشیوں کے سوا کچھ نہ تھا' ایک خاموشی تھی..اس میں یہ اعلان پہلی بار گونجا تو اپنے پسندیدہ مجسموں کے سامنے شوق اور فریب کے مارے ہوئے ساکت ہو چکے لوگ زندہ ہونے لگے..

اپنی من چاہی تصویروں کے اندر چلے گئے..رُوسو کے انہونے جنگلوں اور فان گوگ کے سنہری کھیتوں اور رینائر کے تاثراتی تالابوں میں جا چکے لوگ ہولے ہولے ان جادونگریوں میں سے باہر آنے لگے..

قدیم مصر' بابل' نینوا اور ٹرائے کے دروازوں کے اندر چلے جانے والے لوگ جو وہاں اُن شہروں میں آباد ہو چکے تھے' بصد یاس کوچ کی تیاری کرنے لگے..

میں پچھلے کئی روز سے مسلسل اس عجائب خانے میں محفوظ قدیم دنیاؤں میں ایک دریا کی مانند بہتا رہا تھا..

لیکن میں یہاں اپنے پہلے دن کے اختتام کے لمحے بیان کر رہا ہوں..

شائقین اور سیاح بھی ایک دریا تھے اور اس اعلان کے بعد اُس کا رخ قدیم کائناتوں سے بدل کر صدر دروازے کی جانب رواں ہو گیا.

اور باہر ابھی کچھ دھوپ تھی..

اور جو چہرے ایک زمانہ قدامت کی دنیا میں بسر کر کے آئے تھے وہ اس دھوپ میں آئے تو اُن کی آنکھیں چندھیا گئیں..اُنہیں یقین نہ آیا کہ ہم تو قدیم مصر کے ایک معبد میں ابھی سانس لیتے تھے اور اب یہ کہاں آ گئے ہیں..لیکن نیویارک ایسا شہر ہے وہ ہر کسی کو چاہے وہ کسی بھی جہان میں ہو لمحوں میں واپس لے آتا ہے..

اور باہر..میوزیم کی سیڑھیوں اور سولہویں ایونیو کے درمیان جو وسیع فٹ پاتھ ہے وہاں کھیل تماشا ہو رہا تھا..

نیویارک میں کھیل تماشا ہوتا رہتا ہے..

کہیں کوئی ایک وائلن نواز اپنی دُھن میں مست وائلن کے تاروں میں سے دردبھری آہیں اور سسکیاں تخلیق کر رہا ہے پر اتنا مست بھی نہیں کہ وہ دھیان بھی نہ کرے کہ فٹ پاتھ پر سے گزرنے والے اُس کے فن کی داد کے نذرانے اُس کے ڈبے میں سکوں یا نوٹوں کی صورت ڈال کر گزر رہے ہیں یا نہیں..

ایک مکمل آرکسٹرا بھی فٹ پاتھ پر سجا ہو سکتا ہے..نہایت کلاسیکی دُھنیں بجانے والے.. زیادہ تر سفید فام موسیقار..معنک لڑکے اور لڑکیاں اپنے سامنے رکھے میوزیکل سکور پر نظریں جمائے شاید چائے کوسکی کی ترتیب شدہ کوئی دُھن بجانے میں غرق ہیں..اور اتنے غرق بھی نہیں ہیں کہ کبھی نہ کبھی آنکھ اٹھا کر یہ تسلی نہ کر لیں کہ اُن کے فن سے لطف اندوز ہو کر کچھ راہگیر کچھ نذر نیاز کر کے گئے ہیں یا نہیں..

اُن کی ایک نمائندہ خاتون راہ چلتے لوگوں سے درخواست کر رہی ہے کہ وہ ان موسیقاروں کی حوصلہ افزائی کرنے کی خاطر ان کی موسیقی کی ایک سی ڈی صرف دس پندرہ ڈالر میں پلیز خرید لیں..

ایک تنہا موسیقار گٹار کی تاروں کو اداسی کی دُھنوں میں چھیڑ رہا ہے..

ایک ڈھول بجانے والا بھی فٹ پاتھ پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہوگا..

ایک بانسری نواز..مجھے یقین ہے کہ چرس کے چار پانچ سگریٹ پھونکنے کے بعد بے نیاز ہو چکا ہے..وہ ''سُن ونجھلی دی مٹھڑی تان وے..میں تاں ہو ہو گئی قربان وے'' کا کوئی

امریکی متبادل انداز بجائے چلا جا رہا ہے.. اور وہ بھی اس قدر بے نیاز نہیں کہ راہگیروں کے ڈالروں سے سراسر غافل ہو جائے..

اور ہم پاکستانی اس کے چرسی ہو جانے پر کچھ اعتراض نہیں کر سکتے کہ یہ بُوٹی ہمارے دم سے ہے.. اسی لیے دم مارو دم.. پاکستانی گلوکاروں میں سے.. اور خاص طور پر لوک گلوکاروں میں سے کوئی ایک ہوگا اور وہ بھی بے سُرا ہوگا جو کش لگا کر نہ گاتا ہو.. میرے بہت ہی دل کے قریب گائک پٹھانے خان نے جب پہلی مرتبہ میری میزبانی میں ایک پروگرام میں گایا تو سماں باندھ دیا.. اور جب کچھ عرصے کے بعد ایک اور پروگرام میں تان لگائی تو اس میں وہ بات نہ تھی.. میں نے ایک وقفے کے دوران ان سے کہا ''سائیں اس بار چس نہیں آئی.. کیا بات ہے؟'' پٹھانے خان نے اپنے اکھڑتے ہوئے دانتوں کو عیاں کر کے کہا ''سائیں چس کیسے آئے.. ادھر سُوٹے کا کچھ بندوبست نہیں..''

چنانچہ میں نے اپنا شو بہتر کرنے کی غرض سے پٹھانے خان کو غسل خانے میں لے جا کر چند سوٹے لگوائے..

اس کے بعد پٹھانے خان عروج پر آ گئے.. اور ایسا گایا کہ میں اپنی میزبانی بھول کر ان کی گائیکی میں غرق ہو گیا.. یہ عجیب معجزہ نما بوٹی تھی چرس کی.. اور یہ طے ہے کہ پٹھانے خان اس کے کش لگائے بغیر ''میرا عشق وی توں.. میرا ایمان وی توں'' کبھی ایسے نہ گا سکتا جیسے اُس نے گایا ہے اور اگر گاتا تو اس میں یہ درد اور فراق کا سوز ہرگز نہ ہوتا.. چنانچہ ہم پاکستانی ایک امریکی نے نواز کے چرسی ہو جانے پر کچھ اعتراض نہیں کر سکتے..

میٹرو کے باہر آتا ہوں تو یہاں کھیل تماشا ہو رہا ہے..

نہ موسیقی ہے نہ رقص.. بس کھیل تماشا ہے..

تین سیاہ فام نوجوان.. نہایت ڈھیلی ٹی شرٹوں میں.. اور ایسی لمبی نیکروں میں جو صرف ڈھیلی نہیں ڈھالی بھی ہیں جو ڈھلتی ہوئی ان کے ٹخنوں تک آنے کو ہیں.. وہ اُن میں چلتے پھرتے مجذوب سے لگتے تھے.. سودائی دکھائی دیتے تھے.. کھیل تماشا کر رہے ہیں..

لوگ جمع ہو رہے تھے.. میوزیم سے باہر آنے والے تھکے ہوئے لوگ سیڑھیوں پر بیٹھ رہے تھے اور وہ اُن کے سامنے پرفارم کر رہے تھے..

وہ نہ صرف ایک دوسرے پر بلکہ سیڑھیوں پر براجمان سیاحوں پر فقرے کس رہے تھے.. جگتیں کر رہے تھے.. اور یہ فقرے اور جگتیں بار بار قہقہوں اور تالیوں کا سبب بن رہے تھے.. کہ ان کے فقرے سطحی نہ تھے نہایت کاٹ دار ذومعنی اور دوہرے مطالب کے حامل تھے..

وہ جو کھیل تماشا کرتے تھے.. تین سیاہ فام تھے..

وہ تینوں اگر کبھی لاہور آ جائیں تو ہمارے تھیٹر کے بیشتر کامیڈین اور جگت باز حضرات کو بیکار کر دیں وہ اتنے برجستہ اور بے پناہ تھے.. اگرچہ کچھ کچھ فحش بھی تھے..

ان جگتوں اور کٹیلے فقروں کے دوران وہ کبھی قریب رکھے ذاتی میوزک سسٹم کی بلند آہنگ موسیقی پر نہایت عمدہ رقص کرتے اور کبھی قلابازیاں لگا کر داد وصول کرتے.. ان میں سے ایک تماشائیوں سے مخاطب ہو رہا ہے ''دوستو.. ہم سیاہ فاموں پر بہت اعتراض ہوتا ہے کہ ہم تعلیم حاصل نہیں کرتے.. کالج نہیں جاتے.. کیوں مارگن کیوں نہیں جاتے؟''

''کالج کیسے جائیں، تعلیم بہت مہنگی ہے.. ایک سمسٹر کی فیس اتنی ہے کہ اُس رقم سے پورا ہارلم ایک برس کے لیے بیئر پی سکتا ہے.. اور ہم بہت غریب ہیں، فیس ادا نہیں کر سکتے.. کاش کہ ہم تعلیم حاصل کر سکتے۔'' وہ ایک آنسو پونچھتا ہے ''میں تو تعلیم حاصل کرنے کے لیے مرا جا رہا ہوں۔''

''ہاں'' فرینکی کہتا ہے ''بلکہ پچھلے سال تو تم تھوڑے سے مر بھی گئے تھے، پھر تمہیں ایک کتاب سنگھائی گئی تو تم زندہ ہو گئے.. تمہیں اتنا شوق ہے پڑھنے کا..''

''کیا کریں تعلیم تو بیئر کے ایک مگ سے بھی مہنگی ہے۔''

''تو کیا تم بیئر کا ایک مگ خرید سکتے ہو؟''

''نہیں..''

''تو پھر تم تعلیم کیسے خرید سکتے ہو..''

''نہ میں بیئر کا ایک مگ خرید سکتا ہوں اور نہ میں چرس کا ایک سگریٹ خرید سکتا ہوں.. لیکن میری دلی خواہش ہے کہ میں تعلیم یافتہ ہو جاؤں.. معاشرے میں ترقی کروں.. کروڑ پتی ہو جاؤں اور پھر سب سے پہلا کام یہ کروں کہ بیئر کا ایک مگ خرید کر پیوں..''

''ہے.. تم کیسے دوست ہو مجھے نہیں پلاؤ گے؟''

''بھئی تم بھی تو تعلیم حاصل کر کے دولت مند ہو چکے ہو گے.. تم خود اپنی بیئر خریدنے

کے قابل ہو جاؤ گے۔''

''لیکن ہم تعلیم حاصل کیسے کریں گے؟''

''کمال ہے یہ جو اتنے ڈھیر سارے لوگ ہمارے گرد جمع ہیں' یہ بہت ہمدرد ہیں.. یہ یقیناً تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہماری مدد کریں گے۔''

فرینکی ٹہلتا ہوا اپنا ڈبہ اٹھائے ایک گورے امریکی کے پاس جاتا ہے'' ہے.. کیا تم صرف اس لیے ایک ڈالر نہ دو گے کہ کہیں ہم تعلیم حاصل کر کے تمہارے جاب پر قبضہ نہ کر لیں..'' وہ گورا لطف اندوز ہو کر اس کے ڈبے میں دو چار ڈالر ڈال دیتا ہے.. پھر مارگن بھی اسی انداز میں کچھ رقم جمع کرتا ہے اور پھر ڈبے کو ناک کے قریب لے جا کر سونگھتا ہے اور کہتا ہے'' ہے فرینکی مجھے تو اس میں سے دولت کی خوشبو نہیں آ رہی.. یہ رقم اتنی کم ہے کہ اس سے ہم ایک کتاب بھی نہیں خرید سکتے تو کیا کریں؟''

''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا مارگن.. ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے لیکن تعلیم ضرور حاصل کریں گے.. تو خواتین و حضرات ہم آپ کے سامنے ایک یادگار اور نہایت مشکل کرتب پیش کریں گے جس میں ہماری جان کو بھی خطرہ ہے.. لیکن اس کے لیے ہمیں تین عدد رضا کار درکار ہیں... نہیں نہیں ان کی جان کو کچھ خطرہ نہ ہو گا کہ وہ تو تعلیم یافتہ ہوں گے.. آپ میں سے کون ہمارا ساتھ دے گا.. کون..'' وہ مجمع میں گھوم جاتے ہیں' پھر مارگن ایک طویل قامت جرمن سیاح کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے..'' آ جاؤ.. تمہارے لمبے قد کا شاید ہمیں کچھ فائدہ ہو جائے..''

وہ سیاح ہنسی خوشی اپنی خدمات پیش کر دیتا ہے..

اب مارگن تماشائیوں کو بہ غور دیکھتا.. سیڑھیوں پر براجمان لوگوں میں چلتا ایک خوش شکل اور بھرے بدن کی امریکی لڑکی کے سامنے رک جاتا ہے..'' ہنی تم آ جاؤ..''

وہ ہنی ذرا کتراتی ہے' اٹھتی نہیں ہے..

''سویٹ ہارٹ ہم تمہیں اپنے فلیٹ میں تو مدعو نہیں کر رہے جو تم اتنا جھجک رہی ہو.. یقین کرو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے.. آخر تین سیاہ فام دن دیہاڑے اتنے بڑے ہجوم کے سامنے ایک گوری کو ریپ تو نہیں کر سکتے.. تم مسکرا رہی ہو.. اس کا مطلب ہے شاید امید ہے..''

وہ لڑکی قہقہے لگاتی میدان میں آ جاتی ہے..

اور اُن کی تیسری رضا کار ایک مختصر قامت کی جاپانی سیاح لڑکی ہے جو معمول کے مطابق انگریزی بالکل نہیں جانتی اور مارگن کے درخواست کرنے پر جھک جھک کر اس کا شکریہ ادا کرتے بقیہ دو رضا کاروں کے ساتھ آ کھڑی ہوتی ہے..

وہ تینوں سیاہ فام.. اُن تینوں کو آگے پیچھے ایک قطار میں کھڑا کر دیتے ہیں.. جاپانی لڑکی ذرا شرماتی مسکراتی صورت حال کو انجائے کرتی اپنا ہینڈ بیگ زمین پر رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے..

اُن میں سے ایک جو ذرا فاصلے پر کھڑا ہے' دو چار قلابازیاں لگا کر بیگ تک پہنچتا ہے اور پھر اسے قابو کر کے بھاگ نکلتا ہے.. جاپانی بے چاری ہراساں ہو کر اس کا پیچھا کرتی ہے لیکن وہ تماشائیوں کے ہجوم کے پاس پہنچ کر یکدم رک جاتا ہے اور پلٹ کر کہتا ہے'' ہے لیڈی.. تم ٹوکیو میں نہیں ہو کہ یوں لاپروائی سے اپنا ہینڈ بیگ زمین پر رکھ دو.. یہ نیویارک ہے.. آئندہ احتیاط کرنا..''

ہجوم قہقہے لگاتا ہے اور وہ پھر سے شرمندہ ہوتی شرماتی جاپانی کا ہاتھ پکڑ کر اسے قطار میں کھڑا کر دیتا ہے..

اب وہ تینوں نہایت سنجیدہ شکلیں بنا کر اعلان کرتے ہیں'' خواتین و حضرات.. ہم نے آپ سے کہا تھا ناں کہ ہم تعلیم کے حصول کے لیے اپنی جانیں بھی داؤ پر لگا دیں گے.. تو ہم لگانے والے ہیں آپ نے ہماری قلابازیاں دیکھیں.. رقص دیکھا.. اچھل کود ملاحظہ کی.. لیکن آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اب ہم آپ کے سامنے کیا کرنے جا رہے ہیں.. ایک ناممکن.. شاید ایک ورلڈ ریکارڈ چھلانگ لگانے جا رہے ہیں.. ہم تینوں باری باری بھاگتے ہوئے آئیں گے اور ان تین رضا کاروں کے سروں پر سے گزر جائیں گے.. کیا آپ یقین کر سکتے ہیں۔''

مارگن ذرا حیران ہوتا ہے'' ویسے میں بھی یقین نہیں کر سکتا۔''

فرینکی اسے ڈانٹتا ہے'' بکواس نہیں کرو' اگر وہ یقین کر سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں کر سکتے.. تعلیم حاصل نہیں کرنی؟''

''لیکن فرینکی ہم نے آج تک ایسا نہیں کیا..''

''اسی میں تو جان کا خطرہ ہے کہ پہلے ہم نے کبھی ایسا نہیں کیا.. اسی لیے تو جان جانے کا خدشہ ہے.. ہمت کرو تعلیم حاصل کرنے کے لیے قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں۔'' اس فقرے بازی کے دوران یکدم اُن میں سے ایک پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے.. کچھ سنتا ہے اور بھاگ نکلتا

ہے.. بقیہ دونوں اس کا پیچھا کر کے اسے دبوچ لیتے ہیں..

''کیا ہوا؟''

''یار مجھے نیویارک پولیس کی کاروں کے سائرن سنائی دیئے تھے تو میں جان گیا کہ وہ ہمیں پکڑنے کے لیے آ رہے ہیں۔''

اس کے ساتھی اسے دلاسہ دیتے ہیں ''تم کیسے بے وقوف سیاہ فام ہو.. پولیس سائرن کی آواز سن کر بھاگ کھڑے ہوتے ہو۔ اگرچہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہوتا.. لیکن ذرا دیکھو کہ سفید فام یہ سائرن سن کر بھی اطمینان سے کھڑے رہتے ہیں حالانکہ انہوں نے جرم کیے ہوتے ہیں.. واپس آ جاؤ..''

اب کچھ وقت گزر چکا ہے اور وہ تینوں رضا کار.. ایک جرمن سیاح.. ایک امریکی اور ایک جاپانی لڑکی بہت دیر سے بدھو بنے قطار میں کھڑے بیزار ہونے کو ہیں تو وہ اُن کی جانب متوجہ ہو کر کہتے ہیں ''تو دوستو.. اب ہم تینوں اپنی جانوں کو صرف تعلیم کے حصول کے لیے خطرے میں ڈال کر ایک کارنامہ سرانجام دینے کو ہیں.. یعنی ہم باری باری ان تینوں کے سروں پر سے گزر جائیں گے اور ذرا ملاحظہ کیجیے کہ یہ جرمن سیاح کتنا دراز قامت ہے۔ اس کے سر پر سے گزرنا تو گویا ایورسٹ کے سر پر سے گزرنا ہے.. تو ہم گزر جائیں؟..

وہ بار بار کہتے ہیں کہ.. تو ہم گزر جائیں؟

''گزر جائیں..'' ہجوم تالیاں بجا کر ان کی ہمت بندھاتا ہے..

وہ دو چار قدم کا آغاز کرتے ہیں اور پھر رُک جاتے ہیں ''کیسے گزر جائیں.. ایک مرتبہ ہم اپنی جان پر کھیل کر گزر جائیں گے تو آپ سب لوگ صرف تالیاں پیٹ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے.. تو پہلے آپ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہماری مدد کریں اور اس کے بعد ہم سینے پر ہاتھ رکھ کر آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ شکریئے کے طور پر ان کے سروں پر سے چھلانگ لگا کر ہم گزر جائیں گے اور آپ ششدر رہ جائیں گے۔''

وہ تینوں اب کھلکھلاتے.. تالیاں بجاتے.. پُرشوق ہجوم میں گردش کرتے اس ڈبے میں ڈالر جمع کرنے لگتے ہیں.. اور خاصی رقم جمع کر لیتے ہیں.. اور پھر وہ فٹ پاتھ پر آس پاس کے لوگوں سے بے خبر ہو کر نہایت انہماک سے جمع شدہ رقم کو گننے کی اداکاری کرتے ہیں.. اور یاد

رہے کہ اس دوران پچھلے ایک گھنٹے سے اکڑوں کھڑے رضا کار بدستور قطار بنائے کھڑے ہیں اور اکڑ چکے ہیں..

رقم کی گنتی مکمل ہونے کے بعد فرینکی مایوسی سے سر ہلاتا ہے ''اتنے کم ڈالروں سے تو کالج کے ایک سمسٹر کے پہلے تین روز کی فیس بھی ادا نہیں کی جا سکتی.. یعنی ایک طالب علم کی.. اور ہم تو تین ہیں.. لگتا ہے کہ ہماری حسرت دل میں ہی رہے گی.. ہم ان پڑھ ہی رہیں گے۔'' مارگن اپنی ڈھلکی ہوئی جین اوپر کر کے مایوسی سے آہ بھرتا ہے ''تو پھر اتنی تھوڑی رقم کا ہم کیا کریں.. ان کنجوسوں کو لوٹا دیں..''

''نہیں نہیں.. ان کا دل دکھے گا۔ اگر ہم نے یہ رقم واپس کر دی.. دل دکھانا اچھی بات نہیں۔''

''تو پھر کیا کریں؟''

''تو پھر آؤ اس رقم سے کچھ شراب پیتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم ان پڑھ ہیں.. اگر ان تماشائیوں کی طرح پڑھے لکھے ہوتے تو اتنے بے وقوف نہ ہوتے۔''

''کتنے بے وقوف؟''

''کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ یقین کر سکتا ہے کہ ان تین رضا کاروں کے سر پر سے چھلانگ لگا کر گزرا جا سکتا ہے؟ ہم اتنے کمال کے کھلاڑی ہوتے.. ایسی ناممکن چھلانگیں لگانے والے ہوتے تو اولمپکس میں گولڈ میڈل حاصل نہ کر لیتے.. یہاں بھیک مانگ رہے ہوتے.. تو ان تماشائیوں نے اگر ہمارا اعتبار کیا تو کیا یہ بے وقوف نہیں ہیں.. آؤ اس رقم سے کچھ شراب پیتے ہیں۔''

یہ بیان دے کر وہ تینوں اپنا ساز و سامان سمیٹتے ہیں.. ایک دو قلابازیاں لگاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں..

تماشائی کچھ برا نہیں مانتے.. کہ یہ ایک دلچسپ تماشا تھا جو ختم ہوا..

البتہ ان تینوں رضا کاروں کو احساس ہوتا ہے کہ دراصل بے وقوف وہ ہیں جو یونہی پچھلے ایک گھنٹے سے قطار بنائے بُت بنے بے وجہ کھڑے ہیں لیکن وہ بھی مسکراتے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں..

میں بھی تو ان میں سے ایک تماشائی تھا..

تو کیا میں نے بھی بیشتر تماشائیوں کی مانند اُن سیاہ فاموں کی جھولی میں کچھ ڈالا؟

ہرگز نہیں!

کہ میں تو خود کھیل تماشا کرنے والوں میں سے تھا..

یونہی مجمع لگا کر اپنی چرب زبانی سے لوگوں کو بے وقوف بنا کر رزق کماتا تھا.. اگرچہ قدرے معزز انداز میں کبھی ٹیلی ویژن پر تماشے کرتا تھا اور کبھی ادب کے اوراق میں لفظوں کے شعبدے دکھاتا تھا اور پھر جھولی پھیلا کر اپنے فن کی داد وصول کرتا تھا.. تو میں کیسے اپنے جیسے ہم عصروں کی جھولی میں کچھ ڈالتا..

جھولی پھیلانے والے کسی دوسرے کی جھولی میں کیا ڈالیں گے..

کہ وہ تو خود مانگنے والے.. گداگر ہوتے ہیں..

نیویارک میں اکثر ایسے کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں..



''موما''

ہم دونوں رُوبرو تھے.. میں اور فان گوگ کی پینٹنگ ''دے سٹاری نائٹ''.. اور ہم دونوں میں ستارے چمکتے تھے.. تصویر کے کینوس پر اور میری آنکھوں میں..

میں اس پینٹنگ کے سامنے کھڑا تھا اور اتنی دیر سے کھڑا تھا کہ شاید میوزیم میں آنے والے ملاقاتی مجھے بھی میوزیم آف ماڈرن آرٹ میں نصب ایک مجسمہ سمجھ رہے تھے.. اگر وہ مجھے قریب سے ہو کر دیکھتے اور میری آنکھوں میں دیکھتے تو جان جاتے کہ میں ایک مجسمہ نہیں ہوں کہ ایک مجسمے کی پتھر آنکھوں میں تو نمی نہیں ہوا کرتی.. اور وہ یہ بھی جان جاتے کہ میں وہاں نہیں ہوں صرف میری پرچھائیں ہے کیونکہ میں ''ستاروں بھری رات'' کے اندر جا چکا ہوں.. اور وہاں جو گیا اس کی واپسی مشکل ہوتی ہے اور اگر وہ لوٹ بھی آئے تو کچھ سودائی ہو چکا ہوتا ہے.. آپ بے شک اتنے دیوانے نہ ہوں کہ محبت کے اظہار کے لیے وحشت میں اپنا کان کاٹ کر ایک طوائف کو پیش کر دیں لیکن کچھ تو اثر ہوگا.. ویسے وحشت کا دیوانگی کا تو یونہی بہانہ بنایا گیا ہے ہاتھی عشق کا جسے بھی روندتا ہے وہ یہ سب کچھ ذی ہوش ہونے کے باوجود کر گزرتا ہے..

ہاں میں ''ستاروں بھری رات'' کے اندر جا چکا ہوں اور میرے اوپر جو رات کا خیمہ فلک نیلاہٹ میں ڈوبا ہوا ہے اس میں ایک متحرک سحر سفر کرتا ہے اور اس آسمان میں ستارے کے ایک گرداب کی صورت حرکت میں نظر آتے ہیں اور یہ ستارے اس آسمان میں سے بے نقاب ہوتے.. ظاہر ہوتے اپنی روشنی میں پھٹتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں یوں کہ ان کے شرارے آپ کے بدن پر گرتے ہیں تو وہاں بھی ستارے دمکنے لگتے ہیں..

ستاروں بھری رات کے نیچے ایک خاموش' خوابیدہ' نیلاہٹ میں ڈوبا ایک گاؤں

ہے..سرو کا صرف ایک درخت ہے بل کھاتا جیسے ایک شعلہ بلند ہو رہا ہو ایسے زمین کو اس آسمان سے ملاتا ہے..سرو کا درخت یورپ میں ہمارے ہاں کے برعکس حسن کی بجائے ایک المیے کی ترجمانی کرتا ہے..اداسی کا استعارہ ہے..اور یہاں بھی وہ فان گوگ کی تخلیقی حیات کی سوگواری کو ستاروں بھری رات کے آسمان تک لے جا رہا ہے..

موت..فان گوگ کے لیے..نہ کوئی المناک انجام تھی اور نہ ایک ڈراؤنا خواب بلکہ وہ تو ایک زرد رنگ کا..سورج مکھی کے پھولوں کے بھڑکتے جلتے زرد رنگ کا..مکئی اور جو کے کھیتوں ایسے زرد رنگ کا ایک سنہری خواب تھی جسے آگے بڑھ کر خود گلے لگانے کو جی چاہے' جیسا کہ فان گوگ نے کیا..

اس ستاروں بھری رات میں فضا کی بے پناہ خوبصورتی اور اس کا سوگوار حسن ایسا ہے کہ جس کو زوال نہیں وہ بھی زوال کی خواہش کرنے لگے..

''جب میں ستاروں کو دیکھتا ہوں'' فان گوگ مخاطب ہے ''میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ یہ کیا ہے آسمان پر یہ جو ستارے وہاں دمکتے ہیں ہم ان تک کیوں نہیں پہنچ پاتے جیسے ایک نقشہ دیکھ کر اس پر دمکتے شہروں میں پہنچ جاتے ہیں..جیسے ہم ایک ٹرین پر سوار ہو کر فرانس کے قصبے روئن تک پہنچ جاتے ہیں تو کیا ہم موت پر سوار ہو کر ایک ستارے تک پہنچ سکتے ہیں..''

اُس نے اپنے چہیتے اور راز دار بھائی کو ایک خط میں لکھا..اور لیو دنیا میں واحد ایسا شخص تھا جو یہ جانتا تھا کہ اُس کا بھائی ونسنٹ مصوری کا ایک پیغمبر ہے ''آج صبح سویرے سورج طلوع ہونے سے پیشتر میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو وہاں ابھی تاریکی تھی اور میں نے وہاں صبح کے ستارے کو دیکھا جو بہت ہی بڑا اور روشن تھا..''

فان گوگ نے اس مارننگ سٹار کو ''دے سٹاری نائٹ'' کے بائیں کونے میں ایک زرد سورج کی شکل میں پینٹ کیا ہے..

یہ تصویر..حقیقت کی ہو بہو عکاسی نہیں ہے..نقل نہیں ہے..بلکہ یہ فان گوگ کا اپنا تصور ہے کہ اگر میں ایک ستاروں بھری رات تخلیق کرتا تو ویسی نہ بناتا جیسی پروردگار بناتا ہے بلکہ ایسی بناتا..

دراصل تمام آرٹ شروع دن سے ہی ایک دعوت مبارزت ہے..ایک مقابلہ ہے ایک

چیلنج ہے اُسے جس نے ہمیں تخلیق کیا ہے..اسی قوت کو جس نے اذن دیا کہ ہو جا تو سب کچھ ہو گیا..یہ زمین یہ کائناتیں اور ان سے پرے جو کائناتیں ہیں اور آسمان ہیں اور ان سے اوپر جتنے آسمان ہیں وہ سب وجود میں آ گئے..بس اسی خالق کو آرٹ ایک چیلنج ہے کہ بے شک تو نے مجھے تخلیق کیا لیکن ذرا دیکھ تو سہی کہ میں بھی تو تیری ذات کا ذرّہ ہوں اس لئے انا الحق ہوں اور میں بھی تخلیق پر قادر ہوں..تم جیسا ہوں اگرچہ تم سا نہیں..

تاج محل تخلیق کرنے والے معماروں اور ہنرمندوں نے بھی تو یہی ثابت کیا ہے کہ بے شک تو نے ہمیں بنایا..ہم تیری ہمسری نہیں کر سکتے پر جو ہم نے بنایا ہے وہ تُو بھی بنا کے دکھا..

چنانچہ آرٹ ہے ہی خاکی آدم کی خدا بننے کی خواہش اور کوشش!

ہر بڑا ادیب' مصور' گلوکار یا موسیقار دراصل اس خواہش اور کوشش میں مبتلا رہتا ہے..

بابا ظہیر کاشمیری نے کہا تھا..

قدم قدم پہ جنوں اختیار کرتے تھے
شباب تھا تو ستارے شکار کرتے تھے

تو گویا فان گوگ کی حیات بیان کر دی تھی..اس نے بھی قدم قدم پہ جنوں اختیار کیا اور اس جنوں میں ''ستاروں بھری رات'' کے ستارے شکار کئے..ایسے ستارے بس جنوں میں ہی شکار کئے جا سکتے ہیں..

اور اگر ہم عوامی سطح پر آ جائیں تو کیا مضائقہ ہے جہاں نور جہاں کی کیسی پکار ہے کہ..

سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں..

تو وہ بھی فان گوگ کی کیفیت بیان کرتی ہیں کہ اسے بھی وحشت میں نیند نہیں آتی تھی اور وہ شب بھر تاروں سے باتیں کیا کرتا تھا..

ایک شاعر ایک گلوکارہ اور ایک مصور کیسے ہم زبان ہو جاتے ہیں..

''دے سٹاری نائٹ'' کی قربت میں فان گوگ کی ایک اور تصویر ''زیتون کا درخت'' آویزاں ہے..یوں سمجھ لیجیے کہ اگر وہ رات کی تصویر ہے تو یہ دن کی تصویر ہے..ایک گرمی سے سلگتی ہوئی جنوبی فرانس کی ایک دوپہر میں گہرے ہریاول میں سیاہ ہوتے رنگوں کے زیتون کے ٹیڑھے

میڑھے' بل کھاتے' پیچیدہ شکل کے درخت جو کسی نادیدہ شدّت سے دوہرے ہوئے جاتے ہیں..
اور پس منظر میں کچھ پہاڑ ہیں جن پر ایک عجیب ہیئت کا بادل سایہ کیے ہوئے ہے..

فان گوگ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ یا تو میں پاگل پن کا شکار ہوں اور یا اس دنیا کے لوگ..تو اس نے اقرار کر لیا کہ نہیں میں ہوں جو اپنے حواس کھو بیٹھا ہوں اور وہ اپنی مرضی سے رضا کارانہ طور پر سینٹ ریمے کے پاگل خانے میں داخل ہو گیا..جنوبی فرانس کے اس گمنام قصبے سے اس نے ہالینڈ میں اپنے بھائی کو لکھا ''میں نے آج دو تصویریں پینٹ کی ہیں..ایک تصویر کو ''دے سٹاری نائٹ'' کا عنوان دیا ہے اور دوسری تصویر ایک زمینی منظر کی ہے جسے میں نے ''زیتون کے درخت'' کا نام دیا ہے..''

ایک ہی دن میں تخلیق کی جانے والی یہ دو تصاویر کسی بھی ایک دن میں تخلیق کی جانے والی تصویروں اور فن پاروں پر حاوی ہیں..

فان گوگ کا کہنا تھا کہ یہ دونوں تصویریں ہرگز حقیقت کی قربت یا عکاس نہیں ہیں..
کیونکہ کسی بھی منظر کو ہو بہو کینوس پر اُتار دینا محض تصویر کشی اور نقل ہے اور یہ ایک احمقانہ فعل ہے..
اس منظر کو اپنی ذاتی سُر میں لا کر اسے ازسرِ نو تخلیق کرنا ہی آرٹ ہے..

میں فان گوگ تک بہت مشکل سے پہنچا تھا..بہت کشت کاٹ کر اُس تک رسائی حاصل کی تھی..یہ سفر آسان نہ تھا..

اگر ایک انسان کے اندر ایک بڑے اور آخری سچ تک پہنچنے کی کسک اور آرزو ہو..تو اسے کوئی نہ کوئی مذہب یا عقیدہ اختیار کرنا پڑتا ہے..کسی نہ کسی راستے کا چناؤ کرنا پڑتا ہے بے شک وہ صراطِ مستقیم نہ ہو..اسے بہرطور چلنا پڑتا ہے یہاں تک کہ اسے چلنے کی عادت ہو جاتی ہے اور اگر وہ خوش بخت ہو تو کبھی نہ کبھی سچ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے..

رسائی حاصل کرنے کا..بڑے سچ تک پہنچنے کا فارمولا بہت آسان ہے..
آپ پڑھنا' دیکھنا اور سننا شروع کر دیں..
کچھ بھی..فضول' بیکار' بکواس پڑھنا' دیکھنا اور سننا شروع کر دیں..

ادب کے بڑے اور آخری سچ تک پہنچنے کے لیے بھی یہی شرط ہے کہ پڑھنا شروع کر دیں..خواتین کے ناول' جاسوسی کہانیاں' تیسرے درجے کی رومانی تحریریں کچھ بھی پڑھنا شروع

کر دیں..عادت ڈال لیں کچھ نہ کچھ پڑھنے کی..یہ وہ عامیانہ سیڑھیاں ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ آپ کو بالآخر اس بڑے سچ تک پہنچا دیں گی جو ادب ہے..اگر آپ خوش بخت ہیں تو..ورنہ آپ پہلی سیڑھی پر ہی بیٹھ جائیں گے اور عمر بھر مطمئن بیٹھے رہیں گے..آپ کا یہ سفر دھیرے دھیرے مشکل ہوتا چلا جائے گا اور اس میں لطف کم اور اذیّت زیادہ ہوتی چلی جائے گی اگرچہ اس اذیّت میں بھی لطف کا کچھ شمار نہیں..آپ نے اگر اپنی طبع کے مطابق کسی بھی شاعر یا ادیب تک پہنچنا ہے..دوستوفسکی' کافکا' ہرمن ہیسے' نجیب محفوظ' مارکیز' جیمز' جوائس یا جیمز فریزر تک پہنچنا ہے تو کچھ بھی پڑھنا شروع کر دیں..البتہ ابتدائی عامیانہ ادب کی سیڑھی استعمال کیے بغیر ان ادیبوں سے ہی آغاز کر دینے کا حوصلہ صرف محدودے چند جینئس لوگوں میں ہی ہوتا ہے جو ہم نہیں ہیں تو پڑھنا شروع کر دیں..

یہی فارمولا موسیقی پر بھی لاگو ہوتا ہے..
پڑھنے کی طرح سننا شروع کر دیں..کچھ بھی!

گلی میں سے گزرتے..لوہے کے کڑے پہنے انہیں اپنی مٹھی میں بھینچے ایک چھوٹے سے ڈنڈے سے ضرب لگاتے اور گاتے ''جس ویلے یعقوب نبی تھیں یوسف ہویا راہی'' سنیں تو سہی..

عامیانہ فلمی گانے اور بے شک بے سُرے لوگوں کو سننا شروع کر تو دیں کہ ان کے آخر میں روشن آراء بیگم اور استاد بڑے غلام علی خان آپ کے منتظر ہیں..میں نے اپنی اس حیات میں جو اتنی مختصر بھی نہیں ہے بہت سے ذائقے چکھے ہیں..تجربوں میں سے گزرا ہوں اور اکثر سیدھا راستہ ترک کر کے اِدھر اُدھر بہت بھٹکا ہوں صرف یہ جاننے کے لیے یہ آخری سچ اور حقیقت کہاں ہے..

اور کیا میں ان تک پہنچ سکتا ہوں لیکن تین علوم ایسے ہیں جہاں سے میں جان بوجھ کر سرسری گزرا ہوں' میری محدود سوجھ بوجھ نے محض ان کے دروازوں پر دستک دی ہے..اگر دروازہ کھل گیا ہے تو صرف جھانکا ہے اندر جانے کا حوصلہ نہیں ہوا..اجتناب کیا ہے کہ ان کی انتہا کوئی نہیں..آخری حد کا کچھ پتا نہیں..ان میں سے ایک علم کائنات اور اس کی لامحدودیت کا ہے..دوسرا مذہب ہے اور تیسرا موسیقی ہے' خصوصی طور پر مشرقی کلاسیکی موسیقی..ان تینوں کا کوئی انت نہیں اور میں ایک انتہائی محدود ذہن رکھتا ہوں اور میں اس امر سے آگاہ بھی ہوں اس لیے ان سے اجتناب کیا..

میں یہاں البتہ مغربی موسیقی سے لگاؤ کا ایک ذاتی حوالہ دینا چاہوں گا..میں ابھی کچی

عمر کا ٹین ایجر تھا جب میں یورپ چلا گیا اور وہاں ابھی راک اینڈ رول موسیقی کے آغاز کے زمانے تھے.. بل ہیلی' لٹل رچرڈز اور ان کے بعد ایلوس پریسلے کا راج ہونے کو تھا.. میں اس تیز ردھم والی اکثر بےسُری موسیقی کا رسیا ہو گیا اور اسے رغبت سے سننا شروع کر دیا.. پھر جاز کانوں میں بھلی لگنے لگی.. لوئی آمسٹرانگ کی ٹرمپٹ نے دل میں جگہ بنالی.. پھر روایتی جاز کا لطف آنے لگا اور اس کے راستے ماڈرن جاز اور ڈیو بروبیک کی لازوال پیانو کی دھنیں تک آ گیا.. بلوز میں سیکسافون کی اداس پکاریں مجھ پر گہرا اثر کرتیں اور اگر میں محبت میں ہوتا تو وہ مجھے رلا دیتیں.. لیکن دھیرے دھیرے میں اس موسیقی سے دور ہونے لگا.. کہ یہ موسیقی جوانی کی شراب کو مزید نشہ آور بنانے اور بے خود ہو کر رقص کرتے کرتے نڈھال ہونے کے لیے تو موزوں تھی پر یکسر تنہائی میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی.. یہ بہت بے باک اور عریاں تھی اس میں کوئی بھید کوئی راز نہ تھا.. خون کو بھڑکاتی بہت تھی اس میں شامل نہ ہوتی تھی.. تب یورپی کلاسیکی موسیقی نے میرے احساس اور شعور کے ذرّوں کو اپنی جانب کھنچے چلے آنے پر مجبور کر دیا.. یہ ایک اور دنیا تھی اور ایسی دنیا تھی جو آپ کو آس پاس کی دنیا سے بےخبر اور بے نیاز کر دیتی تھی.. میرے اس بیان سے کہیں یہ غلط فہمی تخلیق نہ ہو جائے کہ میں یورپی کلاسیکی موسیقی کے رموز سے آشنا ہو گیا.. قطعی نہیں.. مجھے اس کی تکنیکی مہارت یا اتار چڑھاؤ کی کچھ سمجھ نہیں لیکن اس کے باوجود یہ مجھ پر یوں اثر انداز ہوتی ہے کہ میرے اندر نئی بستیاں آباد کرتی چلی جاتی ہے.. یہاں یورپی کلاسیکی موسیقی کے جتنے ''خان صاحب'' ہیں ان کی فہرست دوہرانا مناسب نہیں لیکن ان میں موتزارٹ اور بیتھوون کی سمفنیز نے.. خاص طور پر مون لائٹ سناٹا نے مجھے آج بھی اپنا غلام کر رکھا ہے.. بہت ہی خاص لمحوں میں.. کسی المیے کے دوران' کسی شاندار مسرت کے موقع پر یا کسی ایسے لمحے میں جب انسان مر جانے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے.. پیانو کی یہ دھنیں میرے اندر یوں گونجنے لگتی ہیں جیسے نابینا بیتھوون اپنے پیانو پر جھکا آرکسٹرا کے ہمراہ ذاتی طور پر میرے بدن میں پرفارم کر رہا ہے..

یہاں تک کہ بالآخر.. اور مجھے یہ اقرار کرتے ہوئے کچھ شرمندگی ہوتی ہے کہ میں آپرا گلوکاری اور چیمبر موسیقی سے بھی لطف اندوز ہونے لگا..

میں نے اتنی طویل اور نہایت بور تمہید جس میں خود نمائی بہت تھی صرف فان گوگ کی ''دے سٹاری نائٹ'' کی مجھ پر اثر انگیزی کے لیے باندھی ہے.. کہ میں فان گوگ تک بھی آسانی

سے نہیں بہت کشٹ کاٹ کر پہنچا..

تو ادب کی معراج تک رسائی حاصل کرنے کے لیے.. پڑھنے کا آغاز کر دینا شرط ہے.. کچھ بھی پڑھنا.. موسیقی کی آخری سلطنت میں داخل ہونے کی خواہش ہو تو سننا شروع کر دینا ضروری ہے.. کچھ بھی سننا.. اسی طور مصوری کے استادوں تک پہنچنے کے لیے بھی.. دیکھنا شروع کر دینا پہلا قدم ہے..

البتہ یہاں ایک عجیب سا فرق ہے..

ادب اور موسیقی میں آپ لمحہ موجود میں رائج کوئی بھی تحریر یا دھن میں مگن ہو کر اس کے کلاسیکی انجام تک سفر کرتے ہیں..

جبکہ مصوری میں کسی حد تک یہ سفر اُلٹے پاؤں چلتا ہے..

آپ کا آغاز روایت اور کلاسیک سے ہوتا ہے اور پھر اگر آپ پہنچنا چاہیں تو جدید مصوری تک پہنچ جاتے ہیں.. نوجوانی کے اوائل میں ہم بھی دیگر دانشوروں اور مزاحیہ شاعروں کے تتبع میں جدید مصوری کو مضحکہ خیز اور پُرمزاح گردانتے تھے.. انارکلی بازار میں فروخت ہونے والی سینریوں پر جان دیتے تھے جن میں تمام موسموں کے پھول یکبار کھلے ہوتے تھے.. پہلو میں کوہ کے ایک جھونپڑا بھی ہوتا تھا اور ایک آبشار بھی.. پرندے بھی اڑان میں ہوتے تھے اور سورج بھی طلوع ہو رہا ہوتا تھا.. پھر ذرا ہوش میں آئے تو ''شمع'' رسالے کے سرورق ہمیں خوابوں میں لے جانے لگے اور ان میں سے کچھ امرتا پریتم کے ساتھی امروز کے بنائے ہوئے ہوتے تھے.. ان میں سے ایک تصویر جس میں سراسر سرخ لباس میں ایک لڑکی گھٹنوں پر سر رکھے بال بکھرائے بیٹھی ہے مجھے ایسی پسند آئی کہ میں نے وہ سرورق فریم کروا کے اپنے کمرے میں آویزاں کر لیا کہ مجھے یہ میری خیالی محبوبہ لگتی تھی اور والد صاحب نے سخت سرزنش کی تھی کہ کیسی بے ہودہ تصویر گھر میں لگا رکھی ہے.. حالانکہ لڑکی مکمل طور پر باپردہ اور حیادار تھی یہاں تک کہ وہ سرخ لباس میں ایک لڑکا بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے بدنی خطوط بھی پوشیدہ تھے.. پھر اللہ بخش' زین العابدین' چغتائی اور آذر زوبی وغیرہ کا زمانہ آیا.. ادھر مغرب کا رخ کیا تو اول اول ریمبرانٹ' مائیکل انجلو' رونبز اور ڈی ونچی وغیرہ کی پورٹریٹوں نے متاثر کیا لیکن اس سفر کے دوران جب مصوری کی کشتی نہایت نرمی سے بے آواز پانیوں پر تیرتی تھی اسے ایک شدید دھچکا لگا..

پکاسو میرے لیے تب تک اگرچہ ایک باکمال لیکن اوٹ پٹانگ سا مصوّر تھا.. جو عورت کو انناس بنا دیتا تھا اور انناس کو کائنات بنا دیتا تھا.. بائیسکل کے ایک ہینڈل پر کچھ کاٹھ کباڑ چسپاں کر کے اُسے ایک بھینسے کا مجسمہ قرار دیتا تھا.. اس نے مصوری کو ایک مذاق بنا رکھا تھا.. اور مجھے شدید دھچکا یہ لگا کہ میں نے بارسلونا ہسپانیہ میں اس کے خصوصی میوزیم میں اس کی ابتدائی تصویریں دیکھ لیں.. ایسی پورٹریٹ جو کلاسیکی معیار کی ہر شرط پر پوری اترتی ہیں.. قدیم اساتذہ کی بنائی ہوئی پورٹریٹوں جیسی فنی عظمت کی حامل تصاویر شخصیت کا ایک ایک پرت عیاں اور شباہت اتنی مکمل کہ وہ تصویر لگتی تھیں.. اگر ان تصویروں کے نیچے پابلو پکاسو کے مشہور زمانہ دستخط نہ ہوتے تو میں کبھی یقین نہ کرتا کہ یہ اسی پکاسو کا ابتدائی کام ہے جو اوٹ پٹانگ مصوری کا خالق ہے..

اگر وہ اپنے ابتدائی دور میں مصوری کے رموز سے اتنا آشنا تھا کہ ایسی کلاسیکی تصاویر بنانے پر قادر تھا تو پھر وہ بے راہرو کیوں ہو گیا.. جس راستے پر چل رہا تھا اسی پر کیوں نہ چلتا گیا.. بھٹک کیوں گیا؟

دراصل کوئی بھی تخلیق کار چاہے وہ ایک ادیب ہو یا مصوّر جب اپنے فن میں کاملیت کے درجے پر پہنچ جاتا ہے.. ایک ماہر استاد ہو جاتا ہے تو وہ قناعت کر جاتا ہے کہ بس یہی فن کی معراج ہے جہاں میں پہنچ چکا ہوں.. لیکن کچھ ایسے سرپھرے بھی ہوتے ہیں جو قناعت نہیں کرتے اس معراج کے پار جانا چاہتے ہیں.. تجربہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے پار کیا ہے.. اور اس پاگل پن میں اپنی تمام تر شہرت اور ناموری داؤ پر لگا دیتے ہیں..

کاملیت حاصل کرنے کے بعد وہ اس کی یکسانیت سے اکتا جاتے ہیں..

وہ فریدالدین عطار کے ''منطق الطیر'' پرندوں کی مانند آخری سچ تک پہنچنے کی جستجو کرتے ہیں چاہے وہ اس جستجو کے راستے میں ہلاک ہی کیوں نہ ہو جائیں..

سمندری بگلے ''لونگ سٹون سی گل'' کی طرح اپنی پرواز کی حد کو پار کر کے دیکھنا چاہتے ہیں کہ پار کیا ہے بے شک موت ان کا مقدر ہو جائے..

ادب میں ایلیٹ' وہٹ مین' ورجینیا وولف' ہرمن ہیسے' جیمز جوائس' کافکا' مارکیز اور سرماگو ایسے لوگ کلاسیک کی حدود کو توڑ کر پار گئے اور مصوری میں پکاسو کے علاوہ کاملیت کی یکسانیت سے اکتائے ہوئے رینوئر' گوگین' ڈیگاس' مانے' مونے' سیزان' ماتیس' شگال' میرو'

سلوادور ڈالی اور فان گوگ جیسے مصوّر ایسے تھے جنہوں نے مصوری کی طے شدہ حدوں کی خلاف ورزی کی.. یہ ایسے لوگ تھے جو اپنے ساتھ مجھے بھی پار لے گئے..

کلاسیکی مصوری کی کاملیت کے شاہکاروں کے سامنے کھڑے ہو کر آپ سناٹے میں آ جاتے ہیں.. ڈی ونچی' ریمبرانت یا مائیکل انجلو کی تصویروں کو دیکھ کر آپ ان کی کاملیت سے مرعوب ہو جاتے ہیں.. باادب ان کا ملاحظہ کرتے ہیں..

لیکن آپ اور وہ.. چاہے وہ مونالیزا ہو یا ریمبرانت کی کوئی پورٹریٹ.. الگ الگ ہوتے ہیں.. اس کے کمالِ فن کے رعب میں رہتے' ان کی تعظیم میں رہتے ہیں..

جب کہ فان گوگ' گوگین یا پکاسو کی کسی بھی تصویر کے سامنے اگر آپ تادیر کھڑے رہیں تو آپ اور وہ ایک ہو جاتے ہیں.. آپ اپنی حسرتوں اور محبتوں سمیت اس کے اندر چلے جاتے ہیں..

تو کہنا میں یہ چاہتا تھا اور اس کہنے کے لیے مجھے بہت کچھ اکتا دینے والا بھی کہنا پڑا کہ.. میں فان گوگ تک آسانی سے نہیں پہنچا.. مجھے اس تک پہنچنے کے لیے بہت کشت کاٹنے پڑے.. اور یہ بھی ایک بخت آوری تھی کہ میں اس کی ''ستاروں بھری رات'' تک پہنچ گیا تھا اور اس کے سامنے کھڑا تھا.. اسے بُت بنا اتنی دیر سے دیکھ رہا تھا کہ میوزیم میں آنے والے لوگ مجھے بھی میوزیم آف ماڈرن آرٹ نیویارک میں نصب ایک مجسمہ سمجھ رہے تھے اور اگر وہ مجھے قریب ہو کر دیکھتے تو جان جاتے کہ یہ ایک مجسمہ نہیں ہے کہ مجسّمے کی پتھریلی آنکھوں میں نمی نہیں ہوا کرتی..

میوزیم آف ماڈرن آرٹ..

جسے پیار سے اور اختصار سے موما کہا جاتا ہے..

اگر آپ کسی راہگیر سے دریافت کریں کہ میوزیم آف ماڈرن آرٹ کدھر ہے تو وہ لاعلمی میں سر ہلا دے گا اور اگر پوچھیں گے کہ موما کہاں ہے تو وہ مسکرا دے گا اور راستہ بتا دے گا..

موما.. نیویارک کا ایک محبوب ہے..

اور اس محبوب کی تعمیر جاپانی ماہر تعمیر یوشیو تانی گوچی نے کی.. کہ دنیا بھر میں صرف وہ شخص تھا جو جدید آرٹ کو ایک عمارت کی شکل دے سکتا تھا..

جب آپ ماڈرن آرٹ کے ایک میوزیم کا تصور ذہن میں لاتے ہیں تو اس کے ساتھ بہت سے خدشات اور اجتناب جنم لیتے ہیں کہ ''ماڈرن آرٹ'' میں کیا کیا شامل ہو سکتا ہے اور کیا شامل نہیں ہو سکتا کہ ماڈرن آرٹ تو کچھ بھی ہو سکتا ہے..تصویروں اور مجسموں کے علاوہ ایک کرسی کا ڈیزائن..ایک بال بیئرنگ کی شکل' کوئی پوسٹر' فوٹو یا فلم..ایک پتھر' سگریٹ کی خالی ڈبیاں ایک ترتیب کے ساتھ یہاں تک کہ ایک ہیلی کاپٹر بھی جو اس میوزیم کی چھت سے معلق اس کا امتیازی نشان بن چکا ہے..ایک کار کا کوئی خاص ماڈل بھی ماڈرن آرٹ کہلا سکتا ہے اور گرم استری سے بھورے ہو جانے والے کپڑے کو بھی ایک شاہکار کہا جا سکتا ہے..کوکا کولا کی بوتلوں کا ایک انبار..چھت سے لٹکتے بجلی کے بلبوں کا ایک گچھا..ایک ٹیبل لیمپ کا انوکھا ڈیزائن..سفید پلاسٹک کی کرسی جس کی نشست پر زرد رنگ کی ایک گدّی ہے کہ اس کا آئیڈیا ایک انڈے کی سفیدی اور زردی سے لیا گیا ہے..ایک سیاہ لمبوترا پتھر جسے ایک سٹینڈ پر آویزاں کر کے ''مچھلی'' کا نام دیا گیا ہے..

یہ سب کچھ موما میں نمائش پر ہے اور اس کے سوا اور بہت کچھ ہے..

ایک روایتی میوزیم میں کون سی تصویر یا مجسمہ جگہ پا سکتا ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لیے پرکھ کے نپے تلے اصول اور زاویے ہیں لیکن ماڈرن آرٹ کے ایک میوزیم میں کیا ہے جو نمائش کے معیار پر پورا اترتا ہے اور آرٹ ہے اور کیا ہے جو محض کاٹھ کباڑ ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کوئی اصول یا طے شدہ ضابطہ نہیں ہے..ماڈرن آرٹ کے چناؤ یا پرکھ کے لیے ایک ایسی آنکھ درکار ہے جو عہد حاضر کی تیز رفتار زندگی میں روزمرہ کے استعمال کی اشیاء' مشینوں' بیکار ڈبوں' دیواروں پر چسپاں اشتہاروں وغیرہ میں بھی حسن جمال کا کوئی پہلو تلاش کر لے..اور پل بھر میں اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ..یہ آرٹ ہے..

موما میں نمائش کیا گیا ماڈرن آرٹ روزمرہ کی زندگی سے مستعار شدہ ہے..

ہم جیسے اسے دیکھ کر اس کا ٹھٹھہ اُڑا سکتے ہیں..اس پر جی کھول کر ہنس سکتے ہیں لیکن..

اس آرٹ میں کوئی نہ کوئی غیر واضح کشش ضرور ہوتی ہے جو منفرد ہوتی ہے..

مثلاً موما کی چھت سے معلق اُس ہیلی کاپٹر کو ہی لے لیجیے..

یہ کیا آرٹ ہوا..آپ کہہ سکتے ہیں..

یہ بیل 47-D1 نامی ہیلی کاپٹر ہے جسے 1946ء میں ینگ نام کے ایک انجینئر نے

ڈیزائن کیا تھا..وہ ایک انجینئر ہونے کے علاوہ ایک مصور اور شاعر بھی تھا چنانچہ اس کی اس میکانکی تخلیق میں بھی شاعری کی نازکی اور مصوری کے رنگوں کی آمیزش ہے..اور وہ پہلی نظر میں ہی آپ کو بھلا لگتا ہے..ایک کارآمد مشین بھی لگتا ہے لیکن ایک مشین کا مُردہ پن اور سرد مہری اس میں نہیں بلکہ زندگی اور حرارت ہے..روایتی ہیلی کاپٹروں کی مانند اس میں آہنی بھاری پن بھی نہیں بلکہ ایک نزاکت ہے اور وہ معلق حالت میں مائل پرواز لگتا ہے..

مجھے موما کی بیشتر تصویریں بھول چکی ہیں لیکن اس ہیلی کاپٹر کی سرخ نسوانیت اور حسن ابھی تک ذہن پر نقش ہے..

اور کیا ایک ٹیبل لیمپ بھی آرٹ ہو سکتا ہے..

ایک ایسا ٹیبل لیمپ جسے دیکھ کر میں چونکا کہ ہائیں یہ لوگ میری رائٹنگ ٹیبل پر سے میرا ٹیبل لیمپ اٹھا لائے ہیں..

یہ ٹیبل لیمپ کسی رچرڈ صاحب نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے ڈیزائن کیا تھا کیونکہ ان دنوں بازار میں جتنے بھی ٹیبل لیمپ میسر تھے وہ ایک ہی زاویے پر جامد تھے اور ان کی روشنی ایک ہی مقام پر پڑتی تھی..چنانچہ ذاتی ضرورت کے تحت اس نے ایک ایسا ٹیبل لیمپ ڈیزائن کیا جو ایک انسانی بازو کی مانند ہے جسے کسی بھی زاویے پر جھکایا جا سکتا ہے یا حرکت دی جا سکتی ہے..اس کا ڈیزائن اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ بیڈن روڈ اور انارکلی کی ہر دکان پر مل سکتا ہے..تو کیا یہ آرٹ ہے؟

البتہ فلم کے بارے میں تو کچھ شک شبہ کا گمان نہیں کہ..فلم ایک آرٹ فارم ہے..آپ موما میں تمام ایسی فلمیں دیکھ سکتے ہیں جن کے جمالیاتی پہلو کو دنیا بھر میں سراہا گیا..وکٹر سی سٹارم کی ''ہوا''..آرسن ویلز کی ''سٹی زن کین''..جاپان کے اوزو کی ''ٹوکیو سٹوری''..وٹوریو ڈی سیکا کی ''بائیسکل تھیف''..الفرڈ ہچکاک کی کم نو یک اور جیمز سٹیورٹ والی ''ورٹیگو''..اور ان عہد ساز فلموں میں ہمارے ستیاجیت رے کی ''پاتھر پنچالی'' بھی شامل تھی..اس طویل قامت خوب صحت مند بنگالی کو دنیا کے دس بڑے ہدایت کاروں نے متفقہ طور پر بیسویں صدی کے سب سے عظیم ہدایت کار کا ایوارڈ دیا تھا..میں نے تو صرف اس کی ''مہانگر'' اور ''شطرنج کے کھلاڑی'' دیکھی تھی اور مجھے فخر ہوا تھا کہ یہ شخص میرے خطے کا ہے..

موما کی روشن راہداریوں اور کمروں میں صرف ٹیبل لیمپ‘ بال بیئرنگ‘ کرسیاں‘ کاریں یا خالی ڈبے اور خالی بوتلیں ہی نہیں بلکہ ماڈرن آرٹ کے تأثراتی.. یعنی امپریشنسٹ تصاویر کے شاہکار بھی آویزاں ہیں..

میں فان گوگ کی ’’ستاروں بھری رات‘‘ اور ’’سرو کے درخت‘‘ کے تاثرات کچھ زیادہ ہی جذباتی طوالت سے بیان کر چکا ہوں.. اور ہاں یہاں میں ایک مسکراہٹ آمیز حوالہ دینا چاہتا ہوں.. میٹروپالٹن میوزیم دنیا کے اہم ترین عجائب گھروں میں شمار ہوتا ہے اور آپ اس کے تکبّر کو بے جا نہیں کہہ سکتے کہ وہاں دنیا بھر کے شاہکار نمائش پر ہیں.. فان گوگ کے ’’بُوٹ‘‘ بھی وہاں پڑے ہیں اور ’’سیلف پورٹریٹ‘‘ بھی سجی ہے لیکن ہر شخص کے اندر ایک ستاروں بھری رات جگمگا رہی ہوتی ہے اور وہ اسے تلاش کرتا پھرتا ہے اور پھر جب نظر نہیں آتی تو کسی محافظ سے پوچھتا ہے کہ.. جناب ستاروں بھری رات کہاں ہے تو اس کا جواب نہایت ناگواری سے دیا جاتا ہے کہ.. وہ موما میں ہے..

میٹرو کے محافظوں سے یہ سوال دن میں سینکڑوں بار پوچھا جاتا ہے اس لئے ناگوار ہو چکے ہوتے ہیں..

میں بھی اگر موما میں ایک زرِ کثیر خرچ کر آیا تھا کہ یہاں وہ ایک ڈالر والی سہولت میسر نہ تھی تو بنیادی کشش اسی ستاروں بھری رات کی تھی..

بہرحال موما میں جدید آرٹ کے کچھ لوگوں کے لیے ناقابل فہم مظاہر اور اس رات کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے..

فرانسیسی مصوّر سیزان کا ’’غسل کرنے والا‘‘ بھی دیکھا جا سکتا ہے جو نہایت ہی ناتواں اور مریل سا شخص ہے جو صرف ایک جانگیے میں ملبوس ہے..

یہاں روڈین کا ’’خدا کا ہاتھ‘‘ تو نہیں ہے البتہ مصنف بالزاک کا ایک مجسمہ ہے جو ایک سیاہ آسیب دکھائی دیتا ہے.. اور روڈین کو بہت معتوب کیا گیا کہ تم نے یہ کیسا بالزاک بنایا ہے..

فرانس کے ہی ہنری رُوسو ہمارے اُستاد امام دین گجراتی کی مانند پیرس میں چُنگی محرر ہوا کرتے تھے اور استاد کی طرح کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے اور مصوّری کے بارے میں علم بھی نہایت واجبی تھا.. ان کی زندگی میں استاد کی مانند ہی ان کا بہت مذاق اڑایا گیا لیکن آج موما میں

داخل ہونے والا ہر شخص اسی روسو کی تصویر ’’خوابیدہ خانہ بدوش‘‘ دیکھے بغیر نہیں جاتا.. یہ ایک خوابناک بے وجہ سی تصویر ہے جس میں رنگوں کے عجب ٹونے ٹوٹکے ہیں جو دیکھنے والے کو جکڑ لیتے ہیں..

رات چاندنی ہے.. ایک سیاہ فام منڈولین ساز بجانے والی خانہ بدوش اس رات میں خوابیدہ ہے.. اس کے سرہانے پانی کا ایک مرتبان ہے اور.. ایک ببر شیر جس کی ایال چاندنی میں نہائی ہوئی ہے اس خانہ بدوش لڑکی کو سونگھ رہا ہے.. اسے ضرر پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ اس کے خوابیدہ حسن کے سحر میں آیا ہوا ہے..

تصویر کا یہ کیسا خلاف روایت موضوع ہے.. یہ صرف روسو کے ان پڑھ ذہن میں ہی پرورش پا سکتا تھا کہ تعلیم بعض اوقات انسان کی قدرتی صلاحیتوں پر محدودیت کے پہرے بٹھا دیتی ہے..

اپاہج ہنری لاٹرک کا تخلیق کردہ ایک پوسٹر نمائش پر ہے جو اس نے پیرس کے ایک جاپانی ماحول والے کیبرے شو کے لیے بنایا تھا..

موما میں ناروے کے سب سے بڑے مصوّر ایڈورڈ مُنچ کی اداس سیاہی میں ڈوبی ہوئی تصویر ’’طوفان‘‘ بھی آویزاں ہے.. اگرچہ اُس کی وجۂ شہرت وہ سادہ مگر اثر انگیز تصویر ہے جو مونالیزا کے بعد سب سے زیادہ مشتہر ہوئی.. رسالوں‘ اشتہاروں‘ پوسٹروں اور احتجاجی جلوسوں کی زینت ہوئی ’’دے کرائی‘‘..

یعنی ’’چیخ‘‘..

جہاں کہیں ظلم‘ تشدد اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند ہوتی ہے وہاں یہ ’’چیخ‘‘ اس کی ترجمانی کرتی ہے..

’’طوفان‘‘ کے علاوہ یہاں منچ کی ’’میڈونا‘‘ بھی آویزاں ہے.. یہ ذہن میں ایک خلفشار تخلیق کرنے والی پُرکشش تصویر ہے کیونکہ علامتی انداز میں بے لباس ہے.. ’’میڈونا‘‘ یا حضرت مریم علیہ والسلام کو یورپ کے ہر مصوّر نے ہر زمانے میں بار بار پینٹ کیا ہے لیکن منچ کی ’’میڈونا‘‘ ان سب سے جدا اور دھچکا دینے والی ہے..

آسٹریا کا گستاف کلِمت ہیرے جواہر ٹانکنے والا ایک جوہری نظر آتا ہے کہ اس کی تصویروں میں بہت نازکی اور شوخی ہے.. اور یہاں اس کی نمائندہ تصویر ’’اُمید‘‘ دیکھی جا سکتی ہے جو

مشرقی لبادے میں ڈھکی چھپی ایک حاملہ عورت کی ہے..ایک عورت جو امید سے ہے..اس کی تصویروں میں نزاکت اور رنگوں کی شوخی مشرق سے مستعار شدہ ہے..ان میں تُرک اور ایرانی قالینوں کے رنگ ہیں اور جاپان کی نزاکتیں نمایاں ہیں..

ہمارے ہاں بہت کم لوگ رُوسی مصور وازلی کانڈنسکی کے نام اور کام سے آگاہ ہیں..
ہمارے دانشوروں اور مصوروں کی سوئی پکاسو پر ہی اٹکی رہتی ہے جبکہ یہ کانڈنسکی ایسا جینئس تھا جو مصوری کو پکاسو سے بھی کہیں آگے لے گیا..اگر پکاسو کو کیوبزم کا بانی مان لیا جائے تو بھی کانڈنسکی ایک ایسا مصور تھا جس نے..شکل منظر یا کسی بھی شے کو جیسے وہ دکھائی دیتی ہے یکسر ترک کر دیا اور اسے صرف اور صرف رنگوں کے امتزاج سے ایک غیر مرئی ماحول میں ظاہر کرنے کا جتن کیا..یہ کیا کہ اشیاء اور مناظر کی شکل بے شک تجریدی انداز میں کینوس پر اتاری جائے..کیا صرف رنگ یہ شکلیں نہیں دکھا سکتے..کانڈنسکی پوشیدہ یا قیاس انگیز مصوری کا بانی ہے..اس کی متعدد تصاویر موما میں دیکھی جا سکتی ہیں جن میں ''ایک تیر انداز کے ساتھ تصویر'' بہت ہی دلچسپ ہے..

میں رُوسی نژاد فرانسیسی مصور شاگال کی میٹرو میں آویزاں تصویر ''محبت کرنے والے'' کا تذکرہ کر چکا ہوں..یہاں موما میں اسی کی ایک اور مشہور زمانہ تصویر ''میں اور میرا گاؤں'' بھی دیکھی جا سکتی ہے..شاگال گاؤں کی زندگی میں انسانوں اور مویشیوں کو یکساں اہمیت دیتا تھا..اس تصویر میں دودھ دوہتی ہوئی ایک دوشیزہ ہے..گھر ہیں..کسان اور بکریاں ہیں اور یہ سب ایک دوسرے میں یوں مدغم ہو رہے ہیں کہ ان کی ذاتی پہچان باقی نہیں رہی..''میں اور میرا گاؤں'' ماضی کی ایک یاد ہے..پریوں کی ایک کہانی ہے..شاگال کا کہنا تھا کہ وہ کینوس پر بکھری اشیاء منطقی ترتیب سے نہیں بناتا کیونکہ اس کے نزدیک تشریح کی چنداں اہمیت نہیں ہے..

یہاں بھی پال گوگین کے منفرد طرز مصوری کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے..

میں نے میٹرو کے باب میں اُس کی حیات پر مبنی سمرسیٹ ماہم کے ناول ''مون اینڈ سکس پینس'' کا حوالہ دیا تھا..گوگین پیرس کا ایک ممتاز اور متمول بینکار جو یکدم گھر بار ترک کر کے تاہیٹی کے جادوئی جزیرے میں چلا جاتا ہے صرف اس لئے کہ وہ اپنی حیات مصوری کے لیے وقف کر دے..اس نے بقیہ زندگی اس دور افتادہ جزیرے کے نیم تہذیب یافتہ نیم برہنہ کالے کلوٹے چوڑی ناکوں والے باشندوں کے ساتھ بسر کر دی اور دن رات ان کی شکلوں اور روزمرہ کی زندگی کو کینوس پر

اتارتا رہا..آخری عمر میں اسے کوڑھ کے مرض نے آ لیا اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں جھڑ گئیں..لیکن پھر بھی وہ مصوری سے باز نہ آیا..وہ اپنے بائیں ہاتھ کے ٹُنڈ پر برش کو رسّی سے بندھوالیتا اور تصویریں بناتا رہا..

جب اُس کی موت ہوئی تو جو شخص اُس کے جھونپڑے میں داخل ہوا اس کا کہنا تھا کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جنت میں آ گیا ہے..ہر سو عجیب الوہی رنگ تھے..آبشاریں' پرندے اور پھل تھے..حسین عورتیں اور گل بوٹے تھے..گوگین نے اپنے آخری ایام میں اپنے جھونپڑے کے در و دیوار کو پینٹ کرنا شروع کر دیا تھا اور اس نے وہاں اپنے تصور کے مطابق ایک ذاتی جنت بنائی تھی جس میں وہ موت کے بعد جانا چاہتا تھا..اس جھونپڑے کو نذرِ آتش کر دینا ایک مجبوری تھی تا کہ کوڑھ کے جراثیم بقیہ جزیرے میں نہ سرایت کر جائیں..اگر وہ جھونپڑا محفوظ رہتا تو یقیناً یہیں کہیں نمائش پر ہوتا اور ہم بھی جنّت کو اُسی زندگی میں دیکھ لیتے..اگرچہ وہ گوگین کی جنّت ہوتی..

ہر مذہب اور ہر عقیدے کی جنّت جدا ہوتی ہے..اُس خطے کی نا آسودہ خواہشوں کی تصویر ہوتی ہے..صحرا نشین پانی اور شہد کی نہروں کے خواب دیکھتا ہے اور برفانی خطوں کے آتش پرست گرم ہواؤں اور تیز شراب کے آرزومند ہوتے ہیں..اسی طور ان کے دوزخ بھی جدا ہوتے ہیں..برفانی موسموں کے مارے ہوئے دوسروں کے جہنم میں سلگتے الاؤ کے گرد بیٹھ کر جنّت کے مزے لیتے ہیں..کچھ یونہی ہر فرد کی اور اگر وہ فرد جو تخلیق پر قادر ہو اس کی جنّت بھی سب سے الگ اور کسی بھی عقیدے سے ماورا ہوتی ہے..اور ہر عاشق کا بہشت بھی ایسا ہوتا ہے جس میں صرف اس کا عشق خاص جو اسے اِس دنیا میں نہ ملا..اُس دنیا میں مل جاتا ہے..

مجھ سے مت پوچھئے گا میری خیالی جنت کیسی ہوگی اور اُس میں کون ہوگا..اور اس میں کسی پردہ نشین کا نام نہیں آتا..

تاہیٹی جزیرے کے سمندروں میں بہت عرصہ پہلے میں نے امریکی جریدے ''ٹائم'' کے آرٹ سیکشن میں موٹر بوٹ چلاتے نیکر میں ملبوس ایک فربہ اور بوڑھے شخص کی تصویر دیکھی تھی جو اپنے آپ کو پال گوگین کا ناجائز بیٹا قرار دیتا ہے اور معمولی سی تصاویر پینٹ کر کے ان پر ''گوگین'' کے دستخط کر کے پُرشوق سیاحوں سے ڈالر کماتا ہے..ویسے میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ یہ ناجائز اولاد

کیا ہوتی ہے.. اولاد تو ہمیشہ جائز ہوتی ہے البتہ اس کو جنم دینے والے ماں باپ ناجائز ہو سکتے ہیں..

موما میں گوگین کی ایک اور نہایت ہر دلعزیز تصویر ''آ رائے کا بیج'' بھی نمائش پر ہے.. ایک سیاہ فام موٹی ناک والی موٹی عورت.. تاہیٹی کے جزیرے کی ایک عورت.. گوگین اسے ایک قابل پرستش دیوی کے روپ میں دیکھتا ہے.. برہنہ بدن.. اُس کے چرنوں میں عجیب ذائقوں والے مقامی پھل اور پس منظر میں پہاڑ نیلاہٹ میں ڈوبے ہوئے.. زرد پتّوں والے پام کے درخت اور الوہی بادل..

میں نے خصوصی طور پر اس تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر ایک تصویر اتروائی کہ گوگین کے ساتھ میری ذہنی مطابقت تھی.. میں بھی اکثر اپنی آسودہ زندگی ترک کر کے کسی تاہیٹی جزیرے میں چلا جانا چاہتا تھا اور وہ کچھ لکھنا چاہتا تھا جو میں اس معاشرے میں لکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا سنگساری کی موت سے بہت خوف آتا ہے لیکن مجھ میں حوصلہ نہ تھا.. بقول ایک کُونج کے.. تم میں خواہش تو ہے لیکن حوصلہ نہیں ہے اس لئے تم وہ کچھ حاصل نہیں کر سکے جو حاصل کر سکتے تھے..

یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میوزیم ماڈرن آرٹ کا ہو اور اُس میں باوا آدم پکاسو نہ ہوں.. وہ یہاں کافی ہیں..

اُس کی سب سے نمایاں تصویر ''ایک قحبہ خانے میں پانچ برہنہ طوائفیں'' یہاں موجود ہے اور یہ ایک بہت بڑے کینوس پر محیط ہے.. ایک خاتون آرٹ نقاد اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس تصویر کے اسرار و رموز بیان کر رہی تھیں اور میں نے کم از کم پندرہ منٹ نہایت مؤدب ہو کر.. کبھی سمجھتے اور اکثر نہ سمجھتے ہوئے بھی ان اسرار و رموز کو نہایت دلچسپی سے سنا.. یہ کچھ ٹیڑھی میڑھی.. بے ڈھنگی قسم کی طوائفیں ہیں جن کے چہروں میں کچھ کشش نہیں اور نہ ہی ان کی برہنگی میں کچھ ہیجان ہے.. ایک قابل رحم کراہت کا تاثر ہے جو اس تصویر کو دیکھنے سے ابھرتا ہے..

یہاں پکاسو کا مجسمہ ''گٹار'' بھی آپ کے سامنے آ جاتا ہے..

یہ 1912ء میں تخلیق کیا گیا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا جوڑا توڑا گیا.. ٹین کی ایک چادر کو نہایت بھدے طریقے سے کاٹ کر اس میں ایک جستی پائپ نصب کر کے چند آہنی تاریں اس میں ٹانک دی گئی ہیں اور حیرت انگیز طور پر اس کا مجموعی تاثر ایک گٹار کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا..

بیسویں صدی میں ایک مجسمہ یا تراشا جاتا تھا یا ڈھالا جاتا تھا پکاسو نے اس روایت سے بغاوت

کر کے عام اشیاء اور کاٹھ کباڑ کو ترتیب دے کر ایسے ''مجسمے'' بنائے.. سائیکل کے ایک ہینڈل سے بھینسے کا سینگوں والا سر بنا دیا..

مجھے بکری کی تلاش تھی..

کسی بھی بکری کی نہیں.. پکاسو کی ''بکری'' کی.. جو شنید تھی یہیں کہیں موما میں ہے اور دنیا بھر کی بکریوں پر فوقیت اس لئے رکھتی ہے اسے پکاسو نے بنایا ہے.. میں اس مجسمے کو کوشش بسیار کے باوجود تلاش نہ کر سکا..

ہنری ماتیس بھی رنگوں اور شوخیوں کا ایک اور جادوگر ہے.. وہ بھی کسی حد تک شاگال کی مانند سادہ اور بظاہر بچگانہ شکلیں بنا کر آپ کے ذہن کے کینوس پر ایک بھرپور تاثر ثبت کر دیتا ہے..

''پیانو کا سبق'' کے علاوہ اُس کی تصویر ''سرخ سٹوڈیو'' بھی ایسی ہے جس میں اس نے اپنے مصوری کے سٹوڈیو کو سراسر سرخ رنگوں میں پینٹ کیا ہے اور اس کی دلکشی ایسی ہے کہ آپ اسے دیکھ کر ایک عجیب سرخ رنگی مسرت سے دوچار ہوتے ہیں.. اس کی تصویر ''رقص'' کو دیکھ کر ایک شعر کی مانند داد دینے کو جی چاہتا ہے کہ ماتیس صاحب.. کیا کہنے.. کیا خوب کہا ہے.. اس میں پانچ عورتیں حرکت میں ہیں جو لگتا ہے کہ قونیہ کے گھومتے رقص کرتے درویش ہیں جو ابھی کینوس سے باہر آ جائیں گے..

ہنری ماتیس کو مراکو جانے کا اتفاق ہوا تو وہ یورپ کے ٹھنڈے اور بجھے ہوئے رنگوں کو فراموش کر کے افریقہ کے بھڑکتے اور شوخ رنگوں اور وہاں کی تیز دھوپ کا اسیر ہو گیا.. اور اس کے بعد اس کی تمام تصاویر میں رنگوں کی یہی شوخ بارش اور سلگتی ہوئی دھوپ ہے اور اس کی ایک مثال اس کی تصویر ''مراکو والے'' ہے.. ماتیس نے رنگین چمکیلے کاغذوں کو قینچی سے کاٹ کر انہیں سفید گتے پر چسپاں کر کے بھی کچھ اثر انگیز تجربے کئے ہیں اور ان میں ''سوئمنگ پول'' اور ''چاقو پھینکنے والے'' بھی کیا خوب ہیں..

موما میں سب سے بڑی اور طویل تصویر جو چودہ فٹ لمبی اور ساڑھے چھ فٹ چوڑی ہے کلاڈ مونے کی ''واٹر للیز'' یا ''پانی کے کنول'' نام کی ہے جو ایک پوری دیوار پر آویزاں ہے.. اور یہ صرف ایک کینوس پر نہیں بنائی گئی بلکہ تقریباً ایک درجن کینوس کے ٹکڑوں کو الگ الگ پینٹ کر کے پھر انہیں یوں جوڑ کر کہ جوڑ نظر نہ آئیں تخلیق کی گئی ہے..

یہ محض ایک تصویر نہیں..ایک قدرتی منظر ہے جو آپ کے سامنے پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے..جس میں ایک تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی ہیں..اس پر کہیں کائی ہے اور کہیں کنول نمودار ہوتے ہیں..روشنی ہے اور آسمان کی نیلاہٹ ہے جو پانیوں میں عکس ہو کر انہیں نیلگوں کرتی ہے..اسے دیکھتے رہیے تو کچھ دیر بعد محسوس ہوگا یہ پانی بے کنار ہیں اور ان میں کھلے کنول آپ کے بدن میں منتقل ہو رہے ہیں..

اس پینٹنگ کے سامنے ایک طویل بنچ خصوصی طور پر رکھا گیا ہے اور وہاں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی' ہر ملاقاتی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ وہاں آرام سے بیٹھ کر اپنے سامنے بچھے اس منظر کو تادیر دیکھتا رہے..اپنی نظروں میں اتارتا رہے..ہر شاہکار تصویر کی مانند مونے کی ''واٹر للیز'' کو تادیر دیکھتے چلے جانے سے..اسے اپنے اندر جذب ہوتے محسوس کرتے جانے سے کوئی ایک لمحہ ایسا آتا ہے آپ یکسر تنہا ہو جاتے ہیں..آوازیں مدہم پڑنے لگتی ہیں..آس پاس کے لوگ تحلیل ہو جاتے ہیں صرف آپ رہ جاتے ہیں یا آپ کے سامنے تالاب میں کھلے کنول..آپ نہایت آسانی سے ان میں سے کسی کنول کو ہاتھ بڑھا کر چھو سکتے ہیں..

ہسپانوی مصور میرو بھی نہایت پرکیف اور مزے کا پینٹر ہے..سوریلزم کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کی تصاویر..بس ایسی ہوتی ہیں جیسی بس میرو ہی پینٹ کر سکتا ہے..جب وہ ''دنیا کی پیدائش'' پینٹ کرتا ہے تو کچھ رنگ ہیں..دائرے ہیں..زرد دھاگے ایک ستارہ اور ایک تکون ہے جو واقعی ایک پیدائش کا تاثر دیتے ہیں..میرو کہتا تھا میں کبھی کوئی واضح منصوبہ نہیں بناتا تھا کہ میں نے آج یہ پینٹ کرنا ہے بلکہ میں برش اٹھا کر کینوس پر رکھ دیتا تھا اور جو پینٹ ہوتا جاتا تھا وہ پینٹ کرتا چلا جاتا تھا..اور پھر آہستہ آہستہ کوئی تصویر کوئی خیال خود ہی وجود میں آنے لگتا تھا..

پال کلی..جرمن مصور بھی میرو کے قبیلے کا ایک اہم فرد ہے اور اس کی تصویریں بھی ایسی ہیں جو روایتی مصوری کے معیار پر ہرگز پوری نہیں اُترتیں..

شاید نہیں بلکہ یقیناً آپ جدید مصوری کی اتنی تفصیل سے اکتا چکے ہوں گے..مجھے دوش نہ دیجیے کیونکہ میں نے پہلے ہی آپ کے سامنے ایک متبادل پیش کر دیا تھا' بے شک ان بور اوراق کو پلٹ کر آگے بڑھ جایئے میں معترض نہیں ہوں گا..میں ماڈرن آرٹ کے ان شاہکاروں کا قدرے تفصیلی تذکرہ صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ اگر آپ روایت کی تختی پر لکھی عبارتوں کو چند

لمحوں کے لیے بھول کر ان جدید تحریروں کو ذرا ہمدردی اور جاننے سمجھنے کی نیت کر کے ایک نظر دیکھ لیں تو شاید میری طرح آپ کا یہ تاثر یا تصور بھی باطل ثابت ہو جائے کہ ماڈرن آرٹ ایک ڈھونگ ایک تماشا ہے..یہ آرٹ ہے!

چلئے آپ ہسپانوی مصور سلواڈور ڈالی کی ایک تصویر پر غور کر لیجیے..ڈالی جو ابھی میری نوجوانی کے زمانوں میں اپنی موم سے اکڑائی ہوئی تیکھی مونچھوں اور چھڑی کے ساتھ ہمارے درمیان موجود تھا اور یہ تصویر ''یادداشت کا اصرار'' ہے..آپ کی ٹھوس یادیں کیسے موم کی مانند زمانے کی کڑی دھوپ سے ڈھیلی ہو کر اپنی ہیئت کھو بیٹھتی ہیں..اس میں تین نیلے رنگ کی گھڑیاں نمایاں ہیں جن کی سوئیاں جامد ہیں..چل نہیں رہیں..وہ تھما ہوا وقت ہیں..ان میں سے ایک گھڑی کسی خزاں رسیدہ ٹہنی سے ڈھکی ہوئی ہے..دوسری ایک چبوترے کے کنارے سے بہنے کو ہے..گرنے کو ہے اور تیسری کا چہرہ مصور سے مشابہت رکھتا ہے اور وہ بھی مردہ پڑی ہے..وقت ایک مقام پر ٹھہر چکا ہے' یادیں بے روح ہو کر مر چکی ہیں..وقت اور زمانے کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی..ڈالی کا نظریہ تھا کہ ایک تصویر پینٹ کرنے کے لیے حقیقت کی نہیں بلکہ فریب خیال اور تصور کے دھوکے کی ضرورت ہوتی ہے' ایک پاگل شخص اور مجھ میں فرق یہ ہے کہ.....میں پاگل نہیں ہوں..

آپ کو شاید خیال آیا ہو کہ یہ میوزیم آف ماڈرن آرٹ ہے اور امریکہ میں ہے اور اس کے باوجود یہ ملک جدید ترین ہے تو ابھی تک کسی امریکی مصور کا تذکرہ نہیں ہوا..دراصل امریکی چاہے کتنے ہی ماڈرن ہو جائیں وہ بہرطور پیروی یورپ کی کرتے ہیں..مصوری میں بھی یہی صورتِ حال ہے..

امریکیوں میں جیکسن پولاک اینڈ ریوار ہال اور کوننگ ایسے مصور موجود ہیں جن کے تخلیقی جینئس میں کچھ شک نہیں..

ان میں پولاک وہ مصور ہے جو ماڈرن آرٹ کی ''بدنامی'' کا باعث بنتا ہے کیونکہ وہ کینوس کو فرش پر بچھا کر پھر اس پر رنگوں کی بوچھاڑ کرتا ہے..کبھی رنگوں کے ڈبے بے دریغ انڈیل دیتا ہے اور کبھی اس پر رنگوں کی پچکاریاں چلاتا ہے..اور اکثر اس کینوس پر چہل قدمی کر کے تصویر مکمل کرتا ہے..اس لئے اس کی تصاویر میں بے پناہ رنگینیاں ہیں اور وہ کشش سے عاری نہیں ہیں..کیا ہر کوئی اس انداز سے رنگوں کو کینوس پر پھینک کر تصویریں بنا سکتا ہے یہ تو بچے بھی کر سکتے

ہیں۔ نہیں.. بہت سوں نے کوشش کی پر ان کو میر کا انداز نصیب نہ ہوا.. یہ صرف پولاک ہے جو اس نوعیت کی رنگین حرکات کرے تو ایک خاص تاثر وجود میں آتا ہے..موما میں اس کی تصاویر ''مادہ بھیڑیا'' اور ''نومبر 31-1950ء'' نمائش پر ہیں جو اس بے دریغ تکنیک جسے ''ڈرپ'' کہا گیا کے استعمال سے وجود میں آئیں..

ایک زمانے میں اینڈریو وارہال کا بھی بہت چرچا تھا اور ''ٹائم'' میگزین میں اسے ماڈرن آرٹ کا ایک گورو کہا گیا تھا..اس کی تصویر ''سنہری مارلن منرو'' بہت زیر بحث آئی تھی..اور تصویر صرف یہ ہے ایک سنہری رنگ کے کینوس کے درمیان میں منرو کی ایک سنہری بالوں والی تصویر چسپاں کر دی گئی تھی اور یہ کسی حد تک میڈونا یعنی بی بی مریم سے مشابہت رکھنے پر مذہبی تصور کے قریب تھی..

موما میں صرف تصویریں' مجسّمے اور ماڈرن آرٹ کے شعبدے ہی نہیں..خود موما بھی ہے..اس کی عمارت بھی ہے..جاپانی یوشیوتانی گوچی نے بھی اس عمارت کی صورت میں روشنی' وسعت اور مسرت کی حامل ایک تصویر بنائی ہے.. یہاں نظر کہیں اٹکتی نہیں' ہوا کے ایک سبک جھونکے کی مانند ہولے سے چلتی جاتی ہے..اگر اس عمارت کے اندر ایک بھی تصویر آویزاں نہ ہوتی یہ بالکل خالی ہوتی تو بھی شاید اتنے ہی لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے اس میں سانس لینے کے لیے آتے' یہ کنکریٹ اور شیشے سے تخلیق کردہ ایک شاہکار تصویر ہے..

سلجوق اگرچہ ایک سفارت کار ہو چکا ہے لیکن اس کے اندر کا آرکیٹکٹ اسے سانس نہیں لینے دیتا اور وہ موما کی عمارت کا نام ایسے لیتا ہے جیسے کسی مقدّس معبد کا تذکرہ ہو رہا ہو..جب کبھی موقع ملتا ہے وہ ادھر نکلتا ہے..تصویریں نہیں دیکھتا اس عمارت اور اس کے اندر سرایت کرنے والی دھوپ کے زاویے مبہوت ہو کر دیکھتا رہتا ہے..

کیا ایک دن کے لیے ماڈرن آرٹ کچھ زیادہ تو نہیں ہو گیا؟..ہو گیا ہے یقیناً!

صرف بدن اور پاؤں ہی پژمردہ نہیں ہوتے نظر بھی تھک جاتی ہے ایک دن میں اتنا ڈھیر سارا ماڈرن آرٹ برداشت کر جانا اور پھر بھی سانس لیتے رہنا بڑے حوصلے کی بات ہے تو جب شام ڈھلتی تھی اور موما کی بلند کھڑکیوں میں سے نظر آنے والی عمارتیں شفق رنگ ہو کر نیویارک کے سونے کے گہنے ہوئی جاتی تھیں..میں سیڑھیوں سے اتر کر..اس عمارت کے آغوش

میں جو مختصر باغیچہ تھا..شہر کے شور کے درمیان ایک جزیرہ تھا اس میں اتر آیا..

میں بہت تھک چکا تھا..

پر ابھی اتنے حواس میں تھا کہ یونہی کسی بھی بنچ پر نہیں جا بیٹھا بلکہ گائیڈ بک کے مشورے کے سامنے سر تسلیم خم کر کے میں نے اپنے آپ کو سکاٹ برٹن نامی کسی شخص کی تخلیق کردہ ''چٹان کرسیوں'' پر اپنے آپ کو بٹھایا..یہ کرسیاں ایک قدرتی چٹان کو تراش کر یوں بنائی گئی تھیں کہ قدرتی لگتی تھیں..

یہ ایک نہایت ہی دل میں اترنے والا مختصر باغ تھا جہاں شام ڈھلے ایک خاموشی اُترتی تھی..اگرچہ وہاں آپ جیسے درجنوں لوگ آرام کی خاطر ادھر ادھر ستا رہے ہوتے ہیں لیکن آپ محسوس یہی کرتے ہیں بس آپ ہیں اور یہ چھوٹا سا شہر کے شور میں چُپ ایک گوشہ ہے..

تالاب کے کناروں پر اُمڈی ہوئی ایک یونانی خدوخال کی موٹی تازی برہنہ عورت تھی جس کے چہرے پر اذیت کا کوئی لمحہ پتھر ہو چکا تھا ''دریا'' نام کا یہ مجسمہ ایک فرانسیسی میلاٹ نے تراشا تھا..

کہا جاتا ہے میلاٹ نے یہ مجسمہ جنگ کی ہولناکیوں کے احتجاج کی صورت میں بنایا تھا..ایک متناسب بدن کی عورت ہے جس کی کمر میں چھرا گھونپ دیا گیا ہے اور گر رہی ہے..آخری سانس لیتی مرتی ہوئی گر رہی ہے..لیکن پھر اُسے ایک اور خیال آ گیا اور تخلیق کرنے والے لوگوں کے مزاج کا کچھ پتہ نہیں ہوتا نہیں جانے کب کیا خیال آ جائے..

بشیر مرزا..بی ایم..یقیناً ایک بڑا مصوّر..مجھے سامنے بٹھا کر اپنے شوخ راجستھانی اور پنجابی رنگوں میں میری پورٹریٹ بنا رہا ہے..چند روز بعد جب یہ پورٹریٹ مکمل ہو جاتی ہے اور میں اسے پہلی مرتبہ دیکھتا ہوں تو پوچھتا ہوں ''بی ایم..یہ میں ہوں؟''

''میرے کینوس کے سامنے اتنے روز تم ہی بیٹھے رہے ہوناں..تو اور کون ہو سکتا ہے؟ تم ہو..''

''میں اس میں اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہا..''

''تم کیسے پہچان سکتے ہو..تم اپنے آپ کو دیکھنا چاہتے ہو..اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق..لیکن یہ وہ ہے جو دراصل تم ہو..جو تم نہیں دیکھ سکتے..صرف میں دیکھ سکتا ہوں..یہ تصویر کچھ بھی ہو سکتی ہے..تارڑ کی پورٹریٹ..ایک خانہ بدوش' ایک اجڑا ہوا مکان' رنگوں کا سوداگر' وحشت... ایک بیاباں..کچھ بھی..''

بشیر مرزا کی یہ پورٹریٹ میرے ڈرائنگ روم میں آویزاں ہے اور میں جب کبھی اس کے قریب جاتا ہوں تو مجھے اس میں اپنا آپ نظر آنے لگتا ہے.. ایک اجڑا ہوا مکان.. رنگوں کا سوداگر.. وحشت.. ایک بیاباں.. کچھ بھی..

تو میلاٹ کو بھی ایک اور خیال آ گیا کہ دراصل یہ عورت ایک ''دریا'' ہے.. یہ مجسمہ ایستادہ نہیں بلکہ ایک تالاب پر گرا ہوا ہے اور اس کے ہاتھ پانی کے بہاؤ میں آ کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں.. اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچا رہے ہیں.. چنانچہ میں گائیڈ بک کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر پہلے تو چٹانی کرسیوں پر براجمان ہوا پھر بھدے بدن کی ''دریا'' عورت کا مشاہدہ کیا اور پھر تھک ہار کر ایک معمولی سے بنچ پر بیٹھ گیا اور اپنی جیکٹ جو میں ایک عرصے سے دائیں بازو پر لٹکائے پھرتا تھا اسے اپنے برابر میں آویزاں ایک مجسمے کی تھوتھنی سے لٹکا کر نیم دراز ہو گیا۔

میں میوزیم کے بند ہونے کا منتظر تھا..

کیوں؟

ہر میوزیم میں شاہکار اور نادر اشیاء تصویروں اور مجسموں پر کڑی نظر رکھتے ایسے گارڈ یا پہریدار تعینات ہوتے ہیں جو اپنی مخصوص وردیوں میں بُت بنے کھڑے رہتے ہیں.. اور جونہی کوئی شخص کسی شاہکار تصویر کے بہت قریب ہو کر اسے ہاتھ لگاتا ہے.. پکاسو یا فان گوگ کے دستخطوں کو ثواب حاصل کرنے کی خاطر چھوتا ہے تو وہ بُت حرکت میں آ جاتے ہیں..

ایک ایسا ہی بُت.. جو ساکت تھا.. بارلیش تھا.. مسکرانے لگا.. ہولے ہولے میری جانب آنے لگا.. ''تارڑ صاحب آپ کہاں..''

اب آپ ہی انصاف کیجیے اگر ایک بُت اور وہ بھی بارلیش زندہ ہو کر آپ کی جانب آنے لگے اور پوچھے آپ کہاں تو آپ کیا جواب دے سکتے ہیں.. چنانچہ میں بُت بنا کھڑا رہا.

''آپ تارڑ صاحب ہی ہیں ناں..''

''ہاں جی..''

''میں نے جامشورو یونیورسٹی میں ماسٹرز کیا ہے.. یہاں نیویارک میں پارٹ ٹائم پڑھ رہا ہوں اور فُل ٹائم موما میں ایک گارڈ کی حیثیت سے ملازمت کر رہا ہوں.. میں نے آپ کی بہت ساری کتابیں پڑھ رکھی ہیں اور پلیز آپ آج شام میرے ساتھ کھانا کھایئے.. نہیں تو کافی

ضرور پیجیے..''

''آئی ایم سوری.. لیکن شاید یہ ممکن نہ ہو..'' مجھے اس نوعیت کی دعوت قبول کرنے میں ہمیشہ جھجک رہتی ہے..

''آپ یہاں سے فارغ ہو کر کہاں جائیں گے؟''

''یہاں کی سوونیئر شاپ سے کچھ شاہکار تصاویر کے پرنٹ خریدنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور پھر اپنے بیٹے کے فلیٹ میں چلا جاؤں گا.. بہت تھک چکا ہوں..''

''تارڑ صاحب چونکہ میں میوزیم آف ماڈرن آرٹ کا ملازم ہوں اس لیے سوونیئر شاپ میں خریداری پر ہمیں اچھا خاصا ڈسکاؤنٹ ملتا ہے تو شاپنگ کرنے کے لیے مجھے بھی ساتھ لے جایئے گا..''

اس ترغیب نے مجھے پھانس لیا.. اگر اس بارلیش نوجوان کی بدولت میرے کچھ ڈالروں کی بچت ہو جاتی ہے تو کیا مضائقہ ہے..

تو میں میوزیم کے بند ہونے کا منتظر تھا تاکہ وہ نوجوان سومرو نام کا اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آ جائے اور میں اس کے ہمراہ سوونیئر شاپ میں جا کر سستے داموں کچھ پرنٹس خرید سکوں.. اس دوران میں نے محسوس کیا کہ جو بھی میرے قریب سے گزرتا ہے وہ مجھے اور پھر اُس مجسمے کی تھوتھنی کے سینگوں سے لٹکتی ہوئی میری جیکٹ کو ضرور دیکھتا ہے..

کچھ لوگ مسکرا دیتے ہیں اور کچھ ناک چڑھا کر گزر جاتے ہیں..

یہ عجیب سی شامیں ہوتی ہیں آپ کے آس پاس جتنے لوگ موجود ہوتے ہیں ان سب کو فراموش کر کے صرف آپ پر اترنے لگتی ہیں اور کبھی تنہا نہیں آتیں تنہائی کو ساتھ لے کر آتی ہیں.. وہ دن اور تھے جب آپ کسی بھری پری محفل میں کسی ایک چہرے کی ہوس میں تنہا ہو جاتے تھے اور اس میں بھی عجب کیف تھا لیکن یہ دن اور ہیں جب نہ کسی کی خواہش ہوتی ہے اور نہ ہوس اور آپ پھر بھی اچھوت ہو جاتے ہیں، تنہا ہو جاتے ہیں.. نیویارک میں اکثر ایسا ہونے لگا تھا.. اور یہ صرف زمانوں کا بوجھ تھا جو گزر چکے تھے..

کچھ دیر بعد ایک جاپانی سیاح لڑکی.. اور وہ ایک مڈل ایجڈ خاتون بھی ہو سکتی تھی.. مکمل گلابی پن میں رنگی ہوئی.. جین اور جیکٹ.. بیک پیک، جوگرز اور جرابیں.. بال اور ان میں بندھا

ایک ربن اور ظاہر ہے لپ سٹک بھی سراسر گلابی گلابی.. میرے قریب ہو کر ہکلاتے ہوئے کچھ کہہ رہی ہے.. اور میں اس شام کی آزردگی میں سے ذرا باہر آیا کہ کسی نے تو مجھے توجہ کے لائق سمجھا.. اور غور کرتا ہوں تو کہہ رہی ہے.. معاف کیجیے گا.. یہ.. یہ جیکٹ آپ کی ہے!.. جو ٹنگی ہوئی ہے..

''بالکل ہے..''

''کیا آپ اسے اٹھالیں گے پلیز..''

''ہاں کیوں نہیں.. پر.. کیوں؟''

''تاکہ میں پکاسو کی ''بکری'' دیکھ سکوں.. آپ نے اپنی جیکٹ اس کے سینگوں کے ساتھ لٹکا رکھی ہے..''

''جی جی..'' میں نے فوراً جیکٹ اتار کر اپنی گود میں رکھ لی.. اور جاپانی لڑکی دھڑا دھڑ بکری کی تصویریں اُتارنے لگی جن میں یقیناً میرا ہراساں چہرہ بھی شامل ہو گیا ہو گا' کبھی اُن کو اور کبھی بکری کو دیکھنے والا ہراساں چہرہ.. مجھے یہ مجسمہ شناسا سا تو لگا تھا لیکن یہ امکان میری سوچ میں نہیں آسکتا تھا کہ پکاسو کے مشہور ترین جدید مجسموں میں سے ایک یوں کھلے عام پڑا ہو گا.. مجھ سے کیسی بے ادبی ہو گئی تھی.. ایسے نادر آرٹ کی ہر کتاب میں شائع شدہ کروڑوں ڈالروں کے اس مجسمے کو میں نے ایک کھونٹی کے طور پر استعمال کیا تھا.. جانے میرا یہ گناہ کبیرہ آرٹ کی قیامت میں معاف ہو گا یا نہیں..

تو یہ وہی بکری تھی..

میرا جی چاہا میں کم از کم اس بکری کا منہ چوم لوں کہ یہ پکاسو کی بکری تھی.. اور پھر اس گلابی جاپانن کو دیکھا کہ کیسے زمانے آ گئے ہیں ہم بے شک چپٹی ناک اور مہین آنکھوں والے بہر طور مہ رخوں کی موجودگی میں ایک بکری کا منہ چومنے کو بے قرار ہیں..

میوزیم کے بند ہونے کے اوقات کے کچھ دیر بعد سومرو اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر حسب وعدہ باغیچے میں چلا آیا.. میں نے بکری کے پھولے ہوئے پیٹ پر ایک الوداعی تھپکی دی پھر ملیں گے گر خدا لایا اور پھر سومرو مجھے سووینیئر شاپ میں لے گیا.. جہاں میں نے اپنی من پسند تصویروں کے پوسٹر خریدے.. کئی رنگ اور کیلنڈر خریدے اور ان پوسٹرز میں ظاہر ہے ''تاروں بھری رات'' سرفہرست تھا.. یہ سب میرے لیے بہت سستے ہو گئے جب سومرو کی مہربانی سے ان کے دام نصف کر دیئے

گئے.. صرف یہی نہیں اس نے مجھے ''موما ہائی لائٹس'' گائیڈ بک نہایت اصرار کر کے تحفے کے طور پر پیش کر دی.. اگرچہ اسے اصرار کرنے کی چنداں حاجت نہ تھی میں اس گائیڈ بک کو بھی خریدنا چاہتا تھا لیکن اس کی قیمت جو نصف ہو جاتی تھی اس سے بھی ڈر گیا تھا.. شاپنگ کے بعد سومرو مجھے موما سے منسلک ''سٹار بک کافی'' کے آسودہ اندرون میں لے گیا جہاں کافی کے ایک تیز گلے میں کڑواہٹ کے لطف اتارنے والے پیالے کے بعد میں اس کی میزبانی اور مہربانی کا تفصیلی شکریہ ادا کرنے کے بعد باہر آ گیا..

باہر نیویارک کے گلی کوچوں میں آ گیا.. رواں' پُر رونق اور خوش نظر.. ایک اور شام میں آ گیا..

اور میں تنہا نہ آیا.. وہ شاہکار جن کے سامنے میں تنہا ہوا تھا وہ بھی میرے ساتھ چلے آئے.. پکاسو کی ''تین فاحشہ عورتیں''.. اس کی ''گٹار'' مونے کا کنول کے پھولوں سے لبریز تالاب' گوگین' شاگال' ڈالی سب کے سب چلے آئے اور شاید میرے اوپر ایک سرخ ہیلی کاپٹر بھی معلق چلا آیا..

شام ہو رہی تھی اور اس کے باوجود میرے اوپر فان گوگ کی ستاروں بھری رات تھی..

پکاسو کی بکری میرے برابر میں چلتی تھی.. اگر چاہو تو اپنی جیکٹ میرے سینگوں میں لٹکا دو.. اور ان سب کے ساتھ میرے پیچھے پیچھے تنہائی بھی چلی آئی..



''نیچرل ہسٹری میوزیم''

پیارے قارئین بے شک میں قصوروار ہوں میں اب تک آرٹ کا جو جوشاندہ زبردستی آپ کو پلاتا رہا ہوں اُس کے ردعمل میں میں آپ کا پیارا مصنف نہیں رہا.. ہرگز نہیں رہا.. لیکن یقین کیجیے کہ آپ پھر بھی میرے پیارے قارئین ہیں.. مجھے یقین ہے کہ اس باب کے عنوان کو پڑھتے ہی آپ پر غشی کے دورے پڑ رہے ہوں گے.. آپ مجھے برا بھلا کہہ رہے ہوں گے کہ.. ہائیں ایک اور میوزیم.. یہ شخص آخر ہم سے کیا چاہتا ہے کہ ہم آرٹ سے بیزار ہو کر اب خودکشی کرلیں.. کیا کرلیں..

لیکن اے بدستور پیارے قارئین یہ جو میں بیان کرنے چلا ہوں ایک آرٹ میوزیم نہیں ہے.. یہ ایک نہایت انوکھے تجربے کا.. نسل انسانی اور حیوانوں کے ارتقاء کی کڑیاں نمائش کرتا ایک میوزیم ہے.. آپ کو آپ کی اصل اور ابتدائی شکل دکھانے والا میوزیم ہے..

بے شک فان گوگ یا رینائر کی تصاویر اور روڈین کے مجسمے اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتے ہیں لیکن.. قبل از تاریخ کے ڈائناسار اور ان کی مختلف اقسام کے روبرو ہونا.. اور یہ جاننا کہ یہ حضرات.. یعنی ڈائناسار اپنی نسل کی بقاء کے لیے جنسی عمل کیسے کرتے تھے.. کیا ایک مادہ ڈائناسار اس دوران لذت کی منزلیں طے کرتی ہوئی کچھ آہ و بکا کرتی تھی یا نہیں.. وہ بولتے تھے یا نہیں.. یا پھر سندباد جہازی کو سفروں کے دوران جن بڑے جہازی سائز کے پرندوں سے سابقہ پڑتا تھا تو وہ پرندے کیسے ہوتے تھے.. ان کے پروں میں کتنی ہڈیاں ہوتی تھیں..

یا پھر دنیا کے مختلف خطوں میں انسانی تہذیب کا ارتقاء کیسے ہوا..

اور پھر ایک گھوڑا.. کیسے ایک گھوڑا ہوا..

کیا یہ سب مظاہر آرٹ کی دنیا سے کہیں زیادہ دلچسپ نہیں..

یعنی ایک گھوڑا کیسے ایک گھوڑا ہو گیا..

گھوڑا.. یونہی تو گھوڑا نہیں ہو گیا تھا.. ہم انسانوں کی مانند اسے بھی ایک ارتقائی عمل سے گزرنا پڑا تھا اور تب جا کر وہ موجودہ شکل کا گھوڑا ہوا تھا..

یہ جو آپ اپنے آس پاس مختلف حیثیتوں اور شکلوں کے گھوڑے دیکھتے ہیں یہ یونہی گھوڑے نہیں ہو گئے تھے..

گھوڑوں میں بھی ہم انسانوں کی مانند ذات پات کا تفاخر موجود ہے..

آریائی گھوڑا اپنے آپ کو بہت برتر سمجھتا ہے.. ریڈ انڈین گھوڑا کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتا.. منگولیا کا ہر گھوڑا اب بھی اپنی پشت پر چنگیز خان کو لیے پھرتا ہے.. آئرش اور انگریز گھوڑے ویسے ہی اپنی نسلی برتری کے زعم میں اٹھلاتے پھرتے ہیں اور عربی گھوڑا ان سب کو کمی کمین سمجھتا ہے..

لیکن یہ سب گھوڑے یکدم گھوڑے نہ ہوئے.. یونہی گھوڑے نہ ہو گئے.. انہیں بھی ایک ارتقائی عمل میں سے گزرنا پڑا اور تب جا کر گھوڑے ہوئے..

ابتدائی گھوڑا.. جو اس میوزیم میں ایک ڈھانچے کی صورت میں سامنے آتا ہے.. کچھ زیادہ گھوڑا نہ تھا..

یہ ایک.. لاکھوں برس پیشتر ایک پستہ قد اور لمبوترا سا کوئی جانور تھا.. یعنی اگر گھوڑا تھا تو ایک مستطیل سا گھوڑا تھا.. یوں جانیے کہ اگر آج بھی وہ اس شکل میں موجود ہوتا تو کوئی بھی اسے سنجیدگی سے نہ لیتا کہ یہ گھوڑا تو نہیں جیومیٹری کا کوئی سوال ہے جو مستطیل شکل میں سرپٹ بھاگ رہا ہے..

پھر یہ ہوا کہ یہ عجیب ہونق شکل کا جانور محض چند لاکھ برسوں میں آہستہ آہستہ عہد حاضر کی شکل کا گھوڑا ہو گیا.. سمارٹ ہو گیا!

اگر میں یہ تمام ارتقائی مراحل.. کسی ڈائناسار یا گھوڑے کے تفصیل سے بیان کرنا شروع کر دوں یعنی ان کی ہڈیوں کی تعداد.. جنسی عمل یا نظام ہضم وغیرہ تو آپ یقیناً.. جو آرٹ سے عاجز آ چکے ہیں.. آپ کی قوت برداشت ختم ہو چکی ہے تو آپ اگر مجھے زدوکوب کرنا شروع کر دیں تو میں آپ کو موردالزام نہیں ٹھہراؤں گا بلکہ آپ کے ساتھ مل کر اپنے آپ کو زدوکوب کرنے لگوں

گا کہ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..اس لیے میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تفصیل میں ہرگز نہیں جاؤں گا..کسی ڈائناسار کی گردن کا ہار نہیں بنوں گا..کسی ایک چھوٹی سی چٹان کے سائز کے قدیم کچھوے کی پشت پر سوار نہیں ہوں گا..اور نہ ہی کسی لاکھوں برس پیشتر غرق ہو چکے پرندے کے پنجوں سے لٹک کر سندباد جہازی کی مانند کسی ہیروں سے بھرے طلسمی جزیرے میں جا اتروں گا..یہ آپ سے وعدہ رہا..

نیچرل ہسٹری میوزیم ایک بلند وبالا یونانی معبد ایسی عظیم عمارت میں واقع ایک میوزیم ہے..صدر دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی نہایت ہی طویل گردنوں والے بلند چھت تک پہنچنے والی گردنوں والے ڈائناسار سے ملاقات ہو جاتی ہے..شکر ہے کہ وہ زندہ نہیں ہیں. محض ڈھانچے ہیں اگر زندہ ہوتے تو میں ان کے ساتھ ٹیک لگا کر ایک نہایت احمقانہ سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر نہایت اطمینان سے ایک تصویر کیسے اتروا سکتا تھا. جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں نیویارک کا نیچرل ہسٹری میوزیم دراصل نسل انسانی کے ارتقاء اور ثقافت..اور نسل حیوانی کی بتدریج آج کی شکل تک پہنچنے کے ادوار کی ایک داستان ہے جو اگر کتابی شکل میں ہوتی تو اتنی ضخیم ہو جاتی کہ پوری زندگی بھی اس کے مطالعے کے لیے ناکافی ہوتی لیکن یہاں صرف ایک دن میں آپ ان تمام زمانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور لکھے گئے کتاب کی صورت میں محفوظ حرفوں کی نسبت یہ ایک دن آپ کے فہم کے اندرون تک سرایت کر جاتا ہے..

ایسے میوزیم ہی نئی نسل کے ذہنوں کی آبیاری کرتے ہیں..مثلاً ایک امریکی بچہ..جو بس درمیانے درجے کی لیاقت کا حامل ہے..تھوڑا بہت شعور رکھتا ہے جب اس میوزیم کے ہالوں اور شاندار کمروں میں نمائش شدہ انسانی اور حیوانی ارتقاء کی تصویریں اور شکلیں دیکھتا ہے..دنیا بھر کی تہذیبوں کی عکاسی دیکھتا ہے..ان کی تاریخ اور ثقافت کو اس چھت تلے اپنے سامنے دیکھتا ہے..وہ کونسی زبانیں بولتے ہیں..ان کے پہناوے کیا ہیں اور ان قوموں نے تہذیب انسانی میں کیا کردار ادا کیا..یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد جب وہ میوزیم سے باہر نکلتا ہے تو وہ ایک تیسری دنیا کے بچے کی نسبت..جو شاید برتر لیاقت رکھتا ہے..بہتر شعور کا حامل ہے لیکن صرف اس میوزیم کی برکت سے وہ اس تیسری دنیا کے بچے سے فہم و دانش اور آگاہی میں کہیں آگے نکل جاتا ہے..یوں یہ ذہنی نشوونما

کا ایک ایسا زینہ ہے جو ایک امریکی بچے کو آخری سیڑھی تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتا ہے اور وہ بھی صرف ایک دن میں..جب کہ ہمارا بچہ اس زینے کے نیچے کھڑا ابھی پہلی سیڑھی پر قدم رکھنے سے جھجک رہا ہے کہ اس کے آس پاس تو ابھی یہ بحث چل رہی ہے کہ تصویر اتروانا جائز ہے یا نہیں..یا چاند نظر آ گیا ہے یا نہیں..یا میراتھن دوڑ مخلوط ہو سکتی ہے یا نہیں..ایسے میوزیم قائم کرنا تو بہت دور کی بات ہے..اور اگر خدانخواستہ ایسا ہو جائے تو اسے پہلے روز ہی ڈھا دیا جائے گا کہ اس کے اندر نمائش شدہ تہذیبیں اور انسان کے ارتقاء کی منزلیں دکھانا کفر کی تبلیغ کرنا ہے..جہاں گھوڑے کے ایک مجسمے کو صرف اس لیے مسمار کر دیا جاتا ہے کہ اسلام میں بُت بنانا حرام ہے..وہاں ایک ایسا میوزیم کیسے قائم کیا جا سکتا ہے جس میں ہر تہذیب کو ماڈلز یا مجسموں کے ذریعے روشناس کروایا گیا ہو..

یہاں دنیا کے مختلف خطّوں میں نمودار ہونے اور پرورش پانے والی تہذیبوں اور ثقافتوں کی عکاسی اتنے پر اثر طریقے سے کی گئی ہے کہ وہ زندہ لگنے لگتی ہیں..

میدانوں، پہاڑوں اور صحراؤں کی ثقافت کیسے وجود میں آئی.

اور صحراؤں کے حوالے سے یہاں مراکش اور الجیریا کے خانہ بدوش قبیلوں کی نمائندگی ہے اور چونکہ ان کا مذہب اسلام ہے اس لیے اس کی پوری تفصیل ہے کہ یہ مذہب ہے کیا اور یقین کیجیے کہ یہ معلومات..اسلام کے حوالے سے نہایت توصیفی اور کسی قسم کے تعصب سے یکسر پاک ہیں..

قبل از تاریخ کے معدوم ہو چکے پرندوں کے ڈھانچے آپ کے اوپر معلق ہیں..ان کے پروں کا پھیلاؤ حیرت انگیز ہے..ایسے پرندے جو سندباد جہازی کی داستانوں میں ملتے ہیں یا سائنس فکشن کی فلموں میں اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں..

جب یہ پوری دنیا برف سے ڈھکی ہوئی تھی..برفانی دور تھا تو اُن زمانوں میں جو نہایت بڑے بڑے زمین کو چھوتے دانتوں والے..اور زمین کو ہی چھوتے دبیز بالوں والے ''وولیز'' ہاتھی ہوا کرتے تھے..ان کے ڈھانچے اس گزر چکے عہد کو یاد دلاتے ہیں..اور یہ معلومات بھی کہ اس ڈھانچے کو جب زمین میں سے برآمد کیا گیا تو اس کے معدے میں کیا کیا تھا..اس معدوم ہو چکے ہاتھی نے آج سے کروڑوں برس پہلے ناشتے میں کیا تناول کیا تھا..کون سی جھاڑیاں، بوٹیاں اور پتے

اس کے معدے میں پائے گئے تھے..

ایک عظیم الشان سیکشن خلائی ترقی کے لیے مختص ہے..انسان کیسے چاند پر گیا..وہاں کیا دیکھا اور کائنات کیا ہے..اور ہماری دنیا اس کائنات کے مقابلے میں کیا ہے..اور اس کائنات میں ہماری حیثیت کیا ہے..

ایک اور بہت بڑے ہال میں سمندر ہیں..جہازوں کے سائز کی وہیل مچھلیاں ہیں اور آبی مخلوق ہے..میرا ایک بہت قریبی دوست کاروبار کے سلسلے میں کل دنیا گھومتا ہے..وہاں کاروبار کے علاوہ اور بہت کچھ بھی کرتا ہے لیکن اس کا تذکرہ یہاں مناسب نہیں..تو ایک بار وہ کسی نمائش کے سلسلے میں جاپان کے شہر کیوٹو گیا..واپسی پر میں نے پوچھا کہ یار تم کیوٹو کے میوزیم میں بھی گئے تھے وہاں گندھارا کے نہایت نادر اور نرالے مجسمے نمائش پر ہیں تو وہ کہنے لگا ''یار تارڑ میں اب کسی بھی میوزیم کے قریب نہیں پھٹکتا..شروع میں چند میوزیم دیکھے تو ایمان متزلزل ہونے لگا..شکوک نے سر اٹھایا..قدیم تہذیبوں کو..مصر' یونان اور بابل یا ایران کی تہذیبوں کے آثار دیکھے تو اپنی تہذیب حقیر نظر آنے لگی..متروک شدہ خدا نمائش پر دیکھے تو کپکپی طاری ہوگئی کہ آج سے دو چار ہزار برس بعد ہمارے ساتھ..اور ہمارے عقیدے کے ساتھ جانے کیا ہونے والا ہے تو میں نے یہ میوزیم وغیرہ دیکھنے ترک کر دیئے..اتنے علم کو بھاڑ میں ڈالیں جو سوال اٹھانے لگے..ایسے سوال جن کا جواب ہمیں نہیں سوجھتا..''

نیچرل ہسٹری میوزیم بھی آپ کو بہت بھٹکاتا ہے..

چلئے ایسے شکوک بھرے برگشتہ خیالات سے پیچھا چھڑا کر ان دنوں جو معدوم ہو چکا جانور بہت فیشن ایبل ہو چکا ہے اسے دیکھنے کے لیے..یعنی ڈائناسار کو دیکھنے کے لیے چلتے ہیں..

یہ بے ڈھنگا سا..ایک عظیم چھپکلہ سا..جانور ابھی حال ہی میں منظور نظر ہوا ہے ورنہ چند برس پیشتر اس کا کچھ نام ونشان نہ تھا..اور اسے متعارف کروانے میں بھی یہود کی سازش کا عمل دخل ہے کہ ہدایت کار سپیل برگ نے ایک فلم بنائی ''جیوراسک پارک'' اور ذرا ملاحظہ کیجیے کہ جیوراسک میں بھی ''جیو'' یا یہودی موجود ہے..تو صرف اس فلم کا کرشمہ ہے کہ یہ بے ڈھنگا چھپکلہ دنیا بھر میں مارلن منرو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہوگیا..آپ کہیں بھی چلے جائیں..چین' جاپان یا برازیل میں یہ جانور آپ کو وہاں دکھائی دے گا..کھلونوں میں..ملبوسات میں' کتابوں اور

ریستورانوں میں..تفریحی پارکوں میں..ہر جگہ یہ جانور جلوہ گر ہوتا ہے..میری بھتیجی ڈاکٹر نیناں کے کمرے میں نہ تو سپر سٹارز اور پاپ سنگرز کے پوسٹر ہیں اور نہ بیماریوں کے طبی چارٹ بلکہ ہر سُو ڈائناسار کی تصویریں اور ماڈل ہیں..اور وہ مجھے بھی الفت بھری نظروں سے اس لیے دیکھتی ہے کہ بابا جان نیویارک میں ڈائناسار کے ڈھانچے دیکھ کر آئے ہیں..

اس میوزیم میں آنے سے پیشتر میں اقرار کرتا ہوں کہ میں شدید جہالت کا شکار تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ ایک ڈائناسار..بس ایک ڈائناسار ہوتا ہے..جیسے ایک گدھا..بس ایک گدھا ہوتا ہے یا ایک مزاحیہ شاعر..بس ایک مزاحیہ شاعر ہوتا ہے تو یہاں آ کر مجھے ایک دھچکا لگا کہ..ایک ڈائناسار..بس ایک ڈائناسار نہیں ہوتا..

ان کی بہت سی اقسام ہوتی ہیں..مختلف شکلیں ہوتی ہیں..جدا قبیلے ہوتے ہیں..ہم انسانوں کی مانند..ان میں بھی جاٹ' راجپوت' سید یا شیخ وغیرہ ہوتے ہیں..کچھ ذرا خوش شکل ہوتے ہیں..یعنی اگر ایک ڈائناسار خوش شکل ہو سکتا ہے تو..کچھ نہایت غصیلے ہوتے ہیں اور کچھ نہایت تحمل مزاج اور بردبار..

اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بے ہودہ شکلوں والے ہوتے ہیں..

اُن کے بدن کی بناوٹ اور قد کاٹھ بھی مختلف ہوتا ہے..

سپیل برگ کی اس فلم کے بعد یکدم دنیا کے ہر کونے میں سے ڈائناسار برآمد ہونے لگے..بلکہ جن ملکوں میں ان کے ڈھانچے برآمد نہ ہوئے وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوگئے کہ ہائیں ہم کچھ پیچھے رہ گئے ہیں..ہمارے ہاں سے بھی کوئی ڈائناسار کیوں برآمد نہیں ہوا؟ یہاں تک کہ بلوچستان میں جو ڈھانچہ برآمد ہوا ہے اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ دنیا بھر میں اتنا بڑا ڈائناسار کہیں اور نہیں پایا گیا..اور یہ ہماری کیسی خوش بختی ہے کہ دنیا بھر میں نہ اتنے بڑے علماء کرام پائے جاتے ہیں اور نہ اتنے بڑے ڈائناسار..!

تمام تر تحقیق کے باوجود ہم آج تک یہ نہیں جان سکے کہ کیا یہ ڈائناسار بولتے بھی تھے یا نہیں..کیا کوئی آواز نکالتے تھے..کبھی غراتے تھے یا غوں غاں کرتے تھے یا نہیں..یا گونگے تھے..خاموش رہتے تھے..

اور کیا یہ ایک کنگرو کی مانند اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا سکتے تھے یا نہیں..

آپ بھی مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ ایسے اہم سوال ہیں کہ جب تک ان کے جواب نہیں مل جاتے نہ ہم اطمینان سے ناشتہ کر سکتے ہیں اور نہ سردیوں میں دھوپ سینک سکتے ہیں.. جب تک ہم یہ نہیں جان جاتے کہ ڈائنا سار اپنی ٹانگیں اٹھا سکتے تھے یا نہیں ہم کیسے ایک پُرمسرت اور مطمئن زندگی گزار سکتے ہیں.. ہمیں اپنی پہلی فرصت میں ان مسائل کو حل کرنا ہے کہ ڈائنا سار بولتے تھے یا نہیں ورنہ ہم ہمیشہ بے حد آزردہ اور شکستہ دل رہیں گے..

آپ پلیز مجھے شاباش دیجیے کہ میں قطعی طور پر تفصیل میں نہیں جا رہا.. جو کچھ بیان کر رہا ہوں سرسری بیان کر رہا ہوں کہ میں نے ابھی تک کسی ڈائنا سار کی قوت شامعہ کے بارے میں آپ کو تفصیل سے نہیں بتایا..

البتہ اس میوزیم میں دو مقام ایسے ہیں جہاں آپ کو رکنا پڑے گا کہ میں بھی وہاں ٹھٹک گیا تھا..

ایک شوکیس میں روشن پہلو بہ پہلو دو ڈھانچے نمائش پر تھے..

اور ان ڈھانچوں.. قد آدم ڈھانچوں کے برابر میں دو ان سے کہیں چھوٹے بچہ ڈھانچے تھے.. یعنی ہر ڈھانچے کے ساتھ اس کا بچہ ڈھانچہ کھڑا تھا.. جیسے ہر ڈھانچہ اپنے بچے ڈھانچے کو سیر کے لیے لے جا رہا ہے..

اور یہ دونوں ڈھانچے اپنے بچوں سمیت ہو بہو تھے.. کچھ فرق نہ تھا..

یہاں تک تو خیریت گزری کہ صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ انسانی ڈھانچے ہیں لیکن میں ٹھٹک تب گیا جب میں نے قریب ہو کر ایک ڈھانچے کے آگے رکھی تختی پر تو ''انسان'' لکھا دیکھا اور دوسرے ڈھانچے کی تختی پر درج تھا ''بن مانس''..

میں بہت دیر تک اُن کا موازنہ کرتا رہا لیکن مجھے تو وہ ہو بہو دکھائی دیتے رہے.. یہاں تک کہ مجھے اُلجھن ہونے لگی کہ آخر میرے بدن میں ہڈیوں کا جو ڈھانچہ ہے اور چڑیا گھر میں مونگ پھلی ٹھونگتے بن مانس کا جو ڈھانچہ ہے ان میں کچھ فرق تو ہوگا.. ہم ایک جیسے کیسے ہو سکتے ہیں چنانچہ میں نے بہت غور سے دونوں کی ایک ایک ہڈی ایک ایک حصہ بہت غور سے دیکھا اور تب بس انیس بیس کا فرق محسوس ہوا.. یعنی حضرت انسان کی کھوپڑی قدرے بڑے سائز کی تھی.. ادھر حضرت بن مانس کی کولہے کی ہڈی نسبتاً لمبوتری تھی.. ورنہ بازو، پسلیوں کا پنجرہ، ٹانگیں اور پاؤں سراسر

ایک جیسے تھے اور ان کے برابر میں آویزاں بچوں کے ڈھانچوں میں بھی بس اتنا سا فرق تھا..

آپ اس بن مانس اور اس کے بچے کے ڈھانچے کو اپنے علماء کرام کو دکھا دیجیے تو وہ فوراً پکار اٹھیں گے کہ بس یہی تو ہے اشرف المخلوقات.. اور وہ یعنی ڈارون یونہی ہمیں بندروں کی اولاد ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا..

ویسے ان دونوں ڈھانچوں کو یوں برابر میں کھڑا کر دینے میں اہل مغرب کا خبث باطن شامل ہے تاکہ ہم اہل ایمان بھٹک جائیں.. لیکن ہم ایسے سائنسی شعبدوں کے پھندوں میں پھنسنے والے نہیں.. تو ایک تو میں ان ڈھانچوں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا..

اور دوسرا.. ایک دیوار پر کسی درخت کا ایک بہت بڑے گھیرے والا تنے کا ایک دائرہ نما حصہ آویزاں تھا.. اتنا بڑا کہ اس کے نیچے پائے لگا کر اس سے ایک وسیع کھانے کی میز تشکیل دی جا سکتی تھی..

یہ درخت ابھی کچھ عرصہ پہلے تک سرسبز اور سربہ فلک امریکہ کے کسی قدیم جنگل میں زندہ تھا.. اور اس نے پورے تیرہ سو چالیس برس کی عمر پائی اور اتنے ہی برس یہ دنیا دیکھی.. کسی بھی درخت کی عمر کا حساب اس کے تنے کے اندر تخلیق ہو چکے دائروں سے لگایا جاتا ہے.. ہر برس اس کے تنے میں ایک اور دائرے کا اضافہ ہوتا جاتا ہے.. اور دیوار پر آویزاں اس درخت کے تنے میں دائرے تھے انہیں دیکھا جا سکتا اور گنا جا سکتا تھا اور وہ پورے تیرہ سو چالیس تھے..

اس دنیا میں ان تمام برسوں میں جتنے بھی اہم واقعات رونما ہوئے تھے ان کی تاریخیں تنے کے دائروں میں نصب تھیں.. کہ جب یہ دائرہ وجود میں آیا تو یہ وہ برس تھا جب فلاں واقعہ ظہور پذیر ہوا..

اور جتنے بھی اہم واقعات کے حوالے دائروں پر درج تھے وہ سب کے سب یورپ اور امریکہ سے متعلق تھے.. ان میں کہیں بھی افریقہ اور ایشیا میں جو کچھ ہو گزرا تھا اس کا کچھ تذکرہ نہ تھا.. یورپ کے بادشاہ تھے کہ فلاں کے زمانے میں یہ دائرہ تخلیق ہوا.. کون سی ایجاد کون سے برس کے دائرے میں ہوئی.. ابراہم لنکن نے کب حلف اُٹھایا.. امریکی خانہ جنگی جب ہوئی تو اس درخت کا کون سا دائرہ تخلیق ہو رہا تھا.. اور جب ''چارٹر آف انڈی پینڈنس'' پر دستخط ہوئے تھے تو یہ درخت تب بھی تھا.. وغیرہ وغیرہ.. لیکن یہاں افریقہ یا ایشیا میں پچھلے ساڑھے تیرہ سو برس میں رونما ہونے

والے کسی ایک واقعے کا بھی اندراج نہ تھا.. چین' جاپان' ہندوستان نہ تھے.. اور کچھ نہ تھا سوائے امریکہ اور یورپ کے.. لیکن ہم کچھ گلا نہیں کر سکتے تھے.. کچھ شکایت لبوں پر نہ لا سکتے تھے کہ آپ نے اس درخت کی تیرہ سو چالیس برس کی حیات میں صرف اپنے علاقوں اور تاریخ کا ہی کیوں تذکرہ کیا.. ہم بھی تھے تو ہمارا ذکر کیوں نہیں کیا.. ہم نہ گلا کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہمیں کچھ حق ہے شکایت کرنے کا.. کہ نیچرل ہسٹری میوزیم تو ان لوگوں نے.. اس قوم نے خون پسینہ ایک کر کے تحقیق اور توجہ کر کے.. سینکڑوں برسوں کی سائنسی اور سماجی ترقی کر کے بنایا ہے تو وہ کیوں نہ اپنی تاریخ کی جانب نظر کرتے' جو کسان اپنا خون پسینہ ایک کر کے اپنے کھیت میں پونے گنے کی پوریاں کاشت کرتا ہے اور جب ان میں پھوٹ پڑتی ہے تو موسم سرما کی منجمد راتوں میں جاگ کر انہیں پانی سے سیراب کرتا ہے اور پھر شدید گرمیوں میں بلند قامت گنے کے کھیت میں دم پخت ہو کر اس فصل میں گوڈی کرتا ہے تو ظاہر ہے اس کے گنوں میں مٹھاس ہو گی.. اس گنے کے رس سے تیار کردہ گڑ ہی میٹھا ہو گا.. اور جو کسان ایک کھیت کی منڈیر پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور اس گھمنڈ میں مبتلا رہے کہ صدیوں پیشتر میرے آبا و اجداد کے کھیتوں میں ایسے زبردست پونے گنے تھے.. اور ان کے رس سے کیسا میٹھا گڑ بنتا تھا اور یہ جو کسان ہے اتنی مشقت اور تحقیق کر رہا ہے تو یہ کیا جانے کہ ہمارے گنے کیسے شیریں ہوتے تھے..

تو وہ کسان یہ ہیں اور یہ کسان جو ہاتھ پہ ہاتھ دھیرے بیٹھے ہیں ہم ہیں..

شکایت کرنے کی بجائے ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور اپنا ایک ایسا نیچرل ہسٹری میوزیم تخلیق نہیں کرتے.. اس لیے کہ ہم کر ہی نہیں سکتے.. ہم میں تحقیقی اور علمی جستجو کے لیے جو ثابت قدمی' صبر اور مشقت درکار ہے وہ سرے سے ناپید ہے.. ہم ایک ایسی بانجھ عورت ہیں جو کچھ تخلیق نہیں کر سکتی اور شکایت کرتی ہے..

دیوار پر آویزاں تاریخ کے اس حیرت انگیز کیلنڈر پر درج تیرہ سو چالیس برسوں کا حساب کیا.. تو یہ حساب ہوا کہ یہ چودہ سو چھبیس ہجری کے زمانے ہیں تو اس حساب سے جب اس درخت کا بیج زمین سے پھوٹا ہو گا.. ایک ایسی سرزمین پر.. جو ابھی ویسی ہی تھی جیسی کہ اسے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا تھا.. اس کے بیاباں صحرا اور برفیں اور بلندیاں ان چھوئی تھیں.. گرینڈ کینین کی پر عظمت چٹانیں کنواری تھیں.. ہاں اس سرزمین سے پھوٹنے والے اس کے کچھ سرخ چہرہ بیٹے تھے

جو گھوڑوں پر سوار زندگی کرتے تھے اور اسے اپنی ماں جانتے تھے.. تو جب اس درخت کا بیج پھوٹا ہو گا.. تو یہاں سے بہت دور.. سات سمندروں کے پار قصویٰ اونٹنی پر سوار.. اپنے یار غار حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ مدینے کی جانب ہجرت کرتے میرے بابا کو چھیاسی برس بیت چکے ہوں گے..

ہجرت کے صرف چھیاسی برس بعد تو کربلا کی ریت کو خون آمیز ہوئے بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہو گا.. وہ کون سے اموی خلیفہ کا عہد تھا جب اس درخت کے تنے کے گرد اس کی حیات کا پہلا دائرہ مکمل ہوا تھا..

حضرت زینب کو فوت ہوئے اور امام زین العابدین کو رخصت ہوئے کتنا عرصہ گزرا تھا.. بس یہی دن ہوں گے جب اس درخت کی شاخیں پھوٹی ہوں گی اور شاید ابھی تک کربلا کی ریت میں امام حسینؓ کے لہو کی مہک آتی ہو گی..

اگر میں اس تنے کے بہت قریب ہو سکتا.. کہ یہ میرے قد سے ذرا اونچائی پر آویزاں تھا.. اگر میں اس کے قریب ہو سکتا تو شاید اس میں وہ خوشبو سونگھ سکتا تھا.. جس کو گزرے ہوئے ابھی صرف چھیاسی برس گزرے تھے.. اپنے پیغمبر کی خوشبو سونگھ سکتا..

ایک ایسی ہستی کی.. جس کی مہک پونے پندرہ سو برس گزر جانے کے باوجود دنیا کے ہر قریہ میں.. ہر گلی کوچے میں مہکتی چلی جاتی ہے تو صرف چھیاسی برس بعد وہ مہک کیسی تیز اور نشہ آور ہو گی..



''گوگن ہائم میوزیم''

میں آرٹ کا حاجی ہو چکا تھا..

آرٹ کے خرابات کے گرد پھیرے پہ پھیرے..ارے مے گسار وسویرے سویرے..

کبھی روڈین کے مجسمے ''خدا کا ہاتھ'' یا ''بوسہ'' کے گرد پھیرے پہ پھیرے..اور کبھی شاگال کی ''محبت کرنے والے'' کے آگے سر جھکائے اور کبھی پکاسو کی بکری کا بوسہ لینے کی خواہش کرتے ہوئے..

آرٹ دیکھ دیکھ کر.. پندرہ بیس روز تقریباً مسلسل شب و روز دیکھ دیکھ کر میرا کُب نکل آیا تھا..اس لیے کہ پینٹنگ چاہے چھت تک جاتی ہو مصور کا نام اکثر بائیں کونے میں نقش ہوتا ہے اور آپ کو ہمیشہ جھک کر وہ نام جاننا پڑتا تھا..آپ جان جاتے تھے کہ کس کے تخلیقی کرب کی جان اس تصویر میں ہے..اور اس میں ایک عجیب سی سرشاری بھی ہے کہ آپ جھک کر بائیں کونے میں پکاسو یا فان گوگ کے ہاتھوں کی تحریر اس کے دستخط پڑھیں..تو یوں جھکتے پڑھتے میرا کُب نکل آیا تھا..

میرا حال بہت پتلا تھا..

میری حالت بہت نازک ہو گئی تھی.. پھرتے پھرتے..پھیرے لگاتے..میٹرو..موما اور میوزیم آف نیچرل ہسٹری میں چلتے چلتے..میری ٹانگوں اور گردن کے پٹھے اکڑ گئے تھے..تھکاوٹ اتنی ہو گئی تھی کہ مجھے دن کے وقت بھی تارے نظر آتے تھے اور وہ فان گوگ کی ''تاروں بھری رات'' کے بڑے بڑے تارے ہوتے تھے اور راتوں میں مجھے موڈی گلیانی کی نیوڈز مجھے پریشان کرتی تھیں اپنی ہیجان خیز بدنی خوبصورتیوں سے مجھے بھگو جاتی تھیں اور کبھی میں گوگین کے جزیرے

تاہیٹی کی سیاہ فام عورتوں اور مردوں کے ساتھ تالابوں میں نہانے لگتا..اور اکثر سوتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا کہ میں رضائی میں لپٹی ہوئی ایک مصری ممی ہوں اور میں ایک ایسے تابوت میں مدفون ہوں جس کے ڈھکن پر میری شبیہہ پینٹ کی گئی ہے اور جو کوئی بھی پاس سے گزرتا ہے وہ میرا ناک نقشہ پہچان کر ''عجب آزاد مرد'' تھا کہہ کر گزر جاتا ہے..ڈھکن اٹھا کر مجھے تابوت سے باہر نہیں نکالتا..یقیناً یہ میرے ہم عصر ادیب اور کچھ عزیز از جان دوست تھے بلکہ وہ ڈھکن اٹھانے کی بجائے اس پر ذرا زور سے تھپکی بھی دیتے تھے تاکہ وہ مزید مستحکم ہو جائے..اور ''میاں جہاں رہو خوش رہو'' گنگناتے چلے جاتے تھے..

کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ میں اپنی ناک تک آرٹ اور قدیم تہذیبوں سے لبریز ہو چکا تھا اور ان سے عاجز آ چکا تھا..اور اب نیویارک میں قیام کے بقیہ دن نہایت شرافت سے گزارنا چاہتا تھا.. پارک ایونیو میں سرِ شام ٹہلتے ہوئے..دنیا کی خوش لباس اور خوش بدن ترین خواتین پر آنکھیں سینکتے ہوئے..کہ ان پر میں آنکھ رکھ نہیں سکتا تھا' رکھتا تھا تو وہ گر جاتی تھی اور شرمندہ ہو جاتی تھی کہ کہاں دو پاٹوں کے درمیان پس رہی ہوں.. یا پھر دریائے ہڈسن کے کناروں پر سیر کرتے.. سنٹرل پارک میں جوگ کرتے..براڈوے کے فٹ پاتھوں پر سجے کسی قہوہ خانے میں کچھ نہ کچھ پیتے ہوئے..اور میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ میں ان خاتون کو ضرور فون کروں گا جن کا میں نے بہت دل دکھایا تھا..انہوں نے میرے ساتھ ایک شام کے بعد..یعنی میرے اعزاز میں جو ایک نیویارکی شام تھی اس کے بعد نہایت الفت سے مجھے اپنے گھر کھانے کے لیے مدعو کیا تھا اور جب میں نے معذرت کی تھی تو انہوں نے کہا تھا..تارڑ صاحب کیا آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ میرے ہاں تشریف لائیں تو میں آپ کو نیویارک بھر میں سب سے بہترین بریانی کھلاؤں گی..اور میں نے صد افسوس کہ بہت بدتمیزی سے جواب دیا تھا کہ محترمہ میں نیویارک میں بہترین بریانی کھانے کے لیے نہیں آیا..تو انہیں فون کر کے ان سے اپنی بدتمیزی کی معافی مانگ کر..وہ اگر انکار بھی کر دیں تو بھی میں زبردستی اپنے آپ کو ان کے ہاں مدعو کر لوں گا اور نیویارک کی بہترین بریانی کھا کر رہوں گا..

چنانچہ آرٹ کے جھنجھٹ سے فراغت کے پہلے دن جب میں ابھی سنٹرل پارک کا رخ کرنے کے لیے اپنے جوگرز کے تسمے کس رہا تھا تو سلجوق جو نہایت مہارت سے میرے لیے آملیٹ بنانے کی کوشش کر رہا تھا کہنے لگا ''والد صاحب..آج ہم گوگن ہائم میوزیم دیکھنے جا رہے ہیں..''

میری تو سٹی گم گئی..اکڑے ہوئے ہاتھ پاؤں بھی لرزنے لگے ''نہیں بیٹا ایک اور میوزیم ہرگز نہیں.. میں تو بہ تائب ہو چکا ہوں آرٹ سے..مزید آرٹ میری صحت کے لیے مضر ثابت ہو سکتا ہے..''

''لیکن اباجی یہ گوگن ہائم محض ایک میوزیم نہیں..مشہور ماہر تعمیر فرینک لائڈ کی تعمیر کردہ ایک مشہور زمانہ عمارت بھی ہے جس کی تصویریں نیشنل کالج آف آرٹس کے زمانے میں آرکی ٹیکچر کی تعلیم کے دوران اپنی نصابی کتب میں دیکھتے تھے تو دعائیں کرتے تھے کہ یا اللہ کبھی یہ معجزہ عمارت ہمیں دکھا دینا..آپ جانتے ہیں کہ پورے نیویارک میں صرف یہ ایک عمارت ہے جو فرینک لائڈ نے ڈیزائن کی..اور اس میں کیا کیا نایاب مصوری کے شاہکار بھی آویزاں ہیں..''

''سنو برخوردار..مجھے آرکی ٹیکچر سے کیا لینا دینا اور جہاں تک مزید شاہکار تصویروں کو دیکھنے کا سوال ہے تو میں قسم کھا کر تم سے یہ کہتا ہوں کہ اگر پکاسو یا شاگال یہاں براڈوے سٹریٹ میں واقع تمہارے دسویں منزل پر واقع فلیٹ تک سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے نڈھال ہو کر میرے قدموں میں آگریں اور کہیں کہ جناب تارڑ صاحب ہم نے ''نابینا شخص کا کھانا'' اور ''سرو کے درخت'' اور ''سورج مکھی کے پھول'' سے بھی زیادہ مصوری کے کچھ شاہکار تخلیق کیے ہیں آپ ذرا زحمت کیجیے اور فلاں میوزیم میں آکر ان تصویروں کو دیکھ لیجیے اور اگر پسند آجائیں تو ذرا شاباش پکاسو..شاگال کہہ دیجیے گا تو بھی اے میرے کراؤن پرنس میں ٹس سے مس نہ ہوں گا..میوزیم میں نہ جاؤں گا..''

''والد صاحب..آپ نے میرے اور سُمیر کے ہمراہ حج کیا تھا ناں..''

''اس گوگن ہائم وغیرہ کا حج سے کیا تعلق؟''

''وہاں آپ سب سے پہلے بڑے شیطان کو کنکریاں مارتے ہیں..پھر درمیانے کو اور آخر میں سب سے چھوٹے کو..ٹھیک ہے؟''

''ہاں یہ ترتیب تو ٹھیک ہے..''

''تو یوں سمجھ لیجیے کہ میٹروپالٹن آرٹ کا سب سے بڑا شیطان ہے..موما دوسرے نمبر پر ہے اور گوگن ہائم سب سے چھوٹا شیطان ہے..آپ پہلے دونوں شیطانوں کو تو بھگتا چکے تو آپ جب تک تیسرے شیطان کے روبرو نہ ہوں گے تکنیکی طور پر آرٹ کے حاجی نہیں ہو سکتے..''

سلجوق چونکہ اپنی جدہ کی سفارت کے دوران متعدد بار حاجی ہو چکا تھا اس لیے وہ مجھے حج کے وکیبلری کی مار دے رہا تھا..

میں نے اپنا آخری اپنے تئیں ترپ کا پتہ پھینکا ''یار میں نے گائیڈ بک میں چیک کیا ہے کہ اس گوگن ہائم میں داخلے کا ٹکٹ مبلغ بارہ ڈالر ہے..تو ہم دونوں پورے پچیس ڈالر خرچ کر کے اس کے اندر جائیں گے..تو کیا یہ اسراف بے جا نہ ہوگا..اس رقم سے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم نعمت کدہ ہوٹل میں جہاں سے کرائسلر بلڈنگ بھی نظر نواز ہوتی ہے وہاں روسٹ مرغ اور روغنی نان اڑائیں..''

اور سلجوق نے جواب میں اپنا ترپ کا پتہ پھینک دیا ''والد صاحب..آج اتوار ہے..میں نے ابھی نیٹ پر دوبارہ چیک کیا ہے اور اتوار کو سات بجے کے بعد گوگن ہائم میوزیم میں داخلہ مفت ہے..چلو اباجی..''

میٹروپالٹن کی جانب سفر کرتے ہوئے بس کی کھڑکی سے باہر ہمیشہ ایک سفید گھومتی ہوئی عمارت دکھائی دیتی تھی اور یہ گوگن ہائم میوزیم تھا..جیسے سنگ مرمر کی سفیدی کا ایک بگولہ آسمان کو اٹھتے اٹھتے تھم کر ساکت ہو گیا ہو..

یہیں سے ''میوزیم مائل'' شروع ہوتا تھا یعنی ایک میل کے فاصلے کا وہ علاقہ جس میں ہر دوسرے قدم پر ایک میوزیم واقع ہے..

مجھے یقین تھا کہ مفت کے مزے لوٹنے کے لیے گوگن ہائم کے باہر جو ایک قطار ہو گی اس میں پریشان حال فقیر..نیویارک کے غریب غربا اور خستہ حال ہوں گے..ایسے ناکام بارلیش مصور ہوں گے جن کی داڑھیوں میں سے جوئیں ٹپ ٹپ گرتی ہوں گی اور وہ انہیں فٹ پاتھ سے چُن چُن کر پھر سے اپنی داڑھیوں میں آباد کر لیتے ہوں گے کہ انہی کے دم سے ان کے چہروں پر رونق تھی..جہاں ہم جیسے شرفاء کو بھیس بدل کر آنا چاہیے تھا کہ اگر کوئی دیکھ لے تو کیا کہے..یہ اتنے فقرے ہیں کہ بارہ ڈالر کا ٹکٹ بھی نہیں خرید سکتے..خیرات کی قطار میں لگے کھڑے ہیں..

لیکن وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا..

میں اور سلجوق بس سے اترے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ میوزیم کے صدر دروازے کے

باہر جو ایک قطار ہے وہ اتنی طویل ہے کہ بل کھاتی چلی جاتی ہے اور برابر کی گلی میں چلی جاتی ہے اور اس کا اختتام نظر میں نہیں آ رہا..اور ہم دونوں جب اس قطار کے آخر میں جا کر جگہ سنبھالتے ہیں تو ذرا دل برداشتہ اور مایوس ہیں کہ یوں تو میوزیم کے داخلے کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی..اور پھر یہ دیکھتے ہیں کہ اس قطار میں اگر کوئی حقیر فقیر اور غریب غرباء ہو سکتا ہے تو ہم ہیں..بقیہ خواتین و حضرات جو یہاں مفت بر ہونے کو آئے تھے نیویارک کے فیشن ایبل ترین اور متمول ترین افراد تھے..ان میں سے بیشتر تو فیشن ماڈل لگتے تھے..مہنگے ترین ڈیزائنر ملبوسات زیب تن کیے ہوئے لگتا تھا کہ کسی کیٹ واک میں واک کرنے کے لیے آئے ہیں,اور ان کے بدنوں سے ایسے مہنگے پرفیومز کی مہک اٹھتی تھی جس کا صرف ایک جھونکا بھی سو ڈالر سے کم مالیت کا نہ ہوگا..

تو پھر وہ سب کیوں..محض چند ڈالر بچانے کی خاطر..جتنے ڈالر وہ بلا سوچے سمجھے کسی ٹیکسی ڈرائیور یا ویٹر کو تھما دیتے تھے..یہاں برسرِ عام ایک قطار میں کھڑے ہو کر رسوا ہو رہے تھے..صرف اس لیے کہ یہ ذوق جمال کی انتہائی علامت ہے کہ آپ ایک میوزیم اور خاص طور پر گوگن ہائم میوزیم کے باہر ایک قطار میں کھڑے ہیں..پیزا حاصل کرنے کے لیے یا کسی سٹور کے باہر سیل پر لگے ہوئے ملبوسات کو حاصل کرنے کے لیے قطار میں نہیں کھڑے ہوئے..بلکہ فرینک لائڈ رائٹ کی مشہور عالم عمارت کے اندر داخل ہو کر وہاں آرٹش شدہ تصویروں کے روبرو ہونے کو آئے ہیں..

یہ طویل قطار حیرت انگیز طور پر تیزی سے سرکتی ہوئی صدر دروازے تک جا پہنچی اور وہاں جو داخلہ تھا سراسر مفت تو نہ تھا علامت کے طور پر ایک دو ڈالر ادا کرنے تھے تا کہ..آپ کو کچھ تو احساس ہو کہ آپ کہاں داخل ہو رہے ہیں..

گوگن ہائم ایک ایسا میوزیم ہے جس کی مرغولا نما عمارت کے اندرون میں پوشیدہ کمروں میں تو مصوری کے شاہکاروں کی دائمی نمائش ہے..جبکہ اس کی گھومتی ہوئی بلند ہوتی راہداری کی دیواروں پر کسی خاص موضوع یا مصور کے حوالے سے عارضی نمائشوں کا اہتمام ہوتا رہتا ہے..

اس برس ''رُوس'' نمائش پر تھا..

میں جب بھی ادھر سے گزرتا تھا اس عمارت کے ماتھے پر سے ایک بہت بڑا پردہ ہوا

سے سرکتا دکھائی دیتا تھا جس پر صرف ''رشیا'' لکھا ہوا تھا اور ایک روسی لڑکی کی تصویر تھی جو عمارت کے ماتھے سے شروع ہو کر نیچے فٹ پاتھ تک چلی آ رہی تھی..سمور کے ہیٹ میں سردی سے ناک سرخ ہوتی..برفیلے موسموں سے بچاؤ کی خاطر اپنے آپ کو ڈھکتی ہوئی وہ انتہائی دلکش تھی اگرچہ میں اس کے خدوخال سے بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ دس پندرہ برس سے بھی پہلے ایک عام سی بھدی اور موٹی روسی عورت میں بدل جائے گی..روسی لڑکیاں جو معمولی ہوتی ہیں بہت ہی معمولی ہوتی ہیں لیکن چند ایک جو غیر معمولی ہوتی ہیں وہ بہت ہی غیر معمولی ہوتی ہیں اگرچہ چند برس کے بعد وہ بھی معمولی ہو جاتی ہیں..گوگن ہائم کے پورے چہرے کو ڈھکتے ہوئے پردے پر نقش یہ لڑکی تقریباً لینا کی ہم شکل تھی..

1957ء میں جب میں سوویت یونین کے آہنی پردے کو پار کر کے ماسکو جا پہنچا تھا تو وہاں جشن کی رات میں سرخ چوک میں مجھے ایک نقاب پوش لڑکی ملی تھی جو کہ لینا تھی میرے ناولٹ ''فاختہ'' کا مرکزی کردار دوسری جنگ عظیم میں اندھی ہو جانے والی لڑکی کا کردار میں نے اسی لینا کے گرد تخلیق کیا تھا..اس نے ماسکو میں شب و روز میری مہمانداری کی اور میری رفیق رہی..وہ پستہ قد ہونے کے باوجود راسپوٹین کی سحر طراز آنکھوں ایسی کشش رکھنے والی لڑکی تھی..

کیا پتہ گوگن ہائم کے چہرے پر آویزاں یہ رُوسی لڑکی..اُسی لینا کی بیٹی ہو..

ایک ڈالر کی واجبی سی ادائیگی کے بعد ہمیں میوزیم میں آزاد کر دیا گیا..

یہ ایک سفید پُرپیچ زینہ تھا..ایک مرغولا تھا..جس کے درمیان میں خلاء تھا..کسی بھی بلندی پر پہنچ کر نیچے جھانکتے تو اس کے ہال میں داخل ہوتے چلتے پھرتے لوگ نظر آتے رہتے ہیں..

اور اس زینے پر شائقین چڑھتے جاتے ہیں..ہانپتے جاتے ہیں..

اسے ایک عظیم سمندری سیپی سے بھی تشبیہ دی گئی تھی جس میں سفید بھنور ہوتے ہیں..

میں اس سے بہت متاثر ہوا..بے شک نیویارک عجوبہ عمارتوں کا عجائب گھر تھا جن میں ناقابل یقین بلندیاں اور پُرشکوہ تاثر تھے لیکن وہ زندہ نہ تھیں..اور یہ عمارت ایک روح رکھتی تھی..سانس لیتی تھی اور آپ کو اپنا ایک حصہ بنا کر جیسے ایک روحانی سفر ہو بلند ہوتی جاتی تھی..

میں اس سے بے پناہ متاثر تو ہوا لیکن مرعوب نہ ہوا..میں ایک ایسی ہی عمارت کی متعدد

تصویریں دیکھ چکا تھا اور اس شکل کی ایک اور عمارت کو ذاتی طور پر دیکھ چکا تھا.. اور یہ ان دونوں عمارتوں کی ایک دل کش تعبیر تھی.. اس کا ڈیزائن مستعار لیا گیا تھا.. کسی حد تک کہہ سکتے ہیں کہ نقل کیا گیا تھا اگرچہ عقل سے کیا گیا تھا..

میں یہ دعویٰ تو ہرگز نہیں کرتا کہ میں پہلا شخص ہوں جس نے اس مشابہت کو محسوس کیا اور اسے ضبطِ تحریر میں لایا کیونکہ میں فنِ تعمیر کی باریکیوں سے آگاہ نہیں ہوں.. بے شک میرے دونوں بیٹے آرکیٹکٹ ہیں پھر بھی آگاہ نہیں ہوں اور اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ گوگن ہائم کی نابغۂ روزگار عمارت سراسر اوریجنل نہیں ہے اسے ہم.. جیسے کیسے بھی ہیں مسلمانوں سے مستعار لیا گیا ہے..

اور براہ راست عراق میں واقع سامرا کی مسجد کے اس قدیم مینار سے مستعار لیا گیا ہے جس کے گرد ایک زینہ جو ڈھکا ہوا نہیں ہے چوٹی تک پہنچتا ہے.. گوگن ہائم دراصل اس مینار کا عکسِ متضاد ہے.. وہاں زینہ باہر عیاں تھا یہاں وہی پرپیچ زینہ اندرون میں پوشیدہ ہے..

یہ وہی سامرا کا مینار ہے جسے عراقی حملے کے دوران امریکی فوجیوں نے چاند ماری کے لیے استعمال کیا تھا اور اس پر اپنے نام کھودے تھے.. میں اُسی مینار کی نقل گوگن ہائم میں اگر ایک قہقہہ لگا دوں تو اس کے محافظ مجھے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیں گے اور اگر صرف انگلیوں کے اشاروں سے اس کی دیوار پر اپنا نام ہوا میں لکھ دوں تو ایک دہشت گرد کے طور پر بقیہ عمر گوانتانا موبے میں بسر کروں..

اور دوسری عمارت اشبیلیہ کا جیرالڈا ٹاور ہے.. عہدِ موجود میں ایک کلیسا کا مینار لیکن عہدِ قدیم میں اشبیلیہ کی جامع مسجد کا ایک مینار جسے بہت سے مغربی آرکیٹکٹ موجودہ سکائی سکریپرز کی ماں قرار دے چکے ہیں.. اس مینار کے اندر بھی ایک ایسا ہی پرپیچ زینہ ہے جس پر آپ گھومتے ہوئے آسانی سے چڑھتے جاتے ہیں.. سیڑھیاں نہیں محض چڑھائی ہے.. کہا جاتا ہے کہ اسے اس طرز سے اس لئے تعمیر کیا گیا تھا کہ وقت کا سلطان اپنے گھوڑے پر سوار اس کی چوٹی پر پہنچ جائے اور وہاں سے معتمد کے شہر اشبیلیہ اور دریائے وادی الکبیر کا نظارہ کر سکے..

تو ایسا کیوں ہے کہ آج تک کسی فنِ تعمیر کے نقاد نے اس مشابہت کا حوالہ نہیں دیا..

شاید ایسا ہے کہ ایک غریب گویا عمر بھر کوئی لوک گیت الاپتا رہتا ہے.. گاؤں کی گلیوں

میں مٹھی بھر آٹے کی آس میں گاتا رہتا ہے.. باراتوں میں دھتکارے جانے کے باوجود ایک وقت کا پیٹ بھرنے کے لیے گاتا رہتا ہے اور گمنام مر جاتا ہے.. اور پھر کوئی معروف گلوکار اسی گیت کو گا کر دنیا کو مسخر کر لیتا ہے اور دولت کے انبار اس سے سمیٹے نہیں جا سکتے.. منظور جھلا میری دکان کے برابر میں تاج سبزی والے کے خوانچے کے پاس زمین پر بیٹھا صرف اس آس میں کہ مجھے گوبھی کا ایک پھول یا چند آلو مل جائیں گے اپنا لکھا ہوا اور اپنا ترتیب شدہ گیت ''وے میں چوری چوری تیرے نال لا لیاں اکھاں وے'' گاتا رہتا ہے.. کبھی میرے پاس آ بیٹھتا ہے اور میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ''تارڑ صاحب.. کچھ سناؤں..''

اور پھر وہی گیت ریشماں گاتی ہے.. اگرچہ ایک عجیب سوز اور درد سے گاتی ہے تو ہندوستان پاکستان میں دھوم مچ جاتی ہے.. یہاں تک کہ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو کی جانب سفر کرتے ہوئے پائیو کے مقام پر بلتی پورٹر بھی یہی گیت الاپتے ہیں.. اسی گیت کو لتا منگیشکر ''یارا سیلی سیلی'' کی صورت اُسی دھن میں گاتی ہے تو پوری دنیا میں چرچا ہوتا ہے..

کچھ یہی حساب اسمارا اور جیرالڈا کے مینار کا ہے..

یہ دونوں منظور جھلّے تھے.. جن کی کم از کم ان زمانوں میں کچھ شنوائی نہ ہوئی.. اور جب ایک فرینک لائیڈ نے اس اسمارا اور جیرالڈا کے گیت کو الاپ دیا تو کل دنیا اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئی.. یہ سارے نصیب' زمانوں اور تاریخ کے کھیل ہیں اور ان پر ہمارا کچھ اختیار نہیں..

چنانچہ گوگن ہائم بنیادی طور پر ایک سفید مرغولا ہے.. ایک ''واورولا'' ہے.. یعنی درمیان میں سے خالی ہے اور آپ اس کے گرد اٹھتی گیلری کی ڈھلوان پر قدم رکھتے ایسے اوپر چڑھتے ہیں جیسے کوئی کوہ نورد قدرے جھک کر چوٹی پر پہنچنے کی آرزو میں ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہے.. اور اس دوران وہ کوہ نورد اس گیلری کی پیچداری پر چڑھتا دیواروں پر آویزاں روس کے عظیم ترین مصوروں اور مجسمہ سازوں کے معجزے دیکھتا چلا جاتا ہے..

میں بھی اسی کیفیت میں آہستہ آہستہ قدم دھرتا اوپر جا رہا تھا اور راستے میں دیواروں پر آویزاں کچھ تصاویر تو ایسی تھیں جنہیں میں رک کر آرام سے ایک مقام پر ٹِک کر دیکھنا چاہتا تھا پر نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہاں ایسا صاحب ذوق ماحول ہرگز میسر نہ تھا.. کیونکہ آپ کے آس پاس ٹریفک جاری تھی.. کچھ لوگ اوپر آ رہے تھے اور کچھ نیچے جا رہے تھے اور آپ ان کی راہ میں آتے

تھے.. ماحول نہیں بن پاتا تھا.. سلجوق نے ایک آرکیٹکٹ کی حیثیت سے اپنے اباجی کی اس الجھن دور کرتے ہوئے بتایا کہ اس عمارت کا ڈیزائن ایک آرٹ گیلری کے لیے نہایت نامناسب ہے.. کیونکہ آپ دیوار پر آویزاں کسی تصویر کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو ایک ڈھلوان سطح پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ ایک پراطمینان اور آرام دہ حالت نہیں ہو سکتی جو کہ ایک شاہکار کو دیکھنے کے لیے اولین شرط ہے..

میں بیان کر چکا ہوں کہ اُن دنوں یہ بل کھاتی گیلری صرف ''روس'' کے لیے وقف تھی.. جب کہ اس سے ملحقہ اور پوشیدہ کمروں میں میوزیم کے دائمی شاہکار آویزاں تھے اور ان کمروں کا سائز بھی اتنا مختصر تھا کہ آپ کسی بھی تصویر کو ذرا ہٹ کر ایک مناسب فاصلے سے نہیں دیکھ سکتے تھے.. ایک بے آرام کر دینے والی نزدیکی سے انہیں دیکھتے تھے جس میں پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی..

ایسے ہی کسی ایک کمرے میں شاگال کی ''پیرس ایک کھڑکی میں سے'' ایسی من موہنی تصویر آویزاں ہے.. اگرچہ اس کا طرز مصوری بادی النظر میں بچگانہ سا لگتا ہے لیکن اس کی رمزیت پر ذرا دھیان دیں تو اس کے رنگوں کی معنویت حیران کرنے لگتی ہے.. پیرس شہر کا مثالی پیکر اگرچہ سحر انگیز اور پراسرار ہے لیکن یہ جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ نہیں ہے.. کچھ اور ہے اور یہی ''کچھ اور'' شاگال نے مصور کیا ہے..

پکاسو کے ''ایک نابینا شخص کا کھانا'' ایسا ایک اور اثر انگیز شاہکار.. اُسی روایت اور رنگوں میں پینٹ کردہ.. اس کے نیلے دور کی نمائندگی کرتا ''ایک عورت استری کرتے ہوئے'' ایسا شاہکار بھی اس میوزیم کی زینت ہے.. ایک کمر خمیدہ.. مشقت کرتے کرتے شکستہ بدن عورت استری پر ہاتھ رکھے.. ہیں سخت بہت بندۂ مزدور کے اوقات.. زندگی سے بیزار عورت..

اور اسی پکاسو کی ''ایک زرد بالوں والی عورت'' بھی ایک کمال کی تخلیق ہے..

یہاں اگرچہ مانے' فرانز مارک اور کانڈنسکی کی بھی چند نہایت معروف تصاویر ہیں لیکن شاگال کی ''پیرس کی ایک کھڑکی سے'' کے بعد جس تصویر کے سامنے سب سے زیادہ ہجوم ہوتا ہے.. اتنا کہ وہ تصویر دکھائی نہیں دیتی.. امیڈو موڈی گلیانی کی 1917ء میں پینٹ کردہ ''برہنہ عورت'' ہوتی ہے..

میں یہاں برہنہ خواتین کی جو مشہور عالم تصاویر ہیں اُن کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا

اگرچہ جا سکتا ہوں لیکن میں صرف یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک برہنہ بدن.. چاہے وہ ایک عورت کا ہو یا مرد کا.. دنیا میں ان سے بڑھ کر کوئی خوش شکلی' بناوٹ یا خوبصورتی نہیں اور اگر نہیں ایک ماہر مصور کینوس پر اتارتا ہے تو کوئی بھی شخص جوان میں فحاشی' عریانی یا شہوت کا کوئی پہلو تلاش کرتا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا مناسب ہوگا کہ وہ ذہنی طور پر بالغ نہیں.. اگرچہ اس میں کچھ کلام نہیں کہ ایسی ''نیوڈز'' میں اگر ایک کشش اور جنسی جاذبیت ہے تو وہ صرف قدرت کا عطیہ ہے.. یہ کشش اور جاذبیت اگر نہ ہو تو وہ انسان کس کام کا.. اور یہ دنیا کس کام کی!

یہ تو ہوا ایک مختصر بیان گوگن ہائم کے مختصر کمروں میں مستقل طور پر آویزاں تصاویر کا.. تو اب اس کی گھومتی ہوئی سفید گیلری میں جو نمائش صرف ''رشیا'' ہے اور جسے دیکھنے کے لیے نیویارک کی اہل ذوق اُمڈے پڑتے تھے اس کی سیر کرتے ہیں..

نمائش میں سوویت یونین کے عروج سے شروع ہو کر لمحۂ موجود تک جب کہ وہ سکڑ کر صرف روس رہ گیا ہے کی شاہکار تصاویر آپ کے سامنے آتی ہیں اور ان میں سے بیشتر پہلی بار اپنے ملک کے عجائب گھروں سے باہر آئی ہیں.. ان کے سوا جو متاثر کن حصہ ہے وہ مذہب سے متعلق تصاویر کا ہے.. سٹین گلاس میں ابھری ہوئی سنت صوفیوں کی شبیہیں' نہایت بھاری اور مرصع صلیبیں اور ان کو بھی پہلی بار روسی گرجا گھروں سے باہر لایا گیا ہے..

رُوس ہمیشہ سے ایک اداس سرزمین رہا ہے..

اس کے کردار ہمیشہ ذلتوں کے مارے لوگ رہے ہیں.. تھکے ہوئے اور مایوس جن کے چہروں پر المناکی اور تھکاوٹ نقش ہوتی ہے.. وہ زندگی میں جدوجہد تو کرتے ہیں.. اس کے بارے میں گہری فلسفیانہ سوچ تو رکھتے ہیں پر اس کو بدلنے پر قادر نہیں ہوتے.. کہیں نہ کہیں کوئی کسر رہ جاتی ہے جو متوقع سنہری کرن کو سیاہی میں بدل دیتی ہے.. یہ اس کی بے انت وسعت ہے.. اس کے انسانی روح کو سرد کر دینے والے برفانی موسم ہیں یا اس کے باشندوں کے اندر کوئی دکھ ہے جس کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ ان کے آس پاس مسرت کی کوئی کونپل نہیں پھوٹتی.. کیا ہے.. وہ واڈکا کو پانی کی مانند اپنے اندر انڈیلنے کے بعد اگر بے خود ہوتے ہیں تو بھی ان کے خمار میں ایک اداسی ہوتی ہے.. چاہے یہ ٹالسٹائی کے کاؤنٹ اور شہزادیاں ہوں یا دوستووسکی کے غریب دہقان یا طالب علم سب کے سب اداسی اور مایوسی کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں..

اس نمائش میں جو مذہبی تصاویر ہیں ان پر بھی حزن و ملال کے سائے ہیں.. حضرت عیسیٰ کی تصویروں میں بھی سیاہی اور دکھ کی پرچھائیاں ہیں اور ان کے ولی اور برگزیدہ بھی مسرت سے گریزاں نظر آتے ہیں..

اس نمائش کی کچھ تصاویر ایسی تھی جو بے حد شناسا تھیں.. میں ان سے واقف تھا اور ایک عرصے سے انہیں جانتا تھا..

ان میں سے ایک.. نہایت وسیع کینوس پر محیط ولاڈے میر لینن کی وہ تصویر ہے جس میں وہ انقلابی لیڈر اپنی میز پر جھکا مطالعے میں مگن ہے.. یہ تصویر ایک زمانے میں لینن کی تصانیف اور اس کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں کے پہلے صفحے کی زینت ہوا کرتی تھی.. سوویت یونین کے زمانوں میں زیادہ تر مصوری مزدوروں اور کسانوں کی انقلابی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرنے کے حوالے سے کی جاتی تھی اور روسی انقلاب کی ترویج کے لیے یہ تصاویر وسیع پیمانے پر شائع کی جاتی تھیں اس لئے میں ان سب سے بھی شناسا تھا..

ان میں سے بیشتر تصاویر رؤف ملک والے پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے مختصر شوروم میں ڈھیر روسی کتابوں میں ملتی تھیں.. ان اچھے وقتوں میں سوویت انقلاب اور کلاسیکی ادب کو تیسری دنیا تک پہنچانے کی کاوش میں یہ کتابیں اتنی کم قیمت پر مہیا کی جاتی تھیں کہ اگر آپ صرف پچاس روپے جیب سے نکالتے تھے تو ان سے خرید کردہ کتب کی بار برداری کا خرچہ ان کی قیمت سے بڑھ جاتا تھا..

ان میں لینن اور مارکس کے کئی جلدوں پر محیط ''کلیات'' بھی ہوتے تھے اور کوڑیوں کے بھاؤ مل جاتے تھے اور ہمارے بیشتر دوستوں نے انہیں اپنی مہنگی کاروں میں لاد کر اپنی لائبریریوں کو سجایا اور سجانے سے پیشتر صرف ان کے سرورق دیکھے.. اور پھر ان کے پس منظر کے ساتھ انقلابی انداز میں تصویریں اتروا کر دانشور کہلائے..

لیکن اب منتشر ہو چکے سوویت یونین کا ہم جیسے نادار اور ذلتوں کے مارے لوگوں پر ایک احسان بھی ہے.. اور ہم جیسے لوگ کہیں دادو یا چارسدہ میں.. چوٹی زیریں یا جڑانوالہ میں اُس کا یہ احسان نہیں اتار سکتے کہ اُس نے محض اپنے انقلاب اور کمیونزم کی عظمت کا پرچار کرنے والی کتب ہی شائع نہیں کی تھیں بلکہ روسی ادب کی کلاسیکی اور جدید شاعری' ناول' افسانہ' تنقید اور تحقیق بھی شائع کیے اور یہ سب اتنا ارزاں اور کم قیمت تھا کہ تیسری دنیا کا کوئی بھی فرد.. افتادگان خاک میں

سے کوئی بھی.. جو خاک سے اٹھے تو سہی پر پھر اس کا رزق بنا دیے گئے.. یہ فرد اپنی من پسند کتاب آسانی سے خرید سکتا تھا.. اور وہ بھی اپنی مقامی زبان میں ترجمہ شدہ.. ہم تک ظ.. انصاری کا ترجمہ شدہ روسی ادب اردو میں پہنچتا تھا.. اگرچہ انصاری صاحب پر روسی کردار کو زبان اور لہجے کے اعتبار سے لکھنؤ کا بانکا بنا دیتے تھے کہ وہ ''ابے کہاں جا رہے ہو' یا ''میاں تمہارے مزاج کیسے ہیں'' ایسے ترجمے کرتے تھے.. لیکن یہ کوئی اعتراض نہیں ہے.. ہر تہذیب اپنے لب و لہجے اور محاورے کو ہی اپناتی ہے.. میر انیس اور دبیر کے مرثیے اس کی واضح مثال ہیں جن میں امام حسین اور ان کے رفقاء لہجے اور اظہار میں لکھنوی یا دہلوی دکھائی دیتے ہیں..

پشکن.. گوگول' ترگنوف.. دوستوفسکی' ٹالسٹائی یا گورکی ایسے ہم پر مکمل طور پر حاوی ہو جانے اور ہمیشہ کے لیے اثر انداز ہونے والے ادیبوں اور شاعروں کی ضخیم کتابیں ہم نے پانچ سات روپوں میں حاصل کیں.. چنانچہ ہم ایسے ناداروں نے اُس عہد میں ادبی عیش خوب کی..

ماسکو میں.. اور مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے کہ چند ڈبل روٹیاں خریدنے کے لیے یا کیمرے کی ایک فلم حاصل کرنے کے لیے دنیا کے سب سے بڑے سٹور ''گم'' میں ایک طویل قطار میں کھڑا ہونا پڑتا تھا لیکن میرا ذاتی مشاہدہ یہ بھی ہے کہ دوستوفسکی کے کسی ناول کے تازہ ایڈیشن کو حاصل کرنے کے لیے جو قطاریں ہوتی تھیں وہ طویل تر ہوتی تھیں..

رُوسیوں کو اپنے کلاسیکی ادب سے مریضانہ حد تک لگاؤ تھا..

تب رُوسی ادب کے حصول کے لیے قطاریں لگتی تھیں اور یہ برآمد ہوتا تھا..

اور اب ادب نہیں رُوسی عورتیں برآمد ہوتی ہیں اور ان کے لیے قطاریں لگتی ہیں..

افریقہ کے قصبوں میں' پاکستان کے دور دراز کے دیہات میں.. رُوسی بدن میسر ہیں..

میرے ایک جاننے والے کا بیان ہے کہ وہ ایک بار دوبئی گئے اور ایک نہایت مخصوص کلب میں گئے تو وہاں انہیں ایک تجلی خیز ہوش ربا خاتون نہایت لاپروائی اور بے دلی سے بار کاؤنٹر پر بیٹھی دکھائی دی.. اور اس کلب میں جو بھی آتا تھا یا تو خریدار آتا تھا یا اپنے آپ کو فروخت کرنے آتا تھا.. وہ اس کے حسن تاباں کی تاب نہ لا سکے اور اس کے حصول کے بارے میں بے چین ہو کر مالیاتی امور کے بارے میں کسی اہل نظر سے استفسار کیا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ ہر کس و ناکس کے ساتھ جا کر زینت نہیں

بنتیں..آپ جتنی رقم میں ایک ہفتے تک مسلسل کچھ زینتیں حاصل کر سکتے ہیں اتنی رقم صرف ایک گھنٹے کی رفاقت کے لیے ان کی منظور نظر ہے..تو ان جاننے والے کا کہنا ہے کہ وہ اتنی جاذب نظر تھی کہ میں نے اپنی کل متاع چاہے ایک گھنٹے کی رفاقت کے لیے ہی سہی اُس پر راکھ کر دینے کا فیصلہ کر لیا..

اور جب وہ دونوں ایک کمرے میں تنہا ہوئے اور معاملات من و تُو سے پیشتر کچھ خوشگوار گفتگو کا مرحلہ آیا تو اس خاتون نے روسی ادب اور شاعری پر ایسی مدلل گفتگو کی..ایسی فلسفیانہ توجیہات پیش کیں کہ وہ جاننے والا اپنی حرص اور ہوس کو یکسر فراموش کر کے..اُس کی سنتے رہے..اور اُسے سناتے رہے کہ وہ بھی رُوسی ادب کے شیدائیوں میں سے تھے..بس ایسے ہی راز و نیاز میں سویر ہو گئی اور اس بظاہر بدن فروش خاتون نے انہیں بتایا کہ میں سوویت یونین کے زمانوں میں فلاں یونیورسٹی میں ادب پڑھایا کرتی تھی..وہ نظام درہم برہم ہو گیا..جمہوریت' آزادی اور سرمایہ دارانہ نظام آ گیا اور اس میں ادب وغیرہ کی کچھ گنجائش نہ تھی کہ اس میں کچھ منفعت نہ تھی..تو مجھے فارغ کر دیا گیا..میرے پاس ادب کے سوا اور کچھ نہ تھا جس کے ذریعے میں روزی کما سکتی..میں ایک دو برس بھوکی اور بیکار رہی اور پھر مجھے اپنا متناسب بدن یاد آیا جسے میں فراموش کر چکی تھی اور یہ فروخت ہو سکتا تھا..

اور جب سویر ہوئی تو اُس جاننے والے نے اُس خاتون سے پوچھا کہ میرے ذمے آپ کے کتنے درہم ہیں..کتنی رقم ہے..تو اس نے آبدیدہ ہو کر کہا..کچھ بھی نہیں..آپ نے مجھے ہاتھ بھی نہیں لگایا..ہم نے پوری شب صرف ادب کے بارے میں گفتگو کی ہے..اور آپ نے مجھے یاد دلایا ہے کہ میں کیا تھی اور کیا ہو گئی ہوں تو احسان آپ کا ہے..کچھ بھی نہیں!

گوگن ہائم کے بگولے میں..اس کی پُرپیچ گیلری میں بلند ہوتے گھومتے یکدم ایک تصویر ایسی نظر آئی کہ میرے پاؤں پتھر کے ہو گئے..

اس تصویر کو بھی میں بہت بار دیکھ چکا تھا..بہت شناسا اور اپنی لگتی تھی پر یہ تھی کس کی..میں نے جھک کر تصویر تلے جو تختی نصب تھی اسے غور سے پڑھا تو کھلا کہ یہ تو میرے ایک مرشد کی تھی..

اور اُس کے برابر میں ایک اور پینٹنگ بھی تھی اور یہ بھی شناسا اور اپنی لگتی تھی اگرچہ ایک سفید ریش صوفی سنت کی لگتی تھی..ذرا جھک کر نام دیکھا تو وہ ایک اور مرشد تھا..پہلی تصویر فیوڈور دستووسکی کی تھی اور دوسری لیو ٹالسٹائی کی..

ان سے شناسائی یوں تھی کہ ان دونوں ناول نگاروں کی تقریباً ہر تصنیف کی پشت پر ان کی یہی تصاویر ایک تواتر کے ساتھ شائع ہوتی تھیں..

میٹروپالٹن اور موما میں جتنے شاہکار نظر کے سامنے آئے ان میں سے بیشتر متوقع تھے میں جانتا تھا کہ یہ یہاں نمائش پر ہیں لیکن جو کچھ مجھے یہاں یکدم گوگن ہائم میں نظر آ گیا یہ سراسر غیر متوقع تھا اور میرے جیسے روسی ادب کے اسیر کے لیے ایک انمول تحفہ..میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ دوستووسکی اور ٹالسٹائی کی یہ پورٹریٹس جیسی کہ وہ پینٹ کی گئی تھیں کبھی میرے سامنے ہوں گی..

گوگن ہائم میں جانے کیوں تصویر کشی کی مکمل ممانعت ہے..میٹرو اور موما میں فلیش کے استعمال کے بغیر آپ تصویریں اتار سکتے ہیں..اگرچہ میں نے وہاں بھی چند پسندیدہ تصویروں کے سامنے اپنے آپ کو تعینات کر کے دیگر ملاقاتیوں کی منت سماجت کر کے اپنی تصویریں اتروالی تھیں لیکن یہاں تو میں بیتاب ہوا ہوں کہ اگر میں ان پورٹریٹس کے ساتھ اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے تصویریں نہ اتروا سکا تو زندگی ادھوری رہ جائے گی..یوں جان لیجیے کہ اگر غیب سے کہیں فریدالدین عطار اور جنید بغدادی ظہور میں آ جاتے ہیں اور اس لمحے آپ کے پاس ایک عدد کیمرہ بھی ہو تو کیا آپ کا جی نہ چاہے گا کہ فوری طور پر ان صوفیا کے ہمراہ ایک فوٹو اتروا لیں..میں نے سلجوق سے اس بیتابی کا تذکرہ کیا اور کہا کہ کچھ تو سبیل کرو..چنانچہ اس نے نہایت خفیہ طور پر اپنے موبائل کے کیمرے سے میری تصاویر ان بزرگان ادب کے حضور کھینچ لیں..

میوزیم کے بند ہونے کے اعلان..اس کی سفید گھومتے ہوئے زینوں سے بلند ہو کر ہم تک پہنچنے لگے..

اور میں ان دو پورٹریٹوں کے سامنے کھڑا رہا..بلکہ جھکا رہا کہ وہ ادب کے ایسے خدا تھے جنہوں نے ''وار اینڈ پیس''، ''اینا کرنینا''، ''ریزرکشن''، ''کرائم اینڈ پنشمنٹ''، ''جواری''، ''برادرز کرامازوف'' ایسے شاہکار تخلیق کیے..ایک ایسی دنیا تخلیق کی تھی جو رب کی بنائی ہوئی دنیا میں جو ظلم اور بے انصافیاں تھیں ان کی تصویر تھی..

میں نیویارک اور گوگن ہائم کا شکرگزار ہوا کہ اس نے مجھے اپنے ان دو مرشدوں سے ملا دیا تھا..

مرشد دا دیدار ہے ساہنوں لکھ کروڑاں حجاں ہُو!



''گرین اِچ ولیج''

خزاں صرف درختوں اور اُن کے پتّوں پر نہیں اُترتی..

دلوں میں بھی اترتی ہے اور بدن کو زردی سے بھر دیتی ہے..

خزاں صرف درختوں اور دلوں پر ہی نہیں اُترتی ایک ''گاؤں'' پر بھی یوں اترتی ہے کہ اس کے پتھریلے فٹ پاتھوں' ہولے سے حرکت کرتی کاروں' چہروں' گھروں.. اور ان پھول پتوں اور بیلوں پر جو مصوّروں' ادیبوں' شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کی رہائش گاہوں سے لپٹی ہوتی ہیں.. اور ہم جنس پرستوں کی آماجگاہوں' خصوصی شراب خانوں اور قہوہ خانوں.. اور اُس گاؤں میں محوِخرام کیا ہی کشش بھرے نسوانی بدنوں کے شوخ سویٹروں اور جینوں.. یہاں تک کہ نفاست سے نہلائے اور کنگھی کیے گئے کتّوں پر بھی.. بلکہ دھوپ کی کرنوں پر بھی.. جو فٹ پاتھ کا ایک حصہ رَوشن کرتی ہیں.. اور کوئی مدھ بھرا چہرہ کوئی من موہنی شکل اس حصّے میں داخل ہوتی ہے تو وہ بھی اس دھوپ سے روشن ہو جاتی ہے.. اور جونہی وہ چہرہ وہ شکل اس روشن حصّے سے نکل کر سائے میں چلے جاتے ہیں تو کیا دھوپ وہیں رہ جاتی ہے.. نہیں کچھ وہیں رہ جاتی ہے اور کچھ جو اُس چہرے اور شکل پر پڑتی ہے تو وہ وہیں ٹھہری رہتی ہے.. وہ چہرہ وہ شکل اسے ساتھ لے جاتے ہیں.. اور یوں جب وہ سائے میں چلے جاتے ہیں تو ہر کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ دھوپ میں سے گزر کر آئے ہیں اور اُس چہرے اور اُس شکل پر دھوپ کی کرنیں روشن نظر آتی ہیں.. تو خزاں ان سب پر اُترتی ہے..

صرف درختوں پر اور دِلوں میں ہی نہیں اُترتی..

نیویارک بھر میں اور کہیں نہیں.. سنٹرل پارک میں بھی نہیں.. بس اسی ایک گاؤں میں اترتی ہے جس کا نام گرین اِچ ولیج ہے..

اور اس گاؤں پر اتری ہوئی خزاں کا زوال اور بوسیدگی سے کچھ واسطہ نہیں!

اس کے جو رنگ ہیں اُن میں دھیما پن اور ٹھہراؤ ہے.. اگرچہ بجھے بجھے ہیں پر دل کو ایک اداس مسرت دینے والے ہیں.. وہ بہار کے رنگوں کی مانند بھڑکیلے اور آنکھوں میں اُتر کر اپنی شوخی اور تیزی سے دکھ دینے والے نہیں ہیں..

یوں بھی یہ گاؤں جن لوگوں کی آماجگاہ ہے.. مصوّر' ادیب' شاعر اور ہم جنس پرست.. یہ کسی کو دُکھ نہیں دیتے کیونکہ اُن کا اپنا دُکھ بہت بڑا ہوتا ہے جس میں وہ گم رہتے ہیں.. میرے آگے فٹ پاتھ پر.. ایک کمر خمیدہ اسّی برس سے کہیں آگے جا چکی عورت واکنگ سٹک کے سہارے بمشکل قدم اٹھاتی ہے.. اور اُس کے لرزیدہ جھکے ہوئے سر پر ایک بڑا اور نہایت فیشن ایبل ہیٹ ہے.. نیلے ڈینم کی جیکٹ اور طویل سکرٹ میں ملبوس ہے.. اور سکرٹ کے دونوں جانب کمر تک ایسے چاک ہیں جن میں سے اُس کی بوڑھی ٹانگوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو سیاہ جالی دار جرابوں سے مزّین ہیں کہ وہ اب بھی اپنے حسن پر یقین رکھتی ہے اور اُس کی نمائش کرنا چاہتی ہے.. وہ اُس فٹ پاتھ پر ہولے ہولے چلتی جب سائے میں سے نکل کر دھوپ میں آ گئی تو میں نے دیکھا کہ اُس کی کُبڑی پشت پر جو جیکٹ ہے اُس پر سورج مکھی کے پھول کاڑھے ہوئے ہیں اور ان کے گرد گل بوٹوں کی زیبائش ہے.. وہ سادگی اور بزرگی پر یقین نہ رکھتی تھی کہ جب وہ کسی کے قریب سے گزرے تو وہ اس پر ترس نہ کھائے.. احترام سے اُسے راستہ نہ دے بلکہ جیکٹ پر کاڑھے سورج مکھی کے پھولوں کو دیکھ کر جان جائے کہ وہ ابھی زندہ ہے.. یہ سمجھا جائے کہ اُس نے ابھی زندگی کا دامن نہیں چھوڑا' اُس کے سینے میں اب بھی وہ دل دھڑکتا ہے جو چاہا جانا چاہتا ہے.. وہ مُردہ نہیں ہوا.

یوں لگتا تھا جیسے نیلی جیکٹ پر کاڑھے گئے زرد پھولوں کے بوجھ سے وہ ذرا اور جھک گئی ہے..

میں نے گرین اِچ ولیج کی اس بڑھیا کی ایک ہم عمر بہن کو بہت برس پہلے سوئٹزرلینڈ کے شہر بَرن میں بوڑھوں کے ایک ہوسٹل میں دیکھا تھا جہاں میں بھی اُس کی کم خرچی کی بنا پر قیام پذیر تھا.. میں سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا اور وہ اوپر آ رہی تھی.. آ تو خیر کیا رہی تھی بس ایک مقام پر لرزے چلی جا رہی تھی اور اُس کا اگلا قدم ضُعف کی بنا پر اُٹھنے سے انکاری ہو رہا تھا.. وہ اتنی بوڑھی

اور لاغر تھی.. لیکن یہ کیا ہے کہ وہ ایک شوخ رنگوں کا بڑے بڑے پھولوں والا فراک پہنے ہوئے ہے.. سر پر گلابی رنگ ، کا چھجہ نما ہیٹ ہے اور اس پر ستم یہ کہ موصوفہ اونچی ایڑھی کی جوتی پہنے ہوئے ہیں.. اور یہ ایڑھی بھی لرزتی ہے اور اُس کے اوپر جو اماں ہیں وہ بھی لرزتی ہیں اور اگلا قدم اٹھا نہیں سکتیں.. میں نے اُن کے احترام میں کچھ توقف کیا کہ وہ میرے پاس سے گزر جائیں لیکن وہاں کار جہاں اتنا دراز تھا کہ میں بیزار ہو کر نیچے اُترا اور اُن کے پاس سے گزر گیا.. اور پاس سے گزرا ہوں تو وہ اپنی نقلی بتیسی کی نمائش کر کے جرمن میں مجھ سے کچھ کہتی ہیں جو شاید یہ تھا کہ.. دیکھو کیسی شاندار سویر ہے.. اور دیکھو میں زندہ ہوں..

سیڑھیوں کے اختتام پر پہنچ کر میں نے اوپر دیکھا تو وہ اپنی اونچی ایڑھی کی جوتی اور پھولدار فراک میں اُسی مقام پر لرز رہی تھیں.. اور ابھی تک اگلا قدم نہیں اُٹھ سکا تھا..

یہ کیسے شاندار لوگ ہیں کہ زندگی اور خوشی سے آخری سانس تک جُڑے رہتے ہیں.. زندگی اُن کا ساتھ چھوڑ دے پر وہ اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتے.. اور ہم زندگی میں ہی زندگی سے دامن چھڑانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں.. دو چار بال سفید ہوئے تو بزرگ ہو جانا چاہتے ہیں.. بُردبار اور سنجیدہ شکل بنا لیتے ہیں.. اور اگر ہم ایسا نہ بھی ہونا چاہیں تو معاشرہ آل اولاد ہمیں زبردستی ایسا بنا دیتا ہے.. بیوی ایسا بنا دیتی ہے کہ کچھ تو شرم کرو' یہ تمہاری عمر ہے ایک شوخ رنگ کی ٹی شرٹ پہننے کی.. والد صاحب کیا کر رہے ہیں.. یہ کس قسم کی فلم دیکھ رہے ہیں' کیسی موسیقی سن رہے ہیں.. اور صبح سویرے سیر کرتے ہوئے.. ان باباجی کو دیکھو نیکر میں گھوم رہے ہیں' فحاشی اور عریانی کو فروغ دے رہے ہیں۔ ان کا داخلہ یہاں ممنوع قرار دیا جائے.. ہاں آپ قابل تعظیم تب ہی ٹھہرتے ہیں جب آپ اقرار کرتے جائیں کہ بس جی قبر میں ٹانگیں ہیں' اب تو اللہ ہی اللہ ہے.. دیکھیں کب بلاوا آتا ہے.. فلاں قبرستان میں جگہ مل جائے تو قرار آ جائے.. آپ مشک و کافور کا بندوبست کر لیں.. اور یہ گنگناتے پھریں کہ زندگی دینے والے سُن تیری دنیا سے جی بھر گیا.. تبھی آپ احترام کے حقدار ہوں گے..

یہ جو بُڑھیا تھی سورج مکھی کے پھولوں کے بوجھ سے جھکی جاتی تھی.. گرین اِچ ولیج کے مکینوں کی روح کی نمائندگی کرتی تھی.. جو فنا ہونے سے انکاری ہو جاتی ہے.. باہر زرد شیطان کا شہر پھنکار رہا ہے.. اور یہاں اس جزیرے میں اس گاؤں میں جو بھی داخل ہوتا ہے اُس پر یہاں کے

مکینوں کی روح اثر کر جاتی ہے اور وہ بھی اُن جیسا ہو جاتا ہے..

گھنیرے درختوں کی چھاؤں میں.. اور اُن کے کچھ پتے زرد ہو کر فٹ پاتھ پر گر چکے ہیں.. یہاں کافی ہاؤس' شراب خانے اور بیکریاں ہیں.. ایسی عجوبہ دکانیں ہیں جہاں صرف ہم جنس پرستوں کے پسندیدہ پہناوے ملتے ہیں.. کہیں نہایت مردانہ آہنی زیبائش والی سیاہ چمڑے کی جیکٹیں ہیں اور کہیں نہایت زنانہ قسم کے ملبوسات ہیں جو مرد پہنتے ہیں اور اپنے محبوب کو متوجہ کرتے ہیں..

بلکہ یہاں کتوں کے لیے بھی کچھ فیشن گھر ہیں.. اُنہیں موسم سرما کی شدت سے بچانے کے لیے دیدہ زیب سویٹر ہیں اور اُنہی رنگوں سے میچ کردہ اُن کے گلے کے پٹے بھی ہیں.. اُن فیشن گھروں کے شوکیسوں میں آپ کتا ماڈل دیکھ سکتے ہیں جو ان ملبوسات کی نمائش کرتے ہیں.. زندہ نہیں.. اُن کے ماڈل.. اور نہایت ہی دیدہ زیب اور پیارے پیارے کتے.. اور انہیں دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ یہ کیا ہے کہ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا.. اس کی بجائے اگر کتا ہونا ہوتا تو کیا ہی موزوں خیال ہوتا..

اس گاؤں میں دنیا کے مشہور ترین فیشن گھروں کے آؤٹ لیٹ یا شاخیں ہیں لیکن وہ پارک ایونیو یا ففتھ ایونیو کی مانند نہایت ڈرامائی اور آنکھوں کو وا کر دینے والے چکا چوند نہیں بلکہ کچھ خزاں رسیدہ اور بجھے رنگوں کے.. نہایت دھیمے انداز کے ہیں.. یہاں کا ذوق جمال نیویارک سے سراسر مختلف اور قدرے پوشیدہ سا ہے.. وہ آپ کو نہیں بلاتا' آپ اس کی جانب کھنچے چلے جاتے ہیں.. یہاں کے فٹ پاتھوں پر.. قہوہ خانوں اور قدیم گلیوں میں جو لڑکیاں حرکت کرتی ہیں تو وہ نہایت متناسب اور وضع دار انداز میں شوخی' بے باکی اور چنچل پن کے بغیر حرکت کرتی ہیں.. اور اُن کے لباسوں میں مہنگائی کا بھڑک پن نہیں' خزاں کے وہی بجھے ہوئے اداسی کے اگرچہ پُرمسرت رنگ اترتے ہیں..

اس گرین اِچ ولیج کو اہل نیویارک صرف وِلج یا گاؤں کے نام سے پکارتے ہیں اور یہ تھا بھی ایک گاؤں..

1822ء میں جب نیویارک میں زرد بخار کی وبا پھیلی اور روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں اموات ہونے لگیں تو وہاں کے بیشتر شہری فرار ہو کر ادھر آ بسے.. یہ علاقہ تب قدرتی حالت میں

ہرا بھرا تھا' یہاں فارم ہاؤس بکھرے ہوئے تھے اور ندیاں بہتی تھیں.. چونکہ یہاں پناہ لینے والوں نے جہاں جگہ ملی وہاں گھر اور جھونپڑے تعمیر کر لیے اس لیے بقیہ نیویارک کے برعکس یہاں کی سڑکیں اور گلیاں ٹیڑھی میڑھی اور کسی بھی منصوبہ بندی کے بغیر ہیں۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہاں وہ لوگ بسیرا کرنے لگے جو ذرا ''مختلف''.. تھے اور معاشرہ انہیں قبول نہ کرتا تھا.. یہ علاقہ ہم جنس پرستوں کی آماجگاہ بن گیا کہ اُنہیں کہیں اور پناہ نہ ملتی تھی اور قانون کے محافظ ان کی ''سرگرمیوں'' پر نظر رکھتے تھے اور اکثر بلاتردد گرفتار کر کے جیل بھجوا دیتے تھے..اُن زمانوں میں امریکہ یا یورپ میں ابھی ہم جنس پرستی ایک فیشن نہ تھی' اتنی مقبول نہ تھی جتنی کہ آج ہے کہ مردوں کی آپس میں شادیاں ہو رہی ہیں اور ایلٹن جون گلوکار کی شادی ایک اور مرد سے ہو رہی ہے اور اُس میں دنیا بھر کے مشہور ترین اور معزز لوگ شرکت کر رہے ہیں اور اس بندھن کو پوری دنیا میں براہ راست دکھایا جا رہا ہے.. یہاں تک کہ چرچ کے پادری اور بشپ بھی نہایت فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ عیسیٰ کے فضل و کرم سے میں ہم جنس پرست ہوں.. اس گاؤں میں ایسے لوگوں کے ہی ٹھکانے' ریستوران اور شراب خانے تھے..اور یہ کیسی پیاری اور دل کو لبھانے والی بات ہے کہ وہاں یہ رواج ہے کہ دو یا تین لڑکیاں کوئی ایک شام کسی شراب خانے میں گزاریں تو یہ لڑکیاں ہمیشہ کسی ایسے شراب خانے کو ترجیح دیتی ہیں جو کہ ہم جنس پرستوں کا ہو کیونکہ عام شراب خانے میں شراب پینے والے لڑکیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اُنہیں چھیڑ بھی سکتے ہیں جب کہ ایسے ہم جنس پرستوں کے شراب خانے میں لڑکیاں بے حد پرسکون اور محفوظ رہتی ہیں کہ یہاں بیٹھنے والے اُن میں قطعی طور پر دلچسپی نہیں لیتے بلکہ اُن سے گھبرائے رہتے ہیں کہ کہیں یہ ہمیں نہ چھیڑیں..

یہاں اب بھی ایک گلی کا نام ''گے سٹریٹ'' ہے..

اُن زمانوں میں جب پولیس نے اُن زمانوں کے اِن غیر اخلاقی حضرات کے ایک شراب خانے پر چھاپہ مارا تو یہ ''مرد'' اپنے حقوق کی خاطر جان کی بازی لگانے پر تُل گئے.. پولیس کا مقابلہ کیا..شاید کچھ ''شہید'' بھی ہو گئے کہ یہ ایک قسم کی مسلح جدوجہد تھی جواب تاریخ کے صفحوں پر مرقوم ہے اور اب ہر ''گے'' فخر کرتا ہے کہ ہم نے اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے بے مثال قربانیاں دی ہیں..ظاہر ہے ان ''شہیدوں'' کا نام ہم جنس پرستوں کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھا جا چکا ہے..

اب ذرا یورپ اور امریکہ کا دوغلا پن ملاحظہ کیجیے کہ ہمیں ہمیشہ پس ماندہ اور بنیاد پرست قرار دیتا ہے جب کہ اس معاملے میں ہماری روشن خیالی بے مثال ہے.. یورپ اور امریکہ میں جب ہم جنس پرستی کو ایک لعنت اور غیر اخلاقی رویہ سمجھا جاتا تھا تو ہمارے مشرق میں اس کی کھلی چھٹی تھی بلکہ اس کے گیت گائے جاتے تھے اور ہم عطار کے اسی لونڈے سے دوا لیتے تھے.. اپنی شاعری میں لڑکوں کے حسن کے اسیر ہوتے تھے..حوروں کے ہمراہ غلمان بھی جگہ پاتے تھے اور ہم اس معاملے کو ''عِلت مشائخ'' کا نام دیتے تھے..ان مشائخ کے مدارس میں بھی یہ ''سلیبس'' معیوب نہیں گردانا جاتا تھا..اور اس عہد میں بھی علماء کی جانب سے ہم جنس پرستی کی مذمت میں کم ہی بیان آتا ہے..خاص طور پر پاکستان کے شمال مشرقی حصوں میں تو یہ سرگرمی تہذیب کا ایک حصہ ہے..میں اُس شہر کا نام نہیں لوں گا صرف ایک اشارہ کروں گا کہ وہاں کی مہندی بہت مشہور ہے وہاں آج بھی ہفتے کے کسی خاص دن یا تہوار کے موقع پر مقامی شرفاء اس سج دھج سے نکلتے ہیں کہ اُن کے ہمراہ اُن کا ''محبوب'' خوب بنا ٹھنا اور ادائیں دکھلاتا ہوتا ہے اور اُن کے گلے میں ہار ہوتے ہیں اور کمپنی کی مشہوری کے لیے آگے آگے ایک مقامی آرکسٹرا بھی ہوتا ہے..یعنی ڈھول اور سارنگی والے جو دُھنیں بکھیر رہے ہوتے ہیں کہ تم ایک نظر میرا محبوب نظر تو دیکھو..اور رقیب اُن کے ''محبوب'' کو دیکھ کر جل بھن کر راکھ ہو جاتے ہیں..محبوب نے ہاتھ میں ایک ٹیپ ریکارڈر بھی تھام رکھا ہوتا ہے اور ظاہر ہے وہ ایک لڑکا ہوتا ہے..

ابھی دو چار برس پہلے کی بات ہے کہ میرے ایک چاہنے والے دوست نے مجھے ڈیرہ اسماعیل خان مدعو کیا جہاں مجھے مقامی ادیبوں اور شاعروں نے نہایت محبت اور مہربانی سے ایک پر تکلف کھانے پر مدعو کیا..اُن میں ریڈیو کے ایک پروڈیوسر بھی تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تارڑ صاحب کیا آپ فلاں مہینے میں فلاں تاریخ کو فلاں پیر صاحب کے عرس پر تشریف نہیں لا سکتے..میں نے عرض کیا کہ لاہور سے ڈیرہ اسماعیل خان صرف ایک پیر کے لیے اور اس کے عرس کے لیے آنا قدرے مشکل ہے..تو وہ کہنے لگے کہ جناب نہ تو یہ کوئی معمولی پیر ہیں اور نہ ہی اُن کا عرس ایسا ہے..وہاں ایک مقابلۂ حسن منعقد ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی تشہیر نہیں ہوتی تو اسے دیکھنے کے لیے ہی تشریف لے آئیے..

یہ میرے لیے حیرت کا ایک سامان تھا کہ ڈی آئی خان میں یہ کیسے ممکن ہے کہ متناسب

بدن کی دوشیزائیں اوپر اور درمیان میں دھجیاں باندھے.. یعنی وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے.. باندھے کیٹ واک کر رہی ہوں..

تب انہوں نے میری جہالت پر کفِ افسوس ملا اور خندہ زن ہو کر کہنے لگے کہ تارڑ صاحب ہم خوددار لوگ ایسی بے حیائی اور فحاشی کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ لڑکیاں اپنے بدن کی نمائش کرتی پھریں.. اس مقابلۂ حسن میں تو نوجوان گل بدن اور لچکیلے لڑکے حصہ لیتے ہیں.. وہ بہت سجے ہوئے.. اٹھلاتے ادائیں دکھاتے حسین لڑکے ہوتے ہیں جو اس عرس میں سب کی نظروں کے سامنے آتے ہیں.. اور سب جانتے ہیں کہ یہ محبوب نظر کس خان صاحب کا محبوب ہے.. اور پھر باقاعدہ نتائج کا اعلان تو نہیں ہوتا کہ اس برس کے مقابلۂ حسن میں شریک فلاں ''حسینہ'' مس یونیورس قرار پائی ہیں یا قرار پایا ہے لیکن ہر کوئی جان جاتا ہے کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آئی ہے..

ان زمانوں میں بھی ایسے خاندان ہیں جو ایسے ''محبوبوں'' کو تربیت دینے میں کمال کے درجات پر پہنچے ہوئے ہیں.. اُنہیں کم عمری سے ہی سکھایا جاتا ہے کہ کیسے امراؤ جان ادا کی اداؤں کو بھی مات دینی ہے.. رقص اور نخرے کی تربیت باقاعدہ دی جاتی ہے.. ان میں ''لختئی'' کا ادارہ نہایت ثقافتی اور مستحکم ہے..

ویسے مجھے کچھ شرمندگی تو ہو رہی ہے اقرار کرنے میں.. لیکن میں نے عمر بھر اپنی ادبی زندگی میں دیگر معزز ادیبوں کے برعکس اقرار کرنے کی سزا ہی پائی ہے.. بہت لعن طعن سہا ہے لیکن میں اقرار کرنے سے باز نہیں آ سکتا.. تو میں اقرار کرتا ہوں کہ ایک بار اسلام آباد کے لوک ورثہ کے میلے میں بنوں سے آنے والے لختئی رقاص لڑکوں کو جب میں نے ایک بے خود رقص میں گھومتے اور تھرکتے دیکھا اور اُن کے سرخ سفید چہرے پسینے سے دمکتے تھے اور اُن کے دراز گیسو بھی ہوا میں رقص کرتے تھے تو اُن میں سے ایک لختئی ایسا پر کشش اور خوش شکل تھا کہ میں اُسی کو دیکھتا رہ گیا.. اُس لمحے اُس کا اسیر ہو گیا.. اور خواہش کرتا رہا کہ کاش یہ عطار کا لونڈا ہوتا تو میں اس سے دوا لیتا..

اُس لختئی کی نزاکت اور ادائیں آج بھی میرے دل پر نقش ہیں..

مجھے اس اقرار کی آپ جو جی چاہے سزا دے لیں.. لیکن اگر آپ ایسا کریں گے تو پھر

پاکستان بھر میں آپ کس کس کو سزا دیں گے.. کسی ایک پورے صوبے کو تو سزا نہیں دے سکتے..

میں صرف یہ عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ امریکہ اور یورپ کی نسبت ہم اس معاملے میں ایک عرصے سے روشن خیال ہیں..

ویسے بات چل نکلی ہے تو دیکھیں کہاں تک پہنچے.. تو ایک اور اقرار بھی کرتا چلوں..

میرے مشاہدے کے مطابق ہم جنس پرستی دو قسم کے معاشروں میں رواج پاتی ہے.. ایک وہ جہاں عورت دکھائی ہی نہ دیتی ہو جیسے ہمارا صوبہ سرحد اور دوسری وہ جہاں عورت ہی دکھائی دیتی ہو جیسے سکینڈے نیوین ممالک اور خاص طور پر سویڈن.. جنہیں عورت دکھائی نہ دے تو وہ اس جانب مجبوراً مائل ہو جاتے ہیں اور جنہیں ہر گام پر.. ہر بستر میں عورت دکھائی دے وہ اس کی یکسانیت سے اُکتا کر اُدھر کا رُخ کر لیتے ہیں اور میں یہاں پیدائشی طور پر مجبور لوگوں کا تذکرہ نہیں کر رہا جو اگرچہ بظاہر مرد ہوتے ہیں لیکن اُن کے اندر ایک عورت کے جرثومے بہتات میں ہوتے ہیں.. دوش ان کا نہیں تخلیق کار کا ہوتا ہے.. تو سویڈن میں مجھے کچھ ایسے ہی نادر اور نایاب تجربے ہوئے جنہیں میں نے اپنے سفرناموں میں فسادِ خلق سے خوفزدہ ہو کر تحریر نہیں کیا.. اب بھی نہیں کروں گا لیکن ایک معصوم سی محبت کا بیان کر دینے میں کچھ حرج نہیں.. وہ ایک نہایت امن پسند اور دانشور قسم کا نوجوان تھا جو مجھ پر ''عاشق'' ہو گیا.. اب یہ تو میرا ڈیپارٹمنٹ ہی نہ تھا لیکن اُس کی محبت میرے لیے اتنی معصوم اور دھیمی تھی کہ میں اُسے دھتکار نہ سکا.. اُس نے کبھی بھی مجھ سے کچھ مطالبہ نہ کیا.. اُس کی سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ سٹاک ہوم کے سمندر کے کنارے کسی قہوہ خانے میں بیٹھے ہوئے کچھ دیر کے لیے اسے اپنا ہاتھ تھامنے کی اجازت دے دوں.. اور اس نے رخصت ہوتے ہوئے مجھے ایک طلائی لاکٹ تحفے کے طور پر دیا جس کے ساتھ سونے کا ایک دل تھا جو اس کی محبت کا مظہر تھا..

میں نے یہ لاکٹ انگلستان واپسی پر انجلا کو دے دیا..

اور بات چل نکلی ہے.. تو اسی انجلا نے ایک بار مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا.. کہنے لگی کہ میری سہیلیاں کہتی ہیں کہ تمہارا بوائے فرینڈ اپنے سکھ دوست سکھدیپ کے ساتھ ہائی سٹریٹ میں بانہوں میں بانہیں ڈالے گھومتا ہے تو وہ ''گے'' ہے.. ایک مرد اگر ایک عورت کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے گھومے تو یہ تو ایک قدرتی بات ہے لیکن ایک مرد کے ساتھ.. سچ سچ بتاؤ کہ تم

ہوموسیکسوئل تو نہیں ہو..

میں نے اینجلا کو بہ مُشکل یقین دلایا کہ میں نہیں ہوں.. ہمارے ہاں مردوں سے ہم آغوش بھی ہو سکتے ہیں.. اُنہیں چوم بھی سکتے ہیں لیکن ہم عورتوں کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے.. تو اینجلا نے کہا تھا. تم ایک عجیب معاشرے کے لوگ ہو.. جو قدرتی ہے اُسے غیر قانونی گردانتے ہو.. اور جو غیر قدرتی ہے یعنی ایک مرد کا ایک مرد سے ملاپ اُسے قدرتی قرار دیتے ہو.. تو یہ بات.. ہم جنس پرستی کی بات.. بہت دور تلک چلی گئی اور میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اس معاملے میں امریکہ اور یورپ ہماری روشن خیالی کی تاب نہیں لا سکتے.. وہاں تو اب جا کر مردوں کی مردوں سے شادیاں ہو رہی ہیں جب کہ ہمارے ہاں سینکڑوں برسوں سے اس روایت پر کھلے عام عمل ہو رہا ہے اور پس منظر میں ڈھول بھی بجائے جا رہے ہیں۔ ہم جنس پرستی نے تو قبولیت کی سند حاصل کر لی اور اب ایک مرد دوسرے مرد کو ''قبول ہے'' کہہ کر قانونی طور پر شریک زندگی بنا سکتا ہے تو پھر اب اس گرین اِچ وِلیج میں کیا کشش ہے.. یہاں اب بھی معاشرے سے مختلف سوچ رکھنے والے ہجوم کرتے ہیں.. جو طبع اور خصلت میں مختلف ہوتے ہیں اور ظاہر ہے تمام تخلیقی لوگ اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں..

اس گاؤں کی سیر کیجیے تو عجیب انوکھے گھر شراب خانے' بیکریاں اور قہوہ خانے نظر آتے ہیں..

ان میں گلی نمبر ساڑھے پچھتر پر واقع.. جی ہاں واقعی اس سٹریٹ کا نمبر 75.5 ہے.. تو اس گلی میں واقع ایک گھر نیویارک کا سب سے چھوٹا گھر قرار دیا گیا ہے.. اس کی چوڑائی صرف ساڑھے نوفٹ ہے۔ 1893ء میں تعمیر کیا گیا.. اس میں شاعروں' ادیبوں اور اداکاروں نے قیام کیا.. اداکارہ میری مُورا اور اپنے کیری گرانٹ ''این افیئر ٹو ریمبر'' اور ہچکاک کی فلم ''نارتھ بائی نارتھ ویسٹ'' والے بھی اس مختصر ترین مکان کے مکین رہے.. میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ یہ حضرات اور ان میں ایک خاتون شاعرہ بھی تھیں اس ڈربہ نما جگہ میں کیسے دن رات کرتے تھے.. میرا خیال ہے کہ دن رات کرنے کی بجائے کچھ اور کرتے ہوں گے..

صرف چھ گھروں کا ایک مجموعہ ہے جو ''کوکورٹ'' کہلاتا ہے.. او ہنری نے اپنی کہانی ''آخری پتہ'' ان گھروں کے پس منظر میں لکھی تھی.. میں نے اس او ہنری کی کافی کہانیاں پڑھی تو

تھیں لیکن وہ صرف اس لیے یاد میں مسکراہٹ بکھیرتا ہے کہ شفیق الرحمٰن نے لکھا تھا کہ یہ جو او ہنری ہے اسے.. اے او ہنری کہنا چاہیے تھا..

میں نے ابھی گئے حضرات کی جس بے مثال مسلح جدوجہد کا تذکرہ کیا تھا وہ کرسٹوفر سٹریٹ پر واقع ''دے سٹون ویل اِن'' نامی شراب خانے سے شروع ہوئی تھی..

ایک مقام ''پیچن پلیس'' نام کا ہے جہاں بتایا جاتا ہے کہ شاعر ای۔ کمنگ 1923ء سے 1962ء تک قیام پذیر رہا' اس کے بعد وہ اس لیے یہاں قیام نہ کر سکا کہ وہ اسی برس فوت ہو گیا تھا.. جانے کون تھا.. البتہ انگریزی شاعر جان مینسفیلڈ کچھ شناسا سا لگتا ہے.. وہ بھی یہاں ہوا کرتا تھا اور یوجین اونیل تو بہت شناسا سا ہے اُس کے ڈرامے تو ہم جیسوں نے بھی پڑھ رکھے ہیں' وہ بھی اس گھر کا مکین رہا۔ اس کے علاوہ ایک صاحب تھے جان ریڈ.. اُنہوں نے ایک شہرۂ آفاق کتاب ''دس دن جنہوں نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا'' تحریر کی تھی جس میں انہوں نے روسی انقلاب کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا تھا.. وارن بیٹی نے اپنی فلم ''ریڈز'' اسی کتاب پر مبنی بنائی تھی.. جان ریڈ بھی اسی پیچن پلیس میں کچھ عرصے کے لیے رہائش پذیر ہوا. لگتا ہے کہ یہ سب حضرات یوں تو گاؤدی تھے۔ تخلیقی کرشمہ تو صرف اس مکان کا تھا.. جونہی اس میں رہائش اختیار کرتے تھے جینئس ہو جاتے تھے.. مارک ٹوین جس کی نثر اور مزاح پڑھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ یہ امریکہ میں کیسے پیدا ہو گیا' وہ بھی اسی گاؤں کی گلیوں میں آوارہ پھرنے کا شائق تھا..

میں ذاتی طور پر تو اُسے تلاش نہیں کر سکا لیکن یہیں اسی گاؤں میں کہیں ''نائتھ سرکل بار'' نامی شراب خانہ ہے جہاں ڈرامہ نگار ایڈورڈ البی نے ایک آئینے پر کسی مخمور شخص کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی ایک تحریر ''ہو از افریڈ آف ورجینیا وولف'' دیکھی اور اس عجیب فقرے سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے بنیاد بنا کر ایک ڈرامہ لکھا۔ یہ فقرہ مجھے بھی عجیب خیالوں میں مبتلا کرتا ہے.. اُس گمنام نے حالتِ خمار میں ایک آئینے پر ایک ایسا فقرہ کیوں لکھا جو کوئی خاص معنویت نہیں رکھتا اور پھر بھی وہ آپ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے.. یہ ورجینیا وولف کون تھی جس سے وہ یوں تو ڈرتا تھا لیکن مے نوشی کے بعد وہ ہمت کر کے کہتا ہے کہ ورجینیا وولف سے کون ڈرتا ہے..

کیا یہ وہی ورجینیا وولف تھی جسے ہم سب جانتے ہیں..

ویسے اگر آپ مجھ سے دریافت کریں کہ ورجینیا وولف سے کون ڈرتا ہے..

تو میں فوراً ہاتھ اُٹھا کر اقرار کروں گا کہ.. میں ڈرتا ہوں..

وہ جس طور اپنے شعور کی رو میں بہتی چلی جاتی ہے.. مروجہ نثر کے سانچوں کو توڑ کر ایک بعض اوقات ناقابل فہم شعور کے سانچے تخلیق کرتی چلی جاتی ہے تو میں اُس کی تحریر کے سحر سے ڈرتا ہوں..

میں کیا ہمارے عہد کے بیشتر ناول نگار بھی ڈرتے ہیں..

وہ اُن پر حاوی ہوتی چلی جاتی ہے..

یہاں تک کہ قرۃ العین حیدر ایسی کسی کو خاطر میں نہ لانے والی ناول نگار بھی اُس سے اتنی خائف ہوتی ہے کہ اُس کے رنگ میں رنگی جاتی ہے.. کہ سٹریم آف کانشیئنس یا شعور کی رو.. ورجینیا کے پریشان اور منتشر ہوتے دماغ کی اختراع ہے..

ورجینیا کی حیات پر مبنی فلم ''دے آورز'' اس عظیم مصنفہ کے دماغ کی شکستگی اور الیے کو یوں تصویر کرتی ہے کہ اُس کی تحریر بھی ایسی نہیں جو اتنی خوبصورت نمائندگی کر سکے.. اداکارہ نکول کڈمین جو کبھی بھی میرے دل میں جگہ نہ بنا سکی.. جو ایک جانب ''مالین رُوژ'' میں ایک طوائف کی برہنہ اور جنسی انگیختگی کی تصویر ہے اور دوسری جانب ''دے آورز'' میں جب وہ ورجینیا وولف کا روپ دھارتی ہے تو پہچانی نہیں جاتی.. تو یہی نکول میرے دل پر راج کرنے لگتی ہے.. اُس کا بہروپ ناقابل یقین ہے.. اس فلم کا اولین منظر جس میں ورجینیا اطمینان سے چلتی.. گھر سے نکل کر.. درختوں اور بوسیدہ دیواروں کے سائے میں چلتی اطمینان سے ایک ندی میں اُترتی جاتی ہے.. یہاں کہ پانی سر سے گزر جاتے ہیں اور وہ ڈوب جاتی ہے.. یہ منظر اتنا موثر اور جان لیوا ہے کہ پانی آپ کے سر سے بھی گزر جاتے ہیں اور آپ بھی ڈوب جاتے ہیں..

اسی گاؤں میں ایک انگریزی پڑھانے والی اُستانی رہا کرتی تھی' این شارلٹ لنچ.. جو اپنے گھر میں ادبی محفلوں کا اہتمام کیا کرتی تھی.. ہرمن میل ول اور بدن میں سنسنی پیدا کرنے والا ایڈگر ایلن پو اُس کے قریبی دوستوں میں سے تھے.. بلکہ پو نے اپنی مشہور کہانی ''دے ریون'' پہلی بار اس اُستانی کے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھی تھی.. اب تک آپ کو تھوڑا سا یقین آ گیا ہوگا کہ یہ گاؤں.. کیسا انوکھا گاؤں ہے لیکن ابھی اس گاؤں کی گلیوں میں گھومنے والا سب سے مشہور شخص کا تذکرہ باقی ہے.. اور وہ ہے آئرلینڈ کا سب سے بڑا.. سب سے محبوب اور کمال کا شاعر

ڈیلن تھامس.. جسے آئرلینڈ والے ''یولیسس'' کے مصنف جیمز جوائس اور جارج برنارڈ شا کے برابر میں بٹھاتے ہیں.. اور اگر صرف ایک مگ بیئر کا چڑھا لیں تو اُسے وہاں سے اُٹھا کر آسمان پر جا بٹھاتے ہیں.. ڈیلن تھامس اسی گرین اِچ ولیج کے ایک شراب خانے ''دے وہائٹ ہارس'' میں باقاعدگی سے.. ایک اچھے آئرش کی مانند کہ وہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے خانے کی بجائے شراب خانے میں گزارتے ہیں.. وہ باقاعدگی سے وہاں نشست کیا کرتا تھا.. وہاں آتا تھا.. آتا وہ اپنے پاؤں پر تھا لیکن جاتا وہ دوسروں کے پاؤں پر تھا.. اُس کے دوست اور مداح اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر گیت گاتے لے جاتے تھے.. ایک اچھے آئرش کی طرح شراب میں اُس کی جان تھی اور یہ جان بھی شراب سے ہی گئی.. اور ''دے وہائٹ ہارس'' میں ہی مسلسل بیٹھنے سے ہی گئی..

ایک ایسا شراب خانہ جو آئرلینڈ کے سب سے بڑے شاعر کی موت کا سبب بنا.. بجائے اس کے کہ اس کے چاہنے والے اس منحوس مقام سے گریز کرتے وہ اسے مقدس قرار دے کر اُس کی زیارت کو آتے ہیں اور ڈیلن تھامس کی یاد میں بیئر کے ڈرم اپنے اندر انڈیلتے ہیں اور پھر آبدیدہ ہو کر اس کی شاعری پڑھتے ہیں اور آئرش گیت گا گا کر اسے یاد کرتے ہیں..

یہ شراب نوشی اور شاعری کا آپس میں کیا رشتہ ہے..

اِک گونہ بے خودی جو دن رات چاہیے اور نشاط نہیں چاہیے تو ان کا آپس میں کیا تعلق ہے..

اچھے اور بڑے شاعروں میں چند ایک ہیں جو ''سوکھے'' رہے ہیں ورنہ بیشتر تو اتنے ''بھیگے'' رہے ہیں کہ وہ جہاں ہوتے ہیں وہاں اُن کو اپنی خبر بھی نہیں ہوتی.. میں تو ایک نثر نگار ہوں' میں اس بھید کو کیا جانوں..

ابونواس.. خیام.. حافظ سے آغاز کر دیجیے اور بیچ کے زمانوں کو فراموش کر کے اپنے عہد میں قدم رکھ دیجیے تو یہاں بھی شراب خانہ خراب راج کرتی ہے.. جانے حالی' حسرت موہانی اور کسی حد تک مجید امجد نے شاعری کیسے کر ڈالی.. ورنہ.. وہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں' آدمی بے نظیر ہوتے ہیں.. بیشتر فقیر شراب خانہ خراب سے شغف رکھتے تھے.. اور اب دوسروں کو دوش کیا دینا اپنے سگے چچا بھی پنشن ملنے پر سب سے پہلا کام یہ کرتے تھے کہ ''کانچ کا سامان'' ایک گدھا گاڑی پر لے کر آتے تھے اور کہتے تھے کہ پروردگار نے خوراک کا وعدہ تو کر رکھا ہے شراب کا نہیں تو اس کے

لیے خود ہی بندوبست کرنا پڑتا ہے..

ہم جب ٹین ایجر ہوا کرتے تھے تو ہمارے تینوں محبوب شاعر..اختر شیرانی' ساحر اور عدم..تینوں ٹُن بابے ہوا کرتے تھے..حضرت علامہ کے بارے میں بھی زبانی طیور کی یہی مہک آتی تھی..مجاز..جوش..فیض اور فراز کا تو کہنا ہی کیا۔

تو ایک نثر نگار کے طور پر میں اس بھید کو نہیں پا سکا..کچھ آپ ہی سمجھا دیجیے..تو یہیں کہیں ایک اور قدیم شراب خانے کی شنید تھی کہ جہاں ڈیلن تھامس تو آیا جایا ہی کرتا تھا کہ شراب خانوں میں ہی تو اُس کا آنا تھا اور پھر بالآخر جانا تھا..لیکن وہاں ولیم فالکنر..جے ڈی سلنگر اور ارنسٹ ہیمنگوے بھی اکثر پائے جاتے تھے اور سارتر کی ساتھی سمون ڈی بوئیر جب کبھی پیرس سے نیویارک آتیں تو اُن کی بیٹھک بھی وہیں ہوا کرتی تھی..بدقسمتی سے میں اس شراب خانے کا نام اور حدود اربعہ نہ جان سکا ورنہ سب سے پہلے اس مقدس مقام پر حاضری دیتا جہاں پاپا ہیمنگوے اور سیمون ڈی بوئیر کا آنا جانا تھا..

گرین اِچ ولیج کا جو میں آنکھوں دیکھا حال بیان بے دریغ کرتا جا رہا ہوں اور علم اور ادب کے جو دریا بہاتا چلا جا رہا ہوں تو یہ دریا یونہی تو نہیں بہتے جا رہے بلکہ ان کی روانی کی بنیاد اس گاؤں میں ''نوّے منٹ کی چہل قدمی'' ہے..جس کے دوران سلجوق میرا ہم قدم ہے..اس نے نیویارک کی سب سے معتبر گائیڈ بک ''ڈورلنگ کنڈرسے ٹریول گائیڈ'' کبھی سینے سے لگا رکھی ہے ایک صحیفے کی طرح اور کبھی آنکھوں سے لگا رکھی ہے راستہ تلاش کرنے کے لیے اور وہ اس میں درج شدہ ہدایات کے مطابق مجھے تقریباً ''زبردستی'' گرین اِچ ولیج اور سوہو میں نوّے منٹ کی ایک واک کروائے چلا جا رہا ہے..اور میں اتنی طویل محض چہل قدمی کرنے کے موڈ میں نہ تھا اور طرح طرح کے بہانے تراشتے تھے کہ جوتی میاں یہ گائیڈ بکس تو گاؤدی سیاحوں کے لیے ہوتی ہیں اور یہ واکس وغیرہ اور وہ بھی پورے ڈیڑھ گھنٹے کی واکس وغیرہ سے کچھ حاصل حصول نہیں ہوتا' مضر صحت ہوتی ہیں کہ میرے جیسے جہاندیدہ سیاح تو ایک قطرے میں دجلہ دیکھ لیتے ہیں تو میں نے اس گاؤں پر اترتی زرد دھوپ میں ایک خزاں رسیدہ پتہ دیکھ لیا ہے اور وہی ایک جہان ہے..لیکن وہ نہ مانا کہ والد صاحب اپنا جہان نہ آباد کر لیا کیجیے..جو جہان آباد ہے اس کا مشاہدہ کیجیے تو ادھر آئیے کرسٹوفر سٹریٹ سے آغاز کرتے ہیں..بینک سٹریٹ..گرین اِچ ولیج سٹریٹ..شیرڈن سکوئر اور

خاص طور پر بلیکر سٹریٹ کی سیر کرتے ہیں..

تو جو کچھ میں بیان کر چکا ہوں وہ سلجوق نے مجھے اس زبردستی کی واک کے دوران دکھایا اور یہی وہ واک تھی جس کے دوران میں نے اس گاؤں کے ہر گھر' ہر درخت اور ہر چہرے پر وہ دھیمی اور پُراثر خزاں کی رنگت دیکھی جس میں ہم دونوں اس کی گلیوں اور کوچوں میں گھومتے رنگے جا رہے تھے..یعنی ہم بھی یہاں کے مکین ہو رہے تھے..یہاں رنگ و نسل کا امتیاز نہ ہوتا تھا کہ اس گاؤں میں جو بھی تھا..سیاہ فام' گورا' زرد یا ہم جیسا بھورا تھا وہ خزاں کی اس رنگت میں رنگا جا رہا تھا..

سلجوق یہ لمبی لمبی پلانگیں بھرتا مجھ سے آگے نکلتا تھا اور میں جان بوجھ کر کچھ پیچھے رہ جاتا تھا' کبھی کسی عجوبہ شوکیس کے سامنے ٹھہر جاتا تھا جس میں نسوانی ملبوسات ایسے سجے ہوتے تھے کہ اُن کے لیے ایک گرم بدن تلاش کرنے کو جی چاہتا تھا..یا پھر کوئی ایسا چہرہ سامنے آ جاتا جسے دیکھ کر پاؤں پتھر ہونے لگتے اور اُسی دم سلجوق پلٹ کر کہتا'' والد صاحب...''

نیویارک میں قیام کے دوران سلجوق حسب توقع ایک سخت گیر پہرے دار ثابت ہوا..نہ وہ مجھے بھٹکنے دیتا اور نہ میری نظر کو..جونہی میری نظر بھٹکتی ہے اور کسی خوشنمائی پر ٹھہرتی ہے تو جانے اس کے اندر ایسا کونسا نظام دفاع والد صاحب نصب ہے کہ وہ فوراً مڑ کر کہتا ہے..والد صاحب..!

اور وہ نوجوان تھا اور اس کے نزدیک اگر کسی بھی چہرے پر نظر تادیر ٹھہری رہے تو اس کا سبب محض ہوس ہو سکتی ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں..حالانکہ اس عمر میں سبب اس کے سوا اور بھی ہو سکتے ہیں..

لاہور کے ایک درویش حضرت موسےٰ آہنگر..لوہا پگھلانے کا کام کرتے تھے اور ان زمانوں میں جو بھی آہنگر ہوتے تھے اور ان میں مذہب کی کچھ تخصیص نہ تھی وہ انہیں اپنا ولی مانتے تھے..پیٹرن سینٹ مانتے تھے..موسےٰ کے پاس ایک شکل والی ہندو عورت آئی کہ اے لوہار میرے چرخے کا تکلا ٹیڑھا ہو گیا ہے' اسے سیدھا کر دے..موسےٰ نے وہ تکلا اپنی دہکتی بھٹی میں جھونکا اور پھر اس سے غافل ہو کر اس عورت کے حسن سے مغلوب ایسا ہوا کہ اسے دیکھتا ہی چلا گیا..وقت بہت گزر گیا' تکلا آگ میں آگ ہو گیا' پر موسےٰ کی نظریں اس چہرے پر ہی ٹھہری رہیں تو اس عورت نے کہا..اے موسےٰ آہنگر تیرے تو درویش ہونے کی دھوم تھی..تو کیسا عیار درویش ہے کہ

میرے تکلے کو بھول کر مجھے دیکھتا چلا جا رہا ہے.. موسےٰ نے کہا.. اے عورت میں تیرے چہرے میں اپنے رب کے جمال کو دیکھ رہا تھا اور اگر میری نظر میں خواہش اور ہوس کی کوئی ایک رمق بھی ہو تو میں یہ دہکتا ہوا لوہے کا تکلا اپنی آنکھوں میں پھیرتا ہوں.. اگر ہوس کا ایک ذرہ بھی ہو تو میں اندھا ہو جاؤں اور یہ تکلا سونے کا ہو جائے.. موسےٰ نے پگھلتے ہوئے لوہے کا وہ تکلا اپنی آنکھوں میں پھیرا اور روایت ہے کہ اس کی بینائی پر کچھ اثر نہ ہوا البتہ وہ تکلا سونے کا ہو گیا.. وہ ہندو عورت اس کی مرید ہو کر عمر بھر اس کے گھر میں جھاڑو لگاتی رہی.. آج بھی لاہور میں موسے آہنگر کے مزار میں برابر میں اس عورت کی قبر موجود ہے..

میں موسےٰ ایسا دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا تھا..

کسی دہکتے ہوئے تکلے کو ہرگز اپنی آنکھوں میں نہیں پھیر سکتا تھا..

تکلے کے سونے کے ہو جانے کے امکان کم تھے اور میرے نابینا ہو جانے کے زیادہ کہ ہوس نے ابھی تک دامن نہ چھوڑا تھا..

میری نظر تو ہر شے پر ٹھہرتی تھی..

فیئری میڈو میں برف کی دبیز چادر میں سے نمودار ہونے والی سٹرابیری کے پہلے پھول پر.. جھیل سرال میں تیرتے برف کے راج ہنسوں پر.. قریب سے گزرتے آئس کریم کو ناک اور منہ سے لگاتے ایک بچے پر..

وہ درختوں کی گھنی چھاؤں میں سے.. اُن کی نیم سیاہی میں سے ظاہر ہوتی ایک سنہری بالوں والی' بغیر آستین کے سیاہ بلاؤز میں ملبوس اور سیاہ جین والی ایک درمیانی عمر کی عورت پر بھی ٹھہر سکتی تھی جو یہ لباس اس لیے پہن کر آئی تھی کہ اس کے ہمراہ جو ایک نہایت ہی معزز اور تہذیب یافتہ کتا تھا' وہ بھی سیاہ رنگ کا تھا..

یا ایک ''گے'' لڑکا لچکتا ہوا.. نسوانی حسن کی نزاکت والا.. اس کی نزاکت پر بھی ٹھہر سکتی تھی..

اور فٹ پاتھ پر ہولے ہولے سرکتے.. یوں جیسے اس میں جان پڑ گئی ہو ایک خزاں رسیدہ پتے پر بھی یہ نظر ٹھہر جاتی تھی..

اس نظر کا کوئی ایمان نہ تھا..

یہ ایسی تھی کہ کبھی کسی شکل پر جاتی تھی.. کسی منظر میں گم ہوتی تھی.. کسی تصویر میں اترتی

تھی.. ماڈل ٹاؤن پارک کی سرمائی دُھند میں روپوش ہوتی تھی یہاں تک کہ تیز گرم کافی کی مہک سونگھتی تھی تو بے ایمان ہو جاتی تھی..

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہوس کو منفی کر دیں تو جینے کا مزا کیا..

جینے کا مزا یہی ہے کہ نظر مسلسل مذہب بدلتی رہے.. بے ایمان ہوتی رہے..

سلجوق میری ایک اور عادت سے سخت نالاں تھا.. باقاعدہ ناراض ہو جاتا تھا کہ والد صاحب کیا کر رہے ہیں.. راہ چلتے کسی کو ''ہیلو'' کہہ دینا.. کسی سے معاف کیجیے گا کہہ کر راستہ دریافت کر لینا.. لوگوں کو دیکھ کر بے وجہ مسکراتے رہنا.. فٹ پاتھ پر پڑے ایک دنیا جہان سے بے خبر شخص پر جھک کر پوچھ لینا کہ جناب کیا آپ زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں یا کسی بھدی سی سیلز گرل سے کہہ دینا کہ جانِ من آج تو آپ بہت دل کش لگ رہی ہیں..

چنانچہ میں اس کی موجودگی میں اپنے آپ پر جبر کر کے چُپ رہتا تھا..

اسے آپ اولاد کا جبر کہہ سکتے ہیں اور حیرت ہے کہ فرائیڈ تک نے اس کا ذکر نہیں کیا..

میرا خیال ہے کہ فرائڈ کا سلجوق ایسا کوئی سخت گیر بیٹا نہ تھا..

تو میں چپ رہتا تھا.. زبان پر اختیار نہ تھا' اسے گویا نہیں ہونے دیتا تھا اور نظر پر آج تک کس کا اختیار رہا ہے جو میرا ہوتا تو وہ بے ایمان ہو ہی جاتی تھی..

ہم اس نوے منٹ کی چہل قدمی کرتے کرتے ایک خاموش سی گلی میں آ گئے اور اس کے پار ایک قدیم اور دیدہ زیب عمارت کے ماتھے پر مجھے سٹار آف ڈیوڈ.. حضرت داؤد کا ستارہ پتھر میں تراشیدہ دکھائی دیا.. یہودیوں کا مقدس نشان اور پہچان جو اسرائیل کے پرچم پر بھی نیلاہٹ میں آویزاں ہے.. عمارت میں داخلے کی محراب میں ہمیں ایک قدرے مخبوط الحواس منتظر دکھائی دیتا شخص نظر آیا جو یہودی بھی ہو سکتا تھا تو میں نے سلجوق سے کہا ''یار مجھے لگتا ہے کہ یہ یہودی بھائیوں کا معبد ہے.. اور یہ جو اِدھر اُدھر جھانکتا بندہ ہے تو یہود کا کوئی فرد ہے تو ذرا اس سے گپ لگائیں؟''

حیرت انگیز طور پر سلجوق معترض نہ ہوا.. مجھے کچھ ملامت نہ کی.. ہاں کوئی مضائقہ نہیں۔ عبادت گاہ کی دیوار پر آویزاں ایک پرانی طرز کا لیمپ تھا.. جیسے ایک زمانے میں لاہور کے تانگوں

کے پہلو میں لیمپ ہوا کرتے تھے اور اگر سرِ شام ان کو روشن نہیں کیا جاتا تھا تو اُس تانگے کا چالان ہو جاتا تھا.. یہاں ابھی دن تھا' زرد دھوپ تھی اور اس کے باوجود یہ لیمپ..روشن تھا..دن کے وقت کیوں روشن تھا..یہ میں نہیں جانتا تھا..صدر دروازے کے برابر میں ایک چوکھٹے کے اندر کوئی مذہبی اعلان درج تھے..اگرچہ رسم الخط رومن تھا لیکن اس کی معنویت میری سمجھ سے باہر تھی..انگریزی کے علاوہ شاید یہ یہودیوں کی آبائی زبان ہیبرو میں درج تھے..چنانچہ میرے پڑھنے والوں میں سے جو ہیبرو پر دسترس رکھتے ہیں' ان کی آسانی کے لیے میں اس چوکھٹے میں درج عبارت کو ہو بہو نقل کرتا ہوں۔

CONGREGATION
DARECH AMUNO
SHABBOS
FRI 6.20 PM
SAT 9.30 AM AND 8PM
NITZAVIM
RABBI YOSSIE ROSENBAUM
CANDLES
FRI 6.31 PM
RABBI MEIRFUND KABBALLAH
WORK SHOP MON 6.30
CALL 242-6425

اس چوکھٹے کے نیچے ایک شخص کھڑا تھا اور میں جان گیا تھا کہ وہ ایک یہودی ہے..میں اس لیے جان گیا کہ وہ یہودی ہے کہ ایک تو وہ خصوصی سیاہ ہیٹ میں تھا اور دوسرے یہ کہ بھلا اہلِ یہود کے معبد کے باہر ایک عیسائی یا مسلمان کیسے اتنے اعتماد سے کھڑا ہو سکتا ہے۔وہ بہت متاثر کن

شخصیت کا مالک نہ تھا' درمیانی قد کا درمیانی عمر کا بس یہودی سا تھا۔میں نے راہ و رسم بڑھانے کی خاطر اسے اپنی پُرمسرت ترین مسکراہٹ سے نوازا اور پھر سلام دعا کے بعد اسے بتایا کہ ہم دونوں پاکستانی ہیں' مسلمان ہیں اور آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں..

''اچھا آپ پاکستانی ہیں؟'' وہ میری توقع سے کہیں بڑھ کر پُرجوش ہو گیا اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگا'' پھر تو آپ ڈاکٹر قریشی کو جانتے ہوں گے۔''

''کونسے ڈاکٹر قریشی کو؟'' میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

''وہی' میرے ذاتی معالج..نہایت ہی عمدہ انسان ہیں اور بہت ہی قابل ڈاکٹر ہیں اور پاکستانی ہیں تو آپ انہیں جانتے ہوں گے۔''

''نہیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ پاکستانی ہوں اور انہیں نہ جانتے ہوں..ان کے بچے بھی ہیں شاید آپ انہیں جانتے ہوں۔'' اس عجیب سے یہودی نے اس ڈاکٹر قریشی کے بچوں کے نام گنوانے شروع کر دیئے کہ اس کو جانتے ہیں. اس کو جانتے ہیں..تب ہم نے ان سے عرض کیا کہ قبلہ ہم نیویارک میں نئے نئے ہیں' پاکستانی کمیونٹی سے واقفیت نہیں اس لیے ان قریشی صاحب کو واقعی نہیں جانتے..آپ یہ فرمائیں کہ کیا آپ اس معبد کے یہودی مولانا ہیں؟

''نہیں نہیں..میں تو اس کا رکھوالا ہوں..ہرمن میرا نام ہے..بنیادی طور پر آئی ٹی کا انجینئر ہوں لیکن اس کے ساتھ اس عبادت گاہ کی دیکھ بھال بھی کرتا ہوں..کیا آپ واقعی ڈاکٹر قریشی کو نہیں جانتے؟''

عجیب بے تکا سا یہودی تھا شاید ہمیں چھیڑ رہا تھا..ہم اس عبادت گاہ کے بارے میں' یہودیوں کے اعتقادات اور رواجوں کے بارے میں کچھ جاننے کے متمنی تھے اور اس کی سوئی ڈاکٹر قریشی پر اٹکی ہوئی تھی۔ ''نہیں جی..سوری...''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی آپ کو نہیں جانتے ہوں گے؟''

''جی..امکان تو یہی ہے'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا اور یہ ارادہ بھی کر لیا کہ اگر اس واہیات یہودی نے اب کی بار اس ڈاکٹر قریشی کا نام لیا تو میں اس کے دانت توڑ دوں گا..مجھے یہ خدشہ ہرگز نہ تھا کہ وہ جواب میں میرے دانت بھی توڑ دے گا کہ میرے نصف سے زیادہ دانت

پہلے ہی گر چکے تھے اور اگر بقیہ نصف وہ توڑ بھی ڈالے تو اس سے مجھے مالی فوائد ہوں گے کیونکہ ان دانتوں کو میں نے یوں بھی کسی ڈینٹسٹ کو بھاری رقم ادا کر کے نکلوانا ہی تھا کہ وہ اتنی نازک اور لرزیدہ حالت میں بمشکل تمام قائم تھے۔۔''تو ہرمن صاحب آپ اس عبادت گاہ کے رکھوالے ہیں اور باہر کھڑے ہو کر اس کی راکھی کر رہے ہیں؟''

''نہیں میرے یوں باہر کھڑے ہونے کی وجوہات مختلف ہیں۔۔اور وہ تقریباً تین ہیں۔۔ ایک تو آج نیویارک کا سب سے چمکیلا اور روشن دن ہے جس میں خزاں کی اداسی گھلی ہوئی ہے اور اس کی تاثیر ہوا میں بھی ہے جس میں چند سانس لینے کے لیے میں یہاں آ کھڑا ہوا ہوں۔۔دوسرا یہ کہ مجھے تھوڑا سا ڈپریشن ہو گیا ہے۔۔دراصل میں چاکلیٹ براؤنیز تیار کر رہا تھا' اس دوران کوئی ملاقاتی آ گیا۔۔اور میں اُن میں شوگر حل کرنا بھول گیا اور وہ بالکل ہی خراب ہو گئے۔۔میری محنت اکارت گئی تو میں اُس ڈپریشن کو دور کرنے کی خاطر یہاں آ کھڑا ہوا۔۔اور تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میرے غسل خانے کے ایک نل میں سے پانی رُک رُک کر آتا ہے اور لمبی چھینکیں مارنے لگتا ہے۔۔تو میں نے پلمبر کو فون کر رکھا ہے اور اب اس کا انتظار کر رہا ہوں۔۔آپ جانتے ہو کہ نیویارک میں پلمبر ایک نل کو صرف گھمانے اور چیک کرنے کے سو ڈالر چارج کر لیتا ہے' جانتے ہو؟''

''نہیں۔۔ابھی ہمارا نل خراب نہیں ہوا۔''

''دعا کرو کہ وہ خراب نہ ہو ورنہ آپ کنگال ہو جاؤ گے۔۔ویسے اگر آپ کے غسل خانے کے ایک نل میں پانی رک رک کر آ رہا ہو تو آپ کو کتنی کوفت ہوتی ہے۔۔اس سے بہتر ہے کہ آپ کنگال ہو جاؤ۔۔کم از کم اطمینان سے نہا تو سکو گے ناں۔۔''

یہ ایک باتونی یہودی تھا۔۔

''کیا میں آپ کی عبادت گاہ کی ایک تصویر اُتار سکتا ہوں؟''

''ہاں کیوں نہیں؟''

میں نے کیمرے کا رخ عبادت گاہ کے صدر دروازے کی جانب کیا تو وہ فوراً فریم میں سے نکل کر ایک طرف ہو گیا۔

''پلیز آپ وہیں کھڑے رہیے۔''میں نے درخواست کی۔''یہ محض ایک یادگار تصویر ہے کہ ہم آپ کو گرین اچ ولیج کے اکلوتے سنے گاگ کے باہر ملے تھے۔''

''نہیں۔۔میں تصویر نہیں اتروا سکتا۔''

''محض ایک یادگار۔۔''

''نہیں۔۔''اُس کے لہجے میں ذرا سختی جھلکی''پلیز۔۔آج نہیں۔''

آج کیوں نہیں' یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔

اس دوران میں سِنے گاگ کے نیم وا دروازے کے اندر دیکھنے کی سعی کر رہا تھا کہ آخر اندر ہے کیا۔۔تانک جھانک کر رہا تھا اور جان بوجھ کر ذرا عیاں کر رہا تھا تاکہ وہ یہودی میرا عندیہ جان لے اور اس نے جان لیا''اگر آپ ہماری عبادت گاہ کو اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ دیکھ سکتے ہیں۔۔میں آپ کو خوش آمدید کہوں گا۔''

یہ ایک گھریلو سا نیم تاریک اور بہت خاموش عبادت خانہ تھا جس میں شان و شوکت کا کوئی مظاہرہ نہ تھا۔بمشکل چالیس پچاس عبادت گزاروں کی گنجائش ہو گی۔۔وکٹورین طرز کے لکڑی کے بنچ تھے جو اکثر کلیساؤں میں ہوتے ہیں' فرق صرف یہ تھا کہ اُن کے آگے جو سٹینڈ تھے اُن پر بائبل کی بجائے تورات کے نسخے رکھے ہوئے تھے۔۔اور اس نشست گاہ کے آخر میں ایک ہموار سطح کا چبوترہ تھا جس پر سرخ رنگ کا ایک دبیز غلاف بچھا ہوا تھا۔۔

''اس چبوترے کی کیا اہمیت ہے؟''

''ہیکلِ سلیمان میں ایک قربان گاہ ہوا کرتی تھی جس پر دو مینڈھوں کی قربانی دی جاتی تھی۔۔یہ چبوترہ اسی قربان گاہ کی علامت ہے۔''

''یعنی آپ یہاں مینڈھوں کی قربانی نہیں دیتے؟''

''نہیں۔۔''ہرمن مسکراتے ہوئے بولا''نیویارک میں مینڈھے بہت مہنگے ہیں اور یوں بھی انہیں ایک رسم کے طور پر حلال کرنے کی اجازت نہیں۔۔یہ محض ایک علامت ہے۔''

''میں یہاں ایک تصویر بنوا سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔۔جتنی تصویریں جی چاہے بنا لیجیے۔''

میں نے کیمرہ سلجوق کو تھمایا اور قربان گاہ کے قریب ہو کر نہایت مؤدب حالت میں کھڑا ہو گیا کہ میں بھی تو دین ابراہیمی کا پیروکار تھا۔''آپ بھی آ جائیے ہرمن۔۔''میں نے درخواست کی۔

''سوری.. میں آج تصویر نہیں اتروا سکتا۔'' وہ تھوڑا اور پرے ہو گیا۔

آج کیوں نہیں؟..

قربان گاہ سے آگے دو ستون تھے اور وہ بھی ہیکل سلیمانی کے ستونوں کی نمائندگی کرتے تھے.. اور ان کے درمیان میں چھ موم بتیوں والے ترشول نما شمع دان آویزاں تھے.. یہ شمعدان' حضرت داؤد کے نیلے ستارے کے علاوہ یہودیوں کی سب سے بڑی مذہبی علامت ہیں.. انہیں ''منارا'' کہا جاتا ہے اور ہیکل سلیمانی میں اسی شکل کے شمعدانوں میں اگر بتیاں سلگائی جاتی تھیں.. میں نے ان کی مذہبی اہمیت کے بارے میں ہرمن سے استفسار کیا تو وہ رواں ہو گیا ''یہ شمعدان ہماری قدیم مذہبی تاریخ اور اعتقاد کا ایک حصہ ہیں' ہماری تاریخی جدوجہد اور جذبے کی استقامت کی ایک علامت ہیں.. رومیوں نے جب ہمارے بیت المقدس کو تباہ و برباد کیا.. اسے لوٹا تو ہم یہودی ایک بار پھر بے گھر ہو گئے.. آج بھی قدیم رومی کھنڈرات میں محلوں اور معبدوں میں بیت المقدس کی فتح کے مناظر دیواروں میں ابھرے ہوئے مجسموں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ ان میں اس پاکیزہ شہر کو تباہ کر کے اور اسے لوٹ کر واپس آنے والے رومی سپاہیوں کو دکھایا گیا ہے اور وہ مال غنیمت سے لدے ہوئے ہیں.. ان میں سے ایک سپاہی ایسے ہی چھ ''منارا'' شمعدان اٹھائے ہوئے ہے جو وہ ہیکل سلیمانی سے لوٹ کر واپس آ رہا ہے.. تو یہ شمعدان ہمارے لیے مقدس ہے.. ہماری پہچان ہیں.. جیسے صلیب عیسائیوں کی اور چاند ستارہ تمہاری پہچان ہے۔''

اگرچہ وہ ایک باتونی یہودی تھا لیکن بہت دوست اور پیارا سا یہودی تھا۔ ان اہل یہود میں سے ہرگز نہ تھا جو دن رات ہم مومنین کے خلاف سازشوں میں مشغول رہتے ہیں.. ہم اس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کر کے رخصت ہو جانے کی نیت رکھتے تھے' باہر جانے کے لیے صدر دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے تو وہ اچانک گویا ہوا.. ''تمہیں پتہ ہے کہ میں ایک نانا جان ہو چکا ہوں.. تم نے میری نواسی دیکھی ہے؟''

اب بھلا میں نے اس کی تو کیا آج تک کسی یہودی کی نواسی نہیں دیکھی تھی تو میں نے انکار میں سر ہلایا کہ.. نہیں..

''تو آؤ میں تمہیں دکھاتا ہوں..''

''نواسی موجود ہے؟''

''نہیں وہ تو نہیں.. ہاں میرے پاس اس کی بہت ہی پیاری سی تصویر ہے.. بہت ہی لولی ہے۔''

اس نے انتظار نہیں کیا کہ ہم اس کی لولی نواسی کی تصویر دیکھنا بھی چاہتے ہیں کہ نہیں ''پلیز ادھر آ جائیے۔'' یہ کہہ کر ہمیں صدر دروازے کے برابر میں کسی تہہ خانے میں اترتی نیم تاریک سیڑھیوں کی جانب سے لے گیا۔

میرے اور سلجوق کے حواس میں مشترکہ طور پر ایک خوف نے جنم لیا کہ جانے یہ یہودی ہمیں کہاں لے جا رہا ہے اور کیوں لے جا رہا ہے.. باہر نیویارک کے کسی ایک فرد کو بھی علم نہیں کہ ہمیں ایک یہودی اپنی عبادت گاہ کے تاریک تہہ خانے میں لے جا رہا ہے اور جانے کس مقصد کے تحت لے جا رہا ہے' کیا پتہ ہیکل سلیمانی کی قربان گاہ پر قربان کرنے کے لیے لے جا رہا ہو کہ نیویارک میں مینڈھے بہت مہنگے ہیں..

میں اپنے بارے میں تو قطعی طور پر فکر مند نہ تھا کہ میرے جیسے عمر رسیدہ اور حواس باختہ مینڈھوں کی قربانی شاید جائز بھی نہ تھی.. مجھے تو سلجوق کے بارے میں تشویش ہو رہی تھی.. وہ ایک نوجوان اور مُنہ زور مینڈھا تھا..

کوئی بھی مینڈھا چاہے اسے بقرعید پر یا ہیکل سلیمانی کی قربان گاہ پر.. قربان کیا جائے.. اپنی مرضی سے قربان نہیں ہوتا.. کسی بھی ایسے مینڈھے سے آج تک نہیں پوچھا گیا کہ بتا مینڈھے تیری رضا کیا ہے..

چنانچہ اس شش و پنج میں کہ یوں بے وقوفی میں قربان ہو جانا جائز ہے یا نہیں' ہم ان تاریک سیڑھیوں کے اختتام پر پہنچ کر ایک چھوٹے سے ہال کمرے میں اتر گئے.. اور قدرے تسلی ہوئی کہ وہاں دور دور تک کسی قربان گاہ کا نشان نہ تھا اور یوں بھی یہ خیال ہمیں تقویت بخشتا تھا کہ ہم تو دو ہیں اور یہ سازشی یہودی ایک ہے تو ہم مومن ہونے کی حیثیت میں بے تیغ بھی لڑتے ہوئے اس یکے از ہنود کو تہہ تیغ کر دیں گے اور اسے قربان کر دیں گے' خود ہرگز نہ ہوں گے۔

یہ ہال کمرہ جس میں ہم اترے تھے' بہت ہلکی روشنی میں تھا اور اس کے ماحول میں ایک عجیب پُراسراریت تھی.. درمیان میں ایک طویل میز کے گرد دو درجن کے قریب کرسیاں لگی تھیں.. دیواروں پر کچھ مذہبی نوعیت کی ہاتھ کی بنائی ہوئی پوسٹر نما تصویریں تھیں اور ذرا بچگانہ تھیں.. انہیں

پینٹ کرنے والے مارک شاگال کے پیروکار لگتے تھے کہ اس فرانسیسی مصور کی تصاویر بھی بظاہر بچگانہ لگتی تھیں..

ہرمن نے نہایت اشتیاق سے ایک فریم شدہ تصویر سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ ''کیا یہ دنیا کی خوبصورت ترین بچی نہیں ہے؟ یہ ہے میری نواسی۔'' وہ ایک گلابی رنگت کی نہایت بھدی سی ناک اور چوڑے نتھنوں والی بے وجہ سی بچی تھی اور اسے صرف ''پیاری'' قرار دینے کے لیے بھی دل پر ایک پتھر.. بھاری بھرکم پتھر رکھنا پڑتا تھا.. کم از کم میں تو اس کا نانا جان کہلانے میں جھجک محسوس کرتا..

اب میں نے اپنا ترپ کا پتہ پھینکا اور بٹوے میں سے نوفل کی تصویر نکال کر اُسے دکھائی۔ ''یہ میرا نواسا ہے۔''

''ہاں.. یہ بھی میری نواسی کی مانند بہت پیارا بچہ ہے۔'' اس کمبخت یہودی کی آنکھوں میں شاید موتیا اُترا ہوا تھا.. دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ''اور کیا تم جانتے ہو کہ اس کی شکل تمہارے اس بیٹے سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔''

اس مشاہدے پر سلجوق جو ظاہر ہے میرے نواسے کا ماموں لگتا تھا' اپنے بھانجے کو اپنا ہم شکل قرار دینے پر بے حد مسرور ہوا اور یکدم یہودیوں کا حمایتی ہو گیا۔

''اوہ'' ہرمن پریشان ہونے کی اداکاری کرنے لگا۔ ''میں نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے تیار کردہ براؤنیز تو کھلائے نہیں.. ابھی کھلاتا ہوں۔''

''وہی براؤنیز جن میں شوگر وغیرہ حل نہیں ہو سکی تھی اور وہ خراب ہو گئے تھے؟''

''وہ بھی موجود ہیں لیکن میں نے دوبارہ نہایت احتیاط سے کچھ اور براؤنیز بیک کیے ہیں' وہ آپ کو کھلاؤں گا۔''

وہ یقیناً شائیلاک نہ تھا' ایک نہایت فراخ دل اور مہمان نواز یہودی تھا.. اُس کے پیش کردہ براؤنیز نہایت مزیدار اور تازہ تھے.. یہاں تک کہ ہم دونوں نے ''کیا ہم ایک اور براؤنی لے سکتے ہیں؟'' کہہ کر اور اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر متعدد براؤنی کیک نوش کر لیے.. نہ صرف یہ بلکہ وہ براؤنیز جن میں شوگر حل نہ ہوئی تھی' اُنہیں بھی متعدد بار چکھ لیا..

اس دوران ہرمن ہمارے لیے ابلتی ہوئی کافی کے دو پیپر کپ لے آیا..

ہم یہ سکون آور گرم کافی سُر کتے تھے اور خوش ہوتے تھے کہ ہم نے کیا ہی اچھا کیا کہ ہرمن کا کہنا مان کر اس تہہ خانے میں اُتر آئے ورنہ مزیدار کیک اور گرم کافی کی نعمتیں کہاں نصیب ہوتیں.. ایک یہودی روز روز کہاں قابو آتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے عقیدے کے حوالے سے کچھ سوال کیے جن کے جواب میرے ذہن میں نہ آتے تھے..

''ہرمن میں نے سنٹرل پارک اور لونگ آئی لینڈ میں کچھ ایسے یہودیوں کو دیکھا ہے جن کی سیاہ پتلونوں کے دونوں جانب کچھ رسیاں سی لٹکتی تھیں.. جیسے ہماری لڑکیوں کے پراندے ہوتے ہیں یا پہلوانوں کے تہبند کے لڑ لٹکتے ہیں تو ان کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟''

''تم یہودیوں کو بہت غور سے دیکھتے ہو۔'' وہ ہنسنے لگا ''ہم بائبل کے احکام کی پیروی کرتے ہیں.. اس میں درج ہے کہ تمہارے لبادے کے پلو دونوں جانب سے لٹکنے چاہئیں.. اب اس نوعیت کے لبادے یا چوغے تو پہنے نہیں جاتے۔ چنانچہ ہم اپنی پتلونوں کے دونوں جانب ایسے پلو لٹکا کر روایت کو نبھاتے ہیں۔''

''اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کچھ یہودیوں کے سر کے بالوں کے دونوں جانب کچھ مینڈھیاں سی شانوں تک آتی ہیں تو اس میں کیا مصلحت ہے؟''

''یہ بھی بائبل میں آیا ہے کہ تم اپنے سر اور داڑھی کے بال بڑھا کر شانوں پر بکھیر دو.. چنانچہ ہم علامتی طور پر ایسا کرتے ہیں۔''

بائبل؟

اگرچہ یہ ایک یہودی ہے جو صرف تورات پر یقین رکھتا ہے.. پھر یہ بار بار بائبل کا حوالہ کیوں دیئے جا رہا ہے۔ ''ہرمن آپ لوگ تو بائبل کو نہیں مانتے۔'' میں نے جان بوجھ کر قرآن کا حوالہ نہ دیا کہ جو بائبل کو نہیں مانتے ان سے قرآن کا ذکر کیا کرنا..

''کیوں نہیں مانتے.. ہم تو بائبل پر ایمان رکھتے ہیں۔''

''کمال ہے.. میری اطلاع تو یہی تھی کہ آپ بائبل کو نہیں مانتے.. حضرت عیسیٰ کو نہیں مانتے۔''

''ہم تمہارے حضرت عیسےٰ کو تو نہیں مانتے لیکن بائبل تو ہمارے عقیدے کا ایک لازمی جز ہے.. لیکن ہم صرف اولڈ ٹیسٹامنٹ کو مانتے ہیں.. اسی قدیم نسخے پر یقین رکھتے ہیں اور یہ جو

کنگ جارج والی بائبل ہے عیسائیوں والی اس کو ہرگز نہیں مانتے کہ اس میں تحریف ہو چکی ہے.. آپ تو جانتے ہوں گے کہ یہ عیسائی لوگ دراصل ہم یہودیوں کی ہی ایک شاخ ہیں' بس ذرا بھٹکے ہوئے ہیں۔''

میں نے موقع غنیمت جان کر مسلمانوں کے بارے میں پوچھ لیا کہ کیا آپ ہمیں جانتے ہیں؟

''ہاں کیوں نہیں..آپ بھی تو ہماری ہی ایک شاخ ہیں اور آپ بھی ذرا بھٹکے ہوئے ہیں..آئی ایم سوری۔'' وہ یکدم جھجک گیا ''آپ کو برا تو نہیں لگا۔''

''ہرگز نہیں..آپ اپنے دین پر اور میں اپنے دین پر..تو میں یہ جاننا چاہ رہا ہوں کہ آپ ہمارے بارے میں اور کیا جانتے ہیں؟''

''میں پچھلے ہفتے نیویارک کی ایک مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا۔ جب میرے کانوں میں تمہارے کسی واعظ کی آواز آئی اور وہ اسلام کے بارے میں..اس کے احکام کے بارے میں بات کر رہا تھا..کیا تم یقین کرو گے کہ وہ احکام تو بہو بہو وہی تھے جن پر ہمارا اعتقاد ہے..جو ہمارے احکام ہیں..میں بہت دیر تک فٹ پاتھ پر کھڑا اس کا وعظ سنتا رہا جس میں سچائی تھی اور اس کے ایک فقرے نے میرے دل پر بہت اثر کیا' وہ کہہ رہا تھا کہ تم صرف اس راستے پر چلو جو خدا کا راستہ ہے۔''

ہرمن اٹھا' ہمارے کافی کے کپّوں میں جھانک کر دیکھا اور پھر مزید گرم کافی بنا کر لے آیا کیونکہ وہ ہمیں وہاں بٹھائے رکھنا چاہتا تھا۔ ایک عجیب وغریب نظریہ پیش کرنا چاہتا تھا..وہ ایک توہم پرست یہودی تھا..

ہر وہ شخص جو اپنے عقیدے پر آنکھیں بند کر کے ایمان لاتا ہے توہم پرست ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے عقیدے کو دنیا کا آخری اور واحد سچ سمجھتے ہوئے اس کا پرتو ہر سُو دیکھتا ہے..کبھی کسی نومولود بچھڑے کی کھال پر..جھیلوں کے پانیوں میں..پہاڑوں پر بکھرے پتھروں میں..یہاں تک کہ انسانی بدن کے اندر جو نظام ہے جو آنتیں اور شریانیں ہیں ان میں بھی اپنے خدا کا نام..اور اپنی مقدس زبان میں نمودار ہوتا دیکھتا ہے اور اس پر رقّت طاری ہو جاتی ہے..وہ اپنی مقدس کتاب میں سے دنیا کی ہر سچائی..ہر انسانی ایجاد..جدید ترین سائنس کے کمالات..یہاں تک کہ تھیوری

آف ریلیٹوٹی اور ایٹم بم اور جینز کی تھیوری کی واضح نشانیاں بھی دریافت کر کے نہایت فخر سے اعلان کرتا ہے کہ یہ سب کچھ جو آج جانا گیا ہے اور آئندہ صدیوں میں جانا جائے گا وہ تو ہزاروں برس پیشتر لکھا جا چکا ہے..تمام مذاہب نے اپنی اپنی مقدس کتابوں میں یہ سب کچھ واضح نشانیوں کی صورت میں تلاش کر لیا ہے..ہندوؤں نے بھی اپنی مقدس کتابوں میں جدید ترین ایٹمی ہتھیاروں کی تباہ کاریوں کے علاوہ خلاء سے زمین کا جو منظر نظر آتا ہے کہ ''زمین اوپر آسمان سے ایک گندھے ہوئے آٹے کی صورت نظر آتی تھی'' تلاش کر لیا ہے..علاوہ ازیں ہر جسمانی بیماری کا علاج بھی الہامی لفظوں کی ایک پھونک سے ہو جانے کا یقین کامل بھی عقیدے کا ایک جز لاینفک ہے اور یہ رویہ تمام مذاہب میں مشترک ہے..

اب اس الہامی لفظوں کی ایک پھونک کے بارے میں صرف حیرت اس امر پر ہوتی ہے کہ ایک مذہب کی پھونک کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے پر حرام ہے جو اثر کر جائے.. جیسے میری بیگم میمونہ کے سفید ریش..ایک پاکیزہ کرسمس فادر لگتے بھائی اور ان دنوں میرے سمدھی آفتاب صاحب کی ایک پھونک اکثر میرے سر درد کو غائب کر دیتی ہے..محض فرض کر لیجیے کہ ان کی جگہ اگر ایک ہندو پروہت مجھ پر اپنے منتر پھونکتا..کوئی بدھ بھکشو پالی زبان میں کچھ الاپ کر..یا ایک یہودی تورات کی آیتیں پڑھ کر پھونکیں مارتا تو مجھ پر کوئی اثر ہوتا؟؟

اور یقین کیجیے اسی طور کسی ہندو' بدھ یا یہودی پر بھی ہمارے کلام کی پھونکوں کا چنداں اثر نہ ہوتا..کہ ہم سب اپنے اپنے عقیدوں کی قید میں ہیں..ہماری جسمانی اور روحانی بیماریوں کی شفا صرف اپنے اپنے صحیفوں کی پھونک میں ہی ہے..

ہرمن کا عجیب وغریب نظریہ جو اس نے نہایت صدق دل سے پیش کیا یہ تھا کہ..اصل بائبل یعنی تورات میں گزر چکے عہد کے علاوہ ہر زمانے میں جو تاریخی واقعات رونما ہوتے ہیں' ان کا سراغ ملتا ہے..جو ہو چکا..جو ہو رہا ہے..جو ہونا ہے..یہ سب کچھ تورات میں درج ہے..اگرچہ خفیہ اشاروں کی زبان میں ہے..ہرمن نے ایک ویب سائٹ کا حوالہ بھی دیا جو اس نظریے کی تفہیم میں مددگار ثابت ہو سکتی تھی..

اور یہ خفیہ اشارے آپ کیسے جان سکتے ہیں؟..ہرمن کے نظریے کے مطابق آپ تورات کی کسی بھی آیت کا پہلا حرف نوٹ کریں اور پھر بیسواں اور چالیسواں اور یونہی آگے

بڑھتے جائیں تو یہ اشارے واضح ہوتے چلے جائیں گے.. یہاں تک کہ اس خفیہ اشاراتی زبان میں نہ صرف اڈولف ہٹلر کا ذکر ہے بلکہ اس کی خودنوشت ''مائن کیمپف'' یا ''میری جدوجہد'' کا حوالہ بھی واضح ہے۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم تورات میں اس نظریے کے مطابق.. اشاروں کے معمے حل کرتے ہوئے.. مثلاً نیویارک کی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ یا والٹ ڈزنی کے چوہے مکی ماؤس تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔'' ایسے سوال آپ طنزیہ یا مزاحیہ انداز میں نہیں کر سکتے کہ یہ عقیدے کا معاملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے مکمل طور پر بردباری سے دریافت کیا..

ہرمن مسکرانے لگا ''آپ شاید شک کر رہے ہیں لیکن ایسا ممکن ہے.. اگر آپ اس اشاراتی زبان تک رسائی حاصل کر لیں..''

''صحیح'' میں نے اقرار کیا ''ہرمن آپ کے ہاں قضا اور قدر کا مسئلہ کیا ہے.. یعنی تورات کی روشنی میں کہ ہمارے ہاں تو اس مسئلے کے حوالے سے بہت فتور مچا ہے..''

''اس نے.. خدائے واحد نے.. کہ ہم اولین توحید پرست ہیں.. ہم سے پیشتر سینکڑوں خدا تھے اور ہم نے ان سب کو رد کر کے صرف ایک خدا کی پرستش کی اور بہت عتاب سہے' پر ہم باز نہ آئے.. تو اس خدا نے ہمیں اختیار دے رکھا ہے.. آپ اس حیات میں جو بھی عمل کرتے ہیں اس کے بارے میں یہ توجیہہ پیش نہیں کر سکتے کہ میرا کچھ دوش نہیں' یہ تو اس کی رضا سے ہوا ہے.. جو کچھ میں کرتا ہوں' وہ تو لکھا جا چکا ہے.. نہیں آپ جو کچھ کرتے ہیں' خود کرتے ہیں اور اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں.. البتہ اس کو.. پروردگار کو یہ علم ہوتا ہے کہ آپ نے کیا کرنا ہے۔''

''ہرمن.. کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اس عبادت گاہ میں آپ لوگ کب اکٹھے ہوتے ہیں۔ کیا میں آپ کی عبادت میں شامل ہو کر یہ جان سکتا ہوں کہ آپ خدا کو کیسے یاد کرتے ہیں..''

''ہاں.. کیوں نہیں.. آپ ہم میں سے ہی ہیں.. اگرچہ بھٹکے ہوئے ہیں..''

ہرمن نے یہ بھٹکے ہوئے والا فقرہ دوسری بار کہا تھا.. پہلی بار تو میں ضبط کر گیا تھا کہ اس کی میزبانی' گرم کافی اور براؤنیز کے زیر احسان تھا لیکن اب کی بار ضبط کا یہ دامن چھوٹ گیا ''یہ بحث نہ چھیڑیئے کہ ہم میں سے بھٹکا ہوا کون ہے.. آپ یا ہم.. نہ آپ ہمارا دل دکھایئے اور نہ ہم آپ کو ٹھیس پہنچاتے ہیں..''

''ہاں.. ہم اس بحث سے اجتناب کرتے ہیں۔'' ہرمن نے سر ہلایا ''یہ فیصلہ تو قیامت کے روز ہو گا کہ ہم میں سے کون بھٹکا ہوا ہے.. ہاں تو آپ نے پوچھا ہے کہ آپ ہماری مذہبی عبادت میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو بے شک آپ ہماری خصوصی دعا میں شامل ہو جایئے اور کل تو سال بھر کی سب سے مقدس اور خوبصورت شام ہے.. کل سورج غروب ہونے سے پورے بیس منٹ پہلے جب چراغوں کے روشن کیے جانے کا وقت ہوتا ہے' ہماری عبادت کا آغاز ہو جائے گا۔''

''کل کی شام اتنی خصوصی کیوں ہے؟''

''ہمارے عقیدے کے مطابق.. یعنی یہودی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ کل خدا نے یہ فیصلہ کر دینا ہے کہ ہم میں سے کون جنت میں جگہ پائے گا اور کون دوزخ میں جائے گا.. یا ہم میں سے کون اگلے برس مر جائے گا.. کل ہم یہودیوں کے سال کی آخری شام ہے اور کل سے ہمارا نیا سال شروع ہو جائے گا.. چنانچہ کل اگلے برس جو کچھ ہونا ہے' اس کا فیصلہ ہو جانا ہے.. کون زندہ رہے گا اور کون مر جائے گا۔''

مجھے جھرجھری سی آ گئی..

اگرچہ میں تو قصویٰ کے سوار کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے تھا.. ان جولاہوں کی انگلیاں چومنے کی خواہش والا تھا جو اس کے بدن کو مَس کرنے والے کھدر کو بُنتے تھے لیکن اس کے باوجود مجھے جھرجھری سی آ گئی کہ کل فیصلہ ہو جانا ہے..

اس دوران تہہ خانے کی سیڑھیوں سے ایک فربہ اندام امریکی کاندھے پر ایک بھاری تھیلا لٹکائے ہانپتا ہوا نیچے آیا جسے دیکھ کر ہرمن بے پناہ شاداں ہوا اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ''تم بہت دیر سے آئے.. لیکن میں شکایت نہیں کر رہا.. بالکل نہیں کر رہا.. تم غسل خانے میں جا کر ذرا نل چیک کرو اور تم جانتے ہو کہ غسل خانہ کدھر ہے' میں ذرا ان مہمانوں سے فارغ ہو کر آتا ہوں۔''

اور ہم بھی کسی ایسے ہی بہانے کے منتظر تھے جو پلمبر کی صورت میں آ گیا تھا..

ہرمن نے ایک خصوصی عنایت کی.. اُس نے ہمیں ہیکل سلمانی کی یاد میں پینٹ کیا گیا

ایک تجریدی قسم کا نہایت رنگین پوسٹر تحفے کے طور پر پیش کیا' یہ پوسٹر ہم صرف خاص خاص لوگوں کو ہی دیتے ہیں اور آپ خاص ہیں۔''

''اگرچہ بھٹکے ہوئے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

اس نے بھی ہنستے ہوئے انگلی کھڑی کر کے کہا'' یہ.. فیصلہ قیامت کے روز ہوگا...

اس پوسٹر پر مختلف رنگوں کے چاک استعمال کیے گئے تھے.. چونکہ انداز تجریدی تھا' اس لیے شک سا ہوتا تھا کہ یہ وہ قربان گاہ ہے جہاں مینڈھوں کی قربانی دی جاتی ہے.. البتہ سٹار آف ڈیوڈ نہایت واضح اور نیلا تھا.. وہ ترشول نما ''منارا'' شمعدان بھی نظر آتے تھے.. ہبیرو زبان میں کچھ آیات وغیرہ بھی درج تھیں اور ایک کونے میں یہودیوں کے ایک مولانا کرسی پر براجمان وعظ بھی کر رہے تھے..

یہ پوسٹر ابھی تک میٹروپالٹن اور موما سے خرید کردہ شاہکار تصاویر کے پرنٹوں کے ہمراہ میری سٹڈی کے ایک کونے میں رول کیا ہوا دھول جمع کرتا ہے.. یہی سوچتا رہتا ہوں کہ اسے اگر فریم کرواؤں تو کہاں آویزاں کروں.. کیا صادقین کی چھت تک پہنچتی خطاطی کے کینوس کے آس پاس.. پھر جھجک جاتا ہوں کہ کیا یہ مناسب ہوگا.. پھر خیال آتا ہے کہ آخر کیوں نہیں.. ہم دونوں.. یہودی اور مسلمان دور پار کے کزن تو ہیں.. گرچہ ہم میں سے کوئی ایک بھٹکا ہوا ہے..

ہرمن ہمیں صدر دروازے تک چھوڑنے آیا..

دروازے کے پہلو میں دیوار پر کچھ بوسیدہ ہو چکی تصاویر کے فریم آویزاں تھے.. ایک تصویر میں تین نہایت ضعیف مُتشرع قسم کے طویل سفید داڑھیوں والے سیاہ لبادوں میں ملبوس بزرگ تھے.... ہرمن نے رک کر اُن میں سے ایک باباجی کو نہایت الفت سے دیکھا..''انہیں جنّت میں گئے ہوئے چار برس ہو چکے ہیں۔''

''یہ کون ہیں؟''

''اگرچہ یہ تینوں ہی پہنچے ہوئے بزرگ تھے لیکن ان میں سے یہ.. بہت بلند مقام پر فائز تھے اور میرے مرشد تھے.. میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور ان کے بہت سے معجزے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔''

''کیا واقعی؟'' میں نے ایک مصنوعی حیرت سے کہا کہ میں تو جانتا تھا کہ ان معجزوں

وغیرہ پر تو صرف ہماری اجارہ داری ہے' بھلا ایک یہودی.. کیسے کوئی معجزہ دکھا سکتا ہے..

''ہاں واقعی..'' ہرمن نے جان لیا کہ میں مصنوعی حیرت میں ہوں اور وہ مسکرایا۔ ''مجھے جھوٹ بولنے کی کچھ حاجت نہیں ہے.. ہم کاروبار میں تھوڑا بہت جھوٹ بول لیتے ہیں لیکن عام زندگی میں نہیں.. میں گواہ ہوں کہ ان کے ہاں ایک میاں بیوی آئے جن کے ہاں اولاد نہ ہوتی تھی.. انہوں نے بہت تگ و دو کی یہاں تک کہ انٹراوینس طریقہ حمل کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہے.. تو ان بزرگ نے ان دونوں کے لیے دعا کی.. تو ان کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا اور پھر ہر دو برس کے وقفے کے بعد ان کے ہاں اولاد ہوتی چلی گئی اور انہوں نے یہودیوں کے قبیلے میں خاصا اضافہ کر دیا.. کیا یہ ایک معجزہ نہیں ہے؟''

میں ہرمن کے اس بیان پر اور اس کی عقیدت پر قطعی طور پر شک نہیں کر سکتا تھا کہ یہ عقیدت ہی تو ہے جو معجزے تخلیق کرنے پر قادر ہوتی ہے.. اور عقیدت بھی ایسی کہ یہ معجزے صرف ان کے عقیدے کا اعجاز ہیں.. اگر میں اُس پر شک کر سکتا تھا تو اسے بھی میری عقیدت اور معجزوں پر شک کرنے کا اختیار تھا..

ہرمن نے اس دوران ایک ایسی بات کی جو میرے دل کو بہت لگی.. وہ اس لمحے مجھے نہایت برگزیدہ لگا.. اس نے کہا ''تمہیں پتہ ہے کہ خدا کے نیک بندوں کی دعائیں کیوں قبول ہوتی ہیں؟.. وہ جتنی بھی نیکیاں کرتے ہیں.. بغیر کسی غرض کے نیک اعمال کرتے ہیں' وہ سب خدا کے بینک میں جمع ہوتے جاتے ہیں.. وہ اپنے اس اکاؤنٹ میں سے کبھی کچھ نکلواتے نہیں.. اس میں اپنے نیک اعمال جمع کرواتے جاتے ہیں.. پھر کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے یہ برگزیدہ لوگ اپنے لیے نہیں دوسرے لوگوں کی فلاح کے لیے ان جمع شدہ نیکیوں میں سے کچھ نکال کر خرچ کر دیتے ہیں.. اس لیے ان کی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں.. ان کی درخواست سے منسلک ان کی نیکیوں کا حساب ہوتا ہے اور خدا ایسی درخواست رد نہیں کر سکتا۔''

ہرمن نے کیا ہی پتے کی بات کہہ دی تھی.. ایک صوفیانہ تصور پیش کر دیا تھا کہ اللہ کے نیک بندے اپنے اعمال کا حوالہ دے کر اپنے لیے کچھ طلب نہیں کرتے بلکہ خلق خدا کی بھلائی کے لیے کچھ طلب کرتے ہیں..

ہم رخصت ہونے لگے تو ہرمن نے ایک بار پھر اپنی دعوت کو دوہرایا.. ''کل شام..

غروب سے پورے بیس منٹ پہلے.. جب چراغ جلانے کا لمحہ آ جاتا ہے تاکہ تاریکی کا مداوا ہو سکے..آپ ہمارے سنے گاگ میں آ جائیے گا..بے شک ایک جانب کھڑے رہیں یا ہماری عبادت میں شریک ہو جائیں کہ کل کی شب یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ کون جنت میں جائے گا اور کس کے حصے میں دوزخ کا عذاب آئے گا..اور کس نے جیتے رہنا ہے اور کس نے مرجانا ہے۔"

باہر..اس عبادت گاہ کے باہر جس کے اندر یہودی عقیدے قیام کرتے تھے' اس کے باہر نکلے تو وہی گرین اِچ ولیج تھا جو ایک خزاں رسیدہ دھوپ میں زرد ہو رہا تھا..ہر شے.. فُٹ پاتھ..شجر.گلیاں بازار اور گزرتی کاریں اور چہرے سب کے سب زرد ہو رہے تھے اور ان سب کو کچھ پرواہ نہ تھی کہ کل کس نے جنّت میں جانا ہے اور کس نے دوزخ کی آگ میں جلنا ہے اور کس نے زندہ رہنا ہے اور کس نے مرجانا ہے..وہ تو صرف یہ جانتے تھے کہ..عالم دوبارہ نیست.کل کس نے دیکھا ہے..آئے یا نہ آئے..صرف آج ہے..بے شک تمام آسمانی صحیفے کل دکھلاتے ہیں اور اس کے باوجود کل کس نے دیکھا ہے.صرف آج ہے..جسے ہم دیکھ رہے ہیں تو واحد سچائی صرف آج ہے اور اس آج میں صرف ہم ہیں.کل اگر آیا تو دیکھا جائے گا..

ہماری..ہم دونوں کی..سلجوق کی اور میری "گرین اِچ ولیج میں نوّے منٹ کی واک" پھر سے شروع ہو گئی..ہم بھول گئے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمیں کل کی شام کے بارے میں خبردار کر دیا گیا تھا کہ کل فیصلہ ہو جائے گا..اور ہم چلتے رہے..گائیڈ بک کے احکام پر عمل کرتے رہے.. حکم ملتا کہ بائیں جانب مڑ جاؤ..تو ہم مڑ جاتے.. ہدایت کی جاتی کہ اس بیکری کو دیکھیے جہاں نیویارک کے سب سے انوکھے کیک اور تازہ ترین کوکیز میسّر ہیں تو ہم نہ صرف اسے دیکھ لیتے بلکہ سونگھ بھی لیتے..اور اگر گائیڈ بک ارشاد کرتی کہ فلاں مکان کے باہر جو پُر پیچ آہنی جنگلا ہے اس کے پُر پیچ نقش ملاحظہ کیجیے تو ہم فوراً ملاحظہ کر لیتے کہ ہم تو اس کے..ایک گائیڈ بک کے..بے دام غلام ہو چکے تھے..

اور اب ہم کرسٹوفر سٹریٹ میں آ نکلے ہیں اور یہ ہم جنس پرستوں کا گڑھ ہے..یہاں اگر کوئی بظاہر مرد آپ کو دیکھ کر ذرا شرماتا ہوا لجاتا ادائیں دکھاتا ہوا آنکھ مارتا ہے تو اگر آپ میں بھی

کچھ ایسے جراثیم موجود ہیں تو آپ بھی جواب میں آنکھ مار کر اسے مسّرت سے لبریز کر سکتے ہیں اور اگر آپ میں یہ جذبات نہیں پائے جاتے تو آپ محض مسکرا کر اس سے معذرت کر کے کہ بھائی جان یہ میرا ڈیپارٹمنٹ نہیں ہے' آگے بڑھ سکتے ہیں۔اب اس کرسٹوفر سٹریٹ کی دکانوں کے شوکیسوں میں ذرا جھانکیے..یہاں بھی ایسے ہی حضرات کی حسرت کے سامان سجے ہیں..اگر تو آپ "متحرک" ہیں تو آپ کے لیے نہایت مردانہ لوہے اور پیتل کے جڑاؤ والی چمڑے کی جیکٹیں ہیں.. کیلوں والے فُل بوٹ ہیں..مردانہ زیورات ہیں اور اگر آپ "غیر متحرک" ہیں..فاعل نہیں مفعول ہیں..اپنے اندر ایک عورت کی حسیّات پوشیدہ رکھتے ہیں تو آپ کے لیے کیا ہی دیدہ زیب..شرمیلے اور بھڑکیلے ملبوسات ہیں..شوخ رنگوں کی جینیں اور جوتے ہیں..نسوانی زیورات ہیں یہاں تک کہ ماتھے کے جھومر بھی ہیں کہ دولہن کے لیے جھومر سجانا تو بہت ضروری ہوتا ہے..بے شک اس دولہن کی ایک مختصر سی داڑھی بھی ہو..خدا خدا کر کے ہماری یہ نوّے منٹ کی واک اختتام کو پہنچی اور سکستھ ایونیو کی آٹھویں سٹریٹ پر اختتام کو پہنچی جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا..

پہلے تو ہم گائیڈ بک کے احکام کے تابع تھے مگر اب ہم چلتے تھے تو جدھر جی چاہتا تھا ادھر کو چلتے تھے..البتہ بعض اوقات جدھر جی نہیں چاہتا تھا وہاں بھی تانک جھانک کر لیتے تھے اور بالآخر ہم واشنگٹن سکوائر میں پہنچ گئے جو سلجوق کا من پسند مقام تھا..اس لیے بھی کہ نیویارک یونیورسٹی کے علاقے میں واقع ہے..امریکہ کی سب سے بڑی اور وسیع یونیورسٹی واشنگٹن سکوئر کو چاروں جانب سے گھیرے میں لیے ہوئے ہے..

دھوپ کی آخری زرد کرنوں میں یونیورسٹی کی عمارتیں اس سکوئر کو ایک سنہری فریم میں تصویر کرتی تھیں..

کہا جاتا ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ نیویارک کے اس مقام پر پہنچیں جہاں اس شہر کی دھڑکن سنائی دیتی ہے اور اس کی دلکشی کا جادو چلتا ہے تو بس یہی وہ مقام ہے..

اور یہ کیسے ناقابل یقین اور نہ سمجھ میں آنے والے تغیرات ہیں کہ جہاں ایک زمانے میں ہاتھی ڈباؤ دلدل ہوتی تھی..اور ایک خاموش ندی مِن اٹیانام کی بہتی تھی اور سترہویں صدی کے آخر میں پورے نیویارک کے مُردے یہیں دبائے جانے لگے۔یہ علاقہ ایک وسیع قبرستان کی شکل اختیار کر گیا..اور پھر یہ پارک اور چوک تعمیر کرنے کی خاطر ہزاروں استراحت فرماتے مُردوں کو

قبروں میں سے اکھاڑ پھینکا گیا' اُن کی ابدی نیند میں خلل ڈالا گیا کہ اٹھیے اب زندوں کے لیے جگہ خالی کیجیے.. تقریباً دس ہزار ڈھانچوں اور ہڈیوں کو یہاں سے کھود کر مکمل پروٹوکول کے ساتھ نذر آتش کر دیا.. یعنی دفنائیں گے بھی اعزاز کے ساتھ اور پھر جلائیں گے بھی اعزاز کے ساتھ..

واشنگٹن سکوئر اور اس کے اردگرد کے وسیع باغات تو وجود میں آ گئے لیکن اس کی مٹی کو موت کی عادت ہو چکی تھی۔ چنانچہ اُن زمانوں میں جب دو حریف ایک دوسرے کو دعوت مبارزت دیتے تو اسی مقام کا چناؤ ہوتا اور کسی ایک کا خون اس مٹی کی نذر ہوتا.. ایک دنیا سیموئل کولٹ کے ایجاد کردہ ریوالور سے واقف ہے جو آج بھی ''کولٹ'' کہلاتا ہے تو یہ ہلاکت خیز ہتھیار بھی اسی چوک میں ایجاد ہوا تھا اور اُس کی چھ گولیوں کی فائرنگ کا مظاہرہ بھی یہیں ہوا تھا.. اور ہاں.. نیویارک میں برسرعام پھانسی دینے کے لیے موزوں ترین مقام بھی یہی گردانا گیا.. بلکہ اس کے شمال مغربی کونے میں ایلم کا وہ ایک درخت اب تک موجود ہے جس کی ڈالیوں سے رسّے جھلائے جاتے تھے اور پھندے میں جکڑی گردنوں کے بدن خوب جھلائے جاتے تھے.. اس سکوئر کی سب سے بڑی علامت ایک بلند اور شاندار محراب ہے.. اور یہ ان چند سر پھرے آرٹسٹ حضرات کے حوالے سے جانی جاتی ہے جو اس کے اوپر چڑھ گئے اور اعلان کر دیا کہ یہ واشنگٹن سکوئر اب ایک خودمختار جمہوریہ ہے اور نئے بوہیمیا کی ایک ریاست ہے اور یہاں ہماری آرٹسٹوں کی حکومت ہوگی اور ہم جو جی چاہے گا کریں گے.. اس مختصر بغاوت کی سرکوبی فوراً کر دی گئی کہ جانے ان آرٹسٹوں کا جی کیا کیا کچھ کرنے کو چاہتا ہے.. جو نہیں کرنا وہ بھی کرنا چاہتا ہے اور جو کچھ چھپ چھپا کے کیا جاتا ہے.. اسے برسرعام کرنا چاہتا ہے.. ویسے اُس بغاوت کی سرکوبی تو کر دی گئی لیکن اس کے باوجود آج کے واشنگٹن سکوئر میں برسرعام بہت کچھ کیا جاتا ہے جو نہیں کرنا چاہیے.. یا کرنا ہی ہے تو چھپ چھپا کے کر لینا چاہیے..

واشنگٹن سکوئر ایک چوک نہیں حیرت کی ایک عجیب اگرچہ پُرمسرت دنیا ہے.. یہ واقعی نیویارک سے الگ ایک آزاد جو جی میں آئے کرو.. ریاست لگتی ہے..

اگر یہ سلجوق کا سب سے من چاہا مقام تھا تو میں سمجھ سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہے..

یہ ایک ایسا حیرت کدہ تھا جس میں نوخیزی کا خمار تھا' ایک بخار تھا.. یہاں زندگی کی نبض جوانی کی منہ زوری کے ساتھ دھڑکتی ہوئی بہتی تھی.. اور اسے موت کی کچھ پرواہ نہ تھی.. گھرے سبز

درختوں کے جھنڈ.. ان میں پوشیدہ ہوتے راستے اور چاروں جانب نیویارک یونیورسٹی کی آخری کرنوں میں سُنہری ڈلیاں عمارتیں اور ان درختوں تلے.. کہیں بنچوں پر براجمان اور کہیں گھاس کی قربت میں.. مرکزی فوارے کے کناروں پر بیٹھے ہوئے.. ٹیک لگائے ہوئے یونیورسٹی کے طالب علم' موسیقار' مصوّر' آوارہ گرد' بے گھر لوگ' معاشرے کے دھتکارے ہوئے.. ہم جنس پرست اور مفکر' ادیب' سیاح.. یہ سب یہاں اپنا اپنا شہر آرزو بسائے اپنے من میں ڈوب کر سراغ زندگی پا رہے تھے..

اور کبھی کبھی ان سراغ زندگی پانے والوں کو دیکھ کر قدرے کوفت بھی ہوتی تھی.. شرمندگی بھی ہوتی تھی لیکن جس کو ہو جان و دل عزیز وہ.. واشنگٹن سکوئر میں جائے کیوں.. مثلاً وسیع فوارے کے کناروں کے ساتھ ٹیک لگائے دو نوجوان ہم آغوشی میں ایک دوسرے کے لبوں سے لب جوڑے کھڑے تھے اور کوئی بھی ان کی جانب دھیان نہ کرتا تھا سوائے میرے.. میں نے بھی اُنہیں بس ایک نظر دیکھا. گھبرا گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے اور گھبرا کر یہ نظر کہیں اور لے گیا کہ کہیں سلجوق بھی نہ دیکھتا ہو.. وہ دیکھتا تو ہوگا پر مجھے دیکھتا نہ دیکھ لے.. یہ نہیں کہ ہم لوگ ایسی قبیح حرکات سے گریز کرتے ہیں.. کرتے ہیں لیکن اپنی معاشرتی اور مذہبی اقدار کا خیال رکھتے ہیں.. ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ قوال اور گلوکار جو وفات پا چکے ہیں.. انہوں نے مجھے ایک ٹیلی ویژن پروگرام کے بعد.. مجھے اپنے سٹوڈیو میں کھانے کے لیے مدعو کیا.. اور بہت اصرار کیا کہ تارڑ صاحب آپ نے میرے ساتھ بہت سے پروگرام کیے ہیں لیکن آج شب میں نے یوں محسوس کیا جیسے جو کچھ گانا ہے آج گا لوں کل کا کسے پتہ ہے کہ آئے یا نہ آئے.. وہ جب سٹوڈیو میں داخل ہوئے تو اُن کی حالت کچھ اچھی نہ تھی.. پاؤں اتنے سوجے ہوئے تھے کہ وہ جوتے نہ پہن سکتے تھے' ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں.. تو میں اُن کے سٹوڈیو چلا گیا.. وہاں ان کی بیگم نے مجھے فون پر بتایا کہ خان صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے اور وہ معذرت کر رہے ہیں لیکن آپ کھانا ضرور کھا کر جائیے گا.. میں نے خود اپنے ہاتھوں سے خان صاحب کی فرمائش پر آپ کے لیے بنایا ہے.. سب لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ گلوکاروں اور فنکاروں کے گھروں میں دنیا کا لذیذ ترین کھانا تیار ہوتا ہے.. اس کھانے کے دوران کیا دیکھتا ہوں کہ خان صاحب کے جو منیجر ہیں اور جو ایک حاجی ہیں' نوجوان موسیقاروں کو دبوچ دبوچ کر وہی کچھ کر رہے ہیں جو واشنگٹن سکوئر میں

فوارے کی دیوار سے ٹیک لگائے دونوجوان کررہے ہیں.. چونکہ میں ان آداب سے ناواقف تھا اس لیے مجھے الفت کے اس اظہار سے خاصا دھچکا پہنچا اور میں نے ایک معروف فلمی گیت نگار.. جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شام چھ بجے تک توانسان رہتے ہیں اور اُس کے بعد ہولے ہولے حیوان ہوجاتے ہیں اور وہ ہو چکے تھے تو میں نے اُن سے پوچھا کہ حضرت یہ حاجی صاحب کیا کررہے ہیں. تو وہ حیران ہو کر بولے.. کیا کررہے ہیں؟

تو میں نے کہا.. آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کیا کررہے ہیں..

تو انہوں نے مجھ پر ایک نظرحقارت ڈالی اور کہا ''حاجی صاحب وہی کررہے ہیں جو کرتے رہتے ہیں اور تارڑ صاحب اس میں آخر قباحت کیا ہے.. یہ تو ہوتا چلا آیا ہے.. دراصل آپ شریف آدمی ہیں اور ان رموز سے ناواقف ہیں۔''

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ جو کچھ یہ جوڑا واشنگٹن سکوئر کے فوارے سے ٹیک لگائے برسرعام کررہا تھا' یہ سب کچھ ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے لیکن اپنی معاشرتی اور مذہبی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے ذرا چھپ چھپا کے..

یوں اس فوارے سے ذرا پرے جو موسیقار تھے.. گورے بھی.. کالے بھی.. بھورے اور زرد بھی.. سب اپنی اپنی ترنگ میں گاتے بھی تھے اور اپنے ساز بھی بجاتے تھے.. وہاں موسیقاروں کا ایک جمگھٹا تھا جو اپنی من کی موج میں اپنی مسرت کو پانے کے لیے پرفارم کررہا تھا.. ایک منڈیر پر ایک ہسپانوی گٹارنواز براجمان تھا سیاہ لباس میں اور اس کی ساتھی لڑکی تھی جو اس کی گٹار کی تاروں کو کبھی کبھار چھیڑتی تھی اور وہ دونوں نوآموز نہ تھے.. منجھے ہوئے موسیقار تھے جو شہرت اور دولت کی آرزو میں نہیں.. محض اپنے باطن کی تسلی کے لیے.. صرف اپنی خاطر گٹار کی تاروں کو چھیڑتے گیت گاتے تھے..

ان کے قریب کچھ مداح بھی جمع ہوچکے تھے جو اُن کو پورے کانوں سے سنتے تھے.. اُن میں سے صرف دو میری یادداشت میں رہ گئے ہیں..

ایک نیلی جین اور جیکٹ میں کمر سیدھی کیے ایستادہ.. باب کٹ ہیئر سٹائل میں برف سفید بالوں والی ایک پرکشش خاتون.. اور ان کے برابر میں منڈیر پر ٹانگیں لٹکائے ایک سرخ بالوں والی لڑکی.. صرف اُس کے بال سرخ نہ تھے بلکہ اُس کی ویلوٹ کی جیکٹ اور ہونٹ بھی سرخ

تھے.. یہ جیکٹ اُس کی کمر سے نیچے تک آتے کولہوں پر آتے ہمت ہار جاتی تھی اور وہاں سے اُس کی لامبی ٹانگیں سیاہ پھولدار جرابوں میں نمایاں شروع ہوجاتی تھیں..

واشنگٹن سکوائر میں جب شام اُتری تو ہر چہرے پر اُتری.. فوارے کی پھوار کی ہر بوند پر اُتری.. سارے چہرے نیم تاریکی میں گم ہونے لگے پر موسیقی مزید روشن ہوگئی کہ موسیقی تاریکی میں بھی دیکھی جاسکتی ہے.. سنی جاسکتی ہے..

میں نے آج دوپہر اس گاؤں گرین اِچ نامی گاؤں کو خزاں کے دھیمے نیم خوابیدہ زرد ہوتے رنگوں میں یوں دیکھا تھا کہ پتہ پتہ بُوٹا بُوٹا.. چہرہ چہرہ.. گلی گلی زرد ہو رہے تھے..

اور اب ہم واشنگٹن سکوائر سے واپس پھر اسی گاؤں میں آئے ہیں تو یہاں پر بھی شام ڈھل چکی تھی' پتے اور بوٹے تو نمایاں نہ تھے البتہ گلیاں اور چہرے روشن ہو چکے تھے' ایسے چہرے جو روبہ رو آئیں تو آپ کا چہرہ جمال رُخ یار سے فروزاں ہو جائے' زندگی کی تلخیاں اور اداسیاں بھلا دیں.. اور گلیاں ایسی کہ ہر گلی ساجن کی گلی کہ جس میں سے عمر بھر جانے کو جی نہ چاہے..

بیکر سٹریٹ میں ایسے چہروں اور گلیوں کی فراوانی تھی..

رالف لورین فیشن گھر کے شوکیس بھی ایسے تھے جیسے زرد پتوں کا ایک بن ہوں.. اُن میں بھی مورتیاں اور اُن پر سجے پیراہن بھی خزاں کے تانبے کے رنگ میں رنگے تھے..

گھر جانے کو جی نہ چاہتا تھا' نہ میرا نہ سلجوق کا..

ہم اس گاؤں کے اسیر ہو چکے تھے..

ایک شوروم جہاں لگتا تھا کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا وہ اتنا روشن تھا.. وہاں گھر کی زیبائش کے لیے فریم شدہ مناظر.. تصاویر.. پوسٹر اور معروف مصوّروں کے پرنٹ نمائش پر تھے..

ان میں سے دو پوسٹر ایسے تھے کہ میرا دل اُن میں اٹک گیا کہ بس یہ میرے گھر میں سجیں تب زندگی کا لطف آئے.. اگرچہ میرے مختصر گھر میں مزید کسی تصویر یا پوسٹر کی گنجائش نہ تھی.. بلکہ جتنی تصاویر دیواروں پر آویزاں تھیں اُن سے دوگنی سٹور میں دھول جمع کرتی تھیں اور وہ معمولی نہ تھیں صادقین.. سعید اختر اور احمد پرویز کی تھیں لیکن مجھ میں مزید کی ہوس تھی..

یہ ایک کولیکٹر کی ہوس تھی.. ایک نوادرات اور تصاویر جمع کرنے والے کی بے اختیار

ہوس.. اور یہ کچھ ایسی نرالی نہ تھی کہ ہر شخص کی زندگی میں ایسی کوئی نہ کوئی ہوس ضرور پنہاں ہوتی ہے.. عورتوں کی.. دولت اور اقتدار کی.. عبادت کی اور کبھی دوسروں کو ذلیل کر کے خوشی حاصل کرنے کی ہوس..

تو میری ہوس ان کے مقابلے میں تو بہت معمولی اور معصوم تھی..

میں فٹ پاتھ پر کھڑا شوروم کے اندر سجے اُن دو پوسٹروں کو دیکھے جا رہا تھا کہ ان کی قیمت دریافت کر کے طے کیا جائے کہ جیب کے مطابق ہے یا نہیں۔ جب منگول دکھائی دیتا ایک امریکی بھی دکھائی دیتا' ایک شخص باہر آ گیا ''زہے نصیب' زہے نصیب'' وہ پکارتا آ گیا ''تارڑ صاحب آیئے ناں.. براہ کرم قدم رنجہ فرمایئے.. دلِ ماشاد..''

تارڑ صاحب چونکہ پہلے سے ہی قدم رنجہ فرمانے کے لیے پر تول رہے تھے' اس لیے بلا تامل دل ماروشن کی روشنی میں شوروم کے اندر چلے گئے..

کیسے آئے.. کیونکر آئے.. کتنے دنوں کے لیے آئے.. کے مناسب جواب دے کر میں نے اُن چنگیزی شباہت کے حضرت سے کہا' کہ آپ بھی انہی سوالوں کے جواب مرحمت فرما دیجیے..

''میں پچھلے سولہ برس سے یہیں ہوں اور یہیں گرین اِچ ولیج میں یہی پوسٹر.. پرنٹس اور فریموں کا کاروبار کرتا ہوں.. پشاور کا باسی ہوں.. اگرچہ افغانستان کے شمال کا ایک ازبک ہوں.. میری اماں بھی ان دنوں مجھے ملنے نیویارک آئی ہوئی ہیں.. وہ آپ کی بڑی چاہنے والی ہیں اور آپ کی صبح کی نشریات اتنے شوق سے دیکھا کرتی تھیں کہ ہم اکثر ناشتے سے محروم رہ جاتے تھے.. تو جناب زہے نصیب.. کیا پیش کروں.. کافی یا کچھ اور..؟'' پشاوری ازبک نے یہ پیشکش قدرے احتیاط سے کی اور میں جان گیا کہ پشاور اور نیویارک میں اتنا فرق تو ہوگا.. وہاں پوچھا نہیں جاتا کہ کیا پیش کروں بس پیش کر دیا جاتا ہے.. اور یہاں پوچھا تو جاتا ہے مگر اس انداز سے کہ کہیں یہ پیشکش قبول ہی نہ کر لی جائے..

ہم میڈیا کے لوگ بڑے کھچرے ہو چکے ہوتے ہیں' چہرے پڑھنے پر قادر ہوتے ہیں اور لفافے کو دیکھ کر خط کا مضمون فوراً بھانپ لیتے ہیں۔ اگرچہ لفافے کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ میرے اندر کا مضمون بھانپ لیا گیا ہے' چنانچہ میں نے اُن کی دعوت کے جواب میں شکریہ ادا کیا کہ نہیں

ابھی پانچ منٹ پیشتر کافی پی ہے.. جُوس بھی پیا ہے تو گنجائش نہیں ہے لیکن یہ فرمائیں کہ یہ اتنا بڑا شوروم اور کاروبار آپ کا اپنا ہے..؟

''جی ہاں.. لیکن یہ شوروم میری ملکیت نہیں ہے.. اتنا بڑا شوروم اور وہ بھی نیویارک کے مہنگے ترین کاروباری علاقے میں حاصل کرنا.. کرائے پر حاصل کرنا.. اس کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا.. لیکن..'' مجھے قطعی نہیں معلوم کہ اُس نے مجھے کیوں رازداں کر لیا.. شاید وہ جانتا تھا کہ میں یہاں چند روز ٹھہر کر چلا جاؤں گا' اس لیے اگر میں یہ راز جان بھی جاؤں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا.. اگر وہ یہ جانتا کہ میں کچھ عرصے بعد یہ راز اپنے نیویارک کے سفرنامے میں بیان کروں گا تو کیا پھر بھی وہ مجھے رازداں کر لیتا.. یہ میں نہیں جانتا تو اُس نے اس ''لیکن'' کے بعد کہا ''یہ شوروم اطالوی مافیا کے ایک اہم رکن کی ملکیت ہے.. اُس کا دفتر اس شوروم کے پچھواڑے میں ہے.. آپ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ کتنا نفیس اور شریف آدمی ہے.. وہ آتا ہے تین چار گھنٹے اپنے دفتر میں بیٹھ کر کاروباری معاملات نپٹاتا ہے اور چلا جاتا ہے.. یہ اُس کی عنایت ہے کہ میں یہاں کاروبار کر رہا ہوں..''

''وہ آپ پر ہی اتنا مہربان کیوں ہے..؟''

''تارڑ بھائی اُسے ایک فرنٹ کی ضرورت ہے.. اُسے یہ سہولت ہے کہ وہ بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوتا.. پولیس وغیرہ کی نظروں میں نہیں آتا.. کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ اس شوروم کے پیچھے اطالوی مافیا اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے.. ویسے تو پولیس کو سب خبر ہوتی ہے کہ کون کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے لیکن.. اُسے بھی آسودہ رکھا جاتا ہے اور وہ چشم پوشی کرتی ہے.. صرف یہ چاہتی ہے کہ آپ ذرا ڈھکے چھپے انداز میں جو کرنا ہے کریں سر بازار نہ کریں..''

''میں بھی اطالوی مافیا.. بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جزیرہ سسلی سے تعلق رکھنے والے مافیا کی امریکہ میں دہشت اور غیر قانونی حکمرانی کے بارے میں بہت واقف ہوں.. بہت کچھ پڑھا ہے اور سکرین پر دیکھا ہے.. اَل کپون سے گاڈ فادر تک.. تو یہ لوگ درحقیقت کیسے ہوتے ہیں..؟''

''سچ پوچھیے تو تارڑ صاحب یہ بہت بھلے لوگ ہوتے ہیں.. عام لوگوں کے برعکس ان کا ایک اپنا ضابطہ اخلاق ہوتا ہے اور وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے.. بنیادی طور پر مذہبی' خدا ترس اور اپنے خاندان کے ساتھ وفادار لوگ ہوتے ہیں.. کسی پر ظلم نہیں کرتے.. زیادتی نہیں کرتے..

عوام الناس کو نہیں ستاتے.. آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے ہیں.. اگر وہ بے دریغ ہلاک کرتے ہیں تو ہمیشہ اپنے کاروباری رقیبوں کو.. اب اِسی گاؤں میں جتنے نائٹ کلب.. قحبہ خانے اور جوا خانے ہیں تو اُن کی سرپرستی میں چلتے ہیں وہ اُنہیں حفاظت مہیا کرتے ہیں تو اگر وہ اُن سے اپنا بھتہ وصول کرتے ہیں تو یہ اُن کی خدمات کا معاوضہ ہوتا ہے' اس میں تو کچھ برائی نہیں.. لیکن تارڑ صاحب یہ ضابطۂ اخلاق اب دم توڑ رہا ہے.. یہ سب ماضی کی حسین یادیں ہیں.. اب تو نہایت برے اور غیر اخلاقی زمانے آگئے ہیں.. روسی آگئے ہیں..''

''یہ روسی کہاں سے آگئے ہیں.. روس سے ہی آگئے ہوں گے..''

''نہیں.. یہ روسی یہیں کے امریکی روسی ہیں جو ہر کاروبار پر قابض ہو رہے ہیں اور اس میں سارا قصور نیویارک کے پچھلے میئر جولیانو کا ہے جو 9 ستمبر کے سانحے کے بعد امریکہ کا ہیرو ہو گیا تھا.. اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ نیویارک کو جرائم سے پاک کر دے گا... اور اطالوی مافیا کے پیچھے پڑ گیا' حالانکہ کمبخت خود بھی اطالوی ہے.. پورے نیویارک میں اطالوی مافیا کا صفایا کر دیا.. اُس بدبخت نے..''

''جرائم کے ان سرداروں سے نیویارک کو نجات دلا دینا کیا ایک کارنامہ نہیں ہے؟''

''ہرگز نہیں.. میرے نزدیک تو یہ ایک جرم تھا.. کیونکہ تارڑ صاحب اُن کی جگہ روسی مافیا نے لے لی.. نیویارک اس لیے نیویارک ہے کہ یہاں بے پناہ دولت ہے.. بڑا کاروبار ہے اور جہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہوں وہاں بہرصورت بڑا جرم بھی ہوگا.. وہ کہتے ہیں ناں کہ ہر بڑی کاروباری کامیابی کے پیچھے ایک بڑا جرم ہوتا ہے.. تو ایسے شہروں میں بہرطور ایک مافیا بہرصورت ہونا ہی ہوتا ہے.. اطالیہ اور سسلی کے گینگسٹرز اور اُن کے مافیا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن کی ایک اپنی کوڈ آف کنڈکٹ ہے.. ایک خاص اخلاقی رویہ ہے.. وہ بے شک ناجائز دولت کے حصول کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں.. لیکن عورتوں اور بچوں کی تعظیم کرتے ہیں' چاہے اُن کے والی وارثوں کو بے دریغ ہلاک کر ڈالیں۔ عام لوگوں کو کچھ نہیں کہتے' آپس میں لڑتے بھڑتے رہتے ہیں اور یقین کریں کہ غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرتے ہیں.. لیکن روسی..''

پشاوری ازبک اپنے دل میں اطالوی مافیا کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتا تھا بلکہ اُن کا مداح تھا اور اُس کے کچھ جواز دل کو لگتے تھے..

''لیکن روسی.. انہوں نے اطالوی مافیا کی جگہ لے لی ہے.. اور یہ کسی کا کچھ لحاظ نہیں کرتے.. پیسے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں.. بچوں اور عورتوں کو اغوا کر لیتے ہیں اور اُن کا تاوان وصول کرتے ہیں.. عام لوگ بھی اُن کے ظلم کا نشانہ بنتے رہتے ہیں.. وہ دولت کے لیے تمام حدیں عبور کر جاتے ہیں.. اُدھر اطالوی مافیا کے بارے میں آپ جانتے ہوں گے کہ وہ گلوکاروں.. اداکاروں اور ادیبوں کی سرپرستی کرتے ہیں.. ہالی وڈ کے بہت سے معروف لوگوں کا اُن کے ساتھ قریبی تعلق تھا اور ان میں فرینک سناٹرا اور ڈین مارٹن بھی شامل تھے.. اور روسی تو اُن کے مقابلے میں بالکل گنوار ہیں.. اور اس کا ذمہ دار وہ جاہل شخص جولیانو ہے.. آپ کچھ تو پی لیں..''

''جی نہیں شکریہ..'' میں اِس دلچسپ ازبک نسل کے.. پشاور کے باسی اور حال مقیم نیویارک کے شخص سے اجازت لے کر رخصت ہونے کو تھا تو اُس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا ''تارڑ صاحب آپ.....صاحب سے ملے ہیں..؟''

اُس نے کسی پاکستانی کا نام لیا جو میری یادداشت میں محفوظ نہیں رہ سکا..

''یہ کون ہیں..؟''

''آپ نہیں جانتے.. پاکستان سے جو بھی گلوکار اور اداکار وغیرہ آتے ہیں وہ اکثر اُن کے مہمان ہوتے ہیں اور وہ ان کی بے حد پذیرائی کرتے ہیں..''

''چونکہ میں ان دنوں اداکار نہیں ہوں.. اداکاری کب کا ترک کر چکا.. اور کبھی گلوکار تو ہرگز نہیں رہا تو میں انہیں نہیں جانتا..''

''لیکن آپ میری درخواست پر انہیں ضرور ملیے.. اگر انہیں بعد میں علم ہوا کہ آپ میرے شوروم میں تشریف لائے تھے اور میں نے انہیں خبر نہیں کی تو وہ بہت خفا ہوں گے.. بہت امیر ہیں.. میں آپ کو لے کر چلتا ہوں..''

''وہ کہاں ہوتے ہیں..''

''یہ برابر والی سٹریٹ میں اُن کا ''کیفے وِوالڈی'' ہے جو اُدھر وِلیج میں تو کیا پورے نیویارک میں جانا جاتا ہے.. وہیں پر ہوں گے..''

''کیفے وِوالڈی'' قدرے مختصر اور ایک پوشیدہ سا ریستوران تھا.. اس کی زیبائش بہت

جدا نوعیت کی قدرے قدیم انداز کی تھی.. دیواروں پر جانے کون کون سے اطالوی اور امریکی گلوکاروں اور اداکاروں کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں آویزاں تھیں.. یہ ایک پرائیویٹ قسم کا گھونسلا لگتا تھا' جہاں صرف وہی پرندے آتے تھے جو اس کے وجود سے آگاہ تھے..اور اللہ جانے کیسے کیسے پرندے آتے تھے.. بار کاؤنٹر کے پیچھے حسب توقع دو عدد دیدہ زیب خواتین کھڑی تھیں جو اپنے آپے سے باہر نہ ہوتی تھیں اگرچہ اُن کے آپے بے قابو ہو کر باہر آنے لگتے تھے..اگر یہ ایک معمول کا کیفے ہوتا تو گاہکوں کی رالیں ٹپکانے کے لیے بار کاؤنٹر کے پیچھے جو خواتین ہوتیں وہ اپنے آپے سے باہر ہو رہی ہوتیں.. اور گاہک ان آپوں میں مگن ہو کر مہنگی شراب پی جاتے اور بدمزہ خوراک کھا جاتے..لیکن یہ ''کیفے وِوالڈی'' تھا اور اس کا ایک اپنا جمالیاتی معیار تھا اور یہاں آپے سے باہر ہو جانا معیوب تھا.. میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ وہ دونوں خواتین حسب توقع گاہکوں کو لبھاتی نہ تھیں بلکہ کسی حد تک ان سے بیزاری برتتی تھیں.. ہماری موجودگی میں وہاں دو صاحب داخل ہوئے.. ایک میز پر بیٹھ کر انگلیاں چٹخاتے رہے پر ان کی کچھ شنوائی نہ ہوئی اور بالآخر کچھ منّت سماجت کے بعد ان کی پسند کے مشروبات بے دلی سے ان کے سامنے رکھ دیئے گئے.. یہ وہ نادان پرندے تھے جو اس پرائیویٹ گھونسلے میں چلے آتے تھے..

ازبک برادر اِس کیفے میں داخل ہوتے ہی بہت مؤدب ہو گیا تھا اور کہہ رہا تھا ''تارڑ صاحب آپ وُڈی ایلن کو جانتے ہیں..؟''

''ہاں..وہ عینک والا نہایت معمولی شکل کا..نہایت باکمال یہودی..''

''ہاں وہی..اداکار اور ہدایت کار وُڈی ایلن..اُس نے اپنی ایک فلم کی شوٹنگ کے لیے اِسی کیفے کا انتخاب کیا یہ دیکھئے..'' ازبک بھائی نے دیوار پر آویزاں چند تصاویر کی جانب اشارہ کیا جو وُڈی ایلن کی ہی لگتی تھیں..''جہاں آپ کھڑے ہیں اسی مقام پر وُڈی ایلن کھڑا ہوا تھا.. تو اُس نے اِس کیفے میں فلم بندی کی خاطر اسے دوبارہ اپنی خواہش کے مطابق فرنش کیا تھا..سجایا تھا..فلم کی شوٹنگ ختم ہونے پر ہمارے پاکستانی بھائی نے اس سے درخواست کی کہ براہِ کرم یہ فرنیچر اور زیبائش جو آپ نے کی ہے اسے جوں کا توں رہنے دیا جائے..اور وہ آج بھی جوں کا توں ہے اور لوگ آج بھی اس کیفے میں اُس کی فلم کے حوالے سے اُس کی زیارت کو آتے ہیں.. آپ اَل پچینو کو جانتے ہیں..؟''

نیویارک میں آباد سب کا تو نہیں بیشتر پاکستانیوں کا مسئلہ یہ ہے کہ بے شک وہ منڈی بہاءالدین سے جب نکلے تو نہ لاہور دیکھا نہ پشور دیکھا..اور براہِ راست نیویارک دیکھا تو وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ..آپ کو پتہ ہے پیزا کیا ہوتا ہے.. یہاں ایک بڑا شاندار بُت ہے سمندر میں..اُس کو سٹیچو آف لبرٹی کہتے ہیں' آپ کو پتہ ہے وہ کیا ہوتا ہے..کیا کبھی مارلن منرو کا نام سنا ہے..تو یہ ازبک برادر بھی اسی روایت میں مجھ سے اَل پچینو کا پوچھ رہا تھا..

''ہاں..میں اُس اطالوی نژاد کی اداکاری اور مردانگی سے بھرپور چہرے کا قتیل ہوں.. خاص طور پر ''سینٹ آف اے وومن'' میں ایک نابینا کرنل کے رُوپ میں..''

''وہ بھی یہاں آتا جاتا رہتا ہے..آپ واقعی اُسے جانتے ہیں..؟''

پشاوری ازبک نے بار کاؤنٹر کے پیچھے تعینات دوشیزاؤں سے کچھ سوال جواب کیے اور بالآخر اُن سے کوئی فون نمبر حاصل کر کے مجھے اُس کیفے کے مالک پاکستانی صاحب سے رابطہ کروا دیا..وہ صاحب لحۂ موجود میں نیویارک میں نہ تھے.. یہاں سے دو گھنٹے کی مسافت پر کہیں تھے اور مجھ سے معذرت کر رہے تھے کہ میں فوری طور پر واپس نہیں پہنچ سکتا' اگرچہ میں آپ سے ملاقات کرنا ایک اعزاز سمجھتا ہوں..آپ میرا ذاتی فون نمبر نوٹ کر لیں اور پھر میرے کیفے میں تشریف لا کر میری عزت افزائی کریں اور میں آپ کے اعزاز میں ایک دعوت کا بندوبست کروں گا' جس میں اپنے یار اَل پچینو کو بھی مدعو کروں گا..''

اگرچہ اَل پچینو سے ملاقات..اپنے ''اعزاز'' میں دی جانے والی ایک دعوت کے مہمان خصوصی طور پر اَل پچینو سے راہ و رسم ایک ایسی ترغیب تھی..ایک ایسا دانہ تھا کہ مجھ ایسی اُس کی مداح مچھلی اُس پر منہ مار کر شکار ہو سکتی تھی لیکن میں نے شکریے کے ساتھ معذرت کر لی کہ میں تو کل نیویارک سے کینیڈا کے لیے روانہ ہو رہا ہوں..اور وہ صاحب نہایت خوش ہوئے..شاد ماں اور پُرمسرت ہو گئے کہ انہیں بھی یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں میں اُن کی دعوت قبول ہی نہ کر لوں..میں جان گیا تھا کہ وہ مجھے کچھ زیادہ نہیں جانتے..نام تو جانتے ہیں پر کام نہیں جانتے اور محض مروّت کے مارے ایک جعلی سی دعوت مرحمت فرما رہے ہیں اور بے وقوفی تو میری تھی کہ میں ازبک برادر کی باتوں میں آ کر یہاں آ گیا تھا..لیکن دل کی بات کہتا ہوں کہ بعد میں بہت قلق ہوا کہ ذرا ڈھیٹ بن کر اُن کی دعوت قبول کر لیتا تو کیا مضائقہ تھا..

میں نے اُن کا مناسب شکریہ ادا کیا اور پھر وعدہ فردا کر کے ہم واپس ازبک بردار کے پوسٹروں' فریموں اور تصویروں کے جنگل میں آ گئے..اور پھر اُن سے رخصت کے طلب گار ہوئے تو وہ کہنے لگے:''تارڑ صاحب آپ نے اور آپ کے بیٹے نے ہمارے گاؤں میں کیا کیا دیکھا ہے..؟''

میں نے اُس اس توے منٹ کی واک کی ہر تفصیل بیان کر دی تو وہ ذرا خفیہ ہو کر بولے ''آپ نے چملی نہیں دیکھا..''

''وہ کون ہے..؟''

''یہ سامنے جو چوک ہے اُس کے بائیں جانب مڑتے ہیں تو وہ بیڈفورڈ سٹریٹ ہے اور چملی وہاں ہے..''

''ہوگی..لیکن وہ ہے کون..؟''

''نیویارک کا سب سے قدیم اور بہت پوشیدہ شراب خانہ جہاں بڑے بڑے ادیب.. شاعر اور فلسفی آیا کرتے تھے..''

''میرا بچہ میرے ساتھ ہے شراب خانوں کی بات نہ کریں..''

''تارڑ صاحب وہ صرف شراب خانہ تو نہیں..آپ وہاں کھانا بھی کھا سکتے ہیں..آپ جیسے لوگوں کو وہاں ضرور جانا چاہیے..چلئے میں آپ کو راستہ بتاتا ہوں..''

وہ ہمدرد اور ازبک روح پھر سے اپنے شوروم کو تیاگ کر باہر فٹ پاتھ پر آ گئی اور ہمارے ساتھ چلنے پر کمربستہ ہو گئی تو میں نے کہا''آپ پتہ بتلا دیجیے..ہم تلاش کر لیں گے..''

''یہ سامنے جو چوک ہے اس کے پار دائیں ہاتھ پر جو نسبتاً تاریک علاقہ نظر آ رہا ہے' وہاں بیڈفورڈ سٹریٹ میں ہے..عام قسم کا گھریلو دروازہ ہے..ماتھے پر ریستوران بار کا نام بھی آویزاں نہیں ہے..ذرا مشکل سے ملے گا لیکن مل جائے گا..لیکن آپ جائیے ضرور..تو ہم ضرور گئے..''

اور واقعی ایک نیم تاریک سٹریٹ تھی جس میں رہائشی مکانات تھے اور وہیں وہ گھریلو دروازہ تھا جسے دھکیلتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی کہ اس کے مکین ڈانٹ پلا دیں گے کہ اندھے ہو ہمارے گھر میں بلا اجازت چلے آتے ہو۔دروازے کے بائیں جانب چند بوسیدہ چوبی سیڑھیاں

تھیں اور وہاں پہنچ کر آپ کے سامنے ایک قدیم طلسم کدہ ظاہر ہونے لگتا تھا..عجیب پوشیدہ اور کسی حد تک گمنام راحت خانہ تھا جہاں اپنے وقتوں کے عظیم ادیب نشست کیا کرتے تھے..لیکن فی الحال میں وہاں نشست کرنے سے قاصر تھا کہ میں بہت تھک چکا تھا اور سلجوق بھی میرے ہمراہ تھا اور جگہ ایسی نہ تھی جہاں بچوں کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں..لیکن میں نے یہ طے کر لیا کہ اگر نیویارک میں کچھ زندگی باقی ہے تو اس خانہ خراب میں ضرور آؤں گا اور جہاں پاپا ہیمنگوے بیٹھا کرتے تھے وہاں بیٹھ کر ان کی یاد میں ایک تصویر ضرور بنواؤں گا..

گرین اِچ ویلیج جہاں خزاں صرف درختوں اور اُن کے پتوں پر ہی نہیں اُترتی..
دلوں میں بھی اُترتی ہے اور بدن کو زردی سے بھر دیتی ہے..

ایک زرد دوپہر تھی..پھر شام اُتری..پھر رات آ گئی جواب گہری ہو رہی تھی اور ہر جانب روشنیوں کی بہار آ گئی..گُل کھلے اور کیا کیا گُل کھلے..پر میری تھکاوٹ نے تمام ترگلوں کے کھلنے کا انتظار نہ کیا اور ہم دونوں کرسٹوفر کے سب وے سٹیشن میں اتر گئے..براڈوے سٹریٹ واپس جانے کے لیے..جہاں سلجوق کے فلیٹ کی گھریلو مہک ہماری منتظر تھی..



''جیو یارک کے جیو''

نیویارک کو جیو یارک بھی کہا جاتا ہے کہ اس شہر میں زرد شیطان کے جتنے سنہری معبد ہیں.. جہاں سونے کی ڈلیاں آبشاروں کی صورت برستی ہیں.. بین الاقوامی کاروبار' بینک' جائیدادیں' میڈیا..ان سب پر یہودی حاوی ہیں اور بے وجہ حاوی نہیں ہیں، ان میں اتنی اہلیت ہے کہ وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود اکثریت پر چھائے ہوئے ہیں..

یہ کون لوگ ہیں؟ کیسے لوگ ہیں؟

یہ ایک عجیب بات ہے جو سمجھ میں بھی آتی ہے کہ یہودی..عیسائیوں کو نہیں مانتے..

یہودی اور عیسائی ہم مسلمانوں کو نہیں مانتے لیکن ہم یہودیوں اور عیسائیوں کو مانتے ہیں..ان کے پیغمبروں کو مانتے ہیں' اہل کتاب ہونے کے ناتے سے انہیں احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں..ہم میں اور یہودیوں میں دینی حوالے سے بہت کچھ مشترک ہے اور یہ قابل فہم ہے کہ ہم دین ابراہیمی کے پیروکار ہیں..حضرت ابراہیم جنہیں ''ابوالانبیاء'' کا لقب دیا جاتا ہے انہیں یہودی بھی اپنا باپ مانتے ہیں اور ہم بھی ان کے دین کی پیروی کرتے ہیں..اگر یہودی ایک دوسرے سے ملتے ہوئے ''شولام'' کہتے ہیں تو ہم سلام کہتے ہیں.. یہودی سؤر سے شدید پرہیز کرتے ہیں اور ہم بھی سؤر کو حرام سمجھتے ہیں..یہودی روزے رکھتے ہیں اور..ہم بھی تو رکھتے ہیں..

یہودی تورات کی تلاوت اُسی انداز میں جھوم جھوم کر کرتے ہیں جیسے ہم قرآن پاک پڑھتے ہوئے وجد میں آتے ہیں..

اور یہ جو ہم نماز کے لیے گول گول سی ٹوپیاں سر پر تھپتھپا کر جماتے ہیں اور پھر بعد میں

اتار پھینکتے ہیں تو ایسی ہی گول اگرچہ سیاہ رنگ کی ٹوپیاں یہودی ہمہ وقت سر پر جمائے رکھتے ہیں اور وہ انہیں کلپ لگا کر سر پر قائم رکھتے ہیں.. یہاں تک کہ جان کا خطرہ ہو تو بھی اس سیاہ ٹوپی سے جدا نہیں ہوتے..نازی جرمنی کے زمانے میں یہودیوں کو تلاش کرنے کا آسان ترین طریقہ یہی ہوا کرتا تھا کہ مردوں کے ہیٹ اتروا کر دیکھ لیں..اگر یہودی ہے تو سیاہ ٹوپی ہیٹ کے نیچے ہوگی..

ایک یہودی کی سب سے بڑی پہچان یہی ''سکل کیپ'' یعنی کھوپڑی کی ٹوپی رہی ہے جس کا مختلف قوموں نے بہت مذاق اڑایا.تضحیک کا نشانہ بنایا لیکن یہودی اس پہچان سے دستبردار نہ ہوئے..

یہودی بھی تسبیح ہاتھ میں رکھتے ہیں..

ہم مذہب کے حوالے سے بدن کی صفائی ستھرائی کے جن اصولوں پر یقین رکھتے ہیں..

یہودی بھی اس نظام کے تحت اپنے آپ کو پاک صاف رکھتے ہیں..

دونوں مذاہب میں ختنے کرائے جاتے ہیں..بلکہ وہ کراتے ہیں اور ہم بیٹھتے ہیں..کہ ایک زمانے میں معصوم بچے کو باقاعدہ ورغلا کر اور مٹھائی کا لالچ دے کر دو اینٹوں پر ''بٹھایا'' جاتا تھا..مجھے آج تک اپنا ''بٹھانا'' یاد ہے..چیمبر لین روڈ پر ہمارے مکان کی دوسری منزل پر جو کچا صحن تھا وہاں یہ وقوعہ ظہور پذیر ہوا تھا..مجھے اس روز یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ صبح سے خاندان کا ہر شخص مجھ پر صدقے واریاں کیوں ہو رہا ہے..مجھے نئے کپڑے کیوں پہنائے جا رہے ہیں حالانکہ عید کا دن بھی نہیں ہے..اگرچہ سماں عید کے دن جیسا ہے..امی جان بھی ضرورت سے زیادہ خوش نظر آ رہی ہیں اور نئے سوٹ میں اتنی پیاری لگ رہی ہیں..اور یہ ابا جی اور ماموں جان کس بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں اور خاص طور پر ان کا قریبی دوست ابراہیم نائی آج ایک چرمی تھیلا بغل میں دابے کیوں ہمارے گھر آیا ہے اور مجھے الفت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا..مجھ غریب کو کیا علم تھا کہ اس چرمی تھیلے میں میرے ''قتل'' کے کچھ سامان ہیں اور دھار کے تیز ہیں..تو مجھے بہلا پھسلا کر دوسری منزل پر واقع کچے صحن میں پہلے سے آراستہ دو اینٹوں پر بٹھا دیا گیا..اس دوران ابراہیم نائی نے اپنے تھیلے میں سے کچھ اوزار سے برآمد کئے اور مجھے بار بار تلقین کرنے لگا کہ مستنصر اوپر دیکھ..لیکن میں ہوں کہ منہ کھولے اس کی جانب حیرت سے تکتا جاتا ہوں..جبکہ والد صاحب بائیں اینٹ اور ماموں جان قبلہ دائیں اینٹ کے پاس تعینات مسکرا مسکرا کر مجھے اوپر دیکھنے پر مائل کر رہے ہیں اور میں دیکھ نہیں رہا..میں ابراہیم نائی کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے استرے کو شک کی نظروں سے دیکھ

رہا ہوں..تب وہ تاریخی حربہ استعمال ہوا جو ان زمانوں میں ہر بچّے پر استعمال ہوتا تھا اور کارگر ثابت ہوتا تھا یعنی ابراہیم نائی نے یکدم کہا ''مستنصر اوپر دیکھو..چیل گدھے کو اٹھائے لئے جا رہی ہے..''

اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ اس سے بڑھ کر محیر العقول..ایک دو تین برس بچّے کے لیے اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اوپر آسمان پر ایک چیل ایک سالم گدھے کو اٹھائے لئے جا رہی ہے..چنانچہ میں نے بے اختیار فوراً اوپر دیکھا..اب جو میں نے اوپر دیکھا تو ان چند ساعتوں کے اوپر دیکھنے کے دوران ابراہیم نائی نے نیچے سے میرا کام تمام کر دیا..میں وہ نہ رہا جو تھا..اور آج بھی وہی ہوں اللہ کے فضل سے..کام تمام کے ساتھ!

یہودیوں کا بھی کام تمام ہوتا ہے..

یہودی صرف اور صرف ذبیحہ کھاتے ہیں..

جانور کو اس طور ذبح کرتے ہیں جیسے ہم کرتے ہیں یا جیسے وہ کرتے ہیں ویسے ہی ہم کرتے ہیں..

البتہ وہ اس کو ''کوشر'' کا نام دیتے ہیں..کوشر گوشت کو بہت سے علماء کرام نے مسلمانوں کے لیے جائز قرار دیا ہے اور اس سے مغرب اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے لیے خوراک میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں..امریکہ میں نہ صرف گوشت کوشر ہوتا ہے بلکہ بیشتر خورونوش کی اشیاء یہاں تک کہ چاکلیٹ بھی کوشر ہوتا ہے..اگرچہ ان کوشر خوراکوں کی قیمت قدرے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ان کی صفائی ستھرائی میں کچھ شک نہیں ہوتا چنانچہ عام امریکی بھی کوشر خوراکوں کو ترجیح دیتے ہیں..کسی بھی خوراک کو..یا خوراک کے برانڈ کو کوشر قرار دینے کا فیصلہ یہودی علماء کی ایک کمیٹی کرتی ہے..اور یہ فیصلہ ایک طویل مدت کی تحقیق اور چھان پھٹک کے بعد کیا جاتا ہے کہ کیا یہ خوراک حفظان صحت کے اصولوں پر پوری اترتی ہے..اس کی تیاری میں مکمل صفائی ستھرائی برتی گئی ہے اور سب سے اہم یہ کہ اس میں کسی طور سؤر کے گوشت، شوربے یا چربی کا استعمال تو نہیں کیا گیا..یہاں تک کہ ٹوتھ پیسٹ کو بھی اس معیار پر پرکھا جاتا ہے..ہم جیسے لوگ تو لاپروا ہوتے ہیں لیکن یہودی خوراک اور گوشت کے معاملے میں انتہائی احتیاط پسند ہوتے ہیں..

ان کے لیے صرف یہودی ہونا ہی ترجیح اوّل ہے، رنگ، نسل اور قومیت ان کے

نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتے..چنانچہ اسرائیل میں جہاں دنیا بھر کے روسی، جرمن، انگریز، اطالوی، ترک اور فرانسیسی یہودی وغیرہ آباد ہیں وہاں افریقی اور خاصے سیاہ فام یہودی بھی برابر کے حقوق رکھتے ہیں..بلکہ پچھلے دنوں ہندوستان کے ایک قدیم قبیلے نے دعویٰ کیا کہ وہ یہودی نسل کے ہیں چنانچہ متعدد جیّد یہودی علماء وہاں تحقیق کرنے کے لیے گئے..اور برس ہا برس جاتے رہے کہ کیا یہ لوگ واقعی یہودی ہیں، شاید یہودیوں کے گمشدہ قبیلے کے افراد ہیں جو ہندوستان میں جا آباد ہوئے یا صرف اسرائیل کی شہریت حاصل کرنے کے لیے یہ دعوے کر رہے ہیں..تو فیصلہ ان کے حق میں ہوا کہ ان کی بیشتر عبادات اور رسوم یہودیوں سے ملتی جلتی تھیں اور اسرائیل کے دروازے ان پر کھول دیئے گئے..

ہم بھی تو یہی دعوے کرتے ہیں کہ اسلام میں رنگ و نسل کی کچھ قید نہیں..اگرچہ ہم تو سخت قید میں ہیں بلکہ قید بامشقت میں ہیں..رنگ اور نسل تو کیا ذات پات قبیلے اور برادری کی قید میں ہیں..

اور ہاں..یہودی ہمیشہ نہایت شرعی لباس پہنتے ہیں..

یعنی جو اچھے دین دار یہودی ہوتے ہیں کہ ان میں بھی بے دین عناصر پائے جاتے ہیں..نیویارک کے ففتھ ایونیو پر یا ٹائمز سکوئر میں اگر آپ کچھ ''حیادار'' لوگ دیکھتے ہیں تو وہ یہودی ہی ہو سکتے ہیں..مرد سیاہ ہیٹ اور سیاہ سوٹ میں..ستھرے لباس میں..خواتین پوری آستینوں کے بلاؤز اور ٹخنوں تک آتے سکرٹ میں..یہاں تک کہ جو بچّے ہیں وہ بھی نہایت دھلے دھلائے..یہودی لڑکیاں جین اور نیکر میں کم ہی ملیں گی..

ہم بھی شرعی لباس کو اگرچہ مناسب سمجھتے ہیں پر پہننے سے گریز کرتے ہیں..گویا ہم میں اور یہودیوں میں اتنا کچھ مشترک ہے کہ وہ تقریباً مسلمان ہیں..یا ہم تقریباً یہودی ہیں..تصویر کو ان دونوں رخوں سے دیکھا جا سکتا ہے..

یہودی کو دراصل اپنے عقیدے اور ایمان پر مستحکم رہنے کی تاریخ میں بہت بڑی سزا ملی ہے..اس نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا..اپنے قبیلے اور عقیدے سے وفادار رہا ہے اور اپنی وفاداریاں تبدیل نہیں کیں..اس لئے راندۂ درگاہ رہا ہے..ہمیشہ مطعون رہا ہے..ہمیشہ سازشی، غدار اور بے ایمان سمجھا جاتا رہا ہے کہ وہ اپنے ایمان پر قائم رہا ہے..ہر قوم اسے اپنے زوال کا سبب ٹھہراتی

رہی ہے..وہ مصر سے نکالا گیا.. بابل اور بیت المقدس سے نکالا گیا..روس' جرمنی' پولینڈ' یوکرین' اطالیہ' تاریخ کے تمام زمانوں میں ہر ملک سے خارج کیا گیا.. یہاں تک کہ ہم بھی اپنی ہرنا کامی اور شکست کا سبب ہنود کے بعد یہود کو ٹھہراتے ہیں..تو آخر اس کا سبب کیا ہے..

کیا واقعی یہودی دنیا کی بدترین' سازشی' مکار اور غدار قوم ہے..

شاید ایسا ہی ہے..اور شاید ایسا نہیں بھی ہے..یہ منحصر ہے اس بات پر کہ آپ انہیں کس رُخ سے پرکھ رہے ہیں..

کیا یہودیوں کو دراصل اپنے عقیدے پر قائم رہنے اور اپنی روایات کو ترک نہ کرنے کی سزا دی گئی..وہ جس ملک میں بھی مقیم ہوتے تھے اور سینکڑوں ہزاروں برسوں سے رہتے چلے آتے تھے لیکن وہ کبھی اس ملک کے باسی نہ بنتے تھے..وہ اپنی شناخت ایک یہودی کے طور پر کرواتے تھے ایک انگریز' جرمن یا روسی کے طور پر نہیں..اسی لئے مقامی آبادی انہیں شک کی نظروں سے دیکھتی تھی..وہ کسی قوم کے لیے بھی قابل قبول نہ تھے..اور ان پر بے پناہ ظلم ہوئے اور بے شک ہوئے.. اس میں کچھ شک نہیں..

اُن میں ایک درپردہ تکبر یا فخر تو تھا اور اب بھی ہے کہ صرف ہم ہی خدا کے چنے ہوئے پسندیدہ قبیلے کے فرد ہیں..یہ عیسائی اور مسلمان وغیرہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں انہوں نے ہم سے خوشہ چینی کر کے الگ مذہب بنا لئے..ہم جیسا اور کوئی نہیں..اسی لئے ان کی وفاداریوں پر ہمیشہ شک کیا گیا..یہ احساس برتری اور دوسروں کو حقیر سمجھنا بھی ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ایک سبب تھا..

عیسائیوں کی نسبت ہم مسلمان ہمیشہ یہودیوں کے نزدیک رہے ہیں..صرف دینی اقدار کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی..

رسول اللہؐ نے جب اہل مدینہ کو ایک ''ملّت'' قرار دیا تو اس میں یہودی بھی شامل تھے..ہماری ایک ماں حضرت صفیہ یہودی النسل تھیں..ایک بار انہوں نے رسول اللہؐ سے شکایت کی کہ دیکھیں عائشہ کہتی ہیں کہ میں تو ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی ہوں اور حفصہ فخر سے کہتی ہیں کہ میں عمر فاروقؓ کی بیٹی ہوں اور تم..ایک یہودی کی بیٹی ہو..اس پر رسول اکرمؐ از حد محظوظ ہوئے اور ان سے کہا ''اے صفیہ تم ان سے کہو کہ میرا باپ موسیٰ ایک پیغمبر اور میرا ایک چچا ہارون تھا وہ بھی پیغمبر تھا

اور..میرا خاوند محمدؐ ہے وہ بھی ایک پیغمبر ہے تو آؤ مقابلہ کر لو..''

مسلمانوں اور یہودیوں کی مشترکہ وراثت کا سب سے بڑا ثبوت اندلس تھا..

میں سمجھتا ہوں کہ اگر اندلس میں یہودی مسلمانوں کے حلیف اور دوست نہ ہوتے تو وہ شاید سات سو برس تک اندلس کے مختلف حصوں پر حکمرانی نہ کر سکتے..یہاں تک کہ غرناطہ کے بیشتر وزرائے اعظم یہودی تھے..کہا جاتا ہے کہ قصر الحمرا کی تعمیر میں بھی یہودی ماہرین تعمیر کا بڑا حصہ ہے اور اس کو بنیاد بنا کر ایک جرمن یہودی محقق نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ قصر یہودیوں کا تعمیر کردہ ہے.. مسلمان اندلس کے بہت سے جوہر قابل، فلسفی، حکیم اور شاعر یہودی نسل کے تھے اور اپنے اندلسی ہونے پر فخر کرتے تھے..اسی لئے جب ہسپانیہ زیرنگوں ہوا تو مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں سے بھی انتقام لیا گیا قتل کیا گیا، عقیدہ بدل کر عیسائی ہونے پر مجبور کیا گیا.. بالآخر مسلمانوں کے ہمراہ یہودیوں کو بھی اندلس سے نکال دیا گیا کہ انہوں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا..ہسپانیہ سے نکالے جانے والے بیشتر یہودیوں کو بھی کسی عیسائی سلطنت نے نہیں، عثمانی ترکوں نے پناہ دی اور آج بھی استنبول میں ایک علاقہ ایسا ہے جہاں ہسپانیہ سے نکالے جانے والے یہودیوں کی آل اولاد پچھلے پانچ سو برس سے آباد ہے..

تاریخ میں سب سے مطعون اور معتوب لوگ..

کہتے ہیں کہ اگر تم کسی جینئس سے ملو تو اس سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں کہ تم کون ہو..وہ اکثر اوقات یہودی ہوگا..

اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کسی ایک نسل میں جس کے افراد کی تعداد بہت کم ہے..اتنے بڑے اور نابغۂ روزگار لوگ پیدا نہیں ہوئے..کاروبار اور فنون لطیفہ کو تو چھوڑیے وہ سائنس اور فلسفے میں بھی سرفہرست نظر آتے ہیں..ان میں ایک سگمنڈ فرائڈ تھا..

فرائڈ کی خودنوشت پڑھنے کے لائق ہے..اس سے ہمیں یہودی نقطہ نظر سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے..وہ لکھتا ہے کہ ایک روز میں اپنے والد کے ہمراہ سیر کر رہا تھا..تمام بچوں کی مانند میں بھی اپنے باپ کو ایک آئیڈیل شخص سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اتنے بہادر ہیں کہ پوری دنیا کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو سکتے ہیں اور جیت سکتے ہیں..ہم سیر کر رہے تھے تو ایک جرمن سامنے سے آیا تو اس نے بنا کسی اشتعال کے میرے والد کے سر پر رکھی سیاہ ٹوپی دیکھ کر انہیں گالیاں دیں

کہ تم یہودی سؤر ہو اور ہمارے بچوں کو اغواء کر کے ان کا خون پی جاتے ہو اور پھر میرے والد کی ٹوپی ان کے سر سے اتار کر زمین پر پٹخ دی اور اس پر تھوکا.. میرا خیال تھا کہ میرے والد اس بے عزتی پر اسے خوب پیٹیں گے لیکن وہ چپ رہے.. خاموشی سے فٹ پاتھ پر پڑی ٹوپی اٹھا کر اپنے سر پر رکھی اور میری انگلی تھام کر گھر واپس آ گئے.. میرے اندر باپ کا جو تصور تھا وہ ٹوٹ پھوٹ گیا.. گھر پہنچنے پر انہوں نے مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا اور کہا ''سگمنڈ.. وقت آ گیا ہے کہ تم جان لو کہ تم ایک یہودی ہو اور یہ معاشرہ ہمیشہ تمہیں دھتکارتا رہے گا، کبھی قبول نہیں کرے گا.. اس لئے کہ ہم لوگ اپنے دین کے پابند ہیں اور اپنی قدروں کو ترک نہیں کرتے.. جب تک تم ایک عام جرمن سے کم از کم دس گنا اہلیت کے حامل نہیں ہو گے تمہیں روزی نصیب نہیں ہو گی.. تم نے اتنا علم حاصل کرنا ہے کہ سب پر حاوی ہو جاؤ.. اسی میں تمہاری بقاء ہے.. میں جانتا ہوں کہ اس ان پڑھ جرمن کی بے عزتی کے جواب میں اگر میں نے کسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا تو تمہیں بے حد دکھ ہوا ہے.. تم جان لو کہ اگر میں اسے کچھ بھی کہتا، اسے ہاتھ بھی لگا دیتا تو آج رات ایک ہجوم ہمارے علاقے پر حملہ کر دیتا ہمیں سزا دینے کے لیے.. اس لئے میں نے تحمل کا مظاہرہ کیا..''

فرائڈ نے دنیا کو نفسیات کا ایک ایسا نیا علم دیا جس کے بغیر آج کی دنیا کے انسان کی الجھنوں، ذہنی پریشانیوں اور پیدائش سے لے کر موت تک جیسے اس نے زندگی بسر کی اس کا جواز سمجھا ہی نہیں جا سکتا تھا..

مارکس نے بھی دنیا کو ایک نئے علم سے متعارف کروایا جس کی روشنی میں نہ صرف سلطنتیں ترتیب دی جا سکتی تھیں بلکہ دنیا کے دیگر علوم کو بھی ایک نئے زاویے سے پرکھا جا سکتا تھا.. اگرچہ اس کی ''داس کیپٹل'' شاید میری سٹڈی میں وہ واحد کتاب ہے جسے میں آج تک مکمل طور پر پڑھ نہیں پایا اور جتنی پڑھی وہ میری علمی پسماندگی کے باعث پلے نہیں پڑی لیکن مقدس صحیفوں کے بعد یہ وہ پہلی کتاب ہے جس نے ایک نئے عقیدے اور فلسفے کو جنم دیا.. نصف سے زائد دنیا نے اسے اپنایا اور اپنے ایمان کا جزو بنایا..

مارکس کی مانند آئن سٹائن بھی ایک جرمن یہودی تھا.. اور اگر وہ نہ ہوتا تو اس کائنات کی گتھیاں اور کون سلجھاتا.. پچھلی صدی کے بارے میں تو کوئی شک نہیں لیکن شاید پچھلے کئی سو برسوں کے دوران آئن سٹائن جیسا دماغ پیدا نہیں ہوا.. بلکہ اس کا دماغ آج بھی ایک لیبارٹری میں محفوظ

ہے جو عام انسانوں کی نسبت حجم میں کہیں زیادہ بڑا ہے..

تو کیوں یہودیوں کو بقیہ نسلوں کی نسبت بڑے دماغ سے نوازا گیا ہے..

کیا ایسا ممکن ہے کہ شاید عقیدے سے مکمل وابستگی.. جسے ہم مکمل ایمان کہتے ہیں.. اسلام میں پوری طرح داخل ہو جانا کہتے ہیں تو اس کی وجہ سے ان کے دماغ برتر ہو گئے ہیں کہ ایک زمانے میں مسلمان بھی برتر ہوئے تھے..

یا شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دھتکارے بہت گئے.. ہر قوم نے اپنے زوال کا سبب انہیں ٹھہرایا.. جیسے ہم لوگ اپنی ہر ناکامی کو یہود و ہنود کی سازش قرار دیتے ہیں، اپنی ہر نالائقی اور حماقت کے آگے یہود و ہنود کا پردہ تان دیتے ہیں حالانکہ اس سے ثابت یہی ہوتا ہے کہ ہم اتنے بودے ہیں کہ یہود و ہنود مزے سے سازشیں کرتے ہیں اور ہم اتنے معصوم ہیں کہ ان کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں.. یوں بنیادی طور پر ہم یہود و ہنود کو اپنے سے برتر تسلیم کئے جاتے ہیں.. ایک یہودی کے پاس انتخاب کا اختیار بہت محدود تھا.. وہ ایک شاہی خاندان کا فرد نہیں ہو سکتا تھا.. ایک شہزادہ یا بادشاہ نہیں ہو سکتا تھا.. آج تک ایسا نہیں ہوا.. وہ سیاست میں یا فوج میں آخری عہدے پر نہیں پہنچ سکتا تھا.. بے شک یہ جیو یارک ہے لیکن ایک یہودی امریکہ کا صدر نہیں ہو سکتا چاہے وہ ہنری کسنجر ہی کیوں نہ ہو.. انتظامیہ میں بھی اگر وہ بے پناہ صلاحیت رکھتا ہو تو بھی چند سیڑھیاں اوپر جا سکتا ہے' آخر تک نہیں جا سکتا چنانچہ اس کے انتخاب کا اختیار بہت محدود ہو جاتا ہے.. صرف چند راستے کھلے ہیں.. کاروبار' سائنس تحقیق اور فنونِ لطیفہ.. تو وہ ان میں کمال حاصل کرتا ہے کہ یہ اس کی مجبوری ہے.. چونکہ وہ بکھرتا نہیں اپنی صلاحیتوں کو مرکوز کر دیتا ہے شاید اس لئے اس کا دماغ بڑا ہو جاتا ہے..

جب مجھے مجلس فروغ اردو ادب' دوحہ' قطر کی جانب سے عالمی فروغ اردو ایوارڈ سے نوازا گیا تو میرے ساتھ روس کی ایک محقق خاتون نتالیہ پریگارنیا.. کو بھی ایک خصوصی ایوارڈ غالب اور اقبال پر تحقیق کے حوالے سے عطا کیا گیا..

نتالیہ ایک فربہ، بہت خوش مزاج، لمبی اور پرتفکری روسی خاتون تھیں.. مجھ سے دو چار برس بڑی ہوں گی لیکن پہلی ملاقات پر ہی تاریخی طور پر ثابت ہو گیا کہ وہ میری سب سے قدیمی ''گرل فرینڈ'' ہیں جن کے عشق میں، میں تقریباً پینتالیس برس پیشتر مبتلا ہوا تھا اور اس حوالے

سے انہوں نے مجھے بھی اپنا اولین ''بوائے فرینڈ'' قرار دیا..

اُس شام..دوحہ کی ریتلی اور مصیب الرحمان کی یکتا میزبانی کی شام میں جب کہ میری اہلیہ بھی کھانے کی میز پر موجود تھیں..میں نے تذکرہ کیا کہ 1958ء میں ماسکو میں جو یوتھ فیسٹیول منعقد ہوا تھا..میں نے اس میں ایک برطانوی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی تھی اور دنیا کے سب سے بڑے لینن سٹیڈیم میں کچھ دیر کے لیے پاکستانی پرچم تھام کر چلا تھا جبکہ نکیتا خروشچوف، ملکویان اور بلگانن مجھ پر نظر کرم کرتے سلامی لے رہے تھے..نتالیہ نے یکدم چونک کر کہا ''تارڑ صاحب..آپ وہاں تھے 1958ء میں..لینن سٹیڈیم میں..جب یوتھ فیسٹیول کا افتتاح ہو رہا تھا؟''

''میں تھا..''

''میں بھی تھی..'' نتالیہ کے چہرے پر جتنے برس لکھے تھے وہ سارے کے سارے معدوم ہو گئے، وہ کسی اور جہان میں چلی گئی ''کیا آپ کو یاد ہے کہ سٹیڈیم کے درمیان میں دنیا بھر سے آئے ہوئے نوجوانوں کے اعزاز میں کچھ نوجوان لڑکیاں جمناسٹک کا مظاہرہ کر رہی تھیں..''

''ہاں مجھے بہت یاد ہے اور وہ سب کی سب کیسی پرکشش اور پرتناسب تھیں..ایسی کہ بس دل میں اترتی تھیں..''

''تارڑ صاحب..میں اُن میں سے ایک تھی..'' وہ اٹھی اور میری بیگم کی موجودگی میں ایک ہمدم دیریں کی مانند مجھ سے تقریباً لپٹ گئی ''اور آپ بھی وہاں موجود تھے..''

''ہاں میں تھا'' میں نے ہنستے ہوئے کہا..

''تو..آپ نے اُن لڑکیوں کو پسند کیا جو سٹیڈیم کے درمیان میں ورزش کے لباس میں جمناسٹک کا مظاہرہ کر رہی تھیں..تو میں بھی ان میں سے ایک تھی گویا آپ نے مجھے بھی پسند کیا تھا..تو پھر آپ میرے اولین بوائے فرینڈ ہیں اور میں آپ کی گرل فرینڈ..''

میری زندگی میں..جنوں میں جتنی بھی گزری بہ کار گزری ہے..عجیب انہونے واقعات گزرے ہیں لیکن جب میں انہیں تحریر میں لاتا ہوں اہل خرد شک کرتے ہیں..یہ ممکن نہیں..ہمارے ساتھ تو کبھی ایسا نہیں ہوا تو یہ شخص فسانے گھڑتا ہے..اور وہ تو کیا میں بھی کبھی کبھی اپنے آپ پر شک کرنے لگتا ہوں..یہ کیسے ممکن ہے کہ آج سے پینتالیس برس پیشتر جب میں پاکستان کا پرچم

تھامے لینن سٹیڈیم میں پاکستانی وفد کے آگے آگے چلتا تھا اور بار بار بائیں جانب دیکھتا تھا جہاں ایسی نوخیز اور دل کو مٹھی میں لے لینے والی کونپل لڑکیاں رقص کرتی تھیں کہ میرا دل رکتا تھا اور پھر بمشکل چلتا تھا تو ان میں سے ایک لڑکی..عمر رسیدہ اور فربہ ہو چکی اتنے برسوں بعد قطر کے صحرا کے کناروں پر پاکستانی ریستوران ''شیزان'' کی ایک میز پر میرے سامنے آ بیٹھی ہے اور ہر کسی کو کہہ رہی ہے کہ میں اس کی ''گرل فرینڈ'' ہوں..

نتالیہ کے ساتھ اس تعارف کے بعد روزانہ ملاقات رہتی..لیکن میں نے محسوس کیا کہ جب کبھی میں منتشر ہو چکے سوویت یونین کے حق میں کوئی بات کرتا ہوں..تو اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے..میں تیسری دنیا کی نوآبادیاتی غلامی کے حوالے سے جب کبھی سوویت یونین کا تذکرہ کرتا ہوں تو وہ بھڑک اٹھتی ہے ''تم کیا جانو کہ ہم پر کیا گزری ہے..تیسری دنیا کی حمایت کی قیمت ہم روسیوں نے ادا کی ہے..یہ ایک بدترین، انصاف دشمن اور آزادی کو قتل کر دینے والا نظام تھا جو اگر منتشر ہو گیا تو یہ روسی عوام کی خوش نصیبی تھی..''

نتالیہ کی ایسی شدت کی نفرت میری سمجھ میں نہ آتی تھی..

کچھ برس بعد میری نہایت پیاری اور دل ربا دوست لُڈمیلا واسلووا ایک مرتبہ پھر پاکستان آئیں تو میں نے ان سے اس نفرت کا سبب پوچھا..

تو لُڈمیلا نے کہا ''تم نہیں جانتے کہ نتالیہ ایک یہودی ہے..سوویت یونین میں یہودیوں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا..نتالیہ کو اس کی تحقیق اور لیاقت کی بنیاد پر باہر کی دنیا سے ایک سکالرشپ ملا تھا..اس دوران اس کی ایک سہیلی جو یہودی تھی اسرائیل کی قومیت ملنے پر ماسکو سے رخصت ہو رہی تھی اور نتالیہ صرف اسے خدا حافظ کہنے کے لیے گئی اور خفیہ ایجنسی کی رپورٹ پر نہ صرف اسے سکالرشپ سے محروم کر دیا گیا بلکہ اس کی نقل و حرکت پر بھی پابندی لگا دی گئی..نتالیہ پر فاقوں کی نوبت آ گئی، اتنی بڑی سکالر کو صرف یہودی ہونے کی بناء پر ایک مجرم بنا دیا گیا..اگر وہ سوویت یونین کے خلاف ہے تو اس کے پاس مناسب جواز ہیں..ہم اسے الزام نہیں دے سکتے..''

یہودی عام خیال کے برعکس عدل پسند ہیں..

میمن برادری کی مانند یہودیوں کی کاروباری ایمانداری پر بھی شک نہیں کیا جا سکتا..

امریکہ میں مقیم ایک پاکستانی کے مطابق ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی ایسے ادارے یا کاروبار میں ملازمت حاصل کرے جہاں کا سربراہ یہودی ہو کیونکہ ان لوگوں کے لین دین میں کھوٹ نہیں ہوتا اور وہ تو کبھی کسی کا جائز حق نہیں مارتے..

ایک پاکستانی نوجوان جو گمنام رہنا چاہتا ہے..اسے عثمان کہہ لیجیے، جب وہ امریکہ آیا تو ایک ہوٹل کے استقبالیے پر ملازم ہو گیا. گاہکوں کو خوش آمدید کہنا اور انہیں سہولتیں مہیا کرنا..اس ہوٹل چین کا مالک ایک یہودی تھا..اس نے ایک روز عثمان کو اپنے دفتر میں بلا کر کہا کہ میں تمہاری کارکردگی سے بہت متاثر ہوا ہوں اور جس طرح تم اپنے عقیدے کے مطابق وقت نکال کر نماز پڑھتے ہو میں اس کی قدر کرتا ہوں..اگر تو تم یونہی پوری زندگی کسی ہوٹل کے فرنٹ ڈیسک پر کھڑے مسکراتے گزارنا چاہتے ہو تو یہ تمہاری مرضی لیکن اگر تم کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے امریکہ کے نظام کو سمجھو کہ اس کی معیشت کیسے چلتی ہے.. بینکاری کا نظام کن بنیادوں پر استوار ہے..اس نے عثمان کو مشورہ دیا کہ وہ مقامی کالج میں پارٹ ٹائم داخلہ لے کر فلاں فلاں حساب اور معیشت کے کورسز پڑھے تا کہ اسے علم ہو کہ یہ ملک کیسے چل رہا ہے. عثمان نے اس کے مشورے پر عمل کیا..اور آج وہ کروڑ پتی ہے اور وہ یہودی آج بھی اسے ذاتی اور کاروباری مشورے دیتا ہے..

اسی عثمان کا بڑا بھائی خالد بھی اپنے بال بچوں سمیت ایک عرصے سے امریکہ میں رہائش پذیر ہے..وہ اچھا بھلا تھا اور پھر یکدم جانے اسے کیا ہوا کہ اس نے داڑھی بڑھا لی..ایک سبز چوغا زیب تن کر لیا اور سر پر ایک بہت بڑی پگڑی باندھ لی..ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں ایک عصا اور ہمہ وقت بغل میں دابا ایک جائے نماز.. یہاں تک کہ وہ اپنے بال بچوں سے بھی غافل ہو گیا..گیارہ ستمبر کے بعد ہزاروں امریکی مسلمانوں کی مانند اسے بھی امریکہ بدر کرنے کے احکام جاری کر دیئے گئے صرف اس بناء پر کہ اس نے پچھلی بار اپنی رہائش گاہ بدلتے ہوئے اس امر کی اطلاع وزارت داخلہ کو نہیں دی تھی..عثمان نے اپنے بھائی کی ملک بدری کے خلاف عدالت میں اپیل کر دی..جس روز فیصلہ ہونا تھا اس روز عثمان کے قریبی دوست اور مقدمے کے چینی وکیل نے اسے فون کر کے کہا ''عثمان..آئی ایم سوری لیکن تمہارا بھائی اگلے پندرہ منٹ میں ڈیپورٹ کر دیا جائے گا..''

''کیا فیصلہ سنا دیا گیا ہے؟'' عثمان کی گھبراہٹ قابل فہم تھی..

''نہیں..ابھی نہیں..کیا تم جانتے ہو کہ تمہارا بھائی عدالت میں کس حلیے میں داخل ہوا ہے؟..ایک طویل سبز چوغا' سر پر پگڑی' نہایت طویل داڑھی.. ہاتھ میں عصا اور بغل میں پریئر میٹ بھی..اور جو جج ہے وہ یہودی ہے..وہ اسے نہیں چھوڑے گا.تم اس کا سامان باندھو..''

تقریباً دو گھنٹے کے بعد اطلاع ملی نہ صرف عثمان کے بھائی کی ملک بدری کے احکا منسوخ کر دیئے گئے ہیں بلکہ جج نے فیصلے میں یہ بھی کہا ہے کہ میں ایک ایسے شخص کی قدر کرتا ہوں جو اپنے عقیدے کے مطابق داڑھی رکھتا ہے اور ایک مخصوص لباس پہنتا ہے..

خالد صاحب عدالت میں اپنا جائے نماز بھول گئے تو یہودی جج نے ایک اہلکار کی ڈیوٹی لگائی کہ یہ جائے نماز خالد کے گھر پہنچایا جائے..

یہودی اگرچہ اسلام کے دشمن رہے ہیں لیکن میں نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس میں رتی بھر مبالغہ نہیں ہے..

میں شاید یہودیوں کا ایک غیر مشروط مداح اور چاہنے والا ہو جاتا اگر اُن کے دامن پر اسرائیل کا دھبہ نہ ہوتا..اس ایک دھبے نے اُن کے سارے دامن کو سیاہ کر دیا ہے..میں تاریخ کے بارے میں حتمی فیصلے کرنے کی اہلیت تو نہیں رکھتا لیکن ذاتی طور پر میں قائل ہوں کہ تاریخ کا سب سے بڑا ظلم اور سب سے بڑی ناانصافی اسرائیل کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوئی.

میں سمجھتا ہوں کہ یہودیوں کو بھی حق حاصل تھا کہ ان کا بھی اپنا ایک الگ وطن ہوتا..اور یہ یورپ کا فرض تھا کہ جس نے لاکھوں یہودیوں کو زندہ جلا کر راکھ کیا کہ وہ اپنے اس عظیم جرم کی تلافی کرتا اور انہیں کوئی سرزمین عطا کرتا.سویڈن بے آباد پڑا ہے..آسٹریلیا کا پورا براعظم خالی پڑا ہے..کینیڈا اتنا وسیع اور ویران ہے..تو کہیں بھی ان کے لیے جگہ بنائی جا سکتی تھی..لیکن انہوں نے اپنی بلا فلسطینیوں کے گلے میں ڈال دی..ایک پوری قوم ایک ہزاروں برسوں سے مقیم نسل کو زبردستی بے گھر کر کے اسے خدا کے وعدے کا بہانہ بنا کر بے گھر کر کے پوری سرزمین پر یہودیوں کا تسلط قائم کر دیا..اور سوائے جرم ضعیفی کے ان فلسطینیوں کا اور کوئی دوش نہ تھا..گیس چیمبرز میں راکھ کر دیئے جانے والے لاکھوں یہودیوں میں سے کسی ایک کی موت کے وہ ذمہ دار نہیں تھے..یورپ تھا..

اور اس کا جواز یہ تلاش کیا گیا کہ یہ تو ''پرامسڈ لینڈ'' ہے..وہ سرزمین جس کا وعدہ ذاتی

طور پر خدا نے کیا تھا کہ اسے یہودیوں کو بالآخر بخشا جائے گا اور وہ لوٹ کر یہاں آئیں گے.. وہ ایک ناقابل فہم اور عجیب سا خدا ہوگا جو صرف یہودیوں کا ہے اور اپنے وعدے صرف انہی سے پورے کرتا ہے.. کچھ قیاس نہیں کرتا کہ اس ''پرامسڈ لینڈ'' پر مجھ پر ہی یقین رکھنے والے مسلمان اور عیسائی بھی ہزاروں برسوں سے آباد ہیں..

یہ تو ممکن نہیں کہ ایک ہی خدا ایسے فیصلے کرتا ہے تو یہ خدا بھی یقیناً الگ الگ ہیں.. ایک نہیں ہیں..

جو اُس سرزمین کے بیٹے ہیں.. ہزاروں برسوں سے اس سرزمین میں پیدا ہو کر اس میں دفن ہوتے رہے ہیں وہ تو سب کے سب دہشت گرد ہیں اور جو دور دیسوں سے آئے ہیں.. روس' امریکہ' جرمنی' افریقہ سے آئے ہیں اور قابض ہو گئے ہیں تو دراصل وہ حقدار ہیں.. وہ صدیوں پرانے زیتون کے باغوں پر اس لئے بل ڈوزر چلاتے ہیں تا کہ وہاں روسی مہاجرین کے لیے کئی منزلہ فلیٹ تعمیر کئے جائیں..

برلن میں برصغیر کی تقسیم کے حوالے سے منعقدہ ایک سیمینار کے لیے میرے ناول ''راکھ'' کو چنا گیا اور اس کے کچھ ابواب جرمن زبان میں ترجمہ کر کے پیش کئے گئے.. میں نے برلن کے ساتھ اپنی قدیم وابستگی کو یاد کرتے ہوئے دیوار برلن کا حوالہ دیا اور کہا کہ اس بیس کلومیٹر طویل دیوار نے پورے مغرب کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا.. یہ دیوار آزادی اور غلامی کے درمیان ایک عظیم استعارہ قرار پائی.. صدر کینیڈی نے اس کے سائے میں کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں بھی برلن کا باشندہ ہوں اور خواب دیکھتا ہوں کہ اس ظلم کی دیوار کو ڈھا دیا جائے.. یہ تو اب ایک قصۂ پارینہ ہو چکا.. دیوار ڈھے چکی.. لیکن اس لحۂ موجود میں دیوار برلن سے کہیں طویل.. ایک پوری قوم کو قید کرنے والی.. لیکن بلند اور ناقابل عبور ایک اور دیوار تعمیر کر دی گئی ہے.. اور مجھے حیرت ہے کہ یورپ اور امریکہ کے ضمیر خوابیدہ ہیں.. دیوار برلن تو پھر ایک ہی نسل کے لوگوں نے.. خود جرمنوں نے اپنے درمیان تعمیر کی تھی لیکن لحۂ موجود کی یہ دیوار تو ان لوگوں نے کھڑی کی جن کا اس سرزمین سے کچھ واسطہ نہ تھا اور جن کا ہزاروں برس کا واسطہ تھا انہیں قید کرنے کے لیے تعمیر کی.. تو یورپ اور امریکہ پر کیوں کچھ اثر نہیں ہوتا.. شاید اس لیے کہ وہ دیوار جو ڈھے چکی وہ اس خطے میں تھی اور وہ دیوار جس نے لاکھوں آبائی باشندوں کو قید کر دیا ہے وہ کسی اور خطے میں ہے.. ضمیر صرف اسی صورت میں جاگتا

ہے جب کوئی دیوار اس کے گھر میں سے اٹھتی ہے..

بعد میں مجھے بتایا گیا کہ جرمنی میں اس نوعیت کی تقریر کرنا جس میں یہودیوں کے خلاف کوئی بھی شائبہ ہو خلاف قانون ہے اور مجھے گرفتار بھی کیا جا سکتا تھا.. چونکہ میں نے براہ راست اسرائیل کا حوالہ نہیں دیا تھا. صرف استعارے برتے تھے جو بہت واضح تھے اس لیے میں سزاوار نہ ہو سکا..

تاریخ کی اس سب سے بڑی ناانصافی اور ظلم نے ''دہشت پسندی'' کو جنم دیا.. پہلی کونپل دہشت پسندی کی ناانصافی اور ظلم سے پھوٹی..

میرا ایمان ہے کہ اگر اسرائیل کے قیام کی ناانصافی نہ ہوتی تو دنیا میں دہشت پسندی کا نام نہ ہوتا.. کوئی عراق، افغانستان یا اسامہ بن لادن نہ ہوتا.. نہ لیلیٰ خالد ہوتی.. نہ جارج بش ہوتا اور نہ ہی گیارہ ستمبر ہوتا، دنیا آج بھی پرامن اور شانت ہوتی..

ویسے یہ امر باعث حیرت ہے کہ کیسے جب مظلوم طاقت ور ہوتا ہے تو وہ ظالم سے بھی کہیں بڑھ کر ظلم کرتا ہے اور اسے جائز قرار دیتا ہے.. پولینڈ کے ''آخ وائنز'' گیس چیمبروں میں سے بچ نکلنے والا ایک شخص جب اسرائیل میں ہوتا ہے تو وہ نازیوں سے بڑھ کر بے رحم اور ظالم ہو جاتا ہے، وہ جرمنوں سے نہیں فلسطینیوں سے بدلے لیتا ہے اور انکے بچوں کو ہلاک کرنا اپنا جائز حق سمجھتا ہے کہ یہ حق وہ ہے جو اُس کے خدا کے وعدے کے مطابق ہے..

اور اس عظیم ناانصافی اور ظلم.. یہاں تک کہ فلسطین کے بچوں کو ٹینکوں تلے کچل دینے کا جواز ''ہولوکاسٹ'' ہے..

یہودیوں نے یورپ میں اپنے جلائے جانے اور لاکھوں کی تعداد میں گیس چیمبرز میں راکھ کر دیے جانے والے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو مرنے نہیں دیا.. یہ ان کا کمال ہے کہ وہ جو آج سے ساٹھ پینسٹھ برس پیشتر مر گئے تھے.. گیس چیمبرز میں برہنہ کر کے انہیں ہلاک کر دیا گیا تھا.. ان کی لاشوں کو ٹھیلوں میں بھر کر انہیں بھڑکتی بھٹیوں میں انڈیل کر راکھ کر دیا تھا.. اور اس راکھ میں سے نازی ان کے سونے کے دانت تلاش کر کے اپنی محبوباؤں کو تحفے میں پیش کرتے تھے جنہیں وہ اس سے پیشتر یہودیوں کے بدنوں سے اتاری گئی کھالوں سے تخلیق کردہ ٹیبل لیمپ بھی پیش کر چکے تھے.. جیسے ہمارے ہاں اونٹ کی کھال کے ٹیبل لیمپ بنائے جاتے ہیں تو یہ سارے لاکھوں لوگ جو راکھ ہو چکے تھے، مر چکے تھے.. یہودیوں کا کمال یہ ہے کہ وہ سب آج بھی ہمارے آس پاس چلتے

پھرتے نظر آتے ہیں..زندہ ہیں..ٹیلی ویژن سینما سکرین پر..اخباروں..کتابوں اور سیاست میں..
اسرائیل کے قیام کے جواز میں..یہ لاکھوں یہودی اب بھی زندہ ہیں..چلتے ہوئے نظر آتے ہیں..
یہ کیسی مسیحائی ہے کہ مردوں کو زندہ کر دیا گیا ہے..اور یہ کمال یہودی فلم میکرز، دانشوروں، ادیبوں اور سیاستدانوں کا ہے کہ انہوں نے ''ہولوکاسٹ'' کے المیے کو..جواب تک تاریخ کی کتابوں میں دفن ہو چکا تھا اسے ابھی تک زندہ رکھا ہے اور کُل یورپ اور امریکہ کو احساس جرم میں مبتلا کر رکھا ہے اور وہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے بین الاقوامی سطح پر اور خاص طور پر یو این اے میں فلسطین یا لبنان میں اسرائیلی ٹینکوں تلے کچلی جانے والی بوڑھی عورتوں اور بچوں کو بھی دہشت گرد قرار دیتے ہیں..اسرائیل ایک ایسا خدا ہے جس کے پاس زندگی اور موت کا اختیار ہے..اور ایک خدا کے خلاف احتجاج تو نہیں کیا جا سکتا..

یورپ اور امریکہ کے ذہنوں میں دن رات نازی مظالم کے ہولناک مناظر چلتے رہتے ہیں..چلائے جاتے رہتے ہیں تاکہ ان کے احساس جرم کو سانس لینے کا بھی موقع نہ ملے..اس دوران بقیہ دنیا میں جتنے بھی بڑے ظلم ہوئے..قتل ہوئے..آبادیاں تہ تیغ کر دی گئیں..چاہے وہ افریقہ ہو، چیچنیا، عراق، افغانستان یا فلسطین اور بیروت ہو..یہ سب پس منظر میں چلے گئے..
دراصل اُن کے مظلوم اور مُردے سچ مچ مر جاتے ہیں اس لیے کہ ان پر ڈھائے جانے والے ستم کی تصویروں کو ایک مسلسل ابدی روپ دے کر دنیا کو دن رات احساس جرم میں مبتلا رکھنے والے نابغۂ روزگار فلمی ہدایت کار، مصنف اور تاریخ دان نہیں ہوتے..چنانچہ وہ سچ مچ تاریخ کی راکھ میں دفن ہو جاتے ہیں..

آپ کو یہ محسوس کروا دیا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں آج تک جتنے بھی مظالم ہوئے، زیادتیاں ہوئیں ان سب سے زیادہ المناک نازی جرمنی میں یہودیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم ہیں..ان کے سوا ہر ظلم دو نمبر ہے، حوالے کے لائق نہیں ہے..

یہودی..کاروبار اور روپے پیسے کے معاملے میں ہندوؤں کے علاوہ دنیا کی سب سے زیادہ شاطر اور بے حد دانش مند قوم ہیں..تو انہوں نے اپنے آباؤ اجداد پر ہونے والے مظالم کو بھی ایک کاروبار بنا کر خوب منافع حاصل کیا کیونکہ ان میں اتنی لیاقت اور صلاحیت تھی جو دوسروں میں نہیں تھی..فلسطینیوں، عربوں اور دیگر مسلمانوں میں تو ہرگز نہیں تھی..اس لیے اُن کے مرنے والے

واقعی مر گئے اور اِن کے مرنے والے انہوں نے زندہ کر لیے..
جیسے اُنہوں نے این فرینک کو زندہ کر لیا..
اُس کی ڈائری کے چند اوراق کو مغرب اور امریکہ کے دلوں اور مجرم ضمیر پر نقش کر دیا..
جیسے اشوک اعظم کے فرمان پتھروں پر کندہ کر کے پوری سلطنت میں آویزاں کر دیے گئے تھے ایسے این فرینک کا لکھا ہوا ایک ایک حرف مغرب کے سینے پر کھود دیا گیا تاکہ وہ مسلسل اپنے احساس جرم کے تحت یہودیوں کے سامنے سرنگوں رہے..

میں ''نکلے تری تلاش میں'' کے زمانے میں آج سے تقریباً چھتیس برس پیشتر ایمسٹرڈیم میں واقع ''این فرینک ہاؤس'' میں گیا تھا..

''خوراک کا ذخیرہ ختم ہونے کو ہے، میں نے دو روز سے کچھ نہیں کھایا، مجھے بے حد بھوک لگی ہے..''

''آج ساری رات گھر کے باہر فٹ پاتھ پر جرمن سپاہیوں کے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دیتی رہی اور ہم میں سے کوئی بھی نہ سو سکا..آخر مجھ میں اور دوسری چھوٹی لڑکیوں میں کیا فرق ہے کہ نازی مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں..''

این فرینک کو ایمسٹرڈیم کے دوسرے یہودیوں کے ہمراہ گیس چیمبر میں دھکیل کر ہلاک کر دیا گیا..جنگ کے خاتمے پر اس کا باپ جو نازیوں کے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا واپس ایمسٹرڈیم میں اپنے گھر گیا..وہاں ایک کمرے میں این فرینک کی ڈائری کے چند اوراق بکھرے ہوئے تھے اور اس نے چند دوستوں کی مدد سے یہ اوراق ترتیب دے کر ''ڈائری آف این فرینک'' کے نام سے شائع کروا دیے..اس معصوم بچی کی المناک روئیداد نے پورے یورپ کو سوگوار کر دیا..''این فرینک ہاؤس'' اب ایک اہم میوزیم ہے جہاں این فرینک کی ذاتی اشیاء، خاندان کی تصاویر، ڈائری کے اوریجنل ورق اور دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ شدہ اس ڈائری کے نسخے نمائش پر ہیں..اسی گھر میں ''این فرینک فاؤنڈیشن'' کا دفتر ہے..

میرے لیے بھی وہ ایک چھوٹی سی معصوم بچی تھی جسے ہلاک کر دیا گیا تھا اور مجھ پر بھی اس کی المناک موت کا گہرا اثر ہوا اور میں نے اس کی یاد میں فاؤنڈیشن کو چند گلڈرز کا چندہ دیا..

''این فرینک ہاؤس'' میں این فرینک اب بھی زندہ ہے..

اسے مرنے نہیں دیا گیا..
وہ تو صرف ایک تھی..

اور وہاں ہزاروں این فرینکس تھیں جو صابرہ، شتیلہ، جنین اور غزہ کی تاریک راہوں میں ماری گئیں.. اتنی ہی معصوم بھولی بھالی اور بے گناہ جتنی کہ ایمسٹرڈیم کی این فرینک تھی..

لیکن ہماری ساری کی ساری ہزاروں این فرینکس مر گئیں تو بس مر گئیں اور ان کی ایک این فرینک مر کر بھی زندہ رہی..

اُن ہزاروں میں سے کچھ نے ڈائریاں بھی لکھیں جو اُن کی موت کے بعد.. کسی اسرائیلی بُل ڈوزر سے کچلے جانے کے بعد اپنی ماں کی آغوش میں یا صحن میں گڑیوں سے کھیلتے ہوئے موت کا شکار ہونے کے بعد یہ ڈائریاں شائع ہوئیں.. چند روز ان کا تذکرہ ہوا اور پھر وہ گمنامی کی راکھ میں مل گئیں.. میں نے ان میں سے ایک بچی کی ڈائری کے کچھ حصے پڑھے تھے جو شاید این کی ڈائری کی نسبت کہیں زیادہ ہولناک اور رلا دینے والے تھے.. نازی سپاہیوں کے بجائے این کی ڈائری میں اگر اسرائیلی سپاہی پڑھا جائے تو تقریباً وہی روئیداد تھی..

وہ سب آخر گمنامی کی راکھ میں کیوں مل گئیں، کیوں مر گئیں اور این زندہ رہی؟.. صرف اس لیے کہ یہ این فرینکس یہودی نہ تھیں.. مسلمان یا عیسائی فلسطینی تھیں.. اور ان کے قبیلے میں وہ ذہنی صلاحیت اور منصوبہ بندی نہ تھی جو این فرینک کے قبیلے میں تھی جس کے تحت ایک بچی کی موت کو بھی فروخت کیا جا سکتا ہے.. اس کے علاوہ ان کی موت کے لیے کوئی بھی مجرم محسوس نہ کرتا تھا.. یورپ اور امریکہ تک تو ان کی موت کی خبر بھی نہ پہنچی کہ وہ تو ان کے وجود سے بھی بے خبر تھے اور اگر خبر پہنچ جاتی تو وہ ایک صاف ضمیر کے ساتھ انہیں دہشت گرد قرار دے کر بری الذمہ ہو جاتے کہ ایک اسرائیلی فوجی افسر کا یہ بیان میں نے خود سنا اور دیکھا ہے کہ اگر ہمارے ہاتھوں بچے ہلاک ہو جاتے ہیں تو اس پر احتجاج کرنے کی ضرورت نہیں کہ فلسطینی پیدا ہوتے ہی دہشت گرد ہو جاتے ہیں.. وہ ہمارے ٹینکوں پر پتھر پھینکتے ہیں.. اس لیے وہ بھی جائز نشانہ ہیں.. چنانچہ ہماری این فرینکس جب ہلاک کر دی جاتی ہیں تو ہمیشہ کے لیے راکھ ہو جاتی ہیں کہ ہمارے پاس وہ مسیحائی نہیں جو انہیں پھر سے زندہ کر دے..

ان میں سے ایک ایسی بچی تھی جس کے گاؤں پر رات گئے اسرائیلی فوجیوں نے حملہ کر دیا تھا اور وہاں ہزاروں برسوں سے آباد لوگوں کو یا تو ہلاک کر دیا تھا اور یا فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا تا کہ

اس گاؤں پر بل ڈوزر چلا کر اسے صفحۂ ہستی سے مٹا کر وہاں یہودیوں کی تازہ بستیاں آباد کی جائیں.. یہ بچی فائرنگ اور دھماکوں سے اور اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی لاشوں سے خوفزدہ ہو کر چیختی ہوئی گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور پھر بھاگتی چلی جاتی ہے..

جب بہت سے موسم گزر گئے تو اس این فرینک کا بوسیدہ اور کیڑے مکوڑوں کا کھایا ہوا ڈھانچہ گندم کے ایک کھیت میں ملتا ہے.. صرف اس کے سنہری بال ابھی تک سنہری اور روشن ہیں.. اور ان میں سے گندم کی سنہری بالیاں پھوٹ رہی ہیں.. دور سے کچھ گمان نہ ہوتا تھا کہ بالیاں کونسی ہیں اور بال کونسے ہیں..

اس این فرینک نے بھی اپنی سکول کی کاپی پر ایک ڈائری لکھی تھی لیکن اس میں کوئی خوف یا دہشت نہ تھی کہ وہ تو اپنے گھر میں تھی، اپنی ماں کی گود میں تھی اور اپنے وطن میں تھی چنانچہ اس نے وہی باتیں لکھیں جو ہر بچہ لکھتا ہے کہ آج میری استانی نے گھر کا کام نہ کرنے پر مجھے بہت ڈانٹا.. آج میں اپنے ابو کے ساتھ زیتون کے باغوں میں گئی اور اپنے خاندان کے ہمراہ درختوں سے زیتون اتارے اور میرے ابو ایک کولہو میں ڈال کر ان کا تیل نکالتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں.. اور آج.. میرے دونوں بھائی اسرائیلی ٹینکوں کو پتھر مارنے کے لیے گئے تھے اور میں نے بھی چند پتھر جمع کر کے انہیں دیئے..

ان اسرائیلیوں کو جانے ہم سے کیا بیر ہے..

اور ہم میں اتنی سکت، مہارت یا قابلیت نہ تھی کہ ہم اس ایک این فرینک کو زندہ رکھ سکتے.. اس کا کرم خوردہ ڈھانچہ اور سنہری بال کب کے راکھ میں مل چکے..

بے شک اس میں ہماری نالائقی کا بھی عمل دخل ہے.. یورپ اور امریکہ کو بھی کیا دوش دیں کہ ہم خود بھی تو.. ہم اور عرب برادر بھی تو ان این فرینکس سے کچھ ہمدردی نہیں رکھتے بلکہ شکر کرتے ہیں کہ یہ مر گئیں.. مجھے شک ہے کہ یہ صورتِ حال مستقبل قریب میں تو بدلنے والی نہیں اور مستقبل بعید تو بہت بعد کی بات ہے اور مجھے وہاں بھی کچھ امکان نظر نہیں آتا.. ان کی ایک این فرینک زندہ رہے گی.. اور ہماری.. نہ صرف مر چکی ہیں بلکہ مرتی رہیں گی اور ان کی موت بھی رائیگاں جائے گی..

میں نے سرسری طور پر اپنے سفرنامے ''خانہ بدوش'' میں اس کا تذکرہ کیا تھا کہ ان دنوں جب آتش جوان تھا، بے مہار تھا، سوچتا سمجھتا نہیں تھا، جذباتی تھا اور ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا ان دنوں وہ بیروت میں آزادیٔ فلسطین کے دفتر میں گیا تھا اور اپنی خدمات پیش کیں.. مسلح جدوجہد کے

لیےنہیں کہ میں بہت ڈرپوک تھا..بچپن میں صرف ایک مرتبہ غلیل سے ایک چڑیا کو مار گرایا تھااوراس کا بھیجہ باہر آ گیا تھااور وہ تڑپ رہی تھی تو میں کئی روز تک سویا نہ تھا کہ یہ میں نے کیا کیا..انسان چاہے وہ میرا جانی دشمن ہو،اسے ہلاک کر دینا بھی میرے بس میں نہ تھا، میں اتنا ڈرپوک تھا تو میں نے انہیں صرف معاونت کی پیش کش کی کہ کسی دفتر میں حساب کتاب کے رجسٹر کے سامنے بٹھا دیجیےاورانہوں نے میری خدمات قبول نہ کیں کہ میں شادی شدہ تھااور میں نے ایسا کیوں کیا..تا کہ ہماری این فرینکس جو ہلاک کی جارہی تھیں تو میں ان کو زندہ رکھنے کے لیے معاون ثابت ہوسکوں..یہودی میری پسندیدہ اقوام میں سے ایک ہیں کہ ان میں اور مجھ میں بہت کچھ مشترک ہے..ہم دونوں دین ابراہیمی کے پیروکار ہیں لیکن اس پسندیدگی کے درمیان ہزاروں این فرینکس آجاتی ہیں جنہیں انہوں نے ہلاک کیا..

ساری شامیں ایک جیسی نہیں ہوتیں..

ساری شامیں پورے شہر پرنہیں اُترتیں..اپنی من مرضی سے کسی ایک مقام پر اُتر کر وہاں تادیر ٹھہری رہتی ہیں..

وہ شام نہ فیری میڈو کی برفوں میں سے نمودار ہونے والے پہلے سٹرابیری کے سفید پھول پر..نہ کسی محبت میں بے قابو ہو جانے والی لڑکی پر..نہ کسی کتاب پر بلکہ نیویارک کے سنٹرل پارک کے درختوں میں گھری کائی زدہ ایک ہلکی روشنائی میں نہائی جھیل پر اُتری..

اور وہاں جھیل کنارے،بہت سے عجیب سے لوگ جمع تھے..سیاہ سوٹوں میں اور سیاہ ہیٹوں میں..نفیس ستھرے لباس میں..بچوں کے سروں پر بھی سیاہ رنگ کی نمازی ٹوپیاں تھیں اور وہ سارے کے سارے مگن تھے..اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے کتابچے پڑھ رہے تھے جیسے ان کی تلاوت کر رہے ہوں..اور وہ جھیل میں تیرتی بطخوں اور مرغابیوں کی جانب کچھ پھینک رہے تھے..

یہ کیسے لوگ تھے..کون لوگ تھے..

تاریخ میں سب سے معتوب لوگ اور مطعون لوگ..

وہ جھیل میں آہستگی سے تیرتے پرندوں..اور وہ پرندے بھی اس شام کے سحر میں آئے ہوئے بہت آہستگی سے تیرتے تھے تو وہ ڈھلوان سے کناروں پر جمع لوگ ان کی جانب ڈبل روٹی کے ٹکڑے پھینک رہے تھے..جھیل کنارے ایک بورڈ پر خاص طور پر درج تھا کہ پانیوں پر جو کائی ہے وہ

قدرتی نہیں ہے بلکہ اس ہریاول کو پانی کی سطح پر کاشت کیا گیا ہے کہ یہ پرندوں کی مرغوب غذا ہے..

ساری شامیں ایک جیسی نہیں ہوتیں..

اور یہ ایسی پرفسوں شام تھی کہ میں اسے دوبارہ بیان کرتا ہوں..

بعض شامیں پورے شہر پرنہیں اترتیں..اپنی من مرضی سے کسی ایک مقام پر یا کسی ایک شخص پر اتر کر وہاں تادیر ٹھہری رہتی ہیں..اس مقام اور اس شخص کو اپنی زرد کرنوں سے یوں نیم روشن کرتی ہیں کہ وہ اردگرد کے ملگجے میں نمایاں ہونے لگتا ہے..کسی لیمپ پوسٹ کے نیچے اپنی محبت کی منتظر ایک لڑکی جو سنہری ہو رہی ہے اور اس کی جانب بڑھنے والے اس کے محبوب کو صرف وہی دکھائی دے رہی ہے اور وہ شام اس لڑکی کے دل پر بھی اتر رہی ہے..اس ایک کبوتر پر جو ایک فلیٹ کی آہنی ریلنگ پر بیٹھا ہے اور اس کا سرمئی رنگ بھی سنہری ہو رہا ہے اور کبھی صرف مجھ پر..نیویارک جیسے شہر میں بھی صرف مجھ پر.....

یہ نہیں کہ بقیہ شہر پر شام کا سماں نہیں ہوتا..ہوتا ہے پر وہ اس پر اترتی نہیں..میں حسب معمول میٹروپالیٹن میوزیم میں ایک اور دن بسر کر کے سنٹرل پارک کی دیوار کے برابر میں بچھے فٹ پاتھ پر چلتا کولمبس سرکل کی گہما گہمی، ابلتے فواروں،سفید بگھیوں اور ایک بلند ستون پر آویزاں کولمبس کے مجسّمے تک پہنچا تا کہ براڈوے سٹریٹ جانے والی بس کا انتظار کرسکوں..وہ بلند ستون تو شام میں جا چکا تھا لیکن کولمبس کے مجسّمے پر ابھی ہلکی سی زردی باقی تھی..میں گزر جانے کو تھا،سڑک پار کر کے بس سٹاپ کی جانب جانے والا تھا جب میں نے بائیں جانب سنٹرل پارک کی جانب ایک نظر کی تو میرا دل تھم سا گیا..میں نے دیکھا کہ آج کی شام نہ کسی سفید پھول پر،نہ کسی لڑکی کے دل پر،نہ کسی کتاب پر اتری ہے..بلکہ سنٹرل پارک کے درختوں میں گھری کائی زدہ جھیل..ہلکی روشنی میں نہائی جھیل پر اُتری ہے..

پارک کے کناروں پر سربلند عمارتیں ابھی بجھی بجھی سی کرنوں سے بجھی سی روشن تھیں اور سیاہ ہو چکے گھنے درختوں میں سے کہیں کہیں ظاہر ہوتی تھیں..

نیچے جھیل کے کناروں تک انہی سیاہ ہو چکے درختوں میں سے پتھریلی سیڑھیاں اترتی تھیں جہاں ایک فربہ خاتون اپنے فربہ کتّے کی تھوتھنی تھامے اسے کچھ سمجھانے اور پھر چومنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کتّا مان نہیں رہا تھا..

جھیل کے کائی زدہ شام کے سکوت میں آئے ہوئے پانیوں پر ایک قدیم طرز کا خمدار

پتھریلا پُل بھی چپ سا تھا..

اور وہاں بہت سے لوگ جمع تھے جن کے سیاہ ہیٹ اور سوٹ اس ڈھل چکی شام میں بہت دل فریب لگ رہے تھے..

اس شام کی عجیب سی روشنی تھی جو سنٹرل پارک کے سیاہ ہو چکے اشجار، کائی زدہ خاموش جھیل اور اس پر خم دار پل کو ایک ساکت تصویر کر رہی تھی.. اس تصویر کے اندر جانے والا شخص خود بھی تصویر ہو جاتا تھا کہ اسے نہ تو نیویارک شہر کا شور سنائی دیتا تھا اور نہ کسی پتّے کے ہلنے کی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی.. وہ اس انوکھی شام کے جادو میں مبتلا گنگ ہو کر پتھر ہو جاتا تھا اور صرف اس کی آنکھوں میں جھیل کی ہریالی ایسی اترتی تھی کہ وہ سبز دکھائی دینے لگتی تھیں.. آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا میں اس سیاہ پوش ہجوم کے قریب ہوا جو جھیل کنارے حرکت کر رہا تھا.. ان میں سے بیشتر لوگ نہایت خشوع وخضوع سے ہاتھوں میں تھامی ہوئی کتابوں پر سر ہلاتے کچھ پڑھ رہے تھے.. میں ان کے مخصوص اور صاف ستھرے لباس سے جان چکا تھا کہ وہ یہودی ہیں..

کیا مجھے اُن کے گیان دھیان میں دخل دے کر استفسار کرنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں.. شاید انہیں ناگوار گزرے.. کہ ان کے سوا وہاں اور کوئی عام امریکی نہ تھا.. یہ کوئی ذاتی اور مذہبی نوعیت کا اجتماع تھا..

ہاں مجھے پوچھنا تو چاہیے کہ وہ اس شام میں وہاں جھیل کنارے کیا کر رہے ہیں.. کیا پڑھ رہے ہیں، تو میں نے نہایت عاجزی سے دھیمے لہجے میں ایک خوش قامت نوجوان سے یہی پوچھا.. اس نے اپنی عبادت میں مخل ہونے پر کچھ برا نہ مانا اور مجھ سے بڑھ کر عاجزی سے بولا ''یہ شام.. ہم یہودیوں کے سال کی آخری شام ہے.. کل سے ہمارا نیا سال شروع ہوگا.. ہم اس آخری شام کو الوداع کہنے کے لیے اور اپنے گناہوں پر پشیمان ہونے کے لیے یہاں جمع ہوتے ہیں.. تورات کی تلاوت کر رہے ہیں.. ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ وہی شب ہے جب ہمارا خدا اگلے برس جو کچھ ہونا ہے اس کا فیصلہ کرتا ہے.. کس نے مرنا ہے، کس نے زندہ رہنا ہے اس کا فیصلہ آج ہو جانا ہے.. تو یہ توبہ کرنے کی شام ہے.. ہم جھیل میں تیرتی بطخوں، مرغابیوں اور دیگر پرندوں کو ڈبل روٹی کے ٹکڑے کھلا رہے ہیں کہ یوں ہم جتنے پرندوں کو روٹی کھلائیں گے اسی حساب سے ہمارے گناہ کم ہوں گے''..

یہ جو نفیس ترین سوٹوں میں ملبوس ستھرے لوگ تھے.. ان میں صرف مرد اور بچے تھے..

خواتین ان سے الگ کھڑی تھیں اور عبادت میں مگن تھیں اور یہ بھی نہیں کہ یہ ساری تصویر سوگواری کی سیاہی میں تھی.. ہرگز نہیں.. کچھ لاپرواہ سے یہودی ایک جانب کھڑے گپیں لگا رہے تھے اور شاید صرف حاضری لگوانے کی خاطر آئے تھے.. ایک موٹا سا نہایت خوشگوار شکل والا یہودی جو پلاسٹک کے ایک تھیلے میں اپنے گناہوں کے حساب سے ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈال کر لایا تھا تو اسے بہت سے بچوں نے گھیرا ہوا تھا.. وہ ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا بطخوں کی جانب پھینکنے لگتا تو بچے اسے چھین کر خود کھانے لگتے اور وہ ہنستے ہوئے انہیں ڈانٹنے لگتا.. اس نے شاید ہی پانچ سات ٹکڑے جھیل میں پھینکے ہوں باقی سب کے سب بچے اچک لیتے.. اور وہ ان چھوٹے بچوں کے سروں پر تھپکی دیتا اور ان بچوں کے سروں پر بھی سیاہ گول ٹوپیاں جمی ہوئی تھیں..

اگرچہ وہ مجھ سے مختلف عقیدے کے لوگ تھے لیکن اس شام میں نے انہیں تورات پڑھتے اور پرندوں کو ڈبل روٹی کھلاتے دیکھ کر ایک روحانی سرخوشی محسوس کی کہ یہ کیسے شاندار لوگ ہیں جو نہ اپنے مذہب کو بھولتے ہیں اور نہ اپنی قدیم روایتوں کو فراموش کرتے ہیں.. اور کیسے خوبصورت طریقے سے اپنے نئے سال کو خوش آمدید کہنے کیلئے یہاں جمع ہوئے ہیں.. یہ کیسے لوگ ہیں.. کون لوگ ہیں؟

ابھی میں نے ایک موٹے سے خوشگوار شکل کے یہودی کا تذکرہ کیا ہے جسے بچوں نے گھیرا ہوا تھا اور اُس اچھل اچھل کر ڈبل روٹی کے ٹکڑے چھین رہے تھے اور انہیں جھیل میں پھینکنے کے بجائے خود کھا رہے تھے.. اس چھینا جھپٹی میں نمایاں چار بچے تھے.. ان میں سے ایک لڑکا دس بارہ برس کا ہوگا لیکن وہ بھی باقاعدہ ایک غضب کے سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے سر پر سفید لیس کی ایک ٹوپی جمی ہوئی تھی.. دوسرے لڑکے نے جو ابھی کم عمر تھا سرخ سویٹر پہنا ہوا تھا اور اس کے سر پر جو ٹوپی تھی وہ سیاہ تھی.. اور دو بچیاں تھیں اور بہت ہی گڑیا کی طرح پیاری تھیں.. نیلے سویٹروں اور پھول دار فراکوں میں.. اگرچہ عام طور پر یہودیوں کی رنگت دیگر یورپی اقوام کی نسبت قدرے کم سفید ہوتی ہے اور ان کے بال سیاہ ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی لگا بندھا اٹوٹ اصول نہیں ہے.. دیگر اقوام میں شادیوں کے نتیجے میں ان کی آنکھیں جو عام طور پر سیاہ ہوتی ہیں نیلی بھی ہو سکتی ہیں اور ان کے بال سنہری بھی ہو سکتے ہیں، تو یہ جو دو گڑیا بچیاں تھیں ڈبل روٹی کی لوٹ مار میں شامل ان دونوں کے بال سنہری تھے اور وہ ڈبل روٹی کھانے کے بجائے اس کے ٹکڑے اپنی جیبوں میں ٹھونس رہی تھیں اور وہ سحر انگیز شام ان کے بالوں میں زردی بھرتی انہیں مزید سنہری کر رہی تھی..

اس منظر میں وہ شام جو کائی زدہ جھیل میں ڈوبتی تھی، جہاں کچھ سیاہ ہیٹ تورات پر جھکے تلاوت کرتے، نئے برس کی آمد پر توبہ استغفار کر رہے تھے، تو وہ کیا جانتے تھے کہ ان کے درمیان بے وجہ مسکراتا..توند پر سے ڈھلکتی نیلی جین کو سنبھالتا..جو ایک شخص ہے وہ بھی ان کے عقیدے کا ہے..انہی کے دین ابراہیمی کا پیروکار ہے..انہی کی مانند ''شولوم'' سلام کہتا، کبھی کبھار تسبیح پرو لیتا ہے، سؤر نہیں کھاتا اور صرف ذبیحہ کھانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو کانٹے کو گوشت پر رکھ کر بسم اللہ پڑھ لیتا ہے..کچھ روزے بھی رکھ ہی لیتا ہے، آمین کہتا ہے، نماز پڑھتے ہوئے ان جیسی ٹوپی پہنتا ہے، جسے وہ پیغمبروں کا باپ کہتے ہیں اسی ابراہیم کی اولاد میں سے..ان کے بیٹے اسماعیل کی اولاد میں سے وہ پیغمبر ہے جس کے راستے پر وہ چلنے کی کوشش کرتا ہے..اور اس ابراہیم کی بیوی ہاجرہ کے نقش قدم پر سعی کرتا ہے..انہی کے تعمیر کردہ خانہ کعبہ کا طواف کرتا ہے، شیطان کو کنکریاں مارتا ہے اور قربانی کرتا ہے..اماں حوا کے بعد اماں ہاجرہ اس کی ماں ہیں اور وہ جب حج کرتا ہے تو اسی اماں ہاجرہ کو خراج تحسین پیش کرتا ہے کہ حج ہاجرہ ہے..

وہ ان کے اتنا قریب ہے کہ نیچے سے بھی اس کا کام تمام کر دیا جاتا ہے..اس سے بڑھ کر قرابت کیا ہوگی..

وہ نہیں جانتے کہ ان کے درمیان بے وجہ مسکراتا..توند پر سے ڈھلکتی نیلی جین کو سنبھالتا جو شخص ہے وہ کتنا اُن جیسا ہے..

اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ جو دو گڑیا بچیاں ہیں جو ایک موٹے خوشگوار شکل والے یہودی سے ڈبل روٹی کے ٹکڑے زبردستی چھین رہی ہیں اور ان کے بال سنہری ہیں تو یہ شخص انہیں دیکھ کر کہاں اور کس خطے میں چلا گیا ہے..

جہاں سینکڑوں برس قدیمی زیتون کے باغوں پر بلڈوزر چل رہے ہیں اور انہیں ملیامیٹ کر کے نئی بستیاں آباد کی جا رہی ہیں جن میں وہ لوگ آ کر بسیں گے جو نہیں جانتے کہ زیتون کا ذائقہ کیا ہے' وہ بھانت بھانت کے لوگ ہیں اور نہ مقامی زبان سے سے آشنا ہیں اور نہ لوگوں سے..لیکن وہ اس یقین کے ساتھ آئے ہیں کہ یہی وہ سرزمین ہے جس کا وعدہ ان کے خدا نے ان کے ساتھ کیا تھا اور انہیں محفوظ رکھنے کے لیے سینکڑوں کلومیٹر طویل اور دبیز حفاظتی دیوار تعمیر کی گئی ہے تا کہ اس کے اندر قید جو دہشت گرد ہیں وہ ان کے سکون میں خلل نہ ڈالیں..وہ آرام

سے ناشتے کے دوران کافی کا ایک پیالہ پی سکیں..ان کے سکون کی خاطر ہیلی کاپٹر' جیٹ طیارے' توپیں اور میزائل اس دیوار کے اندر قید لوگوں کو زندگی کی قید سے روزانہ آزاد کرواتے ہیں..لبنان کے خلاف جنگ کے دوران ایک انگریز جو ابھی کچھ ماہ پیشتر اسرائیل میں آباد ہوا ہے' کہتا ہے پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں اور کون سی زبان بولتے ہیں اور مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ اسرائیل کے آس پاس کون سے ملک ہیں لیکن میں یہ بات جانتا ہوں کہ یہ سب دہشت گرد ہیں..

اس سحر زدہ شام میں..سنٹرل پارک کی جھیل کے کناروں پر جو لوگ اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے ہیں توبہ کر رہے ہیں تو کیا ان میں سے کوئی ایک تاریخ کے سب سے بڑے گناہ کی بھی معافی مانگ رہا ہے' جس کی مرتکب اُس کی قوم ہے؟..

تو وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ جو دو گڑیا بچیاں ہیں ایک موٹے یہودی سے زبردستی ڈبل روٹی کے ٹکڑے چھینتی جن کے بال سنہری ہیں تو بیر قاسم گاؤں سے روتی خوفزدہ بھاگتی ہوئی جو ایک بچی تھی جو گندم کے ایک کھیت میں مرگئی تھی اس کے بال بھی سنہری تھے' بہت دنوں بعد جب اس کی لاش کو کیڑے جی بھر کے کھا چکے اور صرف اس کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تو صرف اس کے سنہری بال روشن رہے اور ان میں سے گندم کے بوٹے بلند ہوتے گئے اور ان کی بالیاں طلوع ہوتی گئیں' تو وہ بچی بھی انہی کی بہن تھی..صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہ یہودی ہیں اور وہ مسلمان تھی..

یہ زندہ ہیں اور وہ..ان جیسی ہزاروں مر چکی ہیں..

کیا ان کی توبہ استغفار میں وہ ہزاروں بچیاں شامل ہیں؟

یا ان کا خدا اُن ہزاروں بچیوں کو اپنی مخلوق میں شمار نہیں کرتا اور صرف ان دو بچیوں کو جو موجود ہیں ایک موٹے اور خوشگوار خصلت کے یہودی کے تھیلے میں سے زبردستی ڈبل روٹی کے ٹکڑے چھین رہی ہیں' صرف ان دو کو ہی اپنی مخلوق قرار دیتا ہے..

ساری شامیں ایک جیسی نہیں ہوتیں..

کوئی ایک شام پورے شہر پر نہیں اترتی..

وہ صرف دو معصوم سنہری بالوں والی یہودی بچیوں پر اترتی ہیں..انہیں نمایاں کرتی ہیں اور انہی جیسی گندم کے کھیت میں مردہ ہو چکی سنہری بالوں والی ایک بچی پر نہیں اُترتیں..



''امریکہ کی دیوی''

شاید کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی..

اگرچہ کیمرے کہیں مخفی تھے..عوام الناس کو نظر نہ آتے تھے لیکن انہیں وہ بھدے بدن کا اداکار جو پیٹ سے ڈھلکتی پتلون کو سنبھالتا.. ہانپتا.. دوڑتا..لوگوں کو دھکیلتا نظر آ رہا تھا..اور عوام الناس تأسف کرتے تھے کہ ہالی ووڈ کے زوال کی حد ہو گئی ہے کہ انہیں اپنی ڈیٹیکٹو فلم کے لیے اس عمر رسیدہ' بے ہودہ سے بڈھے اداکار کے سوا اور کوئی نہیں ملا..اگرچہ اس بھاگتے دوڑتے گرتے پڑتے..نیویارک کی سب وے کے ہر سٹیشن پر اپنے ڈبّے سے اتر کر لوگوں کو دھکّے دیتے' اگلے ڈبّے میں سوار ہونے کی سعی کرنے والے اداکار کی شکل سے شائبہ ہوتا تھا کہ جب آتش جوان ہوتا ہوگا تو کچھ برا نہ ہوتا ہوگا..البتہ اس کی اداکاری میں بہت جان تھی..کبھی وہ لڑکھڑاتا تھا اور کبھی کسی سے ٹکرا کر مسکراتا تا آئی ایم سوری کہتا تھا..لگتا ہی نہیں تھا کہ اداکاری کر رہا ہے، اتنا قدرتی تھا..

جونہی ٹرین کسی سٹیشن میں داخل ہوتی مدھم رفتار ہونے لگتی تو وہ اپنی نشست سے اٹھ کر سب سے پہلے دروازے کے ساتھ جا لگتا اور اس کے وا ہوتے ہی پلیٹ فارم پر کود جاتا..پھر بھاگ دوڑ کر کے اگلے ڈبّے میں سوار ہو جاتا..تا دیر منہ کھولے پسینہ پونچھتا اور ظالم اتنا اچھا اداکار تھا کہ اس کے چہرے پر چھینٹے مار کر پسینہ تخلیق کرنے کی بھی حاجت نہ تھی..

شاید کوئی جاسوس تھا یا شاید کوئی مجرم تھا..اگر مجرم تھا تو اس نے جوانی کے ایام میں کوئی جرم کیا ہوگا..عصمت کے سوا کچھ اور ہی لوٹا ہوگا..پھر روپوش رہا اور اب اس عمر رسیدگی میں کہیں پول کھل گیا بلکہ انٹر پول کھل گیا..نیویارک پولیس کو خبر ہوگئی اور وہ اس کا پیچھا کر رہی ہے..

اُس پر ترس بھی آ رہا تھا کہ اگر پکڑا گیا تو یہ جو زندگی کے دو چار برس رہ گئے ہیں

بے چارا جیل میں گزارے گا..

اس بھاگ دوڑ کے دوران..لوگوں میں راہ بناتے ہوئے وہ ایک فربہ حبشن کے تھل تھل کرتے جُثّے سے ٹکرایا تو وہ گویا ربڑ کا بنا ہوا تھا چنانچہ پیچھے دھکیلا گیا..حبشن نے کچھ برا نہ مانا کہ چلو اتنی وسیع تنومندی اور ایسی شکل کے باوجود کوئی مجھ سے ٹکرایا تو سہی..ایک بار وہ ایک بارلیش امریکی سے تقریباً ہم آغوش ہو گیا اور وہ شاید گے تھا چنانچہ خوش ہو گیا..اور ہاں اس بھگدڑ میں وہ ایک چینن سے بھی جا ٹکرایا اور وہ اتنی مختصر اور جامع تھی کہ لطف آ گیا اور دوبارہ ٹکرانے کو جی چاہا..

اب آپ سے کیا پردہ..

وہاں نہ کوئی شوٹنگ تھی اور نہ کوئی کیمرہ..نہ وہ کسی کا پیچھا کر رہا تھا اور نہ ہی کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا..

وہ کوئی اداکار نہ تھا..بس میں تھا..

رابعہ اپنی ہمشیرہ عینی سے ملنے پنسلوینیا جا چکی تھی..

سلجوق مجھے نیویارک گردی کے تمام آلات حرب سے لیس کر چکا تھا..میٹرو اور نیویارک بس سروس کا ایک ہفتے کا سیزن ٹکٹ..کہیں بھی سوار ہو جائیے، کہیں بھی اتر جائیے..بے شک سوار ہو جائیے اور پورا ہفتہ نہ اتریے..ریلوے اور بس کے روٹ کے نقشے' منزلیں کون سی ہیں اور راستے کدھر جاتے ہیں..ایک موبائل فون' ایک سینڈوچ' نیویارک کی مشہور گائیڈ بک یعنی ڈورلنگ کنڈرسلے کی گائیڈ بک جس کا دعویٰ تھا کہ ہماری گائیڈ بک تصویروں میں وہ کچھ دکھاتی ہے جو لوگ زبانی بتاتے ہیں..اس کے علاوہ کچھ ہدایات..کہ اباجی شناخت کے لیے اپنا پاسپورٹ بیگ میں ضرور رکھ لیں..کالوں سے ذرا دور رہیں اور گوروں بلکہ گوریوں کے زیادہ قریب نہ جائیں..خواہ مخواہ تصویریں نہ اتاریں اور راہ چلتے لوگوں کی جانب دیکھ کر مسکرائیں نہیں..کسی سے راستہ پوچھنا ہو تو اس کے قریب جاتے ہوئے اعلان کر دیں کہ میں محض آپ سے راستہ پوچھنے کے لیے آپ کے قریب آ رہا ہوں..آپ کو لوٹنا میرا مقصد نہیں ہے..کسی ریستوران میں سوپ ہرگز نہ پئیں کہ یہاں صرف سبزیوں کے سوپ میں بھی سؤر کی یخنی کی آمیزش ہوتی ہے..وغیرہ وغیرہ..

آج بھی اُس نے حسب معمول نہایت عمدہ آملیٹ بنا کر مجھے کھلایا جو نہایت مہارت

سے تیار کردہ تھا..

دراصل پچھلی شب جب اس نے ایک سگھڑ بی بی کی مانند ایپرن باندھ کر کچن میں میرے لئے چکن کڑھائی تیار کی جو نہایت ذائقے دار تھی اور میں نے توصیف کرتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ اس میں ادرک اور سیاہ مرچ بھی شامل ہوتی تو لطف دوبالا ہو جاتا تو اس نے کہا تھا کہ والد صاحب آپ مجھ سے اتنی مہارت کی توقع تو نہ رکھیں..

آملیٹ کھلانے کے بعد یونیورسٹی پہنچنے کی بھاگ دوڑ کے دوران اس نے پوچھا کہ ابّا جی آج آپ کہاں جائیں گے؟

''میٹروپالٹین میوزیم.. یا شاید میوزیم آف ماڈرن آرٹ.. یا شاید..''

تو وہ باقاعدہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا ''ابا جی خدا کے لیے یہ میوزیم بس کر دیں.. نیویارک کی کھلی فضا میں بھی کچھ سانس لیں.. ان عجائب گھروں میں آویزاں تصویریں اور مجسمے بھی آپ کو دیکھ دیکھ کر عاجز آ چکے ہوں گے.. ان پر کچھ رحم کریں اور آج تو کہیں اور چلے جائیں..''

''کہاں جاؤں؟''

''آج لبرٹی آئی لینڈ چلے جائیں.. سٹیچو آف لبرٹی دیکھنے کے لیے..''

''یار اسے تو میں دیکھ چکا..''

''کب؟''

''جب میں سٹیٹن آئی لینڈ جانے والی مفت کی فیری میں سوار ہوا تھا تو اس کے قریب سے ہو گزرا تھا اور میں نے اس کی چند تصویریں بھی اتار لی تھیں تاکہ سند رہے.. اب یہ کیا مجبوری ہے کہ بندہ پندرہ ڈالر خرچ کر کے صرف اسے ہاتھ لگانے کے لیے وہاں جائے''..

''خیر وہ آپ کو ہاتھ تو نہیں لگانے دیں گے کیونکہ بقول ان کے القاعدہ کی ہٹ لسٹ پر مجسمہ آزادی سرفہرست ہے.. لیکن ابا جی اسے پاس سے دیکھنا بہت ضروری ہے..''

''کیوں ضروری ہے.. لبرٹی آئی لینڈ کے جزیرے پر اتر کر ہی اسے دیکھنا کیوں اتنا اشد ضرورت ہے؟''

''ابا جی آپ نے پیرس میں آئفل ٹاور کو دور سے بھی اور قریب سے بھی بہت بار دیکھا اور اس کے باوجود آپ لفٹ پر سوار ہو کر اس کی آخری منزل تک گئے تھے ناں.. پیرس کے آسمانی

مناظر کو دیکھنے کی خاطر..''

''چہ نسبت؟''

''نسبت ہے ابا جی.. جیسے پیرس آئفل ٹاور کے بغیر ادھورا ہے ایسے ہی نیویارک کی واحد شناخت مجسمہ آزادی ہے.. اور ہاں وہاں سے واپسی پر آپ اپنے آج کے شیڈول میں ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ بھی شامل کر لیجیے..''

''دیکھو برخوردار.. تم کہتے ہو تو میں مجسمہ آزادی کے جزیرے میں چلا جاتا ہوں لیکن مجھے کچھ آرزو نہیں ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی آخری منزل پر جانے کی.. خاص طور پر اگر اس سعیٔ لاحاصل کے لیے پندرہ ڈالر کا زر کثیر خرچ ہو جائے.. میں اس کے سائے میں کھڑے ہو کر متعدد تصویریں اتروا چکا ہوں جو انشاءاللہ ملکی اخبارات میں ''تارڑ.. ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کے ساتھ'' کے عنوان سے چھپ جائیں گی تو اوپر جانے سے فائدہ..''

''ابا جی آپ کسی برطانوی کوہ پیما کا ایک قول ہمیں زبردستی سنایا کرتے تھے جس سے پوچھا گیا تھا کہ تم پہاڑوں پر اپنی جان داؤ پر لگا کر کیوں چڑھتے ہو تو اس نے کہا تھا کہ.. اس لئے کہ وہ وہاں ہیں.. تو ابا جی یہ بھی یہاں ہیں اس لئے آپ کو ان تک جانا چاہئے.. جیسے آپ اسلام آباد جاتے ہیں تو امام برّیؒ کے دربار پر حاضری دیتے ہیں.. سیہون شریف میں شہباز قلندرؒ کے مزار پر نہ جانا کیسا کفر ہوگا اور اگر لاہور میں ہیں تو داتاؒ صاحب کو سلام کیا کریں گے؟.. مجسمہ آزادی' ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ اور ٹائمز سکوئر نیویارک کے امام بری شہباز قلندر اور داتا صاحب ہیں.. حاضری ضروری ہے ابا جی..''

تو میں سلجوق کے اصرار پر کمربستہ ہو گیا ان زیارات کے لیے.. بلکہ کمرہ بستہ ہو گیا کہ میری کمر.. اب کمرہ ہو چکی تھی..

اور اب میں لبرٹی آئی لینڈ پہنچنے کے لیے زیرزمین ریلوے کے آخری سٹاپ ساؤتھ فیری تک پہنچنے کے لیے تگ و دو کر رہا تھا.. اس لئے کہ سب وے کی جانب سے ہر ڈبّے میں ایک اشتہار آویزاں تھا کہ اگر آپ نے آخری سٹاپ ساؤتھ فیری پر اترنا ہے تو آپ کو اس ٹرین کے پہلے پانچ ڈبّوں میں ہونا چاہئے.. بقیہ ڈبّے کہیں اور چلے جائیں گے..

یہی اعلان میری بھگدڑ کا سبب تھا..

میں ٹرین کے آخری ڈبوں میں سے ایک میں سوار تھا اور ہر سٹیشن پر اتر کر اگلے ڈبے میں پہنچ جانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا تھا..

اور میری خواری اور سراسیمگی نہایت جائز تھی.. میں نہیں جانتا تھا کہ میں ٹرین کے درجنوں ڈبوں میں سے کون سے ڈبے میں سوار ہوں.. مجھے تو پہلے پانچ ڈبوں میں ہونا چاہیے.. اسی لئے میں ہر سٹیشن پر اتر کر اگلے ڈبے میں سوار ہونے کے لیے مار دھاڑ کرتا تھا.. تا کہ ان پانچ ڈبوں میں سے کسی ایک کا مسافر ہو جاؤں..

اور ہاں اس سفر کے دوران ایک ڈبے میں آویزاں اشتہاروں کے چوکھٹے میں ایک اشتہار میرا منظور نظر ہوا اور وہ یہ تھا کہ کیا آپ اپنے آپ کو نامرد محسوس کرتے ہیں.. شرمندہ ہونے کی بجائے ہم سے رابطہ کریں آپ عش عش کر اٹھیں گے.. مجھے شدید خواہش تھی کہ میں اٹھوں تو عش عش کرتا اٹھوں لیکن بدقسمتی سے میں رابطے کا فون نمبر نوٹ نہ کر سکا.. اور آج تک عش عش کرنے سے محروم ہوں.. نیویارک سب وے کا یہ اشتہار دراصل سرکلر روڈ پر سانڈھے کا تیل اور سلاجیت بیچنے والوں اور ہر دیوار پر جلی حروف میں پینٹ کردہ ''مایوسی گناہ ہے'' قسم کے اعلانات سے چنداں مختلف نہ تھا.. اگرچہ قدرے تہذیب یافتہ تھا.. حیرت ہوئی کہ امریکیوں کو بھی اس نوعیت کی مردانہ کمزوریاں لاحق ہیں..

بالآخر یہ سب وے ایک سٹیشن میں داخل ہوئی اور سکوت میں چلی گئی.. سب مسافر اتر گئے.. میں نے ایک اہلکار سے نہایت عاجزی سے پوچھا کہ سر.. کیا میں اس ٹرین کے پہلے پانچ ڈبوں میں ہوں.. کیونکہ مجھے ساؤتھ فیری جانا ہے'' تو وہ نہایت سرد مہری سے کہنے لگا ''میں اس ٹرین کا ڈرائیور ہوں.. تم آخری ڈبے میں ہو.. اب تم نے اور کہاں جانا ہے.. یہی ساؤتھ فیری ہے..''

لبرٹی آئی لینڈ جانے کے لیے فیری کا ٹکٹ خرید کر میں سمندر میں ڈولتی فیری کی جانب کشاں کشاں گیا تا کہ فوری طور پر مجسمۂ آزادی کی زیارت کے لیے عازم سفر ہو جاؤں.. اور جب میں اس کے اندر اترتے ہوئے چوبی تختے پر پاؤں رکھنے کو تھا تو ایک خاصے بدتمیز اہلکار نے ہاتھ آگے کر کے کہا.. کہاں جا رہے ہو..

میں نے کہا ''لبرٹی آئی لینڈ جا رہا ہوں امریکہ کی دیوی دیکھنے.. میرے پاس ٹکٹ ہے..''

''تمہارا کیا خیال ہے یہ جو سینکڑوں لوگ قطار اندر قطار فیری میں سوار ہونے کے منتظر

ہیں ان کے پاس ٹکٹ نہیں ہیں..''

میں نے ایک بڑا ہجوم دیکھا تو تھا لیکن میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سب لوگ لبرٹی آئی لینڈ جانے کے لیے ڈھیلی ڈھالی قطاروں میں کھڑے ہیں اور یہ قطاریں بل کھاتی بیٹری پارک سے نکل کر ایک شاہراہ کے پار جا کر نیویارک کی عمارتوں میں کہیں اوجھل ہوتی جا رہی تھیں بلکہ وال سٹریٹ کے فٹ پاتھ پر بھی نظر آ رہی تھیں.. جی چاہا کہ اتنے طویل جھمیلے میں پڑنے کی بجائے مجسمۂ آزادی کی زیارت سے توبہ تائب ہو کر گھر کی راہ لوں لیکن یوں توبہ تائب ہو جانے میں پورے بارہ ڈالر کا خسارہ تھا جو میں ٹکٹ کے لیے صرف کر چکا تھا.. میں ایک مختصر سیر کرتا ان قطاروں کے پہلو میں چلتا بالآخر ان کے آخر تک پہنچا اور ہجوم کے اژدھے کی دُم جہاں اختتام کو پہنچتی تھی وہاں آخری زائر کے طور پر اپنی پوزیشن سنبھال لی.. یہ ایک نہایت بیزار کن اور لایعنی انتظار تھا' جس صنم کو میں دور سے دیکھ چکا تھا اس کے چرنوں کو چھونے کا اتنا چاؤ تو نہ تھا.. چند لمحوں میں ہی میں آخری زائر نہ رہا.. لوگ آتے رہے اور کارواں بنتا رہا.. اس دوران ویسٹ انڈیز سے آنے والا ایک سفید فام جوڑا میرے قریب آیا.. وہ دونوں شاید محبت کی وجہ سے یا محض اتفاق سے اتنے ہم شکل تھے کہ بہن بھائی لگتے تھے.. مرد نے جھجکتے ہوئے پوچھا ''کیا لبرٹی آئی لینڈ جانے والی فیری کے لیے یہی قطار ہے؟''

''مجھے امید تو یہی ہے..'' میں نے مسکرا کر جواب دیا..

''اگر یہ کوئی اور قطار ہوئی تو پھر میں کیا کروں گا'' وہ بھی مسکرانے لگا..

''آپ وہی کریں گے جو میں کروں گا..''

دراصل جہاں ہم تھے وہاں سے نہ فیری نظر آ رہی تھی اور نہ بیٹری پارک تو یہ عین ممکن تھا کہ یہ قطار کسی ایسے سٹور کی ہو جہاں زبردست سیل لگی ہوئی ہو اور ہم اس میں شامل ہو گئے ہوں اس لئے اس کی تشویش بجا تھی..

''بہر حال میں ایک پر امید شخص ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ وہی قطار ہے..''

پورے دو گھنٹے کے سفر کے بعد معلوم ہوا کہ ہاں یہ وہی قطار ہے..

قطار میں سرکنے کا یہ سفر بھی کچھ اتنا برا نہ تھا بلکہ مناسب حد تک دلچسپ تھا.. ایک خوب لشکا ہوا کالا کلوٹا سری لنکا کا خاندان تھا.. ان کا ایک نمائندہ قطار میں تعینات رہتا اور بقیہ بچے' فربہ

خواتین اور ایک بزرگ ذرا دور جا کر گھاس پر جا بیٹھتے اور کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے.. جونہی قطار میں کچھ حرکت کے آثار نمودار ہوتے وہ سب بھاگتے ہوئے اس میں شامل ہو جاتے..

اس انتظار کی کوفت اور بوریت کو دور کرنے کے لیے طرح طرح کے سامان تھے..اور ان میں دو فنکار نہایت بلند پائے کے تھے..

ایک صاحب جونسل کے ذرا ملے جلے تھے اپنے سامنے تام چینی اور پیتل کے کچھ برتن اور دیگچیاں اوندھے رکھے انہیں ایک چھڑی سے چھیڑتے اور بجاتے ایک جل ترنگ سا تخلیق کر رہے تھے.. نہایت مگن اور سنجیدہ.. قریب سے سرکتی قطار کی جانب کچھ دھیان نہ کرتے سر جھکائے ان دیگچیوں وغیرہ کو کھڑکا رہے تھے.. یہ کوئی مقامی کھڑک سنگھ تھے جن کے کھڑکانے سے کھڑکتی تھیں دیگچیاں.. البتہ ان کا کھڑاک واقعی سُر میں تھا.. یہ موسیقی شاید ویسٹ انڈیز کی روایتی کولپسو موسیقی کی کوئی چھوٹی بہن وغیرہ تھی جس میں دھات کے تھال اور دیگچے وغیرہ اوندھے کر کے انہیں دھما دھم پیٹا جاتا ہے اور نہایت روح افزا اور تھرکنے والی ایسی موسیقی تخلیق کی جاتی ہے جس کے اثر سے انسان تو کیا پرندے بھی جھومنے لگتے ہیں.. شرط یہ ہے کہ وہ انسان اور پرندے ویسٹ انڈیز کے ہوں.. یہ صاحب نہایت محو ہو کر ایک عبادت گزار کی مانند سر جھکائے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرتے رہتے اور پھر سر اٹھاتے اور قطار میں رینگنے والے سیاحوں سے مخاطب ہو جاتے ''میری مجبوری ہے کہ میں یوں برسرِ عام اپنے فن کا مظاہرہ کروں.. لیکن ٹھہریے میں اپنے فن سے صرف غربت کی وجہ سے انصاف نہیں کر پا رہا.. میں جس قسم کی موسیقی تخلیق کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے بڑے بڑے برتن اور دیگیں وغیرہ درکار ہیں جن پر میری چھڑی کی ضرب پڑے تو ان میں گونج پیدا ہو جو پورے نیویارک پر حاوی ہو جائے.. لیکن اس غربت کا کیا کروں کہ مجھ میں استطاعت نہیں کہ میں اتنے بڑے برتن خرید کر موسیقی کی دنیا میں انقلاب برپا کر دوں.. اس لئے یہ چھوٹے چھوٹے برتن اور دیگچیاں بجا کر اپنا شوق پورا کرتا ہوں.. اگر آپ موسیقی کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں تو کچھ مدد فرمائیں تاکہ میں کم از کم ایک بڑا سارا تانبے کا دیگچہ خرید کر فن کی بلندیوں کو چھولوں..''

وہ شخص واقعی سُر تال کی پہچان رکھتا تھا.. میرے سامنے سیاحوں نے دل کھول کر اتنی مدد کی وہ با آسانی متعدد دیگچے خرید کر فن موسیقی کی خدمت کے علاوہ شادی بیاہ کے موقعوں پر کیٹرنگ کا

کاروبار بھی کر سکتا تھا..

ایک خوش شکل اطالوی فنکار بھی اپنے جوہر دکھا رہا تھا.. اور اس کا جوہر صرف یہ تھا کہ اس نے اپنے ٹیپ ریکارڈر پر کوئی مقبول اطالوی گیت بلند آہنگ میں لگا رکھا تھا اور وہ نہایت عمدہ اداکاری کرتے ہوئے اس کی دھن پر لب ہلا رہا تھا جیسے ہمارے ہاں کے پاپ سنگرز کا وطیرہ ہے.. چنانچہ اس قطار میں جتنے بھی اطالوی نژاد سیاح تھے اور وہ خاصے تھے وہ سب جذباتی ہو رہے تھے اور ایک قومی فریضے کے طور پر اس اطالوی بھائی کے سامنے رکھے ہوئے ڈبے کو ڈالروں سے لبریز کر رہے تھے..

ایک نہایت عمدہ جگت باز بھی کھڑے تھے.. ہاتھ ملتے.. مسکراتے.. سیاحوں پر چوٹیں کرتے.. پھبتیاں کستے.. فقرے لگاتے اور انہیں مسکرانے کے علاوہ کچھ نہ کچھ دے جانے پر مجبور کرتے..

یہ جگت باز صاحب ہمارے لاہوری تھیٹر کے فقرہ باز مزاحیہ اداکاروں سے کسی طور کم نہ تھے.. عوام الناس تو تھیٹر اور ٹیلی ویژن پر کام کرنے والوں کو اور ان میں یہ خاکسار بھی شامل ہے میراثی ہی کہتے ہیں لیکن یہ میراثی چونکہ امریکی تھے اس لئے آرٹسٹ اور انٹرٹینر کہلاتے تھے..

ان صاحب کی اکثر جگتیں جو عوام الناس میں پذیرائی حاصل کر رہی تھیں اور قہقہے تخلیق کر رہی تھیں وہ جنس سے متعلق تھیں چنانچہ ان کے بیشتر فقرے یہاں درج نہیں کئے جا سکتے کہ ان میں عریانی اور فحاشی کا عنصر تناؤ میں آ جاتا ہے.. چونکہ میں ایک پاکستانی ادیب ہوں اور پاکستان میں میراتھون ریس کو بھی عریانی اور فحاشی قرار دے کر اسے روکنے کے لیے شہید ہو جانے کی تمنا کی جاتی ہے.. اگرچہ صرف تمنا کی جاتی ہے.. تو میں اس امریکی جگت باز کے بیشتر فقروں کو سنسر کرتے ہوئے نسبتاً کم فحاشی کی کچھ مثالیں پیش کر دیتا ہوں..

''ہے لیڈی..'' وہ قطار میں کھڑی کسی ایک قدرے صحت مند خاتون سے مخاطب ہو رہے ہیں'' ہے لیڈی.. تمہاری چھاتیوں کا وزن اتنا زیادہ ہے کہ تمہیں اس فیری میں سوار ہونے کے لیے دو ٹکٹ خریدنے چاہئیں..''

ایک نہایت منہ بسورتے امریکی سے کہتے ہیں'' ہے مسٹر.. تم اتنے رنجیدہ کیوں ہو.. اگر پچھلی شب کچھ نہیں ہو سکا.. تو آج شب ہو جائے گا.. اگر تم مجھے دو ڈالر دے جاؤ گے.. نہیں دو گے تو

پھر شرمندگی ہوگی.،''

''ہے لیڈی..تم میری بہن کی مانند ہو..لیکن تم خطرے میں ہو.تمہارے پیچھے قطار میں جڑا ہوا جو مرد ہے اگر تم احتیاط نہیں کرو گی تو اسے محسوس کرو گی.،''

چلیں تو کٹ ہی جائے گا سفر..آہستہ آہستہ..

تو یہ سفر بھی..آہستہ آہستہ ان مہربان فنکاروں کی وجہ سے کٹ ہی گیا..

اور ہاں..جہاں سے وہ شہر تمنا..وہ چاند نگر..یعنی لبرٹی آئی لینڈ کو جانے والی فیری بالآخر نظر آنے لگی وہاں بیٹری پارک میں مجسمہ آزادی کی ایک نقل بہ مطابق اصل ساکت کھڑی تھی..برابر میں آویزاں ایک بورڈ پر لکھا تھا ''مجسمہ آزادی کے ہمراہ اپنی پسند کے مطابق تصویر اتروائیں.،''

یہ سلسلہ بھی ایک تازہ ترین اختراع ہے۔امریکہ اور کینیڈا میں کسی سیاحتی مقام پر..کسی چوک میں یا بندرگاہ کے کنارے ایک بُت بنا کھڑا ہے..ساکت اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے کائنات پر غور کرتا ایک ہنری مور کا مجسمہ ساکت ہے اور جونہی آپ اس کے قریب سے گزرتے ہیں وہ ''ہاؤ'' کر کے آپ کے اوسان خطا کر دیتا ہے کہ آپ اسے ایک بُت ہی سمجھ رہے ہوتے ہیں..یہ ان خطوں کے بہروپئے ہیں..آپ خوش ہو کر انہیں ایک دو ڈالر دے جاتے ہیں..ہمارے ہاں بھی ایک زمانے میں بہروپئے ہوا کرتے تھے..پھر یہ ہوا کہ بہروپ اور روپ میں کچھ فرق نہ رہا تو یہ بہروپئے اوجھل ہو گئے..وہ کبھی مونچھیں لگا کر..ہیٹ پہن کر انکم ٹیکس کے انسپکٹر بن کر آ جاتے..کبھی تھانیدار بن کر گرجتے ہوئے آپ کا دل دہلا دیتے اور کبھی آپ کے کوئی دور دراز کے رشتے دار بن کر..نہایت متانت سے اپنے بھائی یعنی والد صاحب کا حال چال پوچھتے یا پھوپھی جان کے انتقال پُر ملال پر آنسو بہانے لگتے اور پھر فوراً ہی..کھڑے ہو کر آپ کو سلام کرتے اور ''بھاگ لگے رہیں..آل اولاد جیوے..ستے خیراں'' کا الاپ کرنے لگتے اور سوالی ہو جاتے..تو یہ بہروپئے بھی ان کے امریکی یا کینیڈین عزیز ہوتے ہیں..

ہمارے ہاں اب یہ بہروپئے معدوم ہو چکے ہیں..

نئی نسل ان کے بہروپ سے ناواقف ہے..

دراصل اُن دنوں سارے کا سارا معاشرہ روپ میں ہوتا تھا اور کوئی ایک بہروپ بھرتا

تھا..اور ان دنوں ہر کوئی بہروپ میں ہو گیا ہے تو ان بہروپیوں کی گنجائش نہیں رہی..

یہاں جو شخص مجسمہ آزادی کا بہروپ بھرے سیاحوں کو متوجہ کرتا تھا وہ سر پر ایک پلاسٹک سے بنا ہوا تاج پہنے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی ہی ایک ڈنڈا نما مشعل تھی..

اگر سیاح مرد ہے تو وہ دانت نکالتا مجسمہ آزادی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تصویر اتروا رہا ہے..

اور اگر وہ خاتون ہے تو وہ اس بُت کو جس کے اندر ایک انسان ہے بوسے دے رہی ہے..اس سے ہم آغوش ہوتے ہوئے تصویر اتروا رہی ہے..جانے اس بُت پر اس مسلسل ہم آغوشی کے نتیجے میں..اس کے زندہ بدن پر..کیا کیا گزرتی ہوگی..کون کون سی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہوں گی' یہ ہم نہیں صرف بُت جانتا ہے..

بہروپ کی ہمیشہ قدر ہوتی ہے..

اور روپ کے ماتھے پر کبھی بھاگ نہیں لکھے جاتے..

قطار کے آخر میں وال سٹریٹ پر کھڑا آخری سیاح بھی جب لبرٹی آئی لینڈ کی فیری میں سما جاتا ہے تو وہ ایک دھچکے سے ساحل کو پرے کرتی رواں ہو جاتی ہے لیکن وہ سیاح یونہی نہیں سما جاتا..اس کی جامہ تلاشی ہوتی ہے..بیگ تلاشی اور جیب تلاشی ہوتی ہے..بیلٹ اتروائی جاتی ہے..جیکٹ اتروائی جاتی ہے اور بوٹ اتروا لئے جاتے ہیں جنہیں اپنی معصومیت کی گواہی دینے کے لیے مشینوں میں سے گزرنا ہوتا ہے اور نیویارک ایئر پورٹ سے بھی کئی گنا شدید احتیاط کی وجہ یہی ہے کہ القاعدہ نے' بقول امریکیوں کے مجسمہ آزادی کو بھی ہدف بنا رکھا ہے..

فیری میں داخل ہوتے ہی ہر سیاح کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ نچلی منزل میں بند نہ رہے بلکہ فی الفور عرشے پر پہنچ کر کھلے آسمان تلے ریلنگ سے لگ کر دور ہوتے نیویارک کی اثر انگیز سکائی لائن دیکھ سکے اور یوں قدرے دھکم پیل بھی وجود میں آتی ہے..

جونہی یہ فیری ساحل کو ایک دھچکے کے ساتھ پرے کر کے سمندر میں رواں ہوتی ہے تو نیویارک شہر بھی دھیرے دھیرے پرے ہونے لگتا ہے..آپ بے شک اس کے درمیان زندگی کرتے رہیں..ساری زندگی کرتے رہیں تب بھی آپ جان نہ پائیں گے..یہ شہر ذرا اک فاصلے

سے.. پرے ہوکر..اک دوری ہونے سے کیسا دکھائی دیتا ہے اور وہ ایسا اس فیری سے دکھائی دیتا ہے..

پہلے تو اس کی عمارتیں..دنیا کی بلند ترین اور خوش شکل عمارتیں..یعنی پہلے دھچکے کے بعد ساحل سے جدا ہوتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ پر اُمڈی چلی آ رہی ہیں آپ پر گرنے کو ہیں اور پھر چند ہی لمحوں بعد ان کے اور آپ کے درمیان سمندر حائل ہو کر وسیع ہونے لگتا ہے..اور یہی وہ لمحہ ہے جب آپ ایک شان بے نیازی سے ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے زبردستی مسکراتے ہوئے نیویارک سے منہ موڑے بہرصورت ایک تصویر اترواتے ہیں جو گواہی دیتی ہے کہ آپ واقعی کبھی نیویارک میں تھے کہ پس منظر میں اس شہر کا آسمانی افق بلند ہوتا چلا جاتا ہے..

عرشے پر پُرشوق مسافروں کا ایک ہجوم تھا..

اُن میں ایک بظاہر امریکی اگرچہ پوشیدہ پاکستانی لڑکی بھی ہے..سیاہ چشمہ میں..سمندر کی تیز ہوا میں اڑتے سیاہ بالوں والی ایک لڑکی..جس نے معمول کے مطابق جین کے اوپر ایک مختصر سا بلاؤز پہنا ہوا ہے جس میں سے اس کے گندمی رنگ کے پُرکشش بازو نمایاں ہو رہے ہیں..اس کی بغلوں کی ہمسائیگی میں وہ بلاؤز ذرا کم ہے اور کھنچا ہوا ہے کہ وہاں سے ابھار کا جو ابتدائی اظہار ہے وہ قدرے سرکش ہو رہا ہے..اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر لاتعلق ہوگئی..اور میں اس بے وجہ لاتعلقی سے جان گیا کہ اس نے کسی نہ کسی حوالے سے مجھے پہچان لیا ہے..ہم لوگ اتنے کائیاں ہو چکے ہوتے ہیں کہ اگر سینکڑوں لوگ ہماری جانب نگاہ کریں تو ہم تجربے کی بنا پر فوراً جان جاتے ہیں کہ ان میں وہ ایک کون سی نگاہ ہے جس میں پہچان کی پرچھائیاں ایک لمحے کے لیے تیری تھیں اور پھر جان بوجھ کر لاتعلقی کا پردہ تان لیا گیا ہے..جانے وہ کون تھی!

اسے دیکھ کر مجھے ایک اور لڑکی یاد آ گئی..

جو ابھی ابھی مجھے ملی تھی..

اور اس نے لاتعلقی نہیں برتی تھی بلکہ تعلق کی جانب بڑھی تھی..

ابھی نیویارک سب وے میں..ساؤتھ فیری سٹیشن کی جانب سفر کرتے ہوئے..آخری پانچ ڈبوں میں سوار ہونے کی بھگدڑ میں ابھی ایک لڑکی کا سامنا ہوا تھا..لڑکی تو نہیں ایک بھرے

بدن کی عورت سے سامنا ہوا تھا..میں اس لمحے گاڑی کے رکتے ہوئے اپنے ڈبے سے اتر کر اگلے ڈبے میں سوار ہونے کو تھا جب وہ مسافروں کے ہجوم کو دھکیلتی..ڈھیلی پتلون اور پھولدار بلاؤز میں..ناک میں شاید ایک تھلی اور کانوں میں جھمکے..گندمی رنگ میں رنگی ہوئی ہانپتی ہوئی مجھ تک آئی ''آپ مستنصر ہیں''؟

''جی ہاں'' مجھ میں اگلے ڈبے میں سوار ہونے کی افراتفری تھی..

''آپ یہاں..نیویارک میں..'' وہ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی کہ ٹرین میں سوار ہونے والوں کا ہجوم اسے دھکیلتا تھا..

اور میں اگلے ڈبے کی جانب بڑھتا ہوا ''جی جی..اور آپ..میں ذرا جلدی میں ہوں''

''میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں..''

میں نے کچھ معذرت سی کی کہ میں رک نہیں سکتا..اور ڈبے کے اندر چلا گیا..ٹرین حرکت میں آ گئی اور وہ جھمکوں والی اور تھلی والی عورت پلیٹ فارم کے ساتھ پیچھے رہ گئی..جیسے مدتوں پہلے پیرس کے ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر پاسکل نام کی لڑکی رہ گئی تھی..پاکستان میں تو سو پچاس لوگوں میں سے کسی ایک کے چہرے پر پہچان کے شائبے جنم لے ہی لیتے ہیں..یہ ایک معمول تھا..لیکن یہاں..نیویارک میں..جہاں..میں اجنبی تھا..بے نشان تھا..

نہ رفعت مقام ہے..نہ شہرت دوام ہے..

یہ لوحِ دل..یہ لوحِ دل..

نہ اس پہ کوئی نقش ہے..نہ اس پر کوئی نام ہے..

تو یہاں اگر سب وے کے ایک سٹیشن پر ایک گندمی رنگ میں رنگی..عورت کے چہرے پر میری پہچان کے نشان ملتے ہیں تو مجھے رک جانا چاہئے تھا، اس سے بات کر لینی چاہئے تھی، ناشکری نہیں کرنی چاہئے تھی..بے شک وہ مجھ سے کہتی کہ..انکل آپ نیویارک میں کیا کر رہے ہیں یا میں نے آپ کا فلاں ٹیلی ویژن پروگرام دیکھا تھا یا فلاں کتاب پڑھی تھی یا یہ کہ آپ اتنے بھدے اور معمولی سے کیوں ہیں اور آپ کی جین آپ کی توند سے بار بار کیوں کھسکتی ہے تو مجھے رک جانا چاہئے تھا..

مجھے نہیں معلوم کہ نیویارک سب وے کے غالباً پین سٹیشن پر جس خاتون نے مجھ سے کہا

تھا کہ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں تو وہ ادب کی رسیا ہے یا نہیں.. اسے کتاب سے شغف ہے بھی کہ نہیں. لیکن محض اتفاق سے اگر وہ یہ "نیویارک کے سو رنگ" پڑھ لے تو میں اس سے کہنا چاہوں گا کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا.. بات کرنی مجھے بھی ایسی مشکل تو نہ تھی.. میں محض نیویارک کی افراتفری کا شکار تھا اور اگلے ڈبے میں سوار ہونے کی سراسیمگی میں بات کیے بغیر چلا گیا تھا..

لبرٹی آئی لینڈ تک کا سمندری سفر ان ڈالروں سے کہیں زیادہ مختصر تھا جو میں نے اس سفر کے لیے بہائے تھے..

مجسمہ آزادی کا ذاتی جزیرہ.. لبرٹی آئی لینڈ.. جہاں وہ راج کرتی تھی.. امریکہ کے خدا کی حیثیت سے راج سنگھاسن پر براجمان تھی.. بلکہ کھڑی تھی..

ہمیں صرف اس کے چرنوں تک جانے اور وہاں اس کے اردگرد گھوم کر پھیرے لگانے اور تصویریں اتروانے کی اجازت تھی.. نہ تو ہم اس کے بلند چبوترے تک جا سکتے تھے جہاں اس کے پاؤں مستحکم تھے کہ یہ سہولت اس زیارت کے پہلے سو ٹکٹ خریدنے والے زائرین کو ہی نصیب ہوتی ہے اور وہاں سے اوپر جہاں کسی زمانے میں لوگ اس کے چہرے تک لفٹ کے ذریعے پہنچ کر اس کا طواف کرتے آس پاس کے سمندری منظر اور شہر نیویارک کے فضائی نظارے کرتے تھے اور پھر چہرے سے بلند ہو کر اس کے ہاتھ میں تھامی ہوئی مشعل تک پہنچ جاتے تھے اور اس کے پھیرے لگاتے تھے.. تو ہم نہ لگا سکتے تھے.. برا ہو القاعدہ والوں کا جن کی دہشت سے ہم ان مقامات مقدسہ کی زیارت کی سعادت سے محروم کر دیئے گئے..

بیشتر زائرین اس امریکی خدا پر ایک نظر ڈال کر.. یعنی اپنی دستار تھام کر اس پر نظر کرتے تھے کہ نظر کو اس کے الوہی چہرے تک پہنچنے کے لیے خاصا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا تو وہ ایک نظر ڈال کر اس کے چرنوں میں کھڑے ہو کر اپنی تصویریں اتروانے لگتے..

یہ تصویر بھی ایک لعنت ہے..

یہ آپ سے آپ کے خواب چھین لیتی ہے.. وہ ذہن کے بجائے انہیں کاغذ پر منتقل کر کے آپ کو اس چہرے، اس منظر سے ہمیشہ کے لیے بیگانہ کر دیتی ہے.. آپ نے مسجد قرطبہ میں.. تاج محل کے سامنے، آئفل ٹاور یا مجسمہ آزادی کے سائے تلے ایک تصویر اتروالی تو گویا یہ

سب عجوبے آپ کے لیے بیکار ہو گئے.. آپ نے ان کو ایک تصویر میں قید کر لیا تو پھر ان کی کوئی وقعت نہ رہی.. جہاں تک آپ کا تعلق ہے وہ کیمرے کا بٹن دبنے کے بعد بے شک مسمار ہو جائیں بلکہ ہو جائیں تو پھر آپ اس تصویر پر زیادہ فخر کریں گے کہ یہ دیکھئے آئفل ٹاور کے زمیں بوس ہو جانے سے پہلے کی تصویر..

تصویر میں کسی لمحے کو قید کرنے کا سب سے بڑا نقصان اُس لمحے کو ہوتا ہے کہ وہ جامد ہو جاتا ہے.. پہلے وہ ایک متحرک صورت میں آپ کے ذہن کی سکرین پر چلتا ہے چاہے اس کے نقش ماند پڑتے جا رہے ہوں.. مجسمہ آزادی کے اردگرد گھومتے لوگ یاد میں چلتے پھرتے زندہ رہتے ہیں اور تصویر اترتے ہی وہ سب مردہ اور ساکت ہو جاتے ہیں.. اسی لئے غار حرا میں ایک رات بسر کرنے کے لیے جب میں جبل نور پر چڑھ رہا تھا تو میرے تھیلے میں کیمرہ نہ تھا.. کہ میں اس رات کو تصویروں میں ساکت نہیں کرنا چاہتا تھا.. اس لئے وہ رات آج بھی اپنے موسموں اور چاندنی کے متحرک جزیروں سمیت زندہ ہے..

اس امریکی دیوی کو میں نے ہزار بار دیکھا تھا. تصویروں، فلموں، پوسٹروں، ڈاک کے ٹکٹوں اور ٹی شرٹوں پر.. تو اب صرف یہ ثابت کرنے کے لیے میں سچ مچ اس کے قدموں میں تھا.. میں نے بھانت بھانت کے لوگوں سے درخواستیں گزار کر.. ایک مسکین شکل اور لسی مانگنے والیوں کی فقیرانہ مسکراہٹ کے ساتھ التجا کی کہ.. پلیز میری ایک تصویر اتار دیجیے.. تھینک یو.. میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں..

یہ ایک پرشکوہ وجود تھا جو نیلے آسمان میں بلند ہوتا چلا جاتا تھا.. اس کی شانداری میں کوئی شبہ نہ تھا..

اسے آپ نہایت آسانی سے دنیا کا سب سے زیادہ.. آشنا صنم کہہ سکتے ہیں.. مشہور ترین بُت قرار دے سکتے ہیں، ابوالہول کے مجسمے کے علاوہ.. کسی حد تک دنیا کے کچھ خطوں اور وہاں کے لوگوں کے لیے یہ بھی ایک ابوالہول ہے.. ڈر کا باپ ہے.. کہ چاہے وہ ویت نام ہو.. عراق، افغانستان یا ابوغریب یا گوانتانامو بے ہو، وہاں جب ایک امریکی فوجی ہلاکت خیز اسلحے سے لیس اس میں اپنی بزدلی پوشیدہ کئے ایک قیدی ایک شہری کی جانب بڑھتا ہے تو اس قیدی، اس شہری کو اپنی جانب بڑھنے والے اس فوجی کی آستین میں یہی بُت.. یہی مجسمہ آزادی ایک ابوالہول کی

صورت نظر آتا ہے..

بے شک یہ دنیا کا سب سے جانا پہچانا بُت ہے پر اسے آپ کتنی دیر دیکھ سکتے ہیں.. یہ وہ صنم نہیں جس کی چاہت میں مبتلا ہو کر آپ رانجھے ہو جائیں، جوگی ہو جائیں اور نہ ہی یہ کوئی ایسا بت طناز ہے جو آپ کے من مندر میں ہمیشہ کے لیے براجمان ہو جائے.. چنانچہ آپ اس کے گرد طواف کرتے ہیں' دو چار تصویریں اترواتے ہیں.. بیگ میں سے ایک سینڈوچ نکال کر نوش کرتے ہیں' ایک سگریٹ پیتے ہیں اور پھر واپس فیری میں آبیٹھتے ہیں..

لبرٹی آئی لینڈ میں اس مختصر قیام کے دوران دو چار لمحے مسرت کے بھی آئے اور یہ ان دو چار پاکستانی امریکیوں کی دین تھے جو شکاگو سے چھٹیاں منانے کے لیے نیویارک آئے ہوئے تھے.. ایک صاحب مجسمۂ آزادی کے سامنے بُت بنے کھڑے ہیں اور دوسرے تصویر اتار رہے ہیں..

"اوئے یار.. ہلو نہیں. حرکت نہیں کرو.."

"میں نہیں ہل رہا. حرکت نہیں کر رہا.."

"تو اور کیا تمہارے پیچھے مجسمۂ آزادی حرکت کر رہا ہے.."

"اوئے یار کیا پتہ.."

اب یہی صاحب کیمرہ بردار اپنے ایک ساتھی کو کہتے ہیں "تم نے تصویر اتروانی ہے؟"

وہ جانے کیوں بیزار سے ہیں کہتے ہیں "نہیں اتروانی.."

"کیوں؟"

"بس میری مرضی..

مجھے اس مجسمۂ آزادی سے کچھ دلچسپی نہیں.."

"اوئے تمہاری پھوپھی لگتی ہے تصویر اتروالو.."

"بکواس نہیں کرو.."

"چلو پھر خالہ ہی سہی. تصویر اتروالو میری جان.."

فیری لبرٹی آئی لینڈ سے رخصت ہوتی ہے تو حسب توقع ناک کی سیدھ میں سیدھی

مین ہاٹن نہیں جاتی بلکہ ذرا رخ بدل کر ایک اور جزیرے پر جا رکتی ہے.. کیوں رکتی ہے؟ اس لیے کہ امریکہ کے طول و عرض میں جتنے بھی لوگ آباد ہیں.. پولینڈ، روس، اطالیہ، انگلستان یا جرمنی وغیرہ کے' تو ان سب کے آباؤ اجداد ایلس آئی لینڈ کی سوئی کی نوک میں سے گزر کر امریکہ میں اترے تھے..

یہ امریکہ میں داخل ہونے کا واحد راستہ تھا..

تارکین وطن کی کشتیاں اور بحری جہاز یہیں لنگر انداز ہوتے تھے.. ایک نئی دنیا کا خواب دیکھنے والے.. غربت اور فاقوں کے مارے ہوئے. عسرت اور تنگ دامنی سے عاجز.. اور ان میں مفرور مجرم قاتل اور لٹیرے بھی تھے.. ذلتوں کے مارے لوگ بھی تھے.. ایسے نابغۂ روزگار بھی تھے جن کی قدر نہ ہوئی.. مہم جو اور آوارہ گرد بھی تھے.. اور وہ بھی جنہیں اپنے ملکوں میں اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی نہ تھی اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا..

یہ سب لوگ.. معدودے چند کے علاوہ.. اپنے بوسیدہ پیراہنوں.. فاقہ زدہ بچوں اور مردہ آنکھوں سمیت.. اپنی پوٹلیاں، گٹھڑیاں، ادھڑتے ہوئے سوٹ کیس اٹھائے اس نئی دنیا میں آئے تھے تو اسی ایلس آئی لینڈ میں اترے تھے..

میں بھی اس جزیرے میں اترا لیکن مجھے اس میں کچھ خوشنمائی جو جزیرے کے نام سے خوش نظر ہوتی ہو نظر نہ آئی.. سامنے ایک معمولی نوعیت کی عمارت تھی جس کے پہلو میں فیری نے لنگر ڈال دیئے..

مجھے اس عمارت سے کچھ توقع نہ تھی.. فیری میری مرضی کے خلاف یہاں رک گئی تھی اس لیے مجھے رکنا پڑ رہا تھا اور میں جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے فیری سے باہر آتے ہوئے عرشے پر کھڑے ایک ملاح سے پوچھا "یہ فیری اس جزیرے میں کتنی دیر رکی رہے گی.."

"دس منٹ.."

"اگر میں یہاں دس منٹ سے زیادہ رکنا چاہوں تو.."

"آدھے گھنٹے کے بعد ایک اور فیری آجائے گی جس پر سوار ہو کر تم واپس نیویارک جا سکتے ہو.."

وہ بیزار سا اور بہت تنومند ملاح سفید فام نہ لگتا تھا.. اس کی دائیں مٹھی میں وہ گول چھوٹا

سا کیلکولیٹر تھا جسے اِن دنوں تسبیح کرنے کے لیے کلک کلک کیا جاتا ہے.. اس کا انگوٹھا اس کے بٹن پر مسلسل دباؤ ڈال رہا تھا.. وہ نہ اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور نہ ہی ظاہر کر رہا تھا.. وہ جانے کس خطّے سے آ کر یہاں آباد ہوا تھا لیکن شکل سے کچھ مسلمان لگتا تھا.. اس نے مجھ میں کچھ دلچسپی ظاہر نہ کی صرف معلومات فراہم کیں اور میری نظر اس کی میکانکی تسبیح پر ٹھہری ہوئی تھی..

فیری کے سامنے جو معمولی سی عمارت تھی اور جس میں سیاح نہایت اشتیاق سے چلے جا رہے تھے ایک عجائب گھر تھی..

بلند چھتوں والے.. جہاں آوازیں گونجتی تھیں.. مرکزی ہال میں وہ پوٹلیاں' گٹھڑیاں' بوسیدہ سوٹ کیس' چوبی صندوق اور تھیلے وغیرہ نمائش پر تھے جنہیں تارکین وطن گھسیٹتے ہوئے اس دنیا میں داخل ہوئے تھے..

یہاں پر ان کی شناخت کی کارروائی ہوتی.. امریکہ میں داخلے اور قیام کے سرکاری کاغذات قانون کے مطابق تیار کیے جاتے.. اس دوران ان کی عارضی رہائش کا بندوبست بھی اسی عمارت میں کیا جاتا اور پھر وہ یہاں سے نکل کر پورے امریکہ میں.. جہاں جس ریاست میں ان کا کوئی عزیز ہوتا.. جہاں انہیں خبر ملتی کہ سونے کی کانیں ہیں.. قابل کاشت زمین ہے یا جہاں بڑی صنعتیں ظہور پذیر ہو رہی ہیں.. وہاں وہ بکھر جاتے..

عہد رفتہ کے اس میوزیم میں سپیکرز پر یہ کہانیاں سنائی جا رہی تھیں اور اس عہد کی قدیم موسیقی بج رہی تھی.. اور ایک بڑی سکرین پر ان مہاجرین کی آمد کے مناظر دکھائے جا رہے تھے..

یہاں.. پچھلے سو دو سو برسوں میں داخل ہونے والی جتنی اقوام کے لوگ آئے ان کی تعداد کے پیمانے درج تھے.. میں نے نوٹ کیا کہ ابتداء میں بس گورے ہی گورے تھے.. کالے' بھورے یا زرد نہ ہونے کے برابر تھے.. پھر ایک تبدیلی رونما ہوتی ہے.. پچھلے ساٹھ ستر برسوں کے دوران ایشیائی اور افریقی باشندوں کی آمد نمایاں ہونے لگتی ہے.. اور امریکہ کے سفید آٹے میں ملاوٹ ہونے لگتی ہے اور وہ قدرے بھورا ہونے لگتا ہے بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ اس کی ناک چپٹی ہونے لگتی ہے کہ ان میں چینیوں کی اکثریت ہے.. شاید یہ بھی امریکہ کی ایک مجبوری تھی..

ان کے پرانے غلام آزاد ہو کر سرکش ہو گئے تھے.. وہ غلامی کے جکڑے ہوئے جبڑوں سے آزاد ہو گئے تھے اور اب ماضی کے مالکوں کو آنکھیں دکھاتے تھے..

چنانچہ امریکہ کو نئے غلاموں کی ضرورت تھی.. اس لئے ایشیا اور افریقہ کے لیے بھی دروازے کھول دیئے گئے.. یہ لوگ مشقتی اور فرمانبردار تھے.. اطاعت کرتے تھے اور سر جھکا کر چلتے تھے.. اور وہ سارے کام کرتے تھے جو گورے نہ کرتے تھے اور سیاہ فام آزاد ہونے کے بعد نہ کرتے تھے.. یہ لوگ شکایت نہ کرتے تھے.. ہر زیادتی سہہ جاتے تھے.. قانون کا احترام کرتے تھے اور ڈرے ڈرے رہتے تھے..

یہ امریکہ کے نئے غلام تھے..

یہ نئے غلام اب گوروں پر حاوی ہو رہے ہیں..

پہلے وہ ان کے آٹے میں نمک تھے اور اب بڑے شہروں میں وہ خود آٹا تھے اور گورے نمک ہو رہے تھے..

کم از کم ایک بار ایسا ہوا کہ نیویارک سب وے کے جس ڈبے میں میں سوار تھا وہاں حسب عادت میری نظر نے ہر مسافر کے چہرے پر سفر کیا اور اس کے ناک نقشے اور رنگت کو آنکھوں میں نقش کیا تو ان سب میں کوئی ایک بھی گورا چہرہ نہیں تھا.. لیکن وہ سب امریکی تھے.. اگرچہ ان میں میرے خطے کے لوگ کم کم تھے..

میں نے امریکہ کے اس گیٹ وے.. اس ایلس آئی لینڈ کے عجائب گھر کو تفصیل سے نہ دیکھا.. ذرا تیز تیز چلتے شتابی سے فارغ کیا اور نیویارک لوٹنے والی اسی فیری کی قطار میں شامل ہو گیا جو ہمیں لبرٹی آئی لینڈ سے یہاں لے کر آئی تھی..

داخلے پر وہی بہت تنومند سفید فام نہ لگتا ملاّح کھڑا تھا.. وہ ابھی تک اس کیلکولیٹر کو مٹھی میں تھامے اس پر انگوٹھے کا بوجھ ڈالتے کلک کلک کرتا جا رہا تھا. مجھے پھر سے دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آئی جو شناسائی کی تھی جو کہتی تھی کہ ہاں تم جان گئے ہو کہ میں کون ہوں اور کس کی تسبیح کر رہا ہوں اور میں بھی جان گیا ہوں کہ تم کون ہو تو اس پہچان کو زبان دینے سے فائدہ.. یہ میرے اور تمہارے لئے اچھے زمانے نہیں ہیں.. بس چپ رہو کہ اسی میں تمہاری بھی اور میری بھی عافیت ہے..



''ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ...اَین افیئر ٹُو ریممبر''

دنیا کی راج دھانی..کی راج دھانی..

دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب نے اپنے آپ کو دوسروں سے برتر ثابت کرنے کے لیے اور اپنی انا کی تسکین کی خاطر اور اپنے تکبر کے غبارے میں پھونکیں بھرنے کے لیے کیسے کیسے مفروضے گھڑ رکھے ہوتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ ان پر یقین بھی کرنے لگتے ہیں اور ان پر ایمان لے آتے ہیں..بس یہیں سے تاریخ کا فراڈ شروع ہو جاتا ہے..

کس قوم اور کون سے مذہب نے اپنی برتری کی خاطر کیسے کیسے مفروضے گھڑے ہوئے ہیں اس کی تفصیل میں جانے کے لیے دنیا کا آدھا کاغذ درکار ہے..اور اس میں سے نصف کاغذ صرف ہم مسلمانوں اور پاکستانیوں کو درکار ہوگا اور بقیہ نصف سے باقی دنیا بھگت جائے گی چنانچہ عافیت اسی میں ہے کہ صرف امریکیوں سے ہی کام چلایا جائے..اور ان کی برتری کا میں کیا ذکر کروں' وہ کل عالم میں ویت نام' اسرائیل' عراق اور افغانستان وغیرہ میں نظر آتی رہتی ہے..وہ اپنے کسی مارے جانے والے سپاہی کی لاش تک ٹیلیویژن پر نہیں دکھاتے کہ یہ انسانی حقوق کا معاملہ ہے اور ایسی تصویر دیکھ کر امریکیوں کے بچوں کی نفسیات پر برا اثر پڑتا ہے لیکن ایک سابق صدر صدام کو پھانسی کے پھندے ڈالے ٹیلیویژن پر خوب ہی دن رات رات جھلاتے ہیں کہ عراق میں پڑے جھولے..بس اسی نوعیت کے جھولے..اور اسے پھانسی پر چڑھاتے ہوئے خوب ہی بے عزت کرتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں..کہ یہ انسانی نہیں جانوروں کے حقوق کا معاملہ ہے..

جب 1857ء کی جنگ آزادی..غدر یا شورش کے بعد انگریز صاحب بہادر اپنے 'مسلمان' پنجابی اور سکھ فوجیوں کے ہمراہ دلی پر دوبارہ قابض ہوئے تو ایک انصاف پسند کرنل صاحب وغیرہ نے

درخواست کی کہ آپ بے شک اس غدار اور ناشکری قوم کے تمام مردوں کو ہلاک کر ڈالیں اور ہر صورت کر ڈالیں اور جو بچے ذرا قد میں نکلتے ہوں انہیں بھی بلکہ زیادہ احتیاط نہ کریں اور ہر عمر کے مردوں کو مار ڈالنے کا قانونی حق آپ کے پاس ہے لیکن ہم لوگ چونکہ انسانی حقوق اور عیسائیت کی نرم دلی پر یقین رکھتے ہیں اس لیے عورتوں اور چھوٹے بچوں کو پھانسی نہ چڑھایا جائے..اس درخواست کے جواب میں ایک جنرل صاحب نے کہا..یعنی انگریز جنرل نے کہ..انسانی حقوق کا اطلاق انسانوں پر ہوتا ہے جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں پر نہیں..انہیں تلف کر دینا ہی بہتر ہے..اور ایسا ہی کیا گیا..

میں ذاتی طور پر امریکی قوم کا بے حد مداح ہوں..وہ ایک بڑی اور عظیم قوم فی الحال ہیں..اگر وہ اپنی عظمت کے بارے میں کچھ مفروضوں پر یقین رکھتے ہیں تو اُن میں سے کچھ حقیقت پر مبنی بھی ہیں..

دنیا کی راجدھانی..کی راجدھانی..

امریکی کہتے ہیں کہ دنیا کا دارالسلطنت نیویارک ہے..اور اس نیویارک کا دارالسلطنت' ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ ہے..

اپنے شہر کی تعریف کرنا اور اسے دنیا کا سب سے خوش نظر اور یکتا شہر قرار دینا انسانی جبلت میں شامل ہے..اور یہ جبلت وغیرہ حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے اپنے خوابوں کی دنیا میں بسیرا کرتی ہے..ہم بھی تو ''لاہور لاہور ہے'' کے نعرے لگاتے نہیں تھکتے' یہاں تک کہ میرا ننھیال ایک زمانے میں گکھڑ منڈی گاؤں کہلاتا تھا..اب دیکھتا ہوں تو داخلے پر ''گکھڑ سٹی'' کا بورڈ آویزاں ہے تو اگر نیویارک والے اسے دنیا کا دارالسلطنت قرار دیتے ہیں تو کیا برا کرتے ہیں اور اگر ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو اس شہر کا صدر مقام کہتے ہیں تو انہیں دوش نہیں دیا جا سکتا..

ہم جیسے لوگوں نے اگر امریکہ کو شناخت کیا' اسے جانا تو کسی حد تک اس کے ادب اور موسیقی کے حوالے سے اور بہت حد تک ہالی ووڈ کی فلموں کے واسطے سے..یہ متحرک رابطہ نہ ہوتا تو امریکہ ہمارے لیے ادھورا رہتا..اس کی کوئی بھی تصویر آشنا نہ ہوتی..اگر صرف نیویارک کا ذکر چلے تو یہ وہی شہر جاناں ہے' جس کے گلی کوچوں میں فلاں فلم فلاں ٹیلیویژن سیریل کی شوٹنگ ہوئی تھی..اور اس کا ہر ایونیو ہر سٹریٹ اور ہر عمارت پہلے سے دیکھی ہوئی لگتی ہے..جناب ففتھ ایونیو پر واقع یہ

قدرے متین اور خاموش سی جو عمارت ہے تو یہ "ٹفنیز" جیولرز کی ہے.. جن کے زیورات صرف شہزادیوں اور ہالی ووڈ کی ملکاؤں کے سینے پر ہی سجتے ہیں.. تو یہیں پر سوکھی سڑی "رومن ہالیڈے" والی آڈری ہیپ برن کی فلم "بریکفاسٹ ایٹ ٹفنیز" کی شوٹنگ ہوئی تھی.. چونکہ آڈری کا سینہ ذرا کم کم تھا بلکہ نایاب ہی لگتا تھا تو ٹفنیز کے زیورات جانے کہاں سجائے گئے..

اور یہی وہ سنٹرل پارک ہے جس میں پولیس، جاسوس اور مجرم وغیرہ مسلسل ایک دوسرے کا پیچھا کرتے نظر آتے ہیں اور یہی وہ.. ٹائمز سکوئر یا براڈوے وغیرہ ہے تو اب آ جائیے ایک زمانے میں دنیا کی بلند ترین عمارت ایمپائر سٹیٹ کی جانب.. اس کا تعارف بھی ایک فلم کے ذریعے ہی ہوا.. پچاس کی دہائی میں جب مال روڈ پر سے دن بھر میں بمشکل پانچ سات کاریں گزرتی تھیں، بیس پچیس تانگے اور ریڑھے چھم چھم کرتے جاتے تھے اور اہلیان لاہور سخت پریشان تھے کہ آخر اتنی زیادہ ٹریفک کے ہجوم میں کیسے زندہ رہیں گے.. یعنی مال روڈ کے بیچ میں اگر بچے کیڑی کاڑا نہیں کھیل سکتے اور ہر آدھے گھنٹے کے بعد انہیں کسی کار یا تانگے کے لیے اپنا کھیل ملتوی کرنا پڑتا ہے تو لعنت ہے ایسی پُرہجوم زندگی پر.. تو ان دنوں ریگل سینما میں ایک فلم نمائش ہوئی "این افیئر ٹو ریمبر".. کاسٹ میں "ٹی اینڈ سمپتھی" اور "فرام ہیئر ٹو اٹرنٹی" والی انگریزی لب و لہجے اور ثقافت والی ڈیبرا کر تھی اور کیری گرانٹ تھا..

یہ وہی فلم ہے جس سے متاثر ہو کر.. ایک بڑے پیمانے پر اس کی کہانی اور ماحول کو "ٹائی ٹینک" کے نام پر پیش کیا گیا..

پُرتعیش اور گہرے سمندروں کی تاریکی میں جگمگاتا ایک بحری جہاز بحراوقیانوس پر تیرتا لندن سے امریکہ کی جانب رواں ہے.. اور اس پر سوار متمول مسافروں کے لیے ہمارے محاورے کے مطابق ہر دن عید کا ہے اور ہر رات شب برات کی ہے.. اگرچہ ہم عید کے دن وہ کچھ ہرگز نہیں کرتے جو وہ ہر صورت کر گزرتے ہیں.. اور شب برات میں ان کی کارکردگیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو گورے لوگ کر گزرتے ہیں.. تو اس بحری سفر کے دوران ایک مرد اور ایک عورت ایک دوسرے کے قریب آنے لگتے ہیں جب کہ انہیں آنا نہیں چاہیے.. کہ مرد یعنی کیری گرانٹ ایک معمولی مصور ہے لیکن ایک کروڑ پتی حسینہ اس پر عاشق ہو چکی ہے اور وہ اس کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھنے کے لیے نیویارک جا رہا ہے جبکہ عورت ڈیبرا کر بھی ایک مناسب منگیتر رکھتی ہے جو سفر

کے اختتام پر اس کا منتظر ہے اور اس کے باوجود نہ چاہتے ہوئے بھی کہ دونوں ہی بندھے ہوئے ہیں وہ ایک دوسرے کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو جاتے ہیں.. عشق کا ہاتھی انہیں روند کے رکھ دیتا ہے.. نیویارک پہنچنے پر اگرچہ وہ اپنے اپنے منگیتروں سے بغل گیر ہو کر ان کے ہمراہ چلے جاتے ہیں لیکن ایک وعدے کے ساتھ.. کہ وہ اپنے منگیتروں کو ترک کر کے.. آزاد ہو کر پورے ایک برس بعد ملیں گے.. کیری گرانٹ اس دوران مصوری کے ذریعے اپنی روزی کمانے کی سعی کرے گا اور ڈیبرا اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر پورے ایک برس بعد.. فلاں تاریخ کو دن کے اتنے بجے ملیں گے اور مقام ملاقات اس زمانے میں دنیا کی سب سے بلند عمارت ایمپائر سٹیٹ کی آخری منزل ہو گی..

پورے ایک برس بعد طے شدہ دن اور وقت کے مطابق کیری گرانٹ لفٹ کے ذریعے ایمپائر سٹیٹ کی آخری منزل پر پہنچتا ہے.. دن بھر انتظار کرتا ہے لیکن ڈیبرا کر نہیں آتی.. اور جب رات ہو جاتی ہے اور لفٹ آپریٹر اس تنہا شخص کو کہتا ہے کہ سر نیچے جانے کے لیے یہ آخری لفٹ ہے تو وہ مجبوراً اس میں سوار ہو کر چلا جاتا ہے.. وہ ایک عالم یاسیت میں چلا جاتا ہے کہ کیسی بے وفا اور بودی عورت تھی جس نے مجھے برباد کر کے رکھ دیا.. ایک مدت گزر جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو ایک تھیٹر میں دیکھتے ہیں پھر اتفاق سے ملاقات ہو جاتی ہے.. عورت ایک صوفے پر براجمان ٹانگوں پر کمبل اوڑھے نیم دراز ہے اور روئے چلی جا رہی ہے کیونکہ مرد اسے بے وفائی کے ڈھکے چھپے طعنے دے رہا ہے.. وہ تو اپنے وعدے کے مطابق اس روز طے شدہ وقت پر اپنے محبوب سے ملنے آئی تھی اور اتنے چاؤ سے آئی تھی کہ بے خود اور لاپرواہ ہوئی جاتی تھی اور اس لاپرواہی اور بے خودی کی کیفیت میں ڈوبی جب وہ ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کے صدر دروازے تک پہنچنے کے لیے سڑک پار کرنے لگتی ہے تو ایک تیز رفتار کار کی زد میں آ کر شدید زخمی ہو جاتی ہے اور اسے بے ہوشی کے عالم میں ہسپتال لے جایا جاتا ہے.. وہ اس حادثے میں اپنی ٹانگوں سے معذور ہو کر بے بس ہو جاتی ہے ورنہ وہ بے وفا نہیں تھی..

ان زمانوں کو 50ء، 60ء کے برسوں کو میں ہمیشہ "معصومیت کے برس" کہتا ہوں کہ ہم لوگ نہایت بھولے.. کسی حد تک بے وقوف اور بہت حد تک جذباتی ہوا کرتے تھے اور اس فلم نے ہمیں بہت رُلایا.. یہ فلم آج کے معیار کے مطابق نوجوانی کے کچے جذبوں سے نچڑتی ہوئی ایک سوڈو رومینٹک فلم تھی.. لیکن ہم آج میں نہ تھے، اس کل میں تھے جو معصوم اور بے وقوف تھا چنانچہ ہم

نے اسے دیکھا تو بہت روئے.. ایک بار نہیں بار بار دیکھا اور یوں بار بار روئے اور ہم اس کا تھیم سانگ ''این افیئر ٹو ریممبر'' گنگناتے پھرتے اور اداس ہوتے پھرتے..

ابھی پچھلے دنوں پرانی فلموں کے ایک چینل پر جب میں نے یہی فلم دیکھی تو اسے دیکھتے ہوئے ایک حقارت آمیز تبسم مسلسل میرے ہونٹوں پر تھا کہ تارڑ تم ایسی جعلی رومانوی فلموں سے متاثر ہو کر آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے' کتنے احمق اور کچے تھے.. یار آپا رضیہ بٹ بھی اس سے بہتر اور قابل یقین رومان لکھتی ہیں..

تو ایمپائر سٹیٹ کا یہ نقش اول تھا جو میں نے بچپن سے سنبھالا ہوا تھا.. ''این افیئر ٹو ریممبر'' والی ایمپائر سٹیٹ..

اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ میں سب وے سٹیشن سے باہر آ کر بیالیس سٹریٹ پر چلتا ہوا عین اس کے دامن میں نہیں پہنچا.. بلکہ سڑک کے پار اس فٹ پاتھ پر پہنچا جہاں ڈیبرا کر کھڑی تھی اس سڑک کو پار کر کے ایمپائر سٹیٹ کے صدر دروازے کی جانب پہنچنے کی تمنا رکھتی تھی..

مجھے بھی بیالیس سٹریٹ کی اس شاہراہ کے پار جانا تھا..

ایمپائر سٹیٹ کے اندر اور اوپر جانے کے لیے..

تو میرے ذہن میں وہی مدتوں پرانا فلمی حادثہ تھا اور میں نے قدرے احتیاط اور دیکھ بھال سے اس شاہراہ کو عبور کیا.. اگرچہ وہاں.. سڑک کے پار جو عمارت آسمان تک چلی جا رہی تھی اس کی آخری منزل پر کوئی بھی میرا منتظر نہ تھا.. اور میں اسے پار کرتا ہوا اگر کسی حادثے کا شکار ہو جاتا تو کسی نے بھی مجھ پر بے وفائی کا الزام نہیں دھرنا تھا.. البتہ یہ ہوا کہ سڑک پار کرتے ہوئے ایک لحظے کے لیے میرے دھیان میں یہ امکان ایک کوندے کی مانند لپکا کہ اگر میرے لئے وہاں آخری منزل پر کوئی منتظر ہوتا تو وہ کون ہوتا.. محمد علی ڈاکیہ اگر دریائے برالڈو کے کنارے حشوپی کے باغوں کی جانب سے اپنے مشکی گھوڑے پر سوار میری جانب چلا آتا تو اس کے چرمی بیگ میں میرے نام کا خط کس کا ہوتا!

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر.. اطمینان کر کے خیر و عافیت سے وہ سڑک پار کر لی اور ایمپائر سٹیٹ کے صدر دروازے کے اندر داخل ہو گیا..

ایک بلند چھت تلے سنگ سُرخ سے آراستہ ایک راستہ تھا.. ایک لابی تھی جس کے

سامنے.. جس کے ماتھے پر ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی ایک شبیہہ نقش تھی اور اس کی آخری منزل کے گرد ایک نورانی ہالہ تھا جو عام طور پر کلیساؤں کے ننھے فرشتوں کے سروں کے گرد روشن ہوتا ہے.. اور اس میں سے سنہری کرنیں پھوٹ رہی تھیں جیسے یہ عمارت بھی ایک فرشتہ ہو..

امریکیوں کے فرشتے اور مسیحا.. ایسے ہی ہوتے ہیں..

اس شاندار شبیہہ کے نیچے ایک طویل ڈیسک کے پیچھے صرف ایک خاتون سیاحوں کو اس بلڈنگ کے بارے میں معلومات مہیا کر رہی تھی اور وہ مسلسل کر رہی تھی' رکتی نہ تھی کہ سیاح بھی رکتے نہ تھے اور ہر سیاح یہی ایک سوال پوچھے چلا جا رہا تھا کہ کدھر جانا ہے.. کیونکر جانا ہے.. لفٹیں کہاں ہیں.. اور وہ دم نہ لیتی تھی بولتی جاتی تھی..

مختلف راہداریوں میں سے گزرتا.. سیاحوں کے جھمیلے میں.. ایک کشاں کشاں میلے میں.. دوسری منزل پر آ پہنچا.. اور یہاں ٹکٹ گھر تھے.. شرح پندرہ ڈالر فی کس تھی اور میں نے واویلا کیا کہ میں تو سینئر سٹیزن ہوں رعایت کا حقدار ہوں لیکن ٹکٹ فروخت کرنے والے نے میری زبان کا اعتبار نہ کیا اور پاسپورٹ پر درج میری تاریخ پیدائش چیک کر کے صرف دو ڈالر کی تخفیف کی.. میں نے سوچا کہ صرف دو ڈالر کی بچت کے لیے اپنے آپ کو بوڑھا تسلیم کیا تو کیا گھاٹے کا سودا کیا.. ٹکٹ خرید کر میں اپنے تئیں نزدیک ترین لفٹ کی جانب لپکا تاکہ شتابی سے اوپر پہنچ کر نظارے کروں لیکن یہ عشق نہیں آساں.. اس عشق کے امتحان اور بھی تھے.. اور باقاعدہ امتحان تھے' صبر' آزمائش' تھکاوٹ اور بوریت کے امتحان کہ لفٹوں تک پہنچنے کے لیے قطار اندر قطاریں تھیں جن کا دوسرا سرا دکھائی نہ دیتا تھا.. قطار سے ذہن میں ایک.. قطار آتی ہے.. جیسے بس سٹاپ یا سینما کی کھڑکی کے سامنے کی قطار.. سیدھی سرکتی ہوئی قطار لیکن یہاں کچھ زگ زیگ والا معاملہ تھا.. پیتل کے ٹھگنے کھمبوں کے ساتھ رسّے بندھے تھے اور ایسے بندھے تھے کہ آپ ایک بھول بھلّیاں میں چلتے کبھی دائیں مڑ جاتے تھے اور کبھی بائیں' یوں ایک ہی چھت تلے ایک دوسرے کی مخالف سمت میں چلتے ہوئے سیاحوں کو آپ مسلسل رینگتے ہوئے دیکھ کر بیزار ہو جاتے تھے اور یہاں جو انتظار تھا وہ ہم کرتے نہیں تھے، بقول غالب کھینچتے تھے کہ یہ اتنا طویل تھا.. نہایت سہولت سے اس انتظار کے کھینچنے کے دوران آپ ''وار اینڈ پیس'' مکمل طور پر مطالعہ فرما سکتے تھے.. یہ اتنا طویل تھا..

اگر مجھے ایسی آزمائش کا خفیف سا بھی خدشہ ہوتا تو میں ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو دور سے

سلام کر کے چلا جاتا..

اگرچہ صرف میں نہیں تمام سیاح..اور یاد رہے ہر برس کم از کم چالیس لاکھ سیاح اس عمارت کی زیارت کو آتے ہیں..ایک دوسرے کی شکلیں بار بار اور تادیر دیکھنے سے نہایت بیزار ہو چکے تھے اس لمحے کو کوس رہے تھے جب انہوں نے ایمپائر سٹیٹ کی یاترا کا فیصلہ کیا تھا لیکن ان یبوست زدہ چہروں میں تین نہایت ہی چلبلی، ہنس مکھ اور شرارتی چلن کی لڑکیاں بھی تھیں جن پر اس بیہودہ انتظار کی بیزاری کا کچھ اثر نہ ہوا تھا اور وہ مسلسل گنگنا رہی تھیں..بے مہار رقص کر رہی تھیں، کبھی قہقہے لگاتی تھیں اور کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی نزدیک ترین سیاح کو چاہے وہ عورت ہو یا مرد چھیڑتی تھیں..وہاں جو اہلکار متعین تھے ان سے تو وہ مسلسل فلرٹ کر رہی تھیں..ان کے رگ و پے میں جوانی کا جو خون اڑیل گھوڑوں کی مانند دوڑتا تھا ان کے رخساروں اور لبوں سے پھوٹتا تھا..وہ مخمور نہ تھیں..ان کے بدنوں میں رسّے تڑاتے وحشی جانور جوانی کے تھے..بالآخر لفٹ تو سامنے نہ آئی، ایک تلاشی کا مقام آیا جہاں تمام حاضرین کو اچھی طرح ٹٹولا گیا..اور وہ تینوں لڑکیاں ٹٹولے جانے کے لیے از حد پر اشتیاق اور بے چین..ہم اپنے بوٹ اتار رہے ہیں، بیلٹیں اتار رہے ہیں اور وہ لڑکیاں سکیورٹی آفیسرز کو ہنس ہنس کر کہہ رہی ہیں..آفیسر کیا یہاں سب کچھ اتار دینا ہے..

یہاں بھی مجسمہ آزادی کی جانب سفر کرنے سے پیشتر کی طرح کچھ زیادہ ہی چھان پھٹک ہو رہی تھی اور وہی خدشہ کہ القاعدہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہم ٹریڈ ٹاورز کے بعد ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو بھی مسمار کر دیں گے..افغانستان یا پاکستان کے غاروں میں روپوش ہو کر..ان غریبوں نے تو کیا کرنا تھا..البتہ امریکیوں کو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور اس بہانے جہاں انہوں نے پوری دنیا میں اُدھم مچا دیا..دو عمارتوں کے بدلے میں دو ملک مسمار کر دیئے..وہاں انکے لاکھوں بیکار لوگ..ایئرپورٹوں، حساس اداروں، یادگاروں اور اہم عمارتوں کی حفاظت کے نام پر سکیورٹی افسر ہو کر برسرروزگار ہو گئے..اور وہ کرتے کراتے کچھ نہیں صرف لوگوں کی تلاشی لیتے تھے..بوٹ اور بیلٹیں اترواتے تھے..ہینڈ بیگ چیک کرتے تھے اور مناسب معاوضہ پاتے تھے..چنانچہ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ ہر سیاہ بادل کے کناروں پر ایک روپہلی کرن ہوتی ہے تو القاعدہ کے سیاہ بادل میں لاکھوں بیکار امریکیوں کا رزق روپہلی ہوتا تھا..

ایک بے آواز..اتنی خاموش کہ حرکت میں نہ لگتی تھیں لفٹ..ایک ہزار پانچ فٹ کی

بلندی پر صرف ایک منٹ میں لے گئی..یہ ایمپائر سٹیٹ کی 86 ویں منزل تھی..ابھی یہ عمارت مزید دو سو پانچ فٹ کی بلندی تک جاتی تھی.

ولیم لیمب سے جو اس عمارت کا آرکیٹیکٹ تھا اس سے جان جیکب راسکوب نے جس نے اس عمارت کی تعمیر کا خواب دیکھا تھا، پوچھا تھا 'بل تم یہ بتاؤ کہ تم اس عمارت کو کتنا بلند لے جا سکتے ہو..کہاں تک جہاں تک وہ گر نہ جائے..''

یہ ایک ذہن کو بوکھلا دینے والی حقیقت ہے کہ اس زمانے کی دنیا کی بلند ترین عمارت صرف ایک برس اور 45 دنوں میں تعمیر ہو گئی تھی اور کئی دن ایسے آئے کہ صبح سے شام تک تین یا چار منزلیں وجود میں آ گئیں..یہ عہد جدید کے انسان کا ایک تکنیکی معجزہ تھا..

86 ویں منزل پر لفٹ سے باہر قدم رکھیں تو ایک ڈھکا ہوا ریستوران، سووینئر شاپس اور خوراک کی کچھ مشینیں سامنے آتی ہیں اور آپ ان میں سے گزر کر یکدم کھلی فضا میں تیز ہوا کے شور میں آ جاتے ہیں..

آپ کے آس پاس کچھ نہیں..کوئی عمارت نہیں..سب کچھ نیچے بہت نیچے رہ گیا ہے اور آپ ایک آسمانی سنگھاسن پر براجمان ہیں..

پرندے بھی بہت نیچے رہ گئے ہیں..

پورا نیویارک آپ کے قدموں میں بسیرا کرتا ہے..زرد شیطان کے اس شہر کا شور یہاں تک آتے آتے دم توڑ دیتا ہے اور ایک سناٹے میں بدل جاتا ہے..

صرف تیز ہوا ہے اور آپ کی حیرت کا تنہا پھول ہے..

آپ آگے بڑھ کر آہنی جنگلے میں سے نیچے جھانکتے ہیں تو آپ کی نظر گرتی چلی جاتی ہے اور یہ واہمہ ہوتا ہے کہ آپ بھی اس کے ہمراہ گر رہے ہیں اور شہر کی کسی شاہراہ پر کریش کر جائیں گے چنانچہ آپ پیچھے ہٹ جاتے ہیں..

نیچے یعنی نیچے دیکھنے سے اجتناب کیجیے اور آس پاس دیکھئے تو نیویارک ایک کھلونا ہے..بچوں کے کھیلنے کو ایک ماڈل ہے اور اس کی عمارتیں سورج کی تمازت سے بھڑکیلی اور روشن ہوتی ہیں..دور سمندر کے درمیان لبرٹی آئی لینڈ پر ایستادہ مجسمہ آزادی بھی ایک کھلونا ہے جسے آپ آسانی سے اپنے ڈرائنگ روم میں سجا سکتے ہیں..شہر کو آپس میں ملانے والے کماندار پل بھی میکانو

کے ماڈل ہیں..

اگرچہ اس بلندی پر آنے کے لیے ہر فرد نے پندرہ ڈالر خرچ کیے تھے لیکن یہاں ایک مفت بر بھی تھا جس نے ٹکٹ نہیں خریدا تھا اور وہ ایک کبوتر تھا جو جنگلے کے باہر منڈیر پر بیٹھا کبھی ہم کو کبھی نیچے پھیلے نیویارک کو دیکھتا تھا..

ڈھکے ہوئے ریستوران کے اندر سے یکدم ایک کنگ کانگ نامی گوریلا سینے پر دوہتڑ چلاتا ہاؤ ہو کرتا برآمد ہوتا ہے اور مناسب معاوضے پر پرجوش سیاحوں کے ساتھ تصویریں اترواتا ہے.. اس کنگ کانگ کے لبادے کے اندر ظاہر ہے ایک انسان ہے جو پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ روپ دھارتا ہے اور مجھے ہمیشہ یہ روپ بہروپ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے.. آرلینڈو کی ڈزنی لینڈ کی دنیا میں ہر سو کارٹون کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں.. اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں، لوگوں کو لبھاتے، بچوں کے دل پرچاتے ان کے ہمراہ تصویریں اترواتے.. ریستورانوں اور نمائش گاہوں کے باہر گاہکوں کو متوجہ کرنے کی خاطر بڑے بڑے بھالو اور مکی ماؤس رقص کرتے ہوئے اور ان کے اندر ایک انسان ہوتا ہے جس کا اس لبادے میں دم گھٹ رہا ہوتا ہے.. پسینہ بدن کو بھگوتا ہے.. وہ اچھی طرح سے دیکھ بھی نہیں سکتا اور رقص کرتا چلا جاتا ہے.. ایک انسان پاپی پیٹ کی خاطر کبھی چوہا بن جاتا ہے اور کبھی خرگوش.. شاید زندگی کی حقیقت بھی یہی ہے.. کہ ہم سب مجبور اور بے بس کبھی چوہے بن جاتے ہیں اور کبھی خرگوش.. اور ہمیں اس کے عوض کچھ معاوضہ بھی نہیں ملتا..

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ اور کنگ کانگ لازم و ملزوم ہیں..

بہت مدت ہوئی جب ''کنگ کانگ'' نامی ایک فلم بنی تھی جس کے کلائمکس میں کنگ کانگ ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی چوٹی پر جابراجمان ہوتا ہے اور بالآخر اسے ہوائی جہازوں میں نصب گولیاں اگلتی مشین گنوں سے ہلاک کر دیا جاتا ہے.. ابھی حال ہی میں یہی ''کنگ کانگ'' ایک بڑے بجٹ کے ساتھ دوبارہ بنائی گئی ہے اور ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ ایک مرتبہ پھر فوکس میں آ گئی ہے..

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی چوٹی پر پہنچ کر ایک عدد کنگ کانگ کے ساتھ تصویر اتروانا گویا اس یاترا کی قبولیت پر آخری مہر ہے..

وہ تینوں چلبلی نشۂ شباب میں دھت لڑکیاں کنگ کانگ سے لپٹ کر اس کے بوسے لے رہی تھیں اور تصویریں اتروا رہی تھیں..

چین کے.. گلابوں کے شہر شنگھائی میں.. سمندر کے کنارے جن ماؤ ٹاورز نامی ایک عمارت ہے جو ایمپائر سٹیٹ کو بلندی میں پیچھے چھوڑ جاتی ہے.. چونکہ جن ماؤ ٹاورز ایشیا میں ہے اس لیے اس کا کچھ چرچا نہیں ہوتا.. کچھ ناموری اور شہرت نہیں ہوتی اور اس سے کہیں نچلے درجے پر فائز ایمپائر سٹیٹ کی کل عالم میں دھوم ہے.. صرف اس لیے کہ اُسے زرد چینیوں نے تعمیر کیا اور اسے گوروں نے بنایا، حسن کرشمہ ساز صرف گوروں کا ہے.. ادھر بھوری رنگت ہو یا زرد چہرے ہوں تو ان میں نہ کوئی حسن ہے تو کرشمہ کہاں سے آئے گا.. چاہے ہم ایمپائر سٹیٹ سے بھی سینکڑوں منزلیں اوپر چلے جائیں.. بغیر کسی تعصب کے شنگھائی کے جن ماؤ ٹاورز کی آخری منزل سے جو منظر نظر آتا ہے وہ اس منظر کو مات کرتا ہے جو ایمپائر سٹیٹ سے نظر آتا ہے..

تو وہاں ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی آخری منزل پر مجھے رہ رہ کر ''این افیئر ٹو ریممبر'' کا خیال آتا ہے.. یہاں منتظر کیری گرانٹ کا خیال آتا ہے.. اور وہ منتظر تھا اپنے عشق خاص کا.. اور مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اس آخری منزل پر اگر کوئی میرا منتظر ہوتا.. تو وہ کون ہوتا.. جیسے محمد علی ڈاکیے کے چرمی بیگ میں اگر میرے نام کا ایک خط ہوتا تو وہ کس کا ہوتا..

کسی کا بھی نہیں.... جو کچھ دیکھنا تھا دیکھ لیا.... اب کوئی بھی منتظر نہیں..

اب کون منتظر ہے ہمارے لیے وہاں
شام آ گئی ہے لوٹ کے گھر جائیں ہم تو کیا

شام آ گئی تھی..

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ پر ابھی دھوپ کی کچھ پژمردہ غروب کی منتظر کرنیں تھیں اور نیچے بہت نیچے زرد شیطان کے شہر میں شام کب کی اتر چکی تھی..

لوٹ کے گھر جانا تو تھا..

چاہے وہاں.. یہاں کی طرح.. کوئی بھی ہمارا منتظر نہ ہو..



''یو این او، جنرل اسمبلی میں خطاب''

میں نے ابھی تک یو این او کی زیارت نہیں کی تھی..

یہ زیارت اس لیے بھی مجھ پر فرض ٹھہرتی تھی کہ تقریباً پچاس برس پیشتر میں نے اس کی اماں جان یعنی ''لیگ آف نیشنز'' کی جنیوا میں زیارت کی تھی..

بے شک میں نے ایک شب علی محمود کی مرسڈیز میں شرلاٹے بھرتے ہوئے اس کی عمارت کو تیزی سے پاس آتے اور پھر اسی تیزی سے پاس سے گزرتے دیکھا تھا اور اس کے گزرنے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ میرا ڈیجیٹل کیمرہ اپنے میموری کارڈ پر اسے ساکت نہیں کر سکا تھا.. خدا لگتی کہوں گا کہ مجھے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ یا یو این او کا تفصیلی معائنہ کرنے کی چنداں خواہش نہ تھی.. میں صرف ان کی تصاویر اتار کر اپنے امریکی البم میں لگانا چاہتا تھا کہ سند رہے کہ ہم بھی نیویارک گئے تھے..

یو این او کے علاوہ سینٹ پیٹرک کیتھڈرل بھی میری فہرست میں شامل تھا جو امریکہ میں گوتھک طرز تعمیر کا سب سے عالی شان کلیسا ہے.. اس کی زیارت نہ سہی اس میں بھی جھانکنا اس لیے فرض تھا کہ کولون کیتھڈرل دیکھ چکا تھا جو گوتھک طرز تعمیر کا باوا آدم ہے..

فلیٹ سے باہر نکلنے سے پیشتر سلجوق نے میرا تفصیلی چیک اپ کیا جیسے کیتھڈرل سکول کے گیٹ کے باہر اسے چھوڑنے سے پیشتر میں اس کا چیک اپ کیا کرتا تھا کہ بیٹے تمہارا بستہ تو مکمل ہے.. حساب کے کام کی کاپی گھر تو نہیں بھول آئے.. رنگین پنسلیں کہاں ہیں اور لنچ باکس ساتھ لائے ہو یا نہیں.. اور اب وہ چیک کر رہا تھا کہ والد صاحب ذرا دکھائیں کہ سب وے کا نقشہ کہاں ہے.. سب وے اور بس کا سیزن ٹکٹ کس جیب میں ہے.. پاسپورٹ تو نہیں بھول گئے کہیں

شناخت نہ کروانی پڑ جائے..

بٹوے میں کتنے ڈالر ہیں.. دوپہر کے کھانے کے لیے میں نے آپ کے لیے ایک سینڈوچ تیار کر دیا ہے.. سوفٹ ڈرنک کسی مشین میں سے نکال لیجیے گا اور یہ ہے اس کے لیے ریزگاری.. اور ہاں میرا سیل فون بھی جیب میں رکھ لیجیے..

یہ سیل فون جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ایک گارنٹی تھا کہ اگر والد صاحب نیویارک کے رنگ دیکھتے کہیں اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں یا کر دیئے جاتے ہیں تو اسے خبر ہو جائے.. وہ ہر گھنٹے کے بعد فون کر کے مجھ سے پوچھ لیتا تھا کہ والد صاحب اب کہاں ہیں.. یعنی ادھر سے اگر کچھ جواب نہ آئے تو فوری طور پر نیویارک پولیس کو والد صاحب کی گمشدگی کی اطلاع کر دی جائے..

میں اس مکمل چیک اپ میں سرخرو ہو کر فلیٹ سے باہر آنے کو تھا تو سلجوق کہنے لگا.. ''ابو مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے اب تک اتنا نیویارک دیکھ لیا ہے جتنا کہ وہ ہے بھی نہیں.. کہ نہیں؟''

''کبھی یہ اگلی گلی کے برابر میں جو کولمبیا یونیورسٹی ہے جس میں آپ کا برخوردار زیر تعلیم ہے اسے بھی ایک نظر دیکھ لیجیے..'' اس کے لہجے میں ایک ہلکی سی شکایت کا پرتو تھا..

واقعی میں ابھی تک امریکہ کی اس مشہور زمانہ یونیورسٹی کو نہ دیکھ سکا تھا جہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے اپنے آپ کو ایک سپیریئر سپیشی سمجھتے ہیں کہ یہ ''آئیوی لیگ'' میں شامل یونیورسٹی ہے.. یہ تعلیمی ادارے انگریزیوں کے قائم کردہ تھے اور ان کے قدیم در و دیوار پر چونکہ آئیوی کی بیلیں چپکی ہوتی تھیں اس لیے انہیں ''آئیوی لیگ'' کہا گیا.. اور اگر یہ بہت ہی معمولی قسم کی یونیورسٹی ہوتی تو بھی میں بہرصورت اس کی زیارت کرتا کہ یہاں پر ایک محبوب شخص ایڈورڈ سعید پڑھایا کرتا تھا.. ایک عیسائی فلسطینی جس نے دنیا بھر کو فلسطین کے جائز موقف سے آگاہ کیا.. اور اسے دنیا کے نقشے پر لے آیا.. اس کی کتاب ''اورینٹلزم'' نے میرے لیے آگہی کے ایسے در وا کیے جو میرے گمان میں بھی نہ تھے..

''انشاء اللہ.. کل..'' میں نے سلجوق سے وعدہ کیا..

دسویں منزل سے نیچے آنے والی لفٹ جب گراؤنڈ فلور پر پہنچی اور میں عمارت سے باہر براڈوے سٹریٹ پر آیا تو سامنے سے آنے والے کچھ چہرے میری پہچان میں آ رہے تھے.. سٹور' ریستوران' فٹ پاتھ' بک سٹال اور خوراک کے کھوکھے میری پہچان میں آ رہے ہیں.. ایک جاپانی

شوسی ریستوران کے باہر براجمان بے گھر اور بھوکا سیاہ فام بیئر کی بوتل بلند کر کے مجھے ''ہیلو'' کہتا ہے.. وہ مجھے پہچانتا ہے کہ میں روز ادھر سے گزرتا ہوں اور بقول مجید امجد جب میں ادھر سے نہ گزروں گا تو کون مجھے دیکھے گا.. نیویارک تو نہیں کم از کم براڈوے سٹریٹ میرے لیے اجنبی نہ رہی تھی.. اور یہ کوئی اچھا شگون نہ تھا.. مجھے اس شہر میں آئے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا تھا.. اگرچہ یہ زمانہ چند روزہ تھا لیکن پہچان کے اس معمول نے مجھ سے وہ مسکراہٹ چھین لی تھی جو سراسر اجنبی چہروں اور گلیوں کے یکدم سامنے آنے پر چہرے سے مسرت کی ایک پھوار کی مانند پھوٹتی ہے..

سینٹ پیٹرک کیتھڈرل کا نو ہزار کلوگرام وزنی کانسی کا دروازہ کھولنے کے لیے درجنوں ہاتھیوں کی قوت درکار تھی.. نیویارک میں شاید ہاتھیوں کی کمیابی کے باعث اسے بند نہیں رکھا گیا تھا.. کھول دیا گیا تھا.. دروازے پر حضرت عیسیٰ اور ان کے حواریوں کے علاوہ مقامی سنت اور سادھوؤں کے سنہری نقش ثبت تھے جو کسی حد تک فلورنس کے ''جنت کے دروازے'' پر ثبت بائبل کی داستانوں ایسے تھے..

اندر داخل ہوتے ہوئے گیارہ ستمبر کے اثرات ظاہر ہوئے.. یہاں ہر ملاقاتی کی تلاشی دل کھول کر لی جا رہی تھی..

سینٹ پیٹرک کیتھڈرل کا اندرون گوتھک طرز تعمیر کا مؤثر پتھریلا اور بھاری حسن لیے ہوئے تھا.. البتہ چرچ کے اندر ایک امریکی پرچم بھی آویزاں تھا.. ملاقاتیوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ وہ جرمنی یا فرانس کے کسی کلیسا میں نہیں ایک سراسر خالص امریکی چرچ میں ہیں..

ایک جانب نہایت ڈرامائی روشنیوں میں نہایا ہوا الزبتھ این سٹین کا مجسمہ ایک پر اثر پس منظر میں دکھائی دے رہا تھا.. یہ خاتون.. ایک خالص امریکی.. پوپ کی جانب سے سند یافتہ پہلی برگزیدہ ہستی.. یعنی سینٹ تھیں..

اس چرچ میں سب سے پر تاثیر اور روحانی.. ایک نواں نکور دودھ سفید ''پائیتا'' تھا.. میں اس کے قریب ہوا تو اسے دیکھ کر مجھے ایک دھچکا سا لگا کہ یہ یہاں کیسے ہو سکتا ہے.. آخری مرتبہ میں نے اسے سینٹ پیٹرز روم میں دیکھا تھا اور وہ تو پرانا سا تھا اور یہ نواں نکور ہے..

''پائیتا'' اور میں اس.. مائیکل انجلو کے تراشیدہ.. دل کو روک دینے والے.. رگوں کو

مردہ کر دینے والے.. خون کی گردش کو لمحہ بھر کے لیے منقطع کر کے پھر سے جاری کر دینے والے شاہکار مجسمے کے بارے میں اپنی تحریروں میں بہت بار تذکرہ کر چکا ہوں.. حضرت عیسیٰ صلیب سے اتارے جانے کے بعد بی بی مریم کی گود میں مردہ حالت میں.. بازو ڈھیلے اور لٹکے ہوئے.. بدن میں جو جان تھی وہ ایک پیغمبر کی تھی جواب نہیں تھی اور بی بی مریم سر پر چادر اوڑھے گود میں ڈھلکے ہوئے بیٹے کی موت پر سوگوار.. اور یاد رہے کہ ایک نوجوان لڑکی بی بی مریم کہ مائیکل انجلو کے تصور میں بی بی مریم کے لیے ایک بوڑھی عورت نہیں آتی تھی.. جیسا کہ ان دنوں دستور تھا ایک نو آمیز مجسمہ ساز کی حیثیت سے مائیکل نے اپنا یہ مجسمہ سینٹ پیٹرز کے مرکزی ہال میں رکھ دیا اور خود ایک ستون کے پیچھے کھڑا ہو کر دیکھنے لگا کہ عوام الناس اس کے بارے میں کن جذبات کا اظہار کرتے ہیں.. ہر کوئی اس مجسمے کو دیکھ کر رک جاتا.. اس کے سفید ماتمی اور سوگوار سحر کا اسیر ہو کر اسے مبہوت ہو کر دیکھتا رہتا اور پھر اسے رافیل یا کسی اور معروف مجسمہ ساز کی تخلیق قرار دے کر آگے بڑھ جاتا.. مائیکل ستون کی اوٹ میں پیچ و تاب کھاتا رہا اور جب رات ہوئی کلیسا ویران ہو گیا تو اس نے بی بی مریم کے لبادے پر تیشے سے یہ حرف کھود دیے ''یہ مجسمہ فلورنس کے بوناریتا مائیکل انجلو کا تخلیق کردہ ہے'' اور یوں اس نے اس شاہکار کی پوترتا اور کاملیت کو داغدار کر دیا.. یہ فقرہ آج بھی بی بی مریم کے لبادے پر کندہ پڑھا جا سکتا ہے.. ویسے مائیکل انجلو ایسا ہی سیماب صفت شخص تھا.. اس نے تو حضرت موسیٰ کا مجسمہ مکمل ہونے پر انہیں کہا تھا کہ تم ہی تو مکمل موسیٰ ہو پھر بولتے کیوں نہیں.. وہ نہیں بولے تو ان کے گھٹنے پر تیشے سے ایک ضرب لگائی کہ بولو.. وہ تو نہیں بولے البتہ ایک اور شاہکار داغدار ہو گیا.. سینٹ پیٹرک کیتھڈرل میں جو ''پائیتا'' میرے سامنے تھا.. وہ امریکی مجسمہ ساز ولیم پارٹ رِج کی تخلیق تھا.. یہ مجسمہ جو 1906ء میں تراشا گیا ذوق جمال اور کاریگری سے عاری نہیں ہے.. اس میں بھی سوگواری کی ایک الوہی کیفیت کی پرچھائیاں ہیں لیکن یہ پرچھائیاں قدرے اجلی اجلی ہیں..

''پائیتا'' سے دوبارہ ملاقات کے بعد میں جب سینٹ پیٹرک سے باہر آیا تو باہر وہ نیویارک سانس لیتا تھا جو اس یقین کا اسیر تھا کہ اس مائیکل انجلو کے فرسودہ اور قدیم تہذیب کے نمائندہ ''پائیتا'' سے ہمارا ''پائیتا'' ایک بلند تر درجے پر اس لیے فائز ہے کہ یہ امریکی ہے.. امریکہ سے تو حضرت عیسیٰ بھی بلند نہیں ہو سکتے ایک مجسمے کی بساط کیا!

جہاں پہنچ کر وہ بالآخر رک گئی.. وہاں سے.. نیویارک بس سروس آگے نہیں جاسکتی تھی کہ آگے سمندر تھا.. اور امریکی ہونے کے باوجود یہ بس سمندر میں تیر نہیں سکتی تھی اس لیے یہ رک گئی.. یہ آخری سٹاپ تھا..

بس سے اُتر کر ابھی میں دوچار گام گیا ہوں کہ وہ ڈربہ نما.. شیشہ ہی شیشہ.. بلند عمارت نظر آ گئی جس کے آئنوں میں آس پاس کی عمارتوں کے عکس ہی عکس یوں نظر آتے ہیں جیسے وہ عمارتیں اس کے بدن میں تیر رہی ہیں.. اب یہ ایک نہایت ہی سنہری موقع تھا کہ میں اس عمارت یعنی یو این او میں تیسری دنیا پر ڈھائے جانے والے مظالم اور زیادتیوں کا تفصیلی اور نہایت جذباتی تذکرہ کروں.. اس کی تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے کبھی نکیتا خروشچوف کو اپنے جوتے سے ڈیسک بجاتے.. اور کبھی بھٹو کو کوئی قرارداد یا عام نوٹس پھاڑتے ہوئے واک آؤٹ کرتے ہوئے بیان کروں.. کشمیر اور فلسطین کے ساتھ جو سلوک ہوا اس کی کہانی سناؤں لیکن یقین کیجیے کہ مجھے اس لمحے یو این او کی عمارت کو سامنے پا کر ان میں سے کوئی خیال نہ آیا اور صرف ایک خیال آیا کہ میں نہایت مدبرانہ انداز میں اس کے سامنے کھڑے ہو کر ایک یادگار تصویر اتروالوں جو کل کلاں میرے اعزاز میں شائع ہونے والے کسی مجلّے میں ''مصنف یو این او کی عمارت کے سامنے'' کے عنوان سے چھپ جائے.. اور اگر کسی کو بھی ایسے مجلّے کو اشاعت کا خیال نہ آئے تو میں خود خیال کرلوں.. اور یہ تصویر میں نے ایک راہگیر کی منت سماجت کر کے اتروالی.. تصویر اتروالی تو یو این او میرے لیے بیکار ہوگئی..

میں نے اس کے احاطے میں دوچار قدم آگے جا کر ایک پھاٹک کے پار دیکھا تو سفید رنگ کا ایک عارضی ٹینٹ نصب نظر آیا جس پر ''ملاقاتی اِدھر'' جلی حروف میں تحریر تھا.. چونکہ میرا تصویری مقصد پورا ہو چکا تھا اس لیے مجھے کوئی چاؤ نہ تھا اس عمارت کے اندر جا کر اس کے بام و در میں بھٹکنے کا.. اور یوں بھی سفید خیمے کے اندر نیلی قمیضوں اور پتلونوں میں ملبوس اور نیلی ٹائیاں باندھے یو این او کے سکیورٹی اہلکار ہر سیاح اور ملاقاتی کی لمبی ہی تلاشیاں لے رہے تھے.. جہاں ٹٹولنا جائز نہیں ہے' وہاں بھی ٹٹول رہے تھے چنانچہ میں پلٹنے کو تھا جب ان میں سے ایک امریکی دکھائی دیتے اہلکار نے مجھے دیکھا اور لوگوں کو ٹٹولنا موقوف کر کے لپکتا ہوا میری جانب آیا اور کہنے

لگا ''تارڑ صاحب..''

میں نے نروس ہو کر کہا ''ہاں جی..''

''خو کدھر کو جاتا ہے.. واپس کیوں جاتا ہے.. ہم جانے دیتا ہے.. نہیں جانے دے گا.. آپ سے تو ہم پیار کرتا ہے..''

یہ پشاور کے باسی ایک گورے چٹے درمیانے قد کے پٹھان تھے.. وہاں پولیس کے محکمے میں انسپکٹری کرتے تھے پھر یو این او کے لیے منتخب ہو کر کبھی بوسنیا' کبھی افریقہ میں سکیورٹی کے فرائض سرانجام دیتے رہے.. اب ایک عرصے سے نیویارک میں تھے..

انہوں نے محبت اور زبردستی کی ملاوٹ سے میرا ہاتھ تھاما اور خیمے میں تعینات دیگر سکیورٹی افسران کو مخاطب کر کے کہنے لگے ''یہ میرے مہمان ہیں ان کی تلاشی نہیں ہوگی' اس پر ایک بہت سُوجے ہوئے چہرے والے سکیورٹی اہلکار نے کہا ''مسٹر خان.. آپ ان کی ذمہ داری لے رہے ہیں..''

تو مسٹر خان نے اردو میں کہا ''ہاں یارا..''

چنانچہ خان صاحب بغیر کسی تلاشی اور بدنی ٹٹول کے.. اپنی ڈیوٹی ترک کر کے مجھے یو این او کے اندر لے گئے..

انہوں نے اس عمارت کی راہداریوں میں آویزاں جو تصاویر تھیں ان کی تفصیل بتائی.. ہیروشیما پر ایٹمی حملے کے بعد جو اشیاء وہاں راکھ ہوئی تھیں' پگھل گئی تھیں ان کے بارے میں بتایا.. پوری دنیا کے سکوں کو پگھلا کر جو گھنٹی امن کی خاطر تخلیق کی گئی تھی وہ دکھائی.. شگال کی بنائی ہوئی رنگین کھڑکی کی زیارت کروائی.. گراؤنڈ میں ایستادہ سویڈش آرٹسٹ کارل فریڈرک کا مجسمہ ''پستول'' دکھایا جس کی نالی کو گانٹھ دی گئی تھی اور ہنری مُور کا ایک شاہکار مجسمہ دکھایا.

انہوں نے مجھے ایک سربراہ مملکت سے بڑھ کر پروٹوکول دیا کہ وہاں تو یہ ایک مجبوری ہوتی ہے.. ایک شخص کو نہیں.. ایک عہدے کو تعظیم دی جاتی ہے اور ایسے موقعوں پر احساس ہوتا ہے کہ یہ لکھنے لکھانے کا عمل اتنا بھی رائیگاں نہیں جاتا..

خان صاحب نے باقاعدہ سیکرٹری جنرل کوفی عنان کے دفتر پر دستک دی کہ دروازہ کھولیے ہمارے تارڑ صاحب آئے ہیں اور چونکہ وہ اس لمحے وہاں موجود نہیں تھے تو دروازہ کیسے کھولتے..

سکیورٹی کونسل کے ہال پر ایک نظر ڈال کر جب ہم جنرل اسمبلی کے ہال کی جانب گئے تو وہاں دروازے مقفل تھے.. سیاحوں کا ایک گروپ اپنے گائیڈ سمیت یہاں آیا تو ان سے معذرت کرلی گئی کہ آج کچھ وجوہات کی بنا پر آپ جنرل اسمبلی کے ہال کے اندر نہیں جاسکتے..

سیاحوں کا وہ گروہ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا تو خان صاحب نے نگہبانوں کے چہرے کے تاثرات ظاہر ہے یہ تھے کہ ہماری جانے بلا کہ یہ.. بے وجہ مسکراتا..ادھیڑ عمر شخص..جس کی توند پر اس کی شکنوں بھری میلی نیلی جینز نہیں ٹھہرتی..کون ہے..لیکن چونکہ ان کا ایک ساتھی سکیورٹی افسر اس شخص کی سفارش کر رہا تھا اس لیے انہوں نے جنرل اسمبلی میں داخلے کا دروازہ کھول دیا..

جہاں دنیا کی کل اقوام کی تقدیر کے فیصلے سپر پاورز کی عین مرضی کے مطابق ہوتے تھے..وہاں اس اجاڑ اور ویران ہال میں میں تنہا تھا..کرسیوں کے آگے میزوں پر دنیا کے تمام ملکوں کی تختیاں تھیں' ان پر وہ نام تھے جو یہاں فریاد لے کر آتے تھے..جنرل اسمبلی کا ہال خالی پڑا تھا..

''تارڑ صاحب'' خان صاحب نے مجھے تصویریں اتارنے میں مصروف پا کر کہا ''آپ نیچے اتر کر جنرل اسمبلی کے پوڈیم کے عقب میں کھڑے ہو کر تقریر کرنے کے انداز میں کھڑے ہو جائیں تو میں آپ کی تصویر اتارتا ہوں..اور آپ پاکستان واپس پہنچ کر ایک پریس کانفرنس طلب کر کے اس میں اعلان کرسکتے ہیں کہ مجھے خصوصی طور پر..نہایت منت سماجت کر کے..میری ادبی عظمت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یو این او جنرل اسمبلی کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تھی جو میں نے بادل نخواستہ قبول کرلی تھی' حوالے کے لیے ملاحظہ کیجیے یہ تاریخی تصویر..آئیے تارڑ صاحب!''

میں اپنی تمام تر منافقت کے باوجود خان صاحب کے مشورے پر عمل نہ کرسکا..اگرچہ ان کا کہنا تھا کہ بہت سے پاکستانی زعماء ایسا کرتے ہیں اور ایک ایسی تصویر ان کے ڈرائنگ روموں میں جگہ پا کر ان کی عظمت کی نشاندہی کرتی ہے..

خان صاحب نے مجھے یو این او کا چپہ چپہ دکھایا اور جب کوئی بھی چپہ باقی نہ بچا تو مجھے لنچ کے لیے یو این او کے مخصوص کیفے ٹیریا میں لے گئے جہاں صرف اس تنظیم کا عملہ خورونوش کا اہل ہے..جب ہم دونوں خوراک کے حصول کے لیے کاؤنٹر کے سامنے ایک قطار میں کھڑے اپنی باری کے منتظر تھے تو خان صاحب نے معذرت کی کہ تارڑ صاحب آپ کو زحمت تو ہو رہی ہو گی لیکن

جب جنرل پرویز مشرف یو این او میں خطاب کرنے کے لیے آئے تھے تو انہیں بھی ایک کپ کافی حاصل کرنے کے لیے یہیں قطار میں کھڑا ہونا پڑا تھا..

دریائے ہڈسن کے کناروں پر..یو این او کی عمارت کی شیشہ گری کے اندر کیفے ٹیریا میں لنچ کرتے ہوئے خان صاحب اپنے وطن..اپنے پشاور کو یاد کر رہے تھے..''تارڑ صاحب..ادھر نوکری کرتا ہوں تو مجبوری کے ساتھ کرتا ہوں..ادھر میرا جو فلیٹ ہے اس میں روزانہ کم از کم پانچ چھ پٹھان بھائی میرے مہمان ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح نیویارک پہنچ جاتے ہیں اور پھر سیدھے میرے ہاں پہنچ جاتے ہیں کہ تم پختون بھائی ہو تو ہم تمہارے ڈیرے پر تمہارا مہمان ہے..ہمیں ادھر رکھو اور کھلاؤ پلاؤ..تارڑ صاحب ادھر گزارا نہیں ہوتا..پشاور بہت یاد آتا ہے..کوشش کر رہا ہوں کہ یو این او اور نیویارک سے میری جان چھوٹ جائے اور میں ایک مرتبہ پھر اپنے وطن میں کسی تھانے میں تعینات ہو جاؤں..ادھر تو تارڑ بھائی کچھ نہیں ملتا..نہ نمک منڈی کا گوشت ملتا ہے..اور نہ قہوہ ملتا ہے تو ادھر ٹھہر کر کیا کرنا ہے۔''

مجھے یو این او اتنی یاد نہیں..

صرف نیلی وردی والا وہ پٹھان سکیورٹی اہلکار یاد ہے' جس نے باقاعدہ ایک بچھڑے ہوئے بھائی کی مانند مجھ سے محبت کی اور میری مہمانداری کی..کہ انسانی الفت کے سامنے ایک یو این او بھی حقیر ہو جاتی ہے..



''نیویارک پبلک لائبریری.. اور لیوز آف گراس''

میری آنکھوں کی سرخی میں سے نمی پھوٹنے لگی اور اس پر میرا کچھ اختیار نہ تھا..

شاید کسی سائنسی معجزے نے مجھے بدنی طور پر ہزاروں برس پیشتر قدیم یونان کے کسی ایسے معبد میں منتقل کر دیا تھا جو اپالو کے عظیم مندر سے بڑھ کر شان والا تھا.. کہ میں جس عمارت میں تھا اس کے دبیز یونانی ستون اس کی آسمان لگتی منقش اور سنہری چھت تک جاتے اوجھل ہونے لگتے تھے.. فانوس اور شمع دان روشن ہی روشن تھے اور ایک احترام بھری خاموشی تھی.. البتہ عود اور لوبان کی خوشبو نہ تھی ایک اور مہک تھی جو قدیم کتابوں کے بوسیدہ اوراق اور لفظوں کی سیاہی میں سے جنم لیتی ہے.. درجنوں کلومیٹر طویل بک شیلفوں میں جو دنیا بھر کی لاکھوں کتابیں محفوظ تھیں یہ ان سب کی مہک تھی اور دنیا کی ہر مہک سے برتر تھی کہ یہ علم کی مہک تھی..

مجھے گمان نہ تھا کہ نیویارک پبلک لائبریری علم کا ایک ایسا معبد ہے جو قدیم یونان کے دیوتاؤں کے معبدوں سے بھی زیادہ پرشکوہ اور پر تقدس ہے..

میں اس کے اندر داخل ہوا تو میری کیفیت.. احساس اور روحانی سرخوشی کی سطح پر.. وہی تھی جو مسجد قرطبہ' نوٹرڈیم' سینٹ پیٹرز کیتھڈرل یا مسجد امیہ میں داخل ہونے پر مجھ پر طاری ہوئی تھی.. یہاں بھی سجدہ ریز ہونے کی خواہش شدید تھی..

میں نے بہت ضبط کیا کہ آنکھوں کی سرخی میں سے جو نمی پھوٹنے لگی ہے اسے ظاہر نہ ہونے دوں' آنکھیں نہ جھپکوں' مبادا یہ سرخ جام چھلک جائیں اور سب جان جائیں کہ یہ شرمندگی

کے آنسو ہیں کہ.. ہم ایسے کیوں نہیں ہیں..

ہم کبھی ایسے ہی تھے.. قرطبہ' دمشق' بغداد' سمرقند اور بخارا میں ہم بھی ایسے ہی معبد تعمیر کیا کرتے تھے.. اور ان زمانوں میں ہر کتاب ہاتھ سے لکھی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ روشنائی اور کاغذ کے فرق کی وجہ سے ہر کتاب کی مہک بھی الگ ہوتی تھی.. اس میں کتابت کرنے والے کے پسینے اور موم بتی کی مہک کے علاوہ اس کے ہاتھ کی خوشبو بھی ہوتی ہوگی تو ان زمانوں کے کتب خانوں کے اندر کیسی مہک ہوگی.. ہاتھ سے لکھے جانے کے باوجود کتابوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی تھی.. اور وہاں بھی.. یہاں کی طرح کوئی قید نہ تھی مذہب' عقیدے' تاریخ' ثقافت یا جغرافیے کی.. اگر دنیا کے کسی بھی خطے میں علم ہے بے شک اس کی بنیاد الحاد پر ہو وہ ہمارا تھا.. اسی لیے تو اندلس کے ایک عظیم فلسفی نے کہا تھا کہ جو کچھ قرآن میں ہے وہ سچ ہے اور جو افلاطون کہتا ہے وہ بھی سچ ہے.. اگرچہ یہ مختلف سچ ہیں..

نیویارک پبلک لائبریری دنیا کی دسویں سب سے بڑی لائبریری ہے..

اور میں نے اپنے آپ کو حقیر اور پسماندہ اور بے چارا محسوس کیا کہ میں.. ایک پاکستانی مسلمان اس لائق ہی نہ تھا کہ علم کے اس مندر میں داخل ہوتا.. علم اور روشنی سے میرا کچھ سروکار نہ تھا.. ہمیں کم از کم پانچ سو برس گزر گئے تھے اندھیروں اور تعصب میں بھٹکتے ہوئے اور ہم آگاہ بھی نہیں تھے کہ ہم اندھیروں میں ہیں جب کہ یورپ روشنی میں ہے اور ہم آج بھی نہیں ہیں.. ایک اتوار کے دن جب میں سرما کی دھوپ سے اپنے آپ کو گرماتا اپنے ناخن کاٹ رہا تھا تو یکدم مجھے احساس ہوا کہ ہم مسلمانوں نے پچھلے پانچ سو برس میں ایک نیل کٹر بھی ایجاد نہیں کیا.. اور یہ ایک عجیب دکھی کر دینے والا خیال تھا.. ابھی انہی دنوں میں اپنے پیچھے جید علماء کرام جنہیں میں جہلاء کرام کہتا ہوں کا ایک فتویٰ چھوڑ کر آیا تھا.. ایسے علماء کی ایک کمیٹی نے پورے چار ماہ دینی کتب کا مطالعہ کر کے اور ملک بھر کے دیگر علماء سے اس معاملے میں مشورہ کرنے کے بعد فتویٰ دیا تھا کہ ہاں.. صرف دین کی ترویج کی خاطر کوئی فلم یا ویڈیو بنانا جائز ہے.. ان مقاصد کے سوا فلم اور ویڈیو بنانا سراسر حرام ہے لیکن.. ایک فوٹو.. ایک ساکت تصویر بنانا اور بنوانا اب بھی حرام ہیں.. اور بقول ان کے اسلام میں اس کی ہرگز گنجائش نہیں.. ظاہر ہے یہ حضرات یہ جانتے ہی نہیں کہ ایک فلم بھی سینکڑوں ساکت تصویروں سے ہی وجود میں آتی ہے.. لیکن اس نہلے پر ایک اور دہلا آتا ہے..

پرلطف المیہ یہ ہے کہ اس ''روشن خیال'' فتوے کو بھی کچھ دیگر شیوخ قبول نہیں کرتے اور اس مادر پدر آزاد روشن سوچ کو مطعون کرتے ہوئے بیان دیتے ہیں کہ یہ لوگ آج ویڈیو فلم کو جائز قرار دے رہے ہیں تو کل ٹیلیویژن دیکھنا بھی حرام قرار نہیں دیں گے..

میں اور بھی بہت کچھ اپنے پیچھے چھوڑ کر آیا تھا.. جس میں کرکٹ حرام تھی.. میراتھن ریس اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھی جسے روکنے کے لیے نوجوان سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے..

اور ہاں اسلام کے سوا دیگر مذاہب کے پیروکار پاکستان کے دو نمبر شہری تھے جن کے چرچ اور بستیاں جلا دینے میں کچھ حرج نہ تھا.. لیکن کوئی بھی ''مومن'' چاہے اس کا کردار کیسا بھی ہو اگر ایک غیر مسلم کی جانب انگلی اٹھا کر کہہ دیتا ہے کہ یہ ہتک کا مرتکب ہوا ہے.. یا ایک ان پڑھ بچے کو مسجد کی دیوار پر ''لکھتے'' ہوئے دیکھ لیتا ہے تو وہ شخص اور وہ بچہ یقینی موت سے ہمکنار ہوگا.. اس کے لیے کوئی تفتیش' کوئی وضاحتی بیان درکار نہیں.. اول تو اسے حوالات میں بند دیگر مومنین قیدی کیفر کردار کو پہنچا دیں گے اور اگر کوئی جج اسے بے گناہ قرار دینے کی ناپاک جسارت کرے تو وہ جج بھی جہنم واصل کر دیا جائے گا..

میں اس کے سوا بھی بہت کچھ پیچھے چھوڑ کر آیا تھا اور اُس کی تفصیل میں جانے کے لیے بہت سی کتابیں لکھنے کے لیے وقت چاہیے اور ایسی خودکشی کے لیے کچھ وقت چاہیے..

میں نے یہاں مبالغے سے ہرگز کام نہیں لیا کہ جب میں نیویارک پبلک لائبریری کے وسیع ہال میں داخل ہوا ہوں.. تو بلند چھت تلے' اس سے لٹکتے عظیم فانوسوں کی روشنی میں پرانی طرز کے ٹیبل لیمپوں تلے کھلی کتابوں پر جھکے.. عقیدت اور احترام سے جیسے وہ علم کی دیوی کے آگے سجدہ ریز ہو رہے ہوں ہزاروں افراد کو ایک خود فراموشی کے خمار میں گم پایا تو واقعی میری آنکھوں میں نمی آ گئی کہ ہم ایسے کیوں نہیں رہے.. ہم سالانہ مذہبی اجتماعوں میں لاکھوں کی تعداد میں شریک ہو کر گڑگڑا کر مختلف دعائیں مانگنے کے بعد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں.. اگر وہ لاکھوں لوگ ایک ایک کتاب خرید کر علم کا ایک ایسا معبد تعمیر کر لیں تو کچھ حرج ہے.. ویسے ہم تنگ نظری' تعصب اور اپنے ہی عقیدے کے لیے پرجوش ہو کر جام شہادت نوش کرنے والوں کے مدرسوں کی تو دل کھول کر مدد کرتے ہیں کہ اس میں ثواب کی سہولت ہے.. اور ایک ایسی نہ سہی اس سے کہیں کمتر سی لائبریری بنانے کے لیے مدد کرنا اس لیے کاربیکار ہے کہ اس میں ثواب کی گنجائش دکھائی نہیں دیتی..

لائبریری کے ایک برآمدے میں دیوار پر ایک بہت پرتاثیر چھت تک پہنچتی ہوئی ایک تصویر نقش ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور سے اترتے ہوئے مصور کیا گیا ہے.. پس منظر میں وہ پُرنور جھاڑی ہے جس میں سے پھوٹتے ہوئے نُور سے ہم کلام ہو کر وہ اس نور کے نازل کردہ دس احکام کی سنگی تختی ہاتھوں میں تھامے ہوئے آ رہے ہیں.. میں نے اس تصویر کی نیچے رکھے ہوئے ایک بنچ پر بیٹھ کر ایک خصوصی تصویر اتروائی کہ اے موسیٰ.. آپ آل ابراہیم میں سے ہو اور میں بھی دین ابراہیمی کا پیروکار اور اپنے بابا پر ایمان رکھنے والا ہوں جنہوں نے جنگ بدر کے پڑھے لکھے قیدیوں سے یہ کہا کہ تم ہم کو وہ کچھ پڑھا دو جو تم جانتے ہو تو تم آزاد ہو.. اگر تمہیں علم کے حصول کے لیے چین بھی جانا پڑے.. اور جس پر اترنے والے صحیفے میں ہر دوسری سطر پر غور کرنے کی ہدایت ہے اور جس میں ایک عالم کو ایک عبادت گزار پر فوقیت دی گئی ہے اور ایک دانشور کے قلم کی سیاہی کو شہیدوں کے خون پر بھی فضیلت دی گئی ہے تو اے موسیٰ میں اس قوم میں سے ہوں جس نے یہ سارے احکام بھلا دیئے ہیں..

میں اس کائنات نما لائبریری کے تمام حصوں میں تو نہیں جا سکتا تھا کہ اس کے لیے ایک عمر درکار ہے.. ایک ہال میں دنیا کے قدیم ترین نقشے نمائش پر تھے.. یورپ' ایشیا' امریکہ کے اولین تفصیلی نقشے' سرزمینیں' سمندر' جزیرے اور صحرا.. سینکڑوں برس پہلے کے نقش.. جن کی مدد سے مغرب' مشرق پر حاوی ہو گیا.. اور ہم اسی مخمصے میں رہے کہ تصویر حرام ہے یا حلال.. اور آج عید کا چاند نظر آئے گا یا نہیں..

میں اُن دنوں وطن لوٹا تو اخباروں میں.. میڈیا پر.. اور گلی کوچوں میں صرف ایک مسئلہ زیر بحث تھا کہ رویت ہلال کمیٹی کا فیصلہ درست تھا یا نہیں.. اگر مسلم امہ میں تین عیدیں منائی گئی ہیں تو ان میں سے کون ہے جس کی عید جائز ہے اور کون ہے جس نے اس روز روزہ رکھ کر شیطان کی پیروی کی.. اس فیصلے کے مطابق تقریباً نصف اسلامی دنیا شیطان کی پیروکار تھی.. اگرچہ وہ نصف دنیا اِس نصف دنیا کو شیطان کے پیروکار ٹھہرا رہی تھی..

اور جب کبھی.. اور یہ تو ہر بار ہوتا رہتا ہے' عید کے چاند کا قضیہ کھڑا ہوتا رہتا ہے تو مجھے ہمیشہ اپنے ایک چاچا علامہ انڈوں والے یاد آ جاتے ہیں.. وہ ہمارے آبائی گاؤں جوکالیاں میں پیدا ہوئے اور ابا جی کے نزدیکی دوست تھے.. قسمت کے کاروبار انہیں گاؤں سے لاہور کے ایک

ہی بازار چیمبرلین روڈ پر لے آئے جہاں گوالمنڈی چوک کے ایک چھوٹے سے کھوکھے میں علامہ انڈوں کا تھوک بیوپار کرتے تھے اور پرانی سبزی منڈی کے عین سامنے بیجوں کی دکان ہماری ''کسان اینڈ کمپنی'' تھی.. جہاں اباجی بیٹھتے تھے اور ظاہر ہے میں بھی ایک عرصہ اسی کاروبار سے متعلق رہا..علامہ صاحب صبح نو بجے تک انڈوں کی پیٹیاں فروخت کر کے فارغ ہو جاتے اور باقی دن ایک دھوتی اور بنیان میں ملبوس گوالمنڈی میں چہل قدمی کرتے.. کشمیری نژاد، بہت گورے چٹے اور اگر ایک کشمیری مہاتما بدھ ہوتا تو وہی ہوتے..وہی وسیع توند بڑے بڑے چپو نما کان اور جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے.. مذہب کے پابند لیکن ملاؤں کے ویری..موصوف بچپن میں اپنے گھر سے فرار ہو گئے کہ انہیں ستاروں کا علم حاصل کرنے کا جنون تھا..خجل خوار ہوتے دربدر ہوتے اپنے جنون کے ڈسے ہوئے بالآخر مدراس کے قریب کسی ایسے مندر تک جا پہنچے جو ستاروں کے علم کی ایک قدیم درسگاہ بتایا جاتا تھا لیکن اس میں صرف ہندو داخل ہو سکتے تھے.. چنانچہ علامہ صاحب نے اس کچی عمر میں ہندومت کا خوب مطالعہ کیا..سنسکرت سیکھی اور پھر بڑی آسانی سے ایک کٹر ہندو کے طور پر اس مندر میں قبول کر لیے گئے..ان کا کہنا تھا کہ ان طویل برسوں میں بھی جب وہ ایک فلسفی براہمن سے کائنات کی تعلیم حاصل کرتے رہے..ایک نماز قضاء نہ کی..اس دوران انہوں نے ہزاروں برس پیشتر لکھی گئی علم نجوم کی کتابوں کے علاوہ ویدوں کا بھی مطالعہ کیا..

اس قدیم ہندو درسگاہ سے گوالمنڈی چوک میں انڈوں کے کاروبار کے درمیان میں اُن کی جو حیات تھی میں اُس سے ناواقف تھا..اباجی اور ان کی بہت گاڑھی چھنتی تھی کہ دونوں کتابوں کے رسیا تھے..اکثر اوقات وہ توند پر سے پھسلتی دھوتی کو اڑستے دکان میں جھانکتے کہ چودھری صاحب ہیں! اور میں باہر آ کر ان کی منت سماجت کر کے دکان کے اندر لے آتا کیونکہ پیچیدہ فلسفے ان کے بیان سے عام فہم ہو جاتے اور مذہب کی الجھنوں کو وہ یوں دور کرتے کہ شک کی کوئی گنجائش نہ رہتی..میں جان بوجھ کر کسی نہ کسی مسئلے پر کوئی غیر ذمہ دار بات کہہ جاتا تا کہ وہ بولیں اور میں ان سے کچھ آگاہی حاصل کر سکوں..ایک روز تشریف لائے تو میں نے چھوٹتے ہی کہا کہ علامہ جی..یہ بتائیں کہ اللہ ہے بھی یا نہیں..میرا تو خیال ہے کہ ذہن انسانی کی اختراع ہے..اگر ہے تو نظر کیوں نہیں آتا..انہوں نے مجال ہے کسی قسم کا کوئی ردعمل ظاہر کیا ہو، ایک دیسی مولی کو نمک مرچ لگاتے بڑے شوق سے نوش کرتے رہے..پھر اٹھے، میرا ہاتھ تھاما اور دکان سے باہر تھڑے پر

لے گئے..مجھے یاد ہے کہ اس روز بازاروں اور گلیوں میں سرما کی دھوپ کا سنہری پن اترا ہوا تھا یہاں تک کہ تاج سبزی والے کی سبزیاں بھی سنہری دکھائی دے رہی تھیں اور ایک ہلکی سی دھند تھی جس میں چلتے تانگوں کے گھوڑے بھی ایک طلسم ہوشربا لگ رہے تھے..علامہ صاحب نے موچی دروازے کی جانب جاتی سڑک کی طرف اشارہ کر کے کہا..کیا یہاں سے گوجرانوالہ نظر آ رہا ہے؟

اگر میں علامہ صاحب کو نہ جانتا تو یہ ایک خبطی کا لایعنی سوال ہوتا لیکن میں جانتا تھا کہ اس میں بھی کوئی رمز پوشیدہ ہے چنانچہ میں نے مسکرا کر کہا ''علامہ صاحب یہاں سے گوجرانوالہ کیسے نظر آ سکتا ہے؟..''

''اُدھر گوجرانوالہ ہے یا نہیں؟''

''ہے..''

''تو نظر کیوں نہیں آتا؟''

''اس لیے کہ نظر کے راستے میں حائل عمارتیں اور مکان ہیں، آبادیاں اور قصبے ہیں..''

''فرض کرو یہ حائل نہ ہوتے..یہاں سے وہاں تک ایک ہموار میدان ہوتا تو کیا تب تمہیں گوجرانوالہ نظر آ جاتا؟''

''نہیں..''

''کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ نظر کی ایک حد ہوتی ہے..وہ ایک خاص مقام تک ہی جا سکتی ہے..اُس کے آگے نہیں جا سکتی..''

''تو تمہاری نظر ایک خاص حد تک ہی جا سکتی ہے مگر اُس سے آگے نہیں..تو اُس سے آگے گوجرانوالہ تو ہے ناں..ہے ناں؟''

''ہے..''

''اسی طور اللہ..ہے..نظر میں وسعت پیدا کر لو تو نظر آ جائے گا..''

دراصل میں ایک عید کے چاند کا قصہ آپ کو سنانا چاہتا تھا لیکن درمیان میں گوجرانوالہ آ گیا..

انتیسواں روزہ تھا اور میں دکان پر ناتواں اور نڈھال بیٹھا تھا کہ علامہ صاحب آ گئے ''علامہ صاحب دعا کیجیے کہ آج چاند نظر آ جائے..مجھ میں تو ایک اور روزہ رکھنے کی سکت باقی نہیں رہی..''

تو وہ دھیرے سے بولے ''کل عید ہے.. آج چاند نظر آئے گا..''

''علامہ صاحب.. ابھی تو آج شام رویئت ہلال کمیٹی کے اراکین کراچی کی سب سے بلند عمارت حبیب بینک پلازہ کی چھت پر براجمان ہو کر دوربینوں سے چاند دیکھیں گے.. پھر فیصلہ ہوگا' کل عید ہے یا نہیں؟''

''کل عید ہوگی'' وہ جلال میں آ گئے ''آج چاند ہوگا تو کل عید کیوں نہیں ہوگی؟''

''لیکن علامہ صاحب.. ابھی تو جید علماء کرام نے..''

اس پر علامہ صاحب نے جید علماء کرام کے بارے میں جن پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا وہ میں لکھ دوں تو یہ سفید کاغذ بھی سرخ ہو جائے.. اپنے تمام تر علم اور شرافت کے باوجود وہ کشمیری تھے اور گوالمنڈی میں رہتے تھے یعنی سونے پر سہاگا تھا چنانچہ گالیاں نہایت تفصیل سے دیتے تھے اور لفظوں سے تصویر بنا کر سامنے لے آتے تھے.. گرج کر بولے ''اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود فرمایا ہے کہ یہ چاند سورج ایک طے شدہ نظام کے تحت چلتے ہیں' تو پھر کیسے نہیں چل سکتے.. یہ مولوی نہ صرف اللہ کے منکر ہیں بلکہ قرآن کو بھی نہیں مانتے' دوربینوں سے چاند تلاش کرتے ہیں.. یعنی یہ سارا کائناتی نظام انکل پچو ہے کہ آج چاند نظر آ گیا تو نظام چل پڑا ورنہ ان مولویوں کے لیے رک گیا.. لاحول ولا.. حضورؐ کے سب سے آخری صاحبزادے حضرت ابراہیم بھی انتقال کر گئے تو اس روز سورج گرہن لگ گیا جس پر چند لوگوں نے کہا کہ چونکہ ایک پیغمبر کے بیٹے کی وفات ہوئی ہے اس لیے ایسا ہوا ہے.. اس پر سرور کائنات اپنے تمام تر دکھ اور رنج سے باہر آئے اور کہنے لگے کہ جان لو یہ سورج چاند ستارے اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ نظام کے تحت چل رہے ہیں ان پر ایک پیغمبر کے بیٹے کی موت کا بھی اثر نہیں ہو سکتا.. اور یہ مولوی.. ہوائی جہازوں پر چڑھے بیٹھے دوربینوں سے چاند تلاش کر رہے ہیں..''

کچھ دیر بعد ان کا طیش ذرا دھیما ہوا تو کہنے لگے.. افسوس صد افسوس.. ہم مسلمانوں نے ایک ہزار برس پیشتر سورج چاند ستاروں کو مسخر کر لیا تھا.. اندلس میں روایت کے لیے چاند دیکھتے تھے ورنہ سات سو برس کے دوران ہر عید کے چاند کا اعلان پہلے سے ہو جاتا تھا.. اب اگر ہم نالائق ہو گئے ہیں تو چاند پر انسان کو بھیجنے والے ادارے سے ہی دریافت کر لیں کہ اس ماہ چاند کب نکلے گا.. اور ایسا نہ کر سکیں تو اہل ہنود کی ہزاروں برس پیشتر کی لکھی گئی کتابوں میں سے ہی کچھ روشنی

حاصل کریں جن میں اگلے ہزاروں برسوں میں نکلنے والے چاندوں کی تاریخیں طے شدہ ہیں..''

علامہ صاحب کے اس طویل اگرچہ فکر انگیز لیکچر کی وجہ سے مجھے روزہ زیادہ لگنے لگا.. میں نے کہا ''علامہ صاحب.. یہ چمن تو یونہی رہے گا.. آپ بس ایک مرتبہ پھر مجھے یقین دلا دیں کہ آج چاند بہر صورت نظر آ جائے گا تو میرا روزہ آسان ہو جائے گا..''

کہنے لگے ''ایک کاغذ نکالو..''

میں نے ایک سفید کاغذ ان کے سامنے رکھ دیا.. انہوں نے کچھ سوچ بچار کیا اور اس پر کچھ تاریخیں لکھ کر میرے آگے کر دیا.. ''اگلے بیس برسوں میں عیدالفطر کون کون سی تاریخوں کو ہوگی.. یہ میں نے لکھ دیا ہے.. میں اتنے برس تو زندہ نہیں رہوں گا لیکن تم دیکھتے رہنا اور اگر میرے حساب کتاب میں کوئی ایک غلطی بھی ہوئی تو اپنے انڈوں والے چاچے پر بے شک لعنت بھیجنا..''

وہ کاغذ میں نے بہت برس سنبھالے رکھا.. علامہ صاحب کی وفات کے دو تین برس بعد تک بھی سنبھالے رکھا.. اور چاند ان کی لکھی گئی تاریخوں کے عین مطابق طلوع ہوتا رہا.. اور اگر کبھی علمائے کرام بیان دیتے ہیں کہ آج چاند نظر نہیں آیا اور کل عید نہیں ہوگی تو اگلے روز کا چاند پہلی کا چاند نہ ہوتا..

تو میں ایک ایسے معاشرے سے آیا تھا جہاں اب تک چاند کے نکلنے کا تعین نہیں ہو پایا تھا.. یہ نہیں کہ اس معاشرے پر صرف جہلائے کرام کی حکمرانی ہے.. بلکہ وہاں علامہ انڈوں والے ایسے شخص بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان کی قدر نہیں ہوتی اور وہ انڈے فروخت کر کے اپنی حیات کے دن پورے کرتے رہتے ہیں..

موجودہ مغرب اور امریکہ کی عظمت کی بنیاد سراسر تحقیق اور جستجو میں ہے جب کہ اس لمحۂ موجود میں ہم نے اپنی بنیاد جہالت اور تعصب پر رکھ دی ہے اور اس کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا.. اس غلبے کے آثار مجھے تو نظر نہیں آتے.. جب کبھی کوئی قوم دنیا پر غالب آتی ہے تو وہ صرف اپنے علم کے زور پر غالب آتی ہے اور اس کے آثار کم از کم سو دو سو برس پہلے ہویدا ہونے لگتے ہیں.. وہ آثار کہاں ہیں؟..

امریکہ کے طول و عرض میں کتابوں کی ایک دکان ہے ''بارنز اینڈ نوبلز'' جس کی سینکڑوں شاخیں ہیں اور ہر بڑے شہر کی تقریباً ہر سٹریٹ پر آپ کو کتابوں کے یہ سٹور نظر آ جائیں

گئے' یہ دنیا بھر میں شائع ہونے والی انگریزی اور دیگر بڑی زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں' جرائد اور علمی کیسٹس کے سپر سٹور ہیں جن کی عمارتیں شاہانہ انداز کی پرسکون پناہ گاہیں ہیں..آپ پر کچھ فرض نہیں کہ آپ ان کے اندر جا کر وہاں سے کچھ خریدیں..کوئی بھی شخص آپ سے یہ دریافت نہیں کرے گا کہ آپ پچھلے تین گھنٹوں سے صرف کتابوں اور رسائل کی ورق گردانی کر رہے ہیں تو کیوں کر رہے ہیں..بلکہ ان سٹورز میں نہایت ہی آرام دہ گوشے ہیں جہاں آپ پہروں مطالعے میں مصروف رہ سکتے ہیں..جی چاہے تو سٹار بک کافی کا ایک کپ خرید کر جب تک جی چاہے بیٹھ سکتے ہیں..بے شک کوئی ایک کتاب پوری کی پوری پڑھ کر اسے واپس بک شیلف میں رکھ کر ہاتھ لٹکاتے شام کو باہر چلے جائیے کوئی معترض نہیں ہوگا..بلکہ آپ کا شکریہ ادا کیا جائے گا کہ آپ تشریف لائے..بے شمار طالب علم' ادب کے رسیا اور محقق یہاں کتابوں کے ڈھیر لگائے استراحت فرماتے ہیں اور روزانہ فرماتے چلے جاتے ہیں تب بھی کچھ تعرض نہیں کیا جاتا..یہ سُپر سٹورز دراصل سینکڑوں ایسی لائبریریاں ہیں جہاں آپ کو تازہ ترین کتابیں اور رسائل میسر ہیں..صرف یہ کہ عام لائبریریوں کی مانند آپ انہیں ایشو کروا کے ساتھ نہیں لے جا سکتے..ان گوشوں میں بیٹھ کر صبح سے شام تک ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں..

فلوریڈا میں عینی مجھے ایک روز دوپہر کے کھانے کے لیے ایک ریستوران چین ''پنیرا برڈ'' میں لے گئی جہاں بریڈ یعنی ڈبل روٹی کی طرح طرح کی شکلیں اور ذائقے تھے..بلکہ ایک فٹ بال کے سائز کی گول بریڈ کا پیالہ سا بنا کر اُس میں سوپ سرو کیا جاتا ہے..آپ سوپ کے ہمراہ اس روٹی پیالے کو بھی کُھرچ کُھرچ کر کھاتے چلے جاتے ہیں..میں نے مشاہدہ کیا کہ ریستوران کی روشن کھڑکیوں کے پہلو میں متعدد ایسی نشستیں ہیں جہاں دفتر کے دفتر کھلے ہیں.. فائلیں اور لیپ ٹاپ کھلے ہیں..کتابیں کھلی ہیں اور متعدد خواتین اور حضرات نہایت یکسوئی سے یا تو کچھ لکھ رہے ہیں یا کچھ پڑھ رہے ہیں..میں نے عینی سے پوچھا تو وہ کہنے لگی ''ابو اس ریستوران چین میں یہ خصوصی سہولت ہے کہ کوئی بھی آئے' کافی کا ایک کپ خریدے اور بے شک سارا دن یہاں اس کے آرام دہ ماحول میں بیٹھا پڑھتا لکھتا رہے..اور کوئی بھی شخص اس سے یہ پوچھنے کا مجاز نہیں کہ آپ صرف ایک کپ کافی خرید کر پچھلے سات گھنٹوں سے یہاں براجمان کیوں ہیں..بلکہ ریستوران چین اس بات پر فخر کرتی ہے کہ ان کے ہاں پڑھنے لکھنے والے لوگ آتے ہیں اور ان کا

شکریہ ادا کیا جاتا ہے..

میرا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ سلجوق کے دسویں منزل پر واقع فلیٹ کے نیچے براڈوے میں جمعہ اور ہفتہ کی رات کو اتنا بے پناہ ہنگامہ ہوتا تھا کہ میری نیند حرام ہو جاتی تھی..نیچے کولمبیا یونیورسٹی کے طالب علم غل غپاڑہ کر رہے ہیں..گیت گا رہے ہیں..گٹاریں بجا رہے ہیں اور بے خود ہوتے جا رہے ہیں لیکن جونہی اتوار کی شب اترتی ہے تو نیچے براڈوے سٹریٹ میں اُلّو بولنے لگتے ہیں.. سکوت طاری ہو جاتا ہے جیسے کرفیو لگ گیا ہو کہ وہی غل غپاڑہ کرنے والے طالب علم اب پڑھائی میں جُت گئے ہیں..

وہ جب تفریح کرتے ہیں تو بے دھڑک اور دل کھول کر..جی بھر کے کرتے ہیں اور جب کام کرتے ہیں تو انہیں اس کے سوا کچھ ہوش نہیں رہتا..

ایک ہسپانوی نژاد امریکی لڑکی..جس کے آبائی دیس میں چشم غزال آج بھی عام ہے اور اس کی غزالی آنکھوں میں خمار ہے' تنگ جین اور تنگ تر بلاؤز میں اپنے آپ کو چھلکاتی پھرتی ہے..ویک اینڈ گزر جانے پر دنیا کی سب سے زیادہ سنجیدہ اور سوبر لڑکی ہو جاتی ہے..کتابوں پر سر جھکاتی ہے تو بقیہ ہفتہ اپنا سر اٹھاتی نہیں..

سلجوق کا کہنا تھا کہ ابو شاید ہم مشرقیوں میں صبر اور استقامت اور میانہ روی کے جینز کم ہیں..میں یونیورسٹی لائبریری میں مطالعہ کرنے کے لیے بیٹھتا ہوں تو کچھ دیر بعد بے چین اور بے صبر ہو جاتا ہوں اور ٹہلنے کے لیے نکل جاتا ہوں..کافی کا ایک پیالہ پیتا ہوں اور پھر واپس اپنی نشست پر آ بیٹھتا ہوں..لیکن میرے برابر میں میری ایک کلاس فیلو امریکی لڑکی پڑھائی کے لیے آ کر بیٹھتی ہے..جو ویک اینڈ پر گانے گاتی مخمور ہو کر میزیں الٹ رہی ہوتی ہے تو وہ جب آ بیٹھتی ہے تو اگلے آٹھ گھنٹوں میں ٹس سے مس نہیں ہوتی..سر جھکائے مطالعے میں مصروف رہتی ہے.. بلکہ کتابوں میں دفن ہو جاتی ہے..یا پھر مسلسل نوٹس تیار کرتی رہتی ہے اور اس دوران مجھے تو لگتا ہے کہ نہ وہ واش روم جاتی ہے نہ کافی پیتی ہے اور نہ کسی سے بات کرتی ہے..بس بیٹھی رہتی ہے تو شاید ان کے جینز میں ہی صبر' استقامت' جستجو اور علم کی پیاس ہے..اگر ہمیں کوئی بہت ہی آسان پروجیکٹ ملتا ہے..فرض کر لیجیے کہ یہ ثابت کرنا ہے کہ دو جمع دو..چار ہوتے ہیں تو ہم..یعنی مشرقی اس کو سنجیدگی سے نہیں لیتے کہ اس کا کیا ہے یہ تو ثابت شدہ ہے تو جب پوچھا جائے گا تو ثابت

کر دیں گے لیکن ان لوگوں کی جان عذاب میں آ جاتی ہے.. دن رات تحقیق کریں گے.. حوالے تلاش کریں گے.. اپنے آپ کو ہلکان کر لیں گے کہ اگر پروجیکٹ دیا گیا ہے تو یہ بے شک ثابت شدہ ہے لیکن ہم نے پھر سے ثابت کرنا ہے..

میں یونہی کچھ مدت آنکھوں میں آئی ہوئی نمی سنبھالتا علم کے اس عظیم.. نیویارک سنٹرل لائبریری کے طول وعرض میں گھومتا رہا اور پھر قدرتی طور پر تجسس ہوا کہ میں کھوج تو لگاؤں کہ یہاں میری ثقافت اور زبان کے کچھ آثار بھی ہیں یا نہیں اور وہ ساؤتھ ایشین ڈیپارٹمنٹ میں ہی ہو سکتے تھے جو استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ لائبریری کی دوسری منزل پر واقع ہے.. اور یہ ایک نہایت گمشدہ اور خاموش سا کُنج تھا. کتابوں سے لبریز ایک مختصر کمرہ تھا جہاں ایک میز کے گرد چند لوگ مطالعے میں محو تھے اور ان کے سامنے ڈیسک پر نیلی شرٹ اور لنن کے ڈھیلے سفید گرمائی سوٹ میں ملبوس ایک کلاس ٹیچر کی مانند بیٹھے ایک معنک بابا جی کہ ان کے بال سراسر سفید تھے بلکہ بھویں بھی برف ہو رہی تھیں اور وہ ایک کمپیوٹر پر جھکے دین دنیا سے غافل تھے.. میں اندر گیا تو نہ ان معنک بابا جی نے اور نہ ہی میز کے گرد مطالعے میں مصروف حضرات میں سے کسی ایک نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا کہ کون آیا ہے.. میں شیلفوں کے آگے اپنی ناک قریب کئے ان میں لگی کتابوں پر آنکھیں رکھتا ان کے ٹائٹل پڑھتا خاموشی سے سرکتا رہا.. اردو زبان کی ایک ضخیم لغت تھی متعدد جلدوں میں.. ایک انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تھی.. ان کے علاوہ ہندی' مراٹھی' بنگالی اور دیگر ایشیائی زبانوں کی کتابوں کی قطاریں تھیں..

معنک بابا جی اگر یہاں چودھری بنے بیٹھے تھے تو یقیناً اسی شعبے سے متعلق تھے چنانچہ میں نے ان کے قریب ہو کر سرگوشی کی ''معاف کیجیے گا.. میں پاکستان سے ہوں اور میری خواہش ہے کہ آپ کے شعبے میں اردو زبان کی جو کتابیں ہیں انہیں دیکھوں.. کیا آپ مدد کر سکتے ہیں؟''

معنک بابا نے کمپیوٹر سے اپنا سفید سر اُٹھا کر مجھے نہیں اور پرچھت کی جانب دیکھا.. یقیناً اس کے پلے نہیں پڑا تھا کہ میں کس زبان کی بات کر رہا ہوں چنانچہ میں نے پھر حسب سابق سرگوشی میں ذرا ٹھہر ٹھہر کر عرض کیا کہ.. اردو.. یو آر ڈی یو.. اردو زبان کی کتابیں..

تب وہ بابا چھت سے نظریں نیچی کر کے میرے چہرے تک لائے' ہونٹ بھینچ کر مسکرائے ''مجھے پتا ہے کہ.. اردو.. اور مجھے پتا ہونا چاہیے کہ میں نیویارک پبلک لائبریری کے

ساؤتھ ایسٹ ایشین ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ڈاکٹر فلاں ہوں.. اردو کتابوں کی فہرست آپ اس کمپیوٹر سے لے لیجیے..'' انہوں نے ایک بیکار پڑے کمپیوٹر کی جانب اشارہ کیا اور پھر اپنے کمپیوٹر میں غرق ہونے کو تھے جب میں نے عرض کیا کہ.. آئی ایم سوری ڈاکٹر صاحب.. میں کمپیوٹر آپریٹ نہیں کر سکتا کیا آپ اس سلسلے میں میرے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں پلیز..

ڈاکٹر نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے کہہ دیا ہو کہ سوری میں اپنی قمیض کے بٹن بند نہیں کر سکتا یا پتلون کی زپ نہیں چڑھا سکتا لیکن میں کیا کر سکتا تھا کہ میرے بچے اتنے بے صبرے تھے کہ مجھے کمپیوٹر کچھ اس طرح سکھاتے تھے کہ ابا.. یہ.. یہ.. اور یہ اب آن ہو گیا ہے.. اب یہاں چلے جائیے.. یہ کھولئے.. یہ بٹن دبا کر ای میل چیک کیجیے.. اور ادھر سے ویب سائٹ کھول لیجیے اور پھر وہاں چلے جائیے.. اور مجھے حرام ہے جو کچھ بھی پلے پڑتا ہو کہ وہ یہ سب کچھ اتنی شتابی سے کرتے تھے کہ میرا ذہن پیچھے رہ جاتا تھا اور ان کی ماؤس پر رکھی انگلی کوسوں دور نکل جاتی تھی.. نہ اس میں ان کا کوئی دوش تھا کہ وہ اپنے عہد کی روشنی کی رفتار سے چلے جاتے تھے اور نہ میرا ہی کچھ قصور تھا کہ میرا ذہن ابھی تک ایک تانگے پر سوار ٹپ ٹپ کرتا چلتا جاتا تھا.. تو میں نے اسے ایک کارلاحاصل سمجھ کر چھوڑ دیا..

ڈاکٹر جب ایک طویل عرصہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے دیکھتے بور ہو گئے تو مجھ پر ترس کھا کر نیویارک پبلک لائبریری میں جتنی بھی اردو کتابیں موجود تھیں انہیں کمپیوٹر کی سکرین پر لے آئے.. اور ان کی تعداد بہت قلیل تھی.. کچھ لغات تھیں.. کچھ نول کشور لکھنؤ والے کی کتابیں تھیں اور وہ بھی غیر معروف.. اسلام کے بارے میں کچھ کتابیں تھیں لیکن اردو ادب کے حوالے سے اردو کی کوئی کتاب دکھائی نہ دیتی تھی..

میں نے ڈاکٹر صاحب سے شکایت کے لہجے میں سبب پوچھا تو وہ کہنے لگے.. ''پورے امریکہ میں اس لائبریری کی شاخیں موجود ہیں جہاں مقامی آبادی کے ذوق کے مطابق.. ان کی زبانوں میں کتابیں موجود ہوتی ہیں.. وہاں اردو کی کتابیں بھی یقیناً ہوں گی لیکن یہاں.. بس یہی کچھ ہے..''

مجھے کچھ رنج ہوا کہ یہاں دنیا کی دسویں بڑی لائبریری میں.. علم کے اس معبد میں جس کے اندر داخل ہونے پر میری آنکھوں میں نمی آ گئی تھی وہاں اردو کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر

تھی.. انگلینڈ' ڈنمارک' ناروے اور سویڈن وغیرہ میں اکثر لائبریریوں میں اردو کی کتابیں میسّر ہیں کیونکہ ان ملکوں میں بہت سے پاکستانی مقیم ہیں جو اردو کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں.. پاکستانی تو نیویارک میں بھی بہت ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس لائبریری میں اردو کتابوں کا قحط ہے.. یا تو یہ پاکستانی ادھر کا رخ نہیں کرتے اور یا پھر یہاں کی انتظامیہ بوجوہ اردو سے بے اعتنائی برتتی ہے..

میرے رنج کو محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے ذرا معذرت طلب لہجے میں کہا "دراصل ہمارے اس شعبے میں ایک عرصے کے بعد تم ایسے شخص ہو جو آئے ہو اور اردو کی کتابوں کے بارے میں دریافت کیا ہے.. ویسے تو دنیا کی ہر زبان اہم ہوتی ہے لیکن اردو.." جانے کیوں انہوں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر میرا حال احوال پوچھا کہ کیا نیویارک میں ہی رہتے ہو یا کسی اور ریاست میں مقیم ہو.. تو میں نے انہیں بتایا کہ میں تو نیویارک میں صرف حال مقیم ہوں.. پاکستان سے آیا ہوں.. اور جو انہوں نے نہیں پوچھا تھا وہ خود سے بتا دیا کہ اردو زبان کا لکھنے والا ہوں.. اور پھر خود ہی پیشکش کر دی کہ اگر پسند کریں تو اپنی ایک دو کتابیں آپ کی لائبریری کی نذر کر دوں.. میرے احباب اور آشنا خوب جانتے ہیں کہ میں اپنی کتابیں کم ہی نذر کیا کرتا ہوں کیونکہ سچی بات ہے میں انہیں خرید کر تقسیم کرنا افورڈ نہیں کر سکتا.. جیسے پکاسو نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میرے گھر میں میری اپنی بنائی ہوئی تصویریں اس لیے نہیں ہیں کہ وہ بہت مہنگی ہیں اور میں انہیں خریدنا افورڈ نہیں کر سکتا.. ایسے میرے گھر میں بھی میری اپنی کتابیں کم ہی دکھائی دیتی ہیں.. میرے ناشر سنگ میل چونکہ مجھے کتابوں کے عوض ایک زر کثیر عطا کرتے ہیں تو وہ کیسے مجھے ایک ڈھیر کتابوں کا مفت عطا کر سکتے ہیں یا تو آپ رائلٹی وصول کرتے ہیں یا پھر بہت سی کتابیں.. تو میں نے اگر دل کڑا کر کے اس معنک ڈاکٹر باباجی کو اپنی ایک دو کتابیں نذر کرنے کی پیشکش کی تھی تو اس پیشکش کے پس منظر میں ایک غرض' ایک بہت بڑا لالچ تھا.. میری خواہش تھی کہ نیویارک لائبریری کے شیلفوں میں جو لاکھوں کتابیں محفوظ ہیں ان میں میری چند کتابیں بھی شامل ہو جائیں' شاید اسی طور آئندہ زمانوں میں میری تحریر کے کچھ آثار پہچانے جائیں.. بس یہی غرض تھی..

"کیوں نہیں.. کیوں نہیں" بابا معنک نے عینک اتار کر مجھے چندھیائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر عینک ناک پر رکھ لی "یہ تو ایک اعزاز ہو گا.. کیا آپ کے پاس کتابیں موجود ہیں؟"

"نہیں.. اگر آپ اجازت دیں تو میں کل آ سکتا ہوں.."

"کیوں نہیں.. کیوں نہیں" اور پھر حیرت انگیز طور پر معنک بابا نے اس میں "انشاءاللہ" کا اضافہ کر دیا چنانچہ جواب میں میں نے بھی ایک پرجوش "انشاءاللہ" کہہ کر ان سے ہاتھ ملایا اور رخصت کی اجازت چاہی.. جو انہوں نے بخوشی دے دی کیونکہ میں ان کا کافی وقت ضائع کر چکا تھا..

آج جب میں نیویارک پبلک لائبریری کے سامنے ایستادہ شیروں کے سفید مجسموں پر ایک نظر ڈالتا صدر دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا تو عمارت کے ماتھے پر نیویارک کے ستمبر کی ہواؤں میں سرسراتا ہوا کپڑے کا ایک بہت بڑا بینر دکھائی دیا تھا اور اس پر ایک باریش شخص کی شبیہہ سرسراتے ہوئے بینر کی وجہ سے یوں لگتی تھی جیسے اس کی داڑھی کے بال بھی سرسرا رہے ہوں.. وہ شکل سے ایک قدرے تہذیب یافتہ قصاب یا زیادہ سے زیادہ ایک جنونی کوہ پیما لگتا تھا.. بینر پر جلی حروف میں لکھا تھا..

"میں تمہارے ساتھ ہوں".. والٹ وہٹ مین.. لیوز آف گراس 1855-2005ء..

اس امریکی شاعر کی زندگی اور شاعری کے حوالے سے اور اس کے شعری مجموعے "لیوز آف گراس" کی اشاعت کے ڈیڑھ سو برس گزرنے پر لائبریری کے اندر ایک خصوصی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا..

مجھے انگریزی بلکہ یوں کہہ لیجیے یورپی زبانوں کی شاعری سے کچھ زیادہ لگاؤ نہیں ہے.. یعنی مشرقی زبانوں کی شاعری کی نسبت.. میں نے اپنی تنہائیوں اور اداسیوں کے بہت سارے لمحے شیلے' کیٹس' بائرن' پشکن' نرودا' رانبو اور دانتے وغیرہ کے ساتھ گزارے ہیں لیکن یہ کیا ہے کہ یہ لوگ میرے دل پر تو اثر کرتے ہیں لیکن میری تنہائیوں اور اداسیوں میں شریک نہیں ہوتے' میرے بدن کا ایک حصہ نہیں بنتے.. میں تہ دل سے یہ سمجھتا ہوں کہ شاعری صرف مشرق کے خمیر میں ہی گندھی ہوئی ہے.. امراءالقیس' ابونواس' سعدی' حافظ' غالب' میر' بلھے شاہ اور شاہ حسین کے خمیر میں.. ایک زمانہ تھا جب میں ہر ماہ پورے ایک سو روپے کی کتابیں خریدتا تھا.. اور انہیں بک سٹور سے اٹھا کر گھر لانا مشکل ہو جاتا تھا کہ ایک سو روپے میں اتنی ڈھیر ساری کتابیں آ جاتی تھیں.. عام پیپر بیک کی قیمت دو روپے سے زائد نہیں ہوتی تھی.. میرے پاس اب بھی میکملن لنڈن کی شائع کردہ مجلد "وار اینڈ پیس" ہے جس کی قیمت بائیس روپے ہے.. چنانچہ جب میں بے دریغ کتابیں

خریدا کرتا تھا تو اس ڈھیر میں ایک کتاب ''لیوز آف گراس'' بھی چلی آئی.. کیونکہ اس کا نام مجھے پرکشش لگا.. یہ مجموعہ ایک عرصے تک میرے بک شیلف میں دھول جمع کرتا رہا یہاں تک کہ اس کے سرورق پر گھاس کی جو پتیاں نقش تھیں وہ بھی اس دھول کے پردے میں چلی گئیں.. پھر کوئی ایک دن جب میرا بہت جی چاہا کچھ بھی پڑھنے کو.. اب تو یہ احساس ماند پڑتا جاتا ہے لیکن ایک زمانے میں مجھ پر کچھ ایسے لمحے آتے تھے جب مجھے ایک ہول سا اٹھتا تھا.. باقاعدہ ایک طلب سی ہوتی تھی کسی بھی کتاب کو پڑھنے کی.. عجیب اشتعال سا پیدا ہو جاتا تھا ''یکدم'' کچھ پڑھنے کی ہوس بے اختیار کر دیتی تھی.. تو یہ ایک ایسا ہی دن تھا جب میرے سامنے ''لیوز آف گراس'' آ گئی اور میں نے اس کی ورق گردانی شروع کر دی اور کیا ہوا کہ وِہٹ مین کی شاعری ایک آئیوی بیل کی مانند میرے احساسات' محبت' تنہائی' اداسی' منہ زور جذبات اور نارسائی کے گرد ہولے ہولے جُڑتی' لپٹتی چلی گئی.. تقریباً وہی کیفیت جو مجھ پر ایلیٹ کی ''ویسٹ لینڈ'' پڑھتے ہوئے طاری ہوئی تھی اور اس کی شاعری کسی ایک کیفیت میں قید نہ تھی.. کبھی وہ مناظر فطرت کا پجاری ہو کر ان کی توصیف میں بھجن الاپتا تھا.. اور کبھی اپنے اندرون میں چلا جاتا ہے اور آپ کو اپنے ساتھ ایسے لے جاتا ہے کہ آپ بھی اپنے اندرون میں چلے جاتے ہیں.. اور کبھی وہ بہت ہی برہنہ اور جذبات سے عاری ہو کر عامیانہ ہو جاتا ہے.. لیکن اس کے مصرعوں کی سب سے بڑی جادوگری یہ تھی کہ وہ آنکھیں رکھتے تھے اور مجھے دیکھتے تھے..

اور وہ آنکھیں میرے اندر اتر کر مجھے وہ کچھ دکھاتی تھیں جو میں نے کبھی دیکھا نہ ہوتا تھا.. اس لمحۂ موجود میں جب میں نیویارک کی روئیداد لاہور میں گئی رات میں اپنی سٹڈی میں بیٹھا تحریر کر رہا ہوں تو میرے سامنے میز پر ''لیوز آف گراس'' کے اوراق کھلے ہیں اور میں انتخاب نہیں کرتا.. جیسے فال نکالتے ہیں بالکل ویسے ہی اسے جہاں سے کھل جائے کھولتا ہوں اور جو صفحہ بھی سامنے آ جاتا ہے اس پر درج مصرعے براہ راست ترجمہ کرتا جاتا ہوں..

''تم آج کے دن اور رات میرے ہاں ٹھہر جاؤ تو..
تم تمام نظموں کے آغاز کی مالک بن جاؤ گی
اس دنیا اور سورج میں جتنی بھی خوبصورتی ہے..

تم اس کی مالک بن جاؤ گی..
اور ابھی تو لاکھوں سورج باقی ہیں..
اگر تم آج کے دن اور رات میرے پاس ٹھہر جاؤ''

ایک شاندار حُسن والا گھوڑا..
اَن چُھوا اور میرے لمس کا جواب دینے والا
سر بلند ماتھا اور کانوں کے درمیان فاصلہ
اعضاء لشکتے ہوئے اور نازک.. دم زمین پر دھول اڑاتی ہوئی.
آنکھوں میں چمکتی ہوئی شرارت.. کان متحرک اور نفاست سے تراشے ہوئے..
ایک شاندار حُسن والا گھوڑا

سورج اور ستارے جو فضاؤں میں تیرتے ہیں
زمین ایک سیب کی شکل' جس میں ہم رہتے ہیں
ان کی حرکت.. سورج اور ستاروں کی.. کیسی شاندار ہے..

اے میری روح' اگر میں تمہیں سمجھ سکوں تو کیسی طمانیت ہو گی..
جانور اور سبزیاں.. اگر میں ان کو سمجھ سکوں تو کتنا مطمئن ہوں گا..
زمین اور ہوا کے قانون.. اگر میں ان کو جان لوں تو کتنا اطمینان ہو گا..
میں اپنی طمانیت اور اطمینان کی توجیہہ نہیں کر سکتا.. اگرچہ یہ وہاں ہے..
اور میں اپنی زندگی کی بھی توجیہہ نہیں کر سکتا.. اگرچہ یہ بھی ہے..

میرا خیال ہے کہ بہادری کے تمام کارناموں نے..
کھلی فضا میں جنم لیا..
اور تمام آزاد نظموں نے بھی..

وائلنوں کی زبانیں..
اے زبانو تم اُس دل کا حال بتاتی ہو..
جب کہ وہ دل خود بھی نہیں بتا سکتا
یہ اندیشوں میں غرق رہنے والا دل جو..
اپنا حال خود نہیں جانتا..
وائلنوں کی زبانیں..اس کا حال جانتی ہیں..

والٹ وِہٹ مین نے..کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک نظم خصوصی طور پر میرے لیے لکھی تھی..اگرچہ اس سے پیشتر غالب اور بلھے شاہ بھی میرے لیے غزلیں اور کافیاں..صرف میرے لیے لکھ چکے تھے لیکن وہ تو میرے اپنے تھے..میری رگ رگ سے واقف تھے لیکن وِہٹ مین نے مجھ سے ثقافتی اور جغرافیائی دوری کے باوجود میرے لیے ایک نظم کہی جس کا عنوان ہے ''میں ایک پرہجوم شہر میں گزرا..''

''میں ایک مرتبہ ایک پُرہجوم شہر میں سے گزرا تھا..
اپنی یادداشت پر نقش کرتا اس کا طرزِ تعمیر، رسوم، روایات اور محفلیں..
تا کہ.. مستقبل میں ان کا حوالہ دے سکوں..
لیکن اب..اُس شہر کی یادداشت میں اور کچھ باقی نہیں ہے..
سوائے ایک عورت کے..
ایک عورت..جو مجھے اس شہر میں سرِراہ ملی تھی اور..
اس نے مجھے روک لیا تھا..
کیونکہ..وہ مجھ سے محبت کرتی تھی..
ہر دن جو دن تھا..اور ہر رات جو رات تھی ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تھے..
اس کے سوا تو سب کچھ ایک عرصے سے بھول چکا ہوں..

مجھے صرف وہ عورت یاد ہے جو جذبے کی شدت سے مجھ سے لپٹ جایا کرتی تھی..
پھر ہم آوارہ پھرتے تھے..محبت کرتے تھے..اور پھر جدا ہو جاتے تھے..
وہ میرا بازو تھام لیتی تھی، تم نے اس شہر سے نہیں جانا..
میں اب بھی اس کی قربت محسوس کرتا ہوں..
خاموش ہونٹ جو اداسی میں لرزاں تھے ان کی قُربت محسوس کرتا ہوں..
میں ایک مرتبہ ایک پُرہجوم شہر میں سے گزرا تھا..''

نیویارک پبلک لائبریری کے گراؤنڈ فلور پر ایک مختصر کمرے میں ''لیوز آف گراس'' کی اشاعت کے ڈیڑھ سو برس گزرنے پر وِہٹ مین کے اعزاز میں ایک نمائش کا اہتمام تھا..

نیم روشن کمرے کے باہر لائبریری کی ایک سیاہ فام خاتون ایک بلند سٹول پر بمشکل براجمان چوکیداری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی اور قطعی طور پر ایک دوستانہ تاثر چہرے پر نہ رکھتی تھی.. چنانچہ میں نے ازراہ احتیاط بصد ادب اس سے پوچھا. کیا وِہٹ مین کی نمائش اس کمرے میں ہے؟

''کیا تم نے صدر دروازے پر آویزاں بینر نہیں پڑھا..ہاں یہیں پر ہے..''

''تو کیا میں اندر جا سکتا ہوں؟'' یہ بھی پوچھ لینا میں نے بہتر جانا..

''اگر تم چاہو تو..''

یہ نمائشی کمرہ نہایت دھیمی روشنی میں ایک عجیب سی قدامت بھری اداسی میں ڈوبا ہوا تھا جیسے آج تک وہاں کوئی بھی نہیں آیا تھا..دیواروں پر..شوکیسوں میں..والٹ وِہٹ مین کی زندگی اور شاعری حنوط تھی..تصویریں، مناظر، مسودے، اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اور ترمیم شدہ نظمیں..

''لیوز آف گراس'' کے پہلے ایڈیشن اور اس کا اوریجنل مسودہ اور اس میں قطع و برید کے نشان، نپولین سرونی کی بنائی ہوئی اس کی لازوال تصویر..ایک پورٹریٹ..جس میں وہ ایک پیار اور محبت کرنے کے لائق بوڑھا تھا. نورانی داڑھی، بال بھی سفید اور بھنوؤں پر بھی برف سفیدی..

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ میں اس کمرے میں جتنا عرصہ رہا..والٹ وِہٹ مین کے ساتھ تنہا رہا..اور کوئی نہ آیا نہ گیا..البتہ وہ سیاہ فام خاتون کبھی کبھار جھانک کر اطمینان کر لیتی کہ یہ ایشیائی

خدوخال والا شخص کہیں کوئی تخریب کاری تو نہیں کر رہا..ایک شوکیس میں جیمز جوائس کے ''یولیسس'' کے کچھ اوراق نشان زدہ تھے جن میں جوائس کا ایک کردار ''لیوز آف گراس'' کے مصرعوں کا حوالہ دیتا ہے..جب آپ یورپی موسیقاروں' مصوروں اور ادیبوں کی حیات کی ورق گردانی کرتے ہیں تو عام طور پر وہاں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں اور اوائل عمری میں ہی ان کے رجحان کا علم ہو جاتا ہے..جب کہ امریکی تخلیق کاروں کی ابتدائی زندگی میں کچھ سراغ نہیں ملتا کہ مستقبل میں یہ کدھر کا رخ کر لیں گے..شاید وہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت زندگی بسر نہیں کرتے..جو جی میں آئے کرتے رہتے ہیں..اور بالآخر کسی موڑ پر ان کے اندر تخلیق کی ایک چنگاری لَو دینے لگتی ہے اور وہ اس جانب راغب ہو کر اسے ایک الاؤ کی صورت روشن کر لیتے ہیں..

والٹ وِہٹ مین کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا..اُس کی پڑھائی کی عمر چھ برس سے زیادہ نہ تھی..پہلے ایک چھاپہ خانے میں کام کرتا رہا..پھر طرح طرح کی عام مزدوریاں کرتا رہا..پھر ایک اخبار میں ملازم ہو کر چھوٹے موٹے مضامین لکھتا رہا..اور اس کی ان تحریروں میں یہ شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ شخص کبھی..''لیوز آف گراس'' کا شاعر بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی وہ تحریریں بہت ہی سطحی اور عامیانہ تھیں..

چھتیس برس کی عمر میں اس نے پہلی بار ''لیوز آف گراس'' لکھی..جس کے بارے میں کہا گیا کہ اس میں تصوف' جنس' مناظر اور سیاسی شعور یکجا ہو گئے ہیں..اس شعری مجموعے سے اس کی ناآسودگی کا یہ حال تھا کہ وہ پوری زندگی اس کی کتر و بیونت میں مشغول رہا..کچھ نظمیں حذف کر دیتا کچھ اور شامل کر دیتا پھر بھی اس کی تسلی نہ ہوتی..اور بالآخر 1892ء میں جب وہ فوت ہوا تو ''لیوز'' کی موجودہ صورت شکل میں آئی اور اس میں پہلے اور ابتدائی ایڈیشن کی نسبت نظموں کی تعداد چار گنا تھی.....

''تمام سچائیاں..تمام اشیاء میں منتظر رہتی ہیں..''

اس نمائش میں وِہٹ مین کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے اوریجنل مسودے دیکھ کر مجھے وہی خیال آیا جو اکثر آتا رہتا ہے..یورپ اور امریکہ نے اپنے عظیم ادیبوں اور شاعروں کے اوریجنل مسودے سنبھال رکھے ہیں یہاں تک کہ فلورنس میں آپ دانتے کے ''ڈیوائن کامیڈی'' کے اوراق جیسے انہیں دانتے نے اپنے قلم سے تحریر کیا..دیکھ سکتے ہیں..لیکن ہم نے کچھ بھی نہیں

سنبھالا..آج بلّھے شاہ یا وارث شاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک ورق بھی موجود نہیں ہے..اور یہ تو دور کی بات ہے..میری یہ شدید خواہش ہے کہ میں بیدی' بلونت سنگھ' منٹو' عزیز احمد' ن م راشد یا مجید امجد کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کوئی تحریر دیکھ سکوں اور وہ دیکھنے کو نہیں ملتی..یہاں تک کہ علامہ اقبال کے کتنے مسّودے اوریجنل حالت میں محفوظ ہیں اور کہاں ہیں..چلیۓ آج تک ہم کوتاہی کرتے رہے ہیں تو اب ذرا خیال کر لیں اور فیض' ندیم' قراۃ العین حیدر' مشتاق احمد یوسفی' منیر نیازی کے علاوہ بہت سے دوسروں کو ہی محفوظ کر لیں..

بہت عرصہ پیشتر ہمارے درویش دانشور اور مسیحا حکیم محمد سعید نے ادیبوں کے اوریجنل مسّودے محفوظ کر لینے کی تاریخی اہمیت کا احساس کیا اور شاعروں اور ادیبوں سے ذاتی طور پر درخواست کی کہ وہ اپنی شائع شدہ کتابوں کے مسّودے' کوڑے میں پھینکنے کی بجائے انہیں روانہ کر دیں تا کہ وہ انہیں آئندہ زمانوں کے لیے محفوظ کر لیں..اگرچہ میں کسی شمار میں نہ آتا تھا لیکن میں نے بھی اپنے ناولٹ ''فاختہ'' کا مسّودہ انہیں روانہ کر دیا..پھر جانے کیا ہوا..کہ یہ مہم سرد خانے میں چلی گئی اور اس کے ساتھ وہ تمام تر مسّودے جو انہیں بھیجے گئے..

ویسے تو ہم اپنے ادیبوں اور شاعروں کو ہی سنبھال کر نہیں رکھتے تو ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں کہاں سنبھالیں گے..کیا آئندہ نسلوں کے لیے یہ ایک پُرمسرت تجربہ نہ ہوگا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے بیدی کی ''ایک چادر میلی سی..'' منٹو کا ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اشفاق احمد کا ''گڈریا..'' احمد ندیم قاسمی کا ''گنڈاسا..'' انتظار حسین کا ''آخری آدمی..'' عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' اور عینی آپا کا ''آگ کا دریا''..کے اوریجنل مسودے ہوں!

اس درشت چہرے والی سیاہ فام چوکیدار نے کچھ دیر تو کمرے کے اندر جھانک جھانک کر میری حرکات پر کڑی نظر رکھی کہ کہیں یہ شخص ان نادر تصویروں اور مسّودوں کو لے کر چمپت نہ ہو جائے اور پھر میرا انہماک اور سرخوشی دیکھ کر اسے میری شرافت کا کچھ یقین ہوا اور وہ شاید سگریٹ پینے..برگر کھانے یا بیئر کا ایک گھونٹ بھرنے کے لیے چلی گئی تو اس دوران میں اور والٹ وِہٹ مین واقعی تنہا رہ گئے..

اب اگر ہم دونوں تنہا تھے تو میں اس سے گلے شکوے کر سکتا تھا..پوچھ سکتا تھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ میں کبھی ایک پُرہجوم شہر میں سے گزرا تھا..

اور مجھے اُس شہر کی ایک رات میں سرِراہ ایک عورت ملی تھی..

اور اُس نے مجھے روک لیا تھا اور مجھ سے محبت کی تھی..

اور تم کیسے جان گئے کہ میں اب بھی اُس کی قربت محسوس کرتا ہوں..

تم کیسے جان گئے.. اگر جان ہی گئے تھے تو چپ رہتے..

میرا اندر کیوں مشتہر کر دیا..

میں اسے ایک راز ہی رکھنا چاہتا تھا..

اور وہ عورت بھی..

تم نے ہم دونوں کو بدنام کر دیا..

میں ایک مرتبہ ایک پرہجوم شہر میں سے گزرا تھا..

لیکن اب.. اس شہر کی یادداشت میں اور کچھ باقی نہیں..

سوائے ایک عورت کے..



''ن-م-دانش چائنا ٹاؤن میں''

''ابا آج آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' سلجوق مسلسل کچن میں آ جا رہا تھا.. کبھی آملیٹ لا رہا تھا اور کبھی گرم گرم ٹوسٹ اور اس کے ساتھ چائے بنانے کی کوشش بھی کر رہا تھا.. اسے یونیورسٹی پہنچنا تھا..

''میرا خیال ہے کہ آج میں برانکس کا چڑیا گھر دیکھوں گا..''

''چڑیا گھر؟''

''ہاں..''

''ابا.. آپ نیویارک میں ہیں.. اور آپ.. حد ہے.. چڑیا گھر دیکھنے جا رہے ہیں..''

''ہاں بیٹا.. میں نے سنا ہے کہ وہاں ایک پانڈا بھی ہے.. اور میں نے آج تک پانڈا نہیں دیکھا.. یہاں تک کہ جب چین گیا تو وہاں بھی ظالموں نے مجھے پانڈا نہیں دکھایا.. تو میری زندگی کیسی ادھوری رہے گی اگر میں کم از کم ایک پانڈا نہ دیکھ لوں تو..''

''ابو کل شام تو آپ کہہ رہے تھے کہ آپ نے نیویارک پبلک لائبریری کے کسی ڈاکٹر صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ آپ آج انہیں اپنی چند کتابیں لائبریری کے لیے پیش کریں گے تو وہاں نہیں جانا..''

سچی بات ہے میں معنک بابا کو بالکل بھول گیا تھا اور ایک پانڈے کو یاد رکھا تھا..

''جانا تو ہے..'' میں کچھ شرمندگی سے دوچار ہوا ''کل چلا جاؤں گا..''

''نہیں.. آپ آج پانڈے کو ترک کیجیے اور اپنی کتابیں ان ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر آئیے.. مجھے فخر ہوگا کہ میرے ابو کی چند کتابیں نیویارک پبلک لائبریری میں ہیں..''

سلجوق مجھے بہت سارا ناشتہ کروا کے کچھ فائلیں اور کتابیں سنبھالتا رخصت ہو گیا..

معتنک بابا اپنی نشست پر موجود نہ تھا..

وہاں..ایک ہندوستانی یا سری لنکن دکھائی دیتی ایک گھریلو سی اماں براجمان تھیں..لگتا تھا کہ وہ ابھی ابھی باورچی خانے میں دال بگھار کر نکلی ہیں..میرے استفسار پر انہوں نے بے رخی سے اطلاع کی کہ ڈاکٹر صاحب لنچ کے لیے گئے ہیں اور پورے دو بجے واپس آئیں گے..مجھے کچھ انتظار کرنا تھا..وقت گزارنا تھا..پورے کمرے کا احاطہ کرتی میز کے گرد دو تین حضرات کتابوں پر جھکے غافل تھے..میں نے شیلف سے ''ہندوستانی ادب کی تاریخ'' نامی ایک کتاب کی پہلی جلد نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا..ہندوستان کی درجنوں زبانوں کے سینکڑوں ادیبوں کے تفصیلی تذکرے درج تھے..ان کی ذاتی زندگی' تصانیف اور ان پر تنقیدی آراء کے تذکرے..میں نے ان میں سے بیدی صاحب کو تلاش کر لیا اور اپنے اس پسندیدہ نثر نگار کے ساتھ چند لمحے بسر کیے..پھر یونہی ''م'' کی پٹی دیکھ رہا تھا..یونہی تو نہیں اس موہوم آس میں کہ شاید اس میں میرا نام بھی ہو تو منٹو صاحب نمودار ہو گئے..ان کے بارے میں مضمون پڑھ کر احساس ہوا کہ ہر مصنف کے بارے میں کتنی مفصل تحقیق کی گئی ہے..

اُدھر گھڑی کی سوئی سرک کر دو کے ہندسے پر آئی اور ابھی سانس بھی لینے نہیں پائی تھی کہ ڈاکٹر صاحب ''بلیو اینجل'' کے وقت کے پابند پروفیسر کی مانند کمرے میں نازل ہو گئے..میں نے سلام دعا کے بعد اپنی تین کتابیں ان کے سامنے رکھیں اور کہا کہ جناب میں حسب انشاءاللہ پہنچ گیا ہوں..براہ کرم انہیں وصول کیجیے اور مجھے اجازت دیجیے..وہ نہایت کم گو اور دھیمے سے شخص تھے..شاید ذرا سست بھی واقع ہوئے تھے کہ کل والے لباس میں ہی تھے..اُن سے جب میں نے کتابیں وصول کرنے کی درخواست کی تو کہنے لگے..''جی..''

میں نے کہا ''جی ہاں..''

تو انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''جی جی..''

میں نے سوچا شاید قدرے بہرے ہیں اور سن نہیں پائے تو میں نے پھر مدعا بیان کیا..

تو کہنے لگے ''کیوں نہیں؟''

تو میں نے بھی سوالیہ انداز میں کہا ''تو کیوں نہیں؟''

مجھے اب یہ خیال آیا کہ دراصل مروّت کے مارے انکار نہیں کر رہے اِنہوں نے مجھے پہچانا نہیں تو میں نے ایک مرتبہ پھر تعارف کروانے کی سعی کی تو بیچ میں بول اٹھے ''ہاں ہاں..مستانسر حسین تارڑ..'' تو میں نے خوش ہو کر سر ہلایا کہ جی وہی..

اس پر پھر کہنے لگے ''کیوں نہیں..''

میں نے زچ ہو کر کہا..تو کیوں نہیں..تو ان کا جواب آیا..جی!

اس پر ظاہر ہے سر پیٹنے کو جی چاہا اور وہ بھی اپنی ہی کتابوں سے..اور میں خفیف سا خفا ہو گیا..شاید انہیں میری خفگی کا احساس ہو گیا تو پہلی بار ایک مکمل فقرہ بولے ''کتابیں..؟ یہاں نہیں..میرے ذاتی دفتر میں آئیے..یہاں تو نہیں'' اور چل پڑے..

اور میں اپنے تینوں اعمال نامے اٹھائے اُن کے پیچھے پیچھے..اُن کے دفتر میں قدیم فرنیچر اور کتابوں کی خوشگوار مہک ٹھہری ہوئی تھی..انہوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا..ٹائی کی گرہ درست کر کے' گلے میں ڈالے نیویارک پبلک لائبریری کے شناختی کارڈ کو نمایاں کر کے نمائشی سا کھانسے اور کہنے لگے ''اب عنایت کیجیے اپنی تصانیف..وہاں لائبریری کے ریڈنگ روم میں تو کتاب ایسے مقدس تحفے کو قبول نہیں کیا جا سکتا تھا..اس کے لیے تو باقاعدہ تقریب ہونی چاہیے..''

تو گویا یہ ایک تقریب ہو رہی تھی جس میں صرف میں اور ڈاکٹر صاحب شرکت کر رہے تھے..لائبریری کے ایک اہلکار نے از راہ کرم اس پر ہجوم تقریب کی ایک دو تصاویر بھی اُتار دیں..میں نے انہیں اپنے تین ناول ''بہاؤ'' ''راکھ'' اور ''قربت مرگ میں محبت'' پیش کیے جو کسی حد تک ایک ٹرئیالوجی قرار دیئے جا سکتے ہیں..ڈاکٹر صاحب کی فرمائش پر میں نے تینوں ناولوں کے مرکزی خیال کے بارے میں کچھ گفتگو کی..میں نے رخصت چاہنے سے پیشتر پیشکش کی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو میں ان ناولوں کے نام انگریزی میں تحریر کر دوں تا کہ انہیں لائبریری کی فہرست میں شامل کرنے میں دقت نہ ہو تو کہنے لگے ''تارڑ صاحب آپ کو یہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے ہاں ہفتے میں دو بار ایک اردو جاننے والے آتے ہیں جو فہرست تیار کرنے میں ماہر ہیں..یہ اُن کا کام ہے..''

ڈاکٹر صاحب نے میرا اور میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا..البتہ انہوں نے مجھے کافی

اور بسکٹوں بلکہ کوکیز کی بھی پیشکش کی جسے اگر میں قبول کر لیتا تو انہیں بے حد قلق ہوتا کہ یوں اُن کے کام کا حرج ہوتا.. انہوں نے مجھے کچھ دیر ٹھہر جانے کو بھی کہا اور اگر میں ٹھہر جاتا تو انہیں مزید قلق ہوتا..

لائبریری سے باہر آنے سے پیشتر میں اس یونانی طرز کے پُرشکوہ معبد کی راہداریوں میں کچھ دیر چلا.. اور وہاں چلتے.. خاموشی سے چلتے پیاسے لوگوں کی موجودگی کو محسوس کیا جو کتابوں کے چشموں سے اپنی پیاس بجھانے آئے تھے.. میرے نزدیک یہی برگزیدہ لوگ تھے.. کتابوں کے شیلفوں کی طویل قطاروں کے درمیان.. کچھ دیر چلا.. میں جہاں کہیں رُک کر کتاب کا عنوان پڑھتا تو پہلی بار آگاہ ہوتا کہ اس نام کی بھی کوئی کتاب ہے جو پڑھنے کے لائق تھی.. اور میں نے نہیں پڑھی.. مرکزی ہال کی بلند آسمانی چھت تلے ان ہزاروں لوگوں کو دیکھا' پھر سے دیکھا جو کتابوں میں اپنے آپ کو گم کر چکے تھے.. اور میں کل کی نسبت آج قدرے پُرفخر طمانیت میں چلا کہ اس معبد میں محفوظ لاکھوں کتابوں میں سے تین ایسی ہیں جو میری لکھی ہوئی ہیں.. اگرچہ میں خوب جانتا تھا کہ وہ میرٹ پر وہاں موجود نہیں.. اگر کوئی بھی مجھ سے بڑھ کر ناکارہ مصنف اپنی کتابوں کی پیشکش کرتا تو معتک بابا ڈاکٹر نے انکار تو نہیں کرنا تھا.. لیکن اس کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ چھت سے لٹکتے درجنوں فانوسوں کی روشنی میں کچھ روشنی میری بھی ہے.. بے حد بے حیثیت چند لمحوں کے بعد بجھ جانے والے تین دیے میرے بھی ہیں..

لائبریری کے باہر وہی زرد شیطان کا شہر پھنکار رہا تھا.. دولت کی ہوس کا شہر.. لیکن مجھے گورکی سے یہاں تھوڑا سا اختلاف تھا کہ یہ شہر صرف زرد شیطان کا ہی نہیں علم کے سنہری فرشتوں کا شہر بھی ہے..

اور باہر ن-م-دانش میرا منتظر تھا..

وہ یونہی منتظر نہ تھا، میری اور اس کی ملاقات نیویارک پبلک لائبریری کے باہر جو دو سفید پتھریلے شیر ایستادہ تھے ان میں سے جو شیر بائیں جانب دھاڑتا تھا اس کے سائے میں طے پا چکی تھی.

اور یہ ن-م.. کون تھا.. جو راشد نہیں تھا.. دانش تھا؟

تقریباً تیس برس پیشتر کا قصہ ہے کہ لاہور کے نیشنل سنٹر میں ایک آل پاکستان تقریری

مقابلہ ہو رہا تھا جس میں ملک بھر کے کالجوں کے طلباء حصہ لے رہے تھے.. میں شاید اس مقابلے کے جج حضرات میں شامل تھا یا ایک سامع تھا کچھ یاد نہیں تو ایک مکرانی نسل کا نوجوان ایک پاؤں پر بوجھ ڈالتا.. قدرے مشکل سے چلتا آیا مائک کے سامنے کھڑا ہوا اور اپنے فلسفیانہ دلائل سے حذب مخالف کو ملیامیٹ کر دیا.. اور دلائل بھی اتنے وزنی کہ سامعین بھی ان کے تلے دب گئے.. تقریری مقابلے میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے کے بعد وہ سیدھا میرے پاس آیا اور سوائے پاؤں چھونے کے ہر قسم کی عقیدت کا اظہار کیا.. یہی ن-م-دانش تھا..

تب طالب علم تھا پھر کراچی کے ایک کالج میں لیکچرر ہو گیا.. ایک مکرانی سیاہ فام فلسفی اور شاعر.. اور اس کی بیوی شدید قسم کی اردو سپیکنگ جس کا شین قاف جینے نہیں دیتا تھا.. ثقافتی حوالے سے یکسر مخالف سمتوں میں واقع لیکن محبت ایسے معجزے ہی تو دکھاتی ہے.. وہ جب کبھی لاہور آتا تو مجھ سے ملاقات کے لیے ضرور آتا.. پھر وہ گم ہو گیا.. مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے.. مجھے تشویش بھی ہوتی کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں حکومتیں اور حساس ادارے برداشت نہیں کر سکتے.

نیویارک میں شوکت فہمی نے کچھ ادیب دوستوں سے ملاقات کے بہانے میرے لیے ایک تقریب کا اہتمام کیا.. اور میرے لیے یہ ایک خوشگوار حیرت تھی کہ کینیڈا کی سرحد کے قریب مقیم ایک شناسا جوڑا. قمر عباسی اور نیلوفر عباسی خصوصی طور پر مجھ سے ملاقات کی خاطر ایک طویل سفر طے کر کے نیویارک آئے تھے.. ویسے اس شام میں جتنے بھی حاضرین تھے اور وہ سو کے لگ بھگ تو ہوں گے' وہ قطعی طور پر نہیں جانتے تھے کہ اس نیلوفر کا شوخ اور نمکین حسن ایک زمانے میں حسینہ معین کے ڈراموں میں کیسی دھوم مچایا کرتا تھا.. وہ حسینہ کی چنچل اور قدرے بدتمیز لڑکی کا اولین روپ تھی.. اور اس کا باتونی میاں قمر.. کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سفرنامے لکھنے والا ایک ورلڈ ریکارڈ ہولڈر ہے.. دو چار دن میں ایک کتاب لکھ ڈالنے والا یہ قمر مجھے نہایت فخر سے بتاتا ہے کہ تارڑ صاحب آپ تو سفرنامہ لکھتے ہوئے ایک دو برس لگا دیتے ہیں.. میں پہلی بار جب امریکہ اور کینیڈا آیا تھا تو واپسی کے جہاز میں سوار ہونے سے پیشتر اپنے سفرنامے کا مسودہ ناشر کو بھجوا دیا تھا. قمر یقیناً میرے لیے ایک عبرت کا مقام تھا..

اس دوران تقریب کے میزبان نے میرے بارے میں چند کلمات کہنے کے لیے ایک مقرر کو سٹیج پر دعوت دی تو کیا دیکھتا ہوں کہ تیس برس پیشتر کا لاہور نیشنل سنٹر ہے اور ایک سیاہ فام

مکرانی قدرے لنگڑاتا ہوا چلا آرہا ہے..ایک لارڈ بائرن چلا آرہا ہے..صرف ایک فرق کے ساتھ کہ اس کے سر کے بال جو غائب ہو چکے ہیں اب اس کی فرنچ کٹ داڑھی میں نمودار ہو رہے ہیں..

اور مجھے گمان بھی نہ تھا کہ دانش نیویارک میں ہو سکتا ہے اور اگر ہو سکتا ہے تو آج اس محفل میں بھی ہو سکتا ہے..میں مسرت سے بھر گیا اور سٹیج سے اتر کر اسے گلے لگا لیا..

نیویارک پبلک لائبریری کے باہر جو دو سفید پتھریلے شیر ایستادہ تھے ان میں سے جو شیر بائیں جانب دھاڑتا تھا اس کے سائے میں ایک آہنی کرسی پر منتظر ن- م- دانش تھا..ایک واکنگ سٹک اُس کی گود میں تھی..

ایک ہمدم دیریں سے نیویارک میں ملنا کیسا بھلا لگا اب اس کا کیا بیان ہو..

وہ چھڑی کا سہارا لے کر اٹھا ''کہاں چلیں تارڑ صاحب؟''

''تم کیسے چلو گے؟''

''میں اب بہت بہتر چل سکتا ہوں..خاصا چل سکتا ہوں..دیکھئے'' اس نے اپنا دایاں پاؤں آگے کیا جو اس کی نیم معذوری کا باعث تھا..''یہ سپیشل بوٹ..میرے ناپ کے مطابق خصوصی طور پر ایک بین الاقوامی ادارے نے صرف میرے لیے تیار کیا ہے..اس کے طفیل مجھے چلنے میں آسانی ہو گئی ہے..اور یہ بہت مہنگا ہے لیکن میرے لیے نہیں، امریکی حکومت کے لیے''..وہ مسکرانے لگا ''میں واقعی یہاں ایک سپیشل پرسن ہوں..میرا دھیان رکھا جاتا ہے..آپ بتائیں کدھر چلنا ہے؟''

''کہیں بھی..مقصد تو تم سے ملاقات ہے اور باتیں کرنا..''

''اگر اس مقصد میں کچھ مقصدیت بھی پیدا کر لی جائے اور آپ نیویارک کا کوئی حصہ دیکھ لیں تو کیا حرج ہے..''

میں نے ذہن میں کچھ حساب کتاب کیا کہ کیا دیکھ چکا ہوں اور کیا دیکھنا باقی رہ گیا ہے..

''نیویارک کے چائنا ٹاؤن کی بہت شہرت سنی ہے..ہر دوسری فلم میں اسے دیکھا ہے تو اسے دیکھ لیں''..

''ہاں..اس شرط پر کہ اس دوران ہم باتیں کرتے رہیں''..

دانش، گفتگو کا شوقین تھا..رسیا تھا..لیکن میرے لیے مصیبت یہ تھی کہ تاریخ، فلسفہ، عمرانیات اور نفسیات وغیرہ میں اس کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ اس کی بیشتر باتیں، کتابوں کے حوالے

اور تجزیے میرے سر سے گزر جاتے تھے اور میں ہوں ہاں کرتا رہ جاتا تھا..اب ایک اور سانحہ ہو گیا کہ راہ چلتے پاکستانی دکھائی دیتے دو حضرات نے نیویارک پبلک لائبریری کے بائیں جانب کے دھاڑتے شیر کے قریب مجھے دانش سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا..پہچانا اور لپکتے ہوئے میری جانب چلے آئے..اور تارڑ صاحب آپ یہاں کے پُر مسرت جذبات نچھاور کرتے ہوئے مجھ سے بغلگیر ہو گئے..وہ دونوں آئرلینڈ میں مقیم پاکستانی ڈاکٹر تھے..امریکہ کی کسی ریاست میں کسی بین الاقوامی میڈیکل کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے اور نیویارک یاترا کے لیے ایک دو روز کے لیے چلے آئے تھے..ان میں سے ایک تکونی داڑھی والے تھے اور ان کی داڑھی سفید ہونے کو تھی..وہ ایسے ڈاکٹر تھے جن کے طبی تحقیق کے مضامین بین الاقوامی جرائد میں جگہ پاتے تھے تو انہوں نے چھوٹتے ہی محبت کا اظہار کچھ یوں کیا کہ تارڑ صاحب میں تو بچپن سے ہی آپ کی تحریریں پڑھتا آیا ہوں..یہ مجھے بہت ہی برا لگا..

تب..اُن زمانوں میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر میڈم نور جہاں ہمیشہ اس فقرے پر کیوں بھڑک جاتی ہے کہ میڈم میں تو بچپن سے ہی آپ کو سنتا آیا ہوں..ایک مرتبہ جمیلہ ہاشمی کی ایک دعوت میں سیڑھیوں پر سے اترتے صلاح الدین محمود نے کھانس کر اپنے آگے اترتی نور جہاں سے کہا تھا کہ میڈم..ہم تو بچپن سے ہی آپ کو سنتے آئے ہیں..اب صلاح الدین محمود بھی خاصے ادھیڑ عمر تھے تو میڈم نے لچک کر کہا ''اچھا تے تسی تے چُھنّے کا کے او..''

اور ان زمانوں میں یہ سب کچھ میری سمجھ میں آرہا تھا..نوجوانوں کی تو خیر ہے لیکن جب ایک سفید ریش باباجی بھی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تارڑ صاحب..

بہرحال ان ڈاکٹر صاحب نے میری آج سے بیس برس پیشتر کی جو تحریریں تھیں وہ حفظ کر رکھی تھیں اور اس کے بعد وہ آئرلینڈ چلے گئے..

اُن کی آمد کے باعث ہم پھر سے ان آہنی کرسیوں پر براجمان ہو گئے، میں نے دانش کا تعارف کروایا اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی..ڈاکٹر اور دانش سر جوڑ کر جانے کس فلسفیانہ جہان میں ڈوب گئے..اور میں ان کے ساتھ نہیں ڈوب سکتا تھا صرف ڈبکیاں لگا سکتا تھا کہ ان کی گفتگو کے بیشتر حوالے میرے پلے نہیں پڑتے تھے..خدا خدا کر کے وہ دونوں ڈاکٹر رخصت ہوئے اور میری عزتِ نفس کچھ بحال ہوئی..

لائبریری کے عین سامنے سیڑھیوں کے نیچے میں نے امریکہ میں شخصی آزادی اظہار کے دو متاثر کن مظاہرے دیکھے..

پانچ ادھیڑ عمر ویت نام اور شاید کوریا کی جنگوں میں شامل ہونے والے امریکی اپنے آگے ایک بہت بڑا بینر تانے ساکت کھڑے تھے اور بینر پر سرخ روشنائی سے جلی حروف میں لکھا تھا ''سابقہ فوجی اور فوجیوں کے خاندان مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں گھر واپس لایا جائے..''

اُنہیں.. امریکی فوجیوں کو عراق سے واپس لایا جائے..

میں نے ذرا قریب ہو کر ان احتجاجی بابوں کی ایک تصویر اتاری تو ان میں سے ایک بابا جی جو سیاہ ٹی شرٹ اور پی کیپ میں کچھ کچھ پاپا ہیمنگوے لگ رہے تھے انہوں نے انگلیوں سے وِی کا نشان بنایا اور مسکرانے لگے..

ان کے برابر میں احتجاج کی ایک اور صورت تھی جو بہت متاثر کرنے والی اور ماتم کے رنگ میں تھی..

سات آٹھ عمر رسیدہ خواتین سراسر سیاہ لباس میں ایک قطار میں ساکت کھڑی اور ان کے آگے ایک بینر اور وہ بھی سیاہ رنگ کا جس پر ''وویمن اِن بلیک اگینسٹ وار'' درج تھا.. یعنی ماتمی لباس میں ملبوس عورتیں جو جنگ کے خلاف ہیں.. وہ نہایت پیاری سفید بالوں والی مائیاں تھیں اور ان میں دو سیاہ فام تھیں.. میں نے ان کی تصاویر بھی اتاریں لیکن انہوں نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کیا البتہ میں ان کے بارے میں کچھ جاننے کا شدید خواہش مند تھا..

''آپ جنگ کے خلاف ہیں.. تمام جنگوں کے؟''

''ہاں..'' اُن میں سے ایک نے مسکرا کر کہا اور وہ سب سے ادھیڑ عمر تھی اور اس کے باوجود اس کی آواز میں ایسی کھنک تھی کہ نیویارک کی ٹریفک کے شور پر حاوی ہوتی تھی ''ہاں.. اور خاص طور پر عراق کی جنگ کے.. جہاں کہیں بھی انسانوں کو قتل کیا جاتا ہے ہم ہر اُس جنگ کے خلاف ہیں..''

''اسرائیل جب فلسطینیوں کو قتل کرتا ہے تب بھی..''

''ہاں.. بالکل..''

''اور آپ سارا دن یہاں نیویارک پبلک لائبریری کے سامنے احتجاج کا یہ بینر تھامے

کھڑی رہتی ہیں؟''

''نہیں.. سارا دن تو نہیں.. ہم ملازمت پیشہ خواتین ہیں.. ہم میں سے تین گھریلو خواتین بھی ہیں.. تو پانچ بجے جب ہم دفتر سے فارغ ہوتی ہیں تو اپنے معمول کے لباس تبدیل کر کے سوگواری کے لبادے زیب تن کر کے یہاں آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں.. اور تقریباً دو گھنٹے یہاں کھڑے ہو کر شام کے وقت اپنے گھروں کو لوٹ جاتی ہیں..''

''اور آپ کب تک اس معمول پر عمل کرتی رہیں گی؟''

''جب تک کہ تمام جنگیں ختم نہیں ہو جاتیں..''

''وہ تو شاید نہ ہوں..''

''تو ہم بھی یونہی کھڑی رہیں گی.. جنگ کے خلاف احتجاج کرنا ہمارے ضمیر کی آواز ہے.. تم کہاں کے رہنے والے ہو..''

''میں پاکستانی ہوں..''

''تو آپ پاکستان جا کر اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کرنا کہ یہاں امریکہ میں چند سیاہ پوش عورتیں ہیں جو جنگ کے خلاف ہیں..''

چائنا ٹاؤن کی جانب سفر کرتے ہوئے.. پیدل چلتے.. نیویارک کے ہجوم میں راہ بناتے سب وے کی سیڑھیاں اترتے.. سب وے میں بیٹھے ہوئے.. ایک ریستوران میں مجھے پیزا کھلاتے ہوئے.. دانش اپنی گہری مکرانی آواز میں باتیں کرتا رہا.. ''تارڑ صاحب مجھے ابھی تک نہیں معلوم کہ میں نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ اگر کیا تھا' کچھ احباب اور اپنے خاندان کے اصرار پر کیا تھا تو کیوں کیا تھا.. میں وہاں اچھا بھلا ایک کالج میں پڑھا رہا تھا.. اپنے وطن میں تھا' اب جانے کہاں ہوں..''

''تو خوش نہیں ہو؟''

''نہیں یہ میں نہیں کہہ سکتا.. لیکن یہاں آ کر مجھے جتنا سُکھ ملا ہے اتنا ہی دکھ بھی ملا ہے..''

''سُکھ؟.. کیا ملا؟''

''میں یہاں نہایت معمولی معذوری کے باوجود ایک وی آئی پی ہوں.. میرے لئے

تمام دروازے کھول دیے جاتے ہیں..ادھر ہم لوگ بہت کٹھور دل ہیں..یہاں مجھے کوئی بھی لنگڑا یا معذور نہیں کہتا اور نہ ہی مجھ پر ترس کھاتا ہے کہ ہائے ہائے آپ کے پاؤں کو کیا ہوا تھا..اگر چلنے میں دشواری ہوتی ہے تو گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کرو..یہاں میرے ایک اشارے پر نیویارک کی ہر بس رک جاتی ہے چاہے وہاں سٹاپ ہو یا نہ ہو..اگر سڑک پار کرنا چاہوں تو ٹریفک تھم جاتی ہے..میں نے اپنے خصوصی بوٹ کے بارے میں تو آپ کو بتایا تھا جس نے میری زندگی آسان کر دی ہے.. مجھے یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ اگر میں گھر سے ذرا طویل فاصلے پر جانا چاہوں اور سب وے اور بس کا سفر میرے لئے دشوار ثابت ہو سکتا ہو تو میں ایک فون نمبر ملا کر اپنا مسئلہ بیان کرتا ہوں تو ایک خصوصی وین میرے دروازے پر آ جائے گی..میں آج بھی آپ سے ملاقات کے لیے اسی وین پر سوار ہو کر آیا ہوں جس کے ڈرائیور نے اپنی نشست سے اٹھ کر مجھے سہارا دے کر نیچے اتارا تھا اور اب میں اسے جس مقام سے کہوں گا وہ مجھے وہاں سے پک کر لے گا اور گھر پہنچا دے گا..''

''اور دکھ کیا ہے؟''

''اپنے وطن..اپنے سندھ اور کراچی سے جدا ہونے کا دکھ..اور یہ جو معذوری کی سہولتوں کا میں تذکرہ کر رہا تھا یہ بھی یہاں آسانی سے حاصل نہیں ہو جاتیں..اپنی معذوری کو ثابت کرنا پڑتا ہے..بہت جانچ پڑتال ہوتی ہے..مختلف طبی ادارے آپ کا چیک اپ کرتے ہیں.. رپورٹیں تیار کرتے ہیں اور اس عمل میں کئی ماہ لگ جاتے ہیں..جب آپ کو ایک معذور قرار دے دیا جاتا ہے تو پھر آپ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ آپ کس نوعیت کی..کس پیشے سے متعلق ہو کر زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور پھر اسی حساب سے آپ کو یونیورسٹی میں مختلف کورسز کروائے جاتے ہیں..میں گرافک آرٹس یا ادب کے حوالے سے ایک مستقبل کا خواہش مند تھا لیکن نہیں..انکار کر دیا گیا کہ اس کی گنجائش نہیں..آپ سیلز مین بن سکتے ہیں..بس ڈرائیور یا سکیورٹی گارڈ بن سکتے ہیں.. اور میں ان دنوں پارٹ ٹائم سکیورٹی گارڈ کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں..ہاں یہ میں نے جانچ لیا ہے کہ اگر میں ایک مقامی امریکی یا سفید فام ہوتا تو میں گرافک آرٹس کے شعبے میں آسانی سے جا سکتا تھا..ادب کے شعبے سے روزی کما سکتا تھا..یہ میرا تجربہ ہے کہ یہ ملک اپنے تمام تر مساوات اور آزادی کے نعروں کے باوجود تخصیص کرتا ہے..تارکین وطن اگر ان کی رنگت جدا ہو تو ان کے حصے میں اکثر وہی کام آتے ہیں جو سفید فام پسند نہیں کرتے..اور اگر اس سطح سے آپ بلند ہوتے

ہیں تو بے شک آپ ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر معیشت ہوں..بینکر یا اپنے پیشے میں یکتا ہوں تو بھی امریکی نظام میں آپ ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے کہ آگے صرف وہ جا سکتے ہیں جن کی رنگت سفید ہو..لیکن یہ تو میرا ایک ذاتی تجزیہ ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے..اور میں ہرگز شکایت نہیں کر رہا..اس ملک نے میری معذوری کو فراموش کر کے میرے ساتھ ایک انسان والا برتاؤ کیا ہے تو میں اس کا اس نظام کا شکرگزار ہوں..یہ برتاؤ پاکستان میں مجھے کبھی نہ ملتا..وہاں مجھے ایک اپاہج اور لنگڑاتا ہوا پروفیسر ہی کہا جاتا..ویسے..'' دانش کی گہری آواز بھرا گئی ''اگر آپ میرے دل کا معاملہ جاننا چاہتے ہیں تو مجھے اپنے وطن میں شاید گھسٹتے پھرنا زیادہ اچھا لگتا..لیکن زندگی میں دل کے معاملے نہیں چلتے..''

نیویارک کا چائنا ٹاؤن ایک بہت بڑی مایوسی اور بہت بڑا فریب تھا..

میں نے اس ٹاؤن کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور ٹیلی ویژن پر دیکھ رکھا تھا کہ نیویارک کے دل میں آباد یہ جزیرہ چین کے طلسمات اور جادو ٹونوں سے بھرا پڑا ہے..یہاں ایسے چینی بوڑھے ہیں جو زندگی بھر اس ٹاؤن سے باہر نہیں گئے اور یہ نہیں جانتے کہ یہیں کہیں ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ یا مجسمہ آزادی بھی ہے اور چینیوں کے علاوہ بھی کچھ اور لوگ ادھر ادھر رہتے ہیں..وہاں ہر نوعیت کی ادویات اور جڑی بوٹیاں ہیں جن کے استعمال سے کنفیوشس کی عمر کے بوڑھے بھی جنسی سانڈھ ہو جاتے ہیں..چینی مافیا اور جواری حضرات وہاں راج کرتے ہیں اور ریستورانوں میں کیڑے مکوڑے سانپ اور بچھو وغیرہ سرو کئے جاتے ہیں لیکن وہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا..

سوائے اس کے کہ بیشتر نیون سائن اور بورڈ چینی زبان میں تھے اور ظاہر ہے کہ وہاں چینی کثرت میں تھے جو کہ چینیوں کا ایک خاصہ ہے..یعنی کثرت میں ہونا..نہایت دونمبر قسم کے شاپنگ سٹور تھے جہاں اہل نیویارک دھڑا دھڑ شاپنگ کر رہے تھے اور وہاں فروخت کی جانے والی اشیاء کی نسبت ہمارے شاہ عالمی اور اچھرہ میں دستیاب اشیاء کا معیار بین الاقوامی سطح کو چھوتا تھا..

چائنا ٹاؤن میں زیورات کی دکانوں کی بہت چمک بھڑک تھی..دانش کا کہنا تھا یہاں جو سونا فروخت ہوتا ہے وہ..زرد شیطان کے شہر..یعنی سونے کے شہر کے باوجود کچھ زیادہ سونا

نہیں ہوتا..زیادہ کھرا نہیں ہوتا اور اس کے باوجود ان دکانوں پر بے پناہ رش تھا..

ایک چینی ماں جی..فٹ پاتھ پر براجمان..پانی سے لبریز ایک پرات میں تیرتے سبز رنگ کے مختصر کچھوے فروخت کر رہی ہیں کہ یہ خوش قسمتی کے کچھوے ہیں..آپ کے گھر میں اگر ایک ایسا کچھوا ہوگا تو خوش قسمتی دروازے توڑ کر اندر داخل ہو جائے گی..اور ماں جی انہیں ایسی قیمت پر فروخت کر رہی تھیں جس کے عوض آپ کراچی کے ساحل کی ریت پر چاندنی راتوں میں رینگنے والے ایسے کچھوؤں کے پورے خاندان اور ان کی آل اولاد خرید سکتے تھے..

لیکن سیاح حضرات..یعنی اجنبی اور غیر ملکی جو نیویارک کے باشندے تھے یہ کچھوے دھڑا دھڑ خرید رہے تھے..خوش قسمتی خرید رہے تھے..

البتہ اس چائنا ٹاؤن کی ایک انفرادیت ضرور تھی کہ یہاں مچھلی اور سمندری خوراک کی بُو بہت تھی..ریستورانوں کے باہر مختلف جانوروں کے دھڑ لٹک رہے ہیں..مرغیاں، بھیڑیں اور کچھ نامعلوم اقسام کے پرندے..اور ان میں سے بُو آ رہی تھی..

لیکن چائنا ٹاؤن کے فٹ پاتھوں پر سجی ریڑھیوں پر نیویارک بھر میں سب سے سستی خوراک بھی دستیاب ہے..یعنی چینی سوپ اور فرائیڈ رائس..سلجوق اور کولمبیا یونیورسٹی کے طالب علم خصوصی طور پر یہاں صرف اس لیے آتے ہیں کہ نیویارک شہر میں جتنی قیمت پر کافی کا ایک پیالہ دستیاب ہوتا ہے اتنے میں یہاں ڈنر کیا جا سکتا ہے..

تو یہ چائنا ٹاؤن کم از کم میرے لیے ایک بہت بڑی مایوسی تھا..اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں نے اصل چائنا دیکھ رکھا تھا اور یہ اس کی ایک امریکی نقل تھی..

اس دوران مجھے مسلسل دانش کا خیال رہا کہ کہیں وہ تھک نہ جائے..اس کا پاؤں دُکھنے نہ لگے لیکن وہ باہمت شخص اپنی لاٹھی ٹیکتا مجھ سے بھی آگے نکلتا تھا..

چائنا ٹاؤن سے اکتا کر ہم سب وے کے راستے ٹائمز سکوئر میں آ گئے تاکہ آج کی شام مکمل طور پر غارت نہ ہو..تاکہ اصل نیویارک دیکھیں..کچھ حسین اور خوش لباس لوگ دیکھیں..جو لوگ زندہ رہنے کا حق ادا کر رہے ہیں ان کے چہروں پر روشن زندگی کے دیے دیکھیں..شاید ان کی روشنی ہمارے چہروں پر منعکس ہو کر ہمیں بھی زندگی کے قریب لے جائے اور ہم اپنے

دُکھ بھول جائیں..

دانش سے جدا ہو کر میں حسبِ معمول ٹائمز سکوئر کے سٹیشن سے سب وے میں سوار ہو کر براڈوے پر اُتر گیا..میں ایک ہجوم کا حصہ بنا، سیڑھیوں سے اوپر جا رہا تھا کہ ایک لاابالی قسم کا شخص کندھے پر ٹیپ ریکارڈر لٹکائے میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور ایک مائیک میرے منہ کے آگے لا کر بولا ''کیا آج آپ نیویارک سب وے میں محفوظ محسوس کر رہے تھے؟''

عجیب سا سوال تھا میں نے سر ہلا کر کہا ''ہاں..کیوں نہیں..''

''آپ کو اپنی جان خطرے میں تو محسوس نہیں ہوئی؟''

''نہیں..کم از کم میں نے محسوس نہیں کیا..لیکن آپ کون ہیں؟''

''میں ''نیویارک ٹائمز'' کا خصوصی رپورٹر ہوں اور آج کے دن سب وے میں سفر کرنے والے مسافروں کے تاثرات ریکارڈ کر رہا ہوں..''

''آج کے دن ہی کیوں؟..'' اس نے میرا سوال شاید سنا نہیں اور ایک اور مسافر کو روک کر مائیک اس کے سامنے کر دیا..

سلجوق کے فلیٹ پر پہنچ کر اور پھر اُس کی مہارت سے تیار کردہ چکن کڑاہی کا ڈنر نوش کرتے ہوئے اس نے مجھ سے دن بھر کی آوارہ گردی کی رپورٹ طلب کی اور پھر پوچھا ''ابو آج آپ کو سب وے میں سفر کرتے ہوئے کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟''

''نہیں، ہونا چاہیے تھا؟''

''آج تمام ٹی وی چینلز بار بار فلیش کر رہے ہیں کہ القاعدہ نے دھمکی دی ہے کہ وہ نیویارک سب وے کو نشانہ بنائیں گے..چنانچہ تمام سب وے سٹیشنوں پر سکیورٹی کے انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں اس لیے پوچھا تھا..''

''ہاں..اب غور کرتا ہوں تو واقعی سٹیشنوں پر پولیس ذرا زیادہ نمایاں نظر آ رہی تھی''..اور اب مجھے ''نیویارک ٹائمز'' کے نمائندے کا سوال کہ..کیا آج آپ نیویارک سب وے میں محفوظ محسوس کر رہے تھے..سمجھ میں آیا کہ پس منظر کیا تھا..

کیا واقعی اُسامہ بن لادن نے براہ راست کوئی ایسی دھمکی دی تھی یا امریکی عوام کو

دہشت گردی کے خلاف جنگ کی پالیسی کو انصاف پر مبنی قرار دینے کے لیے محض ایک چال تھی..
صرف خوف و ہراس پھیلانے کا ایک حربہ تھا..

اور اگر واقعی یہ حقیقت تھی تو القاعدہ کو کم از کم ان دنوں تو کچھ لحاظ کرنا چاہیے تھا کہ ان کا ایک پرامن اور ڈرپوک ہم مذہب محض سیر کے لیے نیویارک آیا ہوا ہے..

اور مجھے کل نوفل سے ملنے آرلینڈو جانا تھا۔



فلوریڈا

''عینی کا آرلینڈو''

اپنے دوستوں اور عزیزوں کے استقبال کے لیے جو لوگ آرلینڈو ایئرپورٹ پر پہنچے ہوئے ہیں وہ بہت ہی پہنچے ہوئے ہیں کیونکہ یہ ایئرپورٹ میرے ایک ایئرپورٹ دیدہ دوست کے مطابق دنیا کا سب سے پُرکشش اور خوش نظر ایئرپورٹ ہے.. تو ان لوگوں پر ایک نظر کیجیے تو آپ جان جائیں گے کہ آپ ہرگز نیویارک وغیرہ میں نہیں ہیں فلوریڈا کے موسموں میں ہیں.. سوا دو گھنٹے کی فلائیٹ کے بعد آپ اترے ہیں تو ایک اور ہی جہانِ رنگ و بُو میں اترے ہیں جہاں کے موسم خوشگوار، روشن، دھوپ بھرے اور بدن کو بھلے لگنے والے آسودہ کر دینے والے ہیں.. یہ لوگ نیویارک کی مانند ڈھکے چھپے نہیں کُھلے ڈُلے نیکروں اور ٹی شرٹوں میں عیاں ہیں..

اور ان آزاد منش لوگوں کے منتظر ہجوم کی لہروں کے اوپر میری متلاشی نظروں کو ایک چہرہ دکھائی دیتا ہے..

حیرت میں گُم سیاہ آنکھوں والا.. جس کے دودھ سفید رخساروں پر سیبوں کی سرخی کے دھبے ہیں، ایک بچے کا چہرہ مجھے دکھائی دیتا ہے اور میرا دل رک جاتا ہے..

میں نے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے..

پر کہاں؟

بہت برس گزر گئے.. فرانس کے شاہی خاندانوں کے بچوں کے لیے خصوصی طور پر تخلیق کردہ ریشمی گلاب رنگت کے ایک پالنے میں اسے شاید دیکھا تھا.. ہمکتے ہوئے.. مجھ پر جادو کرتے ہوئے.. یہ پالنا یہ Cot ایک شاہانہ فرانسیسی ڈیزائن کا پالنا میں تو افورڈ نہیں کر سکتا تھا.. یہ میرے قدیمی یار ناصر حیات نے میرے پہلے بچے کی آمد پر اپنی فرنیچر ورکشاپ میں خصوصی طور پر ڈیزائن

کر کے مجھے تحفے میں دیا تھا اور اس میں جو بچہ ہمکتا تھا وہ سلجوق تھا..

وہ چہرہ.. آرلینڈو ایئرپورٹ پر منتظر لوگوں کے ہجوم کی لہروں کے اوپر وہ چہرہ.. کیا سلجوق کا تھا جو مجھے لینے کے لیے آ گیا تھا لیکن میں تو اسے نیویارک میں چھوڑ آیا تھا تو وہ یہاں کیسے آ گیا.. اگر آ بھی جائے تو صرف ایک برس کا کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ بچہ جو مجھے دکھائی دے رہا تھا حیرت زدہ سیاہ آنکھوں والا جس کے رخساروں پر سرخ لبوں کے دھبّے تھے وہ ایک برس کا ہی ہوگا..

پھر شک ہوا کہ شاید ثمیر ہے..

پر یہ بھی قرین از قیاس نہ تھا.. وہ تو ماشاء اللہ سوا چھ فٹ قامت کا اپنے دادا جان ایسا اور دلوں کو روک دینے والی شباہت کا ایک ’’بھائیا‘‘ ہو چکا تھا اور اے سی کسٹم جیسے نہایت سرکاری اور غیر تخلیقی عہدے پر تعینات ہو چکا تھا..

تو پھر یہ بچہ جو مجھے دِکھ رہا تھا کون ہے..

دنیا کے سب سے خوشنما اور دِل کش ایئرپورٹ.. آرلینڈو ایئرپورٹ پر دکھائی دینے والا بچہ اگر سلجوق نہ تھا ثمیر نہ تھا تو کون تھا..

دراصل نسل کی شباہت نسل در نسل چلتی ہے..

بہت برس گزرے جب میں اپنے آبائی گاؤں جوکالیاں کی ایک کچی دھول سے اَٹی گلی میں جا رہا ہوں اور سامنے سے کوئی بہت ضعیف کمر خمیدہ ماں جی چلی آ رہی ہیں اور میرے قریب ہو کر اپنی بجھتی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر بچھا کر کہتی ہیں.. پتّر تو چودھری امیر بخش کے لگتے لانوں میں سے تو نہیں ہے.. اس کی آل اولاد میں سے لگتا ہے اور وہ ماں جی مجھے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہی ہیں اور اس کے باوجود میری نسل کی شباہت کو پہچان جاتی ہیں.. میرے دادا جان کو مجھ میں دیکھ لیتی ہیں..

تو یہ بچہ.. منہ کھلا ہوا‘ حیرت زدہ سرخی سے پوچے ہوئے رخساروں والا لوگوں کے ہجوم کے اوپر دکھائی دے جاتا ہے..

اور پھر میں اُسے پہچان جاتا ہوں کیونکہ جوکالیاں کی کچی دھول بھری گلی میں چلی آتی ماں جی کی مانند وہ مجھے سلجوق اور ثمیر ایسا اس لیے لگ رہا ہے کہ وہ ان کا بھانجا ہے اور میرا فی الحال

اکلوتا نواسا نوفل.. اور وہ تو مجھے نہیں پہچان رہا کہ وہ کیا جانے کہ یہ جو بابا جی ہیں جو ابھی ابھی نیویارک کی فلائٹ سے اترے ہیں تو یہ میرے نانا جان ہیں اور میری پہلی سالگرہ کی تقریب میں شامل ہونے کی خاطر بہت سے سمندر اور براعظم پار کر کے آئے ہیں.. وہاں سے جہاں سے اس کی امی آئی تھی..

اب میں ایک اعتراف کرنا چاہوں گا..

میں کسی حد تک دادا جان کہلانے کو تو برداشت کر سکتا تھا پر یہ جو نانا جان ایسا بے ہودہ رشتہ ہے اس سے مجھے شدید چڑ تھی.. گرینڈ فادر کہنے سے بھی کچھ بچت ہو جاتی تھی کہ کیا پتہ دادا ہیں یا نانا..

مجھے نانا سے ہمیشہ تاریخ کا نانا فرنویس اور فلم کا نانا پاٹیکر یاد آ جاتا تھا اور مجھے ان دونوں ناناؤں سے کچھ رغبت نہ تھی.. اور میں حتمی طور پر نانا مستنصر نہیں کہلانا چاہتا تھا.. پر یہ جو بچہ دکھائی دے رہا تھا جو کچھ سلجوق اور کچھ ثمیر ایسا تھا کہ میں نے سوچا ایسے بچّے کے لیے نانا جان ہو جانے میں کچھ زیادہ حرج نہیں..

ابھی تو وہ بولنے کے قابل نہیں ہوا تھا لیکن اگلے برس جب اس نے لاہور آنا تھا اور چپکے سے میری سٹڈی میں آ کر پہلی بار ’’ناں ناں‘‘ کہنا تھا تو میں نے نڈھال ہو جانا تھا اور پھر اس کی منتیں کرنی تھیں سو طرح کے لالچ دینے تھے کہ یار پلیز ایک مرتبہ پھر مجھے ’’ناں ناں‘‘ کہہ دو..

بلال اُسے اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہجوم کے پیچھے کھڑا تھا اور اس کے ساتھ لگی عینی تھی جو میرے نام کے ہر خط اور کارڈ میں صرف آپ کی بیٹی نہیں بلکہ آپ کی لاڈلی بیٹی لکھتی تھی اور یوں زبردستی اپنے آپ کو لاڈلی منوا چکی تھی.. وہ ایڑھیاں اٹھا اٹھا کر ایئرپورٹ میں سے برآمد ہوتے مسافروں میں میرا چہرہ تلاش کر رہی تھی.. اور جب ان دونوں کی نظروں میں میرا چہرہ آ گیا تو ان کے چہرے مسکرانے لگے.. اور وہ میری جانب چلے آئے.. بلال کو میں شادی کے بعد پہلی بار مل رہا تھا اور وہ بالکل ویسا ہی تھا. نوخیز‘ صاف ستھرا‘ خوش لباس اور مسکراتا ہوا..

اور عینی.. وہ بھی ویسی ہی تھی.. جانے وہ کس لباس میں تھی اور کیسی لگ رہی تھی کہ وہ مجھے بھی ایسی ہی لگ رہی تھی جیسی کہ ایک اکلوتی بیٹی جو دور دیسوں میں بیاہی جائے ایک اداس ہو چکے باپ کو لگتی ہے..

اُدھر نوفل صاحب.. کچھ پریشان اور کچھ رونے کی تیاری کرتے ہوئے یہ دیکھ رہے تھے

کہ آخر یہ کون شخص ہے جس کے ساتھ لپٹ کر اسے چومتے ہوئے میری ماں روئے چلی جا رہی ہے اور اگلے لمحے ہنستی چلی جا رہی ہے اور وہ شخص بھی بابا ہونے کو آیا ہے اور پھر بھی رونے سے باز نہیں آ رہا۔

میں پہلی بار اپنی نسل میں کھلنے والے پہلے پھول نوفل کو دیکھ رہا تھا۔۔

آرلینڈو۔۔ ریاست فلوریڈا کی پہچان۔۔ دن کے وقت ہوائی جہاز کی کھڑکی سے ایک شہر دکھائی نہ دیتا تھا۔ کہ وہ ایک شہر نہیں ہے۔۔ ایک وسیع سراسر ہموار کینوس ہے جس پر سینکڑوں جھیلوں کی نیلاہٹ، جنگلوں کی ہریاول اور خوابناک بستیوں کے رنگ بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔۔ اور اگر آپ غروب آفتاب کے بعد ڈزنی لینڈ کے اس شہر آرلینڈو میں دھیرے دھیرے اترتے ہیں تو جہاز کی کھڑکی میں سے کیا دیکھتے ہیں کہ نیچے نیلاہٹ بھرے آبی ذخیرے اور جزیرے ہیں اور ان میں روشنیاں کبھی ڈوبتی ہیں اور کبھی ان کی سطح پر ہزاروں چراغ ہو جاتی ہیں، روشن دمکتے ستارے ہو جاتی ہیں جو جھیلوں میں ابھرتے ڈوبتے آپ کی آنکھوں میں اترتے ہیں اور آپ ایک ایسے سندباد محسوس کرتے ہیں جو کہ جہازی نہیں بلکہ ہوائی جہازی ہے اور ایک بڑے دیوزاد پرندے کے پنجوں کو گرفت میں لیے ایک ایسے اجنبی جزیرے پر اترتے ہیں جہاں ہر سو ہیرے بکھرے پڑے ہیں جو روشنیوں سے دمکتے ہیں اور وہ ہیرے آرلینڈو کی بے حساب جھیلیں ہیں۔۔ جنگل، دلدلیں، سرسبز میدان اور ذخیرے ہیں۔۔

اور جنگل۔۔

ایسے جنگل۔۔ گھنے۔۔ آپس میں جُڑے ہوئے اشجار ایسے جیسے محبت کرنے والے آپس میں جُڑے ہوں۔۔ اور ان میں سو سو طرح کی جھاڑیاں، بیلیں، گھاس اور سروٹ اور پام کے بوٹے۔۔ رنگین پتوں والے پودے۔۔ جنگل ایسے کہ ان کی گھناوٹ میں انسان نے تو کہاں جگہ پانی ہے، سورج کی کرنیں بھی جب اترتی ہیں تو تادیر بلند درختوں کی چوٹیوں پر ٹھٹکی رہتی ہیں کہ ہم کیسے اس سرسبز انبار میں راستہ بنا کر نیچے زمین تک پہنچیں اور وہاں نیچے جہاں دن میں بھی شب کی سیاہی سماں ہے۔۔ وہاں نیم تاریکی راج کرتی ہے۔۔ وہ جنگل اتنے گھنے ہیں اور اگر کوئی زرد کرن اس ناقابل عبور گھناوٹ میں راستہ بناتی بالآخر درختوں کے تنوں اور جھاڑیوں اور بیلوں تک پہنچ جاتی

ہے تو وہ بھی پل دو پل میں اندھیر ہو جاتی ہے۔۔

اور پھر دلدلیں ہیں۔۔

یوں جانئے کہ آرلینڈو کے علاقے میں دلدلیں اور بڑے جوہڑ ہیں جنہیں ہم جھیلیں بھی کہہ سکتے ہیں اور حضرت انسان نے نہایت ڈھٹائی اور پرعزم مشقت سے قدرت کو زیر کر کے ایک تازہ بستی آباد کر لی۔۔ وہ جنوں جو اہل نظر کا خاصا ہے، آرلینڈو اس جنوں کا ایک کرشمہ ہے۔۔ یعنی اپنے میکلوڈ روڈ والے بابا ظہیر کاشمیری کے بقول۔۔

قدم قدم پہ جنوں اختیار کرتے تھے۔۔ شباب تھا تو ستارے شکار کرتے تھے۔۔

تو یہاں بھی حضرت انسان نے قدم قدم پہ جنوں اختیار کیا اور جوہڑوں اور دلدلوں کو پاٹ کر نئی بستیاں آباد کیں۔۔

اور ان جنگلوں کی اندھیاری گھناوٹ میں جہاں سورج کی کرنیں کم کم اترتی ہیں ان کے اندر درندے ہیں۔۔ پرندے بھی اور چرندے بھی ازل سے قیام کرتے ہیں۔۔ کومل جلدوں والے چوکنے ہرن۔۔ اور ڈار اندر ڈار۔۔ متکبر بارہ سنگھے۔۔ دھانسو سؤر، بھورے کالے بھالو۔۔ خرگوش، گلہریاں، خار پشت۔۔ جہازی سائز کے کچھوے۔۔ اور گھنی گھاس کی نیم تاریکی میں سرسراتے درجنوں اقسام کے سنہری، بھورے، سیاہ اور چمکیلے سانپ، جن میں معدودے چند زہریلے ہیں اور ان کے زہر کا تریاق بھی آرلینڈو کے ہر کیمسٹ کی دکان سے مل سکتا ہے اور بیشتر ایسے کہ انہیں ایک پارسل پیک کرتے ہوئے رسّی کے طور پر استعمال کر لیجیے اور وہ اُف کرنے کے لیے بھی منہ نہ کھولیں گے۔۔

یہ دو چار زہریلے سانپوں کی کرامت ہے کہ سینکڑوں بے ضرر سانپ بھی حضرت انسان کو ڈرائے رکھتے ہیں۔۔

سانپوں کے سوا اُن کے ازلی دشمن نیولے۔۔

اور ایسے عظیم الجثہ چوہے۔۔ نہایت فربہ اور پلے ہوئے چوہے جو بے شک گنجے عقاب کی مرغوب ترین خوراک ہیں لیکن اگر معمولی نوعیت کی کسی بلی کے سامنے آ جائیں تو اس کی حرکت قلب بند ہو جائے اور وہ چوہے اس کی مناسب تدفین کرنے کی بجائے اُس کی لاش کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔۔

ان جنگلوں کی دلدلوں میں اور جابجا پھیلے جوہڑوں میں ریاست فلوریڈا کی سب سے

بڑی اور قابلِ فخر پہچان..مگر مچھ بسیرا کرتے ہیں..

انہیں مقامی طور پر ’’گیٹرز‘‘ کہا جاتا ہے..ہماری لغت کے مطابق ’’ایلی گیٹرز‘‘ نہیں کہا جاتا کہ امریکیوں کو ناموں کو مخفف کرنے کا خبط ہے..

کہاوت ہے کہ جس نے فلوریڈا جا کر مگر مچھ نہیں دیکھا..اس نے فلوریڈا نہیں دیکھا..کچھ اور دیکھا..

تو میں نے بس کچھ اور دیکھا..فلوریڈا نہیں دیکھا کہ میں نے وہاں گزرے ہوئے شب و روز میں حرام ہے کہ ایک بھی مگر مچھ دیکھا ہو..

جب بہت دنوں کے قیام کے بعد بھی مجھے یہ محبوبِ نظر دکھائی نہ دیا..اور میں نے اس دوران مقدور بھر کوشش بھی کی..جھیل کی سطح پر دکھائی دینے والی ایک مردہ لکڑی کو بھی اس آس میں تا دیر دیکھتا رہا کہ شاید یہ ایک مگر مچھ ہو جو شکار کی گھات میں ساکت ہو چکا ہو.. پر نہ ہوا پر نہ ہوا مگر مچھ کا دیدار نصیب..

البتہ ایک روز میرا خیال ہے کہ میں مگر مچھ دیکھتا دیکھتا بچا..

سورج کی پہلی کرنیں اُس جھیل کے پانیوں پر ہلکی روشنی بچھا رہی تھیں جس کے کناروں پر بلند گھاس اور سروٹ تھے اور میں صبح کی سیر کے دوران صبح کے سہانے پن کے سحر میں مبتلا بے وجہ مسکراتا چلا جا رہا تھا جب مجھے ایک زوردار چھپاک کی آواز آئی جیسے کوئی بھاری شے پانیوں میں گری ہو..میری نظریں فوراً جھیل کی جانب منتقل ہوئیں اور وہاں کنارے کے قریب ایک پر اضطراب گرداب ابھی تک متحرک تھا..اگر میں اپنے تخیل کو ذرا مبالغے کی مہمیز دے دوں تو شاید اس گرداب میں ڈوبتی ایک مگر مچھ کی دم بھی نظر آ گئی تھی..جو کہ نہیں آئی تھی..بہرطور یہ ممکن تھا کہ کنارے پر استراحت فرماتا کوئی مگر مچھ میرے جوگرز کی آواز سے ڈسٹرب ہو کر غڑاپ سے پانی میں اُتر گیا تھا..

شاید میں دنیا میں وہ واحد شخص تھا جو فلوریڈا گیا اور پھر بھی کوئی مگر مچھ نہ دیکھا..مجھے پاکستان میں بیٹھے ہوئے عینی اور بلال کے توسط سے فلوریڈا کی جتنی خبریں آتی تھیں اُن سب میں مگر مچھ بہت ہوتے تھے کہ..ابو..فلاں آنٹی طاہرہ کے گھر کے لان میں صبح سویرے دو مگر مچھ دھوپ سینک رہے تھے..آنٹی نے انہیں پنجابی میں خوب خوب گالیاں دیں اور وہ شرمندہ ہو کر نزدیکی

جوہڑ میں اُتر گئے..اور وہ جو فلاں انکل ہیں ناں تو ان کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی پر جیسے کسی نے دستک دی تو انکل شیشے سے ناک لگا کر دیکھنے لگے کہ کون ہے تو ان کی ناک ایک گیٹر کی ناک سے جا لگی اور گیٹر نے انکل کی شکل دیکھی تو بھاگ گیا اور ابو میری فلاں سہیلی جو ہے جو بہت امیر ہے تو اس کے میاں ایک صبح اپنے سوئمنگ پول میں تیر رہے تھے تو ان کے برابر میں ایک مگر مچھ بھی تیرنے لگا..اُس کے میاں بہت زبردست تیراک ہیں اس لیے مگر مچھ سے آگے نکل گئے اور پول سے باہر آ گئے..اگر مگر مچھ بہتر تیراک ہوتا تو میاں نے کہاں باہر آنا تھا..

یا یہ کہ ابو میں ڈرائیو کر رہی تھی تو دو گیٹر زیبرا کراسنگ سے سڑک پار کر رہے تھے اور میں نے بریک لگا دی..

یہ نہیں کہ وہ مجھے متاثر کرنے کے لیے ایسی خبریں سناتی تھیں بلکہ حقیقت بھی یہی تھی لیکن میری بیٹی ہونے کی حیثیت سے وہ بھی میری طرح زیبِ داستاں کے لیے مرچ مصالحہ ذرا تیز کر دیتی تھی..

مجھے یہ علم تھا کہ شادی کے فوراً بعد بلال جو آؤٹ ڈور سرگرمیوں کا شائق ہے..اپنے بڑے بھائی کے جہاز سے پیراشوٹ کے ساتھ کود جاتا ہے..گولف کھیلتا ہے..اس کے پاس فزیکل انسٹرکٹر ہونے کی سند ہے یہاں تک کہ سمندروں کی تہہ میں اتر کر مچھلیوں سے بھی ہمکلام ہوتا ہے اور وہ ایک تربیت یافتہ سکوبا ڈائیور بھی ہے تو یہ بلال شادی کے فوراً بعد وکائیوا پارک کے دریا میں عینی کو کینوئنگ کے لیے لے جاتا ہے اور وہاں ان کا کینو الٹ جاتا ہے اور عینی بے چاری کچھ دیر پانیوں میں ڈبکیاں کھاتی ہے پھر بمشکل کینو پر سوار ہوتی ہے اور اسی لمحے وہ اپنی کینو کے قریب ایک ست سے مگر مچھ کو آنکھیں جھپکاتے دیکھ لیتی ہے اور پھر چیخیں مارنے لگتی ہے کہ بلال مجھے واپس لے چلو..

بہرحال یہ جو مگر مچھ ہیں..گیٹرز ہیں..ان سے میری صاحب سلامت بہت پرانی ہے..ان زمانوں میں جب آتش ابھی پوری طرح جوان بھی نہیں تھا انگلستان کی برفانی راتوں اور ٹھٹھرتی شبوں میں..ایلوس پریسلے کی آمد سے بھی پہلے کے زمانوں میں لٹل رچرڈ کے علاوہ ایک گلوکار بل ہیلی نام کا ہوا کرتا تھا جس کے چوڑے ماتھے پر ایک لٹ چپکی ہوتی تھی ایک کُنڈل ہوا کرتا تھا جو اس کا ٹریڈ مارک تھا اور اس کے بینڈ کا نام ’’بل ہیلی اینڈ کامٹس‘‘ ہوا کرتا تھا..جس کی

راک اینڈ رول کی دھنیں انگلستان اور یورپ میں دھومیں مچاتی تھیں اور ان کی دھمک ہمارے نوخیز جذبوں کو بے قابو کرتی تھی..بل ہیلی کا سب سے کلاسیک گیت ''ون او کلاک..ٹو او کلاک..راک'' تھا اور اس کے بعد وہاں دن رات گونجنے والا نغمہ ''سی یو لیٹر ایلی گیٹر..'' تھا اور ڈھلتی عمر کا بل ہیلی جب اپنی مترنم آواز میں ''سی یو لیٹر..'' الاپتا تھا تو ان زمانوں کے ٹین ایجر جن میں میں بھی شامل تھا ''ایلی گیٹر..ایلی گیٹر'' پکارنے لگتے تھے..اگرچہ انگریزی سے سرسری واقفیت کی بنا پر پہلے پہل یہی خیال گزرا کہ یہ ایلی گیٹر کسی دوشیزہ کا نام ہے جس کے ساتھ وعدہ کیا جا رہا ہے کہ ایلی گیٹر بعد میں ملیں گے..ورنہ کسی مگرمچھ سے آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں چاہے وہ کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو..

تو جس روز بلند گھاس اور سروٹوں میں گھری صبح کے سہانے پن سے سنہری ہوتی جھیل کنارے مجھے چھپاک کی آواز سنائی دی تھی جو کسی مگرمچھ کے پانی میں دھم سے اترنے کی آواز ہی ہو سکتی تھی تو میں نے یادداشت میں سے بہت مدھم اور مبہم ہو چکے بل ہیلی کو بہت یاد کیا اور اس سے پیشتر کہ وہ پُراضطراب گرداب پانی کی سطح پر ہموار ہو جاتا میں نے اس نظر نہ آنے والے مگرمچھ سے کہا ''سی یو لیٹر ایلی گیٹر..''

اے مگرمچھ ہم بعد میں ملیں گے..

پر.. یوں نہ تھا..فقط چاہا تھا کہ یوں ہو جائے..

ہم بعد میں بھی نہ ملے..

اور فلوریڈا کے ان گھنے جنگلوں میں صرف ہرن' ریچھ' سؤر' موٹے چوہے' خرگوش وغیرہ ہی قیام نہیں کرتے بلکہ ان کی زمینی قیام گاہ سے ایک بلندی پر درختوں میں نہایت نایاب پنکھ پکھیرو بھی شور مچاتے ہیں اور ان کا کچھ شمار نہیں..خاص طور پر شام ڈھلتی ہے تو یہ بے انت پرندے جوش میں آ جاتے ہیں تو اتنا بے پناہ اور بے دریغ غل کرتے ہیں کہ جان عذاب میں آ جاتی ہے..کان بہرے ہو جاتے ہیں..اور یہ سب صرف تب چپ ہوتے ہیں جب..چھوٹے آسیرے نسل کے عقاب کی چلاّتی ہوئی آواز بے چارے چہچہاتے پرندوں کے دلوں میں خوف بھر دیتی ہے اور وہ دہشت میں آ کر اپنی چونچیں بھینچ لیتے ہیں..

جنگلوں اور دلدلوں میں بسیرا کرنے والی یہ حیات ہرگز آگاہ نہیں ہے کہ اُس کے آس پاس دنیا بدل چکی ہے..نئی دنیا کہلاتی ہے..وہ بانکے گھڑ سوار اس دنیا کے سگے بیٹے جو اس دھرتی کو

اپنی ماں جانتے تھے اس کی پرستش کرتے تھے..ایک قدیم دانش اور اخلاقیات اور تدبر کے پیروکار تھے وہ تو کب کے رخصت ہو چکے تھے..ملیامیٹ کر دیئے گئے تھے..ہو چکے تھے..تبھی تو وہ جب کبھی اپنے جنگل سے باہر آتے تھے..کسی تالاب سے نکلتے تھے تو اپنے سامنے خیموں کی بجائے سنگ وخشت کی بستیاں پاتے تھے اور ان میں عجیب سے لباس زیب تن کیے لوگ رہتے تھے جن کے دل بھی سنگ کے تھے..وہ بھٹک کر شاہراہ پر آ نکلتے تھے تو ان کی سواریوں تلے کچلے جاتے تھے اور اُن زمانوں میں وہ صحت مند بانکے گھڑ سوار اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیتے تھے کہ وہ انہیں اپنا عزیز جانتے تھے..اور وہ بے خطر ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں زندگی گزارتے تھے اور تب وہ اپنے جنگل اپنے تالاب میں شتابی سے لوٹ جاتے تھے کہ وہ سمجھ نہ سکتے تھے کہ یہ دنیا کیسے بدل سکتی ہے..مہربان لوگوں کی بجائے گنوار لوگوں سے کیوں بھر گئی ہے..

براہ کرم میرے اس تفصیلی بیان سے بھٹک نہ جایئے گا کہ آرلینڈو میں ہر سو جنگلی جانوروں' پرندوں' درندوں اور مگرمچھوں کا راج ہے..یہ ایک وسیع علاقے پر پھیلا ہوا خوش نظر اور خاموش شہر ہے..بلکہ شہر کہیے تو شاید شوروغل اور بے تحاشا بلند عمارتوں اور اڈتے ہجوموں کا تاثر ملتا ہے..یہ کہہ لیجیے کہ یہ آرلینڈو ایک شاندار بستی ہے اور اس کے اوپر جو آسمان ہے وہ نظر آتا ہے..سکائی سکریپرز نے اسے مجروح نہیں کیا..ابھی تک پورا دکھائی دیتا ہے..اور یہاں کے جو باسی ہیں وہ ان جانوروں اور مگرمچھوں کو اس حد تک احترام کرتے ہیں کہ بس ان کی پرستش سے کچھ اجتناب کرتے ہیں ورنہ انہیں بٹھاتے دیوی دیوتاؤں کے سنگھاسن پر ہیں..انہیں زک پہنچانا اور ہلاک کرنا تو دور کی بات ہے..انہیں ڈسٹرب کرنا بھی ایک گناہ جانتے ہیں..

یعنی عینی اگر ڈرائیو کرتے ہوئے شاہراہ پر اتفاقاً آ نکلنے والے ایک مگرمچھ کو دیکھ لیتی ہے تو بریک لگا کر اس کے گزر جانے کا انتظار کرتی ہے..

اور اگر اُسے سڑک پر ایک کاہل کچھوا نظر آ جاتا ہے جو جانے کس سوچ میں کچھ زیادہ ہی کاہل ہو چکا ہے اور کچلا جا سکتا ہے تو وہ کار روک لیتی ہے..اترتی ہے..اس کچھوے کو اٹھاتی ہے اور بے ڈر اٹھاتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ کون سے کچھوے کی دُم ایسی ہوتی ہے کہ وہ آپ کو کاٹ سکتا ہے اور یہ والا کچھوا وہ دُم نہیں رکھتا اور بے ضرر ہے تو وہ اسے اٹھا کر سڑک کے پار گھاس پر احتیاط سے رکھ کر پھر سے ڈرائیو کرنے لگتی ہے..میرے ایک جاننے والے بٹ صاحب کہیں سوئٹزرلینڈ

کے ویرانوں میں نکل گئے.. وہاں ایک سانپ ان کے راستے میں آتا ہے تو وہ فوراً اپنا بوٹ اتار کر اسے کچل دیتے ہیں اور پھر اسے ایک ٹہنی سے اٹھا کر اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور نہایت پُرمسرت ہیں کہ اس موذی کو ہلاک کر ڈالا تو کچھ راہگیر انہیں دیکھ کر پولیس کو اطلاع کر دیتے ہیں کہ کوئی غیر ملکی شخص ہے جس نے ایک سانپ کو مار ڈالا ہے تو پولیس انہیں باقاعدہ گرفتار کر کے لے جاتی ہے جیسے انہوں نے کسی انسان کو قتل کر ڈالا ہو اور وہ بٹ صاحب پولیس کی منت سماجت کرتے ہیں کہ جناب ہمارے ہاں سانپ موت کی علامت ہے تو میں نے اس ثقافت کے زیر اثر اسے مار ڈالا.. آئندہ یہ حماقت نہیں ہوگی.. معاف کر دیجیے.. تب جا کر ان کی جاں بخشی ہوئی..

تو یہ امریکی اور یورپی لوگ سب کے سب خبطی ہوتے ہیں..

باہر.. کار کی کھڑکی کے باہر.. چُپ کا ایک جزیرہ گزر رہا تھا.. نیویارک کے بعد آرلینڈو ایک گاؤں لگ رہا تھا..

عینی اور بلال مجھ سے باتیں کیے جا رہے تھے اور نیویارک سے یہاں تک کے سفر کا احوال پوچھ رہے تھے..

بلال جس نے اپنی تمام تر تعلیم آرلینڈو میں ہی حاصل کی تھی.. ایک مدت سے اس شہر کا نہ صرف باسی تھا بلکہ شیدائی تھا اور وہ اپنے شہر کی قدرتی کشش اور مناظر کی داد چاہ رہا تھا کہ انکل نیویارک تو ایک ہولناک بستی ہے' انسانوں اور عمارتوں کا ایک جنگل ہے.. میں جب کبھی وہاں جاتا ہوں تو سانس نہیں لے سکتا.. مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے.. ذرا محسوس کیجیے کہ یہاں کتنا سکون ہے.. کتنا ٹھہراؤ ہے.. دور دور تک کوئی سکائی سکریپر تو کیا دو منزلہ عمارت بھی دکھائی نہیں دیتی.. گھر ہیں' جھیلیں ہیں اور جنگل ہیں.. کیسا شہر ہے انکل!

نوفل.. پچھلی نشست پر اپنی ماں کے برابر میں ''بچہ کرسی'' میں چوڑے فیتوں سے بندھا سو چکا تھا..

14900- گولف وے بلیوارڈ کا گھر.. عینی کا گھر.. پام کے ٹھگنے درخت' گل بوٹے اور ایک ہسپانوی طرز کا سفید فوارہ جو ابل رہا تھا.. یہ میرے استقبال کی خوشی میں جاری کیا گیا تھا.. اور اس گھر کے پچھواڑے میں ایک ایسا وسیع منظر جو کسی کیلنڈر کی تصویر لگتا تھا.. ایک ہریاول سے نچڑتا گولف کورس جس کے کناروں پر عینی ایسے مزید گھر خوش نظر تھے.. جھیلیں اور ان کے پار ایک جنگل

جس کی گھناوٹ کو میں بیان کر چکا ہوں جہاں سورج کی کرنیں بمشکل اس کی گھاس تک پہنچتی ہیں اور وہاں دن کے وقت بھی شب کی سیاہی کا سماں ہوتا ہے.. جہاں سفید بگلوں کی قطاریں پھڑپھڑاتی اترتی تھیں اور جنگل میں سے ہرن نمودار ہوتے تھے.. کونجیں عینی کے لان میں گردنیں اٹھائے اس کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے سامنے اترتی تھیں اور پھر سرِشام جنگل کی جانب سے پرندوں کی صدائیں غل کرتی گھر کے اندر آنے لگتی تھیں..

کچن میں.. فریج کے عین اوپر ایک کیلنڈر آویزاں تھا جس پر آج کی تاریخ.. یعنی آرلینڈو میں میری آمد کی تاریخ کے ہندسے کے گرد ایک سرخ دائرہ تھا.. ایک مزاحیہ مسکراتا جوکر ایک سٹکر کی صورت چسپاں تھا اور اس پر لکھا تھا ''آج ابو جان آئیں گے..''

ابو آ گئے تھے.. پر تھکے ہوئے بہت تھے..

پہلی منزل پر واقع ابو کو جو کمرہ الاٹ کیا گیا تھا اُس کی پوری دیوار شیشے کی کھڑکی اُس طلسم پر کھلتی تھی جس میں گولف کورس کی ہریاول اُمڈتی ہوئی آتی تھی اور ایک مہک لاتی تھی.. جھیلوں کے پانیوں کی نیلاہٹ دستک دیتی تھی اور اُن کے کناروں پر براجمان بگلوں کی سفیدی کمرے کے اندر تک آتی تھی اور ہر شے کو سفید کرتی تھی اور وہ جنگل دکھائی دیتا تھا جس میں پوشیدہ ہزاروں پکھیرو شور مچاتے تھے.. اُن کی چہکار ایسی تھی کہ وہ بند کھڑکی کی رکاوٹ کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی.. چلی آتی تھی.. اور میرے کل سامان میں ٹی شرٹوں' جینوں' کتابوں اور سگریٹوں کے پیکٹوں میں بھی سرایت کر جاتی تھی.. یہاں تک کہ میں نے اپنا پاسپورٹ کھول کر اس سے منسلک آئی نائن فور کی وہ چٹ اپنی تسلی کی خاطر چیک کی جس کے مطابق میں اگلے چار برس تک امریکہ میں قیام کر سکتا تھا تو اس کے صفحوں پر بھی پرندے چہک رہے تھے..

میری فون بک میں کم از کم ایک ایسا فون نمبر درج تھا جہاں صرف ایک پرندہ بہ نفسِ نفیس براجمان تھا.. کبھی چہکنے لگتا تھا اور کبھی میرا منتظر ہو جاتا تھا..

اس شور و غل اور چہکار کے باوجود میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ نفیس اور نرم بستر پر لیٹا تو بے خبر اور بہرا ہو گیا.. پھر نہ جنوں رہا اور نہ پری رہی.. بے خبری رہی.. بے سدھ بے خبر میں نیند کے خمار میں گم ہو گیا..

سی یو الیٹر ایلی گیٹر!

اگلی سویر آنکھ کُھلی ہے تو فجر کی اذان کے ساتھ کُھلی ہے..

یہ تو نہیں کہ آرلینڈو ایک مُشدہ مسلمان شہر ہے جس کی مساجد سے فجر کی اذانیں بلند ہو رہی ہیں جو کانوں میں اُتری ہیں تو میں جاگا ہوں..نہیں!

دراصل میں جہاں کہیں بھی جاگوں.. بیجنگ' کھٹمنڈو' دلّی یا روم میں یا کہیں برفیلی بلندیوں کی ازلی خاموشیوں میں..تو اپنے گھر.. 22 جے گلبرگ III میں..اپنے بیڈروم میں ہی جاگتا ہوں..اور وہاں فجر کے وقت آس پاس کی مساجد میں مختلف مؤذن حضرات کچھ سریلے رنگ میں اور بیشتر دل کو دکھ دینے والے انگ میں اذانیں دے رہے ہوتے ہیں..ایک نامعلوم مؤذن ایسے ہیں جن کی خوش الحانی آنے والی سویر کی کرنوں کو مزید روشن اور پُرنور کر دیتی ہے اور ایک بے چارے ایسے ہیں کہ ان سے درخواست کرنے کو جی چاہتا ہے کہ پلیز چپ ہو جائیے..میں آپ کی عزت کرتا ہوں مولوی جی پر پلیز چپ ہو جائیے..آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ آپ میراثی یا گلوکار نہیں ہیں ورنہ آپ تو بھوکے مر جاتے..آپ کے گلے کو اللہ تعالیٰ نے اذان دینے کے لیے نہیں بلکہ غرارے کرنے کے لیے بنایا ہے..لیکن ان کی بے ڈھب پراذیت اور بے سری آواز کے باوجود وہ مجھے اچھے لگتے ہیں کہ برس ہا برس سے کیسی استقامت اور عقیدت سے اس آواز میں' اللہ کی جانب آؤ' پکارتے چلے جاتے ہیں..آرلینڈو کی اس پہلی سویر میں مجھے اذان سنائی دے رہی تھی..

باہر سکوت تھا..

نیم تاریکی کا راج تھا..

میں اگر فجر کی اذانوں سے جاگ جاتا تھا تو نماز کے لیے نہ جاگتا تھا بلکہ صبح کی سیر کے لیے بیدار ہو جاتا تھا جو میری گھٹی میں پڑ چکی تھی..

اس علت کے باعث میں اکثر بے حد رُسوا ہوتا تھا..

کھٹمنڈو کی سویر میں جوگر پہن کر نیپال نگری میں نکلا ہوں..کچھ دور چلا ہوں تو ہنومان مہاراج کا درشن ہو جاتا ہے..شیش ناگ پھن اٹھائے مجھے سلام کر رہے ہیں..ایک مہاتما بدھ جن کی بڑی بڑی آنکھیں سُرمے کی سیاہی سے لبریز ہیں بُت بنے کھڑے ہیں اور ایک مندر کے مجسمے نہایت فحش حرکات میں مشغول ہیں اگرچہ اس نوعیت کی حرکات کے لیے فجر کا وقت ہی موزوں ہوتا ہے..

بیجنگ میں اس علت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہوٹل سے باہر نکلا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ

پورا چین مجھ سے پہلے نہ صرف بیدار ہو چکا ہے بلکہ فٹ پاتھوں' گلیوں' بازاروں اور پارکوں میں عجیب وغریب دھیمی اور آہستہ رو ورزشیں کرنے میں مشغول ہے۔

دلّی میں انڈیا انٹرنیشنل سنٹر سے برآمد ہوا ہوں تو لودھی گارڈن میں ایک دُھندآلود سویر میں یوگا کی ورزشیں ہو رہی ہیں اور قہقہہ کلب کے ممبران پھیپھڑوں کو پُھلاتے قہقہے لگا رہے ہیں اور میں اُن میں شامل ہو جاتا ہوں..

آرلینڈو میں جب آنکھ کُھلی ہے تو اب اس سوچ میں غلطاں ہوں کہ اپنی علت کی آسودگی کے لیے جوگرز پہن کر سیر کے لیے نکل جاؤں تو کہاں اور کدھر جاؤں..جو قصّے کہانیاں میں آرلینڈو کے بارے میں سن چکا تھا ان کے مطابق تو باہر مگرمچھوں کا راج تھا..اگر میں اس نیم تاریکی میں گھر سے باہر قدم رکھتا ہوں تو عین ممکن ہے کہ وہ قدم کسی مگرمچھ کے کھلے جبڑے میں جا پڑے تو خطرہ مول لینے سے فائدہ..اگر آئندہ کے زمانوں میں ادب کی تاریخ میں میرے تذکرے کا موہوم سا بھی امکان ہو تو میری حیات کے بیان کے آخر میں یہ درج ہو جائے کہ..موصوف کے آخری ایام اپنی بیٹی کے ہاں فلوریڈا میں گزر رہے تھے..وہ ایک سویر سیر کے لیے گھر سے باہر نکلے تو ایک مگرمچھ جبڑا کھولے ان کا منتظر تھا..اگرچہ وہ ان کا فین نہیں تھا لیکن اس نے نہایت رغبت سے انہیں ہڑپ کر لیا..اور ڈکار بھی نہ لی کہ وہ اتنے بڑے ادیب نہ تھے..بلکہ شنید ہے کہ مگرمچھ کو بعد میں بدہضمی ہو گئی کہ ان کے ہم عصر ادیب بھی ان کو ہضم نہ کر سکتے تھے..

چنانچہ میں نے صبح کی سیر کی علت سے اُس صبح اجتناب کیا اور گُچھا مُچھا ہو کر ایک بار پھر مدہوش ہو گیا..

دوبارہ آنکھ کھلی ہے تو اس آنکھ میں سورج چمک رہا تھا..

پورا کمرہ روشن ہو رہا تھا ہے..

ملحقہ واش رُوم بقیہ گھر کی مانند صفائی ستھرائی سے مہکا ہوا تھا..

اپنے آپ کو مناسب طور پر سنوار سنگھار کر..ملبوس ہو کر میں واش رُوم سے باہر آیا اور نیچے لونگ روم میں اترتی سیڑھیوں پر قدم رکھنے کو تھا تو وہ وہاں کھڑا تھا..

ایک پیلی ٹی شرٹ اور ڈھلکتی نیکر میں..وہ مجھے دیکھ رہا تھا..

میں سیڑھیوں سے نیچے آیا تو وہ اپنی ڈھلکتی نیکر کو سنبھالتا فوری طور پر اپنی ماں کی جانب

لپکا جو اس لمحے کچن میں میرے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی اور اس کی پناہ میں چلا گیا..لیکن مجھے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا..عینی جدھر جاتی وہ گردن گھما کر آنکھیں مجھ پر فوکس رکھتا..

"نوفل..یہ نانا جان ہیں" عینی نے اُس کی ڈھارس بندھائی "جاؤ انہیں پاری کرلو.."

اُس نے انکار میں سر ہلا دیا..

"بُری بات نوفل..نانا اتنی دور سے آئے ہیں آپ کو ملنے کے لیے..جاؤ پاری کرو.."

نوفل صاحب نے فوری طور پر پاری تو کرلی لیکن مجھے نہیں اپنی اماں جان کو..

بے شک میرے دونوں بیٹوں نے سول سروس کے امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کی لیکن پڑھنے لکھنے اور قابلیت میں عینی اپنے بھائیوں سے ذرا آگے تھی..کنیئرڈ کالج اور پھر نہایت آسانی سے کنگ ایڈورڈز میڈیکل کالج اور وہاں بھی اُن بورڈز پر اُس کے نام کا اندراج جس پر پوزیشن ہولڈرز کے نام پینٹ کیے جاتے ہیں..

البتہ وہ سگھڑ' سلیقہ شعار اور سلائی کڑھائی میں مہارت رکھنے والی بچی ہرگز نہ تھی..یہ اُس کا شعبہ ہی نہیں تھا' وہ تو ایک انڈہ بھی نہیں ابال سکتی تھی..اسے پڑھنے سے فرصت ملتی تو وہ ان کاموں کی جانب توجہ کرتی..لیکن وہ ایک سڑیل اور معّنک لڑکی بھی نہ تھی..

ایک روز کالج سے واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ اس کی کار کی پچھلی نشست بے شمار شاپنگ بیگز اور ڈبوں سے ٹھنسی پڑی ہے یہاں تک کہ میں نے دروازہ کھول کر دیکھنا چاہا کہ یہ کیا لائی ہے تو درجنوں پیکٹ ایک انبار کی صورت پورچ کے فرش پر گرنے لگے..میں نے عینی کی جانب دیکھا کہ یہ کیا ماجرا ہے تو اس نے ایک شکایت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ابو آپ کو تو یاد نہیں رہا..آج تیرہ مارچ ہے اور میری سالگرہ ہے..یہ تحفے میری دوستوں نے دیئے ہیں.."

جب اُس کا بیاہ ہو گیا اور وہ امریکہ آ گئی تو یہاں امی جان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے' ڈائننگ ٹیبل پر پیش کر دیئے جانے والے کھانوں کی سہولت میسر نہ تھی..چنانچہ وہ ادھر آرلینڈو میں ہانڈی چڑھا لیتی اور کمپیوٹر پر لاہور میں بیٹھی اماں سے ہدایات حاصل کرتی اس میں مرچ مصالحے ڈالتی ڈوئی چلاتی رہتی..امّی پیاز سرخ ہو گئے ہیں تو اب کیا کروں..یہ چاول تو دلدل ہو گئے ہیں ان کا کیا ہو گا..امّی آپ کے آلو تو اتنے خستہ اور مزیدار ہوتے تھے اور میرے آلو پتھر ہو گئے ہیں تو کیوں ہو گئے ہیں..امّی ان امریکی گاجروں کا گجریلا تو مزیدار نہیں بنتا کسی کے ہاتھ

پاکستانی گاجریں بھیج سکتی ہیں اور امّی کیا آپ بھی ہر کھانے پر اتنی محنت کرتی تھیں جتنی میں کر رہی ہوں؟ بہت بعد میں جب اس کے ہاں نوفل پیدا ہوا تو اس نے اسی نوعیت کا ایک اور سوال نہایت سنجیدگی سے پوچھا کہ امی جب میں چھوٹی تھی تو کیا آپ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی تھیں جتنی میں نوفل سے کرتی ہوں..

اور امی نے جل بھن کر کہا تھا کہ نہیں..میں تو تمہیں کوڑے کے ڈھیر پر بٹھا کر چلی آتی تھی..محبت کہاں کرتی تھی..

اسی طرح اُس نے ایک بار اقرار کیا کہ امی جب آپ کہا کرتی تھیں کہ عینی جب میں تمہیں اپنے سینے سے لگاتی ہوں تو مجھے ٹھنڈ پڑ جاتی ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ٹھنڈ کیا ہے جو پڑ جاتی ہے اور اب نوفل کو اپنے ساتھ لپٹاتی ہوں تو سمجھ آتی ہے..

آرلینڈو پہنچ کر..یعنی عینی کے گھر پہنچ کر مجھے ایک شدید دھچکا لگا کہ یہ وہ عینی تو نہیں ہے..

کون سی عینی؟

جو کبھی کبھار دو چار ماہ کے بعد اپنی کتابوں سے سر اٹھاتی تھی اور یکدم اعلان کر دیتی تھی کہ آج..میں کیک بناؤں گی..

اور اس اعلان پر ہر سو سراسیمگی پھیل جاتی تھی کہ آج..عینی کیک بنائے گی..

ہم سب اُس کی بہت منت سماجت کرتے کہ پلیز ایسا نہ کرو..ہم لاہور کی بہترین بیکری سے کیک خرید لاتے ہیں تم نہ بناؤ پر وہ باز نہ آتی..

وہ کچن میں جاتی..اپنے سامنے کیک بنانے کا نسخہ رکھتی اور پھر مار دھاڑ شروع کر دیتی..

ہم سب لونگ روم میں بیٹھے وظیفے پڑھتے رہتے..کچن میں سے کبھی سیاہ دھواں برآمد ہونے لگتا اور کبھی عجیب سی مہک آنے لگتی اور پھر تقریباً دو گھنٹے بعد وہ کچن سے فاتحانہ انداز میں برآمد ہوتی اور اس کے ہاتھوں میں ایک ننھی سی تقریباً سیاہ رنگ کی کوئی کیک نما شے ہوتی جسے ہمیں نہایت رغبت سے کھانا پڑتا اور اس کے ہمراہ داد بھی دینی پڑتی کہ واہ عینی میں نے تو جرمنی میں بھی ایسا کیک نہیں کھایا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ میں نے جرمنی میں کبھی ایسا کیک تو نہ کھایا تھا..

اس شاندار کیک کو تیار کرنے کے بعد عینی حسب معمول پڑھائی میں مشغول ہو جاتی اور

میمونہ کچن کی صفائی میں جُت جاتی.. جہاں درجنوں پلیٹیں' برتن' فرائنگ پین ادھ جلی حالت میں بکھرے ہوتے اور کچن کی دیواروں پر اس کیک کے چھینٹوں کی پر بہار ماڈرن آرٹ کی تصویریں نمائش پر ہوتیں..

تو وہی عینی..

اور کیا یہ وہی عینی ہے!

سلائی کڑھائی میں تو اب بھی نہیں پر دیگر گھریلو کاموں میں کیسے اتنی سگھڑ اور سلیقہ شعار ہو چکی ہے.. اُس کا گھر ایک ہیرے کی طرح دمکتا ہے اور وہ اتنی جھاڑ پونچھ کرتی ہے.. یہاں تک کہ باتھ رومز میں کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ اتنے کھرے اور شفاف ہوتے ہیں اور کیسے کیسے اعلیٰ اور ذائقے دار کھانے پل بھر میں تیار کر لیتی ہے..

نوفل اپنی سیاہ آنکھوں میں حیرت بھرے.. کبھی مجھ سے شرمندہ ہو کر اپنی ماں کی گود میں اپنے آپ کو چھپاتا ہے اور کبھی کن اکھیوں سے مجھے دیکھتا ہے..

آئرلینڈ وا ایئر پورٹ پر اُسے پہلی مرتبہ دیکھ کر جب وہ ہجوم کی لہروں پر تیرتا دکھائی دے رہا تھا اس لمحے اور اس کے بعد جو کچھ مجھے اس بچّے کے لیے محسوس ہوا وہ بیان کرنے سے قاصر ہوں.. اگرچہ وہ براہ راست میری نسل کا بچہ نہ تھا.. کہ عام عقیدے کے مطابق نسل تو بیٹوں سے بڑھتی ہے.. تو پھر یہ کیوں مجھے کل جہان سے پیارا لگ رہا ہے ایسا کہ اس پر سے نظر ہٹتی ہی نہیں تو اس کشش کا جواب میرے بابا.. میرے آقا کی جانب سے مل گیا کہ ہر سوال کا جواب بھی انہیں کے پاس ہے..

وہ جو اُن کے دو نوفل تھے.. حسن اور حسین.. جو نماز کے دوران اُن کی پشت پر سوار ہو کر مزے کرتے تھے اور وہ سجدہ کرتے ہوئے بھی مسکراتے ہوئے احتیاط کرتے تھے کہ کہیں ان آبگینوں کو ٹھیس نہ پہنچے..

اور اُن کی نسل بھی اپنے نواسوں سے آگے بڑھی.. پوتوں سے نہیں..

تو نوفل بھی میرے لیے ایک ایسا ہی نواسا تھا..

میں نے زندگی بھر سوائے حج کے ایام میں پانچوں نمازیں باقاعدگی سے نہیں پڑھیں.. البتہ فجر کی نماز کوشش کرتا ہوں کہ بے شک قضا ہی پڑھ لوں تو نوفل کی آمد کے بعد کی جتنی نمازیں

پڑھیں ان کے دوران جی بہت چاہا کہ نوفل ''بیلے بیلے'' کرتا آئے اور نانا کی پشت پر سوار ہو جائے.. یوں میں اپنے بابا کی قربت میں ہو جاؤں..

عینی کو خوب معلوم تھا کہ ابّو ناشتے پر چکودرے کا کڑوا جوس نہایت ہی اشتیاق سے پیتے ہیں چنانچہ اس کا آدھا فریج گریپ فروٹ جوس کے ڈبوں سے بھرا پڑا تھا..

ناشتے کے دوران بھی نوفل اپنی ماں کی گود میں دبکا مجھے شک بھری نظروں سے دیکھتا رہا کہ آخر یہ کون ہو سکتا ہے جس کے ساتھ میری ماں ہر دس پندرہ منٹ کے بعد لپٹ جاتی ہے اور کبھی ہنستی ہے اور کبھی روتی ہے..

عینی کبھی بھی کوئی خدمت کرنے والی اطاعت گزار قسم کی بیٹی نہ رہی تھی بلکہ سچ پوچھئے تو میمونہ اور میں نے ہی اس کی اطاعت کی اور خدمت گزاری کی کہ وہ ہماری اکلوتی بیٹی تھی.. اگر وہ بھائیوں کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرتی تو ان کی شکایت پر انہیں ہی ڈانٹ پڑتی کہ خبردار اگر عینی کو کچھ کہا تو.. یوں بھی وہ اپنی قابلیت اور خوش شکلی کے زعم میں رہتی تھی اور اس کا تکیہ کلام تھا ''کبھی غرور نہیں کیا''.. یعنی یہ تو طے ہے کہ ہم بہت لائق اور اچھی شکل کے ہیں لیکن اس کے باوجود ''کبھی غرور نہیں کیا''..

لیکن وہ ایک بیٹی تھی اور بیٹوں کی نسبت کہیں بڑھ کر ہمارے لیے فکرمند ہوتی تھی.. بلکہ وہ ہمیں ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتی تھی..

ایک بار میمونہ اپنے تینوں بچوں کو سمیٹ کر اپنی ہمشیرہ جمیلہ سے ملنے کراچی چلی گئی اور میں لاہور میں بے آسرا اور تنہا ہو گیا.. میں نے اس بے آسری اور تنہائی کو بے حد انجوائے کیا لیکن دو چار دنوں کے بعد میں اس مادر پدر آزادی سے اکتا گیا.. ایک روز فون پر بات ہو رہی تھی تو میمونہ کے بعد سلجوق کی آواز آئی ''ابو آپ کیسے ہیں.. مزے کر رہے ہیں' میرے کن کن دوستوں کے فون آئے ہیں؟.. میرے کوئی خط وغیرہ.. اور ہاں فلاں سٹور میں سیل لگی ہے میرے ناپ کی دو جینز خرید لیجیے گا..'' اور اس کے بعد سمیر لائن پر تھا ''ابا جی کیسے ہو.. اور سنائیں.. ہمارے ڈوگی شیری کا کیا حال ہے.. ان موسموں میں السیشن کتّوں کو موٹی جوئیں پڑ جاتی ہیں اس کا خیال رکھئے گا.. یا تو خود اس کی جوئیں نکال لیجیے گا اور اگر زیادہ ہوں تو جانوروں کے ڈاکٹر سے مشورہ کر کے کوئی محلول اس پر چھڑک دیجیے گا.. غفلت نہ کیجیے گا ان جوؤں سے کتے مر بھی جاتے ہیں..'' اور آخر میں جب عینی کی باری آئی تو اس نے صرف یہ پوچھا ''ابو.. ہم آ گئے ہیں تو آپ کے کھانے کا کیا بندوبست

ہے..کیا کھاتے ہیں..کہاں سے کھاتے ہیں..''

تو یہ فرق ہوتا بیٹوں اور بیٹیوں میں..

بیٹے اپنے دوستوں اور کتّوں کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں اور بیٹیاں ابّو کے کھانے کے بارے میں..

ہم ناشتے کے لیے بیٹھے اور ابھی میں نے گریپ فروٹ جُوس کا پہلا گھونٹ لیا تھا کہ لونگ روم کے شیشے پر کسی نے دستک دی..

کیا دیکھتا ہوں کہ شیشے کے پار ایک لمبی گردن والی کُونج پَر سمیٹے کھڑی ہے اور مجھے نہایت ناراض نظروں سے دیکھ رہی ہے..

''آپ ناشتہ کریں ابّو'' عینی میری حیرت کو بھانپ لیتی ہے..

''دستک اس نے دی تھی؟''

''ہاں ابّو..''

''کیوں؟''

''اس کے ناشتے کا وقت بھی ہو گیا ہے..'' اُس نے میرا ہاتھ تھام کر میری ہتھیلی کو چوما اور کہا ''تھینک یُو ابو..''

اُس کُونج نے اپنی چونچ سے شیشے پر ایک اور بے تاب دستک دی..

تو یہ عینی کا آرلینڈو تھا..



''آرلینڈو کی سویریں اور شامیں''

اگرچہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں..

لیکن تین سرمئی کونجوں کا خوشی سے بہرحال تعلق ہے..

اِن کونجوں کے سَر شوخ سرخ رنگ سے رنگے تھے اور اس رنگ میں اُن کی بھور سیاہ آنکھیں کیا خوب جچتی تھیں..

اُن کی گردنیں لامبی تھیں کیونکہ کونج کی گردن لمبی نہ ہو تو وہ کونج نہیں مرغابی ہو جاتی ہے اور پھر اُس کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں رہتا..

یہ کسی ڈار سے بچھڑی ہوئی کونجیں نہ تھیں بلکہ اُن کی اپنی ذاتی ڈار تھی جس میں دو تو میاں بیوی تھے اور تیسرا اُن کا بچہ تھا..

بچہ بہت بدتمیز تھا' جب غصّے میں آتا تھا تو اپنی ماں کے سرخ سر میں چونچ سے ٹھونگے مارتا تھا..

میں مرغابیوں اور کونجوں کے بارے میں بھی بہت کچھ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ ان کی ڈاریں ہوتی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک اگر اپنی ڈار سے بچھڑ جائے تو کُرلاتی بہت ہے..

بہت قدیم اور کھو چکے زمانوں گاؤں کے ایک کچے مکان میں سردیوں کی یخ راتوں میں..جب برابر کی کوٹھڑی سے تازہ کپاس اور گندم کی مہک آ رہی ہوتی تھی اور طاقچے میں مٹی کے ایک دیے کی بتّی پٹاخے مارتی بجھ جانے کو ہوتی تھی تو میں اپنی ماں کی گود میں سمٹا ایک رضائی میں سمٹا..آسمانوں سے اُترتی ایک کُرلاہٹ کو سنتا تھا..

عجیب دُکھ بھری..فریاد کرتی..بین کرتی سردی میں منجمد ہوتے گاؤں کے آسمان سے اُتر

کر رضائی کے اندر میرے کانوں میں اُترتی..

"کوئی کونج ہے مستنصر جو ڈار سے بچھڑ گئی ہے" میری ماں مجھے بتاتی "وہ اپنی سہیلیوں کو آواز دے رہی ہے کہ تم کہاں ہو.. مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی نہ جانا.."

پتہ نہیں امریکی کونجیں اگر اپنی ڈار سے بچھڑ جائیں تو کُرلاتی بھی ہیں یا نہیں اور اگر کُرلاتی ہیں تو کیا اُس لَے میں کُرلاتی ہیں جس لَے میں پاکستانی کونجیں کُرلاتی ہیں..

یہ جو تین کونجیں فلوریڈا کے شہر آرلینڈو میں میری بیٹی کے مکان کے پچھواڑے میں کبھی گولف کورس کی گھاس پر اور کبھی جھیل کنارے اُترنے والی.. اور دھیرے دھیرے چہل قدمی کرتے مجھ تک بے خطر آنے والی.. یہ اجنبی نہ تھیں.. میرا ان سے تعارف ہو چکا تھا..

"ابّو.. آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں" عینی فون پر مجھے اپنے گھر کے بارے میں بتا رہی ہے "یہاں ہر روز ہمارے گھر کے پیچھے جو گولف کورس ہے وہاں تین کونجیں اُترتی ہیں.. پہلے پہل تو وہ ذرا دور دور رہتی تھیں پھر وہ گردنیں اکڑائے قریب آنے لگیں.. ذرا متجسس مگر احتیاط کے ساتھ.. میں نے اُنہیں ڈبل روٹی کے ریزے پیش کیے تو وہ ذرا سی جھجک کے بعد اور قریب ہوئیں اور میری کھلی ہتھیلی پر سے ڈبل روٹی کے ریزے ٹھونگیں مار کر کھانے لگیں.. اب یہ روزانہ کا معمول ہو گیا' میں اُن کی منتظر رہتی کہ وہ کب آئیں اور میں اُنہیں ڈبل روٹی کھلاؤں.. اس دوران جانے کس نے شکایت کر دی کہ ایک پاکستانی لڑکی ہے جو جنگلی حیات کے قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہے' کونجوں کو خوراک کھلاتی ہے.. یوں وہ کونجیں اپنی خوراک خود تلاش کرنے کی بجائے اُس پر انحصار کرنے لگیں گی اور اگر کل کلاں اُنہیں یہ خوراک حاصل نہ ہوئی تو وہ خود خوراک تلاش کرنے کی عادت کو بھول چکی ہوں گی اور یوں بھوک سے مر جائیں گی.. چنانچہ میں نے گرفتاری وغیرہ کے خوف سے اُنہیں ڈبل روٹی کھلانا موقوف کر دیا.. لیکن ابّو وہ پھر بھی روزانہ آ جاتیں' میں باہر نہ نکلتی تو وہ لونگ رُوم کی کھڑکی کے شیشے پر چونچیں مار مار کر احتجاج کرتیں اور نہایت دردناک آوازیں نکالتیں.. ایک روز مجھے خدشہ ہوا کہ وہ چونچیں مار مار کر میری کھڑکی کا شیشہ توڑ دیں گی اور ابّو یہ شیشہ بہت بڑا ہے.. اگر ٹوٹ جاتا تو نیا لگوانے کے لیے ہمارے ماہانہ بجٹ کا ستیاناس ہو جاتا چنانچہ اب میں گھر کے اندر رہتی ہوں اور ہاتھ بڑھا کر اُنہیں ڈبل روٹی کھلا دیتی ہوں اور ساتھ میں اپنے منہ پر اُنگلی رکھ کر "شش" کہہ کر اُنہیں چپ رہنے کی درخواست کرتی ہوں..

اس دوران نوفل پیدا ہوا اور ذرا بڑا ہو گیا تو عینی کی مشکل آسان ہو گئی "ابّو.. اب نوفل اُنہیں ڈبل روٹی کھلا دیتا ہے اگر کسی نے شکایت کی اور کوئی اہلکار تفتیش کے لیے آ گیا تو میں صاف کہہ دوں گی کہ بدتمیز بچہ ہے میرا کہنا نہیں مانتا تو میں کیا کروں.. اور ابّو امریکہ میں تو بچوں کو سرکاری طور پر ڈانٹا بھی نہیں جا سکتا.. اور ہاں نوفل اُنہیں 'چڑیا' کہتا ہے.. میں بہت سکھاتی ہوں کہ بیٹے یہ کونجیں ہیں تو وہ سر ہلا کر کہتا ہے نہیں.. چڑیا ہے.. ایسا بیوقوف بچہ ہے۔"

ایک دوپہر میں عینی کے گھر کے پچھواڑے میں برآمدے میں براجمان اپنے دن کا پانچواں سگریٹ پی رہا تھا کہ میں نے پہلے دن سے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ستھرے گھر کو تمباکو کی بُو سے آلودہ نہیں کرنا' سگریٹ اگر پینا ہے تو باہر برآمدے میں پینا ہے۔ تو چار بجے کے قریب رہائشی مکانوں کی ڈھلواں چھتوں پر جو آسمان تھا وہاں سے پرواز کرتی تین کونجیں نمودار ہوئیں اور عین میرے سامنے گھاس کے ایک قطعے پر لینڈ کر گئیں..

وہ پہلے تو لاتعلقی سے گردنیں لامبی کیے آس پاس دیکھتی رہیں.. اور کبھی چوری چوری اپنے سرخ سروں میں نمایاں ہوتی سیاہ آنکھوں سے مجھے پرکھتی رہیں کہ آج یہ کون ہے.. وہ تیکھے نین نقش والی سوہنی لڑکی کہاں ہے اور اُس کی جگہ اُس کے نین نقش والا یہ بھدا سا شخص کون ہے جس کے مُنہ سے دھواں برآمد ہو رہا ہے.. پھر وہ اپنی مُنحنی اور لامبی ٹانگیں آگے پیچھے رکھتیں نہایت فلسفیانہ شکل بنائے میرے قریب ہو گئیں.. اور میرے پاس اُن کے لیے کچھ ڈبل روٹی تھی.. میں نے بہت محنت سے اُس کے ریزے کیے تھے اِس آس میں کہ شاید وہ آئیں.. اور وہ آ گئیں.. چونچیں آگے کیے وہ میرے پاس آ گئیں..

ہر شخص کی حیات میں کہیں نہ کہیں کچھ دہکتے اور لَو دیتے لمحے تو آتے ہیں جو اُس کے بدن اور اُس کی رُوح کو سرشاری سے شرابور کر کے اُسے خالق کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ اے مالک اِس زندگی کے لیے اور ان لمحوں کے لیے تیرا شکریہ..

بڑے لوگوں کی زندگی میں ایسے لمحے بھی بڑے ہوتے ہیں.. یعنی جس روز آپ کروڑ پتی ہو جاتے ہیں روپوں میں نہیں بلکہ ڈالروں میں.. یا آپ ایک سلور رولز رائس خرید لیتے ہیں.. ایک پورا جزیرہ آپ کی ملکیت میں آ جاتا ہے یا پھر آپ کو نوبل انعام مل جاتا ہے.. لیکن ہم ایسے چھوٹے لوگوں کی زندگی میں ایسے لمحے بھی چھوٹے ہوتے ہیں..

اپنے ننھے سے بیٹے کو پہلی بار خود سے آئس کریم کھاتے دیکھنا اور اُس کے لطف سے آپ کی جانب دیکھ کر ایک بار مسکرا دینا..

گوجر خان کی قربت میں سر شام سرسوں کے زرد کھیتوں کے اوپر زرد ہوتے آسمان پر ایک قوس قزح کی رنگیلڑی کمان نمودار ہوتے دیکھنا..

ہوسے سراماگو کے ناول ''بلائنڈنیس'' کو پہلی بار پڑھنا..

پھر ایک محبت کی گیلی سسکی کو پہلی بار سننا..

کسی آبی پرندے کو ایک اجنبی آسمان پر روزانہ کُرلاتے اور محبت کرتے دیکھنا..

اس نوعیت کے بہت معمولی اور حقیر سے بہت لمحے ہیں اور اُن میں سے ایک لمحہ مجھے آرلینڈو میں تب نصیب ہوا جب میں نے اپنی ہتھیلی آگے کی اور اُس ہتھیلی پر ڈبل روٹی کے کچھ ٹکڑے تھے اور ایک کونج نے آگے ہو کر اُن پر چونچ ماری..اور میں نے اُس کی چونچ کی چُبھن ہتھیلی کے ماس پر محسوس کی..

یقیناً کچھ پڑھنے والے مسکرا دیتے ہوں گے کہ یہ کیسے ایک یادگار لمحہ ہو سکتا ہے..اور میں اُنہیں دوش نہیں دوں گا کہ وہ آگاہ ہی نہیں ہیں کہ ایک آزاد پنچھی ایک لامبی گردن اور سرخ سَر میں نمایاں دو سیاہ آنکھوں والی کونج جب آپ کی ہتھیلی پر چونچ مار کر ڈبل روٹی کا ٹکڑا اُٹھاتی ہے تو کیسا لطف آتا ہے..کس قدر مسرت ہوتی ہے..

چونکہ ان کُونجوں نے مجھے ایک یادگار لمحہ عنایت کیا تھا اس لیے میں نے انہیں جاننے کے لیے ایک کتاب ''فلوریڈا کے پرندے'' کا نہایت انہماک سے مطالعہ کیا..

''سنیڈ ہل کرین..سرمئی کونجیں چار سے پانچ فٹ قد کی ہوتی ہیں..ان کے پروں کا پھیلاؤ چھ سے سات فٹ تک ہوتا ہے۔ یہ کیڑے مکوڑے' مینڈک' چھپکلیاں اور چھوٹے سانپ نہایت رغبت سے نوش کرتی ہیں..اور اگر کوئی چوہا یا مچھلی مل جائے تو بھی پرہیز نہیں کرتیں..''

ان سرمئی کونجوں کے بارے میں میں نے کچھ اور حقائق بھی دریافت کیے اور مجھ پر اُن کی ایک ناقابل یقین خصلت کا انکشاف ہوا..ایک ایسی خوبی جو کسی اور پرندے میں نہیں پائی

جاتی..اور وہ ہے وفا..زندگی بھر کا ساتھ..زندگی میں صرف ایک بار اپنے ساتھی کا چناؤ کرتی ہیں اور پھر مرتے دم تک وہ ساتھ نبھاتی ہیں..کبھی بے وفا نہیں ہوتیں..جب کسی نَر کونج کا دل کسی بانکی نخریلی مادہ کونج پر آ جاتا ہے تو وہ اُسے لبھانے کی خاطر اپنی جانب مائل کرنے کے لیے اُس کے گرد ایک شاہانہ اور سریلا رقص کرنے لگتا ہے..اور وہ مادہ کونج اُسے ذرّہ بھر لفٹ نہیں کرواتی..اُس کی جانب اپنی سیاہ آنکھیں اُٹھا کر نہیں دیکھتی..بظاہر بے اعتنائی برتتی ہے لیکن دل ہی دل میں اُس پر مرٹتی چلی جاتی ہے..جی ہاں بالکل ایک مان چکی عورت کی طرح..اور جب اُن دونوں کا میل ہو جاتا ہے تو پھر پوری زندگی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں اور کسی اور کونج کی جانب چاہے وہ کتنی ہی چنچل اور نوخیز کیوں نہ ہو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے جب کہ دیگر پرندوں کی بے حیائی اور مخرب الاخلاقی سے تو آپ خوب واقف ہیں کہ کیسے پُھدک پُھدک کر ساتھی بدلتے رہتے ہیں..کبھی اس چڑیا پر اور کبھی اُس چڑیا پر..اور دیگر حیوانوں کے حیوانی جذبوں سے بھی آپ آگہی رکھتے ہوں گے..

کہا جاتا ہے کہ ملکہ الزبتھ اپنے شوہر فلپ کے ہمراہ افزائش نسل کے ایک فارم پر تشریف لے گئیں جہاں ایک بیل نے اُن کی شاہانہ موجودگی میں پانچ چھ گائیوں کو سرفراز فرمایا تو ملکہ نے ڈیوک صاحب کی توجہ اس کارکردگی کی جانب مبذول کرواتے ہوئے کہا کہ فلپ..دیکھا تم نے کہ یہ بیل کیسا متحرک اور مصروف عمل ہے اور تم..اس پر ڈیوک نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ..ڈارلنگ تم نے نوٹ نہیں کیا کہ ہر بار گائے نئی ہوتی ہے..

چلئے آپ ایک ارتقاء کی منازل طے کر چکے حیوان نہیں حضرت انسان سے تو واقف ہیں ناں..تو وہ بھی ایک منکوحہ کی موجودگی میں بھی تانک جھانک سے باز نہیں آتے..نظر بازی سے گریز نہیں کرتے اور اگر نہایت ہی شریف الطبع اور باوفا ہوں تب بھی وہ کونسا مرد ہوگا جس کے من میں عقد ثانی کی خواہش انگڑائیاں نہ لیتی ہو..اگر کوئی ایسا مرد ہے تو میں اُسے بلا جھجک دنیا کا سب سے جھوٹا اور منافق مرد قرار دوں گا..الحمدللہ میں اس معاملے میں قطعی طور پر جھوٹا اور منافق نہیں ہوں' بے شک مردانگی زوال پذیر ہے لیکن عقد ثانی کی خواہشیں راتوں کو بیدار رکھتی ہیں..

دونوں میاں بیوی اور اُن کا بچہ کونجیں ہر سہ پہر پورے چار بجے آسمان سے اُتر کر میرے سامنے لینڈ کر جاتیں اور اپنی لم ڈھینگ ٹانگیں آگے پیچھے کرتیں میرے قریب آ جاتیں اور

میرے پاس اُن کے لیے ڈبل روٹی کے ٹکڑے ہوتے..

لیکن سہ پہر چار بجے سے پہلے بھی تو میں کچھ کرتا تھا..آخر کیا کرتا تھا؟

ظاہر ہے دن کا آغاز سویرے سے ہی ہوتا تھا..اور میری سویر کا آغاز ہمیشہ منہ اندھیرے فجر کی اذانوں کے ساتھ ہو جاتا ہے..پہلی دو چار سویروں میں میں نے جان بوجھ کر کاہلی برتی اور اپنے بدن کو آرام دیا..نیویارک کی پُر ہجوم' دل فریب اور رنگینیاں تمام تصویر کی بجائے آرلینڈو کی تنہائی' وسعت اور دھیمے رنگوں کی تصویر کے ساتھ مفاہمت کی' اُس کی عادت ڈالی اور پھر ایک صبح میرے نشئی بدن نے مجھے کچوکے دیئے کہ چل اُٹھ مجھے سیر پر لے چل' میں نے ٹی شرٹ اور نیکر کے ساتھ جوگرز پہنے اور دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں سے نیچے آ گیا..بلال مجھ سے پہلے جاگ چکا تھا اور نہا دھو کر ایک گول ٹوپی سر پر جمائے ناشتہ کر رہا تھا.''انکل آپ کدھر جا رہے ہیں'' وہ ٹھٹک گیا..

میں نے اُسے بتایا..

''لیکن ابھی تو باہر تاریکی ہے..''

''میرے ایک دوست کے مطابق سورج طلوع ہو جائے تو دھوپ میں سیر کرنا صحت کے لیے مضر ہوتا ہے.'' میں نے ہنس کر کہا ''اور تم نے یہ مزاحیہ سی ٹوپی کیوں پہن رکھی ہے؟''

''یہ..یہ تو بال سیٹ کرنے کے لیے ہے..اگر آپ نے جانا ہی ہے تو ذرا احتیاط کیجیے گا' جنگل کے بہت نزدیک ہو کر نہ چلیے گا اور نہ ہی جھیلوں کے قریب سیر کیجیے گا کہ گیٹرز صرف دھوپ سینکنے کے ہی شوقین نہیں ہوتے بلکہ صبح سویرے مینڈکوں اور پرندوں کا ناشتہ کرنے کے لیے بھی پانی سے باہر آتے ہیں اور یہ میرا سیل فون ساتھ لے جائیے..آپ راستہ بھول جائیں یا کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو آپ رابطہ کر سکتے ہیں..''

''یعنی اگر کوئی جنگلی جانور دانت نکوسے مجھ پر حملہ آور ہونے لگتا ہے یا کوئی مگرمچھ جبڑا کھولے میری جانب لپکتا ہے تو میں اُسے کہوں گا کہ ذرا توقف فرمائیے میں سیل فون پر بلال سے رابطہ کر لوں..''

بلال مسکرایا تک نہیں کہنے لگا ''ہاں ایسا ہو سکتا ہے..سیل فون ضرور لے کر جائیں.''

اور اگلے تین ہفتوں کے دوران وہ ہر سویر یہ سیل فون نہایت اہتمام سے میری نیکر کی

جیب میں ڈالتا کہ انکل...اور حرام ہے کہ میں نے اُسے ایک بار بھی استعمال کیا ہو یا اُس کی گھنٹی ہی بجی ہو البتہ وہ وقت دیکھنے کے کام ضرور آ جاتا..بہرحال میں بلال کی برخورداری کا قائل ہو گیا وہ اپنے انکل کے بارے میں اتنا پُرتشویش رہتا ہے..

میں لِونگ روم کے دیوار شیشے کا چوکھٹا ذرا سا دھکیل کر پچھلے برآمدے میں جاتا جو گولف کورس پر کھلتا تھا اور پھر اُس راستے پر آ جاتا جس پر گولف کارٹس چلتی تھیں..یہ ایک بل کھاتی ہوئی چوڑی پگڈنڈی تھی جو کئی کلومیٹر کے علاقے میں وسیع ہوتے گولف کورس کی ہر جھیل اور ہر پہاڑی تک چلی جانے والی ایک منی شاہراہ تھی..گولف کے کھلاڑی گیند کو پوری قوت سے اُچھالتے اور پھر اپنی کارٹس میں سوار ہو کر اپنے گیند کی تلاش میں نکل جاتے..اس پگڈنڈی کے آس پاس کے منظر جو سحر انگیز تھے ہر لحظہ بدلتے رہتے..کبھی جھیلیں' کبھی جوہڑ' کبھی گھنے جنگل اور اکثر سرسبز ڈھلوانیں..

نیم تاریکی میں وہ پگڈنڈی بمشکل دکھائی دیتی..گولف کورس کی تین مصنوعی جھیلوں کے شائبے سے نظر آتے اور کچھ دکھائی نہ دیتا..میں اس راستے پر چلنے لگتا..دو جھیلوں کو ملانے والے ایک ٹُبڑے اور بوسیدہ پُل کے پار ہو کر جب میں پلٹ کر نظر کرتا تو گولف کورس کے کناروں پر نیم تاریکی میں نمایاں ہوتے گھروں کا ایک سلسلہ دکھائی دیتا اور میں اُن میں سے آسانی سے عینی کے گھر کو پہچان لیتا کہ ایک تو وہ آبادی کا سب سے پہلا گھر تھا اور دوسرا یہ کہ اُس میں روشنی ہوتی کہ اُس لمحے بلال دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوتا..

اس پُل کے پار بائیں جانب ایک آپس میں اُلجھے ہوئے' گتھے ہوئے بلند درختوں کا جنگل شروع ہو جاتا جو ایک سیاہ قلعے کی مانند اُمڈتا ہوا اور سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا..اُس کے سانسوں میں کبھی کوئی ٹہنی ٹوٹتی اور کبھی کوئی خوابیدہ پرندہ ایک اور سویر میں زندہ ہونے اور پرندہ ہونے کے چاؤ میں چہکنے لگتا..

کم از کم ایک بار ایسا ہوا کہ کوئی بھاری بھرکم شے درختوں کو روندتی ہوئی آئی کہ وہ دکھائی نہیں سنائی دیتی تھی اور جنگل کے باہر آ کر مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی' میں اگرچہ دہشت میں منجمد ہو گیا لیکن ٹھہرا نہیں چلتا گیا..جانے کیا شے تھی..

اور کم از کم ایک بار ایسا ہوا..کہ میں وہ پگڈنڈی ترک کر کے جنگل کے اندر جانا چاہتا تھا صرف یہ جاننے کے لیے کہ وہاں کیا ہے..جیسے کے ٹو کے راستے میں چلتے ہوئے ایک

پتھریلے ڈھیر پر چڑھ کر صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے دوسری جانب کوئی جھیل تو نہیں.. تو ایک نیم اندھیاری سویر میں میں راستے سے الگ ہو کر جنگل کے اندر ہوا اور وہاں ٹہنیوں' بوٹوں اور درختوں سے لٹکتی سرسبز جھالروں کے جال تھے.. گنجلک بیلیں اور جھاڑیاں تھیں.. سبز کائی ایسے جالے تھے جن میں پاؤں اُلجھتے تھے اور شاخیں آنکھوں کو ڈھکتی تھیں.. اپنا چہرہ بچاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے شاخیں' بیلیں اور سبز جالے پرے کرتے ہوئے میں نے چند قدم اُٹھائے..

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جنگل ایک گوشت خور پودے کی مانند ہے جو مجھے آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لے کر بھینچ رہا ہے.. پھر ایک قدم ایسا آیا کہ وہ گھنے سیاہ کیچڑ کی دلدل میں گیا اور ایسا گیا کہ اُسے کھینچ کر باہر نکالنا مشکل ہو گیا.. تب میں ایسا تائب ہوا کہ پھر کبھی اُس جنگل کے اندر قدم نہ رکھا.. صراط مستقیم پر چلتا رہا..

گولف کورس کی ہریاول میں سفر کرتی یہ پگڈنڈی ایک مقام پر جنگل سے ذرا پرے ہو جاتی تھی اور وہاں دائیں ہاتھ پر کچھ فاصلے پر چند گھر تھے اور اُن کے پچھواڑے میں جو سرسبز ڈھلوانیں تھیں وہاں ہر سویر بے شمار کاہل قسم کے بگلے اُترے ہوئے ہوتے تھے.. گھاس میں چونچیں مارتے شاید اپنا ناشتہ تلاش کرتے تھے اور عین اُس لمحے وہ ساعت نمودار ہوتی جب سورج کی پہلی کرنیں اپنی زردی میں عریاں ہونے لگتیں.. مجھ پر تو ابھی جنگل کی سیاہی غالب ہوتی پر وہ بگلے سارے کے سارے سنہری ہونے لگتے.. قریب سے گزرتے تارڑ سے یکسر لاتعلق سستی سے گھاس میں چونچیں مارتے سنہری ہوتے جاتے۔

سپیدۂ سحر عیاں ہونے لگتا..

پھر میں ایک بہت وسیع گھنے جنگلوں میں گھری جھیل کے قریب ہو کر چلنے لگتا.. بہت دور اس کے دوسرے کناروں پر سلیٹی رنگ کی ٹائلوں سے ڈھکے اور سویر کی دُھند میں ڈوبتے ظاہر ہوتے پانچ گھر دکھائی دیتے اور میں وہاں سے گزرتے ہوئے سوچتا کہ ان گھروں کے مکینوں کے سامنے.. ہر سویر یہ کیسا پُرفریب منظر کھلتا ہو گا اور وہ کیسے نصیب والے ہیں.. اگرچہ مجھے شک تھا کہ ایسے شاندار گھروں میں رہنے والے اکثر لوگ کبھی اتنی سویرے بیدار ہو کر اپنے گھروں کے سامنے جو سحر طراز پانی کے جزیرے ہوتے ہیں اُن پر نازل ہوتی کرنیں ہوتی ہیں اُنہیں ہیں دیکھتے.. اُنہیں ایسے گھروں کے حصول کے لیے اور اُن کی ماہانہ اقساط کی ادائیگی کے لیے دن رات اتنی

مشقت کرنی پڑتی ہے کہ جو وہ حاصل کرتے ہیں اُس سے لطف اندوز ہونے کا اُن کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا..

اس جھیل کی سویر خاموشی اور آبی تنہائی میں ایک صبح میں نے ایک نہایت پُرامن اور شانت شخص کو دیکھا جو پانیوں میں کنڈی ڈالے ڈوری کھینچ رہا تھا.. میں نے کچھ دیر اُسے دور سے دیکھا اور وہ مگن تھا اور پھر اُس کے پاس ہو گیا ''کیا آپ نے کوئی مچھلی شکار کی ہے؟''

''ہاں.. کم از کم تین..''

''اور.. وہ کہاں ہیں؟''

''پانی میں..''

''اگر آپ نے اُن کو پکڑا ہے تو وہ پانی میں کیوں ہیں؟''

''کیونکہ مچھلیوں کو پانی میں ہی رہنا چاہیے..''

میں اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر تھا..

''آپ نے وہ مچھلیاں پکڑیں تو وہ پھر سے پانی میں کیوں چلی گئیں۔''

''میں نے خود اُنہیں پانی میں ڈال دیا.. میں اُنہیں شکار کر کے اُن کے گلپھڑے کُنڈی سے چھڑاتا ہوں اور اُنہیں کچھ دیر اپنے ہاتھوں میں تھام کر اُن کے بے چین بدن کو محسوس کرتا ہوں اور پھر اُنہیں جھیل کے پانیوں میں واپس ڈال دیتا ہوں.. میں صرف شکار کی کیف انگیزی سے لطف لیتا ہوں ورنہ ان سے بہتر مچھلیاں تو ہر سُپر سٹور میں مل جاتی ہیں..''

اس جھیل سے ذرا آگے گولف کورس میں سفر کرتی یہ پگڈنڈی اختتام کو پہنچ جاتی اور وہاں ایک کلب کی عمارت تھی جس سے ملحقہ سوئمنگ پول میں ہر سویر ایک لڑکی تیرتی دکھائی دیتی.. میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی ہی تھی کہ اُس کے لامبے بال سوئمنگ پول کی سطح پر بچھے ہوتے.. ہو سکتا ہے وہ کوئی گیسو دراز لڑکا ہو..

میں شاہراہ پر آ نکلتا..

ذرا ٹھہریئے میں یہاں ایک فلیش فارورڈ کرنا چاہتا ہوں..

میں یہاں جس برس کا بیان کر رہا ہوں اُس سے اگلے برس میں جانا چاہتا ہوں..

اگلے برس جب میں ایک بار پھر عینی کے پاس آرلینڈو گیا تو میری سویر کی روٹین میں

کچھ تغیر نہ ہوا.. گولف کورس کی وہ پگڈنڈی.. وہی جنگل اور وہی جھیلیں.. لیکن جب میں اُس پگڈنڈی کے اختتام تک پہنچا اور آگے شاہراہ تھی تو دائیں جانب جہاں پچھلے برس محض گھاس تھی وہاں ایک نفاست سے ترتیب دی ہوئی خوش رنگ پتّوں اور گل بوٹوں کی ایک کیاری تھی اور اُس خوش نظر ترتیب کے درمیان میں ایک جستی پلیٹ پر ایک نوجوان ہنستی ہوئی سنہری بالوں والی لڑکی کی تصویر ثبت تھی اور اُس زندگی سے بھرپور لڑکی کے نین نقش شبنم کے قطروں میں کچھ دھندلائے جاتے تھے.. جیسے وہ پانیوں کے پیچھے سے ظاہر ہو رہی ہو... جونہی سورج کی پہلی کرنیں اُس کے چہرے پر اُترتیں اُن کی حدت سے وہ شبنم زائل ہو جاتی اور اُس لڑکی کی مسکراہٹ عیاں ہو کر آپ کے دل پر اثر کرنے لگتی..

تصویر کے نیچے ایک عبارت تھی.. اُس لڑکی کا نام درج تھا جو مجھے یاد نہیں رہا.. شاید جون ایلی سن تھا.. اور تحریر تھا کہ.. جون ایلی سن کی یاد میں جو صرف اکیس برس کی عمر میں ایک حادثے کا شکار ہو کر مرگئی.. یہ یادگار گل بوٹوں اور رنگین پتّوں کی پچھلے برس نہ تھی.. اب تھی..

ایک زندگی سے اپنے شباب کے برسوں میں ہی بچھڑ جانے والی لڑکی کے لیے یہ کیا ہی شاندار محبت کا اظہار تھا کہ اُس کی یاد میں ایک جنگل کی قربت میں' ایک جھیل کے پاس ایک ہریالی ڈھلوان پر یہ گل بوٹے ترتیب دیئے جائیں..

میں ہر سویر اس پگڈنڈی کے اختتام پر... جون ایلی سن کی تصویر کے پاس کچھ دیر ٹھہرتا.. انتظار کرتا کہ کب اُس کے خوش نظر چہرے پر سورج کی پہلی کرنیں اُتریں اور اُس پر سے شبنم کا حجاب اُترے.. میں اُس کے لیے.. جسے میں جانتا تک نہ تھا اُس کی جواں سال مرگ پر رنجیدہ ہوتا' کچھ دیر اُس کے پاس ٹھہرتا اور دل ہی دل میں اُس کی مغفرت کی دعا کرتے اُس کے لیے جنّت کی خواہش کرتا.. بے شک مسلمان جنّت کے لیے نہ سہی.. جو بھی اُس کا عقیدہ تھا اُس کی جنّت کے لیے.. اور اگر اُس کا کوئی بھی عقیدہ نہ تھا تو بھی کسی ایسی جنّت کے لیے جس کا تعلق کسی مذہب سے نہ ہو.. کہ ہر مذہب کی جنّت الگ ہوتی ہے جس میں صرف اُسی مذہب کے پیروکار داخل ہو سکتے ہیں.. جیسے مذہب الگ ایسے جنّت الگ.. اس فلیش فارورڈ سے ہم واپس لمحۂ موجود میں آتے ہیں.. میں شاہراہ پر آ نکلتا..

اس لمحے تک میں اپنے آپ میں تنہا ہوتا اگر ملاقات بھی ہوتی تو کسی جانور یا پرندے

سے ہوتی اور اب انسان سامنے سے آنے لگتے.. کچھ اور سیر کرنے والے.. اُن میں سے کچھ دوست خصلت کے اور کچھ بیزار طبیعت کے..

بیشتر سیر کرنے والوں کے ہمراہ اُن کے.. یعنی انسان کے.. بہترین دوست تھے.. کتّے تھے... اور میں امریکی اخلاقیات سے اتنا تو آگاہ ہو چکا تھا کہ ان کے مالک کو فراموش کر کے براہِ راست کتّوں کو ''مارننگ'' یا ''ہے'' کہتا.. اور یوں اُن کے مالک میرے اخلاق کے گرویدہ ہو جاتے.. میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ کسی نے مجھے خبردار کیا تھا کہ اگر آپ کسی کتّے کو ذرا گھور کر بھی دیکھیں تو کتا ناراض ہو نہ ہو اُس کا مالک آپ پر ہتک کتا کا مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں کچھ زیادہ ہی احتیاط پسند ہو گیا.. کتا آ رہا ہوتا اور ظاہر ہے وہ اکیلا تو نہیں اپنے مالک یا مالکن کے ساتھ آ رہا ہوتا تو میں دور سے ہی ''ہاؤ آر یو ڈوئنگ دِس مارننگ'' کہہ کر سلام دعا میں پہل کر لیتا.. تا کہ اُسے شکایت کا موقع ہی نہ ملے..

میں ایک حتمی نتیجے پر پہنچا ہوں اور یونہی نہیں پہنچا ایک عمیق مشاہدے کے بعد پہنچا ہوں کہ... یہاں انسان کتّوں کو سیر نہیں کرواتے بلکہ کتّے انسانوں کو سیر کروانے کے لیے نکلتے ہیں.. وہ یعنی کتّے جدھر جی چاہے چل نکلتے ہیں اور انسان ایک بے دام غلام سر جھکائے اُس کے پیچھے پیچھے.. اگر کتّا یہ محسوس کرتا ہے کہ انسان ذرا سست ہو رہا ہے تو وہ یکدم کسی کتیا کو دیکھ کر بے دھڑک اُس کا پیچھا کرتا ہے اور اُس کے ساتھ دوڑ لگانے لگتا ہے.. پھر یہ فیصلہ کتّے کا ہے کہ اُس نے گھر واپس کب جانا ہے.. کہ انسان اب تھک چکا ہوگا اسے آرام کی ضرورت ہے اب کل صبح پھر اسے سیر کروائیں گے..

ویسے میں نے دنیا کے کسی اور ملک میں نہ تو اتنے کتّے دیکھے ہیں اور نہ اتنے موٹے..

نیویارک کے کچھ علاقوں میں تو لوگ اپنے تن بدن کا ذرا خیال رکھتے ہیں لیکن جونہی آپ وہاں سے باہر آتے ہیں تو موٹے لوگوں کی دنیا شروع ہو جاتی ہے.. آرلینڈو کے میدانی علاقے میں بھی آپ کو چھوٹے موٹے پہاڑ نظر آئیں گے جو حرکت میں ہوتے ہیں.. موٹاپا امریکہ کی ایک شناخت ہے کہ امریکی ہمہ وقت کچھ نہ کچھ چرتے رہتے ہیں' کھاتے رہتے ہیں۔ آئرلینڈ یا جرمنی میں جو موٹے ہوتے ہیں وہ بے تحاشا بیئر اُنڈیلنے کے نتیجے میں ہوتے ہیں جب کہ امریکی تلے ہوئے مرغ' فرنچ فرائز اور پنیر کے برگر ہڑپ کرنے کی وجہ سے پھیل جاتے ہیں.. ان ہردد

موٹوں میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ بیئر نوش کرنے والے خواتین و حضرات موٹے ہو کر نہایت خوشگوار خصلت کے بات بات پر قہقہے بلند کرنے والے ہو جاتے ہیں جب کہ صرف تلی ہوئی خوراک کی بے بہا زیادتی کے باعث پھیلنے والے نہایت بیزار اور بدتمیز ہو جاتے ہیں.. اور اس کے باوجود میرا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ امریکی موٹے اپنے روزمرہ کے کاموں میں نہایت متحرک اور فعال رہتے ہیں.. موٹاپا اُن کی کارکردگی پر اثر نہیں کرتا..

کچھ دیر بعد شاہراہ پر ٹریفک کی آمدورفت شروع ہو جاتی..

دھوپ ظاہر ہو کر منظر کو عیاں کرنے لگتی..

تب میں واپسی کا سفر اختیار کرتا.. جہاں سے شاہراہ آرلینڈو کے ڈاؤن ٹاؤن کی جانب مڑ جاتی وہاں سے پلٹ آتا..

واپسی پر مجھے سکولوں کے بچے ملتے.. کچھ پیدل.. کچھ سائیکلوں پر سوار لیکن ہیلمٹیں پہنے ہوئے اور چند ایک سکیٹنگ کرتے ہوئے..

میں سامنے سے آنے والی کاروں پر نگاہ رکھتا کہ پورے آٹھ بجے اُن میں سے ایک نیلے رنگ کی ٹیوٹا کیمری نے نمودار ہونا تھا اور ڈرائیور کی نشست پر دفتر جانے والے بلال نے ہونا تھا.. وہ مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلاتا اور مسکراتا ہوا چلا جاتا..

گھر نزدیک ہونے لگتا.. یہاں بائیں جانب میں نے ایک بار گھاس پر اچھل کود کرتے دو سیاہ خرگوش دیکھے تھے.. میں کچھ دیر اپنے آپ کو ساکت رکھے اُن کی حرکتوں سے لطف اندوز ہوتا رہا اور پھر وہ ہراساں ہو کر جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئے.. آئندہ دنوں میں اُس مقام پر پہنچ کر میں اُنہیں پھر سے دیکھنے کی تمنا کرتا پر وہ دوبارہ نظر نہ آئے..

دھوپ پھیل چکی ہوتی جب میں عینی کے لِونگ روم کی دیوار کھڑکی دھکیل کر گھر کے اندر قدم رکھتا پر اس سے پیشتر برآمدے میں جوگر اُتار رکھتا کہ اُن کے تلے گھاس کے تنکے سمٹ کر چلے آئے تھے جو قالین کو گھاس بھرا کر سکتے تھے..

گھر کے اندر داخل ہو کر.. بدن کی تھکاوٹ کے لطف میں.. پسینے کی نمی میں آسودہ..

میں سب سے پہلے فریج کا دروازہ کھولتا اور اُس میں سے اپنے پسندیدہ ترین مشروب یعنی چکودرے کے جوس کا کارٹن برآمد کرتا.. کم از کم دو بڑے گلاس اس کی نیم کڑواہٹ کے حلق سے

اُتارتا اور ایسے تر و تازہ ہو جاتا جیسے ایک ٹہنی پر جھولتا پکھیرو جو رات کی اوس کی نمی اپنے پروں پر محسوس کر کے تر و تازہ اور شادمان ہو جاتا ہے..

ازاں بعد میں ''حمام'' کرتا..

مجھے قطعی طور پر علم نہ تھا کہ یہ حمام کیا ہوتا ہے.. میں صرف گوالمنڈی چوک کے قریب ملاّں نائی کے ''گرم حمام'' سے واقف تھا جہاں چار فٹ ضرب چار فٹ کے تین ڈربے سے تھے.. تاریک اتنے تھے کہ اُن میں داخل ہو کر آپ کو اپنی بینائی زائل ہونے کا احساس ہوتا تھا.. یعنی اگر آپ داخل ہو کر اُس کے کائی زدہ اور پھسلویں فرش پر قدم رکھتے ہوئے پھسل نہیں جاتے قائم رہ جاتے تھے.. پھر آپ دوہائی دیتے تھے اور ملاّں نائی باہر سے کوئی لیور دبا کر گرم پانی کو ریلیز کر دیتا تھا.. اوپر شاید چھت میں یا سیلن زدہ دیوار میں کوئی نل ہوتا ہو گا جس میں سے اُبلتا ہوا پانی ایک آبشار کی صورت گرنے لگتا تھا.. پہلے تو آپ اپنے آپ کو پھسلنے سے بچاتے تھے اور اب جان کے مزید لالے پڑ جاتے تھے اور اپنے آپ کو اس بھاپ خارج کرتے بدن کو جھلساتے پانی سے بچانے کی تگ و دو میں مشغول ہو جاتے تھے.. کچھ دیر بعد آپ کو جھلسنے کی عادت ہو جاتی تھی اور پھر کیا ہی ایک انبساط بھری کیفیت بدن کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھی..

تو میرا تجربہ صرف اسی ملاّں کے گرم حمام کا تھا..

سچی بات ہے کہ اس کے بعد کی حیات میں اگرچہ ایران کے قصبے طیب آباد کے ایک شاہی حمام میں بھی حمام کیا.. ٹرکش باتھ میں سے بھی ہو گزرے اور ناروے میں سونا باتھ کے گرم اور پھر یکدم سرد غسل سے بھی دوچار ہوئے پر جو مزا چھجو کے چبارے وہ نہ بلخ نہ بخارے.. ملاّں نائی کا گرم حمام ان سب سے زیادہ کیف آور ہوا کرتا تھا..

ہاں تو میں بھول چکا تھا کہ یہ ''حمام'' کیا ہوتا ہے..

ایک روز میں نے آرلینڈو سے مانٹریال میں مقیم میمونہ کے بارلیش اور بھک چکے جینئس بھائی احمد شفاعت کو فون کیا اور جب اُدھر سے جواب نہ آیا تو اپنا پیغام ریکارڈ کروا دیا.. کچھ دیر بعد شفاعت کا فون آ گیا اور اُس نے کہا ''بہت معذرت کہ میں آپ کا فون اٹینڈ نہیں کر سکا.. دراصل اُس وقت میں حمام کر رہا تھا..''

''جی..'' میں ذرا پریشان ہو گیا کہ وہ پتہ نہیں کیا کر رہا تھا..

''میں.. باتھ رُوم میں تھا..حمام کر رہا تھا۔''

موصوف چونکہ حساب کے ایک پروفیسر ہونے کے علاوہ مذہب کے ایک محقق ہیں اور عربی زبان پر عربوں سے زیادہ عبور ہے اس لیے بھی کہ اُن کی اہلیہ مراکشی ہیں تو وہ ہماری آپ کی طرح باتھ روم جاتے ہیں تو وہ نہیں کرتے جو ہم معمولی لوگ کرتے ہیں بلکہ ''حمام'' کرتے ہیں..

چنانچہ ازاں بعد میں یہی ''حمام'' کرتا..شیو کرتا' شاور کرتا اور کپڑے بدل کر جب نیچے جانے کے لیے سیڑھیوں پر قدم رکھتا تو نیچے وہ منتظر ہوتا..''بیلے بیلے'' کرتا اوپر دیکھ رہا ہوتا کہ نانا کب نیچے آئے گا اور جب نانا نیچے آتا تو وہ فوراً اپنی ماں کی گودی میں براجمان ہو کر متجسس اور شرمندہ آنکھوں سے مجھے تکنے لگتا..

ناشتے کے بعد میں دن کا پہلا سگریٹ پینے کے لیے باہر برآمدے میں جا بیٹھتا کہ ناشتہ کرتے ہوئے سب سے زیادہ لطف اس بات کا آتا ہے کہ اس کے بعد آپ دن کا پہلا سگریٹ پئیں گے اور اُس کے بعد جو کچھ ہونا ہے بیکار ہونا ہے..

یہ برآمدہ..گویا گالف کورس پر کھلنے والی ایک آنکھ تھی..

اور میں اس آنکھ میں بیٹھتا تھا تو کیا کیا دیکھتا تھا..

یہ صرف ایک سویر کی سرگذشت نہیں تین ہفتوں میں جتنی سویریں آئیں اُن میں اس آنکھ نے جو کچھ دیکھا اُس کی تصویریں ہیں..

ایک سویر ایسی آئی جب میں نے چار سیاہ رنگ کی..جیٹ بلیک کونجوں کو اس برآمدے میں بیٹھے ہوئے اُڑان میں دیکھا..وہ نیچی اُڑان میں تھیں اور نہایت آہستگی سے جیسے چینی پتنگیں ہوں ہوا کے شانوں پر ڈولتی تھیں..وہ ذرا اور نیچی ہوئیں تو اُن کے پس منظر میں گھنا نیم تاریک جنگل آ گیا تو وہ اُس میں گھُل کر روپوش ہو گئیں..دکھائی نہ دیں..کچھ دیر بعد وہ اُس پس منظر میں سے اُبھریں تو یکدم ظاہر ہو گئیں..دکھائی دینے لگیں..

پھر ایک اور سویر تھی..

گولف کورس کی ڈھلوانوں میں پانچ لامبی گردنیں حرکت کرتی دکھائی دے رہی تھیں..

صرف لامبی گردنیں..اُن کے دھڑ سبزے میں روپوش تھے اور صرف وہ لامبی گردنیں اور اُن کے اوپر چونچوں والے متجسس سر دکھائی دے رہے تھے..بھلا یہ کیا پرندہ ہو سکتا ہے جس کی صرف گردن

ہو اس لیے یہ خیال تھا کہ اُس کا دھڑ بھی ہو گا..اور پھر گھاس کے سمندر میں سے وہ گردنیں اُبھریں اور اُن کے سفید دھڑ اور لم ڈھینگ ٹانگیں نظر آنے لگیں..وہ پانچ نہایت پُروقار چٹّے سفید بگلے تھے جو گولف کورس کی ہریاول میں ٹھونگیں مار رہے تھے..

یہ بہت سی سویروں کی منتخب اور متحرک تصویریں ہیں جو میں آپ کے لیے حرفوں میں ساکت کر رہا ہوں..اگر ان حرفوں میں کچھ سکت ہوئی تو ان کے سکوت میں سے بہت سے پرندے پَر کھول کر حرکت کرنے لگیں گے..

میں نے ایک صبح ناقابل یقین حد تک وسیع چھتنار پروں والا ایک آبی پرندہ دیکھا اور تب دیکھا جب وہ گولف کورس کی ایک جھیل پر اُترنے والا تھا..وہ اتنا بڑا تھا کہ سندباد جہازی کے سمندروں پر اُڑان کرنے والا غیر معمولی جسامت کا کوئی محیرالعقول جادوئی پرندہ دکھائی دیتا تھا..اتنا بڑا کہ اگر سندباد اُس کی ٹانگوں سے چمٹ کر اُس کے ساتھ پرواز کرتا ہوا کسی ایسے جزیرے میں جا اُترے جو ہیروں بھرا ایک جزیرہ ہو تب بھی اُس پرندے کو کچھ خبر نہ ہو..وہ اتنا بڑا ہو..

جس جھیل پر وہ اُترنے والا تھا وہ سویر کی چکا چوند میں یوں آئینہ ہو رہی تھی کہ اُس آئینے میں کنارں پر اُمڈا جنگل شاہ بلوط کے درختوں اور بیلوں سمیت عکس ہو رہا تھا..وہ آبی پرندہ اُس جھیل پر اُترا نہیں بلکہ گرنے لگا..ایک سفید کٹی پتنگ کی مانند جو زمین پر گرنے سے پیشتر پھڑ پھڑاتی نہیں بلکہ ایک تیر کی طرح گرنے لگتی ہے ایسے وہ پرندہ اُس آئینے پر گر رہا تھا جس میں آس پاس کے جنگل ایک تصویر ہو رہا تھا..

اگرچہ ایک پرندہ کہیں بھی اُترنے سے پیشتر اپنے پَر پھڑ پھڑا کر اپنے آپ کو قائم کرتا ہوا اُترتا ہے..جب کہ وہ پرندہ گرنے لگا..

شاید اس لیے کہ جونہی وہ نیچے آ کر جھیل کی سطح کی قربت میں ہوا تو اُسے پانی نظر نہ آئے ایک جنگل دکھائی دیا اور وہ ششدر رہ گیا ہے کہ میں نے اپنے تئیں ایک جھیل پر اُترنے والا تھا تو یہ شاہ بلوط کے درخت کہاں سے آ گئے..میں ان پر کیسے اُتر سکتا ہوں کہ میں آبی پرندہ ہوں تو آب پر اُتروں گا..وہ اتنا حیرت زدہ ہوا کہ پھڑ پھڑانا بھول گیا اور ایک بے جان پوٹلی کے مانند جھیل پر گر گیا اور جیسے ہی وہ گرا اُس کے پہلے لمس سے شاہ بلوط کے درخت چیڑ' گنجے سرو' چینی ایلم' کنیری پام' سرخ سیڈار اور مکنولیا کے شجر جو جھیل میں عکس ہو رہے تھے وہ سب اُس کے پروں کے چھو

جانے سے ریزہ ریزہ ہوکر بکھرتے گئے لہروں میں بدل کر جھیل کی سطح پر ہلکورے لینے لگے..

جونہی وہ آبی پرندہ اس صدمے سے سنبھلا ذرا ہوش میں آیا تو اُس نے اپنے حصّے کی وہ مچھلی جو اُس نے آسمان پر اُڑتے ہوئے جھیل کے پانیوں میں دیکھ لی تھی.. وہ مچھلی شکار کی پھڑ پھڑاتا ہوا بلند ہوا اور پرواز کر گیا..

جنگل کے سارے درخت پھر سے پانیوں پر لوٹ آئے اور تصویر ہو گئے..

گولف کورس کی اس پگڈنڈی پر میرے سوا بھی سیر کرنے والے بہت تھے..صرف یہ کہ وہ بہت بعد میں دن چڑھے نمودار ہوتے تھے اور میں اس دوران ناشتے سے فارغ ہو کر برآمدے میں براجمان ہو چکا ہوتا تھا..

ان میں سے ایک نیویارک میں ہمہ وقت نظر آنے والی' دوڑنے والی پونی ٹیل لڑکی کی ہمشیرہ تھی اور ایک اصیل گھوڑی کی مانند نپے تلے قدم دھرتی میرے سامنے سے گزر جاتی اور ہمیشہ مجھے ''ہے'' کہہ کر گزرتی..

اگر تو عینی آس پاس ہوتی تو میں جواب میں نہایت بزرگانہ شفقت سے اُسے ''ہیلو'' کہہ کر نظریں جھکا لیتا اور اگر وہ گھر کے کام کاج میں مگن ہوتی تو میں ایک حریص مسکراہٹ کے ساتھ اُسے دوبار ''ہیلو ہیلو'' کہتا اور نظروں سے اُس کے متناسب بدن کا پیچھا کرتا رہتا..اور ہیلو کو بھی خاصا لٹکا کر کہتا..

اور ایک روز میں نے کیا ہی اپنے آپ کو خوش بخت جانا جب وہ لڑکی مجھے ''ہے'' کہہ کر عین میرے سامنے رُک گئی اور جھک کر جاگرز کے تسمے کسنے لگی..اور میں نے فوراً اپنی بیتاب نظریں اُس پر فوکس کر دیں..اب جو میں نے غور کیا ہے نظروں میں جو چہرہ فوکس میں آیا ہے تو اُسے دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دوں..آج تک جو دکھائی دیتا رہا تھا وہ محض سراب تھا' وہ کچھ زیادہ لڑکی نہ تھی صرف اُس کے بدن کے تناسب اور پونی ٹیل نے مجھے دھوکا دیا تھا ورنہ وہ بھی کوئی نانی جان وغیرہ تھیں اور میرے ''ہان'' کی یعنی ہم عمر تھیں..سارا دن موڈ آف رہا..

کچھ دیر بعد اس سولہ سوراخوں والے گولف کورس میں کھیلنے والے شائقین اپنی گولف کارٹس پر سوار نمودار ہونے لگتے..

یہ گولف کارٹس مجھے چاند کی سطح پر حرکت کرنے والی گاڑیاں لگتیں جو ہولے ہولے منظر میں اُبھرتیں..

برآمدے کے عین سامنے تین چار پام کے درختوں کی قربت میں کوئی ''ہول'' یعنی سوراخ تھا جو جانے چھٹا یا ساتواں تھا اور گیند پر صرف ایک ضرب لگا کر اُسے سوراخ میں ڈال دینے کی تمنا کرنے والے یہ کھلاڑی اپنی کارٹس روکتے..مناسب سٹِکس کا چناؤ کرتے اور اُنہیں تھام کر پہلے تو اس گیند کی تلاش میں سرگرداں رہتے جسے اُنہوں نے پتہ نہیں کہاں ہٹ کیا تھا اور وہ اُڑتا ہوا آ کر یہیں کہیں آرام کرتا تھا..یہ گیند مل جاتا تو وہ نہایت غور و خوض سے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سٹک کا سہارا لیے ہوئے اُسے بغور دیکھتے اور پھر کھڑے ہو کر ایک ضرب رسید کرتے اتنی احتیاط اور منصوبہ بندی کے تحت کہ وہ سیدھا سوراخ میں جا گرے..اور جب وہ نہ گرتا سوراخ سے ذرا اِدھر رہ جاتا تو وہ زیرِ لب ''شِٹ'' وغیرہ کہتے اُسے ہلکا سا دھکیل کر سوراخ میں ڈالتے اور پھر جھک کر گیند نکالتے اور اُسے جیب میں رکھ کر اگلے سوراخ کی جانب سفر کرنے لگتے..

عینی کے برآمدے کے سامنے رُکنے والے کھلاڑیوں میں سے کچھ تو مجھ پر نظر کرتے اور پھر نظر انداز کر دیتے..

اور کچھ ذرا حیرت میں آ جاتے کہ اتنے پوش علاقے میں یہ کون شخص ہے جو الہ دین کے چالیس چوروں والا لباس پہنے برآمدے میں بیٹھا ہے..اس لیے کہ میں ہمیشہ شلوار قمیض میں ملبوس ہوتا..اور چند ایک مجھ سے ہم کلام ہو جاتے..

''ہے..آج موسم کتنا زبردست ہے..''

''ہاں..کیا یہ پیارا نہیں ہے..'' میں جواب میں اپنے انگلستان کے زمانوں کا اظہار کرتا یعنی اِز نٹ اِٹ لَولی..

''یہ پیارا ہے تو پھر تم گولف کیوں نہیں کھیلتے..سگریٹ کیوں پی رہے ہو؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ آرام سے بیٹھ کر سگریٹ پینا بھاگ دوڑ کر کے گولف کھیلنے سے کہیں کم مضرِ صحت ہے..میں اپنے آپ کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا..''

''یہ ایک بہانہ ہے..''

''نہیں میری عمر اتنی زیادہ ہے کہ میں گولف کھیلنے کے قابل نہیں ہوں..''

وہ میرے اس اقرار پر بے حد مسرور ہوتے اور کہتے ''کم آن ہم تم سے زیادہ عمر کے ہیں اور گولف کھیل رہے ہیں..''

''تو میں بھی جب بیس تیس برس آپ کی عمر تک پہنچوں گا تو گولف شروع کردوں گا..''

''فنّی مین..'' وہ مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر چلے جاتے..

اس دوران نوفل جواب میرے ساتھ کچھ فرینک ہو چکا تھا لونگ روم کی کھڑکی کے شیشے پر ہاتھ مار کر مجھے متوجہ کرتا کہ تم کیسے نانا ہو کہ باہر بیٹھے ہوئے ہو.. اندر آکر مجھ سے کھیلتے کیوں نہیں.. مجھے کندھوں پر بٹھاؤ.. اپنی ڈیوٹی سرانجام دو.. یوں بیکار نہ بیٹھے رہو..

میں اندر جا کر اُسے کندھوں پر بٹھا لیتا تو وہ چین سے نہ بیٹھتا بلکہ مجھے ہچکولے دینے لگتا کہ چلو چلو مجھے آئینے کے سامنے لے چلو اور میں لے چلتا.. وہ قدآدم آئینے میں کبھی مجھے دیکھتا اور کبھی مسکراتا ہوا اپنے آپ کو ملاحظہ کرتا اور پھر یکدم وحشی ہو جاتا اور ''بیلے بیلے'' کرتا میرے کندھوں پر کودنے لگتا اور وہ مجھ سے سنبھالا نہ جاتا.. یہاں تک کہ اُس کی اچھل کود کو میں سہار نہ سکتا اور اُسے کندھوں سے اُتار کر.. اپنے سامنے کھڑا کر کے.. پہلے یہ اطمینان کر کے کہ بلال دفتر چلا گیا ہے اُسے ڈانٹتا ''اوئے بندے کے پُتّر بنو..'' اور وہ مجھ سے خفا ہو کر ''بیلے بیلے'' کرتا فوراً اپنی ماں کی گود میں جا بیٹھتا اور مجھے شکایت بھری نظروں سے تکنے لگتا کہ یہ کیسا نانا ہے..

یہ آرلینڈو کی سویریں ہوا کرتی تھیں..

اگر سویریں تھیں تو اُن کے بعد شامیں بھی تھیں..

اور اُن شاموں میں.. گولف کورس کی جھیلوں اور ملحقہ گھنے جنگل پر اُترتی شاموں میں شور بہت ہوتا تھا.. غُل بے پناہ ہوتا تھا.. اتنے پرندے اور سب کے سب نظروں سے اوجھل.. روپوش خوب شور مچاتے تھے.. اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ نہیں جاتے تھے مسلسل بولتے رہتے تھے.. ان شاموں میں کوئی شام تھی جب برآمدے میں بیٹھے ہوئے.. یونہی بے دھیانی میں منظر پر نظر کرتے میں نے جنگل میں سے جھجکتے ہوئے نکلتے، ٹھٹکتے ہوئے چار سوہنے بدن والے ہرن دیکھے..

وہ جنگل سے باہر آئے.. انہوں نے مجھے تو نہیں البتہ میں نے اُنہیں دیکھا اور وہ کیسے بھورے رنگ کے خوش نما اور بے چارے سے معصوم جانور تھے.. اور جتنی دیر میں میں نے بلال کو آواز دی کہ ''بلال ہرن'' تو اتنی دیر میں وہ ہرن ہو چکے تھے یعنی جنگل میں روپوش ہو چکے تھے. لیکن ابھی شام ہونے میں پورا دن ہے.. ابھی میں سیر کرنے کے بعد ناشتے سے فارغ ہو کر اپنا پہلا

سگریٹ پی کر گولف کورس پر نمودار ہونے والی کارٹس میں سوار کھلاڑیوں سے گپ شپ کر کے گھر کے اندر آیا ہوں.. اور اندر آتے ہی میں نوفل کا نوکر ہو جاتا ہوں.. میں نے اُسے باتوں میں لگانا ہے... بہلانا ہے.. پُھسلانا ہے. کبھی پیار کرنا ہے اور کبھی گھورنا ہے اُسے قابو میں رکھنا ہے تا کہ اس دوران اُس کی اماں عینی اپنی ستواں ناک پر عینک بیلنس کیے اطمینان سے بجلی، پانی اور مکان کی قسطوں کا حساب کرے.. شاپنگ لسٹ تیار کرے.. اپنی کونسی سہیلیوں کو آج فون کرنا ہے اُن کے نمبر نوٹ کرے اور بلال کے لیے کونسے رنگوں کی جرابیں خرید کرنی ہیں وہ لکھ لے.. اور اس دوران میری نوکری یہ تھی کہ میں نوفل کو باتوں میں لگائے رکھوں..

اور اگر نوفل ابھی ایک برس کا بھی نہ تھا، باتیں نہیں کر سکتا تھا تو میں اُس سے کیسے باتیں کرتا تھا.. وہ ایسے کہ نوفل چلتے پھرتے پاٹی کرتے ہمہ وقت خود کلامی کرتا رہتا تھا.. اگرچہ یہ کلام صرف اُس کی ماں ہی سمجھ سکتی تھی جیسے گونگے کی ماں سمجھتی ہے.. اور اس مسلسل خود کلامی میں وہ ''بیلے بیلے'' اور ''باؤ.. آں آں'' اور ''تت تت'' ایسے بامعنی فلسفیانہ افکار بکھیرتا چلا جاتا..

''نوفل.. آپ نوفل ہو؟''

''بیلے بیلے..''

''آپ نانا سے پیار کرتے ہو.. تم جانتے ہو کہ نانا تمہیں ملنے کی خاطر کتنی دور سے آئے ہیں..''

''باؤ.. آں آں..''

''نوفل... بندے کے پتّر بنو.. فریج کا دروازہ کھول کر اُس میں جمع شدہ خوراک کے ڈبّے.. کارٹن اور بوتلیں وغیرہ اُٹھا اُٹھا کر قالین پر مت پھینکو پلیز..''

''تت تت..''

''نہیں باز آؤ گے تو میں ایک جھانپڑ رسید کروں گا'' میں تنگ آ کر اُسے دھمکاتا..

''باآں.. باؤں..'' وہ فریاد کرتا پھر اپنی ماں کی آغوش میں جا بیٹھتا کہ مجھے اس کٹھور دل نانا سے بچالو..

اس کے بعد ہم باپ اور بیٹی سیر کے لیے نکل جاتے.. نوفل کو پچھلی نشست میں بندھی بچہ کرسی میں باندھ دیا جاتا اور ہم ایک بامقصد آوارہ گردی کے لیے نکل جاتے..

بلال نے عینی کی سہولت اور آمد و رفت کی خاطر اُسے ایک نہایت ڈینڈی قسم کی جیپ نما شے خرید دی تھی جسے مُونا ہمیشہ امریکی رکشا کہتی تھی کہ وہ صرف دو دروازوں والی تھی.. عینی بہت بے دھڑک اور تیز رفتار ڈرائیور تھی..

اور اگر اس دوران کچھ بھی دھڑک تھا تو وہ میرا دل تھا جو اس تیز رفتاری سے دھڑک دھڑک گلے میں آ ٹھہرتا.. میں اُس خوفزدہ کیفیت میں بمشکل ایک ''آہم'' کر کے اُس دل کو اُس کی آماجگاہ تک پہنچاتا پر سکھ کا ایک سانس بھی نصیب میں نہ ہوتا کہ اُس سے اگلے لمحے کوئی موڑ کاٹتے ہوئے وہ اتنی بے دردی سے بریکیں لگاتی کہ میرے دل کو بھی بریکیں لگ جاتیں اور وہ پھر سے دھڑک دھڑک گلے میں آ قیام کرتا.. اور وہ ڈرائیونگ کے دوران مسلسل باتیں کرتی چلی جاتی.. بلال کے بارے میں.. سکول کی دوستوں کے بارے میں.. کنیئرڈ کالج کی اور کنگ ایڈورڈز میڈیکل کالج کی فرینڈز کے بارے میں.. اپنے بھائیوں اور ماں کے بارے میں اور وہ نہیں جانتی تھی کہ میں قطعی طور پر کچھ بھی سننے کے لائق نہیں رہا اور صرف ایک ''آہم'' کر کے گلے میں اٹکے دل کو نگل کر واپس لے جانے کی سعی میں مشغول ہوں.. نوفل کبھی تو پچھلی نشست پر سر ڈھلکا کر نیند میں چلا جاتا.. کبھی اُسی فلسفیانہ خود کلامی میں مصروف ہو جاتا اور کبھی بھوں بھوں کرتے رونے لگتا اور عینی اُسے پچکارنے لگتی..

ہم سٹی سنٹر پہنچ جاتے.. ایک بہت وسیع.. پرفضا.. پام کے درختوں کی قطاروں سے آراستہ ایک شاپنگ ایریا جہاں درجنوں معروف سٹور' شاپنگ مال' ریستوران اور پلے گراؤنڈ بکھرے ہوئے تھے..

عینی کسی بھی شاپنگ مال میں داخل ہو کر عینک لگا کر شاپنگ لسٹ کا مطالعہ کرتی ہوئی گھریلو استعمال کی اشیاء اور خوراک تلاش کرنے لگتی اور اس دوران مجھے نوفل صاحب کو سنبھالنا ہوتا تھا.. بلکہ اُس کی منت کرنا ہوتا تھا.. بلکہ ہاتھ جوڑنا ہوتا تھا کہ بیٹے پلیز ان ڈبوں کو شیلف سے اُتار کر نہ پھینکو.. اور وہ پھینکتا چلا جاتا.. اور نوفل ان چینی کے برتنوں کو ہاتھ نہیں لگانا اور وہ ضرور نہ صرف ہاتھ لگاتا بلکہ ایک آدھ پلیٹ کو فرش پر پھینک کر یہ ثابت کرتا کہ یہ تو ٹوٹ بھی سکتی ہے.. میں اُس کے پیچھے پیچھے بھاگتا پھرتا.. کم از کم ایک بار اُس نے سوٹ کیسوں کے ایک انبار کو دھکیل کر انہیں منہدم کر دیا اور اُن کے نیچے آتا آتا بچا.. پاکستان ہوتا تو میں اُسے ایک عدد تھپڑ رسید کر کے پُرامن کر سکتا

تھا لیکن یہاں امریکہ میں نہ تو میں اُسے ڈانٹ سکتا تھا اور نہ ہی کھلے عام اُسے کوئی دھمکی دے سکتا تھا..

اور وہ بدتمیز بچہ جب کبھی کسی شاپنگ مال یا سٹور میں داخل ہوتا تو وہاں ادھم مچانا اور شیلفوں پر سجی اشیاء کو اُٹھا کر فرش پر پٹخ دینا اپنا فرض منصبی سمجھتا..

آئرلینڈ کے قیام کے دوران اکثر مجھے شبہ ہوا کہ عینی نے مجھے یہاں اس لیے نہیں بلایا کہ وہ مجھ سے از حد محبت کرتی ہے اور میرے فراق میں نڈھال ہوئی جاتی ہے بلکہ محض ایک آیا کے طور پر امپورٹ کیا ہے جو اُس کے بیٹے کی نگہداشت کرے..

بیٹیاں بھی کیسی کمال کی بلیک میلر ہوتی ہیں.

اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ عینی مجھے نوفل کی نگرانی کے لیے جیپ میں چھوڑ کر خود کسی سٹور میں چلی جاتی کہ ابّو میں ابھی آئی..

ایک روز میں نے ایک ایسی ہی نگرانی کے دوران جب کہ نوفل اپنی نشست میں بندھا احتجاج کر رہا تھا کہ مجھے آزاد کر دو.. مجھے کھلا چھوڑ دو.. میں نے وقت گزاری کے لیے ایک سگریٹ سلگا لیا.. اس دوران پارکنگ لاٹ میں ایک بوسیدہ شورلیٹ داخل ہوئی اور اٹکتی ہچکچاتی داخل ہوئی.. میں نے نوٹ کیا کہ اُس کے ٹائر پچکے ہوئے پنکچر ہونے کو لگتے تھے.. یہ شورلیٹ عینی کی جیپ کے برابر میں آ رُکی اور اُس میں سے ایک سیاہ فام ایسی وزن دار خاتون برآمد ہوئی کہ ٹائروں کے پچک جانے کا معاملہ سمجھ میں آ گیا.. اور وہ یونہی دروازہ کھول کر برآمد نہ ہو گئی بلکہ ایک نہایت پیچیدہ عمل کے بعد برآمد ہوئی. پہلے تو اُس نے گرز نما ٹانگ دھم سے باہر رکھی' پھر اپنی گراں مایہ اور پر وسعت پشت کو ذرا سا دھکا دیا اور دوسری ٹانگ باہر رکھ دی.. خاصے تردّد کے بعد وہ پوری کی پوری بالآخر نمودار ہو گئی اور پارکنگ لاٹ بھری سی گئی.. اور مجھے وہ چھوٹی سی بات یاد آ گئی کہ اگر آپ ایک ہاتھی کو اپنی کار میں لفٹ دینا چاہتے ہیں تو آپ کے پاس چار سپیئر ٹائر ہونے چاہئیں..

یہ خاتون غیر متوقع طور پر ایک روڈ رولر کی مانند رول کرتی میرے پاس آ گئی اور میں نے خوفزدہ ہو کر اُسے ایک خوش آمدیدی بلکہ خوشامدی ''ہے'' کہہ دیا..

''یو آر اے ہوربیل مین'' وہ مجھ پر برس پڑی ''تمہیں شرم نہیں آتی..''

''جی.. میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کچھ زیادہ خوفناک نہیں ہوں لیڈی..''

''تم..سگریٹ پی رہے ہوناں؟''

''ہاں..''

''اور تمہارے برابر میں.. جیپ کی پچھلی نشست پر ایک بے چارہ بے بی ہے..اور تم اُس کے قریب سگریٹ پی رہے ہو..کیا تم ایک خوفناک شخص نہیں ہو' بے بی کی صحت کو خطرے میں ڈال رہے ہو' وہ تو باقاعدہ مجھ پر حملہ آور ہونے کو لگتی تھی..

امریکہ میں اُن دنوں دو چیزیں ایسی تھیں جنہیں دیکھ کر امریکیوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور اُنہیں موت نظر آنے لگتی تھی..ایک سگریٹ اور دوسری اُسامہ کی کوئی تازہ ترین ویڈیو..امریکیوں کو ہمہ وقت کوئی نہ کوئی دشمن درکار ہوتا ہے..اگر کوئی بھی دشمن نہ میسر ہو تو وہ خود اُسے تخلیق کر لیتے ہیں..تو اُن دنوں سگریٹ اور اُسامہ کو انہوں نے اپنا دشمن نمبر ایک قرار دے رکھا تھا..

بے شک افیون' چرس' بھنگ' گانجا یا ہیروئن کے دم پہ دم مارو..شراب کے خم کے خم لنڈھاؤ لیکن سگریٹ..نسل انسانی کے لیے اتنا مہلک کہ جس کسی نے بھی ایک سگریٹ سلگا لیا وہ تو بہر طور موت سے ہمکنار ہو گا ہی' اُس کے آس پاس جتنے لوگ ہوں گے جن تک اُس کا دھواں پہنچے گا وہ بھی مکھیوں کی طرح مرنے لگیں گے..اگر سگریٹ نہ ہوتا تو ہر شخص کم از کم ہزار برس جیتا..کینیڈا میں بھی یہی جنون جاری ہے..وہاں ایک تو سگریٹ کو اتنا گراں کر دیا گیا ہے کہ معمولی آمدنی والے لوگ اُسے افورڈ ہی نہیں کر سکتے اور کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اچھے بھلے صاحب ایک شاپنگ مال کے باہر سگریٹ بجھانے کی خاطر جو ایک ریت سے بھرا پیالہ دھرا ہے اُس میں سے ٹوٹے چُن چُن کر اپنی ڈبیا میں جمع کر رہے ہیں بلکہ ایک صاحب شاپنگ مال کے اندر جانے سے پیشتر جب اپنا سگریٹ بجھانے لگتے ہیں تو وہ صاحب منت کر کے اُسے حاصل کرتے ہیں اور کش لگانے لگتے ہیں..اس کے علاوہ سگریٹ کے پیکٹوں پر انتہائی ہولناک تصاویر نمایاں کی گئی ہیں کینسر زدہ بدن..گُھن کھائے ہوئے مسوڑھے اور تھم چکے دل مُردہ جسم دیکھ کر بے حد کراہت ہوتی ہے..اور پُر لطف بات یہ ہے کہ ان تصویروں کی اشاعت سے سگریٹوں کی خریداری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی..اگر آپ کو یہ تصویریں بہت ہی ناگوار گزرتی ہیں تو آپ ایسے کریہہ النظر پیکٹوں میں سے سگریٹ نکال کر اپنے سگریٹ کیس میں رکھ لیتے ہیں یا پھر آپ کو عادت ہو جاتی ہے..مجھے شک ہے کہ یہ آئیڈیا کسی سردار جی کا ہو گا کہ وہ کینیڈا میں بہت ہیں اور تمباکو کو حرام سمجھتے ہیں ورنہ کوئی صحیح الدماغ شخص یہ

آئیڈیا پیش نہیں کر سکتا..میں ذاتی طور پر سگریٹ کو مضر صحت سمجھتا ہوں..بُرا جانتا ہوں..جتنے برس میں نے سگریٹ چھوڑے رکھے وہ ان برسوں سے بہت بہتر تھے جن میں میں پھر سے سگریٹ پی رہا ہوں..نہ کھانسی ہوا کرتی تھی اور نہ سویرے سویرے گلے میں بلغم کے انبار..لیکن اس کے باوجود یورپ اور امریکہ میں جس طور ہر بیماری اور ہر بلا کا ذمہ دار سگریٹ کو ٹھہرا کر اسے پینا تقریباً ایک جرم ہو چکا ہے میں اس رویے کو صرف فاتر العقلی ہی کہوں گا..

چنانچہ یہ سیاہ فام بل ڈوزر خاتون جس طور مجھے مطعون کر رہی تھیں میں اُنہیں دوش نہیں دے سکتا تھا..میں نے اُن کی ڈانٹ ڈپٹ کے جواب میں مسکرا کر کہا ''لیڈی..میں اس بچے کا گرینڈ ڈیڈ ہوں اور دیکھئے کہ وہ جیپ کے اندر ہے اور میں باہر ایک محفوظ فاصلے پر کھڑا سگریٹ پی رہا ہوں..''

''نہیں تم اب بھی بہت نزدیک ہو..تم خوفناک شخص..شرم کرو' اور اس کے ساتھ ہی اُن خاتون نے سرزنش کی خاطر اپنے وزنی ہتھیلی کی پشت سے میرے رخسار پر ایک ہلکی سی چپت رسید کی..

اور میں جو ابھی تک اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس چپت سے ازحد رنجیدہ ہو گیا کہ میری قسمت کیسی ہے کہ امریکہ کے کل قیام کے دوران اگر کسی خاتون نے مجھے چھوا ہے تو وہ ایک سیاہ بل ڈوزر خاتون ہے اور چھوا بھی نہیں چپت رسید کی ہے..

جب تک میں نے اپنے سگریٹ کو پاؤں سے مسل نہ دیا وہ میرے سر پر یوں کھڑی رہیں جیسے ناک آؤٹ ہو چکے سونی لسٹن کے اوپر محمد علی کھڑا تھا..

پارکنگ لاٹ میں جتنی بھی کاریں اور جیپیں پارک کی گئی تھیں اُن میں سے بیشتر کی نمبر پلیٹوں پر مالٹے کی شبیہ بنی ہوئی تھی کہ یہ علاقہ اورنج کاؤنٹی کا تھا..اورنج یا مالٹوں کے باغ تو کب کے نابود ہو چکے اور صرف کاؤنٹی باقی رہ گئی ہے اور اس کے باوجود یہاں کا امتیازی نشان اورنج ہی تھا..

اگر پاکستان میں بھی یہی رواج ہو کہ ہر علاقے کی نمبر پلیٹوں پر وہاں کی معروف پیداوار کے حوالے سے کوئی تصویر بنی ہو تو آپ دور سے آتی کار یا بس وغیرہ کی نمبر پلیٹ دیکھ کر جان سکتے ہیں کہ یہ کہاں سے آ رہی ہے..مثلاً کراچی کی نمبر پلیٹ پر پان کی پیک کیا ہی بہار

دکھائے گی۔ حیدرآباد کی نمبر پلیٹ پر چُوڑیاں بجی ہوں گی.. ملتان کی نمبر پلیٹ کے بارے میں فیصلہ نہ ہو پائے گا کہ اس پر کپاس کا پھول ہو' آم ہو.. کوئی سلونی شکل ہو یا صرف ڈھول ہو.. لاہور کی کار بھی یوں پہچانی جائے گی کہ اُس پر گردے کپورے نقش ہوں یا ایک پیٹو شخص کی تصویر ہو گی.. گوجرانوالہ کی نمبر پلیٹ پر یا تو ایک پہلوان ہوگا اور یا بُھنے ہوئے چڑے.. پشاور کے بارے میں طے ہے کہ نسوار کے علاوہ اور کونسا امتیازی نشان ہو سکتا ہے.. یوں ہر شہر' ہر ضلع کے بارے میں بے شمار ممکنات ہیں لیکن اسلام آباد کی نمبر پلیٹ کے بارے میں متفقہ فیصلہ ہوگا کہ اس پر ایک لوٹے کی تصویر ہو گی..

ہم گھر سے باہر نکلتے تو پھر دیر سے ہی واپس آتے..

اگرچہ میں اس دوران دوپہر کے کھانے کے لیے گھر جانا زیادہ پسند کرتا لیکن عینی پیچھے پڑ جاتی کہ نہیں ابو ہم لنچ کسی ریستوران میں کریں گے.. میں نے آپ کی خاطریں کرنی ہیں اور جب میں کہتا کہ یہ کوئی زبردستی ہے تو وہ کہتی' ہاں ہے.. اگر آپ خاطریں نہیں کرائیں گے تو میں زبردستی کروں گی اور پھر یکدم روہانسی سی ہو جاتی کہ ابّو.. آپ نے کونسا روز روز میرے پاس آنا ہے پلیز مجھے خاطریں کر لینے دیں اور میں ہتھیار ڈال دیتا کیونکہ میں خوب جانتا تھا کہ اگر اب میں نے انکار کر دیا تو بے شک اُس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں لیکن اُن میں سے جو آنسو برسنے لگیں گے وہ اُن سے بھی بڑے ہوں گے..

بے شک وہ اپنے گھر میں خاصی خوش و خرم اور پُرسکون تھی.. سلجوق کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آئی تو چند روز کے بعد نہایت بدتمیزی سے کہنے لگی ابّو سوری مجھے آپ کا گھر کچھ میلا میلا سا لگتا ہے اور مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے.. لیکن اس کے باوجود میں اُس کے امریکہ میں مقیم ہونے سے مفاہمت نہ کر پایا تھا.. پاکستان میں وہ محض ایک تصویر تھی' ٹیلیفون پر ایک آواز تھی' خود نہ تھی.. اور میرے دل میں ٹیس اُٹھتی ہی رہتی تھی کہ وہ وہاں کیوں ہے.. یہاں کیوں نہیں.. اس شہر میں.. اس پاکستان میں کہیں کیوں نہیں ہے کہ جب جی چاہے اُس کی شکل دیکھ لوں.. اور جب ہم دونوں.. میں اور میمونہ بہت ہی اداس ہو جاتے.. ہمارے دل اُس کی جدائی میں بیٹھتے چلے جاتے تو ہم ایک دوسرے کی ڈھارس بندھانے کی خاطر اُس کے خوبصورت گھر.. اُس کی ذاتی جیپ.. اور بلال جیسے اُس کا خیال رکھتا ہے اس کے تذکرے چھیڑ دیتے.. ایک دوسرے کو دھوکے دے کر اداسی

کے عمیق کنوئیں میں سے نکل آنے کی سعی کرتے پر نہ کر سکتے.. اور ہم فون پر.. کمپیوٹر پر بھی ازحد احتیاط کرتے کہ ہماری آوازوں اور شکلوں میں اداسی کا شائبہ نہ ہو جو ہم دونوں کے بدنوں میں سیاہ پرندوں کی مانند گھونسلے بنائے بیٹھی تھی.. کئی بار گہری نیند میں.. کسی خواب کی دُھند میں اُترتے ہوئے اُس کی شکل نظر آنے لگتی اور مجھے واہمہ سا ہوتا کہ میری آنکھوں میں آنسو ہیں.. اور جب بیدار ہوتا تو آنکھیں خشک ہوتیں لیکن یہ سمجھ نہ آتی کہ پھر تکیہ کیوں بھیگا ہوا ہے.. تو میں اُس عینی کو کیسے انکار کر سکتا تھا کہ نہیں بیٹی آپ میری خاطریں نہ کرو..

البتہ یہ جی چاہتا کہ اُسے کہوں کہ خاطریں بے شک کرو لیکن پلیز پیزا نہ کھلانا..

پیزا ایک ایسی خوراک تھی جس سے میں ناک تک عاجز آ چکا تھا.. اگر کوئی بھی شخص مجھے پیشکش کر دیتا تھا کہ آئیے تارڑ صاحب آپ کو پیزا کھلاتے ہیں تو میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ سر آپ مجھے سُولی پر چڑھا دیں' دریائے ہڈسن میں ڈبو دیں لیکن پلیز مجھے پیزا کھانے پر مجبور نہ کریں کہ میں اس واہیات امریکہ کی مرغوب ترین خوراک سے بیزار ہو چکا تھا..

میں نے اپنے ابتدائی پیزے روم' فلارنس اور وینس میں کھائے تھے اور وہ کیسے ذائقے والے تھے' اُن دنوں یہ اطالوی خوراک صرف اطالیہ تک ہی محدود تھی.. اور پھر یہ ایک وبا کی مانند دنیا بھر میں پھیل گئی اور ہر جانب پیزا پیزا ہونے لگی.. اور یہ جو خیر سے پیزا کہلاتا ہے دراصل ہے کیا.. یہ بنیادی طور پر ایک قیمے والا نان ہے جس میں کچھ لیس دار اور الا بلا چیزیں شامل کر کے اُس کا ذائقہ خراب کیا گیا ہے..

جیسے ترقی یافتہ اقوام کی ثقافت چاہے وہ کتنی ہی احمقانہ کیوں نہ ہو.. اور موسیقی چاہے وہ کتنی ہی بے سُری کیوں نہ ہو دنیا بھر میں قبولِ عام کی سند پاتی ہے.. اسی طور ان کی خوراک بے شک وہ ایک سوکھے بن میں ایک روکھا کباب ہو اور برگر کہلاتا ہو ہر خاص و عام کا پسندیدہ ہو جاتا ہے.. یہاں تک کہ ہماری دیسی بیکریوں میں ایک مدت سے بیک کیے جانے والے بیٹھے بَن جن پر چاکلیٹ یا چینی کی تہہ ہوتی تھی وہی امریکہ سے آتے ہیں اور ڈونٹس کہلاتے ہیں اور ہم اُنہیں کافی کی چُسکیوں کے ہمراہ کھاتے ہوئے نہایت معزز محسوس کرتے ہیں.. اور یوں ہماری سینکڑوں خوراکیں لذت کی جنتیں خوراکیں ان برگروں اور پیزوں سے مار کھا گئیں کہ ہم تیسری دنیا کے لوگ تھے اور ہماری خوراکیں بھی تیسرے درجے کی ہو گئیں.. اگر ہم بھی کوئی چھوٹی موٹی

سپر پاور ہوتے تو یورپ اور امریکہ میں ''سموسہ ایکسپریس'' نام کے سلسلے وار ریستوران ہوتے جہاں سموسوں کی سینکڑوں اقسام... قیمے والے' سبزی اور پنیر والے' میٹھے سموسے.. چاکلیٹ سموسے وغیرہ گوروں کو پاگل کر رہی ہوتیں کہ ہائے اتنی ویرائٹی.. علاوہ ازیں ''پراٹھا پارلر'' ''پکوڑا ایکسپریس'' اور ''کڑاہی کیفے'' بھی خوب چلتے..

بہر حال میں پیزے سے بیزار ہو چکا تھا.. خاص طور پر امریکی پیزے سے..

چنانچہ اس بے روح بے جان نان سے اگر پناہ ملتی تو ''بنیرا بریڈ'' میں.. جسے میں ہمیشہ ''بٹیرا بریڈ'' کہتا.. یہاں بریڈ یا روٹی کی ایسی پُر ذائقہ اقسام تازگی اور گرمی کی مہک دیتی تھیں کہ پاکستانی تندور یاد آ جاتے تھے.. کبھی خستہ' کبھی نرم' کبھی بہت گرم.. ادرک کے ذائقے کی فرانسیسی لمبی روٹیاں.. سیاہ جرمن بریڈ اور ان میں طرح طرح کے گوشت' سبزیاں' پنیر اور سلادیں.. ایک تربوز نما بریڈ کو درمیان میں سے تراش کر اُسے ایک پیالہ بنا کر اُس میں آپ کا من پسند گرم گرم سُوپ.. آپ اس سوپ کو سُڑکتے اور اس کے اثر سے نرم ہوتی بریڈ کا بھی مزا لیتے.. سُوپ اختتام کو پہنچتا تو باقی ماندہ بریڈ کے ٹکڑے بھی مزا دے جاتے..

''بنیرا بریڈ'' کی ایک سہولت میں بیان کر چکا ہوں کہ وہاں آپ صرف ایک کافی یا سینڈوچ خرید کر کسی صوفے پر براجمان ہو کر سارا دن کتابیں پڑھ سکتے تھے.. اگر ادیب ہیں تو لکھ سکتے تھے اور اگر کاروباری ہیں تو لیپ ٹیپ کھول کر اپنا کاروبار چلا سکتے تھے اور مجال ہے انتظامیہ کو ذرہ بھر ناگواری محسوس ہو بلکہ اس پر فخر کیا جاتا ہے کہ ہمارے ریستوران میں پڑھنے لکھنے کا ماحول ہے..

اکثر اوقات' ہم دونوں ''بنیرا بریڈ'' میں ہی لنچ کرتے..

اور کبھی ہم لنچ ترک کر کے ''ماربل سلیب'' نامی آئس کریم پالر کے سامنے خاصی دیر تک قطار میں کھڑے رہنے کے بعد کہ وہاں آئس کریم کے عشاق کی قطاریں لگی رہتی تھیں.. تو بہت دیر کے بعد آئس کریم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور یہ ایسی آئس کریم ہوتی کہ اس کے لیے اگر سارا دن ایک قطار میں کھڑا ہونا پڑے تو بھی جائز تھا.. عجیب روحانی لذت والی آئس کریم تھی جسے کھاتے ہوئے میرا سَر لطف میں ہلتا رہتا کہ واہ.. ہل من مزید..

اور کبھی ہم چینی خوراک پیک کروا کے گھر لے جاتے.. یہ بس گزارے لائق ہوتی اس

میں پاکستانی چینی خوراک ایسی لذت ہرگز نہ ہوتی..

عینی مجھے کچھ اطالوی ریستورانوں میں لے گئی جہاں ویٹر سب سے پہلے یہ دریافت کرتا کہ جناب آپ کھانے کے ہمراہ کونسی وائن پئیں گے اور عینی فوراً مجھ سے مشورہ کیے بغیر ویٹر کو تقریباً ڈانٹ دیتی کہ تھینک یو بٹ نو وائن.. جسٹ پلین واٹر پلیز.. حالانکہ مشورہ کر لیتی تو بھی میں نے سادہ پانی ہی منگانا تھا.. اور کیا منگانا تھا.. یا منگانا تھا؟..

پچھلے پہر گھر واپسی ہوتی تو بدن کی کل ہڈیاں سندیسے دیتیں کہ ہماری عمر کا ہی کچھ لحاظ کر دو.. ہمیں کچھ دیر تو آرام دو اور میں اپنے کمرے میں جا کر پنکھا لگا کر سو جاتا.. جی ہاں گھر اگرچہ ایئر کنڈیشنڈ تھا لیکن اس کمرے کی کھڑکی کے شیشے پر دھوپ اتنی پڑتی کہ اندر کا موسم بھی گرم ہو جاتا.. اور وہ صرف پنکھے سے قدرے آسودہ ہوتا..

پانچ بجے کے لگ بھگ بیدار ہوتا.. ایک اور شاور لیتا اور پھر اُسی برآمدے جا ڈیرا جماتا جو گولف کورس پر کھلتا تھا..

دھوپ ڈھل رہی ہوتی جب گولف کارٹس کے رونق شروع ہو جاتی..

کہیں گھاس میں سے بگلوں اور کونجوں کی لامبی گردنیں ظاہر ہوتی دکھائی دیتیں..

سبز رنگت کا ایک ناخن کے سائز کا پیارا سا مینڈک میرے قدموں کے آس پاس کبھی پُھدکتا اور کبھی بالکل ساکت ہو کر مجھے گھورنے لگتا..

ایک روز میں نے نوفل کو اندر سے بلایا اور اُس کی جانب اشارہ کر کے کہا ''مینڈک..'' اُس لمحے وہ ساکت حالت میں تھا.. نوفل اس کے قریب بیٹھ کر اُس کا معائنہ کرنے لگا.. یکدم وہ ذرا سے اُچھلا تو نوفل میاں بھی ساتھ ہی اچھل پڑے اور ایک ''افوہ'' کہہ کر فوراً گھر کے اندر لڑھک گئے.. اندر پہنچ کر شیشے سے ناک لگا کر مجھے اور مینڈک کو دیکھنے لگے... وہ اپنے نانا جان کی مانند خاصے ڈرپوک تھے.. آئندہ دنوں میں میں جب بھی کہتا کہ نوفل مینڈک.. تو وہ اپنی ماں کی گود میں چڑھ کر کہتا ''افوہ..''

ایک بار جب نہ دوپہر تھی اور نہ ہی شام ابھی اُتری تھی.. ان کے درمیان کچھ زمانے تھے جب بہت دور سیاہ بادلوں کی ایک گھناوٹ میں بجلی چمکی.. اور پھر ایک ایسی گہری گونج وہاں سے سفر کرتی مجھ تک چلی آئی جس نے مجھے دہلا دیا.. یہاں تک کہ وہ سبز مینڈک بھی اس زور سے اُچھلا کہ

جب گرا تو اوندھا ہو گیا..

آرلینڈو میں جو بادل گھر گھر آتے ہیں اُن کی خصلت میں خاموشی نہیں ہوتی چمک اور گرج ہوتی ہے اور اُن میں پرورش پانے والی بجلی اُن میں ٹھہرتی نہیں کہیں نہ کہیں گر جاتی ہے.. اور اکثر گرتی رہتی ہے.. یہ ایک معمول ہے.. یہ جو گھٹا ٹوپ بادلوں میں سے ایک سنہری سانپ کی مانند سرسراتی بجلی کی لشک مجھ تک آئی تھی اُس نے گھنے جنگل کو بھی ایک فلیش کی طرح عریاں اور عیاں کر دیا.. اور تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ہی وہاں جنگل پر زوردار پانیوں سے بھری ہوئی بوجھل بارش برسنے لگی ہے. جس کی نمی کو میں یہاں بیٹھا محسوس کر رہا تھا.. اور یہاں گولف کورس اور جھیلوں پر ہلکی دھوپ تھی، کسی ایک بادل کا سایہ بھی نہ تھا.. اور پھر بہت دھیرے دھیرے وہ گھنے سیاہ بادل اور اُن میں سے برسنے والی بارش.. رینگتے ہوئے.. دبے پاؤں چلتے ہوئے گولف کورس اور اس کی جھیلوں اور ہریاول کو ڈھانپنے لگے اور ہر سو تاریکی چھا گئی.. وہ جو پرانا گانا ہے کہ چُپ چُپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے.. پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے تو اُس میں ایک مصرع آتا ہے کہ... ابھی ابھی دن تھا اور ابھی ابھی رات ہے... تو یہ گویا آرلینڈو کے بادلوں اور بارشوں کو ہی مدنظر رکھ کر لکھا گیا تھا.. تاریکی بھی بہت گھنی تھی اور بوچھاڑ برآمدے کے اندر تک مار کرنے لگی اور نہ صرف میرے اُن کاغذوں کو بھگونے لگی جن میں اس قیام کے نوٹس لکھ رہا تھا بلکہ اُس سبز مینڈک کو بھی گیلا کر دیا.. اگرچہ ایک مینڈک ہونے کی حیثیت میں اُسے اس پھوار کو محسوس کر کے شاداماں ہو کر ٹرانا چاہیے تھا پر وہ عجیب بیزار اور فلسفی سا مینڈک تھا کہ بھیگنے پر بیزار ہو گیا.. اور سہم کر ایک کونے میں جا بیٹھا تاکہ بارش سے بچ جائے..

آرلینڈو کے موسموں کے مزاج میں بے وفائی کے سوا اور کچھ نہ تھا.. دھوپ اتنی تیز کہ سرسام ہونے کا خطرہ لاحق ہو جائے.. بدن پسینے سے بھیگنے لگے.. اور اگلے لمحے دل بادل گھنے بادل اُمڈے چلے آ رہے ہیں اور اُن میں بجلی کڑک رہی ہے اور ساتھ میں بارش جو اندھادھند چلی آ رہی ہے.. پوری فضا پر ایک نم آلود دُھند کی چادر تن جاتی ہے..

ایک دوپہر جب یونہی بادل آئے اور میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ بجلی اس شدت سے تڑپ کر گونجی کہ پورا کمرہ لرزنے لگا. تھوڑی دیر بعد ایک اور دھماکا سا ہوا اور میں چوکنا ہو گیا اور جب ایک ایسی بجلی گری جو گویا مجھ پر ہی آ گری ہو تو میں نے ہراساں ہو کر عینی کو پکارا.. وہ میری پکار

پر فوراً پہنچی اور دروازہ کھول کر مسکراتی ہوئی اباجی کی حالت زار پر مسرور ہو کر بولی "ابو یہ آرلینڈو ہے یہاں یہی کچھ ہوتا رہتا ہے.. یہ بجلی کہیں اور گری ہے ہمارے گھر پر نہیں گری. گر گئی تو فکر نہ کریں صرف ایک دھماکا ہو گا اور وہ کنڈکٹر کے راستے زمین میں چلی جائے گی.. یہاں یہی کچھ ہوتا رہتا ہے."

اور واقعی آرلینڈو میں یہی کچھ ہوتا رہتا تھا.. ہری کین.. طوفانی آندھیاں، طوفانِ بادوباراں یا ہوا کے تیز جھکڑ آتے رہتے تھے.. ہم وہاں پاکستان میں بیٹھے پوری پوری رات سی این این پر نظریں جمائے خبریں سنتے رہتے تھے کہ اب یہ طوفان فلاں مقام پر پہنچ گیا ہے اور اب آرلینڈو کے عین اوپر ہے اور آرلینڈو طوفان کی آنکھ میں ہے اور اُدھر عینی اینڈ کمپنی خوراک کا ذخیرہ کر کے سیڑھیوں تلے ایک کمرے میں دُبکی ہوئی ہے اور ہم سے باتیں کر رہی ہے کہ ابو فکر نہ کریں ایسا ہوتا رہتا ہے.. بلکہ نوفل جس شب پیدا ہونے کو تھا تو ہسپتال کے راستے میں ہری کین چارلی کا راج تھا اور ہر شے کو اُڑائے لیے جا رہا تھا.. بارش کے تھپیڑوں سے کاریں اُلٹ رہی تھیں اور جب خدا خدا کر کے عینی ہسپتال پہنچی تو وہاں بھی ویرانی تھی.. بہت کم سٹاف وہاں پہنچ سکا تھا اس لیے ہم نے نوفل کی پیدائش پر اُس کا نام چارلی طوفان تجویز کیا تھا.. اور ایسے طوفانوں میں پیدا ہونے والا بچہ پھر بھی ایک ناخن بھر کے مینڈک سے ڈرتا تھا..

ایک ایسی شام تھی، اُس برآمدے میں بیٹھے ہوئے جو اُتری تو اُس کے ساتھ خوابیدہ جنگل بھی جاگ اُٹھا.. زندہ ہو گیا.. اُس جنگل کے گھنے پن میں جہاں شاہ بلوط کے درختوں کے تنوں اور شاخوں سے سبزے کی روئیدگی جھالروں کی صورت میں لٹکتی تھی وہ ابھی چپ تھا اور ابھی شور کرنے لگا.. اُس کے اندر جتنے بھی پنکھ پکھیرو پرندے تھے جانے اُن کے رنگ کیا تھے.. فلوریڈا کے باسی تھے یا دور دیسوں سے آئے تھے وہ سب کے سب چہچہانے لگے.. اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے.. ایک مترنم شور برپا ہو گیا.. اُن کی بولیاں جنگل میں سے برآمد ہو کر جھیلوں اور گولف کورس کی ہریاول پر ہولے ہولے چہکتیں میرے کانوں میں غُل کرنے لگیں..

اگرچہ وہ پرندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے پر وہ اپنا اپنا راگ نہیں الاپ رہے تھے کہ اُن کی الگ الگ شناخت ہو سکے بلکہ وہ سب ایک مشترکہ جھنکار کی صورت سنائی دے رہے تھے.. ایک ایسی سمفنی کی مانند گونج رہے تھے جس میں مختلف سازوں کی پہچان نہیں ہو سکتی تھی.. اور

یہ بولیاں یہ پُرشور جھنکار.. چہچہاہٹ کا یہ مترنم غُل ایک سہانے سُر میں رچا ہوا تھا.. ایسا سہانا کہ اسے سن کر کسی جہادی مدرسے کی سیاہ پوش طالبات بھی قونیا کے درویشوں کی مانند رقص کرنے لگیں..

پرندوں کی یہ جھنکار شاید حواس کو معطل کر دیتی تھی.. ہوش کو مفلوج کرنے پر قادر تھی کہ کچھ دیر بعد مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ چہکتی جھنکار جنگل سے مجھ تک نہیں آ رہی بلکہ میرے کانوں میں سے جنم لے کر جنگل کی جانب جا رہی ہے..

جنگل تو چُپ تھا..

نہ صرف چُپ تھا بلکہ دم بخود تھا اور اُس میں بسیرا کرنے والے سارے پرندے بھی چونچیں بند کیے دم بخود تھے، حیرت میں غرق تھے کہ ہم تو بولتے نہیں تو یہ کون بولتا ہے.. ہم تو نہیں چہک رہے تو پھر یہ کون ہے جو ہمارے سُروں میں چہک رہا ہے..

اور وہ اپنی اپنی بولیاں بھی پہچان رہے تھے.. اور سناٹے میں تھے کہ یہ ہماری بولیاں بولنے والا کون ہے. ہماری چونچیں بند ہیں تو یہ کون ہے جو ہمارے سُروں میں راگ الاپتا ہے.. ایسے کہ ہم مخمصے میں پڑتے جاتے ہیں کہ یہ ہم ہیں.. اور ہم نہیں ہیں تو اور کون ہے.. وہ کچھ دیر تو ایک بے یقینی میں ضبط کیے بیٹھے رہتے ہیں، حیرت بھرے سناٹے میں دفن رہتے ہیں اور پھر اپنی چونچیں وا کر دیتے ہیں.. انہیں کھول کر دور سے آنے والی جھنکار کے ساتھ سُر ملا کر اُس کے ہم نوا ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ اگر ہم یونہی چُپ بیٹھے رہتے ہیں.. چہکنا موقوف رکھتے ہیں تو ہمارے جنگل کے اُس پار.. جھیلوں اور گولف کورس کے پار جو ایک گھر ہے جس کے برآمدے میں بیٹھا جو مخبوط الحواس شخص ہے تو یہ بولیاں جو ہماری بولیاں ہیں اُس کے بدن میں سے جنم لیتی ہم تک آ رہی ہیں.. تو چونچیں بند رکھنے میں ایک خدشہ ہے..

اگر ہم نہ بولے تو وہ بولنے لگے گا..

ہم نہ چہکے تو اُس کا بدن چہکتا چلا جائے گا..

کہ وہ خود ایک گھناوٹ بھرا قدیم جنگل ہے.. جس میں ایسے ایسے پرندے بسیرا کرتے ہیں جنہیں ہم مُرشد مانتے ہیں.

منطق الطیر کے پرندے.. سی مرغ کی تلاش میں.. سچ کی تلاش میں نکلنے والے پرندے..

شاہ سلمان کا ہُد ہُد..

وہ فاختہ جو نوح کی کشتی کی جانب لوٹ آئی تھی اور اُس کی چونچ میں زیتون کی ایک شاخ تھی.. اور قادر آباد کی جھیلوں پر جتنی بھی مرغابیاں اُترتی ہیں وہ سب.. چاہے اُن کا تعلق خوشی سے ہے یا نہیں.. اور ان کے سوا ایسے پرندے بھی اُس کے بن میں بسیرا کرتے ہیں جو اُس کے تصور اور بے خودی میں سے جنم لیتے ہیں اور اُن کا کوئی نام نہیں..

جھیل کی سطح پر اُس ڈھلتی شام میں.. یکدم تین مچھلیاں پھڑک کر اُچھلیں.. یقیناً انہوں نے بھی اُن چند لمحوں میں جب وہ پانیوں میں سے اُبھر کر لحظہ بھر کے لیے اُن پر معلق ہوئیں، وہ بولیاں سنی ہوں گی.. ایسی بولیاں جو جنگل میں بسیرا کرنے والے پرندے نہیں بولتے تھے.. وہ تو چُپ تھے.. چونچیں بند کیے گُنگ بیٹھے تھے اور پھر بھی اُن بولیوں کا شور غضب کا تھا.. کون بولتا تھا جس کی کسی کو خبر نہ تھی.. لحظہ بھر کے لیے اُن پر معلق ہوئیں اور پھر پانیوں میں گر کر چُپ میں چلی گئیں..

آئرلینڈو کی شامیں ایسی ہوتی تھیں..



''ڈِزنی ڈاؤن ٹاؤن''

ایک تو میں اس ''ڈاؤن ٹاؤن'' سے بے حد عاجز آ چکا تھا..

امریکہ میں ہر شخص اس اصطلاح کو بے دریغ استعمال کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ اُس کا مخاطب جو پاکستانی ہے وہ بے حد کنفیوژ ہو رہا ہے... مسلسل حساب کتاب کر رہا ہے کہ اگر میں ٹائمز سکوئر میں ہوں تو کیا میں ڈاؤن ٹاؤن میں ہوں یا اَپ ٹاؤن میں ہوں.. اگر برونکس کی جانب جانا ہے تو وہ کمبخت اَپ ہے یا ڈاؤن ہے..

چونکہ سب وے سٹیشنوں پر ڈاؤن ٹاؤن جانے کے لیے یا اَپ ٹاؤن سفر کرنے کے لیے مختلف پلیٹ فارموں میں اُترنا پڑتا ہے اس لیے میں شش و پنج میں پڑ جاتا کہ اگر ساؤتھ فیری میری منزل ہے تو کون سے پلیٹ فارم پر اُتروں.. جہاں سے ٹاؤن ڈاؤن ہو رہا ہے یا اُدھر جاؤں جہاں یہ اَپ ہو رہا ہے..

اس پر ایک اور سِتم کہ یہ اصطلاح صرف سمت کا تعین کرنے کے لیے ہی مستعمل نہیں بلکہ شہر کے مرکز کو بھی ڈاؤن ٹاؤن کہا جاتا ہے.. چنانچہ یہ ڈاؤن ٹاؤن مصیبت مجھے مستقل پریشانی میں مبتلا رکھتی.. ایک بار اسی پریشانی اور کنفیوژن میں یوں جانئے کہ جانا تو ساہیوال تھا مگر گجرات جا اُترا.. یعنی قصد کیا کہ پین سٹیشن پر اُترنا ہے لیکن مخالف سمت میں جانے والی ٹرین پر سوار ہو گیا اور جا پہنچا برونکس میں جہاں کا چڑیا گھر بہت مشہور ہے.. ابھی کچھ روز پیشتر پاکستان نے سنو ٹائیگر کا ایک بچہ برونکس کے چڑیا گھر والوں کو پالنے پوسنے کے لیے دیا ہے کیونکہ ہمارے ہاں برفانی چیتے پالنے کا کوئی مناسب بندوبست نہیں.. جب یہ بالغ ہو جائے گا تو ہم اسے واپس پاکستان لے آئیں گے اگر تب تک یہ گرین کارڈ ہولڈر نہ ہو گیا تو.. چنانچہ اب برونکس کے علاقے میں خوار

ہو رہا ہوں اور پوچھتا پھرتا ہوں کہ بھائی جان یا بہن جی میں گم ہو گیا ہوں، جانا پین سٹیشن تھا آ یہاں گیا ہوں تو مجھے یہی بتا دیں کہ براڈوے سٹریٹ واپس جانے کے لیے کہاں سے اور کونسی گاڑی پکڑوں اور اپ جاؤں یا ڈاؤن لیکن یا تو لوگ رُکتے نہیں تھے اور اگر رُک جاتے تھے تو امریکی لہجے میں جانے کیا اوٹ پٹانگ جواب دے کر چلے جاتے تھے.. اور برونکس میں بھٹکتے ہوئے مجھے وہ چینی خاتون نہیں بھولتی جو عجیب کلبلاتی قسم کی کوئی نامانوس خوراک کا خوانچہ لگائے کھڑی تھی، میں نے اُس سے پوچھا تو اُس نے مسکرا کر فویا نگ.. ماؤزے تنگ.. چاؤ چاؤ چن من قسم کا کچھ جواب دیا۔ میں نے سوال دوہرایا تو پھر وہی جواب دوہرا دیا گیا.. بالآخر میرے بار بار پوچھنے پر وہ زچ ہو کر بولی ''نو انگلش.. اونلی چائنیز..''

میرے لیے یہ حیرت کا ایک مقام تھا کہ نیویارک میں ایک خاتون خوانچہ لگائے کھڑی ہے اور ظاہر ہے امریکی قومیت کی ہے اور اس کے باوجود انگریزی کا ایک لفظ نہیں بول سکتی.. امریکہ کے رنگ بھی نیارے ہیں..

بلال ایک روز مجھے کہیں لے جا رہا تھا تو راستے میں چند عمارتوں کی جانب اشارہ کر کے اُس نے کہا ''انکل یہ آرلینڈو کا ڈاؤن ٹاؤن ہے..''

''تو پھر ہم اَپ ٹاؤن میں رہتے ہیں؟''

کہنے لگا ''نہیں انکل.. ادھر کوئی اَپ ٹاؤن نہیں ہے صرف ڈاؤن ٹاؤن ہے۔''

تو قابل فہم طور پر جب مجھے آرلینڈو کے نظارے دکھانے کی پیشکش کرتے ہوئے عینی نے کہا کہ ابّو آج شام ہم ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن جائیں گے تو میرے اوسان خطا ہو گئے کہ جانے کہاں جائیں گے۔

''یعنی ہم ڈزنی لینڈ جائیں گے؟''

''نہیں ابّو'' عینی نے میری جہالت پر کفِ افسوس ملا ''ہم ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن جائیں گے..''

''اور وہاں ڈزنی لینڈ بھی ہو گا..''

''ابو وہ تو ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن ہے وہاں ڈزنی لینڈ کیسے ہو سکتا ہے..''

''تو پھر اُسے ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن کیوں کہتے ہیں جب کہ وہاں ڈزنی لینڈ ہی نہیں ہے؟''

''کیونکہ وہ صرف ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن ہے..''

''افوہ'' میں نے نوفل کی مانند ایک ''افوہ'' کیا اور مسکرانے لگا ''یہ تو بہت ہی آسان فہم بات ہے جو میں سمجھ ہی نہ سکا تھا. اگر وہ صرف ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن ہے تو وہاں ڈزنی لینڈ کیسے ہو سکتا ہے..''

''رائٹ'' عینی نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا..

''اور ہم ہاں جا کر کیا کریں گے؟''

''ڈاؤن ٹاؤن دیکھیں گے.''

''اور وہاں کیا ہوگا؟''

''ڈاؤن ٹاؤن ہوگا ابو.''

ہم اُس شام گھر سے نکلے اور جانے کدھر کدھر سے ہوتے کہاں کہاں سفر کرتے کہیں پہنچے جہاں کچھ رونق میلہ ہو رہا تھا.. پارکنگ لاٹ میں کار پاک کی اور چند قدم چلنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ہزاروں کاروں میں گم ہو چکی تھی کہ وہ پارکنگ بھی ایک قصبے کے سائز کی تھی. بے شمار خاندان اُمڈے چلے آ رہے تھے اور ہم اُن کے ساتھ اُمڈتے ہوئے اس شام کو سو رنگ کرنے کے لیے اور سرخوشی کے حصول کے لیے وہاں جو ایک مصنوعی دنیا آباد تھی اُس کی مرکزی سڑک پر چلنے لگے.. اس دنیا میں مختلف ملکوں کے ریستوران' شراب خانے' سینما گھر' نایاب اشیاء اور تحفوں کی خصوصی دکانیں اور میوزک سٹور آباد تھے.. ہمارے بائیں جانب ایک بہت ہی وسیع مصنوعی جھیل تھی جس کے دوسرے کنارے پر شاندار جگمگاتے ہوٹل اور جوئے خانے جھیل کے پانیوں میں عکس ہوتے تھے.. اور جھیل میں سٹیمر اور کشتیاں رواں تھیں جو مہمانوں اور ملاقاتیوں کو اُن کی ایسی آسائش گاہوں تک لے جا رہی تھیں جہاں ساٹھ ڈالر سے دس ہزار ڈالر تک کے کرائے کی خواب گاہیں میسر تھیں..

مجھے جدہ' دوبئ اور قطر میں ہمیشہ اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو عالی شان شاپنگ مالز اور سپر سٹورز میں ہی گھومتے رہتے ہیں اور ان کے لیے یہی زندگی ہے حالانکہ یہ سب کچھ مصنوعی ہے.. چلئے اس کا تو کچھ جواز ہو سکتا ہے کہ انسان صحرا کو کب تک دیکھے.. لیکن امریکہ میں اور خاص طور پر آرلینڈو میں مجھے اس حیرت نے ڈھانپ لیا کہ عام امریکی کی پہنچ میں اگرچہ دنیا کے عظیم ترین جنگل' چٹانیں' وادیاں اور دریا ہیں.. شاندار ترین قدرتی مناظر ہیں اور

پھر بھی وہ ان مصنوعی مناظر اور مظاہر میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں.. ڈزنی لینڈ کوئی ایک مقام نہیں ہے بلکہ اس کے مختلف قصبے ہیں یعنی میجک کنگڈم' اینمل کنگڈم' سی ورلڈ' ایسکاٹ اور یونیورسل سٹوڈیوز وغیرہ.. اور یہ سبھی حضرت انسان کے ہاتھوں کے کمالات ہیں.. اگرچہ یہ مصنوعی دنیائیں ایسی ہیں کہ ان میں داخل ہوتے ہیں تو ان کا تنوع' ذوق جمال اور تکنیکی معجزے آپ کے حواس پر حاوی ہو جاتے ہیں اور آپ بھی اس مصنوعی زندگی سے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں..

اب یہ جو ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن تھا یہاں مشہور زمانہ ریڈیو سٹی کا موسیقی کا سٹور تھا جس میں داخل ہو جائیے تو وہ اتنا بڑا تھا کہ آپ آسانی سے اس میں گم ہو سکتے تھے.. دنیا جہان کی موسیقی سن سکتے تھے.. یعنی اپنے کانوں میں پلگ فِٹ کر لیجیے اور افریقی' عربی یا چینی موسیقی سے جی بھر کے لطف اندوز ہوتے رہیے.. اور مفت میں ہوتے رہیے.. میں اس سٹور کے مشرقی موسیقی کے حصے میں چلا گیا اور وہاں ظاہر ہے ہندوستانی موسیقی کا راج تھا.. اگرچہ دو چار نصرت فتح علی خان اور مہدی حسن بھی ایک کونے میں آرام کرتے تھے..

ایک اور سٹور صرف شیشہ گری کی بے مثال حیرتوں کا تھا..

یہاں ہر شے شیشے اور کرسٹل کی کاریگری تھی.. ایسے اچھوتے عجوبے تھے کہ انسان دنگ رہ جاتا تھا اور جب اُن میں کسی ایک تتلی یا خوش رنگ گلاس کی قیمت دریافت کرتا تھا تو مزید دنگ رہ جاتا تھا.. سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کونسے کوزہ گر ہیں جو مٹی کی بجائے شیشے کو اپنے چاک پر چڑھا کر ایسے آئینہ عجائبات تخلیق کرتے ہیں.. ایک پور جتنے شیشے کے اُلو کی قیمت اتنی تھی کہ اتنی رقم میں سچ مچ کے درجن بھر اُلو آسانی سے خریدے جا سکتے تھے بلکہ ''جھونگے'' میں ایک اُلو کا پٹھا بھی آ سکتا تھا..

اگر قیمتیں ہوش ربا تھیں تو شیشے کی صناعی بھی ہوش ربا تھی..

اس نوعیت کے متعدد سٹور ایسے تھے جہاں ایسی تخلیقی حیرتیں تھیں کہ انسان وہاں سے نکلتا تھا تو کنگال ہو کر..

ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن اگر ابھی تک میری یادداشت میں ٹھہرا ہوا ہے تو اس کا سبب ایک ایسا سٹور ہے جو ایک عجائب گھر تھا.. امریکی شناخت کے حوالے سے اس کی اور کوئی مثال نہیں.. یہ گویا امریکی ثقافت اور تاریخ کا ایک میوزیم تھا اگرچہ ہر شے برائے فروخت تھی.. یہاں تصویریں اُتارنے پر پابندی تھی کہ تاریخ کی تصویر اُتارنا جائز نہیں..

یہاں وہ لوگ تھے جو امریکی تاریخ میں اپنی سیاست، فراست، حماقت، موسیقی، بدمعاشی یا اداکاری کے حوالے سے داستانیں بن چکے تھے.. اُن کی ذاتی یادگاریں اور تصویریں تھیں.. اُن کے ہاتھوں کے لمس تھے، اُن کے بدنوں کی مہک تھی اور یہ سب کچھ برائے فروخت تھا..

مارلن برانڈو اور جیمز ڈین کی نایاب تصاویر.. دستخط شدہ..

بینک لوٹنے والے جوڑے، بونی اور کلائڈ کی پستولیں..

ایک تصویر میں جان ایف کینیڈی اور مارلن منرو پہلو بہ پہلو.. وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اُس کا حال سنائیں کیا..

سَر ایلٹن جانز.. گائیکی کا ایک جینئس.. اُس کا ایک شوخ اور رنگین اُس کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہوا ایک ذاتی پیانو.. یاد رہے کہ یہ وہی سَر ہیں جنہوں نے ایک اور سَر.. یعنی ایک مرد کے ساتھ باقاعدہ شاہانہ پیمانے پر پوری دنیا میں ٹیلی ویژن پر براہ راست نشر ہوتی.. شادی رچائی.. اور کل دنیا نے شاہی خاندانوں نے بھی مبارکباد کے پیغام بھجوائے اور ان پیغاموں اور نیک خواہشات میں ''دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو'' تو شامل نہیں ہوگا.. تو میں اس شادی کی نشریات دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ایک نائٹ یا سَر کی اہلیہ تو لیڈی کہلاتی ہے تو ایلٹن جانز کا شوہر.. یا شاید بیوی جو کہ ایک مرد تھا وہ جانے کیا کہلائے گا یا کہلائے گی.. صد شکر کہ میڈیا نے اُن کے ہنی مون کو براہ راست نہیں دکھایا..

موسیقی کی ایک اور داستان برطانوی بیٹلز گروپ کی ایک گٹار بھی نمائش پر تھی اور اُن کی متعدد آٹوگراف شدہ تصاویر بھی.. اور یہ بیٹلز اس حقیقت کی کیا خوب ترجمانی کرتے ہیں کہ انسان بے شک بے سُرا اور بیہودہ ہو اگر نصیب اور حالات موافق ہو جائیں اور وہ ایک طاقتور اور دھانسو ملک کا باشندہ ہو تو وہ بھی ایک داستان بن سکتا ہو.. میں اُن کے بیشتر گیتوں سے واقف تھا اور اُن میں صرف ایک دو اس قابل تھے کہ انہیں سُنا جا سکے اگرچہ اُن میں ردھم موجود تھی لیکن کوئی ایک آواز بھی کام کی نہ تھی.. اُن کی سب سے بڑی پہچان اُن کے بے ترتیب بال تھے جو ماتھے کو ڈھانپتے تھے.. تب تک گلوکاروں کے بال جیسے کیسے بھی ہوتے تھے.. ایلوس پرسلے کے بھی.. وہ کنگھی شدہ ہوتے تھے اور یہ آئے تو پریشان بال آئے.. اور کیسے آئے.. وہ ایک سومنگ پول میں ڈبکیاں لگا کر نکلے تو اُن کے منیجر نے اُن کی حماقت آمیز شکلیں دیکھ کر کہا ''لڑکو.. بالوں کو یونہی بے ترتیب رہنے دو اور آج شب یونہی پرفارم کرو''، بیٹلز گروپ نے ہندوستانی راگ بھی ''گائے''.. جان لینن نے

گاندھی کی عینک لگا کر اپنی ادھیڑ عمر جاپانی بیوی کے ہمراہ ہنی مون مناتے ہوئے بستر میں لیٹے پریس کانفرنس کی اور ایک دانشور کہلانے لگا..

امریکہ کے تین صدر.. جان کینیڈی کے ہمراہ اور اُن چاروں کے آٹوگراف تصویر پر..

وہ خود اور زرہ بکتر جو رَسل کرو نے ''گلیڈی ایٹر'' میں پہنے تھے اور جب وہ اکھاڑے میں گر کر مردہ ہو گیا تھا تو اُس کی محبوبہ نے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے ایک لازوال فقرہ کہا تھا ''ہِی وازاے سولجر آف روم... آنر ہِم..''

وہ تلوار جو کیون کاسنر نے ''ڈانسز ود دے وولف'' میں زیب تن کی تھی..

ارنسٹ ہیمنگوے کی آٹوگراف شدہ تصویریں..

اور ان کے سوا بے شمار شہرتیں جو یہاں تصویر تھیں یا جن کی یادگاریں نمائش پر تھیں.. اور یہ سب کچھ نہایت نامناسب قیمتوں پر دستیاب تھا..

اور اس عجائب گھر میں صرف دو نوادرات ایسے تھے کہ اگر میری جیب میں اُن کی قیمت کی قربت میں کچھ ڈالر ہوتے تو میں بلا جھجک انہیں خرید لیتا..

اُن میں سے ایک مارلن منرو کا ایک قد آدم پوسٹر تھا جس پر اُس کے کسی مداح نے دستخط لیے تھے اور پھر اُسے فروخت کر دیا تھا.. مارلن منرو کو اپنے شیدائیوں کی پہچان نہ تھی اگر وہ مجھے اس پوسٹر پر دستخط کر کے دیتی تو میں بھوکا مر جاتا اسے فروخت نہ کرتا.. جیسے بُل رنگ کے ایک معمولی اہلکار کے بانسی ہیٹ پر پابلو پکاسو نے ایک بیل بنا کر اپنے دستخط کر دیئے تھے اور بعد میں اُسے اس ہیٹ کے لیے ایک بھاری رقم کی پیشکش ہوئی تو اُس نے کہا ''اگرچہ میرا گزارہ مشکل سے ہوتا ہے اور میں ایک نادار شخص ہوں لیکن میں بھوکا مر جاؤں گا پابلو پکاسو کا یہ تحفہ فروخت نہیں کروں گا..''

امریکہ نے اسی لیے بے مثال ترقی کی ہے کہ وہاں اگر قیمت مناسب لگتی ہے تو جذبات اُس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے..

مارلن منرو کے پوسٹر کے علاوہ دوسری نادر شے البرٹ آئن سٹائن کی ایک ایسی نایاب تصویر تھی جو آج تک کہیں شائع نہیں ہوئی تھی اور اُس کے ایک کونے میں پچھلی صدی کے سب سے بڑے جینئس کے دستخط ثبت تھے.. جس نے کائنات کی اُن گتھیوں کو سلجھایا جو مقدس صحیفے بھی نہ سلجھا سکے..

میں اس عجوبہ گھر سے جب باہر آیا تو قدرے رنجیدہ اور ملول باہر آیا کہ نہ میرے ہمراہ

آئن سٹائن آیا اور نہ مارلن منرو..

ذرا آگے گئے ہیں تو وہاں ''پلینٹ ہالی وڈ'' کا شور و غوغا اور شور شرابا تھا..

شور و غوغا وہاں براجمان لوگوں کا تھا اور اُن میں سے جو شراب پی رہے تھے اور بہت پی رہے تھے شور شرابا اُن کا تھا..

یہ ریستوران ہالی وڈ کے تین بڑے ایکشن ہیروز..نے اپنی شہرت کو مزید کیش کرنے کے لیے بنایا تھا اور بے شمار شہروں میں بنا کر بے شمار لوگوں کو بیوقوف بنایا تھا..مجھے اُس لمحے تک علم نہ تھا کہ میں بھی اُن لوگوں میں سے ہوں..اور مجھے دیکھنے والے لوگ مجھے بھی ''پلینٹ ہالی وڈ'' کا دیوانہ سمجھتے تھے کیونکہ میں نے جو ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اُس پر ''پلینٹ ہالی وڈ'' لکھا ہوا تھا..جان بوجھ کر نہیں پہنی تھی کہ آج ہم سب ''پلینٹ ہالی وڈ'' کے دیدار کے لیے جا رہے ہیں تو خصوصی طور پر موقعے کے مطابق یہ ٹی شرٹ زیب تن کر لوں..دراصل امریکہ آنے سے پیشتر میں نے سمیر کی وارڈ روب میں سے اُس کی متعدد ٹی شرٹیں غائب کر دی تھیں تا کہ انہیں امریکہ میں پہن کر ذرا امریکی ہو جاؤں اور اُن میں سے ایک یہ بھی تھی جو میں نے اتفاقاً پہن لی تھی..ویسے ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن میں گھومنے پھرنے والے مجھے توصیفی نگاہوں سے اس لیے بھی دیکھ رہے تھے کہ ایسی ٹی شرٹ بے حد گراں قیمت ہوتی ہے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ میڈ اِن گوجرانوالہ ہے جہاں دنیا بھر کے مہنگے ترین برینڈز کی ٹی شرٹیں نقل بہ مطابق اصل بنتی ہیں اور اتنی سستی بنتی ہیں کہ قبول عام کی سند حاصل کرتی ہیں..یہ جو ریستوران تھا ''پلینٹ ہالی وڈ'' تو یہ ایک بلند خیمہ نما شکل کی عمارت تھا..اور آپ ایک گھاٹی چڑھ کر داخلے کے دروازے تک پہنچتے ہیں جہاں آپ سے دریافت کیا جاتا ہے کہ اگر تو آپ ڈنر یا ڈرنکس وغیرہ کے لیے تشریف لائے ہیں تو براہ کرم دائیں جانب قدم رنجہ فرما دیجیے اور اگر تم نے کھانا پینا کچھ نہیں..یونہی منہ اُٹھا کر اُن لوگوں کو حسرت سے دیکھنا چاہتے ہو جو ریستوران میں زندگی کے مزوں کی لوٹ مار کر رہے ہیں تو بائیں جانب سے اندر دفع ہو جاؤ..

ہم بھی اندر دفع ہو گئے..

اگرچہ ہماری جیبیں بھی کچھ ایسی خالی نہ تھیں لیکن عینی کا کہنا تھا کہ اس ریستوران میں دنیا کی بدترین خوراک دنیا کے مہنگے ترین داموں میں ملتی ہے..لوگ محض اس لیے یہاں کچھ کھاتے

ہیں اور بہت پیتے ہیں تا کہ وہ اپنے دوستوں کے سامنے ڈینگیں مار سکیں کہ یہ جو پچھلی شب گزری ہے تو ہم ڈنر کے لیے ''پلینٹ ہالی وڈ'' بس یونہی چلے گئے تھے..

ریستوران کی چھت سے بے شمار کاٹھ کباڑ لٹک رہا تھا..غبارے' فلموں کے پوسٹر اور اداکاروں کی تصویریں..مار دھاڑ کے مناظر اور ان کے درمیان میں یعنی چھت کے ساتھ ایک فوکس واگن کار بھی لٹک رہی تھی..وہاں اتنا شور شرابا تھا..بلند آہنگ موسیقی اور لوگوں کے زبردستی کے قہقہوں کا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی کیونکہ اور کوئی آواز کانوں تک پہنچتی ہی نہ تھی اس لیے آپس میں ہم آواز کے ساتھ اشاروں پر زیادہ انحصار کرتے تھے..

مجھے ہمہ وقت یہی خدشہ رہا کہ چھت سے معلق وہ فوکس واگن کار ابھی دھڑام سے غُل کرتے..بلکہ غُل غپاڑا کرتے خواتین و حضرات پر دھڑام سے گر جائے گی اور انہیں پلینٹ ہالی وڈ کا شہید کر دے گی..

ہم زیادہ دیر تک یہ شور و غوغا برداشت نہ کر سکے اور باہر آ گئے..

اور وہاں میں نے ڈزنی لینڈ کا وہ مال الگ باندھ کے رکھا ہے جو اچھا ہے..دیکھا۔

وہیں ''پلینٹ ہالی وڈ'' ریستوران کی قربت میں ایک مال بلکہ ایک لباس ایسا نمائش پر تھا اور برائے فروخت تھا جس میں کبھی وہ مال بندھا تھا جو کیا ہی اچھا تھا..

یعنی وہ لباس جو میری محبوب اداکارہ..حرام ہے کہ جس کا کوئی بھی ناک نقشہ رعائتی نمبر عطا کر کے بھی تقریباً خوبصورت قرار دیا جا سکے..جولیا رابرٹس نے فلم ''امریکن بیوٹی'' میں ایک بدن فروش عورت کے رُوپ میں زیب تن کیا تھا..ایک سفید رنگ کا مختصر بلاؤز جو ایک کُنڈے سے اُس مختصر ترین نیکر سے منسلک تھا جس میں سے جولیا کی ٹانگیں ظاہر ہوتی تھیں تو ہوتی ہی چلی جاتی تھیں..

ہمارے زمانوں میں اداکارائیں نہایت ادائیں دکھانے والی' چنچل' نٹ کھٹ اور بے حد حسین ہوا کرتی تھی اور اُن میں سے چند ایک کے سوا سب اپنی خوبصورتی کی ''کھٹی'' کھاتی تھیں..اداکاری کے فن سے ذرا ناواقف تھیں اور ہم اُن پر صدقے واریاں ہوتے جاتے تھے..جینا لولو برجیڈا' انیتا ایکبرگ' جین مانسفیلڈ' ریٹا ہیورتھ' ڈورس ڈے' مارلن منرو وغیرہ..البتہ الزبتھ ٹیلر' آڈرے ہیپبرن' صوفیہ لورین اور ڈیبرا کر وغیرہ ایک الگ کلاس تھیں..لیکن یہ جو آج کے زمانے ہیں یہاں دور دور تک کوئی حسین شکل نظر نہیں آتی اور صرف فنِ اداکاری ہی وہ پیمانہ ہے

جس سے کسی اداکارہ کی پرکھ ہوتی ہے چنانچہ نہائت معمولی شکل وصورت کی حامل اداکارائیں ہالی وڈ میں راج کرتی ہیں اور وہ درجنوں میں ہیں.. میرل سٹریپ کو دیکھئے ایسی بے ڈھنگی لم تڑنگی خاتون ہے لیکن اداکاری کرتی ہے تو سکرین پر اُس کے سوا ہر شے پس منظر میں چلی جاتی ہے.. اور پھر جولیا رابرٹس کو ملاحظہ کر لیجئے' ہونٹ موٹے' ناک عجیب سی' آنکھیں معمولی اور بدن بس گزارہ' یہ بڑے بڑے دانت لیکن جب وہ ان بڑے بڑے دانتوں کی پوری بتیسی نمائش کرتی پورا چہرا کھول کر ایک نہائت ہونق سا قہقہہ لگاتی ہے تو کم از کم میں تو اُس پر لوٹ پوٹ ہو جاتا ہوں.. وہ ایسی عجوبہ اداکارہ ہے..

تو اُس جولیا رابرٹس کا وہ مختصر لباس جو اُس نے ''امریکن بیوٹی'' میں پہنا تھا جوں کا توں نہ صرف نمائش پر تھا بلکہ برائے فروخت بھی تھا..

پنجابی کا ایک لوک گیت ہے کہ. مُل وِکدا سجن مل جاوے تے لے لواں میں جند ویچ کے..
یعنی اگر کہیں محبوب برائے فروخت ہو تو میں اپنی جان بیچ کر اُسے خرید لوں..

یہاں محبوب تو نہیں البتہ اُس کا مختصر پیراہن برائے فروخت تھا اور جی اُسے جان بیچ کر خرید لینا چاہتا تھا لیکن.. ایک خدشہ دامنگیر ہوا کہ اس پیراہن میں اگر اُس کے بدن کی مہک ٹھہری ہوئی ہے تب تو جان وغیرہ بیچنے کا فوری طور پر بندوبست کروں لیکن جانے یہ کب سے یہاں نمائش پر ہے.. اور بدن کی مہک اتنی دیر تک تو نہیں ٹھہری رہتی.. اور اگر وہ مہک اس میں موجود نہیں تو یہ ایک بیکار چیتھڑا ہے.. دو ٹکے کا بھی نہیں چہ جائکہ دل وجان کا سودا کر کے اسے حاصل کیا جائے..

میں نے جولیا رابرٹس کے اُس لباس کو قریب ہو کر سونگھا تو نہیں پر میں خوب جانتا تھا کہ اُس کے سراپے کی خوشبو کب کی اُس میں سے رخصت ہو چکی.. کیونکہ اُس میں اگر اُس کی مہک کا ایک بھی جھونکا ہوتا تو جونہی میں ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن میں داخل ہوا تھا میں اُسے اپنے سانسوں میں محسوس کر لیتا اور پھر اُس کی جانب کھنچا چلا آتا..

تو ڈزنی ڈاؤن ٹاؤن سے واپسی پر.. نہ صرف مارلن منرو اور البرٹ آئن سٹائن نے میرا ساتھ نہ دیا بلکہ اُن کے ہمراہ جولیا رابرٹس کے بدن کی مہک بھی نہ آئی..



''ڈزنی لینڈ''

اِس دنیا کی تخلیق کے بعد اگر کسی ایک شخص نے ایک اور دنیا بنائی تو وہ والٹ ڈزنی تھا..
وہ بنیادی طور پر ایک خواب دیکھنے والا شخص تھا.. ایک ایسا بچہ تھا جس نے خوابوں اور خیالوں کی ایک سحر انگیز دنیا بلکہ ایک کائنات تشکیل کی تا کہ دنیا بھر میں جتنے بھی بچے ہیں وہ اس میں داخل ہوں تو ان کے خواب حقیقت میں تبدیل ہو کر ان کے آس پاس ظاہر ہونے لگیں. خوابوں کی یہ کائنات تخلیق کرتے ہوئے اس کے پیش نظر منفعت یا منافع نہ تھا صرف جذبہ اور لگن تھی.. اس نے اگرچہ خواب وخیال کی یہ دنیائیں بچوں کے لیے تخلیق کیں لیکن وہ ایسی جادو بھری اور پرکشش تھیں کہ بڑے بھی بچے بن گئے اور ان کے اسیر ہو گئے..

آج دنیا کے کئی بڑے شہروں میں.. پیرس اور ٹوکیو میں ڈزنی لینڈ تخلیق ہو چکے ہیں.. ان کی محیر العقول کامیابی کا بنیادی سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ انسان جوں جوں مشینوں میں جکڑا خود بھی ایک مشین بنتا جا رہا ہے وہ خواب وخیال کی ان دنیاؤں میں داخل ہو کر کچھ سکون اور بہت ساری خوشی حاصل کرتا ہے.. اور خوشی بھی ایک بچے ایسی جو بدن کو آزاد کر دیتی ہے..

آرلینڈو بے شک جھیلوں، جنگلوں، دلدلوں اور مگرمچھوں کا شہر ہے لیکن اس کی وجۂ شہرت ڈزنی لینڈ ہے..

آرلینڈو اتنا بڑا نہیں جتنے ڈزنی لینڈ کے مختلف مظاہر ہیں..

یہ مظاہر واقعی ایک جادو نگری ہیں.. سحر اور حیرت کی ایک وسیع سلطنت ہیں.. اگرچہ اس سلطنت کے مختلف حصّوں میں داخلے کے ٹکٹ ایک عام پاکستانی کو دیوالیہ کر دینے پر قادر ہیں..

پاکستان میں تصور یہی تھا کہ شہر آرلینڈو کے آس پاس ایک ڈزنی لینڈ ہے..

یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک نہیں..کئی ہیں..

ان میں سب سے جانا پہچانا سنڈریلا کے قلعے والا ''میجک کنگڈم'' ہے..پھر کچھ فاصلے پر ''ایپ کوٹ'' ہے..اُدھر ''یونیورسل سٹوڈیو'' ہے..''اینمل کنگڈم'' کہیں اور ہے اور ''سی ورلڈ'' کہیں اور..اور داخلے کا ٹکٹ..محض ستر ڈالر..کچھ کھانا پینا کرلیں تو روزانہ کے ایک شخص کے لیے سو ڈالر کم از کم..

سچی بات ہے مجھے اس جادونگری..اس ڈزنی لینڈ کو دیکھنے کا کچھ چاؤ نہ تھا..یہ سب خواب وخیال کے کھیل تماشے تھے اور میری عمر نہ کھیل کھیلنے کی تھی اور نہ تماشے دیکھنے کی..اور نہ ہی میں انسان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے کھیل تماشوں سے متاثر ہوتا تھا..

لیکن ڈزنی لینڈ دیکھنا میری مجبوری تھی..

وہ جو کہا جاتا تھا کہ اگر کسی نے آرلینڈو جاکر کم از کم ایک مگرمچھ نہیں دیکھا تو اس نے آرلینڈو نہیں دیکھا..اور اگر وہاں جاکر ڈزنی لینڈ نہیں دیکھا تو کیا دیکھا..

چونکہ میں نے پورے آرلینڈو میں ابھی تک ایک بھی مگرمچھ نہ دیکھا تھا اس لیے صرف یہ ثابت کرنے کے لیے میں آرلینڈو گیا تھا..مجھے ڈزنی بہرصورت دیکھنا تھا..

جو میں نے دیکھا..

امریکہ چونکہ ہر کوئی جاتا ہے..اوران میں سے کوئی کوئی نہیں ہر کوئی سفرنامہ بھی لکھتا ہے اور جو کوئی آرلینڈو جاتا ہے اور تقریباً ہر کوئی آرلینڈو جاتا ہے اور وہاں جاتا ہے تو ظاہر ہے ڈزنی لینڈ بھی جاتا ہے اور اسے بیان بھی کرتا ہے..امریکہ کے سفرناموں میں سب سے زیادہ اکتا دینے والے اور طویل اور بورنگ حصے ڈزنی لینڈ کے بارے میں ہوتے ہیں..چونکہ میں اس سفرنامے میں نیویارک کے عجائب گھروں کے بارے میں بورترین حصے لکھ چکا ہوں اس لیے..ڈزنی لینڈ کو مختصر کرنے کی کوشش کروں گا..

جب آپ کسی کھنڈر یا عمارت کو پڑھنے والوں کے لیے تعمیر کرتے ہیں..حرفوں کی اینٹیں جما کر ان پر دل کو گرفت میں لینے والے تاریخی حقائق کا گارا یا سیمنٹ لیپ کر اینٹ پر اینٹ رکھتے گویا نئے سرے سے قاری کے سامنے جو گمشدہ روایتیں اور حکایتیں ہیں ان کو زندہ کر کے

ایک شکل بناتے ہیں..ایسے کہ پڑھنے والا حرفوں سے تعمیر کردہ اس عمارت کے اندر جا سکتا ہے..

اُسے محسوس کرسکتا ہے..

اسی طور جب آپ کسی قدرتی منظر کو..کسی سنولیک کو..دشت مرگ کو' بلیک فارسٹ ک آئیجن سمندر کو گھر واپسی پر..اپنی سٹڈی کی خاموشی میں..رات کے کسی پہر زندہ کرتے ہیں..انہیں یوں محسوس کرتے ہیں جیسے وہ آپ کو آنکھوں کے سامنے ہیں اور اور پھر ان کو بیان کرتے ہیں تو ان مناظر کا تھوڑا بہت طلسم پڑھنے والے کے بدن پر بھی اثر کرتا ہے اور کتاب کی سکرین پر اسے و منظر دکھائی دینے لگتا ہے..

لیکن..اور یہ ایک بہت بڑا ''لیکن'' ہے..

لیکن جب آپ ایک غیر حقیقی' انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی اصلی دنیا کی نقل دنیا کے سائنسی شعبدوں' نظر کے فریب اور دھوکوں کی دھند میں سے گذر کر اپنے وقتی ہیجان اور جوش ک لفظوں میں بیان کرتے ہیں تو یہ ایک پھیکی اور اکتا دینے والی روئداد ہوتی ہے..ایک عورت ایک وینس کی مانند ایک برفانی ندی سے نہا کر نکل رہی ہے..آپ کی جانب بڑھ رہی ہے اور اس کے گورے بدن کے کچھ حصے سردی سے تھرتھراتے ہیں' دھوپ میں اس کے روئیں سنہرے ہو رہے ہیں اور آپ ایک متاثر شدہ کیف کی حالت میں اسے لفظوں کا روپ دیتے ہیں..اور دوسری جانب شوکیس میں سجی پلاسٹک کی ایک عورت ہے اور آپ اس کے بدن کے تناسب کو بیان کرتے ہیں ایک بے اثر کیفیت میں..یہ فرق ہے..

سنڈریلا کا قلعہ ایک نقل ہے..اصل نہیں..

دنیا کے مختلف ملکوں کے گلی محلے ہیں..پر وہ ماڈل ہیں..

آپ افریقہ میں ایک سفاری پر نکلتے ہیں..جانور تو سچ مچ کے ہیں پر وہ افریقہ میں نہیں آرلینڈو میں ہیں..

ایک راکٹ پر سوار ہو کر زمین کے مدار سے نکل کر..چاند کو چھوتے..مریخ کی سرخ سط پر جا اترتے ہیں لیکن یہ صرف تکنیک کے شعبدے اور دھچکے ہیں..آپ ایک ہی مقام پر بیٹھے ہیں..

ایک جنگل میں پوشیدہ پرندے چہک رہے ہیں..آپ ان کو تلاش نہیں کرسکتے کہ ب

صرف ان کی ریکارڈ شدہ بولیاں ہیں..

تھری ڈی تھیئٹر کی سکرین میں سے بگز بنی خرگوش نکلتا ہے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتا ہے اور آپ اسے ہاتھ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اتنا اصلی ہے اگرچہ نقلی ہے..

یہ سب شک شبہے کے شعبدے ہیں..

سکرین پر تیرتا ایک کچھوا آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے اور آپ اُس سے محو گفتگو ہو جاتے ہیں.. آپ امریکہ کے شہروں' سمندروں اور باغوں پر پرواز کر رہے ہیں.. شہروں کا شور' سمندروں کی نمکین گیلاہٹ اور باغوں میں جو مالٹے نظر آ رہے ہیں ان کی مہک آپ تک پہنچ رہی ہے اور آپ کہیں نہیں گئے.. ایک جھولتی ہوئی نشست پر بیٹھے فریب کے شکار ہو رہے ہیں..

تو یہ سب کھیل تماشے ہیں.. سائنس اور انسانی ذہن کے کرشمے ہیں' خوبصورت دھوکے اور وقتی ہیجان ہیں..

ان سب کو بیان تو کیا جا سکتا ہے لیکن پڑھنے والا آپ کے عارضی خمار میں شریک نہیں ہو سکتا.. یہ ہیجان اور جذبہ منتقل نہیں ہو سکتا کہ یہ سب کچھ ایک شعبدہ ایک نقل ہے.. ایک سنو لیک یا ایجئن سمندر نہیں' ندی میں نہا کر نکلنے والی عورت کا بدن نہیں.. جو کہ نہ کسی کی نقل ہیں اور نہ کوئی شعبدہ.. اگر شعبدے ہیں تو اس کے جس نے انسان کو بنایا.. تو وہ انسان جو نقلیں بناتا ہے انہیں دیکھ کر حیرت ہو سکتی ہے' ہیجان پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ دائمی مسرت کا سبب نہیں بن سکتیں.. ایسی مسرت جو قارئین کو منتقل کی جا سکے.. چنانچہ میں کوشش کروں گا کہ فریب اور دھوکے کی اس نقلی دنیا کے بیان کو جہاں تک ممکن ہے مختصر کرتا جاؤں.. اگرچہ میں نے اس دنیا میں پورے پانچ روز بسر کیے لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ شدید اُکتاہٹ کا شکار ہو جائیں..

ہر اہم شہر کے باسی اپنے شہر کے قابل ذکر اور تاریخی مقامات سے عاجز آ چکے ہوتے ہیں.. انہیں مہمان نوازی اور محبت کا بھرم رکھنے کے لیے دوسرے شہروں یا ملکوں سے آنے والے عزیزوں اور دوستوں کو یہ مقامات ''بخوشی'' دکھانے پڑتے ہیں.. یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ مجبوری کی حالت میں ہیں اور لاہور کا شاہی قلعہ یا شالیمار باغ یا کراچی کا سمندر یا پشاور کا درہ خیبر ہر دوسرے تیسرے ہفتے دیکھ دیکھ کر بیزار ہو چکے ہیں..

اہل آرلینڈو کا بھی یہی حال ہے.. اگرچہ وہ ڈزنی لینڈ کا تذکرہ سن کر مسکراتے ہیں لیکن

ان کے دل رو رہے ہوتے ہیں کہ ہائے وہاں پھر جانا پڑے گا.. میں عینی اور بلال کو اس امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ انہوں نے ڈزنی لینڈ کو بس سرسری دیکھا ہے اور وہ تو ایک مدت سے منتظر تھے کہ کوئی مہمان آئے اور وہ اس بہانے ڈزنی کی اس لینڈ کی خوب سیر کریں..

چنانچہ ایک سویر ہم گھر سے نکلے اور فاصلے طے کرتے چلے گئے.. آرلینڈو گزر گیا.. اس کے نواح پیچھے رہ گئے اور ہم جانے کہاں کہاں سے ہوتے بالآخر جنگلوں میں گم ہوتی ایک شاہراہ پر مڑ گئے.. ان جنگلوں میں بے شمار درخت گرے ہوئے تھے اور یہ پچھلے ہری کین کی یادگار تھے.. ہم ایک لق و دق صحرائی وسعتوں والی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئے جہاں اِکا دُکا کاریں ایک دوسرے سے روٹھی دور دور کھڑی تھیں..

آپ نے یہاں صرف کار کو پارک نہیں کرنا بلکہ یہ بھی کسی ڈائری پر نوٹ کر لینا ہے کہ کہاں پارک کی ہے.. اور اس حصے کا امتیازی نشان کیا ہے.. زیبرا' اونٹ' زرافہ ہاتھی وغیرہ یہ نشان ہیں چنانچہ آپ کی کار لین نمبر تین میں اونٹ کے علاقے میں ہے.. ابھی یہ پارکنگ ویران پڑی تھی اور ابھی ہم چند قدم چل کر پیچھے دیکھتے ہیں تو وہ ہزاروں کاروں میں گم ہو چکی ہے.. بہت سے سیاح واپسی پر اپنی کار تلاش نہیں کر پاتے.. اپنا زرافہ یا اونٹ یاد نہیں رکھتے اور پھر یا تو ٹیکسی پر سوار ہو کر گھر چلے جاتے ہیں کہ کل صبح آ کر تلاش کریں گے یا پھر پولیس کی مدد طلب کرتے ہیں..

پارکنگ سے نکل کر آپ ایک ٹرام میں سوار ہوتے ہیں جس کا کنڈکٹر ایک رٹی رٹائی تقریر کرتا چلا جاتا ہے آپ کو بار بار خوش آمدید کہتا ہے.. ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد ڈزنی لینڈ کے مختلف حصوں میں پہنچنے کے لیے آپ موٹر بوٹ' مونوریل' بس یا ایک دُخانی جہاز استعمال کر سکتے ہیں..

ہم نے ایم جی ایم سٹوڈیو کی وسیع نمائش گاہ سے آغاز کیا.. اس فلمی دنیا میں اگرچہ بے شمار دلچسپیاں تھیں مثلاً کون سی مشہور فلم کیسے شوٹ کی گئی.. فلموں کے ایسے سیٹ جنہیں دیکھ کر آپ کو ان فلموں کے مناظر یاد آنے لگتے ہیں.. سینما گھر اور ملبوسات وغیرہ.. ہم نے شتابی سے دو چار تصویریں اتاریں اور رخصت ہو گئے کیونکہ میڈیا کے ساتھ پوری زندگی بسر کرنے کے بعد میں فلمی فریب میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور یوں بھی ہم ایک ٹکٹ میں دو مزے کرنا چاہتے تھے..

''میجک کنگڈم'' میں ہم بھری دوپہر میں داخل ہوئے اور وہ بھی فلوریڈا کی گرم دوپہر.. کسی بھی جادو کا اثر..چاہے وہ جناتی ہو یا نسوانی سرشام ہوتا ہے یا پھر رات کو سرچڑھ کر بولتا ہے.. بھری دوپہر میں بے اثر ہوتا ہے..سامنے سنڈریلا کا طلسمی قلعہ دھوپ میں نڈھال ہو رہا تھا..اور وہاں تک جانے والی مین سٹریٹ یو ایس اے جو نظر نواز قدیم طرز کی دل پر اثر کرنے والی سٹریٹ تھی وہاں طرح طرح کے تفریحی شوز ہو رہے تھے..روایتی لباسوں میں پسینے سے بھیگتے رقاص اور گویئے سیاحوں کا دل لبھا رہے تھے..نہایت پرشکوہ اور دیدہ زیب بگھیاں تھیں جنہیں بہت بور ہو چکے گھوڑے کھینچ رہے تھے..مین سٹریٹ یو ایس اے کے دونوں جانب جو قدیم عمارتیں گڑیا گھر لگ رہی تھیں ان کے اندر چلے جائیے تو وہاں آپ کو لوٹ لینے والے سامان بہ کثرت تھے.. پھول' کتابیں اور ان سب پر صرف ایک چوہا ناچ رہا تھا..دنیا کا سب سے مشہور چوہا مکی ماؤس جو ڈزنی لینڈ کا راجہ ہے..آپ مکی ماؤس کی تصویر والی جو ٹی شرٹ آرلینڈو کے پاکستانی دکاندار سے چار ڈالر میں حاصل کر سکتے تھے وہی ٹی شرٹ یہاں بیس ڈالر کی تھی..

اس سٹریٹ میں ایک متمول پاکستانی خاندان سے بھی ملاقات ہوگئی اور وہ خوب ہی متمول تھا..صاحب خانہ مجھے پہچان کر نہایت مربیانہ انداز میں مجھ سے ہاتھ ملاتے ہیں' اپنا کارڈ عنایت کرتے ہیں'' تارڑ صاحب میں نیویارک میں خوشبویات کا کاروبار کرتا ہوں..اگر آپ کا آنا ہو تو فون کر لیجیے گا ہم آپ کو کہیں ڈنر پر لے جائیں گے..آفٹر آل آپ ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں..آپ کو کم از کم ڈنر کھلانا ہمارا فرض بنتا ہے'' پھر وہ اپنی بیگم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ''یہ تارڑ صاحب ہیں..پہچانا؟''

بیگم جو نہایت صحت مند ہیں اس اطلاع کے ملنے پر کہ یہ تارڑ صاحب ہیں ذرا ناگواری سے کہتی ہیں ''ہاں'' اور ان کی صحت پر کچھ اثر نہیں پڑتا..

پھر وہ اپنے بچوں کو بلاتے ہیں اور مجھے ان کے سامنے پیش کر دیتے ہیں کہ یہ..

بچوں نے ''ہاں'' بھی نہ کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگے..

اس قدر عزت افزائی کے بعد میں نے سنڈریلا کے قلعے کے سامنے کھڑے ہو کر زبردستی مسکراتے ہوئے چند یادگاری تصویریں اتروائیں اور پھر ہم اس قلعے کے اندر چلے گئے..اس کے اندر بھی سووینیئر سٹور تھے اور ان میں ایک دکان میں کانچ کا سامان تھا..کرسٹل سے تراشیدہ اشیاء

تھیں..مختلف جانور..مچھلیاں اور مینڈک..پھر سنڈریلا کے بالشت بھر کے مجسمے اور اس کے سینڈل..جو وہ اپنی غربت میں واپس جانے سے قبل بھاگ دوڑ میں اس قلعے میں چھوڑ گئی تھی تاکہ بعد میں شہزادہ صاحب اس کی مدد سے اسے تلاش کر لیں..قلعے کے اندر بہت بھیڑ تھی اس لیے کہ پورے میجک کنگڈم میں صرف یہاں تیز دھوپ سے پناہ مل سکتی تھی..ایک امریکی ماں اپنے بچے کے بدن پر خنک پانی کے چھینٹے مار رہی تھی کیونکہ وہ غریب دھوپ کی تاب نہ لا کر مدہوش سا ہو چکا تھا..

سنڈریلا کے قلعے میں مجھے تو کوئی طلسم نظر نہ آیا شاید دھوپ کی تیزی کا اثر تھا لیکن اس کے نزدیک ہی مکی ماؤس آرکسٹرا نے ہمارے دل جیت لیے اور اس آرکسٹرا کا کنڈکٹر ڈونالڈ ڈک تھا..

اس آرکسٹرا کی پرفارمنس جس تھیٹر میں ہوتی ہے وہاں شائقین کے ہجوم قطاروں میں بندھے نہایت صبر سے منتظر رہتے ہیں کہ کب پچھلا شو اختتام کو پہنچے اور کب ہماری باری آئے اور کب ہم پچیس فٹ اونچی اور سوفٹ چوڑی دنیا کی سب سے بڑی فلم سکرین پر یہ کارٹون عجوبہ دیکھیں..

یہ ایک تھری ڈی فلم تھی..

بہت مدت پہلے..تقریباً نصف صدی پیشتر لاہور کے پلازہ سینما میں دنیا کی سب سے پہلی تھری ڈی فلم ''ہاؤس آف ویکس'' کی نمائش ہوئی تھی..مجھے یاد ہے کہ اس فلم کا سب سے انوکھا آئٹم پلاسٹک کے بنے ہوئے وہ رنگین چشمے تھے جنہیں پہن کر آپ اس فلم کی تھری ڈائمنشنل کیفیت سے لطف اندوز ہو سکتے تھے اور مجھے گمان ہے کہ بھاٹی اور موچی گیٹ کے جتنے بھی بھاگا مے اور ماجھے تھے اور مال روڈ پر ٹہلتے جتنے بھی پلپلی صاحب تھے اور گڑھی شاہو کا جتنا بھی کرستان کراؤڈ تھا ان سب نے یہ فلم دیکھی اور ٹکٹیں بلیک میں خرید کر دیکھی..''ہاؤس آف ویکس'' ایک ایسے قاتل کی کہانی تھی جو لاشوں کو موم میں محفوظ کر کے اپنے گھر کے تہہ خانے میں سجا دیتا تھا.. تھری ڈی کی تکنیک ایسی تھی کہ یکدم کوئی لاش آنکھیں جھپکنے لگتی تھی یا آپ کی نشست تک چلی آتی تھی اور پورے ہال میں چیخیں بلند ہونے لگتی تھیں..ان میں سے کچھ چیخیں ایسی بھی ہوتی تھیں جن کا ماخذ کچھ اور ہوتا تھا..

یہاں میجک کنگڈم میں جب مکی ماؤس آرکسٹرا سکرین پر نمودار ہوتا تھا تو قہقہے بلند ہونے لگتے تھے کہ آج کا تھری ڈی سسٹم ''ہاؤس آف ویکس'' کے زمانوں کی نسبت کہیں زیادہ

ترقی یافتہ اور موثر تھا. عینکیں یہاں بھی پہننی پڑتی تھیں..

ڈانلڈ ڈک بیٹن یا چھڑی تھامے آرکسٹرا کو ہدایات دے رہا ہے.. یکدم پلٹتا ہے اور چھڑی تماشائیوں کی جانب پھینک دیتا ہے اور ہر شخص کو یہی لگتا ہے کہ چھڑی میرے سر میں آ لگے گی اور وہ خوفزدہ ہو کر یا تو چیخ مارتا ہے اور یا پھر اپنے سر کو بچانے کی کوشش کرتا ہے.. پھر ڈانلڈ ڈک خود سکرین سے باہر آ کر فضا میں چلتا ہوا ہر شخص کے آگے اپنا ہاتھ کرتا ہے اور وہ شخص بے اختیار اپنا ہاتھ آگے کر دیتا ہے.. وہ وہاں گیت گاتا رہتا ہے آپ کی آنکھوں کے عین سامنے اور گویا وہ صرف آپ کے لیے گیت گا رہا ہے لیکن اس پرفارمنس کا سب سے جادو بھرا لمحہ وہ تھا جب اس آرکسٹرا میں سے ایک ننھی سی پری جلوہ گر ہوتی ہے اور اس کے سفید لبادے کے گرد پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں اور ستارے دمک رہے ہیں اور وہ شراروں میں رقص کرتی سکرین سے نکل کر آپ کی آنکھوں کی سطح پر آ کر ٹھہر جاتی ہے' مسکراتی ہے.. آنکھیں جھپکتی ہے اور آپ چند لمحوں کے لیے اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں' اس کے پیارے سراپے سے نظریں نہیں ہٹا سکتے.. میں جانتا تھا کہ یہ محض فریبِ نظر ہے اس لیے بہت ضبط کیا اور اس پری کو چھونے سے گریز کیا. لیکن یکدم یہ سوچتے ہوئے کہ کیا پتہ یہ فریبِ نظر نہ ہو میں نے اگرچہ کچھ بے وقوف محسوس کرتے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے چھونے کی کوشش کی.. اور اس حال میں میں ہی بے وقوف نہ ہوا' سب ہو گئے.. خاص طور پر بچے تو مسلسل اسے دبوچ لینے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اسے اپنے ساتھ گھر لے جا سکیں..

ایسی پریاں پھلجھڑیوں کے شراروں میں رقص کرتی زندگی میں کئی بار آپ کی آنکھوں کے سامنے فضاء میں ناز دکھلاتی دکھائی دیتی ہیں.. رشتوں اور دوستیوں کی پریاں.. محبت کی.. مذہب اور وطن کی پریاں.. اور سب فریبِ نظر.. آنکھ کا دھوکا..

اگلی منزل ''ایپ کوٹ'' تھی..

اگر انسان کو ڈزنی لینڈ کے سارے شعبدہ گھروں میں سے کسی ایک کا چناؤ کرنا ہو تو میرے خیال میں ''ایپ کوٹ'' کو ہی اولیت حاصل ہونی چاہیے کہ یہ دراصل انسانی تخیل کی بلند پروازی کا ایک حیرت ناک مظہر ہے.. اور یہاں بھی درجنوں شو ہیں اور درجنوں پروازیں ہیں اور یہ فیصلہ آپ کا ہو گا کہ آپ کے ناتواں پروں میں پرواز کی کتنی سکت ہے.. یہاں بھی

آپ نے چناؤ کرنا ہو گا ورنہ صرف ''ایپ کوٹ'' کو مکمل طور پر دیکھنے اور پرکھنے کے لیے کئی روز درکار ہیں..

''ایپ کوٹ'' کو آپ ایک ایسا براعظم بھی کہہ سکتے ہیں جس میں پورے گیارہ ملک آباد ہیں. اس کی دلکشی کا ایک منفرد سبب اس کے اندر میلوں میں پھیلی ہوئی ایک ایسی مصنوعی جھیل ہے جس میں نہ صرف موٹر بوٹس جھاگ اڑاتی فراٹے بھرتی ہیں بلکہ کنارے پر ایک بہت بڑا سٹیم شپ بھی لنگر انداز ہے.....

اور جھیل کے گرد گیارہ ملکوں کی مختصر بستیاں اور ان کے گلی کوچے. ان کے باسیوں سمیت آباد ہیں.....

ہر ملک کی روایت اور ثقافت کے مطابق وہاں کے خصوصی فن تعمیر کی مختصر تصویر بنائی گئی ہے..... اور ان کے گلی کوچوں میں اتنی کاملیت ہے کہ اگر آپ میکسیکو میں داخل ہو جاتے ہیں تو وہیں کے اسیر ہو جاتے ہیں..... اور جب باہر آنے لگتے ہیں تو آپ کو یقین ہوتا ہے کہ اب پاسپورٹ اور ویزا چیک ہو گا کیونکہ آپ امریکہ واپس آ رہے ہیں.

ناروے کے سرد اور قدیمی محلے..... آپ ایک کشتی میں سوار ہو کر سمندر کے تھپیڑوں کا سامنا کر سکتے ہیں.

امریکہ کے اندر میں جان بوجھ کر نہیں گیا کہ میں اگر ہوں ہی امریکہ میں تو امریکہ کے اندر امریکہ کی ہی نقل دیکھنا چہ معنی.....

اطالیہ میں وینس کے گنڈولے تیرتے ہیں اور ہوا میں انگوروں کی شراب کا خمار ہے.

جاپان جائیے تو وہاں اصلی سوشی کے ریستوران ہیں اور سینکڑوں برس قدیم بالشت بھر کے بون سائی شجر ہیں...

انگلستان میں وہی پتھر کی گلیاں اور شیکسپیئر کے زمانے کے گھر... سرخ پوسٹ بوکس' قدیمی شراب خانے اور بدمزہ فش اینڈ چپس جن کی بدمزگی کا مزا لینے کو میں ترسا ہوا تھا... یہاں کے ایک کوچے میں قدیم طرز کی ایک بگھی پر سوار کچھ انوکھے اداکار تھے جو اس اوپن ایئر تھیٹر میں پرفارم کر رہے تھے... ان میں ایک سیاہ فام اداکار تھا جو کنگ آرتھر کا کردار ادا کر رہا تھا' غضب کا فقرے باز تھا اور اس کے ہمراہ ایک نہایت دودھیلی مختصر قد کی ایک لڑکی تھی جو چہک رہی تھی... میں

بھی ان تماشائیوں میں شامل ہو گیا جو فٹ پاتھ پر بیٹھے ان کی پرفارمنس کو سراہ رہے تھے۔ ہر اداکار ذاتی طور پر آپ کے قریب آ کر براہ راست آپ سے مخاطب ہو کر مکالمے ادا کرتا تھا اور داد وصول کرتا تھا...اور یہ ایک پرلطف تجربہ تھا..

بیشتر سیاحوں کی مانند میرا پسندیدہ ملک بھی مراکو تھا..قدیم نیلی اینٹوں کی نقاشی' منقش دروازے اور محرابیں اور ان کے درمیان میں اندلسی طرز کا ایک دل ربا فوارہ ابلتا ہوا۔ میں نے ریستوران میں صرف جھانکا اور وہاں لوگ حقّے کے کش لگاتے ایک تھرکتی ہوئی رقاصہ کی ناف کو آنکھوں میں فوکس کرنے کی کوشش کر رہے تھے پر وہ کہاں ایک پل کے لیے ٹھہرتی تھی جو فوکس ہو جائے..اگرچہ میں ایک بردار مسلمان ملک کی بے مثال پذیرائی پر روحانی مسرت سے ازحد دوچار ہوا پر کچھ رنجیدہ بھی ہوا کہ یہاں عریانی اور فحاشی عروج پر تھی۔ ہمیں اس کا قلع قمع کرنے کے لیے پاکستان سے چند طالبان ادھر بھیجنے چاہئیں کہ اسلام نافذ کرنا ہمارا فرض بنتا ہے..

''ایپ کوٹ'' کی جھیل کنارے ان گیارہ نقل بہ مطابق اصل ملکوں میں سے کسی ایک میں آپ ایک ایسی شام گزار سکتے ہیں جس میں آپ کو شائبہ تک نہ ہوگا کہ آپ دراصل امریکہ میں ڈزنی لینڈ کے ایک شعبدہ گھر میں ہیں...صرف تھوڑا سا تخیّل اور تھوڑا سا خمار درکار ہے..

ڈزنی لینڈ والے ہر برس کوئی نہ کوئی حواس کو جھنجھوڑ دینے والا نیا شعبدہ متعارف کرواتے رہتے ہیں تاکہ جو یہاں درجنوں بار آ چکے ہیں وہ بھی احساس کمتری میں مبتلا ہو جائیں کہ ہائے ہائے ہم نے یہ والا شعبدہ تو دیکھا ہی نہیں..ان دنوں ''ایپ کوٹ'' کے ایک نئے شعبدے Soaring کی بڑی ہی دھوم تھی.. پورے آرلینڈو میں اس کے بل بورڈ نمایاں تھے..اخباروں میں مسلسل تذکرے چل رہے تھے کہ آپ اگر ''سورنگ'' یا ''بلند پروازی'' کے تجربے میں سے نہیں گزرے تو یونہی اس جہان سے گزرے..

چنانچہ ہم بھی گزرنے گئے..

ایک نیم تاریک ہال میں آپ کو ایک جھولا نما نشست پر بٹھا دیا جاتا ہے..یعنی آپ بیٹھتے ہیں تو آپ کے پاؤں زمین کو نہیں لگتے ذرا اوپر معلق رہتے ہیں..سامنے ایک بہت بڑی سکرین ہے جس پر کچھ منظر نمودار ہونے لگتے ہیں..یکدم مکمل تاریکی آپ کو لپیٹ میں لے لیتی ہے اور آپ اپنی نشست پر جھولتے ہوئے ہوا میں اٹھنے لگتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک گونجدار موسیقی

اور تیز ہواؤں کا شور آپ کو اپنے دوش پر بٹھائے مزید بلندی پر لے جاتا ہے اور اب آپ اڑنے لگے ہیں' پرواز کرنے لگتے ہیں..تیز ہوا کے تھپیڑے آپ کی آنکھوں اور چہرے پر برستے ہیں' بال بکھرنے لگتے ہیں..آپ آسمانوں پر ہیں اور آپ کے قدموں تلے سے صحرا' پر ہجوم شہر' سمندر' جنگل اور کھیت کھلیان تیزی سے گزرتے جا رہے ہیں..اگر صحرا گزر رہے ہیں تو ان کی زرد ریت اڑتی ہوئی آنکھوں تک آتی ہے..گرمی سے بدن جھلستا ہے اور پسینہ آنے لگتا ہے پھر ایک پر ہجوم شہر ہے اور آپ اس کی بلند ترین عمارت سے ٹکرانے لگتے ہیں اور بمشکل بچتے ہیں..سمندروں پر اڑان ہے تو واضح طور پر ایک نمکین نمی آپ کے نتھنوں میں محسوس ہونے لگتی ہے اور کوئی ایک لہر اتنی بلند ہوتی ہے کہ اُس کے چھینٹے آپ کے کپڑے بھگو دیتے ہیں..

نیچے مالٹے کے باغوں میں مزدور کام کر رہے ہیں اور وہ حیرت سے اوپر دیکھتے ہیں اور آپ کو ہاتھ ہلاتے ہیں اور ظاہر ہے آپ بھی جواب میں بے تحاشا ہاتھ ہلا رہے ہیں..مالٹوں کی زرد مہک کے ہلکورے آپ تک آ رہے ہیں پھر بہت نیچے فلوریڈا کا ایک گالف کورس ہے جہاں ایک صاحب بال کو ضرب لگاتے ہیں تو وہ پرواز کرتا ہوا آپ کی ناک کو آ لگتا ہے..اس اڑان کے دوران جھولتی ہوئی نشست پر براجمان آپ کے پاؤں فضا میں لٹک رہے ہیں..میری چپل کا ایک سٹریپ ذرا ڈھیلا تھا اور میں متفکر تھا کہ یہ کھل گیا تو چپل نیچے سمندر میں جا گرے گی اور میں بار بار اپنے پاؤں سمیٹتا کہ کہیں وہ اتر نہ جائے..بہت احتیاط کرتا رہا کہ یہ میری واحد چپل تھی..

بلند پائے کی نثر کی تنقیدی تعریف یہ ہے کہ وہ بے یقینی کو معلّق کر دیتی ہے..بے یقینی کو یقین میں بدل دیتی ہے..انکار کرنے کو جی چاہے تو بھی وہ انکار اس نثر کے سحر سے ایک عارضی اقرار میں بدل جاتا ہے..یعنی دماغ کی سوچنے اور پرکھنے کی صلاحیتیں کچھ لمحوں کے لیے موقوف ہو جاتی ہیں..یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ناول یا افسانہ ایک ذہنی اختراع ہے..اس کے کردار موسم اور واقعات اصل نہیں مصنف کے تصور کے شعبدے ہیں اور اس کے باوجود آپ یقین کر لیتے ہیں..ان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے..اگر نثر نگار کے قلم میں انکار کو اقرار میں بدل دینے کی قوت ہے..

ڈزنی لینڈ کے کھیل تماشے بھی یہی کچھ ہیں..

ان کی تکنیکی مہارت ایسی بے مثل ہوتی ہے کہ وہ بے یقینی کو ایک عارضی یقین میں بدلتی

چلی جاتی ہے..

آپ لاکھ انکار کرتے چلے جائیں کہ یہ نہیں ہو سکتا.. یہ نہیں ہو سکتا اور وہ اسے ایک ایسے اقرار میں بدلنے پر قادر ہے جو مسلسل پکارتا ہے کہ.. یہ ہے.. یہ ہے..

بے یقینی کو ایک عارضی سکتے میں لے جانے والا سب سے مؤثر شعبدہ.. جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا.. مجھ پر ایسا اثر انداز ہوا کہ میں شام سے پہلے ایک مرتبہ پھر اس تجربے میں سے گزرنے کی خاطر قطار میں کھڑا ہو گیا.. اور یہ ''مشن ٹو مارس'' تھا.. مریخ کی جانب ایک خلائی سفر تھا.. ایک ایسا سفر جسے بیان کرنا ممکن نہیں کہ اس میں صرف بدن کی حساسیت اور دماغ کی موقوفی کا عمل دخل ہے..

اس ''رائڈ'' میں جانے کے لیے ایک مدت انتظار کرنا پڑتا ہے کہ زمین کے سارے باسی مریخ پر قدم رکھنا چاہتے ہیں..

آپ ایک سُرنگ نما راستے میں چلتے جا رہے ہیں اور آپ کے آس پاس کائناتیں گردش میں ہیں.. موسیقی کی گونج ہے.. آوازیں اور دھماکے ہیں.. چاند پر پہلا قدم رکھنے والا خلاباز گفتگو کر رہا ہے.. خلائی شٹل میں سوار ہونے والوں کو تربیت دی جا رہی ہے.. ہالی ووڈ کا ایک مشہور اداکار آپ کو اس مشن کے لیے ہدایات دے رہا ہے..

ماحول اتنا خلائی اور گمبھیر ہے کہ آپ اس کی زد میں آ کر سنجیدہ ہو جاتے ہیں کہ یہ کوئی ڈرامے بازی نہیں ہے' کچھ نہ کچھ ہونے کو ہے..

بار بار ایک اعلان اس سرنگ نما راستے میں گونج رہا ہے خبردار کر رہا ہے کہ اگر آپ کمزور دل کے ہیں' ہیجان برداشت کرنے کے اہل نہیں ہیں.. دل کے عارضے میں مبتلا ہیں یا بند اور مقفل جگہوں میں بند ہو جانے سے گھبراتے ہیں یا آپ حاملہ ہیں تو اس مشن پر جانے سے گریز کیجیے.. یہیں سے واپس چلے جائیے.. کسی بھی حادثے کی صورت میں انتظامیہ ذمہ دار نہیں ہو گی.. اور میں دل ہی دل میں حساب کتاب کرتا چلا جا رہا ہوں کہ اگر میرا دل ہر شے پر آ جاتا ہے.. فیئری میڈو کے ایک پھول' سنو لیک کی ایک تتلی یا وکٹوریہ کے ایک آبی پرندے پر آ جاتا ہے تو یہ اتنا کمزور نہیں.. میں اگر ایک متعصب' تنگ نظر اور دستور شکن معاشرے میں ابھی تک زندہ ہوں تو میں ہیجان برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں.. البتہ بند کمروں کے اندر مجھے وحشت ہوتی ہے لیکن

میں حاملہ تو ہرگز نہیں ہوں تو میں مریخ پر قدم رکھ سکتا ہوں..

ایک پلیٹ فارم پر کھڑے آپ اس گاڑی کے منتظر ہیں اور آپ اس وقت کیپ کنیورل کے خلائی مرکز کے اندر منتظر ہیں.. گاڑی میں دیگر خلابازوں کے ہمراہ سوار ہو کر تھوڑی دیر کے بعد آپ وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں مریخ کی جانب فائر کیا جانے والا راکٹ آپ کا منتظر ہے.. ایک تنگ برآمدہ ہے.. ہدایات جاری ہیں.. فرش پر آپ کے کھڑے ہونے کا مقام متعین ہے.. ہر خلائی ٹیم میں تین خلابازوں کا عملہ ہے.. خلائی جہاز کا انجینئر.. راستہ متعین کرنے والا نیوی گیٹر اور شٹل کمانڈر..

آپ اپنی اپنی جگہ نہایت مؤدب اور ڈرے ڈرے کھڑے ہو جاتے ہیں.. اس یقین کامل کے ساتھ کہ آپ واقعی مریخ پر جا رہے ہیں..

بار بار تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ اگر آپ کمزور دل ہیں.. آپ کا بلڈ پریشر شوٹ کر جاتا ہے.. بند جگہوں پر قید نہیں ہو سکتے تو اب بھی وقت ہے.. یہ وہ مرحلہ ہے جب ایک آدھ سیاح حوصلہ ہار جاتا ہے اور مسکراتا ہوا بیک آؤٹ کر جاتا ہے..

آپ کے سامنے کھٹاک سے ایک آہنی دروازہ وا ہو جاتا ہے.. آپ باری باری اندر جاتے ہیں اور وہاں وہ سپیس شٹل ہے جس میں آپ کو سوار ہو کر مریخ تک کا سفر کرنا ہے.. آپ اس میں داخل ہو کر متعین کردہ نشستوں پر براجمان ہو جاتے ہیں..

میں شٹل کمانڈر کے عہدے پر تعینات ہوں..

جب سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں تو شٹل کے دروازے ایک دھماکے سے بند ہو جاتے ہیں.. آپ کی نشست پیچھے چلی جاتی ہے اور ایک کمپیوٹر سکرین ڈیش بورڈ سے الگ ہو کر آپ کے سینے کے ساتھ آ لگتی ہے..

یہاں کچھ وحشت ہوتی ہے کیونکہ آپ ایک آہنی اور تنگ جگہ میں قید ہو چکے ہیں..

یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے..

کمپیوٹر کی سکرین پر ایک دیو قامت راکٹ شعلے اگل رہا ہے ارآپ کی شٹل اس کے اندر نصب ہے.. کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو جاتا ہے.. دس' نو' آٹھ.. اور زیرو تو ایک دھماکہ ہوتا ہے.. زلزلہ آ جاتا ہے شٹل لرزنے لگتی ہے.. آپ کی نگاہیں سکرین پر ہیں اور پھر وہ راکٹ ایک ہولناک

گرج کے ساتھ زمین کا ساتھ چھوڑتا ہے تو آپ کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں کہ یہ میں نے کیا کیا.. کیسی حماقت کرڈالی..اچھا بھلا بائیس جے..گلبرگ نمبر تین نزد فردوس مارکیٹ لاہور میں اپنے بال بچوں سمیت آسودہ اور مطمئن زندگی گزارتا تھا..یہ ''پنگھا'' کیوں لے لیا..

راکٹ کے ہمراہ یہ خلائی شٹل بھی اوپر اٹھنے لگتی ہے..ہم زمین سے دور ہو رہے ہیں.. ایک اور دھچکا لگتا ہے اور شٹل راکٹ سے جدا ہو کر خود مختار ہو جاتی ہے..اب تو آپ بالکل ہی لاچار اور بے بس ہو گئے ہیں..

آپ کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا جاتا..مسلسل ہدایات دی جا رہی ہیں..آسمانوں کی نیلاہٹ میں شٹل بے آواز تیرتی چلی جا رہی ہے..

اعلان ہو رہا ہے کہ شٹل کمانڈر..فوری طور پر اپنے سامنے جو سرخ بٹن ہے اسے دبائیں تا کہ ایک اور راکٹ فائر ہو اور آپ زمین کے مدار سے نکل جائیں..

اور شٹل کمانڈر چونکہ تارڑ صاحب ہیں اس لیے وہ گھبرا کر فوراً سرخ بٹن دبا دیتے ہیں اور راکٹ فائر ہونے کا دھماکہ اور دھچکا انہیں دہلا دیتا ہے..آپ زمین کی کشش سے باہر نکل جاتے ہیں..زمین دور ہوتی دکھائی دے رہی ہے..

اور ہاں..اب آپ خلاء میں ہیں اس لیے آپ پر جی فورس اثر انداز ہو رہی ہے..میں نے محسوس کیا کہ میں ہاتھ اٹھانا چاہتا ہوں تو وہ بہت ہولے سے اٹھتا ہے..بے وزنی کی ایک کیفیت ہے..نظر بھی قدرے دھندلا رہی ہے..مسکراتا ہوں تو دیر تک ہولے ہولے لب کھلتے چلے جاتے ہیں..عجیب بے وزن خلائی کیفیت ہے..میں اپنی ہتھیلی کو آنکھوں کے قریب لانا چاہتا ہوں تو وہ آتی ہی نہیں..آتی ہے تو سلو موشن میں آتی ہے..

یکدم ایمرجنسی ڈیکلیئر ہو جاتی ہے..نیچے زمین سے کیپ کنیورل سے وارننگ دی جا رہی ہے کہ آپ چاند کی سطح سے ٹکرا جانے والے ہیں فوری طور پر فلاں بٹن دبا کر راکٹ فائر کیجیے..آپ سراسیمہ ہو کر فوراً وہ بٹن دباتے ہیں..آپ کی خلائی شٹل ایک اور دھچکے کے ساتھ اپنا راستہ بدلتی ہے..چاند کی سطح کو چھوتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے..میں نے آج تک چاند کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا..

یہ وہی چاند تھا جسے ہمارے درجنوں جید علماء کرام تلاش کرتے رہتے تھے اور یہ نہیں ملتا

تھا..اور یہ وہی چاند تھا جس کے گیت ہم بچپن میں گاتے تھے اور بے وجہ اداس ہوتے تھے..نہ یہ چاند ہو گا نہ یہ تارے رہیں گے مگر ہم ہمیشہ تمہارے رہیں گے وغیرہ..

چاند سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ایک سیارہ قریب آتا چلا جا رہا ہے جو کہ مریخ ہے اور بالآخر مریخ کی سرخ سرزمین اور چٹانیں تیزی سے قریب آنے لگتی ہیں..اور آپ انہیں اپنے سامنے آویزاں کمپیوٹر سکرین پر قریب آتا دیکھ رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہدایت کی جاتی ہے کہ مریخ پر اترنے کے لیے فلاں بٹن دبا کر دو راکٹ فائر کیجیے جو آپ فائر کرتے ہیں تو آپ کی خلائی شٹل دھیرے دھیرے مریخ کی سطح پر اتر جاتی ہے..ابھی آپ اپنا پُرجوش سانس درست کر رہے ہوتے ہیں کہ شٹل کے پاؤں تلے جو سرخ مٹی ہے وہ سرکنے لگتی ہے..ریزہ ریزہ ہو کر بہت گہرائی میں گرتی جاتی ہے..شٹل دھچکے کھا رہی ہے اور یکدم آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ کی شٹل ایک ایسے کنارے پر معلق ہے جس کے نیچے اتھاہ گہرائیاں ہیں اور یہ کنارہ ہولے ہولے بھُرتا جا رہا ہے..بھُرنے والی مٹی ایک عمیق گہرائی میں گر رہی ہے اور آپ کی شٹل بھی بس اگلے لمحے لڑھک کر نیچے جانے والی ہے..یہ ایسے ہولناک لمحے تھے کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آ ٹھہرا کہ بس اب تو گئے کہ گئے..آپ لاکھ انکار کریں کہ یہ شعبدہ ہے لیکن حلق میں دھڑکتا دل دوہائی دیتا ہے کہ نہیں تمہارے ساتھ ایسا ہونے والا ہے..اگر مرنا نہیں چاہتے تو کچھ کرلو..اب انسان کیا کرے وہ ایک آہنی کیپسول میں مقفل ہے' کھائی میں گرتی چٹانوں کی ہولناک گونج ہے..چھاتی کے عین آگے سکرین ہے جس پر اپنی شٹل کو ایک کنارے پر معلق دیکھ رہے ہیں اور وہ گرا ہی چاہتی ہے..موسیقی بھی موت کی آمد کے اعلان پر سوگواری سے دہلا رہی ہے..انکار کے باوجود اقرار کی کیفیت ہے کہ تارڑ صاحب آپ بے شک آج تک خوش نصیب رہے ہیں' مرگ صفت برف زاروں اور بلندیوں اور وحشی دریاؤں سے بچ نکلے ہیں پر آج آپ کا نصیب ساتھ چھوڑنے کو ہے..آپ تو دنیا کو لوٹنے والے نہیں یہیں مریخ کی سرخ سرزمین میں جاں بحق ہو کر دفن ہو جانے کو ہیں..

اور کوئی بھی شخص..اول تو مرنا ہی نہیں چاہتا..اور اگر بے بس اور لاچار ہو جائے تو بھی اس کا دل یہ نہیں چاہتا کہ مکہ یا مدینہ میں مر جائے..وہ وطن واپس آ کر وہاں مر کر اپنے بزرگوں کی اپنے قبروں کے برابر میں اپنی مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہے..

چہ جائکہ مریخ پر جا مرے..

اس کی سرخ مٹی میں دفن ہو جائے..اور وہ بھی کفن کے بغیر..

یہ تو وہ ہرگز نہیں چاہتا..

اس لیے بھی نہیں چاہتا کہ اس کے عزیز اور دوست اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے بھلا مریخ پر کیسے پہنچیں گے..

وہ اُس سے اتنی بے پناہ محبت تو نہیں کرتے کہ صرف فاتحہ پڑھنے کے لیے مریخ تک کا سفر اختیار کریں اور ایک خلائی شٹل کرائے پر حاصل کر کے وہاں تک پہنچیں اور اس کا کرایہ بھی تو بہت ہو گا..

اس لیے میری مقدور بھر کوشش تھی' دعائیں کر رہا تھا کہ یا اللہ مجھے اس شٹل کے ساتھ اس گہرائی میں گرنے سے بچا لے آئندہ میری توبہ جو مریخ کی طرف آؤں..

یہ کیفیت بے یقینی کو یقین میں بدل دینے کی انتہا تھی..

اور جب زمین پر واپسی ہوئی..واپسی کا کیا مطلب کہیں گئے ہی نہیں تھے اسی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے اور اس کے باوجود میں نے رب کا شکر ادا کیا کہ میں خیریت سے واپس آ گیا ہوں ورنہ مجھے یقین تھا کہ میری سرخ قبر وہیں بنے گی اور اخباروں میں خبر شائع ہو گی کہ تارڑ صاحب کیسے احمق آوارہ گرد ہوا کرتے تھے' موصوف سفرنامہ لکھنے کے چاؤ میں مریخ تک چلے گئے اور وہیں مر گئے..ان کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے..

ڈزنی لینڈ کے رولر کوسٹر بھی اپنی خطرناکی اور ہولناکی میں لاجواب ہیں..

آسمانوں تک جاتے..پٹڑیوں پر لُڑھکتے پر اشتیاق اور خوفزدہ سیاحوں سے بھرے ڈبے جو ہولے ہولے بلندی کی جانب جاتے ہیں اور پھر ایک آفت کی مانند نہایت تیز رفتار سے گرنے لگتے ہیں اور سیاح اکثر چیخیں بلند کر کے اور کبھی دھاڑیں مار کر روتے ہوئے اپنی خوفزدہ مسرت کا اظہار کرتے ہیں..

بے شک یہ ایک عظیم اور لاثانی تجربہ ہو گا لیکن یہ طے تھا کہ میں زندگی بھر کسی رولر کوسٹر میں سوار نہیں ہوں گا کہ چاچا عظمت مجھے خبردار کر چکا تھا..

چاچا عظمت ایک جاٹ ہونے کی حیثیت میں قریباً میرا رشتے دار جس کے 14..یار برا

سٹریٹ مانچسٹر والے گھر میں میں نے کچھ روز بسر کئے تھے اور اس دلچسپ تجربے کی بنیاد پر ناول ''دیس ہوئے پردیس'' لکھا تھا..تو یہی چاچا عظمت ایک روز نہایت دہشت زدہ کیفیت میں لرزہ براندام گھر آتا ہے اور مجھ سے ہکلاتے ہوئے کہتا ہے ''مستنصر تم کبھی کسی رولر کوسٹر میں بیٹھے ہو؟''

''نہیں چاچا جی..''

''تو پھر بیٹھنا بھی نہیں پتر..''

اس کے بعد پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے یہ بیان دیا ''مستنصر میں تو نہ بیٹھتا تھا پر دوستوں کے کہنے سننے میں آ گیا اور مجبوراً بیٹھ گیا....پتر اب جو ریل گاڑی کا وہ ڈبہ چلا ہے کھڑ کھڑ کرتا اور پھر جو اونچا ہو کر یکدم گرا ہے اور پھر ٹیڑھا ہو کر لڑھکنے لگا ہے اور پھر لڑھکتا ہی چلا گیا ہے آندھی سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے..پھر ذرا ہولے ہوا ہے تو اگلے لمحے پھر سے وہی اللہ دے اور بندہ لے..ہمہ وقت یہی خیال دامنگیر رہا کہ چوہدری عظمت اللہ وڑائچ تم نے آج یقیناً یہاں جاں بحق ہو جانا ہے اور جب پاکستان میں ضلع گجرات کے گاؤں ہریئے والے میں تمہاری موت کی خبر پہنچے گی تو برادری کیا کہے گی کہ چوہدری عظمت یُو کے میں موج میلہ کرتا....کسی رولر کوسٹر میں سوار بچوں کی مانند جھولے لیتا دل کے تھم جانے سے انتقال کر گیا ہے تو جاٹوں کی کیا عزت رہ جائے گی....تم بھی جاٹ ہو، میرا مشورہ ہے کہ کبھی کسی رولر کوسٹر پر نہ بیٹھنا میں جانے کیسے جان بچا کر آ گیا ہوں..''

تو میں نے چاچے عظمت کا یہ مشورہ پلّے باندھ رکھا تھا....جاٹوں کی عزت کا معاملہ تھا....چاہے رولر کوسٹر ڈزنی لینڈ کا ہی کیوں نہ ہو....میں نے نہیں بیٹھنا تھا..

کاش کے چاچا عظمت کبھی ''مشن ٹو مارس'' والی شٹل میں بھی بیٹھا ہوتا اور مجھے خبردار کر دیتا کیونکہ وہاں تو جاٹوں کی عزت مٹی میں مل گئی تھی اور وہ بھی مریخ کی سرخ مٹی میں..

''ایپ کوٹ'' میں سارے کھیل تماشے موت کے منظر اور دل کو روک دینے والے ہی نہیں ہیں بلکہ دل کو اپنی گرفت میں لے کر مسرت سے مسخر کر لینے والے بھی ہیں اور ان میں سے ایک باتونی اور مسخرے کرش نامی کچھوے سے ملاقات ہے..

ایک ایسا کچھوا جس کی ادائیں آپ کا دل موہ لیتی ہیں اور آپ اس کی محبت میں مبتلا ہو

جاتے ہیں..

یہ کچھوا بھی ایک تھیٹر کے اندر ایک بہت وسیع سکرین پر زیرِ آب تیرتا پھرتا ہے.. بہت سے لوگوں نے اس کچھوے کی سفارش کی تھی اور میں چونکہ اپنے آپ کو دانشور سمجھتا تھا اس لئے ایک معمولی کچھوے کو دیکھنا اپنی ہتک سمجھتا تھا اور پھر بتایا گیا کہ وہ بھی دانشور ہے تو میں صرف اس لئے ملاقات کو چلا گیا..

تھیٹر میں داخل ہوتے ہی میں نے نوٹ کیا کہ بہت سارے تماشائی خاص طور پر بچے نشستوں پر براجمان ہونے کی بجائے سکرین کے عین آگے فرش پر بیٹھنے کو ترجیح دیتے ہیں.... یہ بعد میں کھلا کہ وہاں بیٹھنے میں کیا مصلحت تھی..

روشنیاں گُل ہو جاتی ہیں اور شو کا آغاز ہو جاتا ہے.. سکرین پر کرش نامی کچھوا سمندر کی تہہ میں تیرتا پھرتا ہے.. نازک اندام مچھلیوں سے فلرٹ کر رہا ہے.. بڑی مچھلیوں کی چاپلوسی کر رہا ہے.. گیت گا رہا ہے.. ایک حسین کچھوی کا پیچھا کرتا ہے اسے پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کرتا ہے.. اس کا بوسہ لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک تھپڑ کھاتا ہے اور پھر گیت گانے لگتا ہے..

غرض کہ اپنی حیات سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا ہے..

کچھ دیر بعد کرش اس لطف اندوزی سے فارغ ہو کر تماشائیوں سے مخاطب ہو کر باتیں کرنے لگتا ہے.. لطیفے سناتا ہے اور پھر ہمارے کچھ لطیفہ باز ادیبوں کی مانند خود ہی قہقہے لگاتا بے حال ہوتا ہے.. یہاں تک تو صورتِ حال سمجھ میں آتی تھی لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میری سمجھ سے باہر ہے.. میڈیا سے وابستگی کے باوجود.... کیمرے کی چالبازیوں اور تکنیکی چکر بازیوں سے آگاہ ہونے کے باوجود اور تمام عرصہ کھوج میں رہنے کے باوجود میں یہ نہ جان سکا کہ وہ کون سا ایسا تکنیکی کمال تھا جس کی بدولت وہ کمبخت کچھوا نہ صرف تماشائیوں کو سچ مچ دیکھ رہا تھا بلکہ ہر فرد سے مخاطب ہو کر اس پر فقرے چست کر رہا تھا..

بقول سلجوق.... گورے کمال کرتے ہیں..

اور کمال یہ ہے کہ کرش کچھوا سکرین کے آگے فرش پر براجمان ایک موٹے امریکی پر اڈا چلا آتا ہے اور گردن لمبی کر کے کہتا ہے "یار تم تو بہت موٹے ہو.... اپنی شرٹ کا اوپر والا بٹن تو بند کر کے دکھاؤ.."

وہ شخص چونک جاتا ہے ادھر ادھر نگاہ کرتا ہے تو کچھوا سرزنش کرتا ہے "اوئے اِدھر اُدھر کیا دیکھ رہے ہو، میں تم سے مخاطب ہوں موٹے.."

اور موٹا ذرا پشیمان ہو کر پہلے تو اپنی شرٹ کا بٹن بند کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ بند نہیں ہوتا تو خجالت سے مسکرانے لگتا ہے اور تب کچھوا کہتا ہے "اب مسکرا رہے ہو.. لیکن ذرا یہ تو بتاؤ کہ تمہاری بیوی تمہارا وزن کیسے برداشت کرتی ہے.. روڈ رولر کے بچے.."

اس فقرے پر تھیئٹر میں بیٹھے تماشائی لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں اور وہ موٹے صاحب بھی صورتِ حال سے لطف اندوز ہوتے موڈ میں آ جاتے ہیں "پہلے تم بتاؤ کہ تمہاری کچھوی کس حال میں ہے.."

"وہ تمہاری بیوی سے بہتر حال میں ہے کیونکہ میں اتنا موٹا نہیں ہوں.... یوں بھی ہم کچھوے لوگ پانی میں تیرتے تیرتے سب کچھ کر لیتے ہیں تمہاری طرح بستروں کے محتاج نہیں ہوتے.."

موٹے امریکی کو خوب بے عزّت کر کے کرش ایک خاتون کی جانب رجوع کرتا ہے اور وہ اگلی نشستوں پر براجمان ہنستی جا رہی ہے.. اسے بہت غور سے تکتے ہوئے گردن نکال کر کہتا ہے "ہے لیڈی.... میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم.... بہت ہی پیاری ہو.... ہائے ہائے میں کیا کروں کیونکہ میں کچھوا ہوں.... اگر تم اگلے جنم میں ایک کچھوی ہو جاؤ تو میں شرط لگاتا ہوں کہ میں تم سے شادی کر لوں گا.."

وہ خاتون قہقہے لگاتی کھلے دل سے اس کھیل میں شریک ہو جاتی ہے.. "تم اسی جنم میں مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے.."

"میں نہیں کر سکتا.." کچھوا اپنے آنسو پونچھتا ہے..

"لیکن کیوں نہیں.... کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟"

"میں تو تمہارے لئے مرا جا رہا ہوں ڈارلنگ.... لیکن شادی کرنے سے ایک مسئلہ ہو جائے گا"

"وہ کیا؟"

"بچوں کا مسئلہ ہو جائے گا.... کسی بچّے کی گردن اگر میری طرح لمبی ہو گئی اور اُس کے

آ گئے تمہارا چہرہ لگ گیا تو اس بچّے کا نام رکھنا مشکل ہو جائے گا.. یوں بھی تم میرے ساتھ زیرِ آب کیسے تیرتی پھرو گی.... ہم تو یہاں کپڑے بھی نہیں پہنتے اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم کچھوی ہونے کا انتظار کرو۔"

"یا تم انسان ہو جانے کا انتظار کرو" وہ خاتون ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی ہے اور اس کے برابر میں بیٹھا ہوا اس کا خاوند تو لوٹ پوٹ ہو کر نشست سے گرنے کو ہے..

"میں بے شک ایک کچھوا ہوں لیکن ایک بے وقوف نہیں ہوں جو اگلے جنم میں انسان ہو جانے کی تمنا کروں.... انسان ہو جاؤں تو سنٹرل ریونیو والے میری جان عذاب میں ڈال دیں اور جو کماؤں وہ سب ٹیکس میں لے جائیں.... باس کی خوشامد کرتا رہوں.... الیکشن میں ووٹ ڈالتا رہوں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اگر بیوی کو طلاق دے دوں تو وہ دعویٰ کر کے ساری عمر کے لیے مجھے غلام بنا دے.. میں کماتا رہوں اور وہ کھاتی رہے بلکہ اپنے بوائے فرینڈ کو بھی کھلاتی رہے.. ہم کچھوے نہ شادی کرتے ہیں نہ طلاق دیتے ہیں اس لئے خوش رہتے ہیں.. تمہیں کیا پتہ کہ ایک کچھوا ہونے میں کتنے مزے ہیں.."

"مثلاً کون سے مزے؟"

"جب کچھوی ہو کر میرے پاس آؤ گی ناں تب بتاؤں گا کہ کون سے مزے.."

کرش کچھوے نے متعدد تماشائیوں کے ساتھ اس قسم کی چُہلیں کیں، اُن پر پھبتیاں کسیں اور اس دوران مجھے خدشہ بھی رہا اور خواہش بھی.... کہ کہیں یہ میرا پول نہ کھول دے یا کاش کہ کھول دے کہ.... اوئے خود ساختہ دانشور اور جعلی ادیب تم اس ڈھلتی عمر میں کس کی تمنا کس کی آرزو کرتے ہو.... تمہیں حسبِ آرزو کچھ نہیں ملنے کا.... کیونکہ آرزوؤں کے لیے بھی ایک خاص عمر ہوتی ہے جو گزر چکی ہے.. بس حرص باقی رہ جاتی ہے یا قبر ایک ماں کی مانند تمہاری منتظر رہتی ہے..

صد شکر کہ کرش نے میرا لحاظ کیا.... لیکن اس کے ساتھ یہ قلق بھی کہ اگر میرا پول کھول دیتا ان سینکڑوں لوگوں کے سامنے تو شاید میں ہوش میں آ جاتا اور آرزو کرنے سے باز آ جاتا..

کرش کچھوا بالغ خواتین و حضرات سے گپ شپ لگا کر منتظر بچوں کی جانب راغب ہو گیا.... وہ ہر بچّے سے مخاطب ہو کر اس کا نام پوچھتا تھا اور پھر اسے اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے نہ صرف اس کی ٹی شرٹ کے رنگ اور نیکر کے بارے میں کومنٹ دیتا تھا بلکہ کچھ مشورے بھی

دیتا تھا.... اس مکالمے کا سب سے دلچسپ حصّہ وہ تھا جب بچّے جوش میں آ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور نہایت معصومیت سے طرح طرح کے سوال کرنے لگتے تھے اور وہ ان سوالوں کے جواب آنکھیں مٹکاتا نہایت بھولپن اور دوستی سے دیتا تھا..

"کرش.... تمہاری عمر کیا ہے؟"

"ہاہا.... لٹل گرل ایک کچھوے سے اس کی عمر نہیں پوچھا کرتے.. وہ دس برس کا بھی ہو سکتا ہے اور دو سو برس کا بھی.... تمہارا کیا خیال ہے کہ میری عمر کتنی ہے؟"

لٹل گرل شور مچا دیتی ہے "سو برس.... سو برس.."

"میں لگتا سو برس کا ہوں.... لیکن دراصل ہوں میں دو سو برس کا.. آپ جانتی ہو کہ کیوں؟"

"کیوں کرش؟"

"اس لئے کہ میں سگریٹ بہت پیتا ہوں.."

"کرش تم تو سمندر میں رہتے ہو تو سگریٹ کیسے سلگاتے ہو؟"

"بچّے میں ہمہ وقت تو سمندر میں نہیں رہتا.... ساحل پر جا کر ریت پر رینگنے کی ورزش کرتا ہوں اور اس دوران سگریٹ پیتا ہوں.."

"سگریٹ پینا بری بات ہے میرے ڈیڈ کہتے ہیں.."

"لیکن وہ شراب تو پیتے ہیں ناں؟"

"ہاں کبھی کبھار.."

"لیکن میں تو کبھی کبھار بھی شراب نہیں پیتا، جانتے ہو کیوں؟"

"کیوں؟ کیوں؟" بہت سارے بچّے شور مچاتے ہیں..

"اس لئے کہ میں شراب پی کر نشے میں آ جاؤں تو سمندر میں ڈوب جاؤں.."

"آپ تو کچھوے ہو.. ڈوب کیسے سکتے ہو.."

"کچھوا شراب پی لے تو وہ تیرنا بھول جاتا ہے اس لئے ڈوب سکتا ہے."

ایک اور چھوٹا سا بچہ بہت شور مچا رہا ہے کہ کرش پلیز میری بات سنو..

کرش تیرتا ہوا اُس کے قریب ہو جاتا ہے "ہاں کڈ.."

"کرش آپ کھاتے کیا ہو؟"

''اوہ میری خوراک.....میں کبھی کبھار اپنے ہی انڈے فرائی کر کے کھاتا ہوں تو بڑا مزا آتا ہے..''

''تمہارے بچے ہیں؟''

''ہاں..''

''کتنے؟''

''ہم کچھوے اپنے بچوں کا حساب نہیں رکھتے بلکہ ہمارے بچے حساب رکھتے ہیں کہ ہمارے ڈیڈی کون سے ہیں..''

''کرش..'' ایک بہت پیاری پونی ٹیل والی بچی سکرین ساتھ قریباً ناک لگا کر کہتی ہے ''کیا تم میرے ساتھ گھر چل سکتے ہو..پلیز کرش..''

اور کرش کچھوا ذرا اُداس ہو کر آنکھیں جھپکتا ہے ''سویٹ ہارٹ تمہارا گھر بہت دور ہے..میں ابھی رینگنا شروع کروں تو وہاں اگلی صدی تک پہنچوں گا اس لئے سوری..بچو مجھے واش روم جانے کی حاجت ہو رہی ہے اس لئے تم سے رخصت چاہتا ہوں..''

''نہیں نہیں'' تمام بچے احتجاج کر رہے ہیں ''پلیز نہیں جاؤ..ادھر ہی کچھ کر لو..''

''تم چاہتے ہو کہ ادھر ہی کچھ کر کے اس صاف شفاف سمندر کو آلودہ کر دوں..کیا تم یہ چاہو گے؟''

بچے اداس ہو جاتے ہیں ''ٹھیک ہے کرش..تم واش روم جاؤ..خدا حافظ..''

تمام بچے نہایت آبدیدہ ہو کر کرش کی جانب ہاتھ ہلاتے ہیں اور وہ ایک کچھوا آنسو پونچھتا ہوا سمندر میں گم ہو جاتا ہے..

یقین جانئے مجھے بھی کرش سے جدا ہو جانے پر بہت دُکھ ہوا..وہ بیشتر انسانوں سے بہتر رفاقت تھا..کھرا اور پیارا کچھوا!



''جانوروں کی سلطنت''

اگر میں یہ اقرار کروں اور اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ مجھے بچپن سے ہی انسانوں کی نسبت جانوروں اور پرندوں وغیرہ سے زیادہ دلچسپی رہی ہے تو اس کا سبب مردم بیزاری ہرگز نہیں بلکہ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ میں خود ایک کامل انسان نہیں ہوں..مجھ میں کوئی کمی رہ گئی ہے کہ میں انسان سے زیادہ ایک جانور یا پرندہ محسوس کرتا ہوں..ایک ایسا پرندہ جو کسی ایک مقام پر گھونسلا نہیں بناتا، کسی ایک ڈالی پر نہیں بیٹھتا..کبھی میں فریدالدین عطار کے پرندوں میں شامل ہو کر غُل کرنے لگتا ہوں اور کبھی آبی پرندہ لونگ سٹون ہو کر سرحدوں کے پار جانا چاہتا ہوں..

میرے کالموں کے مجموعوں کے نام بھی جانوروں سے میرے لگاؤ کی عکاسی کرتے ہیں..''اُلو ہمارے بھائی ہیں''..''شُتر مرغ ریاست''''گدھے ہمارے بھائی ہیں''..اگلے مجموعے کے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا نام ''دریائی گھوڑے ہمارے بھائی ہیں'' رکھوں یا ''لومڑ ہمارے بزرگ ہیں'' بہتر رہے گا..ویسے تو میرے ایک سفرنامے کا نام ''سُنہری اُلو کا شہر'' بھی ہے۔

میرے ذہن میں گاؤں کی وہ تپتی دوپہر نقش ہے جب میں نے پھتو شیخ کی تیار کردہ لچکیلے ربڑ والی غلیل سے کیکر کے درخت میں سہمی ہوئی ایک چڑیا کو مار گرایا تھا اور جب وہ پھڑ پھڑاتی تڑپتی میرے قدموں میں آ گری تو اس کا ننھا سا بھیجہ پاش پاش ہو چکا تھا اور وہ جاں کنی کی حالت میں آنکھیں جھپکتی تھی..میں آج تک اس کی تڑپ اور مردہ ہوتی آنکھوں اور خون آلود بھیجے کو نہیں بھولا..وہ ایک مدت تک میرے خوابوں میں آ کر تڑپتی جاتی تھی اور اس کی جان نہیں نکلتی تھی..تب میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی کسی جانور یا پرندے کو ہلاک نہیں کروں گا..

بے شک اس میں بے شمار ثواب ہے لیکن میں نے آج تک قربانی کے بکرے کی گردن پر بھی چھری نہیں رکھی..

پچھلے دنوں ایک متمول پاکستانی شکاری نے ایک زرکثیر خرچ کے قازقستان جا کر ''ٹرافی ہنٹ'' سکیم کے تحت شکار کھیلا..

یہ سکیم جنگلی حیات کو محفوظ کرنے کے لیے ایک انوکھا تجربہ ہے جو کسی حد تک کامیاب ہو رہا ہے.. یعنی بے دریغ غیر قانونی شکار کی بجائے کسی بھی علاقے میں پائے جانے والے جنگلی جانوروں میں سے دس بیس کو قانونی طور پر شکار کرنے کی اجازت دے دی جائے اور اس اجازت نامے کی فیس اتنی زیادہ ہو کہ مقامی آبادی کے رزق کا بندوبست ہو جائے تا کہ وہ لوگ جنگلی حیات کو ایک سرمایہ سمجھ کر خود اس کی حفاظت کریں..اور شکار کئے جانے والے جانوروں کی تعداد اتنی کم ہو کہ وہ ان کی نسل کی بڑھنے پر اثر انداز نہ ہو.. چنانچہ ان دنوں افریقہ اور سنٹرل ایشیا میں یہی طریقۂ شکار رائج ہے اور صرف انتہائی دولت مند افراد ہی شکار کا شوق پورا کر سکتے ہیں.. یعنی ایک ہاتھی کو مارنے کی فیس اتنی ہے کہ آپ اس رقم سے ایک زندہ ہاتھی بھی خرید سکتے ہیں..تو اس پاکستانی شکاری نے اس سکیم کے تحت قازقستان جا کر نہ صرف ایک مارکوپولو شیپ کو ہلاک کیا بلکہ اس کے مردہ بدن کے ساتھ بیٹھ کر ایک پر تکبر تصویر اتروا کر اخباروں میں بھی چھپوائی..اس تصویر نے بہت روز مجھے سونے نہ دیا..

اُس ہلاک شدہ مارکوپولو شیپ کے سینگ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتنے پر پیچ اور شاہانہ تھے ایسے کہ نیلے آسمان میں چھید کرتے تھے..میں نے ایسا پرشکوہ جانور کبھی نہ دیکھا تھا..آپ یونانی دیومالا کے کردار اوڈیسیس سے خوب واقف ہوں گے جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کے.. جادوگرنیوں کے سحر سے فرار ہوتا..یک چشم سائیکلوپ دیو کے شکنجے سے بچتا سات سمندر پار صرف اس لئے چلا جارہا تھا تا کہ سنہری کھال حاصل کر سکے..صرف ایک سنہری کھال..میں کچھ مبالغہ نہیں کرتا کہ اس مارکوپولو شیپ کے سینگ اتنے شاندار اور سحر انگیز تھے کہ اگر وہ جانور قدیم بابل میں ہوتا..فرعونوں کے مصر میں ہوتا تو ایک خدا ہوتا..اس کی پرستش کی جاتی..اور اگر میں اوڈیسیس ہوتا تو میں بھی بلاؤں اور جنوں کا سامنا کرتا اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا اس دیوتا مارکوپولو شیپ تک جا پہنچتا..اسے ہلاک کر دینے کے گناہ کبیرہ کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا صرف اس کا دیدار

کرتا..اس کی پرستش کرتا اور وطن لوٹ آتا..

اس تصویر کی اشاعت پر مجھ ایسے کچھ ڈرپوک لوگوں نے احتجاج کیا تو شکاری نے بے شک معقول جواز مہیا کیے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ یہ مارکوپولو شیپ اپنی عمر کے اختتام تک پہنچ رہا تھا..ایک نر تھا..اسے یوں بھی کچھ عرصے کے بعد قدرتی طور پر مر جانا تھا تو اس کے شکار کے عوض جو کثیر رقم میں نے ادا کی ہے' اس سے مقامی لوگوں کا معیار زندگی بہتر ہوگا..میرے نزدیک یہ تو کوئی جواز نہ تھا کہ یوں کسی بھی لمحے کوئی شکاری میری عمر کے لوگوں کو بھی ہلاک کر سکتا ہے کہ انہوں نے یوں بھی کچھ عرصے کے بعد مر جانا ہے..اور انہیں ہلاک کرنے کے عوض ان کے پس ماندگان بہتر زندگی گزاریں گے..

اس طویل بیانئے سے اگرچہ میں ثابت نہیں کر سکا لیکن چاہتا تھا کہ ثابت ہو جائے کہ مجھے جانور..انسانوں سے کہیں بڑھ کر پیارے ہیں..

مجھے یاد ہے کہ میری ایک انگلش لینڈ لیڈی کاؤبوائے فلمیں ٹیلی ویژن پر دیکھتی ہوئی کسی گھوڑے کو گولی لگنے سے مرتے دیکھتی تھی تو زاروقطار رونے لگتی تھی جب کہ انسانوں کو ہلاک ہوتے دیکھ کر اسے چنداں دکھ نہ ہوتا تھا اور آلو کے قتلے کھاتی رہتی تھی اور جب میں نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کیا ہی پتے کی بات کہی ''مسٹر..انسان جنگ کرتے ہیں اپنی مرضی سے تو ان کا ہلاک ہو جانا قدرتی ہے جب کہ گھوڑے تو جنگ نہیں کرتے تو ان کا مر جانا ایک المیہ ہے..''

اب تو آپ جان گئے ہوں گے کہ ڈزنی لینڈ کی ''اینمل کنگڈم'' میں داخل ہوتے ہوئے میں کیوں سرخوشی میں مخمور مسکراتا جارہا تھا کہ میں جانوروں اور پرندوں کی ایک دنیا میں جارہا ہوں..اندر داخل ہوتے ہی شدید طور پر نیلاہٹ میں گھلی ہوئی ایک دریا صورت جھیل نظر کے سامنے پھیل گئی..یہ مصنوعی تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی کہ اس میں جا بجا کنول کے پھول تیرتے تھے اور اس کے کناروں پر ایک سُندربن تھا..دریائے ایمزن کے کناروں کا ایسا گھنا جنگل تھا' ہرا بھرا اور اس کے شجر یوں آپس میں گتھے ہوئے تھے کہ سورج کی کرنیں ان میں الجھ کر تاریک ہو جاتی تھیں..خدا جانے یہ گھنا جنگل کس کے تصور کا کرشمہ تھا اور اسے کیسے اس مصنوعی جھیل کے کناروں پر تخلیق کیا گیا..

اس جھیل پر لکڑی کا ایک پُل آپ کو پار لے جاتا تھا..

اور اُس پار ''زندگی کا درخت'' سامنے آ جاتا تھا..راستہ روک لیتا تھا..

یہ ایک برگد نما گھنا حضرت ڈزنی کا تخلیق کردہ جعلی درخت ہے جس کے تنے میں سے بھانت بھانت کے جنگلی جانور ابھرتے ہیں.. ناراض شیر' اداس ہاتھی' رنجیدہ بارہ سنگھے.. یہ جانور اگر زندہ حالت میں یہاں ہوتے تو بھی ان کی وجاہت اور کاملیت اتنی عجیب سی کشش والی نہ ہوتی..

ہم نے زندگی کے اُس درخت کے گرد کچھ پھیرے لگائے.. دھیان رکھا کہ سات پھیرے طواف کے نہ ہو جائیں اور پھر زینہ بہ زینہ اترتے اس درخت کی جڑوں میں بیٹھ گئے.. ہم نے تو کیا بیٹھنا تھا اس کی جڑوں میں ایک تھیئٹر پوشیدہ بیٹھا ہوا تھا.. یہ بھی میجک کنگڈم کے تھیٹر کی مانند تھری ڈی تھا.. وہاں مکی ماؤس کا آرکسٹرا تھا تو یہاں سٹیج پر جو کردار نمودار ہوتے تھے وہ سب کے سب کیڑے مکوڑے تھے.. رینگتے ہوئے لال بیگ ایسے کہ بدن پر رینگتے ہوئے محسوس ہوتے تھے.. ایک عجیب سی شکل کا موٹا سا مکوڑا سٹیج پر آ کر تماشائیوں سے مخاطب ہوتا ہے ''میں آپ کی ناقص معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا ہوں جو کہ ایک حقیقت ہے.. کیا آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں کل جتنے انسان ہیں ان کی نسبت ہم کیڑے مکوڑوں کی تعداد کئی ہزار گنا زیادہ ہے.. آپ سب تو فنا ہو جائیں گے لیکن ہم موجود رہیں گے اس لیے ہمارا ادب کیا کیجیے.. ہم آپ انسانوں سے برتر ہیں لیکن آپ پر ترس کھاتے ہوئے میں آپ سب کو اعزازی مکوڑے قرار دیتا ہوں..''

اس دوران ایک نہایت سڑیل قسم کے منحنی سے مکوڑا صاحب آتے ہیں اور آتے ہی سامنے بیٹھے انسانوں پر برس پڑتے ہیں ''ذرا دیکھو کتنی معصوم شکلیں بنائے بیٹھے ہیں.. جب کہ یہ لوگ ہمیں مارنے' کچلنے اور تلف کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں.. ہم ان سے جان بچاتے پھرتے ہیں..'' سڑیل مکوڑا موٹے مکوڑے کی جانب دیکھ کر کہتا ہے ''دیکھو ہمارے قاتل آج ہمارے قابو میں آ گئے ہیں. تھیئٹر کے دروازے بند ہیں' یہ فرار نہیں ہو سکتے تو کیوں نہ ان سب انسانوں کو تلف کر دیا جائے..''

موٹا مکوڑا سر ہلاتا ہے ''نہیں اب ہم ایسا نہیں کر سکتے.. انہیں ہلاک نہیں کر سکتے..''

''کیوں نہیں کر سکتے..''

''اس لیے کہ میں ان سب کو اعزازی مکوڑے قرار دے چکا ہوں.. اور اب یہ ہمارے عزیز بن گئے ہیں.. اپنوں کو نہیں مارا جاتا..''

اتنی دیر میں ایک پھولا ہوا بیلون نما مکوڑا پیٹ پر ہاتھ رکھے پریشانی کی حالت میں سٹیج

پر آتا ہے' کراہتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے ''اوہو میں نے عادت سے مجبور ہو کر کچھ زیادہ ہی کھا لیا ہے.. جانے کیا کھا لیا ہے کہ میرا معدہ خراب ہو گیا ہے.. اور پیٹ میں گیس بھر گئی ہے تبھی تو اتنا پھول گیا ہے.. میں بہت بے بس ہو رہا ہوں یہ گیس خارج ہوا ہی چاہتی ہے.. معاف کر دیجیے گا..''

یہ کہہ کر وہ مکوڑا حضرت تماشائیوں کی جانب پشت کر کے ایک دھماکے کے ساتھ گیس خارج کرتے ہیں اور اتنے سکڑ جاتے ہیں کہ بمشکل دکھائی دیتے ہیں.. مت پوچھیے کہ پورے تھیئٹر میں گیس کی کیسی ناقابل برداشت بدبو پھیلی.. مجھ سمیت سب نے اپنی ناکوں پر ٹشو پیپر رکھ لیے اور سانس لینے سے اجتناب کیا..

اب ایک مسخرہ سا کیڑا آتا ہے لوٹ پوٹ ہوتا ''میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ میں سے کچھ لوگ ہمیں سنجیدگی سے نہیں لے رہے.. یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سچ مچ کے نہیں.. ہم ابھی ثابت کرنے والے ہیں کہ ہم سچ مچ کے کیڑے مکوڑے ہیں اور آپ کو کاٹ بھی سکتے ہیں.. کاٹیں؟'' اور اس کے ساتھ ہی درجنوں لوگ ''یاہو'' کے نعرے لگاتے اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر اپنے بدن کے مختلف حصوں کو سہلانے لگتے ہیں کہ انہیں واقعی کسی شے نے کاٹ کھایا تھا.. میرا گمان ہے کہ تھیٹر کی کچھ نشستوں کے اندر کوئی ایسا میکانکی نظام نصب تھا جو عین اس لمحے جب مسخرہ مکوڑا ''کاٹیں!'' کہتا تھا تو وہ یکدم وہاں بیٹھے شخص کو چٹکی سی کاٹ لیتا تھا..

اس مکوڑا شو نے محظوظ تو بہت کیا پر بقیہ دن یہی محسوس ہوتا رہا کہ کچھ نہ کچھ بدن پر رینگ رہا ہے اور وہ یکدم کاٹ لے گا..

تھیئٹر سے باہر آئے تو وہاں اُلو تھا..

معمولی اُلو نہ تھا بلکہ بہت بڑا اُلو تھا..

پھونس کے ایک چھپر تلے نہایت رنجیدہ اور بیزار نوعیت کے ایک معنک حضرت ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں اور انہوں نے نپولین کی مانند اپنا بایاں ہاتھ سینے پر رکھا ہوا ہے اور ان کے بازو پر بھوری اور سنہری رنگت والا ایک پرشکوہ عقاب آنکھیں بند کیے بیٹھا ہے.. قریب ہو کر غور سے دیکھتا ہوں تو وہ کچھ اور دکھائی دیتا ہے اور یاد نہیں آ رہا کہ یہ جو بھی دکھائی دیتا ہے دیکھا ہوا لگتا ہے تو یہ ہے کیا اور اسے دیکھا کہاں تھا.. پھر یکدم منکشف ہوتا ہے کہ او ہو یہ عقاب تو نہیں ایک اُلو ہے.. اور واحد پرندہ ایسا ہے جس کے سونے جاگنے کے اوقات ہم سے مطابقت نہیں رکھتے اس لیے کم

ملاقات ہوتی ہے اور اسی لیے اگر کبھی دکھائی دے جائے تو پہلی نظر میں پہچانا نہیں جاتا.. اور یہ کوئی معمولی اُلو نہ تھا بلکہ بہت بڑا اُلو تھا..

میں نے پوری زندگی میں جتنے بھی اُلو دیکھے ہیں اور کافی دیکھے ہیں اگرچہ وہ سب کے سب اُلو نہ تھے تو ان میں سے جسامت کے لحاظ سے یہ سب سے بڑا اُلو تھا..

اس بڑے اُلو نے مجھے اداس کر دیا کہ ایک زمانے میں میں بھی بڑا اُلو ہوا کرتا تھا..

میرے اباجی جب بہت ہی طیش میں آ جاتے.. غصے میں آ جاتے اور پوری حیات میں ایک دو بار ہی آئے ہوں گے اور جب مجھ سے شدید ناراضی کا اظہار کرنا ہوتا تھا تو کہا کرتے تھے ''مستنصر.. تم بڑے اُلو ہو..''

اُن کی بُرا بھلا کہنے کی.. یہاں تک کہ گالی دینے کی ویکیبلری بس اس ایک ''تم بڑے اُلو ہو'' پر ہی اختتام پذیر ہو جاتی تھی.. اس سے آگے کبھی نہ گئی..

میں اداس اس لیے ہوا تھا کہ کتنے ڈھیروں برس بیت گئے مجھے کسی نے ''مستنصر تم بڑے اُلو ہو'' نہیں کہا تھا..

یہ کہنے والے چلے گئے..

چنانچہ یہ ایک نہایت وجیہہ گھنے بال و پر والا بھوری اور سنہری رنگت کا بڑا اُلو تھا جو بیزار نوعیت کے معنک صاحب کے بازو پر آنکھیں موندھے بیٹھا تھا.. اور اس کا یوں آنکھیں بند کر کے بیٹھنا بنتا بھی تھا کہ دن کی روشنی تھی.. تیز دھوپ تھی تو اگر وہ آنکھیں کھول کر بیٹھا ہوتا تو اُلو نہ ہوتا کچھ اور ہوتا..

ان معنک صاحب اور اُن کے اُلو کے گرد دس بارہ بچے جمع تھے جو منہ کھولے کبھی صاحب کو دیکھتے تھے اور کبھی اُلو کو اور فیصلہ نہ کر پا رہے تھے ان میں سے کون کیا ہے..

یہ دراصل مختلف پرندوں کے تفصیلی تعارف کی ایک اوپن ایئر کلاس تھی.. وہ صاحب بچوں کو اُلو کا شجرہ نسب بتا رہے تھے کہ یہ کون سی نسل کا ہے' کہاں پایا جاتا ہے.. اس کی عادات اور خصائل کیا ہیں اور یہ بقیہ اُلوؤں سے کس طرح مختلف ہے..

یہ اُلو میرا بھائی بھی تھا.. اس لیے نہیں کہ میرے اباجی مجھے بڑا اُلو کہا کرتے تھے بلکہ اس لیے کہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میرے کالموں کے ایک مجموعے کا نام ''اُلو ہمارے بھائی ہیں''

رکھا گیا تھا اور اگر اس کتاب کے نئے ایڈیشن آئے دن نکلتے رہتے ہیں تو اس میں میری تحریر کی اثر آفرینی وغیرہ کا کچھ کمال نہیں بلکہ محبت بھری بہنیں اپنے بھائیوں کو ان کی سالگرہ پر یہی کتاب تحفے میں دیتی ہیں.. اگرچہ ایک اور مجموعے کے نام ''گدھے ہمارے بھائی ہیں'' لیکن یہ زیادہ پاپولر اس لیے نہیں ہو سکا کہ بہنیں اتنی بدتمیز نہیں ہونا چاہتیں کہ گدھوں کو بھی اپنا بھائی قرار دے ڈالیں..

بچہ لوگ ایک سچ مچ کے بڑے اُلو کو اپنے سامنے پا کر بے حد جذباتی ہو رہے تھے اور معنک اور بیزار صاحب سے اُلو کے بارے میں طرح طرح کے سوال پوچھ رہے تھے..

''انکل.. یہ اُلو ناشتے میں کیا کھاتا ہے.. اس کے پروں کی لمبائی ناپی جائے تو کتنے فٹ ہو گی.. یہ رہتا کہاں ہے.. آپ کے ساتھ رہتا ہے اور کیا یہ ایک ڈیڈی ہے یا ایک ممی.. اور کیا اس کے بچے بھی ہیں..''

اگر وہ بچے مجھ سے یہ سوال کرتے کہ کیا اس اُلو کے بچے بھی ہیں تو میں انہیں بتاتا کہ بچو ہمارے ملک میں تو ہر بچہ اُلو کا بچہ ہوتا ہے.. اپنے والدین کے لیے ایک اُلو کا پٹھا ہوتا ہے.. یعنی اُلو کا بچہ ہوتا ہے.. تو آپ حساب کر لو کہ ہمارے ملک میں کتنے اُلو کے بچے پائے جاتے ہیں..

مجھے یہ ''اُلو شو'' بے حد پسند آیا..

پرندوں کے بارے میں امریکی بچوں کو کیسے پر اثر طریقے سے پڑھایا جا رہا ہے.. انہیں تعلیم دی جا رہی ہے اور یہ تعلیم اس لمحے شروع ہو جاتی ہے جب ایک بچہ اس دنیا میں آ کر اپنی آنکھیں کھولتا ہے.. اس کے والدین اگرچہ وہ ابھی سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا پھر بھی مسلسل آس پاس کی اشیاء اور قدرتی مناظر کے بارے میں معلومات فراہم کرتے جاتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں ان کا اثر ہو گا.. یہ بچے ایک ''نیچرل ہسٹری میوزیم'' میں داخل ہو کر انسانی تاریخ' پرندوں اور جانوروں کے ارتقاء اور تہذیب کے بارے میں دو تین گھنٹوں میں اتنا کچھ جان لیتے ہیں جو ہمارا بچہ پوری عمر نہیں جان سکتا..

والدین ان میں تجسس اور اشتیاق کے بیج بوتے رہتے ہیں..

فان گوگ اور پکاسو کی تصاویر کے سامنے کھڑے ہو کر انہیں سمجھاتے رہتے ہیں کہ ان دونوں مصوروں کی تخلیقی صلاحیتوں میں کیا فرق ہے..

سنٹرل پارک میں سیر کر رہے ہیں تو اپنے بچوں کا دماغ کھا رہے ہیں کہ اس جھاڑی کا

نام یہ ہے اور یہ بُوٹا فلاں موسموں میں بہار پر آتا ہے..اور یہ درخت کون سا ہے اور دنیا کے کس خطے کا ہے..اور یہ بُوٹی جو مہک دے رہی ہے یہ کہاں سے آئی ہے..

یوں ایک بودا سا نالائق امریکی بچہ بھی ہمارے باصلاحیت بچوں سے اس مسلسل ''تعلیم'' اور آگاہی کے زور پر کہیں آگے نکل جاتا ہے..

ہمارے بچے ہر شے میں..تنگ نظری' تعصب اور عقیدے میں جکڑ کر شاہ دولا کے چوہے بنا دیئے جاتے ہیں..وہ ہر سوال نہیں پوچھ سکتے..اگر پوچھ لیں تو سرزنش کی جاتی ہے..میں ان دنوں اپنے آس پاس نظر کرتا ہوں تو چھوٹے چھوٹے بچوں کے سروں پر مسلسل سبز رنگ کی پگڑیاں کسی نظر آتی ہیں..میں ان معصوم بچوں کو اپنے گھر کے سامنے والی گراؤنڈز میں دیکھتا ہوں کہ وہ کرکٹ یا فٹ بال کھیلنا چاہتے ہیں اور وہ پگڑیاں ان کے سروں پر قائم نہیں رہتیں تو وہ آس پاس نگاہ کرتے ہیں کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور اپنی سبز پگڑی اتار کر کسی بینچ پر رکھتے ہیں اور کھیل کود میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جونہی ان کے مولوی صاحب نمودار ہوتے ہیں تو وہ بچے گرتے پڑتے اپنی پگڑیاں سروں پر جمانے لگتے ہیں..

پانچ چھ برس کی بچیاں حجاب پہنے اپنے آپ کو چادروں میں لپیٹے ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں..

کبھی ننھے بچوں کو شاہ دولا کے چوہے بنانے کی خاطر ان کے سروں پر آہنی کنٹوپ چڑھا دیئے جاتے تھے اور ان کی ذہنی نشو و نما رک جاتی تھی..وہ بالغ ہو جاتے تھے پر ان کے سر چھوٹے رہ جاتے تھے..میں موازنہ نہیں کرنا چاہتا..

چنانچہ اس اُلو کلاس کو اٹینڈ کرنے والا ہر بچہ ''اُلو ایکسپرٹ'' ہو جاتا تھا..

اور میری گود میں جو نوفل یہاں ہیں ابھی ایک برس کے ہیں وہ بھی منہ کھولے انتہائی انہماک سے کبھی اپنے نانا جان اور کبھی اُلو کو دیکھتے ہیں..

بس ایک مرتبہ وہ بڑا اُلو حالت استغراق میں سے باہر آیا اور آنکھیں کھول دیں..اس پر بچہ لوگ نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں..تالیوں کے شور کو ناپسند کرتے اُلو نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں..

یہ ایک خوش بخت اُلو تھا جسے ہر کوئی بڑا اُلو کہتا تھا..اور مجھے تو بڑا اُلو کہنے والا کوئی نہ تھا..

''اینمل ورلڈ'' میں فلوریڈا کی چمکیلی اور تیز دھوپ تو تھی ہی' حبس بھی بہت تھا اور فاصلے بھی طویل تھے چنانچہ میں جب کبھی نڈھال ہو جاتا تو چند گھونٹ پانی کے پی کے' متعین کردہ سموکنگ ایریا میں پناہ لے کر سگریٹ سلگا لیتا..تو میں راستے سے ہٹ کر ایک نہایت گھنے کنج کے اندر چلا گیا جہاں چھاؤں بھی گھنی تھی..ایک بہت بڑا بگلا ایک تالاب میں ایک ٹانگ پر معلّق بھگت ہوا جاتا تھا اور کیا ہی خوش الحان پرندے اس جھنڈ میں چہکتے چلے جاتے تھے جنہوں نے میرے دل کو خوش باش کر دیا لیکن جونہی سگریٹ ختم کر کے میں وہاں سے نکلنے لگا تو وہ سب یکدم چپ ہو گئے..میں حیران ہو کر دو قدم پیچھے گیا تو وہ پھر سے غُل کرنے لگے..میں نے یہ عمل دو تین بار دوہرایا' جھنڈ کے اندر جاتا تو وہ چہکنے لگتے اور باہر قدم رکھتا تو کمبخت چپ سادھ لیتے..کیسے کمال کے گانٹھ کے پکے پنچھی ہیں کہ جب کوئی آ جائے تو راگ بہار الاپنے لگتے ہیں اور چلا جائے تو منقار زیر پر ہو جاتے ہیں..گورے بھی کمال کرتے ہیں پنچھیوں کو بھی سدھا لیتے ہیں کہ ہمہ وقت چہکنے کی ضرورت نہیں ہے' جب کوئی سننے والا آئے تو کچھ سنا دے ورنہ خاموش رہو..بعد میں کھلا کہ ہمیں بیوقوف بنایا گیا تھا..اس کنج میں کوئی پرندہ وغیرہ تھا ہی نہیں بلکہ ان کی چہچہاہٹ کی ریکارڈنگ تھی جو کسی کے آنے پر خود بخود آن ہو جاتی تھی اور اس کے جانے پر آف ہو جاتی تھی..

تو اُس جانوروں کی دنیا میں گھومتے ہوئے..تالاب آبشار ہیں..جھرنے اور گل بوٹے پانیوں میں رنگین مچھلیاں اور کناروں پر بیٹھے پرندے..جو نظر آتا فریب نظر آتا..کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ ان میں نقلی کیا ہے اور اصلی کیا ہے..مثلاً میں نے ایک سارس کو دیکھا جو بہت دیر تک نقلی لگتا رہا اور پھر اس نے گردن میں خم دے کر پانیوں میں چونچ ڈالی' ایک مچھلی دابی اور اسے ہڑپ کر گیا..مچھلی بھی اصلی نہیں لگتی تھی..لیکن اگر وہ نقلی تھی تو سارس صاحب نے اسے ہڑپ کیوں کیا..اگر انجانے میں پیٹ میں اتار لی ہے تو انہیں فوری طور پر تڑپ تڑپ کر جانے دے دینی چاہیے..ہو سکتا ہے کمبخت دونوں ہی نقلی ہوں..

اینمل ورلڈ کی سب سے پسندیدہ رائڈ ''کلی منجارو سفاری'' تھی..

کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی خاص وقعت نہیں ہوتی لیکن وہ کسی ناول یا فلم یا کسی ذاتی تجربے کے حوالے سے آپ کے دل پر ثبت ہو جاتے ہیں اور آئندہ زندگی میں جب

کبھی آپ وہ نام سنتے ہیں تو یہ دل دھڑکنے لگتا ہے..ان میں سے ایک نام کلی منجارو کا ہے.. ہیمنگوے کی ایک کہانی ''سنوز آف کلی منجاروز'' پر بنی فلم کو میں نے بچپن میں بار بار دیکھا تھا..ایک قریب المرگ گریگوری پیک افریقہ کے سب سے بلند اور برف پوش پہاڑ کلی منجارو کے دامن میں بے آسرا پڑا اس جہاز کا منتظر ہے جو اسے اس ویرانے میں سے نکال کر لے جائے گا اور نزدیکی درخت پر گدھ بیٹھنا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ موت کی بُو سونگھ لیتے ہیں..پیک اپنے ماضی کو یاد کر رہا ہے اور ایوا گارڈنر کے سرخ ہونٹوں میں دبے سلگتے ہوئے سگریٹ کو یاد کر رہا ہے..

تب سے کلی منجارو کا نام میرے دل کی دھڑکن کا سبب بنتا چلا آیا ہے تو میں نے بہر طور اس سفر یا سفاری پر جانا تھا.

قدیم سفید فام لوگوں کے ذہنوں میں جو افریقہ ہے اس کا آغاز ہو جاتا ہے..وہی موسیقی، جنگل..قدیم ساز، لکڑی کے کیبن اور پھر ایک سٹیشن آ جاتا ہے جہاں بھورے رنگ کے افریقی مزاج کی گاڑیاں آ جا رہی ہیں..آنے والی گاڑی میں سے سیاح اتر رہے ہیں اور ان کے چہرے تمتما رہے ہیں..جونہی یہ گاڑی خالی ہوتی ہے موٹی موٹی امریکی لڑکیاں براؤن بش شرٹوں، نیکروں اور فُل بوٹوں میں بڑے بڑے ہیٹ اوڑھے جیسے ابھی ابھی افریقہ کے کسی آدم خور قبیلے کے سردار سے بچ کر آئی ہیں..آپ کو گاڑی میں بٹھاتی ہیں اور ڈرائیور کو اشارہ کرتی ہیں کہ فُل ہے کا کے فُل ہے..

یہ سفاری ٹرک اب نہایت دشوار گزار جنگل میں گھرے راستوں پر ہچکولے کھاتا چلا جا رہا ہے..بعض دھچکوں سے آپ گرنے کو آتے ہیں اور بمشکل سنبھلتے ہیں..اس سفاری کے دوران دیکھے جانے والے جانور آپ کو متاثر کریں نہ کریں لیکن وہ خاتون حسب معمول خاکی لباس میں جو ڈرائیور کے برابر میں کھڑی سیاحوں سے مخاطب ہو رہی ہے..رننگ کومنٹری کر رہی ہے وہ آپ کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے..وہ یقیناً کسی ڈرامہ سکول کی تربیت یافتہ ہے کیونکہ چہرے کے تاثرات سے لب و لہجے سے وہ آپ کی بے یقینی کو یقین میں بدل دیتی ہے..

دیکھئے دیکھئے ان جنگلوں میں پوچرز گھوم رہے ہیں..غیر قانونی طور پر شکار کرنے والے اور وہ ہاتھیوں کو ہلاک کر کے ان کے سینگ اٹھا کر جھاڑیوں میں روپوش ہونے کو ہیں..ہمیں ان کا پیچھا کرنا ہے یہ لوگ مجرم ہیں..

اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ جھاڑیوں میں چند لوگ ہیں تو سہی..لگتے نقلی ہیں لیکن کومنٹری کرنے والی خاتون کی چرب زبانی آپ کو باور کروا دیتی ہے کہ وہ اصلی ہیں اور اب اس گھنے جھنڈ میں دیکھئے وہاں ایک جہاز ہے جس میں یہ مجرم لوگ سوار ہونے کو ہیں لیکن دیکھئے عین وقت پر جنگل کے محافظ پہنچ گئے اور انہیں گرفتار کیا جا رہا ہے..گھنے جھنڈ میں ایک جہاز کا ڈھانچہ نظر آ رہا ہے..

اور خواتین و حضرات آپ سے درخواست ہے کہ ذرا سنبھل جائیے..ہم ایک وحشی دریا پر معلق ایک مخدوش سے پُل پر سے گزریں گے..اور یہ کسی وقت بھی مسمار ہو کر دریا میں گر سکتا ہے.. ابھی پچھلے دنوں ایک ایسا ہی سفاری ٹرک اس میں گر گیا تھا..سنبھل جائیے..

اور واقعی اُس پُل کی حالت کچھ اچھی نہیں اور آپ کا ٹرک اس پر ڈولتا ہے..چند سیاح جان بوجھ کر خوفزدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، چیخیں مارتے ہیں اور پھر ٹرک خیریت سے پار چلا جاتا ہے..

اُس پُل کے پار ہوتے ہیں گھنے جنگل اختتام کو پہنچتے ہیں اور ایک وسیع دھوپ میں تپتی افریقی لینڈ سکیپ آپ کے سامنے آ جاتی ہے..آپ کا ٹرک اس میں دھول اڑاتا جا رہا ہے..اس زمینی منظر میں کچھ جھاڑیاں ہیں اور کہیں کہیں درخت ہیں جن پر گدھ بیٹھے ہوئے ہیں..زرافے گردنیں اٹھائے آپ کے ٹرک کی جانب تک رہے ہیں..ایک تالاب میں دو سُست ہاتھی لوٹنیاں لگا رہے ہیں..درجنوں ہرن ہیں جو چوکڑیاں بھرتے کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں..زیبروں کا ایک جوڑا منہ جوڑے کھڑا ہے..

ایک درخت کی چھاؤں میں تین چار ببر شیر آرام کر رہے ہیں جو یقیناً تمام دن ایسے سفاری ٹرکوں کی آمد و رفت اور ان میں براجمان سیاحوں کو دیکھ دیکھ کر اتنے بیزار ہو چکے ہیں کہ ہماری جانب آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے..

وہاں مجھے ایک ایسا ہرن نما جانور نظر آیا جو میں نے آج تک کہیں نہ دیکھا تھا..پتہ نہیں کیا تھا..

اور یہ سب جانور اصلی تھے..کیونکہ زیبروں کا جوڑا منہ جوڑے بوس و کنار میں مشغول تھا اور نقلی زیبروں کو کبھی یہ خیال نہیں آ سکتا کہ ہونٹوں کا مصرف یہ بھی ہو سکتا ہے..

اس کلی منجارو سفاری کے دوران آپ کچھ لمحوں کے لیے تو فراموش کر دیتے ہیں کہ آپ

کہاں ہیں..اور یہ سب کچھ جانوروں کے سونقل بہ مطابق اصل ہے اور آپ افریقہ کی گرم دوپہر میں اونگھتے ہوئے شتر مرغوں اور زرافوں کے قریب آ جاتے ہیں..اور آپ کے چہرے پر افریقی راستوں کی دھول ہے..اور پسلیوں میں سفاری ٹرک کے دھچکوں کی دکھن ہے اور زبان پیاس سے سوکھتی ہے اور وہاں جانوروں کی ایک خاص بُو ہے..

سفاری کا اختتام ہوتا ہے تو آپ اتنے بوکھلائے ہوئے ہیں کہ وہیں ٹرک میں بیٹھے رہتے ہیں کلی منجارو کے دامن میں.. جہاں درخت پر گدھ اتر رہے ہیں کہ انہوں نے موت کی بُو سونگھ لی ہے..اور آپ اُس جہاز کے منتظر ہیں جو آپ کو اس ویرانے اور ان گدھوں سے دور لے جائے گا..

لیکن ان گدھوں سے کچھ فرار نہیں..

انہوں نے بہر طور اُترنا ہے..

جہاں آپ کا وقت لکھا گیا ہے وہاں بہر طور اُترنا ہے..

جناح باغ لاہور کے کسی برگد پر..فیئری میڈو کے کسی سفید برچ کے درخت پر..گاؤں کے کسی کیکر پر..الاسکا کے کسی ٹنڈ منڈ جلے ہوئے شجر پر..

انہوں نے بہر طور اُترنا ہے..

جہاں آپ کا وقت لکھا گیا ہے بس وہاں..

اس دوران میں نے دنیا بھر کے پرندوں کا ایک اجتماع بھی دیکھا..دراصل یہ ایک بڑا آپرا تھا جس میں پرندے اپنی اپنی بولیاں بولتے کبھی پاپ سونگ گاتے تھے اور کبھی پکے راگ الاپنے لگتے تھے..

ایک چھوٹا سا ہال نما کمرہ تھا جہاں ان پرندوں کا بسیرا تھا..

جب اس ہال کو سیاح بھر دیتے تھے تو دروازے بند ہو جاتے تھے..ہر سو تاریکی چھا جاتی تھی اور پھر روشنیوں اور سایوں کے کھیل میں طرح طرح کے پنکھ پکھیرو پرفارم کرنے لگتے تھے..وہ اس ڈالی سے اس ڈالی پر جاتے تھے..آپ کے کاندھے پر بیٹھ جاتے تھے اور گاتے جاتے تھے..یعنی کبھی تو وہ "کنیں کنیں جاناں اے بلو دے گھر" پر جھومتے گاتے تھے اور کبھی راگ درباری

الاپنے لگتے تھے..

یہ کہنے کی کیا حاجت ہے کہ یہاں بھی فریب کے پرندے پرواز کرتے گیت گاتے تھے..

اس "اینمل کنگڈم" میں صرف جانور پرندے اور گھنے جنگل اور جھیلیں ہی نہ تھیں بلکہ دنیا کے پانچوں براعظم بھی موجود تھے..

میں ایشیا کی جانب ملتفت ہوا تو کیا آپ یقین کریں گے کہ وہاں پنجابی گیتوں پر لوگ "بلّے بلّے" کرتے بھنگڑا ڈال رہے تھے..چونکہ یہ سب کچھ تو میں اپنے ہاں بھی دیکھ سکتا تھا اس لیے میں وہاں تا دیر نہ ٹھہرا..کوچ کیا اور افریقہ چلا گیا..

اور افریقہ کی نمائندگی میں کیسی کمال کاملیت تھی کہ وہاں وہی درخت تھے جو افریقہ میں ہوتے ہیں..پرانی حویلیاں تھیں جو مسمار ہونے کو تھیں اور ان کے صحن میں وہ پھول کھلے تھے جو شدید گرمی کو سہہ جاتے ہیں..ریستورانوں میں افریقی عورتیں اپنے شوخ لبادوں میں موسیقی پر بدن ہلاتی تھیں..

اگرچہ اس "اینمل کنگڈم" میں یعنی "جانورستان" میں گھومتے گزرتے ہم..یعنی عینی، بلال اور میں حیرت سے بچّے ہو چکے تھے..لیکن جو پہلے سے ہی ایک بچہ تھا..نوفل تھا وہ نہ صرف انتہائی بور ہو چکا تھا..اگرچہ ہم نے ایک نہایت پیارے بن مانس کے ساتھ اس کی متعدد تصویریں بھی اتاری تھیں اور پھر بھی وہ نہ صرف بور ہو چکا تھا بلکہ دھوپ کی تمازت اس پر اثر کر چکی تھی اور وہ لال بھبوکا ہو رہا تھا..چنانچہ اسے برسرعام برہنہ کر دیا گیا..اس کے بدن پر پھونکیں ماری گئیں..برف کی ٹکور کی گئی اور آخر میں ایک کھلونے پنکھے سے اسے ہوا دی گئی تب جا کر وہ قدرے بحال ہوا..

ویسے وہاں متعدد بچّے اسی طریقے سے بحال کیے جا رہے تھے..

"اینمل کنگڈم" کا ایک ایسا حصہ تھا جو سیاحوں کے لیے بند تھا اور وہاں ایک بلند پہاڑ تخلیق کیا جا رہا تھا اور اس پر مشینوں سے سفید سفوف جمایا جا رہا تھا جو برف کا تأثر دے رہا تھا اور اس کے دامن میں ایک قدیم گاؤں تعمیر کیا جا رہا تھا..

"انکل.." بلال مجھ سے مخاطب ہوا "آپ نے دنیا کے بلند ترین پہاڑ دیکھے ہیں..کے ٹو اور نانگا پربت کے بیس کیمپ تک گئے ہیں پر دنیا کی سب سے بلند چوٹی ایورسٹ تک تو نہیں پہنچے"..

''ہاں..وہاں تک تو نہیں پہنچا..اگرچہ نیپال تو پہنچا پر وہاں تک نہیں پہنچا.''

''تو آپ اگلے برس ضرور آیئے گا آپ پہنچ جائیں گے..یہ جو پہاڑ آپ کے سامنے بلند ہو رہا ہے..ماؤنٹ ایورسٹ ہے..اسی شکل کا..بالکل وہی..اور اس کے دامن میں جو گاؤں ہے..وہ ایک نیپالی بستی ہے جہاں کوہ پیما چند روز ٹھہرتے ہیں اور پھر ایورسٹ کو فتح کرنے کے لیے نکلتے ہیں..اگلے برس ضرور آیئے گا.''

واقعی ایک معجزہ رونما ہو رہا تھا..میں نے ایورسٹ کی جتنی بھی تصویریں دیکھی تھیں ان سب میں جو گھاٹیاں' کھائیاں اور برفیں اور گلیشیر تھے وہ سب ڈزنی لینڈ میں رونما ہو رہے تھے..

ابھی تین ہفتے پیشتر عینی نے مجھے بتایا ہے کہ ابو آپ کی وہ ایورسٹ مکمل ہو گئی ہے..تو آپ میرے لیے نہ آئیں ایورسٹ کے لیے تو آ جائیں..

یہ تو نہیں کہ جو کچھ آپ پیچھے چھوڑ آتے ہیں وہ پیچھے رہ جاتا ہے بلکہ سب کچھ آپ کے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے..

رتی گلی کے راج ہنس' ناٹنگھم کا شیرووڈ فارسٹ' دریائے سندھ کی اندھی ڈولفن..

دریائے ماسکو کے کناروں پر برچ کا ایک جنگل' شہزادوں کے جزیرے یا افغانستان کی ایک قدیم کارواں سرائے..سب کے سب آپ کے پیچھے چلے آتے ہیں..

اور وہ ہر کسی کے پیچھے نہیں جاتے صرف ان کے پیچھے جاتے ہیں جس کا دل انہیں دیکھ کر پگھل گیا تھا اور پھر دوبارہ دل نہ ہو سکا تھا..

اسی طور..اُس جانوروں کی سلطنت میں گزارے ہوئے ایک دن کے جتنے بھی پرندے تھے..اصلی تھے یا نقلی تھے..سچ مچ چہچہاتے تھے یا ان کی ریکارڈ شدہ آوازیں میرے کانوں میں اترتی تھیں..وہ جو ہاتھی کان ہلاتے تھے اور زیبرے منہ ملاتے تھے..یہ سب میرے پیچھے چلے آئے پر ان سب پر ایک اُلو غالب آ گیا جو ایک بڑا اُلو تھا..اور مجھے ''تم بڑے اُلو ہو'' کہنے والے کب کے رخصت ہو چکے تھے..



''ہیپی برتھ ڈے نوفل''

اگرچہ میں عینی سے تو یہی کہتا تھا کہ بیٹے میں تو صرف تمہیں ملنے اور دیکھنے کے لیے امریکہ آیا ہوں کیونکہ تم میرا سب سے بیوٹی فل اور لاڈلا بے بی ہو..اُدھر سلجوق اور رابعہ کے ساتھ بھی میں نے یہی چکر چلا رکھا تھا لیکن بھیتر کی بات تو یہی ہے کہ میں صرف اُسے دیکھنے اور اُس کی پہلی سالگرہ میں شریک ہونے کے چاؤ میں سات سمندر پار سے آیا تھا..وہ جسے میں جو بھی کہتا تھا جواب میں صرف ''بیلے بیلے'' کہتا تھا..

بلال کی مجھے فضول خرچی والی عادت بے حد پسند ہے..وہ بیشتر پاکستانیوں کی مانند روپے پیسے کے معاملے میں بہت احتیاط پسند نہیں..مہنگے ترین ڈیزائنرز کپڑے اور جوتے پہنتا ہے' خوش منظر گھر میں رہتا ہے اور مہنگے ریستورانوں میں جانے کا شوقین ہے اور دل کھول کر خرچ کرتا ہے..نوفل کی پہلی سالگرہ تو موقع ہی ایسا تھا کہ کون باپ ہو گا جو اپنے بیٹے کی پہلی سالگرہ پر اپنا دل نہ کھولے..بلال نے دل کے ساتھ اپنا بٹوہ بھی کھول دیا اور تقریب کے انتظامات نہایت شاہانہ اور بے پناہ کیے..جیسے وہ سالگرہ نہیں نوفل کی شادی کر رہا ہے..اُس نے مشہور عالم ڈزنی لینڈ کے ایک خصوصی کلب ''نیور لینڈ کلب'' کے خصوصی بچہ ہال میں اس تقریب کا بندوبست کیا اور سینکڑوں مہمانوں اور اُن کے بچوں کو مدعو کیا..اور اُن مہمانوں کو یہ بھی بتایا کہ نوفل کے نانا جان خصوصی طور پر پاکستان سے پرواز کرتے ہوئے سالگرہ میں شریک ہونے کے لیے پہنچ چکے ہیں..

ڈزنی لینڈ کا یہ بچہ ہال ایک حیرت کدہ تھا..

یعنی بچہ تو کیا جو بڑا بھی اس میں داخل ہوتا تو حیرت زدہ ہو کر خود بھی بچہ بن جاتا..یہ ہلکی روشنی میں ڈوبی ہوئی ایک خوابناک جگہ تھی..دیواروں پر مکی ماؤس رقص کرتے ہوئے..فرش پر

ستارے بچھے ہوئے.. سہانے رنگوں اور شکلوں کے غبارے معلق.. ویڈیو گیمز کے لیے الگ کمرہ.. بچوں کے لیے مختلف فینسی ڈریس' ایک چھوٹا سا چلڈرن تھیٹر جس کی سکرین پر مسلسل کارٹون فلمیں چل رہی تھیں..

ایک آرٹسٹ خاتون بچّوں کے رخساروں اور ماتھوں پر کارٹون کردار طوطے' چڑیاں اور پھول پینٹ کر رہی تھی..

میں تو نوفل سے باقاعدہ حسد میں مبتلا ہو گیا..

عینی بھی ماشاءاللہ اپنے نیم سنہری مہندی رنگے شلوار قمیض سوٹ میں نہایت گلیمرس ماما لگ رہی تھی.. اور نوفل پولو کی سفید ٹی شرٹ' نیکر اور براؤن شوز میں حیران پریشان کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں اور اتنے سارے بچّے اور غبارے کہاں سے آ گئے ہیں اور میری امی ہنستی کیوں جاتی ہیں اور جو کوئی آتا ہے اُس سے ہاتھ ملا کر مجھے آگے کیوں کر دیتی ہیں اور ہر شخص مجھے پاریاں کیوں کر رہا ہے..

میں واقعی نوفل سے حسد محسوس کر رہا تھا کہ کاش ہم بھی بچّے ہوتے.. اور محمد رفیع گا رہا ہوتا کہ

ہم بھی اگر بچّے ہوتے
اور نام ہمارا ہوتا ببلو ببلو
اور کھانے کو ملتے لڈّو
تو دنیا کہتی ہپی برتھ ڈے ٹُو یُو..

اور جو دنیا. نوفل کو ہپی برتھ ڈے ٹُو یو کہنے آئی تھی وہ امریکی دنیا تھی.. یعنی یہاں رنگ و نسل کی تمام ورائٹی موجود تھی..

ظاہر ہے پاکستانی خاندان اور اُن کے بال بچّے تو تھے ہی.. ہاں ہندوستانی جوڑے بھی سلام نمستے کر رہے تھے.. سیاہ فام کراؤڈ بھی موجود تھا.. چینی بھی تھے' فلی پینو اور انڈونیشین بھی.. عینی کے گورے ہمسائے بھی خصوصی طور پر آئے تھے اور تحفوں سے لدے ہوئے آئے تھے.. اُن میں وہ ادھیڑ عمر سکاٹ بھی تھا جو برابر کے گھر میں رہتا تھا.. میری طرح باقاعدگی سے

صبح کی سیر کرتا تھا لیکن میری طرح دھیرے دھیرے سستی سے واک نہ کرتا تھا مسلسل بھاگتا تھا اگرچہ مجھ سے کہیں سینئر تھا.. جب وہ جوگنگ کرتا لوٹتا تو پسینے سے شرابور ہانپتا لوٹتا اور صرف ایک نیکر میں اور تب میں چکوترے کے جُوس کے دو گلاس چڑھا کر برآمدے میں استراحت فرما رہا ہوتا اور وہ مجھے مخاطب کر کے کہتا ''اوہ یہ بہت مشکل کام ہے.. اذیت ناک کام ہے صبح سویرے بھاگنا دوڑنا'' اور پھر اُس پسینہ شدہ حالت میں نیکر سمیت اپنے سومنگ پول میں کود جاتا اور ڈبکیاں لگانے لگتا..

یہاں بلال کے بیسٹ فرینڈ رچرڈ سے بھی ملاقات ہوگئی جس کے والد صاحب فوت ہوگئے تو اُن کے جنازے اور آخری رسوم میں شرکت کی خاطر عینی کو ایک سیاہ سوٹ خریدنا پڑا.. اور وہ چرچ میں سر جھکائے کھڑی رہی لیکن تازہ ترین صورت حال یہ تھی کہ رچرڈ مسلمان ہو چکا تھا.. اگر اُس کے والد صاحب اپنی فوتیدگی کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دیتے تو عینی کو سیاہ سوٹ نہ خریدنا پڑتا.. وہ ایک چینی قسم کا امریکی تھا جس کو شادی راس نہ آتی تھی.. پہلی بیوی ایک سیاہ فام حسینہ تھی جس کا مرغوب مشغلہ اُسے زدوکوب کرنا تھا.. قابل فہم طور پر جہاں تک رچرڈ کی قوت برداشت چلی وہاں تک شادی چلی.. پھر ایک اور خاتون آئیں اور وہ بھی رخصت ہوگئیں. عہد حاضر میں وہ ایک انڈونیشین خاتون سے بیاہا ہوا تھا اور اُس سے شادی کرنے کی خاطر مسجد میں جا کر مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا.. عینی بھی رچرڈ کی بے حد مداح تھی.. اُس کا کہنا تھا کہ ابّو آپ تصور نہیں کر سکتے کہ رچرڈ بنیادی طور پر کتنا نفیس اور نیک دل شخص ہے.. اُس کی شرافت اور سادگی کی قدر نہیں کی جاتی اس لیے اُس کی شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں.. اُس کی موجودہ بیوی مجھے اس لیے پسند ہے کہ اُس نے رچرڈ کو مسلمان کر لیا ہے.. اُن کا ایک بیٹا بھی ہے.. لیکن اُس کی ساس نے اُس کے گھر میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں اور رچرڈ پر بہت رعب جماتی ہے..

سیاہ فام جان پالئن بھی بلال کے بہت قریبی دوستوں میں سے ہے.. عیسائی ہے لیکن اُس کے بچوں کے نام علیک اور ملیک ہیں جو یقیناً علی اور ملک کے امریکی لہجے ہیں.. ہارلم کے بارے میں لکھتے ہوئے میں نے سیاہ فاموں کے اس ثقافتی رویے کا ذکر کیا تھا کہ وہ عیسائی ہونے کے باوجود اپنے بچوں کے مسلمان نام اکثر رکھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے مسلمان ہونے سے آگاہ ہیں اور اپنی اُس شناخت کو ناموں کے حوالے سے زندہ رکھتے ہیں.. جان کی بیگم نہایت

بُردبار لیکن مسخری سی تھی..

ایک عام گورے کی نسبت ایک سیاہ فام کی حس مزاح یوں بھی بہت تیز اور تیکھی ہوتی ہے..اُس نے نہائت گرمجوشی سے ہاتھ ملایا' نواسے کی سالگرہ کی مبارک دی اور پوچھنے لگی کہ..

''آپ کیسے ہیں؟''

میں نے ایک خصوصی پاکستانی آزردگی سے کہا''میں اس عمر میں کیسا ہو سکتا ہوں..بس جی رہا ہوں..''

اس پر وہ خوش مزاج ہوئی اور ہنسی''تم اتنے بوڑھے تو نہیں ہو۔''

''میں ہوں..'' میں نے اپنے آپ کو بزرگ ثابت کرنے کے لیے قدرے نقاہت سے کہا''دکھائی نہیں دیتا اگرچہ ہوں..''

''نہیں..میں سچ کہتی ہوں..''

''میں واقعی ایک بوڑھا ہوتا شخص ہوں'' میں نے اس انداز سے کہا کہ مجھے خود بھی اپنے آپ پر ترس آنے لگا..

''اگر تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے..''

کچھ دیر کی رسمی گفتگو کے بعد میں چلنے لگا تو اُس نے ایک طنزآمیز کمینگی سے کہا''چلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم رکھنا..'' یعنی کہیں بڑھاپے کے باعث گر نہ جاؤ۔

مجھے تو پاکستان کی عادت تھی کہ جونہی آپ ساٹھ سے تجاوز کرتے ہیں تو آپ کی عزت شروع ہو جاتی ہے۔آپ کو''بزرگو'' کہہ کر پکارا جاتا ہے اور نظروں سے ناپا جانا لگتا ہے کہ اس کے لیے کتنے گز کورا لٹھا درکار ہو گا.دن تھوڑے ہیں تو اگربتیوں' گلاب کی پتیوں اور گھڑوں کا بندوبست شروع کر دیا جائے اور ہر شخص ہمدرد اور مہربان ہوا جاتا ہے اور ملتے ہی نہائت رونی شکل بنا کر پوچھتا ہے''تارڑ صاحب..آپ کی صحت کیسی ہے؟''

تارڑ صاحب کو چونکہ اللہ کے فضل سے کوئی پرابلم' کوئی علالت نہیں ہے تو وہ کہتے ہیں..کہ جناب میری صحت کو کیا ہونا ہے' بلڈ پریشر کی گولی باقاعدگی سے پھانک لیتا ہوں اگرچہ اسے کبھی چیک نہیں کروایا..کہ سلیم بیگ کے ایک دوست گاڈی پہلوان روزانہ ایک کلو دہی پر ایک کلو چینی چھڑک کر ناشتے کا آغاز کرتے تھے تو کسی نے کہا کہ پہلوان جی آپ کو

شُوگر ہو جائے گی تو انہوں نے کہا کہ نہیں..کبھی نہیں ہو گی..اور جب پوچھا گیا کہ کیوں نہیں ہو گی تو گاڈی پہلوان نے گہرے یقین سے جواب دیا''چیک کرواؤں گا تو ہو گی..ہم نے چیک ہی نہیں کروانی..''

اس پر مہربان شخص ذرا رنجیدہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے''ویسے واقعی آپ مکمل طور پر صحت مند ہیں کوئی بھی عارضہ نہیں..دل' جگر' پھیپھڑوں یا گردوں کا..''

اور آپ اقرار کرتے ہیں کہ فی الحال تو نہیں.

اس پر وہ صاحب دل گرفتہ اور مایوس ہو کر رخصت ہوتے ہوئے کہتے ہیں''پھر بھی اپنا خیال رکھا کیجیے..اس عمر میں کچھ پتہ نہیں ہوتا..''

امریکہ میں آ کر میں دل گرفتہ اور مایوس ہوا کہ حرام ہے یہاں کسی بھی بندے نے میری عمر یا صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا ہو..یا مجھے بزرگ جان کر میری کچھ عزت کی ہو..بلکہ میں تھوڑا سا معتبر اور معزز ہونے کی خاطر جان بوجھ کر اپنی عمر کا رونا روتا تو اُدھر سے جواب آتا''اوہ واقعی.تم خود بھی اس پر یقین نہ کرنا کہ تم..اوکے ہو..''

اس رونق اور ہلچل اور ہجوم میں..نوفل میاں یکدم خراٹے لینے لگے اور سو گئے..جن کے اعزاز میں یہ ہلا گلا ہو رہا تھا وہ اپنی ماں کی گود میں خراٹے لینے لگے..

اور جب ڈزنی لینڈ کی انتظامیہ کی جانب سے سالگرہ کا ایک بلند اور قلعہ نما کیک بچہ ہال میں آیا تب انہیں زبردستی خوابِ غفلت سے جگایا گیا اور انہیں کیک کاٹنے کے لیے درخواست کی گئی جو انہوں نے منہ بسورتے ہوئے قبول کر لی..

اس بچہ ہال کے ایک کونے میں اُن تحائف کے انبار تھے جو مہمان نوفل کے لیے لائے تھے اور وہ بلند ہوتے کے۔ٹو کی بلندی کے آس پاس ہونے والے تھے..اتنے بلند کہ اُن پر برف بھی گر سکتی تھی..

ڈزنی لینڈ کی ویٹر خواتین نے نہائت اہتمام سے مہمانوں کو کھانا پیش کیا..جو پاکستانی' چینی اور امریکی ملا جلا پروگرام تھا..

جب ہم گھر لوٹ رہے تھے تو ایک کار میں نہیں بلال کے ایک دوست کے ٹرک میں لوٹ رہے تھے کہ کار میں اتنی گنجائش نہ تھی اور ٹرک کے پچھواڑے میں نوفل کو اُس کی سالگرہ پر ملنے

والے تحائف کے انبار بھرے پڑے تھے..

نوفل میاں پھر سو گئے تھے اگرچہ اُن کے نانا جان ایک ایسا غبارہ تھامے جس پر ہیپی برتھ ڈے نقش تھا تھامے ہوئے تھکے ہوئے پھر بھی مسکراتے ہوئے اپنی نانا جانی پر شاد ماں ہو رہے تھے..اگرچہ دل میں یہی خواہش رکھتے تھے کہ..

ہم بھی اگر بچے ہوتے
اور نام ہمارا ہوتا بلو بلو
اور کھانے کو ملتے لڈو
تو دنیا کہتی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔



''میامی اور کوکو رینا''

ہم ہر ویک اینڈ پر میامی جانے کے لیے پَر تولتے..اسے عینی مقامی لہجے میں مائی بولتی تھی..

کبھی عین روانگی کے وقت شدید بارش آسمانوں سے آبشاروں کی صورت گرنے لگتی اور ہمارے پَر بھیگ جاتے اور ہم پرواز کے قابل نہ رہتے..

اور کبھی ہری کین کترینا کا خوف گھر سے نکلنے نہ دیتا جس کا سیلاب ان دنوں فلوریڈا کے برابر میں واقع نیو آرلین میں غریب سیاہ فاموں کی لٹیا ڈبو رہا تھا..اور قوی امکان تھا کہ یہ کترینا آرلینڈو کا رخ بھی کر سکتا تھا..

ان علاقوں میں ہری کین یا سمندری طوفان ایک معمول ہیں..

ہم کہاں جانتے تھے کہ یہ ہری کین کون ہوتے ہیں کہاں سے آتے ہیں اور کیوں آتے ہیں اور یوں بھی اُدھر لاہور کی سلگتی گرمیوں میں لوڈ شیڈنگ کے دوران دستی پنکھے جھلتے کسے پرواہ تھی کہ وہاں امریکہ کی کسی ریاست میں گھروں کی چھتیں تیز ہواؤں کی زد میں آکر پتنگوں کی مانند کیوں اڑی چلی جا رہی ہیں اور پام کے درخت لکھنوی بانکوں کی مانند کمر تک دوہرے کیوں ہوئے جا رہے ہیں اور پورے شہر پانی میں کشتیاں کیوں ہوئے چلے جاتے ہیں..ہم نے تو تب جانا تب جا کر پرواہ کی جب عینی نے طوفانوں کی اس آنکھ میں جا کر گھر بنا لیا..وہ یوں بھی ایک قرۃ العین تھی یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی اور ہماری یہ ٹھنڈک طوفان کی آنکھ میں جا بسی..کیا یہ ایک سحر انگیز تبدیلی نہیں کہ اس دنیا کی گولائی کے گھومتے ہوئے نقشوں پر لاکھوں قصبے اور ہزاروں شہر اور بے انت آبادیاں آپ کے لیے تاریک ہوتی ہیں..وہ آپ کو کبھی دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی آپ ان کے نام یا وجود سے باقاعدہ

آگاہ ہوتے ہیں اور پھر محبت..اولاد کی..عقیدے یا تاریخ کی..یا صرف ایک چہرے کی سیدھی ایک تیز روشنی کے تیر کی مانند اپنے اس نشانے تک چلی جاتی ہے آنکھوں کو چندھیاتی ہوئی اس قصبے یا شہر تک چلی جاتی ہے اور اسے یوں روشن کر دیتی ہے کہ ان کا نام اور اس کا وجود آپ کی آنکھوں میں ایک الاؤ کی طرح بھڑکنے لگتا ہے..اس قصبے یا شہر تک جہاں اس محبت کا بسیرا ہے..

ٹیلی ویژن پر موسم کی رپورٹ کے سورج اور بادل ہیں اور دنیا کے ہر بڑے شہر کا درجہ حرارت لکھا ہوا سکرین پر چلتا جا رہا ہے اور آپ صرف کسی ایک شہر کی خاطر وہاں کا موسم جاننے کی خاطر اپنی آنکھیں سکرین پر بچھائے رکھتے ہیں..آپ نہ صرف اپنی محبت کے لیے بلکہ اس شہر کے تمام مکینوں کے لیے فکر مند ہوتے ہیں..

آرلینڈو بھی بس ایک ایسا شہر تھا..

عینی وہاں جا بسی تو معلوم ہوا کہ اس نام کا بھی کوئی شہر ہے..

تو اب کسی ایک شب سی این این یا فوکس نیوز پر مسلسل آرلینڈو کا نام آ رہا ہے اور نیوز کاسٹر بتائے چلے جا رہے ہیں کہ ایک نہایت تباہ کن اور تیز ہواؤں والا سمندری طوفان ہری کین چارلی گلف آف میکسیکو سے جنم لے کر آرلینڈو کی جانب بڑھ رہا ہے اور کسی بھی لمحے اسے ہٹ کر کے اسے برباد کرنے کو ہو..ہم دونوں میاں بیوی کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں اور ہم ساری رات ٹیلی ویژن سکرین سے جُڑ کر بیٹھے رہتے ہیں اور وہاں عجیب دل کو مسل دینے والے نیلے پیلے مرغولے سے اٹھتے نظر آ رہے ہیں جو آرلینڈو کی جانب بڑھ رہے ہیں اور ہم دعائیں کر رہے ہیں کہ یا اللہ یہ عینی کے گھر سے اِدھر اُدھر ہو کر نکل جائیں..ہم نے درجن بھر بین الاقوامی کالنگ کارڈز کا ذخیرہ بھی کر رکھا ہے اور ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد اسے فون کر رہے ہیں کہ بیٹے اب تم لوگ کیسے ہو..حوصلہ رکھنا..اب کیا صورتِ حال ہے..اور فون کے اندر عینی کی آواز کے پس منظر میں تیز ہوا کا شور ہے..

''ابو..آپ فکر نہ کریں..ہم نے خوراک کا ذخیرہ کر لیا ہے اور سیڑھیوں کے نیچے پناہ لے چکے ہیں کیونکہ پورے گھر میں یہ محفوظ ترین مقام ہے..ہم بھی ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہیں جس پر اس طوفان کا سامنا کرنے کے لیے مسلسل ہدایات دی جا رہی ہیں..ابھی کچھ دیر پہلے ہمارے گھر کی چھت کی تین چار ٹائلیں ہوا کے زور سے اکھڑ گئی ہیں..آپ بالکل فکر نہ کریں..''

ہم ایسا نہ کر سکتے تھے یعنی فکر نہ کرنا ہمارے اختیار میں نہ تھا اور ہمارے دل حلق میں اٹکے ہوئے تھے کہ عینی کے وہ دن قریب تھے جب نوفل صاحب کا ظہور ہونا تھا..

اور یہ بچہ..یہ نوفل..اُس نے بھی کچھ صبر نہ کیا کہ ابھی میرا وقت نہیں ہے اور یوں بھی باہر سمندری طوفان ہر شے کو اڑائے چلا جا رہا ہے تو عافیت یہیں ہے پر اس نے اپنے....وقت کا بھی انتظار نہ کیا، بے چین ہو گیا اس دنیا میں آنے کے لیے..چنانچہ اس ہولناک پُرشور، پُربارش اور گرجتے ہوئے ہری کین چارلی میں بلال درد میں مبتلا عینی کو ہسپتال کی جانب لے جا رہا ہے اور راستوں پر درخت گر رہے ہیں اور چھتوں سے جدا ہونے والی اینٹیں بکھر رہی ہیں اور بس ایک واحد کار ہے جو آرلینڈو بھر میں اپنے گیراج سے باہر ویران شاہراہوں پر چلی جا رہی ہے..

یہاں تک کہ ہسپتال پہنچتے ہیں تو وہاں بھی تقریباً ویرانی ہے کہ ہری کین کے باعث معدودے چند لوگ ہی ڈیوٹی پر پہنچ پائے تھے..

چنانچہ نوفل یہاں اس ہری کین چارلی کے دوران نمودار ہوئے..

شاید اسی لئے وہ ایک چھوٹا سا ہری کین ہے یعنی جدھر جاتا ہے تباہی پھیلاتا چلا جاتا ہے..میں نے نہایت سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ اس بچے کا نام چارلی رکھ دیا جائے..لیکن اعتراض ہوا کہ یہ نام سراسر غیر اسلامی ہے..علاوہ ازیں چارلی پکارنے سے آپ کی نظروں کے سامنے چارلی چپلن مونچھیں پھڑکاتا چھاتا اور آنکھیں گھماتا مسخریاں کرنے لگتا ہے چنانچہ اس کا نام حضرت ورقہ بن نوفل کے حوالے سے..اماں خدیجہ کے پھوپھی زاد کے حوالے سے نوفل رکھا گیا..ایک ایسی شخصیت جنہوں نے رسول اللہؐ کے خدشوں اور فکر مندیوں کو دور کیا اور انہیں اطلاع کی کہ اے محمدؐ..وہ شخص جبریل تھا اور تم پر پیغمبری اتری ہے اس لئے اپنے خدشے ترک کر دو..اس شخص کا مرتبہ کتنا عظیم تھا جو وہ کچھ جان گیا جو ہمارے رسولؐ بھی اس لمحے تک نہ جانتے تھے..

تو یہ بچہ جو دراصل ایک چارلی تھا، نوفل ہو گیا..ایک طوفان کی آنکھ میں جنم لینے والا..

اُس ہستی کا ہم نام ہو گیا جس کی اطلاع سے، ہم سب کی آنکھوں میں آج ستارے چمکتے ہیں..

اگرچہ میمونہ نے ہر ماں کی طرح اپنی بیٹی کے پہلے بچے کی پیدائش کے موقع پر پہنچنے کی پوری تیاری کر رکھی تھی..ویزا، ٹکٹ، سامان سب کچھ تیار تھا پر اِدھر بچے نے شیڈول میں خود ہی تبدیلی کر دی..میمونہ تب پہنچی جب نوفل میاں طوفانوں سے کھیلتے ختنہ شدہ حالت میں گھر پہنچ چکے تھے..

نوفل کی دیکھ بھال کے سلسلے میں جب میمونہ عینی کو کوئی مشورہ دیتی تو وہ کہتی ''چھوڑیئے امی..آپ کو کیا پتہ کہ ایک بچہ کیسے پالتے ہیں..''

اس پر میمونہ جل کر کہتی ''ہاں مجھے کیا پتہ ہوسکتا ہے..تم لوگ تو خود بخود ہی پل گئے تھے..''

''ہم تو اچھے بچے تھے امی اور ہمیں پالنے میں آپ کو کچھ دشواری نہ ہوئی..سلجوق بھائی تو شروع سے ہی چپ چپ سے صوفی تھے..سمیر بھی ایک فرمانبردار فلسفی سا بچہ تھا..اور میں؟..میرا تو کچھ جواب نہ تھا..سب سے پیاری اور لاڈلی بیٹی..لیکن ہم سب تو نہایت آرام سے ٹُوری کلینک میں پیدا ہو گئے تھے..کیا آپ کا کوئی بھی بچہ ہری کین کے دوران پیدا ہوا ہے اور وہ بھی نوفل ایسا..آپ کو کیا پتہ کہ ایک نوفل کو کیسے پالتے ہیں..''

میمونہ شدید طور پر خفا ہو کر واپسی کے لیے اپنا سامان پیک کرنے لگتی تو عینی منت سماجت پر اتر آتی ''او ہو امی..آپ تو یونہی مائنڈ کر گئی ہیں..میں تو مذاق کر رہی تھی..ویسے آپس کی بات ہے آپ کا کوئی بچہ بھی نوفل جیسا نہیں ہے..''

اگر وہ یہ دعویٰ نہ کرتی تو ایک ماں نہ ہوتی.....

آرلینڈو میں اگرچہ پاکستانی تھے لیکن ذرا کم کم تھے.....

اور جتنے بھی تھے خوشحال اور متمول تھے..کہا جاتا ہے کہ ڈزنی لینڈ کے آس پاس جو علاقے ہیں وہ نیویارک سے بھی زیادہ مہنگے ہیں اور یہ ہندوستانیوں اور پاکستانی کی ملکیت ہیں..اس لئے کہ ان دنوں یہ ویرانے تھے جب یہ لوگ ادھر آئے اور شہر سے باہر زندگی بسر کرنے لگے اور تب ڈزنی لینڈ وجود میں آیا تو ان کا نصیب بھی جاگ اٹھا..ویسے ان میں سے بیشتر پاکستانیوں کے ذوق جمال اور لباس پر امریکہ میں طویل قیام کا کچھ اثر نہ ہوا تھا..آپ دور سے دیکھ سکتے تھے کہ وہ سٹور کسی پاکستانی کی ملکیت ہے کہ وہ مرید کے یا منڈی بہاؤالدین میں بھی ہوسکتا تھا..

ان پاکستانیوں میں سب سے زیادہ محبت بھری اور فراخ دل آنٹی طاہرہ تھیں جن کے میاں سعودی عرب کی جرمن سیمن کمپنی میں ایک عرصے سے ایک بلند انتظامی عہدے پر فائز تھے..خود سعودی عرب میں رہتے تھے اور بال بچوں کو بہتر تعلیم کی غرض سے فلوریڈا میں رکھا ہوا تھا..

آنٹی طاہرہ ایک شاندار گھر میں رہائش رکھتی تھیں اور عینی پر باقاعدہ مرتی تھیں..

طاہرہ آنٹی نے دراصل عینی کو ہم سے چھین لیا تھا اور ایک ایسی بیٹی بنالیا تھا جس کی کوئی

بھی فرمائش وہ رد نہ کرتی تھیں اور نہ ہی اسے خانگی صورتِ حال میں آزردہ دیکھ سکتی تھیں..ان کی اپنی اولاد بھی بہت لائق اور فرمانبردار تھی..ان کی زندگی میں صرف ایک دکھ تھا اور یہ ایک جان لیوا دکھ تھا..ان کا بیٹا قاسم جو ذہنی طور پر ایک پسماندہ بچہ تھا..

اور یہ بچہ عینی باجی پر فدا تھا..ایسا کہ اور کسی کی بات نہیں مانتا تھا..اکثر اپنی ماں کی بھی نہیں صرف عینی کی بات مانتا تھا..

کبھی طاہرہ آنٹی کا فون آجاتا کہ عینی آج قاسم بہت تنگ کر رہا ہے..سکول جانے سے انکاری ہو رہا ہے..چیزیں توڑ رہا ہے..تم آجاؤ..عینی اسے اپنے ساتھ بٹھا کر آئس کریم کھلانے لے جاتی اور وہ خوش ہو جاتا اور سکول جانے پر رضامند ہو جاتا..

عینی میں ماشاءاللہ قدرت کا عطیہ ایک صلاحیت ہے کہ وہ دوسروں کے دکھ بانٹ سکتی ہے اور انہیں مسرت دے سکتی ہے..

پاکستان میں جب کبھی میمونہ عینی کے بارے میں بہت فکر مند ہوتی اس کی جدائی میں چپ سی ہو جاتی تو میں ہمیشہ اسے ڈھارس دیتے ہوئے کہتا ''وہاں آنٹی طاہرہ جو ہیں..ان کی موجودگی میں ہم کیوں عینی کے لیے فکر کریں..وہ اسے ہم سے زیادہ چاہتی ہیں..''

ظاہر ہے آرلینڈو میں میری آمد پر ایک نہایت شاندار ڈنر کا اہتمام کیا اور ان کے میاں مظفر صاحب نے اپنے لان میں جو جھیل کے کناروں پر تھا باربی کیو کا زبردست بندوبست کیا..

پھر ایک ویک اینڈ ایسا آیا جب ہم نے میامی جانے کے لیے پَر نہ تولے..تولتے تب جب کھولتے..ہم نے کھولے ہی نہیں..کہ ابھی بارش شروع ہو جائے گی..یا ابھی خبر ملے گی کہ ہری کین کا ترینا اُمڈا چلا آرہا ہے یا ہری کین چارلی وغیرہ کی پھر سے آمد ہے..لیکن کیا دیکھتے ہیں کہ آسمان صاف شفاف نیلو نیل جھیل ہوا جاتا ہے..اور ہری کین کا ترینا اپنا رخ موڑ کر کسی اور جانب چلا گیا ہے..چنانچہ ہم نے فوراً اپنے سمٹے ہوئے پَر کھولے پھر تولے اور میامی کے سفر کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے..

ہم جاتو میامی رہے تھے لیکن میامی شہر نہیں جا رہے تھے بلکہ کوکو بیچ جا رہے تھے کہ ہمیں پَر کھولتے اور تولتے ذرا تاخیر ہو گئی تھی اور اتنا وقت نہ بچا تھا کہ ہم میامی پہنچ کر شہر دیکھتے پھر سمندر

میں پورا بدن نہ سہی ایک انگلی ڈبو کر شام سے پہلے گھر لوٹ آتے.. چنانچہ ہم نے کوکو بیچ کا رخ کر لیا. عینی نے اگرچہ بہت اصرار کیا تھا کہ ابو آپ فکر نہ کریں ہم میامی ہی چلتے ہیں کیا ہوا جو رات دیر سے آرلینڈو لوٹیں گے لیکن میں نے کوکو کو پسند کر لیا تھا.. جب پہلی بار یہ نام میرے کانوں میں اترا تو یوں محسوس ہوا جیسے ساز بجتے ہیں، محبت پھر سے ہونے والی ہے اور احمد رشدی گا رہا ہے.. کوکو کورینہ.. میرے خیالوں میں چھائی ہے اک صورت متوالی سی.. کوکو کورینا.. چنانچہ کوکو.. بیچ!

اب تک مجھ ملاّ کی دوڑ آرلینڈو کی مسجد تک ہی محدود تھی.. گھر سے نکلے تو شاپنگ کے لیے سٹی سنٹر چلے گئے.. بہت مار دھاڑ کی تو ڈزنی لینڈ جا پہنچے اور کبھی آرلینڈو کا دامن نہ چھوڑا.. تو پہلی بار یہ دامن چھوڑا اور اس ڈزنی لینڈ کی جادوگری سے باہر آئے.. باہر آئے تو گویا آس پاس جنگل اور ویرانے جنم لینے لگے.. اور جنگلوں کے بھیتر میں جو دلدلیں تھیں ان پر کیسے کیسے پرندے اڑان کرتے منڈلاتے تھے.. پام کے خوشنما شجر دھوپ میں کیسے دل فریب ہوتے تھے اور اپنے چیرواں پتّوں پر کرنوں کو ٹھہرنے نہ دیتے تھے کہ ذرا سی ہوا کے چلتے ہی کرنیں ان پتّوں سے گر کر گھنے جنگل کی تاریکی میں گم ہو جاتیں.. ان گھنے ذخیروں کے کناروں پر جہازی سائز کے بُل ڈوزر کھڑے تھے اور کرینوں کے زرافے گردنیں اٹھائے منتظر تھے.. تازہ بستیوں کے لیے زمین برابر کی جا رہی تھی.. گھنے جنگل ہموار ہو رہے تھے اور دلدلوں کو مٹی سے بھر کر انہیں رہائشی مکانوں کے قابل بنایا جا رہا تھا..

''بلال.. اگر یونہی نئی بستیاں آباد ہوتی رہیں تو کوئی دن جاتا ہے جب یہ آبائی جنگل معدوم ہو جائیں گے.. ان میں آباد جنگلی حیات کا نام و نشان مٹ جائے گا..''

''نہیں انکل ایسا نہیں ہوگا.. ایک سروے کے مطابق امریکہ میں اب بھی ساٹھ فیصد ایسا علاقہ ہے جہاں انسان گھر بنا لیں تو بھی یہاں کے قدرتی ماحول پر آنچ نہ آئے گی.. آپ نے ہوائی جہاز سے دیکھا ہوگا کہ فلوریڈا کی ہر آبادی کے گرد ابھی تک سینکڑوں میلوں میں پھیلے ہوئے جنگل اور جھیلیں ہیں.. دنیا بھر میں قدرتی ماحول کو جوں کا توں رکھنے کے باوجود انسانی بستیوں کے لیے اتنی زمین نہیں ہے جتنی امریکہ میں ہے.. آپ فکر نہ کریں اگلے دو تین سو برس تک تو یہ جنگل اور جھیلیں محفوظ رہیں گے.. میں نے شاید پہلے بھی تذکرہ کیا تھا کہ اگر آپ کہیں دس ایکڑ جنگل ایک رہائشی علاقہ تخلیق کرنے کے لیے حاصل کرتے ہیں تو آپ کو کہیں اور بدلے میں دس ایکڑ جنگل خرید کر وقف کرنا پڑتا ہے.. اور یہ وقف جنگل گویا مقدس ہو جاتا ہے اسے کوئی بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا..''

اور یہ حقیقت ہے کہ امریکہ کے علاوہ کینیڈا میں بھی اتنے وسیع اور بے انت علاقے پھیلے ہوئے ہیں کہ ان ممالک کو اگلے کئی سو برس تک انسانی رہائش کا کوئی مسئلہ درپیش نہ ہوگا.. مجھ میں جو ایک آوارہ گرد ہے اس کا ایک نظریہ ہے.. آئندہ صدیاں صرف ان ملکوں کی ہوں گی جن کے پاس بے شمار ویران وسعتیں اور جنگل ہیں جہاں گھر بن سکتے ہیں.. ان میں امریکہ اور کینیڈا کے علاوہ افریقہ کے کچھ ممالک روس اور سنٹرل ایشیا بھی شامل ہیں.. جبکہ بیشتر ایشیائی ممالک کثرت آبادی کے بوجھ تلے دب جائیں گے کہ ان کے پاس اس آبادی کی رہائش کے لیے ایک چپّہ زمین بھی نہ ہوگی.. آج سے دو سو برس بعد کا پاکستان، ہندوستان یا بنگلہ دیش تصوّر میں لائیے.. یہاں تو لوگ بحیرۂ عرب یا خلیج بنگال میں گر رہے ہوں گے کہ زمین پر ان کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی..

تقریباً دو گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد گھنے ذخیرے تو پیچھے رہ گئے اور یوں لگا جیسے شاہراہ ایک سمندر میں غرق ہونے کو جا رہی ہے.. نظر کے سامنے بے انت پانیوں کا پھیلاؤ وسیع ہوتا گیا.. ہماری کار ایک پُل پر سے ایک عرصے تک گزرتی رہی اور ہمارے نیچے گہرا سمندر بھی ایک عرصے تک گزرتا رہا.. جیسے ایک بچے سے ''کارگزاری'' کو فقرے میں استعمال کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے کہا ''ہم نے ایک پُل پر سے اپنی کارگزاری''.. تو یہ ایک ایسا ہی طویل پُل تھا جس پر سے ہم نے اپنی کار گزاری.. اور دیر تک گزاری.

پُل کے پار ہوئے تو کوکو کا شہر شروع ہو گیا..

یہ شہر تو خیر کیا تھا.. بس کوکو ہی تھا.. کورینا بھی کہیں نہیں تھی.. ویران ریستوران.. تیز دھوپ.. ایک سیاہ فام بوڑھا آرام کرسی پر اونگھتا ہوا اور بیش قیمت کاروں کے بے شمار شوروم کہ یہاں امریکہ کے متمول ترین افراد ڈیرے ڈالے ہوئے تھے.. سمندر کناروں پر رہائش رکھتے تھے اور صرف وہی ایسی مہنگی کاریں افورڈ کر سکتے تھے..

رونق اس لئے نہ تھی کہ پُرتعیش گھروں کے مکین اپنے سوئمنگ پولز میں تیرتے تھے.. گھر کے ساتھ جو سمندر ہے اس میں ڈبکیاں لگاتے تھے اور گھریلو شراب خانوں میں موج میلہ کرتے تھے تو انہوں نے باہر آ کر کیا کرنا تھا.. باہر تو وہی رونق کرتے ہیں جن کے گھروں میں کچھ نہ ہو..

ہم سمندر کے قریب ہوئے تو سمندر دکھائی نہ دیا.. ساحل کے کناروں پر قطار اندر قطار مہنگے ہوٹلوں کی عمارتیں دکھائی دیں اور یہاں بھی ویرانی تھی کہ ان ہوٹلوں میں مقیم سیاحوں کو بھی

اپنے کمرے سے نکل کر باہر جانے کی حاجت کم ہی ہوتی تھی.. سمندر کی خواہش ہوئی تو کھڑکی کے پردے ہٹا کر اس کا نظارہ کر لیا..

آسمان نیلاہٹ سے غضبناک ہوتا تھا اور پام کے بلند درخت اس کی نیلاہٹ میں اپنا سبزہ گھولتے تھے..

ہم نے ایسے ہی کچھ سمندری ہوا کی زد میں آ کر جھومتے ہوئے پام کے درختوں تلے کار پارک کی.. اور کڑی دھوپ میں پارک کی کہ کھجور کی مانند پام کے درخت کا بھی سایہ نہیں ہوتا..

کار پارک کی اور بوسیدہ لکڑی کے ایک پل پر قدم رکھتے سمندر کے روبرو ہو گئے..

پُل کی ریلنگ پر براجمان ایک صاحب سیاہ عینک لگائے.. برمیوڈا شارٹس میں ملبوس.. سمندر کو تکتے جاتے تھے.. ان کے بازو ٹیٹو کے گُل بوٹوں سے بھرے ہوئے تھے.. وہ جانے کس دھیان میں تھے کہ ہم پاس سے گزرے تو انہوں نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا کہ کون گزرتا ہے کہ ان کی آنکھیں سمندر پر تھیں..

ہم نے سمندر کی قربت کے احترام میں اپنے جوتے اُتار دیئے اور ننگے پاؤں گرم ریت پر چلتے ہوئے اس کی لہروں تک آ گئے اور ان لہروں نے بھی ہمارا احترام کیا اور ہمارے پاؤں چھوئے.. یہ ساحل بھی پُرہجوم نہ تھا.. چند لوگ آرام دہ کرسیوں پر ٹانگیں پھیلائے دھوپ سینک رہے تھے اور غالباً سو چکے تھے اور سمندر کی لہروں پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سرفنگ بورڈز پر اپنے آپ کو قائم رکھے کبھی نظر سے اوجھل ہو جاتے تھے اور کبھی پانیوں پر پھسلتے نمودار ہو جاتے تھے..

کوکو بیچ واقعی کوکو کورینا تھی.. اک صورت متوالی تھی.. اس کا سمندر نہ تو گدلا تھا اور نہ ہی شور مچانے والا تھا.. یہ ایسا خاموش نیل بھرا تھا کہ آسمان کی نیلاہٹ کو چھوتا تھا تو اس کے رنگ میں اتر جاتا تھا اور یوں کچھ گمان نہ ہوتا تھا کہ سمندر کی حد کہاں ہے اور آسمان کہاں سے شروع ہوتا ہے..

کبھی شائبہ ہوتا کہ یہ آسمان ہے جس میں سے جھاگ اُٹھتی ہے اور اس کی لہروں پر سرف بورڈ ابھرتے اور اوجھل ہوتے ہیں اور پاؤں تلے جو ریت ہے وہ آسمان کی ہے.. اور کبھی یہ لگتا کہ یہ تو سمندر ہے جو ہم پر سایہ فگن ہے اور ابھی اس کے پانی ہم پر گرنے لگیں گے.. کچھ فرق نہ تھا سمندر اور آسمان میں..

نوفل میاں کی ٹی شرٹ اتار کر انہیں صرف نیکر میں رہنے دیا گیا اور کھلا چھوڑ دیا گیا.. دو چار ننھے قدم ریت میں دھرتے بمشکل نکالتے پھر چلنے کی کوشش کرتے اور پھر ''بیلے بیلے''

کرنے لگتے کہ آؤ میری مدد کرو..

نوفل پہلی بار سمندر دیکھ رہا تھا اور سمندر بھی پہلی بار نوفل کو دیکھ رہا تھا..

وہ دونوں طے نہیں کر پا رہے تھے کہ یہ کیا ہے..

نوفل کبھی اپنے پیٹ پر ہاتھ مارتا اور رونے کو ہوتا اور جب کوئی لہر اس کے پاؤں تک آتی تو وہ ذرا ڈر کر مسکرانے لگتا.

اگرچہ اسے پانی سے بے حد لگاؤ تھا..

ڈائننگ ٹیبل پر رکھے پانی سے بھرے گلاس میں یکدم ہاتھ ڈال کر اسے چھلکا کر ''بیلے بیلے'' کرنا اس کا مرغوب مشغلہ تھا. نظر بچا کے گالف کورس کی کسی جھیل میں ہاتھ چلانا اسے بے پناہ مسرت سے ہمکنار کرتا تھا. لیکن اس کی محبوب ترین تفریح واش روم کے اندر پائی جاتی تھی.. اگر واش روم کا دروازہ اتفاقاً کھلا رہ گیا ہے تو نوفل میاں تیر کی طرح اس کے اندر جاتے ہیں اور اس سے پیشتر کہ عینی اس کا پیچھا کرتی ہوئی آن پہنچے وہ کموڈ کی تہہ میں جمع شدہ پانی میں ہاتھ ڈال کر ''بیلے بیلے'' کرتے چھینٹے اڑا رہے ہیں.. چنانچہ جس نے پانی صرف ایک جھیل میں.. ایک گلاس یا کموڈ کی تہہ میں ہی دیکھا ہو جب اس کے سامنے ایک سمندر آ جائے تو وہ کیا محسوس کرے گا..

بے شک کوکو بیچ کی سفید ریت اور تازہ نمکین سمندری ہوا اور پام کے درختوں کی سجاوٹ نے مجھ پر بہت اثر کیا لیکن مجھ پر اس تصور نے.. بلکہ اس کھوج نے کہ جب ایک برس کا بچہ پہلی بار اپنے سامنے سمندر کا بے انت پھیلاؤ دیکھتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے.. وہ محسوس کیا کرتا ہے.. اس خیال نے زیادہ اثر کیا.. کیونکہ یہاں ایک بالغ کی قوت متخیلہ ناکارہ ہو جاتی ہے.. اگر میں نوفل کی عمر کا ہوتا اور اس کی آنکھوں سے سمندر کو دیکھتا تو مجھے وہ کیا نظر آتا.. یہ خیال مجھ پر بہت اثر کرتا تھا..

میں اُس سے الگ ہو کر اپنی ان عمر رسیدہ ہوتی آنکھوں میں سمندر سمونے کے لیے کچھ دور چلتا گیا.. کوکو بیچ کی جھاگ بھری لہریں کیسی برق رفتاری سے چلی آتی تھیں اور میرے پاؤں تک آ کر ان کے نیچے جو ریت تھی اسے کھسکاتی.. چند لمحوں کے لیے مجھے بے بس کر دیتی تھیں.. ان میں واپسی پر اتنا زور ہوتا کہ جیسے مجھے بھی بہا لے جائیں گی.. اور تب مجھے ایک دو نہیں اکٹھے پانچ سیاہ تابوت نظر آنے لگے جو ایک قبرستان کی جانب لوگوں کے کاندھوں پر سمندر کی لہروں کی مانند اُبھرتے ڈوبتے چلے جاتے تھے..

ظفر شیخ مسکراتا ہوا..اُس جیسے دھیمے اور محبت بھرے مزاج کا شخص آج تک میں نے نہیں دیکھا..اُس کے اندر صبر اور تحمل کے سوا اور کچھ نہ تھا..مسکراہٹ اور محبت کے سوا اور کچھ نہ تھا..

ظفر شیخ اپنی جھکی ہوئی آنکھوں والی ہمیشہ ایک سفید اوورآل میں باپردہ بیوی کے ہمراہ جناح باغ میں سیر کرتا ہوا..جھک کر ملتا اور بدستور مسکراتا ہوا..

اُس کا بڑا بیٹا عثمان میرے بڑے بیٹے سلجوق کا ہم عمر تھا..اور اب تو یقین بھی نہیں آتا کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی تھے..وہ جو کچھ بھی..اپنے بیٹے کے لیے خریدتا وہی سلجوق کے لیے بھی خرید لیتا..اور میں اس کی اس عادت سے بے حد عاجز تھا..ایک روز میرے پورچ میں بچوں کی ایک خوبصورت نئی نکور سائیکل کھڑی تھی کہ ظفر صاحب کا ڈرائیور دے گیا ہے..کیوں؟

''میں نے عثمان کے لیے ایک سائیکل خریدی تھی تو سلجوق کے لیے بھی کیوں نہ خریدتا'' ظفر نے کہا تھا..

یہیں کہیں..امریکہ کے انہی ساحلوں کے کنارے وہ بال بچوں سمیت ایک کار پر سفر کرتا تھا..اور پھر ایک مقام پر جہاں سمندر پُرشور اور شاندار تھا وہ وہاں ایک یادگار تصویر اتارنے کے لیے رک جاتا ہے..اُس کا پورا خاندان..بیوی اور تینوں بچے سمندر کے کناروں پر کھڑے مسکرا رہے ہیں اور پھر یکدم ظفر کی آنکھوں سے لگے کیمرے کے ویو فائنڈر سے غائب ہو جاتے ہیں..ابھی وہ نظر آ رہے تھے اور ابھی ویو فائنڈر خالی ہے..ایک بلند لہر ایسی آئی کہ ان چاروں کو بہا لے گئی..ظفر بے اختیار ان کے پیچھے..اپنے جگر گوشوں کو بچانے کی خاطر سمندر میں چلا جاتا ہے..اور پھر کبھی واپس نہیں آتا..پورا خاندان بچھڑتا نہیں پھر سے یکجا ہو جاتا ہے..سمندر میں کچھ دیر بسیرا کرتا ہے اور پھر سمندر سے بھی برداشت نہیں ہوتا کہ میں نے کیوں انہیں اپنی مرگ آبی آغوش میں لے لیا اور وہ انہیں پھر سے ساحل کے حوالے کر دیتا ہے کہ یہ تو اجنبی دیس ہے جاؤ اپنی مٹی میں جاؤ اور مٹی ہو جاؤ..

تو مجھے اُس سمندر سے ڈر لگ رہا تھا..

میں اُس کی لہروں پر اکٹھے پانچ سیاہ تابوت ابھرتے ڈوبتے دیکھتا تھا جو لاہور کے ایک قبرستان کی جانب بہتے چلے جاتے تھے..

نوفل پر دھوپ کا اثر ہو گیا..

وہ ابھی چہک رہا تھا..پانی کے قریب جانے کی کوشش کرتا تھا اور میں خوفزدہ ہو کر اسے روک

دیتا تھا..وہ ابھی چہکتا تھا اور ابھی یکدم چپ ہو گیا..اس کے گال تمتمانے لگے..لال بھبوکا ہونے لگے اور وہ کچھ بے سُدھ سا ہو گیا..تو ہم نے فوری طور پر اسے گود میں اٹھایا اور اپنی کار تک لے آئے..عینی نے قدرے نروس ہو کر فٹافٹ اس کے تمام کپڑے..یعنی اس کی نیکر اتاری اور پھر منرل واٹر سے اس کے بدن پر خوب چھڑکاؤ کیا..اسے نہلایا..دوسری بوتل کے بعد وہ بے سُدھ سے قدرے سُدھ ہوا..اور ذرا نقاہت سے اپنی واحد وکیبلری ''بیلے بیلے'' کرنے لگا..ہم تینوں بھی ہوش میں آ گئے اور فیصلہ کیا کہ کوکو بیچ کو خیر باد کہہ دیا جائے..اس کی گرم ریت اور اس پر اترتی تیکھی سلگتی کرنوں سے دور ہوا جائے..

واپسی پر ہم نے کیپ کینورل کا راستہ اختیار کیا..

یہیں سے حضرت انسان نے ستاروں پر کمندیں ڈالی تھیں..

جانے علامہ اقبال کو اُن نوجوانوں سے بھی محبت تھی یا نہیں کہ ستاروں پر کمندیں تو انہوں نے ہی ڈالیں..ہم نے تو صرف پتنگوں میں ڈوریں ڈالیں اور انہیں ستاروں کی جانب اڑایا..اور یوں خودی کو بلند کرتے رہے..

کیپ کینورل کی بندرگاہ میں دنیا بھر کے سیاحتی کروز شپ لنگر انداز تھے..

ہم ''ناسا'' کی عمارتوں کو چھوتے ہوئے نکلے، جن کے اندر شنید ہے کہ تمام موسم ہوتے ہیں..سارے موسم تخلیق کر لئے جاتے ہیں..شدید سردی، برفباری، قیامت کی گرمی یہاں تک کہ موسلا دھار بارشیں بھی تاکہ خلاء میں جانے والوں کو ان موسموں میں سے گزار کر ان کا عادی کیا جا سکے..

جی ہاں..وہی کیپ کینورل جہاں سے سپیس شٹل ایک دیوزاد راکٹ پر سوار کائنات کو تسخیر کرنے کے لیے زمین سے اٹھتی ہے..

عینی کا کہنا تھا کہ جب بھی کسی خلائی جہاز نے لانچ ہونا ہوتا ہے تو وہ ٹیلی ویژن پر یہ منظر دیکھتی ہے اور جونہی راکٹ فائر ہونے لگتے ہیں اور وہ شٹل زمین سے جدا ہوتی ہے تو وہ فوراً اپنے گھر کے پچھواڑے میں گالف کورس پر آ جاتی ہے اور کیپ کینورل کی جانب تکنے لگتی ہے اور چند لمحوں کے بعد وہ سپیس شٹل آسمانوں میں بلند ہوتی اسے دکھائی دینے لگتی ہے..

ابھی کچھ عرصہ پیشتر ایک ایسی ہی خلائی کشتی جب آسمانوں کے اندر دور تک تیر کر..خلاؤں کے سمندروں میں رواں ہو کر..جب زمین کی جانب واپس آ رہی تھی، اتر رہی تھی تو جانے کیا ہوا..جل کر راکھ ہو گئی..خلاء نورد بھی راکھ ہوئے..اور ان میں سے خلاء کی مسافر ایک

ہندوستانی لڑکی بھی تھی جس کے لیے وہ شٹل ایک چتا ثابت ہوئی اور وہ بھی جل مری..وہ ایک پنجابی کڑی تھی..ایک بہادر سوہنی..آج اس کے آبائی قصبے میں اس کی یاد میں اس کا ایک مجسمہ آویزاں ہے جہاں اس کے پاؤں تلے پھولوں کے ڈھیر ہوتے ہیں..وہ پنجاب کی ایک ہیروئن ہے..

اب ہمارے ہاں ایک تو مجسمہ سازی کی ممانعت ہے اور اگر اجازت ہوتی تو بھی ہم کس ہیروئن کا مجسمہ نصب کرتے..اگر ایک سر سے پاؤں تک سیاہ چادر میں روپوش ڈنڈا بردار ہیروئن کا مجسمہ نصب کرتے تو کچھ عجیب سا نہ لگتا اور اگر ہماری اس ہیروئن کو خبر ہو جاتی تو وہ ڈنڈے مار مار کر ہمارا بھرکس نکال دیتی اور اپنے پرائیویٹ قاضی کے سامنے پیش کر کے ہمیں درّے لگواتی..

یہیں کہیں سے وہ لوگ خلاؤں میں گئے جنہوں نے چاند پر پہلا قدم رکھا..اور وہاں..نہ انہوں نے اپنی قومیت پر فخر کیا اور نہ ہی اپنے عقیدے کا حوالہ دیا بلکہ اس پہلے قدم کو انسانیت کیلئے ایک بڑا قدم قرار دیا..

یہ 1969ء کا قصہ ہے..''نکلے تری تلاش میں'' اور ''اُندلس میں اجنبی'' کے سفر کے زمانے..میں ہالینڈ میں اپنے عزیز دوست حنیف کے گھر میں تھا..

''اُس شب ہم نے کھانا گھر پر ہی کھایا کیونکہ ٹیلی ویژن پر ایک بہت ہی خصوصی پروگرام دکھایا جانا تھا..آج خلائی جہاز اپالو گیارہ چاند پر اتر رہا تھا..علی الصبح نیل آمسٹرانگ ایک آؤٹ آف فوکس بھوت کی طرح چاند پر اترا'' انسان کا ایک قدم مگر انسانیت کیلئے ایک عظیم جست..'' چاند پر انسان کے اولین الفاظ..

ویسے میں تو ان اخلاق باختہ جھوٹے اور فریبی لوگوں پر یقین نہیں رکھتا..

دیکھیں اگر ملک بھر کے جید علمائے کرام دوربینوں اور ہوائی جہازوں کی مدد سے بھی چاند تلاش نہیں کر سکتے..یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ آج چاند نکلا ہے یا نہیں تو یہ گمراہ کفار کیسے یہ جان سکتے ہیں کہ جب ہم چاند تک پہنچیں گے تو وہ نکلا بھی ہوگا یا نہیں..

یہ نرے احمق ہیں ہمارے علماء کرام سے مشورہ کئے بغیر چاند کی جانب چل نکلتے ہیں..تو میں ان اخلاق باختہ جھوٹے اور فریبی لوگوں پر کچھ یقین نہیں رکھتا..



''چیز کیک فیکٹری''

عینی کے گھر کے پچھلے برآمدے میں بیٹھے ہوئے جب سامنے کی جھیلوں پر تاریکی اترتی تھی اور کوئی پرندہ نہ اترتا تھا..اور جنگل کی گھناوٹ میں بسیرا کرنے والے پنکھ پکھیرو ساری شام غُل کرتے تھک ہار کر چونچیں بند کر لیتے تھے اور ہر سُو چپ کا راج ہو جاتا تھا تو میں اپنے اس سفرنامے کی یادداشتیں سنبھالتا گھر کے اندر آ جاتا تھا..

عینی اور بلال اکثر مجھے رات کے کھانے کے لیے آرلینڈو کے کسی دور افتادہ ریستوران میں لے جاتے..ایک بار وہ مجھے ''کرابا'' لے گئے..اور میرے حساب سے وہ مجھے بھری دوپہر میں لے گئے کہ امریکیوں کے ڈنر کا آغاز چھ بجے شروع ہو جاتا ہے..مجھے عجیب سا لگا کہ باہر ابھی ہلکی دھوپ ہے اور اندر ہم رات کا کھانا کھا رہے ہیں..اسی ''کرابا'' میں میں نے زندگی کی ایک بہترین اور رس بھری سٹیک کھائی..اب یہ مت پوچھنے بیٹھ جایئے گا کہ وہ سٹیک حلال تھی یا نہیں..کیونکہ ایک مقامی مولانا نے باقاعدہ فتویٰ دیا تھا کہ اسلام ہمیں ہر پیچیدگی میں سے سرخرو ہونے کی اجازت دیتا ہے..اول تو اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے اور اگر کچھ تردّد اور تشویش ہے اور آپ کی پلیٹ میں ایک عدد روسٹ چکن ''مجھے کھاؤ..کھا جاؤ'' پکار رہا ہے یا ایک سلگتی ہوئی سٹیک دھوئیں میں مچاتی ہے تو آپ اُس گوشت پر جو کہ مشینوں کے ذریعے ہلاک شدہ جانوروں اور پرندوں کا ہے..اُس پر چھری رکھ کر ''بسم اللہ'' پڑھ لیں تو وہ آپ کے لیے حلال ہو جائے گا..

چونکہ میں نے ہمیشہ علماء کرام کی دینی فراست کے سامنے سر جھکایا ہے اس لئے یہاں بھی میں نے اپنا سر جھکایا چھری سٹیک پر رکھی اور ''بسم اللہ'' پڑھ کر اسے شرعی طور پر حلال کر لیا اور یقین مانئے اسے کھاتے ہوئے بے حد لطف اندوز ہوا..

ایک اور شب بلال نے کہا ''انکل آج ہم آپ کو چیز کیک فیکٹری لے کر جائیں گے..''

میں نے اُسے سرزنش کی کہ بیٹے مجھے تو بہت بھوک لگی ہے اور تم مجھے کسی فیکٹری میں لے جانا چاہتے ہو..بے شک وہاں پنیر کے کیک مینوفیکچر ہوتے ہیں لیکن میں تو کیکوں سے زیادہ رغبت نہیں رکھتا..مجھے کوئی سیدھا سادا عام سا کھانا کھلا دو پلیز!

تو وہ میری نادانی پر مُتبسّم ہوا ''انکل یہ ''چیز کیک فیکٹری'' تو ایک ایسی ریستوران چین ہے جس کی خوراک کے بہت چرچے ہیں..علاوہ ازیں اس کے چیز کیک ایسے ہیں کہ آپ آرلینڈو کو بھول جائیں گے انہیں کبھی نہیں بھولیں گے..''

ہم آرلینڈو سے نکلے تو خاصی دیر نکلتے گئے..خاصی طویل مسافت کے بعد ''ونٹر پارک'' نامی ایک دھیمے سروں کے قصبے میں داخل ہوئے جس کا عمارتی جمال قابل دید تھا..یہ ایک مختصر سا پیرس تھا..نفاست اور حسن کی دھند میں سے ظاہر ہوتا ایک ثروت مند قصبہ جس کے آخری کنارے پر یہ ''چیز کیک فیکٹری'' تھی..

ذہن میں تصور تو یہی تھا اس فیکٹری میں مشینوں کی گڑگڑاہٹ ہوگی اور دھڑا دھڑ چیز کیک مینوفیکچر ہو رہے ہوں گے..لیکن وہاں تو یونانی ستونوں پر ایستادہ ایک معبد نما عمارت تھی جس کے باہر درجنوں لوگ چہل قدمی کر رہے تھے، منتظر تھے کہ کب ہماری باری آئے اور ہم اندر جا کر اس فیکٹری میں تیار کردہ خوراکوں سے کام و دہن کی تواضع کریں..

عینی نے اندر جا کر کاؤنٹر سے اپنی باری کا ٹوکن حاصل کیا اور ہم بھی منتظر خواتین و حضرات کی صف میں شامل ہو گئے..کچھ دیر بعد میں ذرا ایک محفوظ فاصلے پر ہو کر سگریٹ پینے لگا..وہاں ایک موٹا امریکی بوڑھا پیٹ پر ہاتھ جمائے نیکر پہنے سر پر ایک چھاج نما ہیٹ جمائے ٹہل رہا تھا..وہ میرے قریب سے گزرتا تو بڑبڑاتا ''ہاں..میں نے کچھ زیادہ ہی کھا لیا ہے..''

اور جب اُس نے کوئی دسویں بار میرے قریب سے گزرتے ہوئے یہی فقرہ کہا تو میں نے مروّت کے مارے پوچھ ہی لیا کہ..کھایا کیا تھا؟

''وہ پتہ نہیں..کچھ کھایا تھا..ہاں شاید اورنج چکن کھایا تھا..''

''وہ تو نہیں کھانا چاہئے تھا..'' میں نے یونہی کہا..

''کیوں؟''

''اُس کے کھانے سے یہی کچھ ہوتا ہے جو آپ کو ہو رہا ہے..''

''تم نے کبھی اورنج چکن کھایا ہے؟''

''نہیں..''

''تو تم کیسے جانتے ہو کہ اُس کے کھانے سے یہ کچھ ہوتا ہے..''

''آپ کو دیکھ کر جان گیا ہوں کہ اورنج چکن کھانے سے یہی کچھ ہوتا ہے..''

''فنی مین'' وہ ناک چڑھا کر آگے بڑھ گیا..

وہ جب بھی میرے قریب سے گزرتا کہ چکن اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا ناک چڑھا کر ذرا غصّے کی اداکاری کرتا ہوا کہتا ''فنی مین''

بالآخر ہمارا ٹوکن نمبر پکارا گیا اور ہم چیز کیک فیکٹری کے اندر داخل ہو گئے..

یہ ریستوران واقعی اتنا وسیع تھا کہ اس پر ایک فیکٹری کا گمان ہوتا تھا اور اس فیکٹری میں جتنے بھی ''مزدور'' تھے وہ سب کھانے پینے میں مصروف تھے..اگرچہ پینے میں زیادہ مصروف تھے اور بلند رُوحوں میں تھے یعنی سپرٹس میں تھے..یوں بھی سپرٹس حلق سے اترتے ہی ناکارہ ترین رُوحوں کو بھی بلند درجات پر فائز کر دیتی ہیں..

ہم نے وہاں ایک میز پر جا بسیرا کیا اور ہمارے حصّے میں ایک ہسپانوی ویٹر آ گیا..اتنا پُرمسرت جیسے ہم اس کے ایک مدت سے بچھڑے ہوئے کزن ہوں اور یونہی سر راہ ملاقات ہو گئی ہو..اس نے فوری طور پر جھک کر ہمارے سامنے مینو کارڈ رکھے اور اپنا تعارف کروایا ''میرا نام ماریو ہے..مَیں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں..آپ کو چیز کیک فیکٹری میں خوش آمدید کہتا ہوں..آپ نہیں جانتے کہ آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے کتنی مسرت ہو رہی ہے..آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟''

''ماریو..'' میں نے اس کی خوشدلی سے متاثر ہوتے ہوئے کہا ''آپ ذاتی طور پر اس مینو میں درج کون سی ڈش میرے لئے تجویز کریں گے..میں آپ کی پسند کی ڈش کھانا چاہتا ہوں..''

ماریو مسکراتا رہا..

میں نے پھر اپنا سوال دوہرایا کہ کون سی ڈش..

ماریو بدستور مسکراتا رہا..

عینی نے میرے کان کے قریب منہ لا کر کہا ''ابّو اس ماریو نے استقبالیہ کلمات رٹ رکھے ہیں اور ان کے سوا یہ انگریزی میں خلاص ہے آپ مینو کارڈ پر اپنی پسند کی خوراک پر انگلی رکھ

دیں تو وہ جان جائے گا کہ آپ کیا کھانا چاہتے ہیں..''

عینی اور بلال نے کاجو چکن آرڈر کیا اور میں نے اورنج چکن پسند کیا..وہی کچھ جو باہر ٹہلتے موٹے امریکی نے کھالیا تھا اور پھر اسے کچھ ہوگیا تھا..

اورنج چکن جب آیا تو سلاد اور چاولوں کے ہمراہ آیا اور وہ اتنا پرذائقہ تھا کہ اس کے کھانے سے اگر کچھ ہو جاتا تھا تو ہو جائے..

یاد رہے کہ ہمارے ہمراہ نوفل بھی تھا اور اس کی موجودگی میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ دنیا کا کوئی بھی کام اطمینان سے کیا جائے..ریستوران میں بیٹھ کر ایک پرسکون ڈنر کیا جاسکے..چنانچہ پہلے تو بلال اسے گود میں اٹھا کر بہلاتا ریستوران کے باہر لے گیا اس دوران عینی نے کچھ لقمے شتابی سے حلق سے اتارے اور پھر نوفل کو وصول کر کے باہر چلی گئی تاکہ بلال موقع کا فائدہ اُٹھا کر کچھ کھا لے..

یہ ایک مہنگا ریستوران تھا اور اس میں صرف مہنگے لوگ آتے تھے..اگرچہ ہم سستے لوگ تھے لیکن امریکہ میں آکر ذرا مہنگے ہو گئے تھے..ڈالر کو ساٹھ روپے کی بجائے ایک روپے کا جان کر خرچ کرتے تھے..اگرچہ ایسا کرنے سے جان جاتی تھی..

بلال کو شکایت تھی کہ چیز کیک فیکٹری میں اب جو لوگ آنے لگے ہیں وہ نہایت بے ہودہ اور بدذوق ہیں..پہلے زمانوں میں جو لوگ آتے تھے باقاعدہ ڈریس اپ ہو کر سج سنور کر آتے تھے اور اب جو آتے ہیں وہ نیکروں اور چپلوں میں چلے آتے ہیں..بلال ذرا رکھ رکھاؤ کا قائل نوجوان تھا..

خوراک کی مقدار بے بس کر دینے والی تھی..جب میں اپنے اورنج چکن سے اتنا لبریز ہو گیا کہ میرے اندر اورنج یعنی مالٹوں کے باغ بہار دینے لگے اور چکن پھڑ پھڑانے لگے تو میں نے ہار مان لی اور تب بلال نے کہا ''انکل اب آپ یہاں کی سپیشلٹی چیز کیک کھائیں گے..''

''نہ..'' میں نے ہراساں ہو کر کہا ''ہم تو نہیں کھائیں گے بلکہ کھا نہ سکیں گے کہ میرے اندر چاول کے ایک اور دانے کے لیے بھی گنجائش باقی نہیں ہے..''

پر جب وہ چیز کیک آیا تو آ کر چھا گیا گنجائش نکلتی گئی. آج تک یورپ اور امریکہ میں میں نے جتنے بھی ڈیسرٹ یا میٹھے کھائے تھے یہ چیز کیک ان سب میں ذائقے کے حساب میں سب سے بلند مقام پر فائز تھا..میں نے کھایا تو کھاتا چلا گیا کہ بابر بہ عیش کوش ایں چیز کیک دوبارہ نیست!



''ایڈیٹ بوکس''

دنیا میں آج تک سب سے زیادہ احمق کس نے بنائے ہیں؟

سب سے زیادہ ایڈیٹ کس نے جنم دیئے ہیں؟

جی ہاں ''ایڈیٹ بوکس'' نے جسے عرف عام میں ٹیلی ویژن بھی کہا جاتا ہے..

یہ دراصل ایک احمق تیار کرنے والی مشین ہے جس کے سامنے ایک اچھا بھلا ذی ہوش اور دانا شخص جب تا دیر بیٹھا اسے تکتا جاتا ہے تو ہولے ہولے وہ ایک احمق میں بدل جاتا ہے..

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بیان سٹریٹ فرام دے ہارسز ماؤتھ ہے..براہ راست گھوڑے کے منہ سے ہے اور وہ گھوڑا میں ہوں..کیونکہ میں ایک طویل مدت سے اس احمق بنانے والی مشین سے منسلک ہوں اور لوگوں کو احمق بناتا چلا آیا ہوں..

ذرائع ابلاغ کی ایک ہائی پروفائل میٹنگ میں ان زمانوں کے وزیر اطلاعات نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک میڈیا کیا ہے..

تو میں نے گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''میڈیا کا مطلب ہے لوگوں کو بے وقوف بنانا..''

اس پر میٹنگ میں شامل بلند درجات کے سرکاری افسروں نے تبسم فرمایا جب کہ وزیر اطلاعات نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا ''تارڑ صاحب ہم تو آپ سے ایک مدلل اور دانشورانہ تجزیے کی توقع کر رہے تھے..''

اس پر میں نے بھی تبسم فرمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''سر آپ کی فرمائش پر میں وہ بھی پیش کر دیتا ہوں..'' چنانچہ میں نے بلند بانگ اگرچہ کھوکھلی لفاظی میں محب الوطنی، ثقافت،

روایات‘ افلاطون کی ''ریاست‘‘ اور میکاولی کی ''پرنس‘‘ وغیرہ کے ملغوبے سے ایک مدلل تجزیہ پیش کر دیا جس پر اہل میٹنگ جھوم جھوم گئے اور ابھی وہ مزید جھومنے کو تھے کہ میں نے آخر میں عرض کر دیا کہ جناب اس تجزیے کا نچوڑ بھی یہی ہے کہ میڈیا کا مطلب ہے لوگوں کو بے وقوف بنانا.. اور یونہی بے وقوف نہ بنانا بلکہ اپنی پسند کے مطابق بے وقوف بنانا..

اگر مستقبل میں مجھے وزارت اطلاعات نے ایسی میٹنگوں میں دعوت دینے سے گریز کیا تو میں اُن کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا..

نہ صرف پاکستان میں بلکہ بیشتر ترقی پذیر ممالک میں بھی میڈیا اسی نوعیت کی خدمات سرانجام دیتا ہے.. لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق احمق بناتا ہے اور وہ خوشی خوشی بن بھی جاتے ہیں..

اُن دنوں بھٹو صاحب کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی.. اور اس کے ماضی کے نہایت ملنسار ار عاجز.. لاہور کے گورنر ہاؤس میں جب بھٹو ایک صوفے پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا اور اٹھنے لگا تھا تو فوراً کمر تک جھک کر اس کی جوتیاں اٹھا کر اس کے پاؤں کے آگے رکھنے والے جنرل سے اس کی جاں بخشی کی اپیلیں کی جا رہی تھیں.. انہی دنوں ریڈیو پاکستان میں ایک سکرپٹ لکھتے ہوئے میں نے احادیث اور قرآنی آیات کا ایک مجموعہ دیکھا.. اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس میں جا بجا ان آیات اور احادیث پر سرخ مارکر کے نشان تھے کہ ان کا احوالہ نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ ان میں عفو و درگزر کی تلقین تھی.. معاف کر دینے اور رحم کرنے کے بارے میں حکم تھا.. یعنی قرآن اور حدیث کے چند حوالے بھی ممنوع تھے تا کہ لوگوں کو اپنی پسند کا بے وقوف بنایا جا سکے..

1971ء کی شکست آپ کو یاد ہوگی.. فوج کو سیاستدانوں کو تو یاد نہیں آپ کو تو یاد ہوگی جب پاکستانی فوج ہتھیار ڈال کر سرخرو ہو چکی تھی اور خبروں میں صرف ایک فقرہ تھا کہ آج ایک خصوصی معاہدے کے تحت ہندوستانی فوجیں ڈھاکہ میں داخل ہو گئیں اور پھر.. ملّی ترانے گونجنے لگے اور ایک مخمور صدر.. ایک جنرل تقریر کر رہا تھا اور ونسٹن چرچل کی ایک تقریر کی بھونڈی نقل کر رہا تھا کہ.. جنگ جاری رہے گی.. صحراؤں میں جنگلوں میں.. جنگ جاری رہے گی اور ہم جیسے لوگوں نے نہ بی بی سی پر اور نہ آل انڈیا ریڈیو پر کچھ یقین کیا بلکہ اپنے پاک میڈیا پر یقین کیا.. ہم احمق بنا دیئے گئے..

بے نظیر تشریف لاتی ہیں تو فوراً میڈیا پر ''ہم مائیں ہم بہنیں ہم بیٹیاں‘‘ وغیرہ کے نغمے

چلنے لگتے ہیں.. نواز شریف کا نزول ہوتا ہے تو ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد‘‘ شروع ہو جاتا ہے.. اور اگر کوئی جنرل آتا ہے تو اکثر آتا ہے تو علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے اقوال کے علاوہ ''اے وطن کے سجیلے جوانو‘‘ سنائی دینے لگتا ہے..

میرے جیسے سیانے کالم نگار موقع کی مناسبت سے اخباروں میں قلابازیاں لگانے لگتے ہیں.. ابھی نواز شریف کو مسیحا قرار دیتے ہیں اور اگلے سانس میں مطالبہ کرتے ہیں کہ آخر اس غدار کو پھانسی کیوں نہیں دے دی جاتی..

یہ بھی میرا آنکھوں دیکھا حال ہے کہ موٹروے کا افتتاح ہو رہا ہے نواز شریف کے سامنے مائیک پر ٹیلیویژن کا ایک مجاہد اور مبلغ کمپیئر.. جو کبھی بھٹو پر فدا تھا.. پھر ضیاء الحق پر نثار ہوا.. مبلغ اسلام کا لقب پایا اور اب نواز شریف کے نوازنے پر اسے شیر شاہ سوری سے کہیں آگے جا کر ایک پیغمبر ثابت کر رہا ہے اور اس کے حق میں نعرے لگا لگا کر اس کا گلا بیٹھ جاتا ہے.. اور پھر اس کی خوشنودی کے لیے سپریم کورٹ آف پاکستان کی تختیاں اکھاڑ رہا ہے اور یہ سب کچھ ٹیلیویژن پر دکھایا جا رہا ہے اور کچھ عرصے بعد یہی دیدۂ بینا رکھنے والا کمپیئر اسی ٹیلیویژن سکرین پر جنرل مشرف کے حق میں نعرے لگوا رہا ہے اور اس کا گلا بیٹھا ہوا ہے.. شعر سنا سنا کر نڈھال ہو رہا ہے.. اپنے آپ کو مسلسل نیلام کرتا ہوا پھر سے بلند درجات پر فائز نظر آتا ہے.. لوگ بدستور احمق بنتے چلے جاتے ہیں..

میری ٹیلیویژن کی زندگی میں سب سے ہیجان خیز اور نتیجہ خیز وہ دن گزرے ہیں جب میں خصوصی الیکشن نشریات کی جو کئی دنوں پر محیط ہوتی تھیں میزبانی کیا کرتا تھا.. یوں میں متعدد الیکشن کروا چکا ہوں.. میں اور الیکشن نشریات کچھ ایسے لازم و ملزوم ہوئے کہ ایک بار میں کسی ذاتی کام سے اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترا تو ایک اخبار نے خبر لگا دی کہ تارڑ کی اسلام آباد آمد سے شک ہوتا ہے کہ الیکشن ہونے والے ہیں.. تو میں بالکل بقائمی ہوش حواس بیان کرتا ہوں کہ ایک الیکشن کے حتمی نتائج آنے پر ٹیلیویژن سٹوڈیو میں ایک پُربصیرت سیاسی تجزیہ نگار جو قدرے فاقہ زدہ سے لگ رہے تھے داخل ہوئے اور ''ہم جیت گئے‘ ہم جیت گئے‘‘ کے نعرے لگانے لگے کہ.. نواز شریف جیت گئے تھے.. اور میں قطعی طور پر مبالغہ نہیں کر رہا کہ اگلے الیکشن میں وہ پھر سٹوڈیو میں داخل ہو کر یہی نعرے ''ہم جیت گئے‘ ہم جیت گئے‘‘ کے لگاتے ہیں اور اس بار بینظیر بھٹو جیت گئی

ہیں.. یہ کھیل تماشے میڈیا کے ہیں..

ہمارے ایک وزیر اطلاعات جنہوں نے اپنے آپ کو ایک شہر کا فرزند قرار دے رکھا ہے نہایت فخر سے بیان دیتے ہیں.. ٹیلیویژن پر فرماتے ہیں کہ میں تو مختلف حکومتوں میں پانچ بار مرکزی وزیر رہ چکا ہوں' میری دانش پر شک کرتے ہو..

چلئے ہم تو پسماندہ اور نیم ترقی یافتہ ممالک ہیں ہماری مجبوری ہے کہ لوگوں کو احمق بنایا جائے لیکن یقین کیجیے یورپ اور امریکہ میں بھی صورت حال چنداں مختلف نہیں.. بلکہ میری ناقص رائے میں وہ عوام الناس کو احمق بنانے کے چمپیئن ہیں.. ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے..

اور میری ناقص رائے یہ بھی ہے کہ اہل امریکہ و یورپ ہماری نسبت کہیں آسانی سے احمق بن جاتے ہیں..

اگر ایک درجن فلسطینی بچے اور عورتیں اسرائیلی گن شپ ہیلی کاپٹروں کے راکٹوں سے لوتھڑوں میں بدل جاتے ہیں تو امریکی میڈیا پر خبر یہ ہوگی کہ آج اسرائیل نے ایک درجن دہشت پسندوں کو عین اس وقت ہلاک کر دیا جب وہ اسرائیل پر ایک خودکش حملہ کرنے والے تھے اور ادھر اگر تل ابیب میں کسی درخت پر بیٹھا چڑیا کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جاتا ہے تو ہر چینل پر.. خاص طور پر فوکس نیوز پر ماتم شروع ہو جاتا ہے کہ ذرا دیکھئے ان دہشت پسندوں نے ایک پر امن اور معصوم چڑیا کے بچے کو کس بیدردی سے مار ڈالا ہے.. اور پھر چڑیا کے اس بچے کی پوری لائف ہسٹری دکھائی جاتی ہے کہ دیکھئے یہ اس کے سوگوار ماں باپ ہیں جن کے جگر گوشے کو ظالموں نے ہلاک کر دیا ہے.. انہوں نے صبح سے ناشتہ تو کیا ایک کپ کافی کا بھی نہیں پیا اور اب ہم آپ کو براہ راست اس قبرستان میں لیے چلتے ہیں جہاں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں اس چڑیا کے بچے کی تدفین کی جا رہی ہے.. اس براہ راست نشریے کو دیکھ کر یورپ اور امریکہ میں آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں.. اسی میڈیا پر عراق پر حملے سے بہت پہلے جب امریکی وزیر خارجہ میڈلین او برائٹ سے سوال کیا جاتا ہے کہ عراق پر پابندیوں کے نتیجے میں لاکھوں عراقی بچے مناسب دوائیں نہ ملنے پر مر گئے ہیں تو انہوں نے کندھے جھٹک کر کس بے اعتنائی سے جواب دیا تھا کہ.. ہاں ہم تک بھی یہ خبر پہنچی ہے لیکن ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے..

گلف کی جنگ کے دوران میڈیا کا سب سے گھناؤنا چہرہ نظر آیا جس نے لاکھوں لوگوں

کی ہلاکت کو ایسے رومانوی انداز میں پیش کیا کہ ہر دیکھنے والے نے یہی خواہش کی کہ کاش یہ جنگ کبھی ختم نہ ہو.. ہم لوگوں کو مرتے دیکھتے رہیں..

عراق پر امریکی حملے کے دوران میڈیا کا رومان عروج پر پہنچ گیا.. بغداد شہر پر آگ برس رہی ہے اور اس کے قدیم کوچہ بازار روشن ہو رہے ہیں.. وہ بے مثال شہر بھڑکتا بجھتا خاک ہو رہا ہے.. امریکی طیاروں کے پائلٹ اپنا بارود برساتے ہوئے نعرے لگا رہے ہیں کہ بومب بیگڈاڈ.. فک بیگڈاڈ.. اور یہ سب کچھ امریکی گھروں میں ٹیلیویژن سکرین پر براہ راست دکھایا جا رہا ہے اور دیکھنے والے آسودہ زندگی میں بیئر پی رہے ہیں.. چپس پھانک رہے ہیں اور انہیں شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ اس بھڑک اور آگ میں ہزاروں شہری.. بچے اور بوڑھے بھسم ہو رہے ہیں..

میڈیا.. اس عہد کا دجّال ہے.. پُرفریب اور جھوٹا ہے..

اور مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ شاید میں بھی ایک مجرم ہوں.. میڈیا کے ذریعے لوگوں کو احمق بنانے کے جرم میں شریک ہوں..

اکثر جب ہم کسی ریستوران میں شام گزار کر گھر لوٹتے.. تو عینی اور بلال فوری طور پر آرام کرنے کی خاطر اپنے کمرے میں چلے جاتے کہ انہیں اگلی سویر بیدار ہو کر امریکی زندگی کی تیز رفتاری میں جُت کر اپنے بقاء کی جنگ میں شریک ہونا ہوتا تھا.. میں چونکہ ایک ملاقاتی تھا.. بیکار شخص تھا جس نے کوئی بھی جنگ نہ لڑنی تھی اس لئے میں ٹیلی ویژن کھول کر بیٹھ جاتا اس احتیاط کے ساتھ کہ آواز اتنی مدھم ہو کہ انہیں ڈسٹرب نہ کرے.. میں چینلز کی کتاب کے اوراق پلٹنے لگتا.. ہر چینل کا اپنا اپنا رنگ تھا.. کہیں آپ بے وقوف بنتے تھے اور کہیں کہیں آپ سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے.. فیصلہ آپ کا ہوتا تھا کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں..

اُن دنوں پٹرول کی قیمتوں میں کبھی اضافہ ہوتا تھا اور کبھی دو چار سینٹ کی کمی ہوتی تھی اور ہر جانب ہاہا کار مچی ہوئی تھی کہ ہائے ہائے پٹرول جو پانی سے بھی سستا ہوا کرتا تھا اب مہنگا ہوا جا رہا ہے.. ہر چینل پر دن رات پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کا سوگ منایا جا رہا تھا.. جب میں نے جانا کہ ایک عام امریکی کو کچھ غرض نہیں ہے کہ عراق اور افغانستان میں کیا ہو رہا ہے اور پاکستان کہاں اور کیوں واقع ہے.. اسے صرف اور صرف اپنی روزمرہ زندگی سے غرض ہے اور پٹرول کی قیمتوں سے غرض ہے..

میں یہاں تقریباً ہر چینل پر نہایت تسلسل سے چلنے والے ایک اشتہار کا تذکرہ کرنا چاہوں گا تا کہ آپ کو امریکی عوام کی مشترکہ سوچ سے کچھ آگاہی ہو..ایک نہایت گہری آواز مخاطب ہوتی ہے ''براہ کرم صرف تین سو پچاس ڈالر کا چندہ عطا کر دیجیے..کیا آپ جانتے ہیں کہ اتنی رقم میں ایک غریب اور دُکھی یہودی، رُوس، پولینڈ اور یوکرائن سے اُس سرزمین پر اُتر سکتا ہے جس کا وعدہ خدا نے اُس کے ساتھ کیا ہوا ہے..صرف تین سو ڈالر میں آپ ایک نادار یہودی کی قسمت بدل سکتے ہیں.. ہاں اگر آپ سات سو ڈالر عنایت کر دیں تو ایک یہودی میاں بیوی اسرائیل پہنچ سکتے ہیں اور اگر آپ چودہ سو ڈالر ہمارے ادارے کو عطا کر دیں تو ایک پورا یہودی خاندان اسرائیل میں آباد ہو سکتا ہے'' اس آواز کے پس منظر میں نہایت رقت آمیز مناظر دکھائے جا رہے ہیں..سیاہ ٹوپیوں اور داڑھیوں والے یہودی اور ان کے اہل خانہ اسرائیل کے کسی ایئرپورٹ پر اُتر کر سجدے کر رہے ہیں..مسکرا رہے ہیں، آنسو پونچھ رہے ہیں اور پھر انہیں دیوارِ گریہ سے لپٹ کر گریہ کرتے دکھایا جا رہا ہے..

جو قوم اس نوعیت کے جذباتی اشتہاروں کے ذریعے رقم جمع کر کے روزانہ ہزاروں یہودیوں کو روس اور پولینڈ سے نکال کر اسرائیل میں آباد کر رہی ہے..وہ فلسطینیوں کا ساتھ کیسے دے سکتی ہے..اپنے ہی آباد کیے ہوئے اسرائیل کو کیسے برباد کر سکتی ہے..

مجھے یہ ایک اشتہار اس لیے بھی یاد رہ گیا ہے کہ اس میں مشہور شخصیات سکرین پر نمودار ہو کر ذاتی طور پر چندے کی اپیل کرتی تھیں اور ان میں پَیٹ بون بھی شامل تھا. نصف صدی پیشتر کے انگلستان کی برفیلی رتوں میں اس شخص کے گیتوں ''اپریل لَو'' اور ''ڈارلنگ مجھے اپنے لبوں پر بوسہ دینے سے منع نہ کرو'' نے میرے کچے ذہن پر بہت اثر کیا تھا اور میں ان گیتوں کو دن رات سنتا تھا یہاں تک کہ آج بھی ان کے مکمل بول یاد ہیں..یہی پَیٹ بون بعد میں اتنا مذہبی ہو گیا کہ خاندانی منصوبہ بندی کو بھی گناہ سمجھتے ہوئے بچوں کی ایک پلٹن پیدا کر لی..

وہی پیٹ بُون آج یہودیوں کو اسرائیل میں آباد کرنے کے لیے چندہ مانگ رہا تھا..اس لئے بھی کہ کچھ عیسائی فرقے اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ دنیا کے کل یہودی جب ایک جگہ پر اکٹھے ہو جائیں گے تب حضرت عیسیٰ کا دوبارہ نزول ہو گا اور وہ ان سب کو عیسائی بنا دیں گے ..چنانچہ پَیٹ بون بھی اسی شوق میں یہ سب کچھ کر رہا تھا کہ جلد از جلد ان کم بخت یہودیوں کو ایک

جگہ جمع ہو جانے میں مدد دیں تا کہ حضرت عیسیٰ اتریں اور یہ بھی عیسائی ہو جائیں..اگرچہ تاریخی طور پر عیسائیوں اور یہودیوں میں ہمیشہ اینٹ اور کتّے کا بیر رہا ہے..آخر ایڈولف ہٹلر بھی تو ایک عیسائی تھا..میرا خیال ہے کہ سیانے یہودیوں نے بھی عیسائیوں کے اس یقین کو خوب ہوا دی ہے کہ آپ لوگ پلیز ہم سب کو اسرائیل میں اکٹھا کر دیں پھر دیکھا جائے گا کہ کون کیا ہوتا ہے اور اگر بہ فرضِ محال حضرت عیسیٰ کا نزول ہو گیا تو ہم ان سے وہی سلوک کر لیں گے جو دو ہزار سات سال پہلے کیا تھا..پھر سولی پر چڑھا دیں گے..

پیٹ بُون کی شکل بھی وہ نہ تھی جو پچاس برس پیشتر تھی..میرے جیسی ہو چکی تھی اور وہ ٹیلیویژن پر اپیل کر رہا تھا کہ صرف ساڑھے تین سو ڈالر میں ایک دکھی یہودی کو اسرائیل بھیجا جا سکتا ہے..وہ اس سرزمین پر قدم رکھ سکتا ہے جس کا وعدہ خدا نے اس کے ساتھ کر رکھا ہے..کیا خدا نے اُن سے یہ وعدہ کیا تھا؟

ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ میرے خدا نے صرف میرے ساتھ وعدہ کیا تھا..

حالانکہ خدا بھی کسی کا دل نہیں دکھاتا..ہر شخص سے وعدہ کر لیتا ہے..

اور پھر وہ شخص اگر توانا اور زور آور ہو تو زبردستی یہ وعدہ پورا کروا لیتا ہے جیسا کہ اسرائیلی امریکیوں کی مدد سے کر رہے ہیں..

اور اگر ناتواں اور کمزور ہو تو خدا بھی اپنا وعدہ فراموش کر دیتا ہے جیسا کہ فلسطینیوں کے ساتھ ہوا..

ایک شب امریکی فوج کے ایک ڈاکٹر کیپٹن کی کتاب ''خدا اور ملک کے درمیان'' کے بارے میں ایک تفصیلی پروگرام دکھایا جا رہا تھا. فلپین نژاد کیپٹن کہہ رہا تھا ''میں ایک امریکی فوجی کی حیثیت سے شام گیا اور وہاں ان لوگوں کے اخلاق اور نسلی برابری کے نظریے سے اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا..ایک شامی لڑکی سے شادی بھی کر لی..پھر اعلیٰ کمان نے مجھے امریکی فوج میں شامل مسلمان فوجیوں کے مذہبی سربراہ کے طور پر تعینات کر دیا کیونکہ میں اسلام سے خوب واقفیت رکھتا تھا..اس دوران میری پوسٹنگ گوانتا ناموبے میں ہوگئی..وہاں قیدیوں کی جو حالت تھی وہ میں بیان نہیں کر سکتا..وہاں بہت سے بے گناہ لوگ تھے..زنجیروں میں جکڑے ہوئے اور ان میں کچھ بچے

بھی تھے اور وہاں قرآن کی بے حرمتی پر کچھ قیدیوں نے بھوک ہڑتال کر دی کچھ نے خودکشی کی کوشش کی کہ وہ اور کچھ نہ کر سکتے تھے..ان میں سے بہت سے قیدی اذیت اور جبر کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو چکے تھے اور میں نے سفارش کی کہ یا تو انہیں آزاد کر دیا جائے اور یا پھر کسی کلینک میں ان کا علاج کروایا جائے..فوجی حکام کو میری یہ سفارش پسند نہ آئی اور انہوں نے ایک اور ڈاکٹر کو ان قیدیوں پر تعینات کر دیا اور اس نے موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے رپورٹ دی کہ نہیں..یہ مکار لوگ ہیں..اچھے بھلے صحت مند ہیں..قید میں رکھنے سے ان کی صحت پر کچھ اثر نہیں پڑے گا..

میں جب وہاں سے واپس امریکہ آیا تو ایئرپورٹ پر ایف بی آئی اور فوج کے اداروں کے متعدد افسران میرے ’’استقبال‘‘ کو موجود تھے..انہوں نے بار بار میرے سامان کی تلاشی لی..میرے کپڑے اتروا کر میرے بدن کو ٹٹولا گیا اور میں احتجاج کرتا رہا کہ ڈیم اٹ آئی ایم این آفیسر آف یُو ایس آرمی..پر ان پر کچھ اثر نہ ہوا..مجھے تین روز تک قید میں رکھا گیا، مجھ پر غداری اور جاسوسی کا مقدمہ چلایا گیا..اگرچہ مجھے باعزت طور پر بری کر دیا گیا اور مجھ سے معذرت کی گئی لیکن انہوں نے میری روح کو داغدار کر دیا کہ میں اپنے ملک کا اور فوج کا اتنا ہی وفادار تھا جتنا کہ کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے صرف میں مسلمان تھا اس لئے میرے ساتھ یہ ہتک آمیز رویہ اختیار کیا گیا..میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ایک جانب میرا ملک ہے اور دوسری جانب میرا اللہ ہے تو میں ان میں سے کس کا چناؤ کروں؟ تو میں نے ان دونوں کا چناؤ کر لیا ہے..نہ میں اپنے ملک کو چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ہی اپنے اللہ کو..اس لئے میری کتاب کا نام ’’خدا اور ملک کے درمیان ہے..‘‘

میں نے عرض کیا تھا ناں کہ جہاں بیشتر امریکی چینل آپ کو بے وقوف بناتے ہیں وہاں کچھ ایسے بھی ہیں جو آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں..امریکی حکومت کے نقطۂ نظر سے مکمل انحراف کر کے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھاتے ہیں اور یہی ان کی عظمت اور ترقی کا راز ہے..آپ بعض اوقات حیران رہ جاتے ہیں کہ کیا میں امریکہ میں ہوں..اور ایک امریکی ٹیلی ویژن چینل دیکھ رہا ہوں جس پر مسلمانوں کا دفاع کیا جا رہا ہے اور فلسطینیوں کے حق میں نعرے لگائے جا رہے ہیں..

اُن دنوں وائٹ ہاؤس کے عین سامنے جنگ کے مخالف امریکیوں نے ایک مظاہرہ کیا جس میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب لوگ شامل تھے اور اسے بھی براہ راست دکھایا گیا..سٹیج پر جو میزبان تھا وہ ایک عرب تھا جس کے گلے میں فلسطینی رومال لپٹا ہوا تھا..بہت سے لوگوں کو اپنے خیالات کا

اظہار کرنے کے لیے سٹیج پر مدعو کیا گیا اور ان میں برطانوی پارلیمنٹ کا ممبر جو خصوصی طور پر اس مظاہرے میں شرکت کرنے کی خاطر برطانیہ سے آیا تھا..جارج گیلا وے بھی تھا..

وہ بے شک ایک عیسائی ہو گا لیکن ہم اسے آسانی سے مسلم کاز کا ایک مجاہد قرار دے سکتے ہیں..اس کے گلے میں بھی ایک فلسطینی رومال تھا اور اس نے مائیک تھام کر نہایت عربی لہجے میں حاضرین کو ’’السلام علیکم‘‘ کہا..اس کا ترجمہ کیا کہ تم سب پر سلامتی ہو اور پھر اپنی تقریر کا آغاز کیا ’’یہ اسلام اور عیسائیت کی جنگ نہیں ہے..کلیش آف سولائزیشن نہیں ہے..صرف جارج بش اور ٹونی بلیئر کی ذاتی جنگ ہے اور یہ دونوں جنگی مجرم ہیں جن پر جنگی جرائم کا مقدمہ چلانا چاہئے.. جب بش یہ کہتا ہے کہ ہماری تہذیب کو خطرہ ہے تو وہ دنیا کی کسی بھی تہذیب کی نمائندگی نہیں کرتا..وہ خود تہذیب یافتہ نہیں ہے..ہم ایک ایسی دنیا چاہتے ہیں جو بش اور بلیئر کے بغیر ہو..جنگ کے بغیر ہو..کسی امریکی یا برطانوی کا خون کسی عراقی یا افغانی خون سے افضل نہیں ہے..ہر انسان کا خون ایک جیسا ہوتا ہے اور اسے بہانا ایک جرم ہے..آپ سب پر اللہ کا فضل ہو..السلام علیکم اور شکریہ..‘‘

کیا آپ اس جارج گیلا وے کو ایک مومن نہیں کہہ سکتے..

اب ایک پژمردہ بوڑھی عورت..ایک سفید فام امریکی سٹیج پر آتی ہے ’’میرا بیٹا عراق میں تھا..میں جانتی ہوں کہ وہاں ہم امریکی کیا کر رہے ہیں..عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے ہیں ..میرے بیٹے نے ایک کار پر فائر کرنے سے انکار کر دیا کہ اس میں صرف عورتیں اور بچے تھے..اس پر حکم عدولی اور غداری کا مقدمہ قائم کر دیا گیا اور وہ فرار ہو کر کینیڈا چلا گیا..اب اگر وہ اپنے وطن واپس آتا ہے تو سیدھا جیل چلا جاتا ہے..اسے نہیں بلکہ بش کو جیل میں ڈالنا چاہئے کہ سب سے بڑا مجرم تو وہ ہے..وہ جو اس وقت سامنے اس وائٹ ہاؤس میں بیٹھا ہے اور اس مظاہرے کو ٹیلی ویژن پر دیکھ رہا ہے..ذرا باہر آئے اور عوام کی عدالت کا سامنا کرے..لیکن وہ بزدل ہے باہر نہیں آئے گا‘‘

ایک نوجوان امریکی لڑکی جس کی گود میں ایک ہمکتا ہوا ایک بچہ ہے سٹیج پر آتی ہے اور اپنے بچے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بلند کرتی ہے ’’یہ بھی جنگ کے خلاف احتجاج کرنے آیا ہے ..یہ ہمارا سب سے کم عمر ساتھی ہے..پلیز اسے خوش آمدید کہئے‘‘ اور وہ لاکھوں کا ہجوم نعرے لگاتا اس بچے کا استقبال کرتا ہے..احتجاج کی روائت کی پیروی کرتے ہوئے بیشتر مظاہرین اپنے بال بچوں سمیت اس مظاہرے میں شریک ہیں..ایک بڑی پکنک کا سا سماں ہے..

سٹیج پر ایک صاحب ریورنٹ جان تھامس تشریف لاتے ہیں جو یونائیٹڈ چرچ آف کرائسٹ کے سربراہ ہیں..ایک دھیمے مزاج کے سویٹ سے پادری جی ہیں'' بہنو اور بھائیو..دنیا کے لوگ ہم امریکیوں کو ایک خطرناک قوم سمجھتے ہیں جو اخلاقیات سے عاری ہے..نو ستمبر کے سانحے کے بعد دنیا بھر میں ہمارے لئے ہمدردی کے جو جذبات پیدا ہوئے تھے وہ ہماری حرکتوں کی وجہ سے ختم ہو چکے ہیں اور اب ہم مجرم ہو گئے ہیں..اگرچہ بش یہ چاہتا ہے کہ کلیسا اس معاملے میں خاموش رہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ظلم ہو رہا ہو اور کلیسا خاموش رہے..بہنوں اور بھائیو..بُش نے کہا ہے کہ یہ ایک کروسیڈ ہے..صلیبی جنگ ہے..میں جو عیسیٰ کی صلیب کا رکھوالا ہوں یہ کہتا ہوں کہ یہ ہرگز ہرگز ایک صلیبی جنگ نہیں ہے..یہ مفاد پرستی اور خود غرضی کی جنگ ہے ایک مجرمانہ جنگ ہے..اس لئے کہ ہمیں ایک ہمدرد خدا درکار ہے'' ان مظاہرین میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو عادی مظاہرین تھے..انہوں نے اپنی زندگیاں صرف احتجاج اور ناانصافی اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے وقف کر رکھی تھیں..اور ان میں سے اکثر مالی مسائل سے دوچار رہتے تھے کہ وہ ایک بڑی کار یا بڑے گھر کی بجائے ایک بڑے مقصد پر یقین رکھتے تھے..

میرے خاندان کی قدرے دھان پان سی دانشور اور بین الاقوامی سطح کی ناول نگار عظمیٰ اسلم خان اگرچہ ایک مختلف نقطۂ نظر کی قائل ہے..عظمیٰ جس کے ناول ''سٹوری آف دے گولڈن روٹ'' اور ''ٹریسپاسنگ'' نقادوں کے پسندیدہ ٹھہرے ہیں..امریکہ کی پڑھی لکھی ہے بلکہ اس کا خاوند بھی امریکی ہے تو اس کا کہنا ہے کہ پھوپھا جان جنگ کے خلاف ایسے مظاہروں میں شامل بیشتر لوگ صرف اپنے آپ کو معاشرے سے ذرا برتر اور زیادہ حساس ثابت کرنے کے لیے آتے ہیں..ان کے لیے یہ ایک دانشورانہ پکنک ہوتی ہے اور وہ اپنے خاندانوں سمیت کھلی فضا میں سانس لینے اور چند نعرے لگانے کے لیے آجاتے ہیں..پھر وہ مطمئن ہو کر اپنی نارمل زندگی کی جانب لوٹ جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا..اور ان مظاہروں کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا، ظلم جاری رہتا ہے اور کسی پر کچھ اثر نہیں ہوتا..جنگی جنونی بھی اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں کہ یہ مظاہرے ایک اوپن ائیر پکنک ہیں، لوگ آئیں گے اور اپنا غصہ نکال کر چلے جائیں گے اور وہ اپنی پالیسیاں نہیں بدلتے..عراق کی جنگ کے خلاف امریکہ اور برطانیہ میں لاکھوں کے جو ہجوم ان مظاہروں میں شریک ہوئے کیا اس سے کچھ بھی بدل سکا..عظمیٰ میں نے عرض کیا تھا کہ ایک دھان پان سی لڑکی

ہے اس لئے کچھ کچھ قنوطی ہے..ورنہ ویت نام کی جنگ کے خلاف امریکہ میں جو عظیم الشان مظاہرے ہوئے تھے انہوں نے امریکی حکومت کو وہاں سے پسپا ہونے پر مجبور کیا تھا..البتہ یہ ایک بہانہ بھی ہو سکتا تھا کہ ویت کانگ گوریلوں نے دراصل امریکہ کی کمر توڑ دی تھی اور وہ وہاں سے فرار ہو جانے کے لیے کوئی راستہ تلاش کر رہا تھا اور یہ راستہ ان مظاہروں نے مہیا کر دیا..

امریکی میڈیا پر ڈیموکریٹک پارٹی کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لئے بھی کہ ڈیموکریٹس کو عام طور پر قدرے پڑھا لکھا روشن خیال اور ریپبلکن کو کسی حد تک قدامت پسند اور علم و ادب سے دور سمجھا جاتا ہے..چنانچہ امریکہ میں دکھائے جانے والے جتنے بھی پسندیدہ ترین نائٹ شو ہیں ان کا ایک ہی ہدف ہوتا ہے جس پر مسلسل طنز کے تیر برسائے جاتے ہیں اور وہ ہے صدر بُش..اس کی نقلیں اتاری جاتی ہیں..کھڑے کھڑے کانوں کے حوالے سے بندر اور بن مانس سے ملایا جاتا ہے..ایسی بھد اڑائی جاتی ہے کہ بُش پر ترس آنے لگتا ہے کہ یہ کیسا دنیا کی سب سے بڑی سُپر پاور کا صدر ہے اور یوں دنیا کا سب سے طاقتور شخص ہے کہ ہمارے گاؤں کا میراثی بھی اتنی بے عزتی برداشت نہ کرے اور خودکشی کر لے..اور یہ شخص ہر شب ٹیلی ویژن پر ذلیل کیا جاتا ہے اور لطف یہ کہ وہ ان شوز کو نہایت رغبت سے دیکھتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے..نہ جانے کیوں آج تک ایسے صاحب صدر کی بے عزتی کرنے والے اور ان کی وردی..معاف کیجیے گا ان کے کپڑے اتار دینے والے میزبانوں پر امریکہ سے غداری کرنے کا مقدمہ کیوں نہیں چلایا گیا..وہ ملکی سالمیت اور نظریہ امریکہ کے خلاف سازش کرنے کے جرم میں دھر کیوں نہیں لئے گئے یہاں تک کہ ایف بی آئی نے انہیں اغواء تک نہیں کیا..

میں اُن شوز کے چیدہ چیدہ چُبھتے ہوئے فقرے پیش کرتا ہوں جن کے میزبان جان سٹیورٹ اور ڈیوڈ لیٹرمین تھے..

''ہے..کیا تم نے سنا ہے کہ بُش ایک مرتبہ پھر چھٹیاں منانے کے لیے اپنے رانچ پر چلا گیا ہے؟''

''ہاں تو اس میں کیا قباحت ہے..وہ اپریل میں ذرا سکون کی خاطر اپنے رانچ پر گیا تھا اور اب تو اگست آ گیا ہے..اُس نے پورے تین مہینے وائٹ ہاؤس میں دن رات غور و خوض کرنے میں گزارے ہیں تو انسان اتنا غور کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اسے چھٹیاں گزارنے کا حق حاصل ہے..''

''ٹھہرو ٹھہرو.. یہ تم نے کیا کہا ہے کہ وہ وائٹ ہاؤس میں غور و خوض کرتا رہا ہے.. یہ کہا ہے؟''

''ہاں.. یہی کہا ہے..''

''تمہارے خیال میں بش غور و خوض کر سکتا ہے؟''

''وہ تو میں نے محاورتاً کہا تھا. غور کرنے کے لیے تو دماغ چاہئے ناں..''

''ہاں اگر ایک بن مانس غور کر سکتا ہے تو بُش کیوں نہیں..''

''اور ہاں تم نے اُس کا تازہ ترین بیان سنا ہے.. اُس نے کہا ہے کہ معیشت دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے..''

''وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے؟''

''وہ درست کہتا ہے.. کیونکہ چین اور کوریا کی معیشت واقعی دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے..''

''چلو یہ بتاؤ کہ ان چھٹیوں میں بُش اپنے رانچ پر کیا کرتا رہتا ہے..''

''بھئی وہ صبح سویرے ناشتہ کرتا ہے.. پھر گھڑ سواری کرتا ہے.. پھر اپنے کتّوں سے کھیلتا ہے یا شاید کتّے اس سے کھیلتے ہیں.. شام کو ٹیلی ویژن پر یہ شو دیکھتا ہے اور بہت ہنستا ہے کیونکہ ہم جو کچھ لکھتے ہیں اس کے پلے نہیں پڑتا.. اس کے بعد وہ مطالعہ کرتا ہے اور پھر سو جاتا ہے..''

''ٹھہرو ٹھہرو.. یہ تم نے مطالعے کا لفظ کیوں استعمال کیا.. بُش مطالعہ بھی کرتا ہے؟''

''صحافیوں کو اُس کا شاف تو یہی بریفنگ دیتا ہے.. اس کے علاوہ بتایا جاتا ہے کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بارے میں سوچتا رہتا ہے..''

''ٹھہرو.. کیا وہ سوچ بھی سکتا ہے؟''

''اُس کا شاف ہمیں یہی بتاتا ہے اور سٹاف کو وہ خود بتاتا ہے کہ میں سوچتا ہوں..''

''چلو یہ سوچ بچار چھوڑو کہ بُش کیسے سوچ سکتا ہے.. کیا تم جانتے ہو کہ وائٹ ہاؤس پر ایک خاندان نے ملکیت کا دعویٰ کر دیا ہے؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے.. اُس میں تو بُش رہتا ہے..''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ وہ اُس میں نہیں رہتا اپنے رانچ پر چھٹیاں مناتا رہتا ہے.. امریکی آئین کی ایک شق کے مطابق اگر کوئی جائیداد یا رہائش گاہ ایک طویل مدت تک بے آباد اور خالی

پڑی رہے تو وہ متروکہ قرار دی جا سکتی ہے اور اُس پر کوئی بھی حق ملکیت کا دعویٰ کر سکتا ہے.. تم جانتے ہو کہ وائٹ ہاؤس اکثر بے آباد پڑا رہتا ہے اور بُش اپنے رانچ پر چھٹیاں مناتا رہتا ہے تو یہ عین ممکن ہے کہ وہ کسی روز واپس آئے تو وائٹ ہاؤس پر قبضہ ہو چکا ہو..''

''تمہیں پتہ ہے کہ بُش کا تکیہ کلام کیا ہے؟''

''ہاں وہ ہر سوال کے جواب میں کہتا ہے.. میں نہیں جانتا..''

''اور کیا تم جانتے ہو کہ بش بار بار یہ بیان کیوں دے رہا ہے کہ ہم اُن سے.. دہشت گردوں سے اس لئے عراق میں لڑ رہے ہیں کہ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہمیں ان کے ساتھ یہاں امریکہ میں لڑنا پڑے گا..''

''دیکھو.. مذاق اپنی جگہ لیکن وہ شریف آدمی کہتا بالکل درست ہے.. اگر وہ سارے دہشت پسند عراقی پاسپورٹ بنوا کر امریکی سفارت خانے سے ویزا حاصل کر کے اپنے تباہ کن ہتھیاروں کو کاندھوں پر اٹھائے امریکہ آ جائیں اور ہم سے لڑنے لگیں تو کتنی پرابلم ہو گی.. بُش کی عقلمندی کی داد دو کہ امریکی فوج عراقی ویزا حاصل کئے بغیر آسانی سے عراق جا کر ان دہشت پسندوں سے وہیں نمٹ لیتے ہیں..''

''اچھا ایک بات بتاؤ.. اگرچہ یہ ایک سُنی سنائی بات ہے لیکن تم بتاؤ کہ کیا یہ سچ ہے کہ.. اگر بُش کو کوئی بات سمجھانی ہے تو پہلی مرتبہ اُسے سمجھ نہیں آتی اور جب دوسری بار سمجھایا جائے تب وہ سمجھتا ہے؟''

''یہ کیا کہہ رہے ہو.. کہ وہ دوسری بار سمجھ جاتا ہے..''

''یہ تو صرف اخلاقیات کا تقاضا تھا کہ میں ایسا کہہ رہا تھا ورنہ وہ تو تیسری اور چوتھی بار بھی نہیں سمجھ پاتا..''

''اچھا تو بُش اپنے رانچ میں اور کیا کرتا رہتا ہے؟''

''بس مزے کرتا ہے.. آرام کرتا ہے.. پھر رات کو کوئی کتاب پڑھتا ہے اور سو جاتا ہے..''

''ٹھہرو.. تم مجھے احمق سمجھتے ہو.. میں نے اب تک بہت برداشت کیا ہے.. بُش کوئی کتاب پڑھتا ہے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا..''

اِن نائٹ شوز میں ایک فقرہ ایسا آیا کہ مجھے خدشہ ہوا کہ یہ ابن انشاء کا لکھا ہوا ہے..

کیونکہ انہوں نے اردو کی آخری کتاب میں اورنگ زیب کے بارے میں وہ کلاسیک فقرہ لکھا تھا کہ بچو اورنگزیب ایک ایسا خداترس بادشاہ تھا کہ ساری عمر اس نے نہ کوئی نماز چھوڑی اور نہ کوئی بھائی..اور وہ فقرہ کچھ یوں تھا..

''اور ہاں بُش سے عراق پر حملے کے حوالے سے پوچھا گیا کہ کیا امریکہ نے ویت نام کی جنگ سے کچھ نہیں سیکھا..''

''تو بُش نے کیا جواب دیا..''

''اُس نے کہا.. ہاں ہم امریکیوں نے ویت نام کی جنگ سے یہ سیکھا ہے کہ ویت نام پر ہرگز حملہ نہیں کرنا چاہئے..''

امریکی ٹیلی ویژن پر صرف ایسے سیاسی شوز ہی نہیں چلتے بلکہ نہایت مذہبی اور بنیاد پرست پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں اور انہیں بھی بے پناہ پسند کیا جاتا ہے..ان شوز کے میزبان ظاہر ہے وہاں کے مذہبی دانشور اور علماء کرام ہوتے ہیں..اگرچہ وہ باریش نہیں ہوتے لیکن ان کی ذہنیت اور تنگ نظری ایسی ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں کے نہایت ہی ان پڑھ اور اُجڈ مولوی بھی ان کے مقابلے میں روشن خیال نظر آنے لگتے ہیں..

ان میں طرح طرح کے ''مولوی'' ہوتے ہیں..

ہزاروں لوگ ان نجات دہندگان کی جذباتی تقریریں سن کر جھوم رہے ہیں..رقص کر رہے ہیں' وجد میں آئے ہوئے ہیں اور آہ وزاری کر رہے ہیں اور افلاک کی سیر کر رہے ہیں..ان میں سے کچھ تو سیدھے سادے مولوی ہوتے ہیں جو حاضرین کے جذبات کو ثواب کی دیا سلائی دکھا کر بھڑکاتے ہیں..اور ان کے سوا کچھ اور ایسے ہوتے ہیں جو بنیادی طور پر منجھے ہوئے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے والے اداکار ہوتے ہیں..وہ اُنہیں رُلاتے ہیں..زبان کے زور سے آخرت اور ثواب کے قصے بیان کر کے انہیں نڈھال کر دیتے ہیں..مجلسیں برپا کرتے ہیں..مذہبی جذبات کو بھڑکانے کے ایکسپرٹ ہوتے ہیں اور کمال کے اداکار ہوتے ہیں اور ہم موازنہ کرنا چاہیں تو ہمارے ہاں بھی باقاعدگی سے ایسا ہوتا رہتا ہے اور ہم بھی آبدیدہ ہوتے رہتے ہیں..

ان میں ایک اور قسم قدرے مسخرے مولویوں کی ہوتی ہے جو سٹیج پر خوب دھما چوکڑی مچاتے ہیں..کبھی گاتے ہیں اور کبھی رقص کرنے لگتے ہیں اور کبھی لطیفے سنانے لگتے ہیں..البتہ ان

میں ایک آدھ مولوی یا واعظ ایسا بھی آجاتا تھا جس کا بیانیہ بے حد اثر انگیز ہوتا تھا..اس میں نہ تعصب ہوتا تھا اور نہ ہی بنیاد پرستی صرف محبت ہوتی تھی..اگلے زمانوں میں ایک ایسا ہی واعظ ''ایلمر گنٹری'' نام کا ہوا کرتا تھا..وہ ایک بنچ پر کھڑا ہو کر وعظ شروع کرتا تھا اور ہزاروں کے ہجوم کو اپنی آتش بیانی سے زیر کر لیتا تھا..وہ سب وجد میں آ کر حضرت عیسیٰؑ کی توصیف کرنے لگتے تھے..ہاتھ اٹھا اٹھا کر فریاد کرتے تھے اور ایلمر گنٹری بھی ان کے ہمراہ روتا تھا اور فریاد کرتا تھا اگرچہ وہ ایک عادی زانی اور شرابی تھا اور وعظ کرتے ہوئے بھی مخمور حالت میں ہوا کرتا تھا..اس کا کچھ موازنہ منیر نیازی کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا کہ منیر جب مخمور ہوتے تھے اور وہ اکثر ہوا کرتے تھے تو ہمارے رسولؐ کو یاد کرتے تو خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رُلاتے تھے..

اس بے راہرو واعظ کی حیات پر ہالی ووڈ میں ایک فلم بنائی گئی تھی اور واعظ کا کردار برٹ لنکاسٹر نے ادا کیا تھا..

مجھے ایک اور حیرت ہوئی..بلی گراہم ابھی تک پسندیدہ اور چاہے جانے والا واعظ تھا..

میں نے اگلے زمانوں میں اس کی تقاریر سنی تھیں اس کے ٹیلی ویژن شوز دیکھے تھے اور وہ ایک جادو بیان علم رکھنے والا شخص تھا جو امریکی معاشرے کی ہوس زر پر مسلسل ضربیں لگاتا تھا اور لوگوں جذباتی کر کے مذہب کی جانب لاتا تھا..

وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اس کی شعلہ بیانی اب بھی سرد نہ ہوئی تھی..

اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ امریکی میڈیا پر صرف اسی نوعیت کے ''شریفانہ'' سیاسی اور مذہبی پروگرام چلتے رہتے ہیں تو آخر وہ عریانی اور فحاشی اور بے حیائی کیا ہوئے..کدھر گئے جن کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر ہم اخلاقی طور پر اپنے آپ کو برتر ثابت کرتے رہتے ہیں..سچی بات ہے میں نے تو امریکہ کے مختصر قیام کے دوران حرام ہے کوئی قابل ذکر عریانی اور فحاشی دیکھی ہو حالانکہ میں مرا جا رہا تھا کہ کہیں تو یہ نظر آئے..تھوڑی سی فحاشی ہی سہی..ذرا سی عریانی ہی سہی..پر یہ آرزو پوری نہ ہوئی..چند ایک واجبی سے الوداعی یا ملاقاتی بوسے اور وہ بھی بہت پھیکے..

چند ایک بے ضرر سی بغل گیریاں جن کا نتیجہ کچھ نہ نکلنا تھا..

اور جب میں مایوسی کی آخری حدوں پر تھا اور عریانی وغیرہ پر میرا ایمان اُٹھنے کو تھا تو ایک شب دل کی مراد پوری ہوگئی..میں اپنے پسندیدہ سیاسی شوز دیکھنے کے بعد ریموٹ کے بٹن یونہی دبا

رہا تھا کہ کسی چینل پر بین الاقوامی خبریں مل جائیں کہ یکدم ایک محترمہ ایک بلند سٹول پر برہنہ حالت میں نہایت اطمینان سے ٹانگیں ہلاتی نظر آ گئیں.. پہلی نظر پر تو ایک دھچکا سا لگا اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ یہ میں کس کے ساتھ پکڑا گیا ہوں پھر احساس ہوا کہ او ہو یہ تو محض ایک شائبہ ہے اس کے ساتھ میں کیسے پکڑا جا سکتا ہوں.. دراصل ٹیلی ویژن کی سکرین اتنی بڑی تھی کہ وہ کم بخت لگتا یہی تھا کہ سچ مچ سامنے آ بیٹھی ہے اور اس کے بدن کی حدّت بھی محسوس ہوتی تھی.. مجھے یہ خدشہ بھی دامن گیر تھا کہ کہیں اس دوران عینی لونگ روم میں نہ جھانک لے.. پہلے ابا جی کو دیکھے کہ اُن کی باچھیں کھلی ہوئی ہیں پھر سکرین کو دیکھ کر جان لے کہ کیوں کھلی ہوئی ہیں اور پھر مکمل صدمے میں چلی جائے..

تو ان باحیا خاتون کا انٹرویو چل رہا تھا...

وہ ''نیلی فلموں'' کی شہزادی کہلاتی تھیں اور صرف پاپی پیٹ کی خاطر پورنو فلموں میں جلوہ گر ہوتی تھیں اور اپنے پیٹ کو بھرتی رہتی تھیں..

''اب آپ پورنو پرنسس ہیں تو مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟''

''میں ایک پورنو کوئین بننا چاہتی ہوں.. اگر برطانیہ یا ڈنمارک وغیرہ کی کوئین ہو سکتی ہے تو کیا میں اُن سے کم ہوں بلکہ آپ براہ راست دیکھ سکتے ہیں کہ میں اُن سے کہیں زیادہ ہوں..''

''آپ یوں میرے سامنے ایک بنچ پر بالکل عریاں حالت میں براجمان کیسا محسوس کرتی ہیں..''

''جیسا آپ کپڑے پہنے ہوئے محسوس کرتے ہیں ویسا ہی میں کپڑوں کے بغیر محسوس کرتی ہوں یعنی بہت ہی نارمل اور قدرتی.. کیونکہ آپ تو جانتے ہیں کہ ایک انسان اسی طور پیدا ہوتا ہے.. بلکہ جتنا عرصہ مجھے کپڑے پہننے پڑتے ہیں اتنا عرصہ مجھے بہت اُلجھن ہوتی رہتی ہے..''

''آپ جو کچھ کرتی اور کرواتی ہیں.. یعنی مردوں کے ساتھ.. بہت ساری حالتوں میں.. تو کیا آپ کی اخلاقیات مجروح نہیں ہوتی؟''

''نہیں.. میں وہ کچھ کرتی ہوں جو کرنا مجھے پسند ہے.. میں کسی اور کی دل آزاری تو نہیں کرتی.. کسی کو دُکھ نہیں دیتی.. اور یوں اپنا پیٹ بھرتی ہوں.. میری اخلاقیات کا پیمانہ صرف یہ ہے کہ کسی کو دُکھ نہ دو.. اور خود جو جی میں آئے کرو..''

اس انٹرویو کے دوران ان خاتون کے کمالات کی جھلکیاں بھی دکھائی جا رہی تھیں جن

میں وہ ہاؤ ہُو وغیرہ کر رہی تھیں۔

اس پر میزبان نے.. جس کو سکرین پر دکھایا نہیں جا رہا تھا سوال کیا ''ان مقابلوں اور چاروں شانے چت ہو جانے والے مظاہروں میں آپ کے چہرے پر جو تاثرات اُبھرتے ہیں کیا اُن میں کچھ حقیقت بھی ہوتی ہے یا محض اداکاری کا کمال ہوتا ہے..''

''دیکھیں آپ نے شاید آج تک کسی پورنو فلم میں کام نہیں کیا اس لیے آپ اس کی تکنیک سے واقف نہیں ہیں.. وہ جو پانچ سات منٹ کا ہیجان خیز منظر ہوتا ہے وہ تو کئی دنوں میں فلمایا جاتا ہے کہ فریقین میں اتنی سکت نہیں ہوتی' تازہ دم ہونا پڑتا ہے خاص طور پر مرد اداکار کو.. تو کبھی کبھار وہ اداکار واقعی کمال کرتا ہے تو چہرے پر حقیقی جذبات کی اذیت بھی نمودار ہو جاتی ہے.. آپ نے ابھی جو ایک منظر ملاحظہ کیا تو شاید آپ نے نوٹ کیا ہو کہ میرے چہرے پر جو مسرت تھی اور جو کرب تھا وہ ظاہر کرتا تھا کہ میں اپنے آپ میں نہیں ہوں..''

''اور خاتون.. بلکہ کوئین.. پرفارمنس کے دوران آپ جو ہاؤ ہو کرتی شور مچاتی ہیں تو اس میں حقیقت کا کتنا عنصر ہوتا ہے؟''

''شیکسپیئر کے ڈراموں میں کردار کتنے بلند آہنگ ہوتے ہیں.. اصلی زندگی میں تو وہ اس طرح نہیں بولتے تو یہی کیفیت میری ہوتی ہے.. میری آہیں اور سسکیاں دراصل شیکسپیئر کے ڈراموں کی طرح ذرا بلند آہنگ ہوتی ہیں..''

''مجھے افسوس ہے کہ ہمارے شو کا وقت ختم ہو رہا ہے تو کیا اب آپ کپڑے پہن لیں گی..''

''مجھے یہاں سے سیدھے ایک فلم کی شوٹنگ کے لیے جانا ہے تو کپڑے پہن لینے سے فائدہ..''

''اور آخر میں.. کیا آپ قوم کو کوئی پیغام دینا پسند کریں گی؟''

''ہاں میں اُن سے یہ کہوں گی.. کہ اپنی کارکردگی کا موازنہ نہ کیا کیجیے.. جو کچھ آپ ایک مرتبہ کرتے ہیں وہ ہم درجنوں بار کرتے ہیں تب جا کر ہمارا ایک مرتبہ ہوتا ہے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں.. مجھے اپنے شو میں مدعو کرنے کا بہت بہت شکریہ.. دراصل یہ پہلی بار ہے کہ کیمروں کے سامنے میں بیٹھی رہی ہوں.. لیٹی نہیں ہوں..''



''وکائیوا...اُبلتے پانی''

تو ہم نے سفر دیکھا..
صبح کے اُجالے میں..
راہ کا سہانا پن..

بہتے پانیوں..ازلوں سے بہتے پانیوں پر..اُن زمانوں سے بہتے پانیوں پر' جب ہر جانب تاریکی تھی اور پروردگار نے کہا کہ روشنی ہو جا.تو تب سے بہتے پانیوں پر..اور ان بہتے پانیوں پر جو روشنی تھی وہ بھی تب سے ہے جب اس نے کہا تھا کہ روشنی ہو جا..اور روشنی بھی وہی ہے جو بہتے پانیوں پر ہے..اور اسی لیے یہ روشنی اس کا پرتو ہے اس کا اجالا ہے اور ان بہتے پانیوں پر ایک کینو..ایک ڈونگا..ہماری چھوٹی سی کشتی بہتی تھی اور بہت آہستگی سے دھیرے سے تیرتی تھی..اور اس کی روانی میں بلال اور میری کاوش بھی شامل تھی کہ ہم دونوں اسے کھیتے تھے..چپّو چلاتے تھے..

''وکائیوا'' ریڈ انڈین زبان میں ''اُبلتے پانی''..جن پر ہم رواں تھے..

اُبلتے پانیوں پر..جن کا نام انہوں نے وکائیوا رکھا..وہ جو اس سرزمین کے بیٹے تھے..اس کی کوکھ سے جنم لیتے تھے اس کی مٹی میں دفن ہو جاتے تھے..وہ اس کے سینے کے ساتھ لگ کر رہتے تھے..اس دھرتی کی دھڑکن سنتے تھے..ان دھڑکنوں میں ندیاں' آبشار' جنگل' چٹانیں اور دریا تھے جو اس سرزمین کے ہر بیٹے کے سینے میں دھڑکتے تھے تو انہوں نے اس شفاف شیشہ پانیوں کی ندی کو ''وکائیوا'' کا نام دیا..اُبلتے پانی' بہتے پانی اور اس ندی کے پانی جن پر ہماری کشتی رواں تھی ایسے شفاف اور اجلے تھے کہ نظر ان کے پار جاتی تھی..تہہ تک چلی جاتی تھی اور تہہ میں جو بوسیدہ پتے اور ٹہنیاں تھیں وہ یوں رُو بہ رُو دکھائی دیتی تھیں جیسے ان کے اور آنکھوں کے درمیان پانی حائل

نہ ہوں اور احساس تب ہوتا تھا کہ درمیان میں پانی بھی ہیں جب ایک پتہ ان کے اندر کہیں سے تیرتا ہوا آتا تھا اور وہ پتہ ایک شیشے میں فریم شدہ لگتا تھا اور چونکہ وہ تیرتا تھا اس لیے ہولے ہولے اس آبی فریم میں سے نکل جاتا تھا..

اور اس وکائیوا ندی کے دونوں کناروں پر گھنے گھٹا ٹوپ اندھیارے جنگل تھے جو اس پر امڈے چلے آتے تھے..کچھ قدیم شجر اتنے جھکے ہوئے کہ پانیوں میں ڈوب رہے تھے..ان پانیوں کی تہہ میں صرف بوسیدہ پتے' گلی سڑی سیاہ ٹہنیاں' دلدل ہی نہ تھی بلکہ ان میں مچھلیاں بھی تھی جو ننگی تھیں..

اور کیسی ننگی مچھلیاں تھیں کہ ایک خلاء میں حرکت کرتی دکھائی دیتی تھیں کہ پانی تو نظر نہ آتے تھے اتنے شفاف تھے اور وہ نظر آتی تھیں کہ یہ پانی کے بغیر ایک خلاء میں کیسے تیرتی ہیں..

کہیں وکائیوا ندی کی سطح پر کچھوؤں کی گردنیں دکھائی دیتی تھیں اور وہ ہماری کشتی کو دیکھ کر ڈبکی نہیں لگاتے تھے..ہمیں تکتے رہتے تھے..یہ کچھوے تیرتے بھی نظر آ جاتے تھے اور کسی پانی پر جھکی ٹہنی پر براجمان دھوپ سینکتے ہوئے بھی..

بہتے پانیوں کے اوپر آسمان پر حاوی ہوتے جو تناور شجر تھے اور ان میں سے کچھ کی ٹہنیاں پتوں سے عاری تھیں تو ان سے لپٹا ہوا کوئی ماکسن قسم کا سانپ بھی ہو سکتا تھا جس کے زہر کا کوئی توڑ نہیں..کسی سوکھی ہوئی شاخ سے لٹکتا ایک شاخ ہی لگتا یہ سانپ نیچے بہتے پانیوں کی ندی پر گر بھی سکتا تھا اور ان پانیوں پر جو کینو رواں تھا اور جس میں ہم دونوں چپّو چلاتے تھے وہ ہم پر بھی گر سکتا تھا..اس لیے بلال اوپر دیکھتے تشویش بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مجھ سے کہتا ہے..

انکل ذرا تیزی سے چپّو چلا کر ان درختوں کے نیچے سے گزر جائیں اور ندی کے درمیان میں چلے جائیں..یہ سانپ بہت زہریلے ہوتے ہیں اور ہم پر گر سکتے ہیں..

دائیں بائیں' دو رویہ
شاد ماں درختوں کی'
جھومتی قطاریں ہیں
ہر قدم کے وقفے پر

دھوپ کی خلیجیں ہیں
چھاؤں کے جزیرے ہیں
جس طرف کو سورج ہے،
اس طرف، درختوں کی
شبنمیں جبینوں پر
تیرگی کا پرتو ہے!
تیرگی کے پرتو کا
رُخ ہماری جانب ہے..

تو نے ہم سفر دیکھا..
دھوپ ہے کہ سایہ ہے
رہروؤں کی مایا ہے
دور دور تک.... رستا
دور دور تک.... دنیا
دور دور تک.... سب کچھ
اک عجب سہانا پن
صبح کے اجالے میں۔

دائیں بائیں دو رویہ.. شادماں درختوں کی جھومتی قطاریں ہیں اور ہر قدم کے وقفے پر وکائیوا ندی کے پانیوں پر کہیں دھوپ کی خلیجیں ہیں اور کہیں چھاؤں کے جزیرے ہیں اور جہاں دھوپ ہے وہ پانیوں کی تہہ میں سرسراتی گھاس اور اس پر اٹکھیلیاں کرتی ننھی منی مچھلیوں کی ڈاروں کو روشن کرتی ہے.. ایک کچھوا اگرچہ اپنے تئیں گردن تک اپنے آپ کو پانی میں روپوش رکھے ہوئے ہے پر دھوپ اس کے بقیہ بدن کو بھی عیاں کر رہی ہے اور جہاں جہاں چھاؤں کے جزیرے ہیں وہاں وہاں ندی کا بہاؤ سست ہو گیا ہے، تھم گیا ہے.. شاید کسی ریڈ انڈین دوشیزہ نے..

دو چوٹیاں کاندھے پر جھلائے، چمڑے کے پیراہن میں.. کسی سرخ رُو دوشیزہ نے شاید اس وکائیوا کی منت کی ہو کہ.. میرے سیاں جی اتریں گے پار.. ندیا دھیرے بہو..

اور یہ ندیا تو یوں بھی دھیرے ہی بہتی تھی تو اس دوشیزہ کی درخواست پر بہت ہی دھیرے بہنے لگی ہوگی..

اور ایسی ندیا سے کیسے ایک سیاں جی پار اترتے ہوں گے..

ایک ایسے سیاں جی.. یقیناً اپنے گھوڑے سمیت اور ان کا رنگ بھی اپنے گھوڑے ایسا ہے تانبے جیسے.. گیسو دراز اپنے تیر کمان اور ٹاماہاک کلہاڑے کے ساتھ.. شکار کیا ہوا ہرن اپنے آگے کاٹھی پر ڈالے.. وہ اپنی دو چوٹیوں والی منتظر محبوبہ کی خاطر پار اترتے ہوں گے.. اور یہ ریڈ انڈین دوشیزہ ہمارے پنجاب کی ایک مٹیار کی مانند اپنی ماں سے فرمائش کیا کرتی ہوگی کہ.. مائے میرییے نیں مینوں بڑا چاء.. تے دو گُتاں کر میریاں اور تب جا کر اُس کی ماں اُس کی دو چوٹیاں گوندھتی ہوگی..

تو بہتے پانیوں کی ندی پر چھاؤں کے جزیرے تھے وہاں پانی دھیرے سے بہتے تھے..

میں ہار نہ مانتا تھا اگرچہ میرے بازو دُکھ رہے تھے اور چپّو چلاتا جاتا تھا..

بلال کیپٹن آف دی شپ تھا اس لئے مجھے ہدایات دیتا چلا جاتا تھا کہ انکل ہم کنارے کے قریب ہوتے جا رہے ہیں، پانی میں گرے ہوئے درختوں میں ہمارا کینو الجھ جائے گا.. الٹ جائے گا اس لئے صرف دایاں چپّو چلائیں..

اور کبھی وہ میری بے مہار چپّو بازی سے تنگ آ کر کہتا.. آپ پلیز کچھ دیر چپّو نہ ہی چلائیں تو بہتر ہے..

اور کم از کم ایک بار ایسا ہوا کہ.. وہ کینو نہایت ہی ہلکے پلاسٹک کا بنا ہوا تھا.. آپ کمر سیدھی کر کے بیٹھنے کی بجائے اگر ذرا سا بھی دائیں بائیں ہوتے ہیں تو وہ ڈول جاتا ہے.. میں ذرا سا دائیں جھکتا کسی مچھلی یا پتے کو شفاف پانیوں میں تیرتے ہوئے دیکھنے کے لیے یا بائیں جانب تہہ میں سرسراتی گھاس میں سرسراتا کوئی آبی کیڑا نظر میں لانے کے لیے تو ہم جھول جاتے تو کم از کم ایک بار ایسا ہوا کہ ہم جھولتے جھولتے اُلٹ کر پانیوں میں گرنے لگے اور پھر سنبھل گئے..

مجھے تمام تر احتیاطی تدابیر یاد تھیں کہ اگر کینو اُلٹ جاتا ہے تو آپ نے بھگدڑ نہیں مچانی.. خوفزدہ ہو

کر ہاتھ پاؤں نہیں چلانے کیونکہ ندی کے پانی اتنے گہرے نہیں کہ آپ ڈوب جائیں.. اگر بھگدڑ مچائیں گے تو یقیناً ڈوب جائیں گے.. کھڑے ہونے کی کوشش کیجیے اور حوصلے کے ساتھ کینو سے لپٹے رہیے اور فوری طور پر کنارے کی جانب جانے کی سعی بھی مت کیجیے کہ وہاں پانی میں ڈوبے ہوئے درختوں کے تنوں اور شاخوں سے آپ اُلجھ کر اپنے آپ کو زخمی کر سکتے ہیں.. کینو سے لپٹے رہیے اور پھر اُسے سیدھا کر لیجیے جو وہ آسانی سے ہو جائے گا اور پھر اُس میں زور لگا کر سوار ہو جایئے جو آسانی سے نہیں ہو سکیں گے..

اسی بہتے پانیوں کی ندی میں یہیں کہیں عینی نے ڈبکیاں کھائی تھیں اور میں اس کا مختصر تذکرہ کر چکا ہوں.. شادی کے فوراً بعد جب وہ لاہور سے سیدھی آرلینڈو پہنچی تو ہمیں لحہ بہ لحہ بدلتی ہوئی صورتِ حال سے باخبر کرتی رہی.. ابو بلال کو بھی آؤٹ ڈور کا بہت خبط ہے.. کبھی اپنے بھائی کے جہاز سے پیراشوٹ کے ساتھ کود جاتا ہے اور کبھی گہرے سمندروں میں اتر کر سمندری حیات کو قریب سے ملاحظہ کرتا ہے.. مجھے اکثر ''آؤٹ ڈور ورلڈ'' کے سٹور میں لے جاتا ہے جہاں تمام تر آؤٹ ڈور سرگرمیوں کا سامان ملتا ہے.. مچھلیوں سے لے کر ریچھوں اور بارہ سنگھوں تک کو شکار کرنے کا سامان.. وہ مجھے زبردستی جدید ترین خیمے، سلیپنگ بیگ اور کوہ نوردی کے سامان دکھاتا ہے اور میں کہتی ہوں کہ بلال یہ سب کچھ تو میں بچپن سے دیکھتی آئی ہوں.. ابو کو بھی یہی خبط ہے.. اور ایک روز وہ مجھے وکائیوا پارک لے گیا جہاں ایک بہت دلفریب اور خاموش دریا تھا اور ہمارا کینو الٹ گیا اور ہم دونوں بڑی مشکل سے اس میں دوبارہ سوار ہوئے اور ہنستے جا رہے تھے جب میں نے قریب ہی ایک مگرمچھ کو جبڑا کھولے دھوپ سینکتے دیکھا تو میں چیخیں مارنے لگی..

ہمارا کینو وکائیوا کے بہتے پانیوں پر تنہا بہتا جاتا تھا..

دور دور تک... رستا
دور دور تک... دنیا
دور دور تک... سب کچھ
اک عجب سہانا پن
صبح کے اُجالے میں..

بلال مجھے فون پر اکثر لالچ دیتا رہتا.. بہلاتا پھسلاتا رہتا کہ انکل آپ آرلینڈو آئیں تو سہی میں آپ کو ایسی جگہوں پر لے چلوں گا کہ آپ اپنے شمالی علاقے بھول جائیں گے.. اور آج صبح وہ لے آیا.. آرلینڈو سے ایک قدرے طویل مسافت کے بعد ہم شاہراہ سے ہٹ کر ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئے جہاں یکدم خاموشی اتر آئی.. وہاں درختوں میں گھرے شاندار گھر تھے اور سرسبز تاریکیاں تھیں.. ہمارے دونوں جانب بھی اتنے قدآور اور تنومند شجر تھے کہ ان کے درمیان میں بچھی تارکول کی سڑک ان کی دہشت میں آ کر سمٹی جاتی تھی اور اس پر رواں ہماری کار بھی مختصر ہوتی جاتی تھی..

سڑک گویا جنگلوں میں پوشیدہ ایک سرمئی دریا تھا.. اور ہماری کار گویا ایک کشتی تھی جو اُس کے بہاؤ کے سنگ بہتی جا رہی تھی..

ہم ایک مقام پر دائیں جانب درختوں کے ان ذخیروں کے اندر چلے گئے اور وہ شجر ہم پر ایسے امڈتے آئے جیسے ہمیں بھی اپنے وجود کا حصہ بنا لیں گے.. ہم ان کے پتے اور ٹہنیاں بن جائیں گے.. ہماری کار تنہا اس گھرے کُنج میں چلی گئی یہاں تک کہ ایک پارکنگ کا مقام آیا اور ہم نے اُسے پارک کر دیا..

بائیں جانب گہرائی میں کچھ چوبی سیڑھیاں تھیں ہم اُن پر اُترنے لگے.. کچھ کچے راستے آئے اور ڈھیروں خاموشی آئی.. شاید یہ پرندوں کے چہکنے کا وقت نہ تھا یا وہ درخت اتنے گھنے تھے کہ ان میں پوشیدہ پرندوں کی آوازیں ہم تک نہ پہنچتی تھیں ورنہ اتنی خاموشی کیونکر ہو سکتی تھی..

راستے کے اختتام پر لکڑی کے ایک کیبن میں وکائیوا نیشنل پارک کا سوونیئر سٹور تھا اور یہیں سے پانچ ڈالر فی گھنٹہ کے حساب سے کینو حاصل کئے جا سکتے تھے.. رقم جمع کروا کے رسید یہاں سے حاصل کی جاتی تھی اور کینو ظاہر ہے نیچے وکائیوا ندی کے کناروں پر ملتے تھے.. اس کیبن کے باہر مختلف بورڈوں پر پارک میں پائے جانے والی جنگلی حیات کی تفصیل تھی.. یعنی جانوروں، پرندوں، مینڈکوں اور سانپوں کی تصویر اور تفصیل تھی.. یہاں گیٹرز تو تھے ہی کہ یہ ایک گیٹر کاؤنٹی تھی، ان کے سوا کچھوا حضرات کی بھی بہت ورائٹی تھی.. سانپ چوبیس اقسام کے پائے جاتے تھے، وافر پائے جاتے تھے اور ان کی تفصیل پڑھ کر حد درجہ طمانیت ہوئی کہ ان میں سے صرف چار ایسی قسمیں تھیں جن کے کاٹے کا پانی نہیں مانگتا تھا.. اور کیوں نہیں مانگتا تھا؟ اس لئے کہ کاٹے جانے

کے لمحے میں وہ دکائیواندی کے آس پاس ہوتا تھا تو اس نے مزید پانی کیا کرنا تھا.. چنانچہ ہمیں صرف اتنی سی احتیاط کرنی تھی کہ ان چار سانپوں کے سائز.. کینچلی کے رنگ اور ڈیزائن اور ان کی سرسراتی زبانوں کی بناوٹ یاد رکھنی تھی اور جہاں بھی ان سے ملاقات ہو جائے انہیں ''سلام نمستے'' کہہ کر ذرا پیچ کے نکل جانا ہے.. سلام اس لئے کہ ہم ماشاءاللہ سے مسلمان ہیں اور نمستے اس لئے کہ ہندومت میں ناگ دیوتا کی پرستش کی جاتی ہے اور کون جانے ان میں سے کوئی ایک دیوتا ہو اور صرف سلام کہنے سے برا مان جائے..

ان چاروں اقسام کے سوا جتنے بھی یعنی بیس کے قریب سانپ تھے وہ بے ضرر تھے اور آپ انہیں بے خطر ایک ٹائی کے طور پر گلے میں باندھ سکتے تھے..

کیبن کے برابر میں واش رُومز کی سہولت بھی میسر تھی جس سے میں نے فوری فائدہ صرف اس لئے اٹھایا کہ اگر ندی کنارے یا جنگل میں چلتے ہوئے بدن میں آبی دباؤ بڑھ جائے تو وہاں ہلکا کرنے کی خاطر اپنے آپ کو عیاں کرنا خطرے سے خالی نہ تھا.. کیا جانئے ان چار زہریلے سانپوں میں سے کوئی ایک موقع غنیمت جان کر کسی ایسے مقام پر ڈس لے کہ آپ زندگی بھر کے لیے آہ وفغاں سے.. یعنی نسوانی آہ وفغاں سے فارغ ہو جائیں اور وہ سانپ یہ بھی جان لے کہ آپ واقعی مسلمان ہیں..

ایک اور کچا راستہ نیچے جارہا تھا اور ہم اس پر ٹھپ ٹھپ کرتے نیچے چلے گئے اور وہاں وکائیواندی کیسی خوش نظر اور پوشیدہ تھی جو ظاہر ہوئی تو ہم خوشی سے لبریز ہو گئے اور وہ ندی بہتی نہ تھی، ایک گم صم ساکت تصویر تھی..

ندی کے دوسرے کنارے پر ہمارے ہاں کے جوہڑوں میں کثرت سے پائی جانے والی بوٹی پانیوں کو ڈھک رہی تھی..

پچپن برس پیشتر کے گکھڑ منڈی کے دارے کے سامنے جو ایک وسیع گدلا اور بدبودار جوہڑ ہوا کرتا تھا جس میں بابو ڈوب گئی تھی اور جہاں چاچے سلیم تارڑ نے اپنی دونالی بندوق سے ایک جل ککڑ شکار کیا تھا وہاں بھی یہی بوٹی جوہڑ کے پانیوں کو ڈھانپتی تھی اور بہار کے دنوں میں کاسنی رنگ کے پھول ''کمیوں'' کے پھول اس بوٹی میں سے نمودار ہوتے تھے.. پنجابی شاعری میں محبوب کے روپ کو انہی کمیوں کے پھولوں سے تشبیہہ دی جاتی تھی.. اور اس گھنی بوٹی کے اندر وہ

کچھوے آرام کرتے تھے جن میں سے ایک تو میں نے بھی شکار کیا تھا.. اور وہ نابنجار میری بیش قیمت کم از کم دو آنے کی کُنڈی ہڑپ کر گیا تھا.. جوہڑ کے کنارے اس کے پانیوں میں کنڈی ڈالے ایک گرم دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں اور چلچلاتی چیلوں کے دہکتے ہوئے آسمان تلے میں نے اپنے ہاتھوں میں تھامی ڈور پر جب ایک تناؤ محسوس کیا تو میرے تن بدن میں ایک سنسنی پھیل گئی کہ بالآخر کوئی وزنی مچھلی پھنس گئی ہے اور جب میں نے اپنی پورے دس برس کی حیات کی طاقت بروئے کار لا کر ڈوری کھینچی تو اس کے آخر میں ایک مچھلی نہ تھی ایک واہیات کچھوا تھا.. میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ میری دو آنے والی کُنڈی اُگل دے.. اسے جوتے مارے.. ایک ڈنڈے سے زدوکوب کیا لیکن وہ پتھر بنا رہا.. وہ اپنے خول کے حصار میں سے گردن باہر نکالتا تو کُنڈی برآمد ہوتی.. میں نے اسے اتنا مارا کہ وہ مر گیا.. اور میں رونے لگا.. وہ اتنا مر گیا کہ میں ابھی اس کی موت اور کُنڈی کے غم میں آنسو پونچھنے کو تھا کہ وہ رینگتا ہوا پھر سے جوہڑ میں اتر گیا.. تب سے اب تک جب میں کسی بھی کچھوے کو دیکھتا ہوں.. بے شک ''اینیمل پلینٹ'' کے چینل پر دیکھتا ہوں تو مجھے یہ وہی کچھوا لگتا ہے جو میری قیمتی کُنڈی کو ہڑپ کر کے غائب ہو گیا تھا اور میں اسے جوتے مارنا چاہتا ہوں..

وکائیواندی کے ریتلے کناروں پر کچھ کچھوے آرام کر رہے تھے اور میں انہیں دیکھ کر پھر سے اشتعال میں آنے کو تھا جب ایک کیبن میں مقیم ایک موٹا سا مسخرہ شخص ہمیں دیکھ کر باہر آ گیا.. کچھوؤں کی قربت میں چار پانچ کینو سفید اور پیلے ریت پر اوندھے پڑے تھے.. اس نے ادائیگی کی رسید ملاحظہ کی اور دو چپو ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا ''تم ان میں سے کوئی سا کینو بھی پسند کر سکتے ہو.. ہمارے پاس بہت ورائٹی ہے.. سفید بھی ہیں اور پیلے رنگ کے بھی.. پسند کر لو..''

کیبن کے برابر میں ایک وارننگ درج تھی ''جنگلی جانوروں کو خوراک کھلانا سختی سے منع ہے..'' میں نے اپنی سیاحتی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر نہایت سنجیدگی سے پوچھا ''مثلاً کون سے جنگلی جانوروں کو خوراک کھلانا منع ہے؟''

''مثلاً مجھے..'' اُس نے قہقہہ لگا کر کہا ''یہ بورڈ صرف میرے لئے یہاں آویزاں کیا گیا ہے کیونکہ یہاں جو لوگ بھی آتے تھے مجھے پیزے اور آلو کے قتلے کھلاتے تھے جن کی وجہ سے میں

اتنا موٹا ہو گیا ہوں.. اور میرا بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا ہے..''

عجیب خوشگوار اور مسخرہ شخص تھا.. لیکن وہ فوراً سنجیدہ بھی ہو گیا ''ہاں آپ وائیکو اندی میں نہ تو مچھلیوں کو کوئی خوراک ڈال سکتے ہیں اور نہ ہی کچھوؤں کو کچھ کھلانے کی کوشش کر سکتے ہیں اور مگرمچھوں کو کچھ بھی کھلانے کے لیے چونکہ ان کے قریب جانا پڑتا ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ ایسا نہ کریں.. ورنہ انہیں خوراک کھلانے کی بجائے آپ اُن کی خوراک بن سکتے ہیں..''

''یعنی اس ندی میں مگرمچھ بہت ہوتے ہیں..''

''ہاں کافی ہوتے ہیں.. ویسے تو ایک مگرمچھ بھی کافی ہوتا ہے لیکن یہاں ایک سے زیادہ بہت زیادہ ہوتے ہیں.. میں آج صبح یہاں سے کچھ دور گیا تھا تو جیسا کہ ہو جاتا ہے راستے میں میرا کینو اُلٹ گیا اور میں پانی میں ہاتھ پیر مارتا پھر سے اس پر سوار ہو گیا جب میں پانی میں تھا تو میرا ہاتھ ایک مادہ مگرمچھ پر پڑ گیا لیکن اس نے مجھے کچھ نہیں کہا، وہ میرا ہاتھ چبا بھی سکتی تھی..''

''آپ کیسے جان سکتے ہیں کہ وہ ایک مادہ ہی تھی؟''

''ہاہا..'' وہ پھر سے مسخرہ ہو گیا ''یہ تجربے کی بات ہے.. ہاتھ پڑ جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہاں مادہ ہے یا نر..''

''یعنی آج ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ وکائیو اندی میں کوئی مگرمچھ نظر آ جائے گا؟''

''میں کہہ نہیں سکتا کیونکہ آج کہیں کہیں بادل ہیں، دھوپ تیز نہیں اور وہ عام طور پر دھوپ سینکنے کے لیے کناروں پر آ کر لیٹتے ہیں.. بہر حال آپ احتیاط کیجیے گا کہ آپ کا کینو اوندھا نہ ہو جائے.. آپ کو کینو کھینے کا تجربہ تو ہو گا..''

''مجھے تو نہیں، اِسے ہے'' میں نے بلال کی جانب اشارہ کیا ''یہ میرا داماد ہے..''

''مجھے اُمید ہے کہ یہ تمہیں ایک فادر اِن لاء کے طور پر پسند کرتا ہو گا ورنہ.. کوئی بھی داماد جو اپنے فادر ان لاء کو پسند نہیں کرتا وہ وکائیو اندی میں اپنے کینو کو جان بوجھ کر اُلٹا کر اس سے نجات حاصل کر سکتا ہے.. ہاہا.. ہاہا..''

''ہاہا..'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی نقل اُتاری ''فنی مین..''

بلال نے سفید رنگ کا ایک کینو ریت سے گھسیٹ کر ندی کے پانی میں اُتارا..

میں اس خام خیالی میں مبتلا تھا کہ میرا داماد میری بزرگی کے احترام میں مجھے کینو میں

بٹھائے گا اور چپو وغیرہ خود ہی چلائے گا.. میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے اور روانی کے سحر کو آنکھوں میں اتارتا مسکراتا مزے کروں گا.. لیکن اس نے کچھ لحاظ نہ کیا، ایک چپو خود تھاما اور دوسرا میرے حوالے کر دیا کہ انکل زور لگا کے ہیّا.. انکل میں زور ہوتا تو کہیں اور نہ لگاتے لیکن.. ہیّا..

کنارے سے جدا ہو کر بہاؤ کی روانی میں آنے کے لیے ہمیں بہت زور لگانا پڑا.. لیکن ہم آ گئے..

ہم نے دائیں جانب بہنا تھا لیکن بائیں جانب لکڑی کے ایک بوسیدہ پل کے پار وہ مختصر جھیل، درختوں کے سبزے تلے نیلگوں پانیوں کا ایک ذخیرہ تھا جو کہ وکائیو اندی کا منبع تھا.. اُس جھیل کی تہہ میں سے درجنوں چشمے پھوٹتے تھے جھیل کچورا کی مانند.. کنوارے پانیوں کی آبشاریں اچھلتی تھیں.. اور پھر یہ پانی وکائیو اندی کا روپ دھار کر بہنے لگتے تھے.. ہزار ہا شجر ہائے سایہ دار کی آغوش میں بہتے چلے جاتے تھے اگرچہ وہ لگتے سکوت میں تھے لیکن ان میں روانی تھی جس کا احساس تب ہوتا تھا جب آپ کا کینو ہولے ہولے خود ہی بہنے لگتا تھا..

اور میں اس خام خیالی میں مبتلا تھا کہ اگر آپ بہاؤ کے ساتھ بہنے لگتے ہیں تو خود ہی بہنے لگتے ہیں اور آپ نے کچھ کام نہیں کرنا.. بے شک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں.. چپو بے شک رکھ دیں کشتی تو چلی جا رہی ہے خدا کے سہارے.. جب کہ ایسا ہرگز نہیں تھا.. آپ نے اپنے کینو کو ندی کے مرکزی بہاؤ میں رکھنا ہے.. اور یہ کچھ اتنا آسان نہ تھا.. خون پسینہ ایک کرنا پڑتا تھا.. مسلسل چپو چلانے پڑتے تھے ورنہ کینو تو کسی شرارتی بچّے کی طرح کبھی اِدھر نکل جاتا تھا اور کبھی اُدھر اور اسے کھینچ تان کر واپس لانا پڑتا تھا.. بس یہ سمجھ لیجیے کہ یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لینا.. اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے.. یہ ابلتے رواں پانی آگ کے نہ تھے، شفاف شیشہ خنک بدن تھے لیکن ان میں بھی ڈوب کے جانا خطرے سے خالی نہ تھا کہ ان کے اندر گیٹر تھے لیکن مجھے کچھ زیادہ ڈر نہ تھا، میں جانتا تھا کہ میں محفوظ رہوں گا کہ میری عمر میں کسی مادہ کا مجھ پہ ملتفت ہونا قدرے دشوار تھا بے شک وہ ایک مگرمچھ مادہ ہی کیوں نہ ہو.. ہاں اگر وہ نابینا ہو تو پھر دوسری بات ہے..

ساحل سے جدا ہو کر جونہی ہم بہاؤ میں شامل ہوئے تو ہمارے سامنے دور دور تک ایک منظر کھلا.. ایک خاموشی کھلی جس کے کناروں پر جانے کن زمانوں کے اشجار تھے.. اور وہ چُپ تھے..

ان زمانوں کے جب سیّاں جی اس ندی کے پار اترا کرتے تھے.. وہ ہم پر جھکے، پانیوں پر اپنی

شاخیں جھکائے ہمیں دیکھتے تھے..اور یہ ندی دور تک چلی جاتی تھی.. پانی میں گرچکے درختوں پر دھیرے سے بہتی تھی..کبھی اس کی سطح پر سورج اترتا تھا اور اسے سیال پارے میں بدل دیتا تھا اور آنکھوں کو یوں چندھیا دیتا تھا کہ ہم اپنا راستہ بھی نہ دیکھ سکتے تھے..یہ میرے ساتھ کیسی روشنی ہے کہ مجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے..اور اگلے لمحے ہم بہتے ہوئے ذرا آگے ہوتے تو سورج بادلوں میں روپوش ہو جاتا اور ندی کے پانی چھاؤں میں چلے جاتے..

ہاں کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ کینو ایک ہی سیدھ میں خودبخود تیرنے لگتا اور ہم چپّو اُٹھا لیتے..چونکہ میں کینو کے اگلے حصے میں براجمان تھا اس لئے ان لمحوں میں میں یکسر تنہا ہو جاتا..پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے بلال کی موجودگی سے غافل ہو جاتا اور تنہا اس منظر کے اندر داخل ہوتا جاتا..مجھ پر کبھی درختوں کی گھنیری چھاؤں چھا جاتی اور کبھی دھوپ کے جزیرے میرے بدن پر اُترنے لگتے..

پانیوں پر نگاہ کرتا تو اُن میں تیرتی مچھلیاں بھی کبھی سائے میں چلی جاتیں اور سرمئی لگنے لگتیں اور کبھی دھوپ میں نکل کر رنگینیوں میں ڈوب جاتیں..

ایک عجیب سا احساس مجھ میں تیرنے لگتا کہ میں ایک بدن میں قید نہیں ہوں..دراصل ایک روح ہوں..وہی ازلی روح جو اللہ کی پھونک سے وجود میں آئی اور پانیوں پر تیرتی تھی تو میں وہ ہوں..اور مجھ سے ہی آئندہ جہان تخلیق ہوں گے..بنی نوع انسان کا منبع میں ہوں..ایک آدم ہوں..چونکہ تمام حیات نے پانیوں سے جنم لیا تو یہ وہ پانی ہیں جن میں سے میں جنم لے رہا ہوں..میں ہی حق ہوں..انا الحق ہوں..اور میں ہی سچ ہوں..ایک آدم ہوں..

لیکن یہ احساس پل دو پل کے لیے مجھ میں تیرتا اور پھر زائل ہو جاتا..

کینو کو پانیوں میں دھکیلتے ہوئے بلال نے ایک حیرت کا اظہار کیا تھا کہ آج کوئی اور ہی دن ہے کہ ہم اس ندی کی روانی میں اترنے والے واحد مسافر ہیں ورنہ میں جب کبھی یہاں آیا تو یہاں اتنے کینو ہجوم کرتے تھے کہ آپس میں بھڑتے رہتے تھے اور راستہ نہیں ملتا تھا..

پوری وکائیوا ندی میں بہتے اُس روز ہمارے سوا اور کوئی نہ تھا..

یہ ہماری ملکیت میں تھی..

میں زندگی میں پہلی بار ایک کینو میں سوار ہوا تھا لیکن میں ایک پُرشوق طالب علم تھا اور

کچھ دیر بعد ہی اس کے اسرار و رموز سے آگاہ ہو گیا کہ اگر اس کا رُخ دائیں جانب کرنا ہے تو چپّو کو بائیں جانب پانیوں میں ڈال کر زور لگانا ہے..اور اگر وہ کناروں کے قریب ہوا جاتا ہے اور اسے پانی میں ڈوبے ہوئے درختوں کے تنوں اور شاخوں سے بچانا ہے جن سے اُلجھ کر وہ اُلٹ سکتا ہے تو پھر چپّو کو پانی کی سطح پر نہیں چلانا بلکہ گہرائی میں ڈبو کر خوب زور لگانا ہے..یعنی اب میں ایک ماہر کینو کھینے والا ہو چکا تھا اور ایک قدیم ریڈ انڈین ہو سکتا تھا..

''انکل عینی نے اس مقام پر گیٹر دیکھا تھا اور چیخیں ماری تھیں'' بلال نے نہایت سنجیدگی سے مجھے اُس تاریخی مقام سے آگاہ کیا..

تب مجھے خیال آیا کہ کہاں ہیں وہ درجنوں مگرمچھ اور مگرمچھنیاں جو وکائیوا ندی میں تیرتے پھرتے ہیں اور کناروں پر دھوپ سینکتے ہر کسی کو دکھائی دیتے ہیں..وہ کہیں نہ تھے..میں بیان کر چکا ہوں کہ شاید میں تاریخ میں وہ واحد شخص ہوں جو فلوریڈا ایسے گیٹر کنٹری میں آیا اور ایک بھی گیٹر دیکھے بغیر بہ چشم نم رخصت ہو گیا.

بلند پہاڑوں کے سوا آج میں پہلی بار ایک جنگل میں بہتی ندی میں یکسر تنہا ہوا تھا..اور تنہائی بھی کیسی نایاب نعمت ہے جس کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا کہ تنہائی میں ہی پیغمبری اُترتی ہے..نہ اُترے تو بھی پیغمبری کے بھید سمجھ میں آنے لگتے ہیں..

اب کیا دیکھتا ہوں کہ کنارے پر خودرو پودوں اور مردہ ٹہنیوں کے درمیان ایک بہت بڑے حجم کا گیٹر دم سادھے بیٹھا ہے..وہ آنکھ بھی نہ جھپکتا تھا..

''بلال'' میں نے مڑے بغیر اُسے پکارا کہ مڑنے سے کینو کا توازن خراب ہو جاتا تھا

''گیٹر..''

''کہاں انکل؟'' اُس کی آواز آئی..

''وہاں..''

''گیٹر ہی لگتا ہے..بہت بڑا ہے..ذرا قریب ہوتے ہیں'' وہ چپّو چلاتا قریب ہوا

''نہیں انکل..گیٹر نہیں..ذرا غور سے دیکھئے پانی میں گرا ہوا ایک بوسیدہ درخت ہے..''

''یار اُس کی ایک آنکھ بھی ہے..''

''لگتا گیٹر ہی ہے..پر ہے نہیں..''

ان پانیوں کی سرسراتی چُپ میں.. بہتے بہتے.. اور پانی ویسے جیسے فلٹر جھیلوں کے آئینہ پانی ہوں.. اور اُن میں کائی کی لمبی گھاس اس لیے ہولے ہولے سرسراتی ہو اور اُس کے قدموں سے چشمے پھوٹ رہے ہوں اور وہ اُن کے پانیوں کے زور سے سرسراتی ہو. اور جھیل سرال ایسے نظر کے آر پار نیلے پانی.. اور دونوں جانب گھنے جنگلوں کی چُپ.. تو ایسی سکوت بھری تنہائی کی گود میں بہتے انسان کے حواس بھی کیسے کیسے شعبدے دکھاتے ہیں..

میں ایک ایسا شخص ہوں جس کے قبیلے والے نامعلوم زمانوں سے ایک ہی مقام پر بستی بسائے بیٹھے ہیں اور وہ اس دنیا سے باہر نکلنے کو گناہ جانتے ہیں کہ وہ اس یقین میں ہیں کہ اس سے بہتر دنیا اور کہیں نہیں ہے اور میں ایک ایسا شخص ہوں جو کائنات اور سمندروں کے بھید جاننا چاہتا ہوں.. میں نے اپنے ہاتھوں سے چوری چھپے ایک کشتی تراشی ہے اور اُس میں سوار ہو کر نامعلوم سمندروں میں اُتر گیا ہوں صرف اس تجسس میں کہ شاید ان کے پار کہیں ایک اور جزیرہ ہو.. ایک اور دنیا ہو.. اور وہ صرف میری ہو..

یا میرے اپنے قبیلے نے مجھے آشفتہ سَر اور خبط کا مارا ہوا قرار دے کر مجھے عاق کر دیا ہو کہ اپنا خیمہ سمیٹ اور یہاں سے چلا جا.. اور میں نے اس ندی کے بہاؤ میں کشتی ڈال دی ہو کہ یہ مجھے جہاں بھی لے جائے گی وہیں میں اپنی ایک تازہ بستی آباد کر لوں گا..

اُس مکمل تنہائی میں بہتے ہوئے جب ہمارا کینو پانیوں پر راج کرتا تنہا تھا مجھے ایک اور عجیب سا خیال آ گیا کہ اگر یکدم سامنے سے ایک ٹائی ٹینک کے حجم کا جہاز نمودار ہو جائے.. پانیوں کو چیرتا- تلاطم برپا کرتا.. بلندی میں درختوں کی چوٹیوں سے بھی اونچا ہوتا.. ہماری جانب اندھا دُھند چلا آتا ہو اور وہ جہاز تو اس پوری ندی کو بھر دے گا تو پھر ہم کیا کریں گے.. وہ تو ہمیں روندتا ہوا چھک چھک کرتا چلا جائے گا.. کیا یہ عجیب سا خیال نہیں ہے.. اور یہ آیا..

میرے بازو شل ہو رہے تھے.. چپّو چلاتے چلاتے وہ اتنے دُکھتے تھے کہ میں چپّو کو پانی میں پھینک کر سو جانا چاہتا تھا.. اگلے کئی روز تک میرے بازوؤں میں دُکھن ہوتی تھی.. اور یہ تو ہونی ہی تھی کہ محبت اور جذبے کی شدت کے لمحوں کے بعد دُکھن تو ہوتی ہے جو لاکھ سُکھوں سے زیادہ سُکھ دیتی ہے..

سامنے سے ٹائی ٹینک تو نہ آیا البتہ ندی کی تنہائی اور چُپ میں ایک سرخ رنگ کا

کے یاک چلا آ رہا تھا. سرخ ہیلمٹ پہنے دائیں بائیں چپّو چلاتا کوئی شخص آ رہا تھا..

وہ آیا.. ہمارے پاس سے گزر کر چپّو چلاتا گزر گیا..

مجھے شک ہے کہ اُس نے ہمیں دیکھا ہی نہیں چپّو چلانے میں اتنا مگن کہ دیکھا ہی نہیں اور گزر گیا..

یہ واحد شخص تھا جو اُس دُھندلی سویر میں وکائیواندی پر بہتا ہماری نظروں میں آیا تھا.. آیا اور گزر گیا..

بلال کے مطابق اس ندی کے آس پاس جتنے جنگل ہیں وہاں انسان قدم نہیں رکھ سکتا.. اُن کے اندر جانا منع ہے تا کہ وہ قدیمی حالت میں جوں کے توں محفوظ رہیں اور وہاں سے ایک ٹہنی اُٹھا کر لے آنا بھی جرم ہے.. دیگر جانوروں کے علاوہ ان وکائیوا جنگلوں میں ریچھ بھی پائے جاتے ہیں..

امریکیوں کو اپنی سرزمین سنبھالنے کا ہنر آتا ہے.. وہ اُسے واقعی ایک ماں سمجھتے ہیں اور دل و جان سے اُس کی حفاظت کرتے ہیں.. انہیں خبط ہے اپنے جانور' پرندے' جنگل' دلدلیں' ندیاں' آبشاریں اور چٹانیں محفوظ کرنے کا اور سنبھالنے کا.. اُن کی عزت کرنے کا اور انہیں انسانوں سے بھی بلند درجے پر فائز کرنے کا.. یہ سب کچھ گوری اقوام کی خصلت میں تو نہ تھا البتہ یہاں کے آبائی باشندوں کے خون میں تھا.. مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے اُن آبائی باشندوں کی روحیں آج کے امریکیوں میں حلول کر گئی ہیں.. اور یہ انہی روحوں کا کرشمہ ہے کہ امریکی قدرت کے ان لازوال تحائف کی قدر کرنے لگے ہیں.. مثلاً جو ''بالڈ ہیڈڈ ایگل'' ہے امریکہ کا امتیازی نشان جو بیک وقت زیتون کی ایک شاخ اور تیر کو امن اور جنگ کی علامت کے طور پر ظاہر کرتا ہے.. اگرچہ وہ اکثر اوقات تیر ہی چلاتا ہے زیتون کی شاخ کا استعمال شاذ ہی کرتا ہے تو یہ دراصل گنجا نہیں بلکہ اس کے سر پر جو گھنے سفید بال ہیں وہ دور سے کم دکھائی پڑتے ہیں اور یہ گنجا لگتا ہے۔ اگرچہ ہے نہیں تو اس پرندے کو گزند پہنچانا یا اُسے پریشان کرنا بھی ایک جرم شمار ہوتا ہے.. گنجا عقاب اگر ایک امریکی پر جھپٹ پڑے اور اس کے چہرے کو لہولہان کر دے تو بھی وہ اُس پر ہاتھ نہیں اُٹھائے گا کہ کہیں اس کا ایک پَر نہ جھڑ جائے..

بلال سینفورڈ کاؤنٹی کا سٹی انجینئر ہے' اُس کا کہنا ہے کہ جب ہم ایک نئی بستی کے لیے

جنگل یا دلدل صاف کر رہے ہوتے ہیں اور اگر ہمیں یہ پتہ چل جائے یا کوئی ہمیں خبر کر دے کہ وہاں کسی درخت پر گنجے عقاب کا گھونسلا ہے تو ہمارے بُل ڈوزر رُک جاتے ہیں، تعمیراتی کام فوراً روک دیئے جاتے ہیں کیونکہ یہاں کے قانون کے مطابق جہاں کہیں گنجے عقاب کا بسیرا ہو اس کے آس پاس تقریباً نصف کلومیٹر تک کوئی تعمیر نہیں کی جا سکتی جنگل نہیں کاٹا جا سکتا تا کہ وہ بے آرام ہو کر اپنا گھونسلا نہ چھوڑ دے.. آرلینڈو میں کم از کم دو شاہراہیں ایسی ہیں جو اچھی بھلی سیدھی چلی جا رہی ہوتی ہیں اور پھر ایک جنگل کے گرد گھوم کر پھر سے براہ راست ہو جاتی ہیں صرف اس لیے کہ وہاں گنجے عقاب کے گھونسلے تھے۔ شاہراہ کا راستہ بدل کر اُسے ایک نیم دائرے کی شکل دے کر آگے لے جایا گیا تا کہ گنجا عقاب سُکھ کی نیند سو سکے..

چلئے عقاب، ہرن یا مگرمچھ تو کچھ جانور ہوئے، اگر آپ کہیں گھر تعمیر کر رہے ہیں اور بدقسمتی سے آپ کی زمین میں کچھوؤں کی وہ نسل قیام پذیر ہے جو مٹی میں رہتی ہے تو آپ وہاں گھر تعمیر نہیں کر سکتے.. ایک صاحب جانتے تھے کہ اُن کی زمین کے اندر وہ کچھوے رہتے ہیں اور پھر بھی وہ گھر بناتے رہے.. کسی نے رپورٹ کر دی اور موصوف کو چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔

چینی بھی ایک ایسی قوم ہے جنہوں نے اپنے ماضی کو سنبھال رکھنے میں کمال کیا ہے..
مثلاً شی آن میں ”پتھروں کا جنگل“ نامی عجائب گھر ہے جہاں پتھر کی ایسی سِلیں نمائش پر ہیں جن میں سے کچھ دو سے ڈھائی ہزار برس پرانی ہیں اور اُن پر کنفیوشس، مہاتما بدھ اور قدیم چینی فلسفیوں کے فرمودات کندہ ہیں۔ چینی شاعری اور آداب کے طریقے کُھدے ہوئے ہیں۔ یوں جان لیجیے کہ پتھر کی کتابوں کی ایک لائبریری ہے.. ان کا مطالعہ کیجیے اور آپ ڈھائی ہزار برس پیشتر سے لمحۂ موجود تک چینی زبان کے ارتقاء سے واقف ہو جائیں گے.. وہ کیسے مختلف ادوار میں بدلی اور کونسے محاورے کس زمانے میں رائج ہوئے.. اور تمام عظیم فلسفیوں کے فرمودات اور چینی شاعری کی اصل تحریر اور محاورہ کیا تھا..

چین کے بعد امریکہ میں مجھے احساس ہوا کہ یہ قوم بھی اپنے ماضی کو سنبھالتی ہے، اگرچہ ایک فرق کے ساتھ.. چینی اپنی قدیم ثقافت اور ادب کو سنبھالتے ہیں اور امریکی اپنی سرزمین کو.. اس کے شجر، جانور اور پرندے سنبھالتے ہیں کیونکہ چین ایک پرانی دنیا ہے اُس نے اپنا ماضی سنبھالنا ہے.. امریکہ ایک نئی دنیا ہے اس کے پاس ماضی نہیں ہے صرف حال ہے اور اسی حال میں جو شجر،

جانور اور پرندے ہیں انہیں سنبھالنا ہے..

اور ہمارے پاس یہ دونوں زمانے ہیں.. قدیم ثقافت اور ادب بھی ہے اور سرزمین بھی اور شجر، جانور اور پرندے بھی مگر ہم ان میں سے کسی کو بھی نہیں سنبھالتے.. کہ ہم اُن کی طرح ایک قوم نہیں.. قراردادوں، نعروں اور جلسے جلوسوں میں ہم ایک قوم ہیں، لیکن ہیں نہیں.. ہوتے تو کبھی اپنی قدیم ثقافت اور سرزمین سے مجرمانہ غفلت نہ برتتے.. سیاست، مذہب اور فوج کی کوئی ثقافت یا سرزمین نہیں ہوتی.. اُن کے لیے وہ ایک مفتوحہ علاقہ ہوتے ہیں جن پر راج کرنا اُن کی واحد ترجیح ہوتی ہے.. انہیں کیا اگر گندھارا.... پاکستان کی سب سے عظیم تہذیب کے مجسّمے، خانقاہیں اور آثار یکسر ملیامیٹ ہو جائیں.. فیریؔ میڈو کے قدیم آبائی جنگل بیدردی سے کاٹ دیئے جائیں اُن میں رہنے والے مرغ زرّیں ہلاک کر دیئے جائیں.. دنیا میں صنوبر کے قدیم ترین درختوں کا سب سے بڑا جنگل تباہ ہو جائے.. عنقا پرندوں کو بُھون کر عرب شاہوں کے دسترخوانوں کو سجایا جائے.. ناچتے موروں کا خودکار ہتھیاروں سے قتلِ عام کیا جائے.. اگر کسی چوک میں ایک خوبصورت گھوڑے کا مجسمہ ایستادہ کیا جائے تو اُسے بھی غضبناک ہو کر ڈھا دیا جائے کہ یہ بُت ہے..

بامیان میں دنیا کے سب سے بلند بدھ مجسّموں پر توپوں اور طیاروں سے حملہ کر کے انہیں ملبے میں بدل دیا جائے تو اس سربلندی میں کیا مضائقہ ہے.. کم از کم طالبان کے دور میں یہ فیصلہ تو بالآخر ہو گیا کہ شرعی داڑھی وہ ہے جو مٹھی میں بھینچنے سے غائب نہ ہو جائے بلکہ اُس کے بال مٹھی سے باہر جھانک رہے ہوں..

ہم اگرچہ چین ایسی قدیم ثقافت اور امریکہ ایسی شاندار سرزمین والے نہیں لیکن ہم اُن کی برابری یوں کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس یہ دونوں شواہد موجود ہیں.. مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان سے جوڑتے نہیں.. اپنی ثقافت یا سرزمین سے تبھی عشق ہو سکتا ہے جب آپ ایک قوم ہوں.. اپنی دھرتی کے وارث ہوں اور اس کا باسی ہونے پر فخر کریں.. ہم تو اس مٹی سے وفاداری کرنا گناہ جانتے ہیں کیونکہ ہمارا کوئی وطن نہیں، ہر وہ ملک ہمارا ہے جو خدا کا ہے.. بس جس ملک میں رہتے ہیں وہ ہمارا نہیں ہے، ہم تو اس میں ایک فاتح کی مانند دندناتے پھرتے ہیں اور اسی لیے آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ہماری ثقافت کیا ہے اور ہماری تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے.. تو پھر سنبھالیں کیا!

اور جب کبھی چپّو چلائے بغیر ہمارا کینوٗ بہاؤ کی زد میں آ کر خود سے بہتا چلا جاتا تھا اور میں یکسر تنہا محسوس کرتا تھا تو میرے تصور میں یہ بھی آتا کہ کسی زمانے میں اسی وکائیو ندی کے پانیوں پر کھوکھلے تنے والے ریڈ انڈین کینوٗ بھی تیرا کرتے ہوں گے.. اور کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا.. دو تین سو برس پیشتر اس سرزمین کے آبائی بیٹوں کی کشتیاں یہاں رواں ہوتی ہوں گی.. اُن کے سرخ و سفید بدنوں پر اسی سوج کی کرنیں جیسے میرے وجود پر پڑتی ہیں ایسے ہی پڑتی ہوں گی.. وہ بھی دھوپ چھاؤں کے اس کھیل میں سے گزرتے ہوں گے.. وہ ''بہتے پانی'' جو ہزاروں برسوں سے بہتے چلے آ رہے تھے اور اُن پر اُن کی کشتیاں اور کینوٗ بہتے چلے آئے تھے.. آزاد' مہمان نواز.. اپنی آبائی سرزمین پر فخر کرنے والے.. اور اس یقین کے اسیر کہ ابد تک ہمارے خیمے اسی دھرتی پر نصب رہیں گے.. ہم اس میں دفن ہوتے رہیں گے اور پھر زندہ ہوتے رہیں گے..

اور کیا تب اُن کے گمان میں بھی آ سکتا تھا کہ یہ سب کچھ ہم سے چھن جائے گا.. یہ بہتے پانی اُبلتے پانی جن میں ہمارے کینوٗ رواں ہیں یہ بھی ہمارے نہ رہیں گے.. نہ ہم رہیں گے اور نہ ہماری ثقافت۔ زبان یا لباس.. ہمارے قبیلے معدوم ہو جائیں گے اور صرف کتابوں میں ہماری تصویریں رہ جائیں گی.. البتہ یہ بہتے پانی رہ جائیں گے اور ان پر بھٹکی ہوئی بے روح رنگت والے عجیب شکلوں والے لوگ قابض ہو جائیں گے.. بے شک ان کی شفافی میں جھلملاتی مچھلیاں' دھوپ میں آرام کرتے مگرمچھ' کچھوے' آبی پرندے اور سانپ رہ جائیں گے لیکن ہم نہ رہیں گے..

امریکہ اور کینیڈا میں بھی آبشاروں' چٹانوں اور ندیوں وغیرہ کے انڈین نام محفوظ کر لیے گئے ہیں' اُنہیں اُنہی ناموں سے پکارا جاتا ہے جن سے وہاں کے آبائی باشندے نابود ہو چکے اور اگر موجود ہیں تو اپنی ثقافت اور پہچان کھو چکے باشندے.. پکارتے تھے.. جیسے ہسپانیہ کے دیس میں آج بھی چشم غزال عام ہے پر کوئی نہیں جانتا کہ اس کی سحر انگیز سیاہی میں کونسے خون کا کرشمہ ہے.. وہاں اب بھی درجنوں قصبوں کے نام ''مدینہ'' سے شروع ہوتے ہیں جیسے مدینۃ سالم.. قرطبہ.. غرناطہ.. اشبیلیہ.. مرسیہ.. وادی الکبیر ہی چلے آتے ہیں.. ابھی تک یاسمین' شاکرہ اور سلمیٰ جیسے نام موجود ہیں لیکن وہ نہیں ہیں جنہوں نے یہ نام دیئے.. اور نہ ہی شاکرہ نام کی کولہے تھراتی گلوکارہ کے گمان میں ہے کہ اُس کا نام مسلمان ہے.. اس لیے کہ صرف نام رہ گئے اور وہ خود

نہ رہے.. اور مجھے کبھی کبھی بہت ڈر محسوس ہوتا ہے کہ کہیں فلسطینیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہو.. اور اُن کی تصویریں بھی صرف کتابوں میں ملیں کہ یہ دیکھئے یہ ایک فلسطینی ہے.. اور یہ اس کا بچہ ہے جو آٹھ برس کی عمر میں ہی دہشت پسند ہو گیا تھا.. اسرائیلی ٹینکوں پر پتھر پھینکتا تھا اس لیے گولی مار کر اُسے ہلاک کر دیا گیا.. اور یہ ایک فلسطینی ماں ہے جس کے پانچوں بیٹے دہشت گرد تھے انہیں گن شپ ہیلی کاپٹر کے ذریعے کیفر کردار تک پہنچایا گیا.. اور یہ ہزاروں برس قدیم زیتون کے درختوں کا ایک باغ تھا جنہیں بُل ڈوز کر کے نئی یہودی بستیاں تعمیر کی گئیں.. یہ فلسطینی اس لیے معدوم ہو گئے کہ وہ جینیں پہن کر نمازیں پڑھتے تھے اور اُن کی لڑکیاں حجاب نہیں پہنتی تھیں مردوں کے ہمراہ کلاشنکوفیں چلاتی پھرتی تھیں.. یہ وہی فلسطینی ہیں جنہیں امریکہ اور اسرائیل نے تو مارنا ہی تھا لیکن انہیں ان کے عرب بھائیوں نے زیادہ مارا.. سیاہ ستمبر کے مہینے میں اُردن کے بادشاہ کے ساتھ انہیں ایک پاکستانی فوجی افسر نے بھی بہت ہلاک کیا اور اسے اُردن کا ایک فوجی اعزاز عطا کیا گیا جو وہ بڑے فخر سے تب بھی زیب تن کرتا تھا جب وہ اسلام کے نام کی مالا جپتا اپنے ملک کا صدر بن بیٹھا تھا..

مجھے جا بجا کناروں پر ایسے کُنج دکھائی دیتے تھے جہاں ندی کے پانی ایک تالاب کی صورت ٹھہرے ہوئے تھے اور اُن پر گھنے شجر سایہ کرتے تھے.. وہ ایسے پُرکشش اور جادو بھرے دکھائی دیتے تھے کہ میرا جی چاہتا کہ ہم روانی کا یہ سفر کچھ دیر کے لیے موقوف کر کے اس کُنج میں جا بسرام کریں.. میں ایک سگریٹ سلگا کر اُس کُنج کی آبی اور سرسبز تنہائی میں بیٹھ کر دیکھوں تو سہی کہ وہاں کیسے کیسے خیال آتے ہیں.. دھیان کدھر نکل جاتا ہے.. لیکن بلال میری اس تمنا کے بارے میں کچھ زیادہ پُرشوق نہ تھا.. اُس کا خیال تھا کہ یوں مرکزی بہاؤ سے الگ ہو کر اُس کُنج تک پہنچنا اور پھر سے واپس آنا ذرا مشکل ہوگا.. اور اُس یہاں سے سحر انگیز دکھائی دیتے کُنج میں کچھ بھی ہو سکتا ہے..

ہمیں اُس آبی خاموشی اور تنہائی میں بہتے تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا تھا..

ایک بہت پھیلے ہوئے پروں والا پرندہ کچھ دیر ہمارے کینوٗ کے عین اوپر پھڑپھڑایا اور پھر کنارے قریب ایک [illegible] کے تنے پر اُتر کر ہماری جانب دیکھنے لگا..

ایسی شاندار سرزمین چھن جانے پر اس کے قدیم باسیوں نے کیا محسوس کیا ہوگا.. جب

اُن کے تیر، برچھے اور کلہاڑے.. توپوں اور بندوقوں کے سامنے کچھ کام نہ آئے.. اگرچہ وہ جو آئے تھے نہ اخلاق میں اُن سے بہتر تھے اور نہ ہی شکل صورت میں بلکہ اُن کے مقابلے میں وہ وحشی لگتے تھے اگرچہ گوری رنگت کے تھے اور وہ صرف اس لیے اُن سے بدتر ہو گئے کہ اُن کے پاس ہلاکت کے تازہ ترین ہتھیار تھے.. نہ اُن کی اخلاقیات.. سرزمین سے عشق اور نہ ہی اُس میں دفن اُن کے بزرگوں کی روحیں اُن کے کچھ کام آئیں اور وہ ابھی مالک تھے اور ابھی شُودھر ہو گئے..

ہم بہت دور آ چکے تھے.. ندی تو جانے کہاں تک جاتی تھی.. جہاں جاتی تھی ہم وہاں تک تو نہ جا سکتے تھے چنانچہ ہم نے پسپائی اختیار کرنے کی خاطر دائیں بائیں چپّو چلا کر کینوٗ کو بمشکل موڑا اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا..

اور فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اب تک ہم موج کر رہے تھے، مزے اڑا رہے تھے کہ بہاؤ کے ساتھ کبھی کبھار چپّو چلا کر بہتے جانا تو آسان تھا اور اب بہاؤ کی مخالف سمت میں کشتی لے جانے کے لیے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے.. مسلسل چپّو چلانے پڑتے ہیں، ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہیں اور پھر لگتا ہے کہ آپ کا کینوٗ ساکت ہو گیا ہے.. حرکت ہی نہیں کرتا.. بہاؤ کے مخالف چلنا ہمیشہ دشوار ہوتا ہے، جدھر زمانہ چلتا ہے ادھر تو ہر کوئی چل سکتا ہے، مروّجہ رسوم، اخلاقیات اور مذہبی اقدار کے ساتھ بہتے جانا تو بہت آسان ہے البتہ اپنی راہ تلاش کر کے اس پر چلنا.. معاشرے کے مخالف رخ پر چلنا تو جان لیوا ہوتا ہے اور کون اپنی جان جان بوجھ کر گنواتا ہے.. تو واپسی کا سفر خاصا کٹھن تھا..

کنارے کے قریب ہونے لگے تو بلال نے کہا ''انکل چپّو تیز تیز چلائیں تا کہ کینوٗ تیز رفتار ہو کر پانی سے نکل کر ریت پر چڑھ جائے..''

ہم نے چپّو اور کینوٗ اس خوش مزاج شخص کے حوالے کیے اور اس نے صرف اتنا پوچھا

''کوئی گیٹر نظر آیا؟''

''نہیں..''

''میں نے بتایا تھا ناں کہ آج دھوپ کم ہے وہ پانی میں سے نکل کر کناروں پر نہیں آئیں گے..''

کیا ہماری وائیکا واہمم کا اختتام ہو گیا تھا؟

نہیں.. ابھی تو اس کا نکتۂ عروج آنے کو تھا..

جہاں سے وائیکا واندی جنم لیتی تھی..

ایک وسیع جھیل نما قدرتی تالاب، شفاف پانیوں کا ذخیرہ، درختوں تلے ایک آئینہ جزیرہ.. جس کے آس پاس گھاس بھری ڈھلوانوں پر مردوزن دھوپ سینکتے اوندھے پڑے تھے.. جو دھوپ مگرمچھوں کے لیے ناکافی تھی ان کے لیے کافی تھی.. ان میں سے کچھ کے بچّے دوسرے کنارے پر واقع ایک گھنے درخت کے قریب جھیل میں ڈبکیاں لگاتے تھے اور ڈوبتے نہ تھے کہ وہاں پانی کم تھے..

جدھر ہم تھے یہاں پانی گہرے معلوم پڑتے تھے..

تہہ میں سے پھوٹتے ہوئے چشموں سے لبریز ہوتی اس جھیل میں ٹلاوے بہت تھے..

اس کی نیلاہٹ اور شفافی ایسی تھی کہ انسان اس میں اترنے سے جھجک جائے کہ کہیں یہ آئینہ کرچی کرچی نہ ہو جائے.. پانی اتنے بے عیب اور کنوارے تھے..

جھیل کے پانیوں سے پیام آتے تھے کہ ہم میں اُتر کر دیکھو تم اپنی کرومبر، سرال اور رتی گلی جھیل کو فراموش کر دو گے.. یہ پانی جو پیام بھیج رہے تھے میں نے بھی انہیں کچھ جوابی سندیسے بھیجے کہ سنو.. وہ تو میرے اپنے من موہنے دیس کے پانی ہیں.. میں اُن میں اُترتا ہوں تو وہ میرا لحاظ کرتے ہیں، مجھے ڈوبنے نہیں دیتے، میرے بدن کو بوسوں سے گیلا کر دیتے ہیں اور تم تو امریکی پانی ہو، نہ میرے بدن کو جانتے ہو اور نہ میرے وطن کو تو تمہارا کیا پتہ کہ تم ہرگز لحاظ نہ کرو.. میں ڈوبنے لگوں تو تم مجھے ڈوب جانے دو.. میرا وزن نہ سہار سکو اور ڈوب جانے دو.. میرے اپنے پانیوں کو تو میرا بے ڈول اور وزنی بدن ایک پَر کی مانند ہلکا پھلکا لگتا ہے اور وہ میرا لحاظ کرتے ہیں..

یہ طے تھا کہ پانیوں میں ایک ڈبکی ہی سہی لگانی ضرور ہے..

بلال نے ذرا احتیاط کی کہیں انکل ادھر ڈوبیں تو اُدھر نہ نکلیں تو پھر کیا ہو گا چنانچہ وہ پہلے خود پانیوں میں اترا اور پھر ان کی گہرائی کا اندازہ کر کے کہ وہ ڈوبو تو نہیں ہیں میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُتار لیا..

وکائیوا ندی کے چشموں کے پانی نہایت سرد تھے.. پہلے تو بدن کے رونگٹے کھڑے

ہو گئے اور بتیسی بجنے لگی اور پھر کچھ دیر تک ان میں ڈوبے رہنے سے عادت ہوگئی۔۔ وہ ڈوبو پانی نہ تھے۔۔ میں ان پانیوں میں سیدھا کھڑا ہوتا اور نیچے نگاہ کرتا تو مجھے اپنے پاؤں ریت میں دھنسے نظر آتے اور وہ اتنے شفاف، سپید اور پیارے نظر آتے کہ میرے نہ لگتے کسی گوری گنّے کی پوری کے لگتے اور ان کے گرد کوئی مچھلی بھی تیرتی اور کوئی پتہ بھی دکھائی دیتا۔۔

میری عمر کے پُل کے نیچے سے بہت سے پانی بہہ چکے تھے۔۔ اور میں اس دوران کیسے کیسے پانیوں میں اتر چکا تھا۔ گکھڑ منڈی کے جوہڑوں سے لے کر جنوبی فرانس کے گہرے نیلے سمندروں تک۔ لیکن میں نے ان جیسی شفاف آئینہ دکھاوٹ اور کہیں نہیں دیکھی تھی۔۔

وکائیوا جھیل کے پانی نیلگوں نہ تھے۔۔ شدید طور پر نچڑی ہوئی سرسبز رنگت کے تھے جیسے ایک پورے جنگل کا رس نچوڑ کر اس کے پانیوں میں گھول دیا گیا ہو۔۔

میں ان میں ایک موٹے لُدھر کی مانند مزے کرتا لوٹتا رہا۔ اور کبھی سانس روک کر ڈبکی لگا کر زیرِ آب چلا جاتا اور وہاں ایک اور ہی خوابناک دنیا جھلملا رہی ہوتی۔ تہہ میں سے ابلتے چشموں کو اپنی آنکھوں اور بدن پر ابلتے محسوس کرتا۔۔ اور جب نظر اس جھیل کی تہہ پر سفر کرتی تو وہاں انہی چشموں کے آبی انار ابلتے چھوٹتے نظر آتے۔۔ میں تہہ کے نزدیک ہو کر کسی چشمے کے فوارے میں ہاتھ آگے کرتا تو اس کے ہلکورے محسوس کرتا۔۔ میں ان ہلکوروں سے آشنا تھا۔۔ پانی جہاں بھی پھوٹتے ہیں آپ انہیں بدن کے کسی حصے پر ہلکورے لیتے محسوس کر لیتے ہیں۔۔ ایسے پانی جولمس سے بڑھ جاتے ہیں۔۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بارات اتری ہے جس کے استقبال کے لیے یہ آبی انار چھوٹ رہے ہیں۔۔ اس خوابناک جہان میں سے باہر آنے کو جی نہ چاہتا تھا پر دم روکے رکھنا ممکن نہ ہوتا۔۔ اور میں تہہ میں سے اُبھرتا سطح پر آ جاتا۔۔ اور جھیل کے آس پاس اُمڈتے ہرے شجر میری آنکھوں میں تصویر ہونے لگتے۔۔

میں کچھ دیر گہرے سانس لے کر اپنے پھیپھڑوں کو بھرتا اور پھر دم روک کر زیرِ آب چلا جاتا۔۔ بہت بچپن میں ایک باتصویر ناول ''پانی کے بچے'' میرا بہت پسندیدہ تھا۔ قومی کتب خانے نے شائع کیا تھا اور کسی انگریزی ناول کا ترجمہ تھا اور اسے بچوں کا پہلا ناول کہا جاتا تھا۔۔ اور میں اسے پڑھتے ہوئے خوابوں میں مبتلا خواہش کرتا تھا کہ کاش میں بھی پانی کا ایک بچہ ہوتا۔۔ اس ناول کے بچوں کی مانند زیرِ آب تیرتا پھرتا زندگی کرتا۔۔ میری وہ خواہش آج جا کر امریکہ میں وکائیوا ندی

کی جھیل کی تہہ میں جا کر پوری ہوتی تھی۔۔ اگرچہ میں اب بچہ نہ تھا بوڑھا ہو کر پھر سے بچہ بن جانے کے دنوں تک آ چکا تھا۔۔

بلال ایک ماہر تیراک بھی تھا کیونکہ اس کے پاس سمندر کی تہہ میں اُتر کر سکوبا ڈائیونگ کا ڈپلومہ تھا۔ فزیکل انسٹرکٹر کا کورس بھی مکمل کر چکا تھا کہ یہ اس کے شوق تھے۔۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ کل کلاں مجھے انجینئرنگ کے شعبے سے فارغ کر دیا جاتا ہے تو میں سکوبا ڈائیونگ کا ٹیچر ہو جاؤں گا۔۔ وہ بھی ممکن نہ ہوا تو کسی جم میں فزیکل انسٹرکٹر کی ملازمت تو مل ہی جائے گی۔۔ وہ اس دن کا انتظار کر رہا تھا جب نوفل ذرا سا بڑا ہو جائے اور وہ اسے بھی پانی کا بچہ بنا دے۔۔

ابھی میرا جی نہ چاہتا تھا ان شفاف پانیوں میں سے باہر آ جانے کو کہ کیا جانے کبھی ایسا آئینہ خانہ اترنے کو ملے یا نہ ملے۔۔

میں کوئی باقاعدہ تیراک وغیرہ نہیں ہوں۔۔ بس یہ ہے کہ کوئی مجھے گہرے پانیوں میں دھکا دے دے تو شڑپ شڑپ ہاتھ پاؤں مار کر باہر آ جاتا ہوں۔۔ تیرنے کی کوشش کروں تو دھڑ ڈوب جاتا ہے اور ہاتھ پاؤں کچھ دیر کے لیے اوپر رہ جاتے ہیں اور پھر وہ بھی سر سمیت نیچے چلے جاتے ہیں۔۔ چنانچہ یہاں بھی میں تیراکی میں ملوث نہیں تھا، بس ایک خالی ڈرم کی مانند یونہی ڈوبتا اُبھرتا مزے کر رہا تھا جب بلال نے پکارا ''انکل آپ کی تصویر اُتاروں؟''

''اُتار لو۔۔'' میں نے اُبھرتے ہوئے نعرہ لگایا۔۔

''کیمرہ کار میں ہے۔۔ میں لاتا ہوں'' اس سے پیشتر کہ میں ایک اور نعرہ لگاتا کہ نہیں رہنے دو۔۔ وہ ڈھلوان پر اونچے نیچے ہوتے درختوں میں اونچا ہوتا اوجھل ہو گیا۔۔ بلال کے چلے جانے کے بعد میں ٹھٹھرنے لگا لیکن وکائیوا جھیل میں ''سومنگ'' کرتے ہوئے ایک تصویر اتروانے کے چاؤ میں پانیوں میں ٹھہرا رہا۔۔ چند لمحوں بعد یوں محسوس ہوا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔۔ ایک واضح تبدیلی کے سائے گہرے ہونے لگے۔۔ دھوپ مزید مدھم ہو گئی۔ جھیل کے پانی جو ہوا کے کسی جھونکے سے ذرا کروٹیں بدلتے تھے۔۔ سرسراتے تھے یکدم ذرا پُرجوش ہونے لگے۔۔ ان کی سطح پر لہریں ابھرنے لگیں اور یکدم ہوا کا گہرا شور گونجنے لگا۔۔ وکائیوا جھیل پر اُمڈتے شجر دوہرے ہونے لگے۔۔ شور کرنے لگے۔۔ ان کی مردہ ٹہنیاں ہوا کے زور سے ٹوٹ ٹوٹ کر جھیل کے پانیوں پر گرنے لگیں۔۔ درختوں کے خزاں رسیدہ پتے جھڑنے لگے۔۔ ٹہنیوں سے بچھڑ کر مردہ ہو چکی زرد تتلیوں کی

مانند سطحِ آب پر گرنے لگے..

وہ جو جھیل میں تیرتے پھرتے پُرمسرت لوگ تھے وہ جانے کیوں ہراساں ہو کر پانیوں سے باہر آنے لگے..ڈھلوانوں پر اوندھے لیٹے دھوپ سینکتے جوڑے بھی ایک افراتفری میں اٹھے اور سامان سمیٹ کر رخصت ہونے لگے..

چند لمحوں بعد وایکاوا کی مختصر جھیل میں صرف میں رہ گیا..سوکھی ٹہنیاں رہ گئیں اور زرد پتے پانیوں پر رہ گئے اور کچھ نہ رہا..اور ان یکدم وارد ہو جانے والی سنسناتی ہواؤں کے پہلو میں تیز بارش اتر آئی..چھینٹوں کی صورت میں نہیں ایک بوچھاڑ کی صورت میں گرنے لگی..

ہر سُو تاریکی سی چھانے لگی..

ہوا کا شور..دوہرے ہوتے شجر..پانیوں پر گرتی سوکھی ٹہنیاں اور زرد پتے جو بارش میں شامل ہو کر اُس کی رنگت بھی زرد کر رہے تھے..

بدن میں ایک گہرا خوف..لیکن عافیت اسی میں تھی کہ میں جھیل میں ہی ٹھہرا رہوں کہ وہاں سے نکل کر کناروں پر جاتا ہوں تو وہاں سر پر دوہرے ہوتے ٹوٹتے شجر ہیں..

یہ شاید کسی سمندری طوفان یا ہری کین کا پیش خیمہ تھا جس کے خوف سے سب لوگ ہراساں ہو کر..اپنے کپڑے اور سامان سمیٹ کر رخصت ہو گئے تھے..

اور اُس لمحے جب میں وکائیوا جھیل کے پانیوں میں تنہا اور ڈرا ہوا تھا اور آس پاس کچھ نہ کچھ ٹوٹ کر گرتا تھا اور درختوں میں تیز ہوائیں سانپوں کی طرح شوکتی تھیں تب مجھے ایک انہونا سا خیال آیا..اس پُرشور اور ہیبت ناک تنہائی میں آپ یقین کر لیجیے کہ واقعی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی کی آمد آمد ہے..جیسے اس سرزمین کے قدیم باسی اپنے جنگلوں، جھیلوں اور ندیوں میں واپس آ رہے ہیں..گھنے جنگل میں سے نمودار ہو رہے ہیں..شور مچاتے نہیں بالکل چپ چاپ چلے آ رہے ہیں..وکائیوا ندی کے پانیوں پر ان کے کینُو لاتعداد ہیں جنہیں کھیتے ہوئے وہ خاموشی سے اپنی گم گشتہ جنت میں واپس آ رہے ہیں کہ ہم اپنی سرزمین واپس لینے آئے ہیں..اپنی خیمہ بستیاں پھر سے آباد کرنے کو آئے ہیں..اپنے گھوڑے دوڑانے آئے ہیں..اپنے بزرگوں کی راکھ کو وکائیوا ندی میں بہانے کے لیے آئے ہیں..

اگرچہ وہ جو چھین لیتے ہیں کبھی واپس نہیں کرتے..

آج بھی اُندلس میں اگر کوئی شخص رنجیدہ نظر آئے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ..کہیں

غرناطہ تو نہیں چھن گیا..

تو ان سے ان کا غرناطہ چھن گیا تھا یہ اُسے واپس لینے آئے ہیں..

مجھے یقین ہے کہ ریڈ انڈین علماء کرام نے بھی فتوے جاری کئے ہوں گے کہ یہ تو تمہارے اعمال کی سزا ہے، خدا کا قہر ہے جو گوروں کی صورت تم پر ٹوٹ پڑا ہے، گڑگڑا کر معافی مانگو..اور تم فکر نہ کرو ہمارے دیوتا ان کی توپوں میں کیڑے ڈال دیں گے..بس توبہ استغفار کرو..

ایسے علماء کرام ہمیشہ سے تباہی اور بربادی کے پیغمبر چلے آتے ہیں..

نہ دراوڑوں کو اپنی دھرتی ماتا واپس ملی..نہ موروں کو ان کا اندلس دوبارہ نصیب ہوا اور نہ ہی فلسطینیوں کو ان کا آبائی وطن کبھی ملے گا کہ یہ سب انصاف پر یقین رکھتے تھے..

انصاف جو نسل انسانی کا سب سے بڑا فریب اور دھوکا ہے..

یہ کبھی ملتا نہیں ہمیشہ وحشی اور بدتہذیب طاقت سے حاصل کیا جاتا ہے..

یہ سب لوگ اپنے اپنے خداؤں پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ انہیں انصاف دلوائیں گے..مظلوموں کی مدد کریں گے..انہیں ان کا حق دلوائیں گے..نافرمانوں کی بستیاں ملیامیٹ کر دیں گے..پر وہ خدا یہ وعدہ پورا نہیں کرتے صرف کتابوں میں ایسا کرتے ہیں..

کہ جیت صحیفوں کی نہیں پُرشکوہ گھوڑے ''اسوا'' کی ہوتی ہے..

چاہے اُس پر ایک نافرمان سوار ہو..

لوہے کے ہتھیاروں کی ہوتی ہے چاہے انہیں تھامنے والا ہاتھ کسی بھی دیوتا پر یقین نہ رکھتا ہو..منظم فوجی قوت کی ہوتی ہے..اس کے خود کار تباہ کن اسلحے کی ہوتی ہے چاہے اس کے چلانے والے کتنے بے دین ہی کیوں نہ ہوں..ان کے سامنے انصاف کے کلہاڑے اور تیر بیکار ہو جاتے ہیں..جیت انصاف کی نہیں ٹینکوں اور گن شپ ہیلی کاپٹروں کی ہوتی ہے..

یہ سب کچھ اگرچہ نافرمان لوگوں کے قبضے میں ہوتا ہے پر انہیں کوئی سزا نہیں ملتی..اگر ملتی ہے تو صرف انہیں جو حق اور انصاف کی فتح پر یقین کامل رکھتے ہیں..

اگرچہ وہ مفاہمت نہیں کرتے..محکوم ہو کر بھی..احتجاج کرتے آنسو بہاتے نظمیں اور نوحے لکھتے ہیں لیکن ان کے آنسوؤں، نوحوں اور دعاؤں..صدق دل سے مانگی جانے والی دعاؤں

کے سامنے اگر ایک گن شپ ہیلی کاپٹر آجاتا ہے تو وہ انہیں ملیامیٹ کر دیتا ہے..

مجھے وائیکاوا جھیل میں..ہواؤں کے شور میں تنہا.. پانیوں پر گرتی مردہ ٹہنیوں اور زرد پتوں کی بارش میں ..قدیم اشجار کو بھگوتی بارش میں..واقعی ایسا محسوس ہوا کہ یہاں کے قدیم باشندے گھنے جنگلوں میں سے نمودار ہو رہے ہیں..اپنی کشتیوں کو بہتے پانیوں پر کھیتے چلے آرہے ہیں اپنی سرزمین پر پھر سے واپس آرہے ہیں..لیکن یہ ایک واہمہ تھا..جو چھن جائے وہ کبھی واپس نہیں ملتا..غرناطہ کبھی واپس نہیں ملتا..



"شام پئی بِن شام محمد"

جو بھی...کہیں بھی آخری شام ہوتی ہے..اُس کی سرمئی شکل اور اُس میں آپ تک آنے والی آوازیں مختلف ہوتی ہیں.. یہاں تک کہ کوئی ایک پرندہ جو ہر شام چہکتا ہے تو اُس شام میں اوّل تو چپ سادھ لیتا ہے اور اگر چہکتا ہے تو بہت مدھم سروں میں اور اداسی کے رنگوں میں رنگا ہوا چہکتا ہے..اور آپ جان جاتے ہیں اس نگر میں یہ آپ کی آخری شام ہے..

میں حسب معمول عینی کے گھر کے پچھواڑے میں برآمدے میں بیٹھا اُس شام میں تھا..

گولف کورس اور جھیلوں کے پار نیم تاریکی میں گُھلتے جنگل کی گھناوٹ کے اوپر بادلوں میں ایک سرخی تیرتی تھی..ہر سُو سناٹا تھا..کچھ بھی نہ بولتا تھا..

کبھی کسی جھینگر کے ٹرانے کی صدا کانوں میں آتی اور پھر چُپ ہو جاتی..

آج پہلا دن تھا جب وہ تینوں کونجیں گولف کورس کی ہریاول پر نہ اُتری تھیں..سوچ سوچ کر پاؤں اُٹھاتی میرے پاس نہ آئی تھیں..

میں نے اُن کے لیے ڈبل روٹی کے جو ٹکڑے میز پر رکھے تھے وہ منتظر رہے پر اُن کو چونچ مارنے والے نہ آئے..ان ٹکڑوں کے برابر میں میری سفری یادداشتوں کے کاغذ پڑے تھے جن میں سے ایک پر ایک سیاہ پتنگا بہت دیر سے بیٹھا ہوا تھا..وہ مردہ لگتا تھا پر کبھی کبھار اُس کے پَر لمحہ بھر کے لیے پھڑ پھڑاتے..

شاید کونجیں کسی آخری شام میں نہیں اُترتیں.

جنگل کے بھیتر میں سے ایک عقاب کی چیخ اُبھری اور سامنے والی جھیل پر سے گزرتی

مجھ تک آنے کو تھی کہ اُس میں ڈوب کر گم ہو گئی..

گھاس بھی مہر بہ لب تھی اور پانی بھی گُنگ ہو چکے تھے..

اگر آسمان پر کوئی پرندہ نمودار ہوتا تو وہ بھی اس خاموشی میں پرواز کرتا گم ہو جاتا..

عجیب سناٹا تھا اور چُپ ایسی تھی کہ چل سکتی تو اُس کی چاپ بھی سنائی نہ دیتی..اور پھر اس ازل سے ٹھہری ہوئی خاموشی میں ایک صدا سنائی دینے لگی..

یہ کون ہے جو صدائیں دیتا ہے..ایسی کہ میرے دل میں اُترتی ہیں..صدائیں ہیں بھی یا نہیں..صرف شائبے ہیں کہ ایسی صدائیں تو اپنے وطن میں سنائی دیتی ہیں..یہاں پرائے دیسوں میں تو اُن کے گمان ہیں..

فلاح کی جانب آؤ..فلاح کی جانب آؤ..اللہ سب سے بڑا ہے..

یہ صدا ایک واہمہ تھا..شاید ایک تصور تھا جو میرے بدن میں گونجتا تھا..بھلا فلوریڈا کے شہر آرلینڈو میں کون اذان دے سکتا ہے..

پر ہواؤں میں فلاح کے سندیسے تھے' میں نے کان لگا کر غور سے سنا تو یہ صدا عینی کے گھر میں سے آ رہی تھی..یہ واہمہ نہ تھا' فلاح کی جانب بلاتی ایک مترنم آواز تھی جس کا منبع عینی کا گھر تھا..اور پھر مجھے یاد آ گیا..اُس کے گھر میں ایک ایسا الارم کلاک تھا جو نماز کے اوقات میں ایک خوش الحان اذان نشر کرنے لگتا ہے..

اور یہ اذان ایسی پُر اثر تھی کہ گھر کے اندر سے ایک مدھر تان کی مانند نکلتی تھی اور اُس شام میں گولف کورس کی جھیلوں پر تیرتی جنگل کے اندر تک جاتی تھی اور اُس میں مقیم چرندوں اور پرندوں کو بھی فلاح کی جانب بلاتی تھی..

اور یہ وہ لمحہ تھا جب میں اپنے گھر کے لیے اداس ہوا..اپنے لاہور اپنے پاکستان کے لیے ترسا..کہ وہاں بے شک کچھ چیختی چلاتی آوازیں بھی تھیں پر اُن میں کچھ خوش الحان بھی تھے جو پانچوں وقت یہی فلاح کی صدا دیتے تھے..بے شک میں اس صدا پر کم دھیان کرتا تھا..پر یہ میرے خون اور خصلت میں شامل ہو چکی تھی اور میں اس صدا کے لیے اداس ہوا جاتا تھا..میرے کان اس کے لیے ترس گئے تھے..

چل خُسرو گھر اپنے..سانجھ پئی چودیس..

ہر جانب شام ہو رہی ہے تو چل..گھر اپنے..

شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نیں ڈرناں..

بے شک اے خسرو..اے میاں محمد....یہ تیری اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کا گھر ہے..فلوریڈا میں ہے..تو یہاں جو شام اُترتی ہے یہی سندیسہ دیتی ہے کہ مستنصر چل گھر اپنے..پہلے نیویارک چل..اور پھر چل اپنے لاہور....



نیویارک واپسی

''مچلی میں ہمینگوے کے ساتھ..''

خزاں صرف درختوں اور اُن کے پتوں پر نہیں اترتی..
دلوں میں بھی اُترتی ہے اور بدن کو زردی سے بھر دیتی ہے..ایک ''گاؤں'' پر بھی یوں اُترتی ہے کہ..

کیسی مدتیں بیت گئیں جب میں پہلی بار ایک زرد دوپہر میں اس گاؤں میں آیا تھا..
کتنے زمانے گزر چکے' جب سلجوق کے ہمراہ میں نے ایک نوّے منٹ کی واک کے دوران اس کی گلی گلی اور کونہ کونہ چھان مارا تھا..اور کیسے اُس ڈھلتی دھوپ کے سحر سے فٹ پاتھ..کاریں..رہائش گاہیں..چہرے سب کے سب زردی میں نہائے گئے تھے..وہ پھول جو اس کے کنجوں میں کھلتے تھے' اگرچہ صد رنگ تھے پر اُس دوپہر یک رنگ نظر آنے لگے تھے..مصوروں..ادیبوں..ڈرامہ نگاروں اور ہم جنس پرستوں کی آماجگاہیں بھی زردی میں ڈھل چکی تھیں پر اُس زردی میں اُداسی نہ تھی..یاسیت کا کچھ پرتو نہ تھا بلکہ زندگی کی وہ حرارت تھی جو صرف تخلیق کے لمحوں میں پھوٹتی ہے..نہیں کچھ زیادہ مدت نہیں ہوئی اگرچہ لگتا ہے کہ مدتیں بیت گئیں..اور کوئی زمانے نہیں گزرے اگرچہ لگتا ہے کہ بہت گزر چکے ہیں..میں اُسی زمانے میں اِن گلی کوچوں میں سرگرداں ہوا تھا..یہی تقریباً دو ماہ پیشتر..ابھی میں نے فلوریڈا کا رُخ نہیں کیا تھا..کینیڈا کی جانب کوچ نہیں کیا تھا' جب انہی گلی کوچوں میں گھوما تھا..

تو شاید یہ آرلینڈو فلوریڈا کے قیام کی صبحیں اور شامیں تھیں جن میں مجھ پر کونجیں اُترتی تھیں..ہرن چوکڑیاں بھرتے تھے اور نیلے آسمانوں کو گنجے عقاب اپنی چونچوں سے چیرتے تھے..جو مجھے لگتا تھا کہ یہاں آئے زمانے بیت گئے..

یا شاید کینیڈا کے راکیز میں پوشیدہ وِسلر نام کا ایک پہاڑی قصبہ تھا‘ جہاں میں گئی رات پہنچا تھا اور شدید سردی سے دوچار دھند میں راستہ بھول گیا تھا.. اور فلوریڈا کی اُس کونج سے پوچھتا تھا جو میرے ساتھ چلی آئی تھی کہ تم مجھے اِس رات اُس بلند کوہستانی قصبے میں لے آئی ہو جس کے نام سے بھی میں آگاہ نہ تھا. اُندلس کے قصبے ثوریا کی مانند جانتا نہ تھا کہ کسی نقشے پر اُس کا وجود ہے تو تم لے آئی ہو تو کیوں لے آئی ہو... میں کیسی کشتی پر سوار ہوں جو پانیوں کی بجائے بلند پہاڑوں میں بادبان کھولے مجھے اِس کے دھند آلود کوچوں میں لے آئی ہے.. یا پھر کینیڈا کے آخری سرے پر گہرے نیلے سمندروں میں جو وہیل مچھلیاں اُبھرتی اور ڈوبتی تھیں اور اتنی قربت میں تھیں کہ اُن کے ڈوبنے سے پانیوں میں جو طلاطم برپا ہوتا تھا اُس کے چھینٹے میرے چہرے کو بھگوتے تھے تو شاید اس لیے اب میں واپس نیویارک میں آیا ہوں تو لگتا ہے کہ زمانے بدل گئے ہیں..

اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آبی پرندہ.. بس گل.. جو وکٹوریا کے ساحلی قصبے کے آسمان پر ہمہ وقت غُل کرتا پرواز کرتا تھا‘ بے تابی سے چونچ کھولے ہمہ وقت پیاسا.. سسکیاں بھرتا مسلسل وکٹوریا کے آسمان پر تیرتا تھا.. شاید اُس پرندے نے مجھے زمانوں سے غافل کر دیا تھا اِس لیے آج اس گاؤں میں آیا ہوں تو لگتا ہے کہ بہت زمانے ہو گئے جب میں یہاں آیا تھا..

تب دوپہر کی زردی میں آیا تھا‘ رات گہری ہو گئی تو گھر لوٹا تھا..

اب آیا تھا تو رات میں ہی آیا تھا..

کیوں آیا تھا..؟

کوئی محفل تھی ادبی نوعیت کی نیویارک میں اور وہ بھی میرے لیے جب ایک اجنبی شخص نے میرے قریب ہو کر کہا. حسن نے آپ کو سلام بھیجا ہے.. وہ معذرت کر رہا تھا کہ اس شام آ نہیں سکا. کہتا تھا کہ تارڑ صاحب کو کہیے گا مجھے فون کر لیں..

"کون حسن..؟"

"آپ.. وہ تو کہتا تھا کہ تارڑ صاحب میرے دوست ہیں.."

"دنیا میں کافی حسن ہیں.. یہ کون سے اور کہاں کے حسن ہیں..؟"

"حسن عباس رضا.. راولپنڈی کے ہیں.. شاعر بھی ہیں.. آپ جانتے ہیں ناں..؟"

وہ جو میری زندگی کے صبح کی نشریات کی میزبانی کے دن تھے.. دن کیا برس ہا برس تھے‘ اُن میں احمد داؤد ایسا بھیڑیا بدن کا.. منگول ناک نقشے اور گٹھے ہوئے بدن والا قدرے بدتمیز اور بہت شاندار شخص.. اُن برسوں میں میری خلوتوں اور منظروں کا ساتھی تھا. اُس کے بدن میں خون نہیں پارہ گردش کرتا تھا‘ اس کا مجھے یقین تھا کہ وہ کہیں ٹِک کر بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا.. بیٹھتا تھا اور چند لمحوں بعد اُٹھ کھڑا ہوتا تھا کہ تارڑ آؤ میں آپ کو ایک قدیم گاؤں میں لے چلتا ہوں جہاں اب بھی اورنگ زیب کے عہد کا ایک کنواں موجود ہے اور اُس کے پانی خشک نہیں ہوتے.. تارڑ آج چاند کی چودھویں ہے. اسلام آباد کے فلاں پُل کے قریب جو سڑک ہے اُس پر سانپوں کا میلہ ہو گا.. وہ قریبی جنگل میں سے سردی کے مارے ہوئے نکلتے ہیں اور سڑک پر آ جاتے ہیں کہ اُس میں ابھی دھوپ کی کچھ حدت باقی ہوتی ہے.. وہ اپنے ٹھٹھرتے بدنوں کو وہاں آسودگی دیتے لوٹتے ہیں اور.. ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں‘ لپٹے ہوتے ہیں.. آؤ ان سانپوں کو دیکھتے ہیں.. احمد داؤد کی پٹاری میں ہمیشہ حیرت اور عجوبے کا کوئی نہ کوئی سنپولیا اپنا ننھا سا پھن اُٹھائے مجھے ڈسنے کو تیار ہوتا تھا.. میرا یہ یقین باطل ثابت ہو گیا کہ اُس کے بدن میں خون کی بجائے پارہ گردش کرتا ہے جب یک دم اُس کے دل کی حرکت بند ہو گئی کہ خون اُس کے دل میں نہ پہنچ سکا تھا.. خون ہی تھا اس لیے‘ پارہ ہوتا تو وہ پہنچ جاتا اور اس کے دل کو تھمنے نہ دیتا..

احمد داؤد میرا رفیق تھا اور حسن اُس کا دوست تھا.. وہ دونوں نیشنل کونسل آف آرٹس میں اکٹھے رزق کمانے کی کوشش کرتے تھے جو نا کافی ہوتا تھا.. چنانچہ حسن میرا بھی دوست ہو گیا.. وہ قدرے بھارے بدن کا پیارا سا بھالو ہوا کرتا تھا.. داؤد کی مانند اُس کی خصلت میں بھی بے چینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ کیسا عمدہ اور نظریاتی شاعر ہوا کرتا تھا. "بادبان" ایسا انقلابی اور خطرناک ادبی رسالہ مرتب کیا کرتا تھا.. اور وہی مجھے آنٹی ناز کے پاس لے گیا جو مشہور مصور احمد پرویز کی بہن تھیں.. آنٹی ناز نے بھی ایک زمانے میں اپنے حسن کے زور پر راج کیا تھا.. کیسی شاہانہ اور پروقار زندگی گزاری تھی.. کبھی کسی افغان شہزادے کے ساتھ.. اور کبھی وہ زمانے تھے کہ صدارتی محل کے دروازے ان کے احترام میں خود بخود کھل جایا کرتے تھے.. اور جن زمانوں میں حسن نے مجھے اُن سے ملوایا اور ظاہر ہے احمد داؤد بھی ہم رکاب ہوا کرتا تھا‘ آنٹی ناز کے بڑھاپے میں بھی ایک تمکنت تھی اور وہ ایک دو کمروں کے مکان میں گزر اوقات کے لیے انگریزی کی ٹیوشن

پڑھایا کرتی تھیں اور ایک عُسرت زدہ حیات سے ہار نہ مانتی تھیں.. اُن کے تنگ غسل خانے میں ایک کیل سے لٹکی ہوئی' نمی میں بھیگ کر پھیکی پڑ چکی احمد پرویز کی بنائی ہوئی ایک سیلف پورٹریٹ تھی جس کا تذکرہ آنٹی ناز نے احمد پرویز کے بارے میں لکھی ہوئی کتاب میں بھی کیا ہے.. یہ پورٹریٹ آنٹی ناز نے مجھے عنایت کر دی اور اس میں حسن کی کاوش بھی شامل تھی.. اور وہی حسن اب نیویارک میں تھا..

تو میں اُس اجنبی شخص کو کیا جواب دیتا کہ میں حسن کو جانتا ہوں یا نہیں.. اگلے روز اُس کا فون آ گیا.. اور میں آئرلینڈ جا رہا تھا..

نیویارک واپس آیا تو پھر فون آ گیا اور میں اگلے روز کینیڈا جا رہا تھا اور رُک نہ سکتا تھا..

وہاں سے واپسی ہوئی تو حسن نے جو فون کیا اُس پر سوائے بدتمیزی کے اور کچھ نہ کیا اور میری بزرگی اور معذرت کا کچھ لحاظ نہ کیا.. میں نے اُسے اب اپنی مکمل فراغت اور سپردگی کا یقین دلایا اور پوچھا حسن ملاقات تو بہر طور کرتے ہیں تو اس شہر ملاقات میں کیا کریں گے.. کہاں جائیں گے ذرا طے کر لیتے ہیں..

''تارڑ جی ذرا شغل میلہ کریں گے.. اس کے بعد نیویارک کی گلیوں اور گوریوں کو دیکھیں گے اور پھر کسی پاکستانی ریستوران میں بریانی یا نہاری کھائیں گے.. کیا خیال ہے..؟''

''ایک تو میں تم پاکستانیوں کی نہاری اور بریانی سے بے حد بیزار ہو چکا ہوں.. میں نے اگر یہی کسب کرنے تھے تو اندرون شہر حاجی کی نہاری نوش کرتا.. میکلوڈ روڈ کی بریانی سے فیض اُٹھاتا نیویارک کیوں آتا..''

''تو پھر آپ حکم کریں کہ کہاں... ہم تو آپ کے حکم کے بندے ہیں..''

''ہم سے کیا مراد... تم ایک بندے نہیں ہو...؟''

''نہیں ہم دراصل دو بندے ہیں جیسے اور جس قسم کے بھی بندے ہیں تو دو ہیں.. ایک بندہ تو میں ہوں.. دوسرے میرے ایک نہایت عزیز اور نظریاتی دوست کھوکھر صاحب ہیں.. تو حکم کیجیے کیا کرنا ہے اور کہاں جانا ہے..''

''میں نے بہت زمانے پہلے گرین اِچ ولیج میں ایک عجیب زرد دوپہر گزاری تھی حسن.. لگتا تھا جیسے آسمان سرسوں کا ایک کھیت ہے جس کی زردی کے دوپٹے نے پورے گاؤں کو ڈھانپ

رکھا ہے.. تو آج رات اُس گاؤں کی گلیوں میں آوارہ ہوتے ہیں' کیا خیال ہے.. تم سب وے میں سوار ہو کر کرسٹوفر کے سٹیشن پر اتر جانا.. میں باہر فٹ پاتھ پر تمہارا انتظار کروں گا..''

میں طے شدہ وقت کے عین مطابق براڈوے سے کرسٹوفر کے سٹیشن پر پہنچ کر باہر فٹ پاتھ پر تعینات ہو گیا.. میری تعیناتی کو خاصی مدت بیت گئی اور حسن کا دور دور تک کوئی سراغ نہ تھا.. مجھے الجھن ہونے لگی.. یہ پنڈی والے اگر وقت اور وعدے کے پابند ہوتے تو ترقی نہ کر جاتے.. صرف انہیں معتبر بنانے کی خاطر برابر میں اسلام آباد تعمیر کیا گیا.. اور پھر بھی افاقہ نہ ہوا.. خاصی دیر بعد جب میں فٹ پاتھ پر ٹہلنے کے دوران شاید ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکا تھا اور پسپائی اختیار کرنے کو تھا جب سڑک کے پار سے ایک نعرہ ادھر آیا ''اوئے تارڑ جی.. ہم یہاں ہیں..''

قصور کسی کا بھی نہ تھا.. میں اگر براڈوے سے آیا تھا تو کرسٹوفر پہنچ کر سٹیشن سے باہر اس جانب نکلا تھا اور وہ مخالف سمت سے آیا تھا اس لیے سڑک کے پار اسی سٹیشن کی جو سیڑھیاں باہر آتی ہیں ان سے نکلا تھا اور ہم یوں آر پار کھڑے ایک دوسرے کے منتظر رہے..

حسن ہمیشہ سُوٹ میں ملبوس ہوا کرتا تھا اور یہ پہناوا اسے بے حد مرغوب تھا اور یہاں نیویارک میں بھی اس کی مرغوبیت قائم تھی اور وہ ویسا ہی تھا ایک بھینچے جانے کے قابل بھالو.. اس کے ہمراہ نیلی قمیض' کارڈرائے کی پتلون' ایک عینک اور مونچھوں میں ملبوس کھوکھر صاحب تھے.. یہ کھوکھر صاحب گوجرانوالہ میں کچھ وکیل سے تھے اور پیپلز پارٹی کے سرگرم رکن ایسے تھے کہ اکثر گرم سرد ہوتے اندر باہر ہوتے رہتے تھے.. یعنی کبھی گوجرانوالہ کے دن اور کبھی ڈسٹرکٹ جیل کی راتیں.. یہ امریکہ میں ان کے پاکستانی ہونے کے آخری ایام تھے اور چند روز بعد وہ امریکی شہریت کے حامل ہونے والے تھے کہ انقلاب کا نکتۂ عروج امریکی شہریت ہی ہوتی ہے..

کھوکھر صاحب.. جب آئے تو پہلے سے ہی قدرے کھوئے ہوئے تھے بلکہ کسی حد تک کھوکھر اپار جا چکے تھے.. اب اگر ہم تیز ترین گاڑی میں سوار ہو کر بھی ان کا پیچھا کرتے تو ان کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتے تھے.. وہ اتنے کھوئے ہوئے کھوکھر اپار ہو چکے تھے..

حسن اور میں نے کچھ دیر احمد داؤد کو یاد کیا.. اس کے لاابالی پن.. بدتمیزیوں اور محبتوں کو

یاد کیا.. یہ تصور کیا کہ اگر آج وہ بھی ہمارے ہمراہ نیویارک کی رات میں ہوتا تو کیا ہوتا.. ہم نے بیتے ہوئے دنوں کو بہت یاد کیا' جب پروائے ننگ و نام تھی.. جب احمد داؤد ''وسکی اور پرندوں کا گوشت'' لکھنے پر عتاب میں آ جاتا تھا. حسن کی نظموں پر گرفت ہوتی تھی اور ایک اخبار میں میری تصویر کے ہمراہ یہ مطالبہ کیا گیا کہ اس شخص کو ''بابا بگلوس'' ایسی کہانی لکھنے پر سرعام پھانسی دی جائے.. ہم وہ پرندے تھے جنہوں نے جبر کے موسموں میں مرنے سے انکار کر دیا تھا.. یہ انکار احمد داؤد کے کچھ کام نہ آیا اور وہ مر گیا. حسن اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر سامراج کی سلطنت میں ایک بینک میں ملازمت کرتا تھا اور میں سماج کو بدل ڈالنے کے خواب سے تائب ہو کر ایک پرآسائش زندگی گزارتا تھا.. بیتے ہوئے دنوں کو ہم نے بہت یاد کیا' پر کہاں تک کرتے.. یاد ماضی کو عذاب قرار دے کر ہم بالآخر حال میں چلے آئے.. نیویارک میں چلے آئے جہاں ہم ''گاؤں'' کے گلی کوچوں میں ''آوارہ ہوں'' کی دھن پر گھومتے تھے.. ریستورانوں اور شراب خانوں میں تانک جھانک کرتے تھے.. اور ایک مدت کے بعد.. کہ ہم ہمدم دیرینہ تھے اور عیسیٰ اور خضر سے ملاقات سے بڑھ کر یہ ملاقات تھی.. اور یہ کیسی خمار آمیز اور شاندار شب تھی جس میں ہم ناظم حکمت' پابلو نیرودا اور فیض صاحب کو یاد کرتے تھے.. حسن اور کھوکھر صاحب راہ چلتی گوریوں کی شان میں قصیدے کہتے.. ان کی بدنی بناوٹ کو بیان کرتے.. حسن تو تھا ہی شاعر.. لیکن کھوکھر صاحب بھی ایسے شاعر ہوئے کہ آپ انہیں شاعری سے باز نہیں رکھ سکتے تھے کہ وہ کھوکھراپار جا چکے تھے..

جب اس بے مقصد اور بے مہار آوارگی نے ہم میں تھکاوٹ بھر دی تو حسن نے پوچھا:

''تارڑ صاحب.. آپ کھانا کہاں اور کس قسم کا کھانا پسند کریں گے..''

''ابھی تو میں مچلی میں جانا پسند کروں گا..''

''چلو چلو مچلی چلو..'' کھوکھر صاحب نے اسے بھی ایک سیاسی رنگ کے انداز میں کہا.. جیسے چلو چلو مینار پاکستان چلو یا لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو کے انداز میں..

''مچلی؟'' البتہ حسن سنجیدہ ہو گیا..

دراصل حسن اور کھوکھر صاحب وہ بھولے بھالے معصوم پرندے تھے جنہیں میں نے اپنے دام میں صرف اس لیے پھانس لیا تھا کہ ہم آج کی شب مچلی جائیں.. کیونکہ ایک مدت پہلے

جب سلجوق کی رفاقت میں میں نے اس قدیم شراب خانے میں جھانکا تھا تو میں نے طے کر لیا تھا کہ پھر ملیں گے گر خدا لایا.. اگر نیویارک میں کچھ زندگی باقی ہے تو میں اس خانہ خراب میں آ کر رہوں گا اور جہاں پاپا ہیمنگوے براجمان ہو کر اپنی پسندیدہ شراب پیتے تھے' وہاں... بیٹھ کر اورنج جوس پیتے ہوئے ایک عدد تصویر بہرصورت اترواؤں گا.. یعنی اقرار صرف اورنج جوس کا کرنا ہے..

''ہاں حسن.. بریڈفورڈ سٹریٹ میں جو مچلتی ہوئی مچلی ہے.. وہاں جا کر مچل جانے کو جی چاہتا ہے..''

''چلو چلو مچلی چلو جہاں جانے کو تارڑ صاحب کا جی مچل مچل جاتا ہے..'' کھوکھر صاحب میرے ہم نوا ہو گئے..

پورا ''گاؤں'' شب کی سیاہی میں روشن ہوتا ہے پر جانے کیوں بریڈفورڈ سٹریٹ ہمیشہ بجھی بجھی سی نیم تاریک رہتی ہے..

''مچلی'' کے قدیم چوبی پھاٹک کے اوپر آہنی سلاخوں سے مزین ایک کھڑکی تھی جو بند تھی.. اور وہاں کوئی نشان کچھ پہچان نہ تھی کہ اس کے اندر کیا ہے..

میں نے اپنا ہاتھ چوبی پھاٹک پر رکھا کہ اسے دھکیل کر اندر جائیں تو حسن کہنے لگا:

''تارڑ صاحب' یہاں کسی کی پرائیویسی میں دخل اندازی کرنا جرم ہے.. یوں بے دھڑک اندر چلے جانا خطرے سے خالی نہیں.. اگر یہ کوئی ذاتی رہائش گاہ ہوئی تو نیویارک پولیس ہم تینوں کو پکڑ کر لے جائے گی..''

''تو لے جائے..'' کھوکھر صاحب کو کچھ پروا نہ تھی.. ''لے جائیں گے.. لے جائیں گے.. دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' وہ گنگنانے لگے..

''حسن میں اطمینان کر چکا ہوں.. اس کے اندر جھانک چکا ہوں.. اندر 1928ء سے قائم شدہ انہی زمانوں میں سانس لیتا ہوا ایک شراب خانہ ہے تو فکر نہ کرو.. آ جاؤ.. وہ دروازہ دھکیل کر جب ہم اندر داخل ہوئے تو گویا نیویارک کی دنیا سے جدا ہو کر ہم زمانے کی ایک سرنگ میں داخل ہو کر 1928ء میں چلے گئے..

اندر.. باہر کی دنیا سے کٹا ہوا.. اس زرد شیطان کے شہر کی جگمگاہٹ اور جدیدیت سے

پوشیدہ ہوتا ہوا.. ایک نیم تاریک.. لکڑی کے تختوں کا فرش جو اپنا روغن کھو چکا تھا.. میزیں بوسیدگی کی حالت میں.. کرسیاں اور بنچ نہایت بوڑھے ہوتے ہوئے.. تو وہاں ایک ریستوران کہہ لیجیے.. بہتر ہے کہ ایک خانہ خراب مے خانہ آباد کہہ لیجیے.. اور اس کی نیم تاریک قدامت میں بیٹھے ہوئے.. سرگوشیاں کرتے.. زندگی کرتے لوگ' ایسے لگتا تھا کہ ہمیشہ سے یہیں ہیں' ان میں سے کوئی نہ گیا اور نہ آیا.. وہ ایسے مطمئن اور شانت وہاں آباد تھے.. اور کسی نے ایک پلک بھی نہ جھپکی.. کچھ دھیان نہ کیا کہ کون آیا ہے.. کوئی اور بھی آیا ہے..

میرے جیسے بے وجہ ہیجان میں آ جانے والے شخص کے لیے.. یہ محض ایک مے خانہ قدیم نہ تھا.. ایک جادونگری تھی جس میں شنید تھی کہ حرف کے جادوگر راج کیا کرتے تھے.. تحریر کے ساحر وہاں کے شہزادے تھے اور ادب کی سلطنت کے شاہ اپنے تخت پر براجمان ہوتے تھے جو قدیم چوبی کرسیوں اور بنچوں کی صورت میں ہوتا تھا..

ڈیلان تھامس.. آئرلینڈ کا الکوحل کا رسیا قومی شاعر.. ولیم فالکنر.. جے ڈی سلنگر اور پاپا جی ہیمنگوے کا پسندیدہ ٹھکانا یہی تھا.. یہاں تک کہ سمون ڈی بووئیر جب کبھی اپنے رفیق ژاں پال سارتر سے جدا ہو کر پیرس سے نیویارک آتی تو اس کا زیادہ وقت اسی محلی کی فریب نگری میں بسر ہوتا..

مارلن منرو کے ایک شوہر.. ڈرامہ نگار آرتھر ملر کی شامیں بھی اسی محلی کی چاہت میں گزرتیں..

محلی کی دیواروں پر امریکی ادب اور دانشوروں کی تصویروں کی ایک نمائش تھی.. ان سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں آویزاں تھیں جو اس خانہ خراب میں آیا کرتے تھے.. اور ان میں سب سے نمایاں.. ادب کے حوالے سے نہیں.. شخصیت کے حوالے سے نمایاں سفید ریش موٹے اونی سویٹر میں ملبوس پاپا ہیمنگوے تھا.. جس نے اپنی کچھ شامیں یہاں روشن کیں..

لیکن ان نادر اور نایاب.. نابغہ روزگار لوگوں کی بلیک اینڈ وہائٹ تصاویر کے علاوہ میری روح کو جس منظر نے چھو لیا' وہ ان تصاویر کے نیچے انہی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں کے اوّلین اور خصوصی ایڈیشنوں کی سجاوٹ تھی.. مے خانے کی اس دیوار سے شروع ہو کر اس کے آخر تک وہ

ایک طویل شیلف میں سجتے چلے گئے تھے.. اندر داخل ہوتے ہی اس ادبی نمائش نے مجھے پاس بلا لیا اور بھول گیا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں' مجھے تو صرف وہ پہلی اشاعتیں دکھائی دے رہی تھیں جو اس مے خانے کے گلے میں ایک ہار کی صورت زیبائش تھیں.. نزدیک کی عینک ناک پر جمائے اور یہ ناک کتابوں کے سرورق سے چھوتا میں ہولے ہولے چلتا گیا.. ناولوں ڈراموں اور مضامین کے مجموعوں کے عنوان اور ان کے مصنفوں کے نام پڑھتا.. کبھی کسی مے خوار سے ٹکرا جاتا اور "سوری" کہہ کر آگے بڑھ جاتا اور کبھی کسی خالی کرسی سے اُلجھ جاتا کہ میں ان کتابوں سے نظر نہ ہٹاتا تھا.. مجھے اس بے مثال نمائش نے بے پایاں مسرت سے ہمکنار کیا اور میں نے سوچا کہ کیا آج سے اسّی نوے برس بعد لاہور میں بھی کوئی ایسا قہوہ خانہ یا شراب خانہ ہوگا جس میں آج کے عہد کے نمایاں ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر ہوں گی اور ان دنوں شائع ہونے والی اہم کتابوں کے ایڈیشن نمائش پر ہوں گے.. صرف ایک قہوہ خانہ تھا جو ایسا ہو سکتا تھا پر اب نہیں ہوگا..

ذرا تصور میں لائیے کہ پاک ٹی ہاؤس اگر ہوتا تو آج سے نوے برس بعد اس کی دیواروں پر کیسے کیسے نابغہ روزگار شاعروں اور ادیبوں کی تصاویر آویزاں ہوتیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو گئے وقتوں میں چائے کی ایک پیالی پر یہاں پہروں بیٹھے رہتے تھے.. وہ اس ٹی ہاؤس کے اتنے رسیا تھے کہ ان میں سے ایک کی بارات بھی یہیں جمع ہو کر دلہن کے گھر کی جانب روانہ ہوئی.. اور ان ادیبوں کی کیسی کیسی کتابیں جنہوں نے کلاسیک کا درجہ اختیار کیا' اس کی دیواروں پر سجی ہوتیں.. ان کے سرورق یہاں نمایاں ہوتے اور اس کی بوسیدہ کرسیوں اور ادھڑے ہوئے صوفوں کی نشاندہی ہوتی کہ یہاں کون بیٹھتا تھا اور یہ جگہ کس کے لیے مخصوص تھی..

یہ واحد امکان تھا.. پاک ٹی ہاؤس کا تسلسل وہ واحد امکان تھا جس کی زیارت کو آئندہ نسلیں آتیں اور اس کے دروازے کے سامنے پھولوں کے گلدستے رکھ کر ان ادیبوں سے عقیدت کا اظہار کرتیں جن سے وہ محبت کرتے تھے اور جو کبھی اس ٹی ہاؤس میں آیا کرتے تھے.. پر ایسا نہ ہونا تھا.. اس معاشرے میں ہرگز نہ ہونا تھا اور نہ ہوا اور ٹی ہاؤس کے دروازے ادیبوں پر بند کر دیے گئے کہ وہاں اب ٹائروں کی ایک دکان کھلنے والی تھی جو اس کے عارضی مالک کے لیے چائے کی فروخت سے کہیں زیادہ منافع بخش ثابت ہو سکتی تھی..

ادیبوں اور شاعروں کی بجائے وہاں اب جاپانی چینی پاکستانی نئے اور استعمال شدہ

ٹائر براجمان ہوں گے کہ یہی تو ایک ترقی یافتہ اور مہذب معاشرے کی واضح نشانیاں ہیں اور تم ان پر غور نہیں کرتے..

نیویارک کے باسیوں کو اگر چناؤ کے لیے کہا جائے تو وہ ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ اور مجلی کو مسمار کر دیئے جانے کے انتخاب میں بلا جھجک مجلی کے حق میں ووٹ دیں گے..اور ہمارا ووٹ ٹائروں کی دکان کے حق میں ہوگا..

''تارڑ صاحب..'' حسن نے مجھے پکارا جو کھوکھر صاحب کے ہمراہ ایک کونے میں براجمان ہو چکا تھا اور میرا منتظر تھا..''اب آ بھی جائیں اور آ کر بتائیں کہ کیا پئیں گے..؟''

''اپنے کھوکھر صاحب کو ذرا اور کھوکھرا پار لے جاؤ..میں یہ سرورق گردانی مکمل کر کے ہی آؤں گا..''

''یہ خاصے پار جا چکے ہیں..مزید پار گئے تو ڈوب جائیں گے..'' حسن نے اُن کے کندھے پر ایک دھپ لگا کر کہا اور اس دھپ کی شدت سے کھوکھر صاحب پار جاتے جاتے بچے..

مجلی کا ماحول کسی قدر انگلستان کے دیہی علاقوں میں واقع ان قدیم شراب خانوں ایسا تھا جن کے اندرون پر زمانہ اثر انداز نہیں ہوتا..ان کی آرائش اور ماحول میں کچھ تبدیلی نہیں آتی..وہ جوں کے توں پرانے وقتوں میں سانس لیتے رہتے ہیں..وہاں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اجنبی آ جائے ورنہ آس پاس کے دیہات اور قصبوں میں رہنے والے عام لوگ..مزدور اور کسان ہی ہر شب مہمان ہوتے ہیں..چنانچہ وہ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں ایک خاندان کی مانند ہوتے ہیں اور وہ وہاں ٹُن ہونے کے لیے نہیں آتے بلکہ اکثر بیئر کے ایک مگ کو سامنے رکھ کر پوری شب خوش گپیوں میں گزارتے ہیں اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا جاتا ہے اور کوئی ایک نوجوان جو قدرے مخمور ہو جائے' اپنا مگ اٹھا کر بڑے فخر سے اعلان کر دے گا کہ خواتین و حضرات آپ کی توجہ چاہتا ہوں..کیا آپ جانتے ہیں کہ اسی کرسی پر بیٹھ کر اس میز پر اپنا بیئر کا جھاگ آلود مگ رکھ کر میرے دادا جان بھی بیٹھا کرتے تھے..چنانچہ یہ ایک قدرے خمار آلود خاندانی میل ملاقات بھی ہوتی ہے..

مجلی بھی کچھ ایسا ہی گئے وقتوں میں سانس لیتا خانہ خراب تھا..یعنی چوبی فرش کی بوسیدگی بتاتی تھی کہ اس پر بہت لوگ چل چکے ہیں..کچھ تو چلے ہیں اور کچھ یہاں گرے اور کچھ وہاں گرے

ہیں..لکڑی کی دیواروں پر بھی قدامت کی سیاہی تھی اور میزوں پر بھی اگر رندہ لگا دیا جاتا تو ان کی شکل بہتر نکل آتی..ذرا ستھری ہو جاتیں..ایک آہنی دروازہ بھی تھا جس کے تختوں پر گھوڑے کی ایک نعل خوش بختی کی علامت پر ٹھونکی ہوئی تھی اور یہ دروازہ جانے کھلتا بھی تھا یا نہیں..اگر کھلتا تھا تو جانے کہاں کھلتا تھا..

مجلی کے گوشوں کونوں کُھدروں میں اور بار کاؤنٹر کے اونچے سٹولوں پر براجمان مرد اور عورتیں سب کے سب ایک دوسرے کے شناسا بے تکلف اور ایک ہی خاندان کے لگتے تھے کہ وہ آپس میں چہلیں کر رہے تھے اور بے وجہ ہم آغوش ہو کر ایک دوسرے کا حال دریافت کر رہے تھے..حالانکہ حال دریافت کرنے کا یہ کوئی مناسب طریقہ تو نہیں' اگر ہوتا تو ہم سے بھی کوئی ہمارا حال دریافت کرتا..

پورے مجلی میں ہم تینوں کے سوا کوئی کالا یا سانولا نہ تھا..

ہماری میز کے برابر میں چوبی فرش پر ایک نہایت ریشمی نسواری رنگ کی دراز زلفوں والا لحیم شحیم کتا پڑا تھا..صرف اس کی آنکھوں میں جو حرکت اور زندگی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سچ مچ کا کتا ہے' کوئی کھلونا نہیں' جو فرش پر پڑا ہے..پتہ نہیں کس کا تھا..

جس کا بھی تھا وہ اسے مجلی کے اندر لا کر بھول گیا تھا کہ وہ اس کا ہے..

اور کتے کو بھی کچھ پروا نہ تھی کہ وہ کس کا ہے..

وہ اپنے قبیلے کا شاید کوئی صوفی تھا جسے دنیا سے کچھ غرض نہ تھی اور مزے سے اور ایک بے اعتنائی کی کیفیت میں فرش پر تھوتھنی رکھے' اک عالم استغراق میں استراحت فرماتا تھا..

کبھی کبھار میں اس کی درویشی سے متاثر ہو کر جھکتا اور اس کے نسواری اور ریشمی بالوں پر ایک الفت بھری تھپکی دیتا تو اس کی آنکھوں میں شکر گزاری کی شرمندگی سی آ جاتی اور وہ صرف ایک بار اپنی دم اٹھا کر اس شکر گزاری کا اظہار کرتا اور اسے پھر سے فرش پر رکھ دیتا..

عجیب درویش کتا تھا..

مجلی میں یہ شب گزارنے والے لوگ..زندگی کی قدر کرنے والے خوش طبع لوگ صورت شکل اور لباس سے بھلے لوگ لگتے تھے..کاروباری اور کائیاں نہ لگتے تھے..

برابر کی میز پر ایک جوڑا براجمان تھا..میں ذرا کوشش کر کے ان سے فرینڈلی ہو گیا..وہ

جو مرد تھا وہ ایک انٹریئر ڈیزائنر تھا اور اس کی ساتھی لڑکی کسی اداکاری کے سکول کی طالبہ تھی.. محفل میں اسی نوعیت کے لوگ آتے تھے..

میں بہت دیر سے تاک میں تھا..

اگرچہ حسن اور کھوکھر صاحب کے ساتھ شغل میلہ کر رہا تھا لیکن میرا دھیان کہیں اور تھا..

میں منتظر تھا..

منتظر تھا کہ کب.. وہ تین حضرات جو مسلسل سرخ وائن کے گھونٹ بھرتے باتیں کرتے تھکتے نہ تھے وہ کب رخصت ہوں اور میں اس نشست پر جا بیٹھوں کہ یہ وہی نشست تھی جہاں پاپا ہیمنگوے بیٹھا کرتے تھے اور ان کی باریش تصویر اس نشست کے عین اوپر آویزاں اس کی نشاندہی کرتی تھی.. سٹائن بیک اور یوجین اونیل کا بھی یہی مرغوب گوشہ ہوا کرتا تھا اور سمون ڈی بوائر بھی اسی کونے کو پسند کرتی تھی..

تو میں منتظر تھا..

لیکن وہ تینوں حضرات تو گویا نشستوں کے ساتھ چپک چکے تھے.. اٹھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے.. اٹھتے تو میں اس نشست پر جا بیٹھتا..

اس انتظار کے دوران بار کاؤنٹر پر براجمان ایک پھیکی پڑتی نیلی جین اور پورے بازوؤں کے بھورے سویٹر میں ملبوس‘ جس کی بائیں کلائی میں پلاسٹک کے تین دبیز کنگن جھولتے تھے‘ ایک لڑکی گھنگھریالے سنہری بالوں والی.. اور اس کی چپٹی ناک تلے جو بے دریغ مسکراہٹ تھی‘ وہ صرف کسی ایسی لڑکی کی ہی ہو سکتی تھی جس نے زندگی میں کوئی دکھ نہ سہا ہو اور محبت نے ہمیشہ اپنے بازو اس کے لیے وا کیے ہوئے ہوں.. وہ ہمارے قریب آئی اور مجھ سے کہنے لگی.. ’’کیا میں تمہارے کتے کو پیار کر لوں؟..‘‘

شاید وہ کتا نسواری رنگ کا اس لیے تھا کہ نسوار کھاتا تھا.. بہر طور افیونی ضرور تھا اور چونکہ ہماری میز کے پائے سے لگ کر مسلسل حالت استغراق میں تھا‘ اس لیے اس لڑکی کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ یہ ہمارا ذاتی کتا ہے.. ویسے عمر کا زوال بھی انسان کو کیسی کیسی ذلتوں سے ہمکنار کرتا ہے کہ قصہ آج سے تیس برس پیشتر کا ہوتا تو یہ لڑکی مجھ سے نہیں بلکہ کتے سے پوچھتی کہ... کیا میں تمہارے مالک سے پیار کر لوں..؟

’’جی ضرور.. ویسے یہ میرا کتا نہیں ہے.‘‘ میں نے مسکرا کر کہا اور اس پر حسن اور کھوکھر صاحب نے بھی نعرۂ تحسین بلند کیا کہ.. ہمارا بھی نہیں ہے..

چنانچہ پھیکی پڑتی نیلی جین والی لڑکی نے جی بھر کے کتے کو پیار کیا.. اس کے کانوں میں کھجلی کی اور اس کی پشت پر دیر تک ہاتھ پھیرا.. اور کتا ایسا نامرد کہ حرکت تک نہ کی.. بس فرش پر تھوتھنی رکھے آنکھیں جھپکاتا رہا.. البتہ ہم تینوں میں بہت حرکت ہوئی اور ہم لطف اندوز ہوتے رہے جیسے وہ ہمارے کانوں میں کھجلی کر رہی ہے اور ہماری پشت سہلا رہی ہے.. تیسری دنیا کے جنسی طور پر ناآسودہ لوگ بس اسی طرح دور دور سے ہی لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں..

وہ تینوں مے خوار یکدم اٹھ گئے..

وہی جو پاپا ہیمنگوے کی تصویر تلے سرخ شراب کے گھونٹ بھرتے تھے وہ اٹھ گئے اور میں فوراً اٹھا اور اس نشست پر جا بیٹھا.

سب سے پہلے تو میں نے ایک نہایت دانشورانہ اور ادیبانہ پوز بنا کر.. ہیمنگوے کی پورٹریٹ تلے ایک تصویر بنوائی تا کہ سند رہے کہ گزرے تھے ہم وہاں سے.. جہاں ’’بوڑھا اور سمندر‘‘ کا ناول نگار بیٹھا کرتا تھا.. یہ تصویر خصوصی طور پر اس لیے بنوائی گئی تھی تا کہ ہم اپنے ادبی کیریئر کے اختتام پر جو سائیکل کے کیریئر سے ملتا جلتا تھا.. اگرچہ وہ تو پہلی کتاب لکھنے کے فوراً بعد ہی اختتام پذیر ہو گیا تھا.. تو تب آئندہ برسوں میں جب یہ احساس دامن گیر ہو جائے کہ میاں تم نے جہاں پہنچنا تھا پہنچ گئے اور کہیں بھی نہیں پہنچے اور ادبی عظمت کی گاڑی تو کب کی چھوٹ چکی تو پھر ہم ہراساں ہو کر اپنے نام آنے والے کاٹھ کباڑ خطوط.. جھاڑ جھنکار.. آؤٹ آف فوکس تصویریں.. اخباروں کے تراشے.. اپنی چنیدہ تحریروں اور ہم عصر ادیبوں سے منت سماجت کر کے اور کبھی زبردستی لکھوائی جانے والی توصیفی مضامین پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ’’تارڑ اور اس کی ادبی عظمت‘‘ نام کی اپنے ذاتی خرچے پر یا کسی ادبی انجمن سے مانگ تانگ کر چھپوائیں گے تو اس میں یہ تصویر بھی شامل ہو گی.. کہ.. تارڑ ہیمنگوے کے ساتھ.. بلکہ ہیمنگوے تارڑ کے ساتھ..!

ہیمنگوے میرے پسندیدہ ترین مصنفوں میں شامل نہیں ہے.. البتہ اس کی حیات کی بے راہروی اور آوارگی مجھے اس کی قربت میں لے آتی ہے اور وہ میری پسندیدہ ادبی شخصیت بن جاتا ہے.. اس لیے بھی کہ کسی ادبی نقاد نے میری آوارگی اور ذہنی خلجان کو ہیمنگوے سے جا ملایا تھا.

میں کسی حد تک ذہنی..رومانوی اور جذباتی سطح پر ہیمنگوے کے قریب تھا اور وہ بھی کسی حد تک مجھ سے مماثلت رکھتا تھا۔امریکہ میں بھی تو آوارہ گرد تارڑ ہو سکتے ہیں..

میں نے اپنے ادبی کیریئر کے آغاز میں کچھ افسانے اور ناول غیر ملکی پس منظر میں تحریر کیے..مثلاً افسانوں میں ''سیاہ آنکھ میں تصویر''، ''بادشاہ''، ''جولی'' اور ناولوں میں ''فاختہ''، ''پیار کا پہلا شہر'' اور ''جپسی''..وغیرہ..تو نقاد حضرات اور بیشتر ہم عصر ادیبوں نے بھی فیصلہ صادر فرما دیا کہ یہ تو سفرنامے ہیں کیونکہ یہ تو انگلستان..فرانس..روس اور ہسپانیہ کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں..اُن دنوں افسانہ یا ناول صرف وہی سمجھا جاتا تھا جس کا پس منظر پاکستان ہو اور صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کوئی کردار انگلستان کی ہوا کھا آئے تو کچھ مضائقہ نہیں..میں نے بہت واویلا کیا کہ جناب مجھے یوں رد نہ کیجیے..یہ افسانے ہیں ناول ہیں اور صرف ان کا پس منظر غیر ملکی ہے کیونکہ عمر گزری ہے اُسی دشت کی سیاہی میں..تو ان زمانوں میں میں ہیمنگوے کو اپنی ڈھال بناتا تھا کہ صاحب میری معلومات کے مطابق اس امریکی مصنف نے صرف اور صرف اپنا پہلا ناول امریکی پس منظر میں لکھا اور اس کے بعد اس کی کل تحریریں اور کردار پیرس..افریقہ..ہسپانیہ..اطالیہ..سوئٹزرلینڈ اور کیوبا میں جنم لیتے ہیں اور یہ تحریریں سب کی سب خودنوشت کے زمرے میں آتی ہیں اور پاپا جی ذرا سیانے تھے کہ ہر ناول اور کہانی میں مرکزی کردار اگرچہ ان کا اپنا ہوتا تھا لیکن وہ صرف یہ تبدیلی کرتے تھے کہ..''میں ارنسٹ ہیمنگوے..جب جنگ کے دوران اطالیہ میں ایک ایمبولینس ڈرائیور تھا..یا ہسپانوی خانہ جنگی میں شریک تھا..یا پامپلونا کے فی اسٹا میں شریک تھا..یا کیوبا کے سمندروں میں کشتی نکل کر جایا کرتا تھا تب میرے ساتھ یہ ہوا۔'' تو تبدیلی وہ یہ کرتے تھے کہ ''میں'' کی بجائے اپنا نام کسی کردار کو دے دیتے تھے کہ جیک پیرس میں تھا..ٹونی افریقہ میں جنگلی بھینسوں کا شکار کھیل رہا تھا اور اس کے ساتھ یہ ہوا..

''سنوز آف کلی منجاروز''..''اے فیئر ویل ٹو آرمز''..''دی سن آلسو رائزز''..''فار ہوم دے بیل ٹولز''..''گرین ہلز آف افریقہ''..''اے موو ایبل فیسٹ''..یہاں تک کہ اس کا کلاسیک ''اولڈ مین اینڈ دے سی'' یہ سب ناول ہیمنگوے کی خودنوشتیں ہیں..

ہم نے بہت واویلا کیا پر ہماری کسی نے نہ سنی اور ہمارے افسانوں اور ناولوں کو سفرنامے ہی قرار دیا جاتا رہا..

ہماری کون سنتا تھا..جب کہ ہیمنگوے کی سب نے سنی کہ وہ امریکی تھا اور انگریزی میں لکھتا تھا..

ہیمنگوے میں ایک اور قباحت تھی..وہ ایک آوارہ مزاج..لااُبالی..کھلنڈرا..عورتوں کا شیدائی، کسی حد تک منہ پھٹ اور بے دید اور ہماری نظروں میں ایک اوباش شخص تو تھا ہی لیکن..پاپا ہیمنگوے کی سب سے بڑی کمزوری..اور طاقت بھی..شراب تھی..اس کا ہر ناول مے نوشی سے شروع ہوتا ہے..شاید ''اولڈ مین اینڈ سی'' میں شراب نہیں ہے کہ سمندروں پر شراب خانے قائم نہیں ہو سکتے ڈول جاتے ہیں..اس کے سوا ہر ناول میں اس کا مرکزی کردار جہاں کہیں بھی بیٹھتا ہے..افریقہ یا پیرس میں تو اپنے گلے کو پہلے تر کرتا ہے اور پھر بات کرتا ہے..اگر وہ پیرس میں ہے تو اس کا مرغوب ترین مشروب ''پرنو'' ہے..سونف سے کشید کی گئی شراب جو بے رنگ ہوتی ہے اور پانی کی آمیزش سے دودھیا ہوتی ہے..عرب دنیا اور خاص طور پر لبنان میں اسے ''عرق'' کے نام سے جانا جاتا ہے..

ہیمنگوے اگر امریکہ کی بجائے پاکستان میں پیدا ہوتا اور اردو زبان میں لکھتا تو اس پر بھی سفرنامے کا الزام دھر کر اسے رد کر دیا جاتا..لیکن وہ ایک بڑے ملک میں پیدا ہوا اور اس نے ایک بڑی زبان میں لکھا، اس لیے وہ نامور ہو گیا..ہمارے بلونت سنگھ..راجندر سنگھ بیدی..کرشن چندر..عزیز احمد..سعادت حسن منٹو اور قراۃ العین حیدر صرف اس لیے بین الاقوامی سطح پر گمنام رہے کہ وہ تیسری دنیا کے باسی تھے اور اردو میں لکھتے تھے..اگر یہ انگریزی میں لکھتے تو کیا کوئی ہیمنگوے..شٹائن بیک..مارک ٹوین یا جیمز جوائس ان کے سامنے ٹھہر سکتا..؟ہاں گارسیا مارکیز کافکا..کامیو..کندیرا...یا ہوسے سراماگو ٹھہر سکتے تھے، پر ان سے برتر نہ ٹھہر سکتے تھے..

تیسری دنیا میں جنم لینے والے لکھاریوں کی حیات ایک یونانی المیے سے کم نہیں..صرف اس لیے کہ ان کی جنم بھومی اہم نہیں اور وہ جو ادب تخلیق کرتے ہیں تو اپنی زبان میں تخلیق کرتے ہیں جو بین الاقوامی سطح پر کچھ حیثیت نہیں رکھتی..چنانچہ وہ گمنام رہتے ہیں..

چونکہ میں محفل میں اس لمحۂ موجود میں پاپا ہیمنگوے کی نشست پر براجمان ہوں اس لیے مناسب ہوگا کہ میں اس پاپا جی سے اپنی اوّلین ملاقات کا احوال بیان کر دوں..

شاید یہ احوال میں پہلے بھی اسی تحریر میں بیان کر چکا ہوں..

پاپا ہیمنگوے سے میری پہلی ملاقات لاہور کے اوڈین سینما کی سکرین پر ہوئی..جب میں مسلم ماڈل ہائی سکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور خاور زمان کے ہمراہ گھر والوں سے چوری چھپے انگریزی فلمیں دیکھا کرتا تھا..

''سنوز آف کلی منجاروز'' نے لاہور کے تمام ٹین ایجرز پر جادو کر دیا تھا..

ایک مرتا ہوا زخمی شخص گریگوری پیک افریقہ کے بیابانوں میں..اس جہاز کا منتظر جو اسے تہذیب یافتہ دنیا میں لے جائے گا..

.....اور قریبی درخت کی ٹنڈ منڈ شاخوں پر گدھ اترتے جاتے ہیں ایک متوقع مرگ کی بُو سونگھتے ہوئے کہ کب یہ شخص مرے اور ہم اسے نوچ کھائیں..اور وہ شخص قربت مرگ میں اپنی گزشتہ زندگی کو یاد کر رہا ہے.. جہاں پیرس کے ایک نائٹ کلب میں ایوا گارڈنر اپنے لبوں میں دابے سگریٹ کو اس کے قریب لاتی کہتی ہے..تمہارے پاس لائٹ ہے..؟''

ہم نے یہ فلم..ہیمنگوے کی ایک کہانی پر مبنی یہ فلم بہت بار صرف اس ایک منظر کے لیے دیکھی جب ایوا گارڈنر ایسی ساحرہ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے پیک سے پوچھتی ہے کہ کیا تمہارے پاس ماچس ہے؟

چنانچہ میں نے اس پاپا کی نشست پر بیٹھ کر ایک تصویر اتروانے کے بعد اس اولڈ مین کی یاد میں ایوا گارڈنر کی مانند ایک سگریٹ سلگایا اور اس کی بلیک اینڈ وہائٹ پورٹریٹ کی جانب دیکھا کہ شاید اسے یاد ہو کہ اس کی اور میری پہلی ملاقات لاہور کے اوڈین سینما میں ہوئی تھی.. پر اسے کہاں کچھ یاد تھا..جو یاد دلانے پر یاد آ جاتا..اسے تو یہ بھی یاد نہ آیا کہ ''اندلس میں اجنبی'' میں میں نے اس کی تحریر ''ڈیتھ اِن دے آفٹرنون'' کے بہت حوالے دیئے تھے..اور اسے یاد بھی کیوں آتا کہ مجھ ایسے ہزاروں لوگ اس کے حوالے دیا ہی کرتے ہیں..

وہ دُھندلائی ہوئی پھیکی پڑتی نیلی جین والی گھنگھریالے بالوں والی لڑکی پھر سے اپنے سٹول پر سے اٹھی..اور اس بار کچھ مستی اس کی چال میں ڈھلتی تھی..وہ حالت خمار میں تھی لیکن ابھی اختیار میں تھی..''کیا میں تمہارے کتے کو ایک مرتبہ پھر پیار کر لوں..؟''

''یہ کتا میرا نہیں ہے..؟''

''پھر بھی..میں اسے پیار کر لوں..''

ہیمنگوے نے اپنی خودنوشت میں ایک عجیب سا فلسفہ بیان کیا ہے کہ..جب ایک مرد کے اندر جو رس ہوتا ہے اس کی روانی تھم جائے تو اسے خودکشی کر لینی چاہیے..اور اس نے کر لی..

اگرچہ میری روانی مکمل طور پر تھمی نہیں تھی اور فی الحال خودکشی کی چنداں حاجت نہ تھی لیکن اس کے باوجود جب اس لڑکی نے دوسری بار میری بجائے کتے سے الفت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا کہ..کیا میں تمہارے کتے سے ایک مرتبہ پھر پیار کر لوں..تو مجھے خودکشی کر لینی چاہیے تھی..



''ہمدمِ دیرینہ سے ملنا..''

میں اپنے برابر میں ڈرائیور کی نشست پر بیٹھے ہوئے.. نیلی قمیض، سرخ ٹائی اور نیوی بلو سوٹ میں ملبوس گورے چٹے سفید بالوں والے شخص کو.. جس کے کانوں میں اس کے سیل فون کے ایئر پلگ چسپاں تھے اور وہ کبھی مجھ سے اور کبھی جانے کن کن سے بات کرتا تھا اور اس کے پہناوے میں سے آئیوڈین یا کسی دوائی کی مہک آتی تھی.. تو میں اس شخص کو پورے پچاس برس کے بعد دیکھ رہا تھا..

میرے اور اس کے درمیان نصف صدی حائل تھی..

اگر وہ مجھے کسی محفل میں ملتا.. سر بازار نظر آتا تو مجھے شائبہ بھی نہ ہوتا کہ کبھی ہم بھی تم سے تھے آشنا.. لیکن آج کی ملاقات پر جب وہ میری جانب بڑھا تو سراسر اجنبی تھا لیکن جونہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی میں اسے پہچان گیا.. اس کی شرمیلی مسکراہٹ پر نصف صدی بھی اثر انداز نہ ہوئی تھی.. یہ مسکراہٹ وہی تھی جب وہ مسلم ماڈل ہائی سکول کی گراؤنڈ میں ہم طلباء کے سامنے کھڑے ہو کر.. سینے پر ہاتھ باندھ کر ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' الاپتا تھا اور ہم جھوم جھوم کر اس کی ہم نوائی کرتے تھے..

یہ وہی خالد محمود بٹ تھا..

میری اہلیت تو بس اوسط درجے کی تھی.. جن مضامین میں گپ لگانے اور داستان طرازی کے امکانات ہوتے تھے یعنی اردو، تاریخ، جغرافیہ اور کبھی انگریزی ان میں تو میں صفحے کے صفحے سیاہ کر کے اول دوم آ جایا کرتا تھا البتہ جہاں تک ریاضی اور ڈرائنگ وغیرہ کا تعلق تھا ان میں رعایتی نمبروں پر بھی مشکل سے پاس ہوتا تھا اور میرے مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کے

لیے کسی نجومی کی ضرورت نہ تھی یہ ہر ایک کو بشمول میرے تاریک نظر آتا تھا.. لیکن خالد کی قابلیت کے ہر سو چرچے تھے اور ہر کوئی جانتا تھا یہ دبلا پتلا گورا چٹا شرمیلا لڑکا.. بہرصورت کہیں نہ کہیں کوئی مقام حاصل کر کے نامور ہوگا.. اور ایسا ہی ہوا.. وہ ہمارے ہیڈ ماسٹر عزیز صاحب کا چہیتا شاگرد تھا اور بالآخر ان کی شاگردی سے نکل کر ان کی دامادی میں آ گیا.. عزیز صاحب کا بیٹا محبوب الحق.. جو بعد میں بین الاقوامی سطح کا ماہر معیشت ہوا اور مرکزی وزیر برائے خزانہ ہوا.. ہم سے دو تین جماعتیں آگے تھا..

میٹرک کے بعد ہم دونوں مسلم ماڈل سے زیادہ دور نہ گئے بلکہ اس کی دیوار سے ملحقہ گورنمنٹ کالج میں چلے گئے لیکن وہاں ہماری ملاقات کم کم ہوتی.. وہ سائنس گروپ میں تھا اور میں آرٹ کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا تھا..

پھر ایک طویل بے خبری کا دور آیا.. ہم میں سے کون کہاں چلا گیا کچھ خبر نہ ہوئی اور پھر کسی کلاس فیلو نے تذکرہ کیا کہ خالد میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے امریکہ چلا گیا تھا اور اب وہ دنیا کے بڑے کِڈنی سرجنز میں شمار ہوتا ہے.. وہ اتنا متمول ہے کہ اپنے پرائیویٹ جیٹ میں سفر کرتا ہے اور اس کی رہائش گاہ ایک سمندر کے کنارے پر ہے اور نصف کلومیٹر کا ساحل اس کی ملکیت میں ہے.. اس قسم کی سچی جھوٹی رپورٹیں ہم تک پہنچتی رہیں..

میری خواہش تھی زندگی میں پہلی بار نیویارک آیا ہوں تو کوئی ایسا سبب بن جائے کہ میں نصف صدی پیشتر کی آشنائی کو زندہ کر سکوں.. اگرچہ ہم ان زمانوں میں اچھے دوست ہوا کرتے تھے لیکن نصف صدی کے بعد صرف وہی دوست یاد آتے ہیں جو نامور یا متمول ہو چکے ہوں.. اور آپ ان کو قطعی طور پر فراموش کر دیتے ہیں جنہیں زمانہ فراموش کر دیتا ہے.. تو خالد سے دوبارہ ملاقات کی خواہش میں اس کی ناموری کا بھی بہت عمل دخل تھا..

اور یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوتی اگر ایک عجیب و غریب کردار مامون ایمن میرا کھوج لگا تا کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں واقع اشفاق حسین کے گھر کے تہہ خانے میں نہ پہنچ جاتا..

قارئین شاید تھوڑے سے کھو گئے ہوں.. ذرا اُلجھ گئے ہوں یہ کہ بابا صاحب نیویارک اور فلوریڈا کے بعد کینیڈا کدھر نکل گئے.. تو میں اس گتھی کو قدرے سلجھا دیتا ہوں پاکستان کے بعد

میں نے پہلا قدم نیویارک میں رکھا.. وہاں ایک مناسب قیام کے بعد فلوریڈا کا رخ کیا.. پھر آرلینڈو پرواز کرتا کینیڈا پہنچتا ہوں.. وہاں ٹورنٹو، اٹاوہ، مانٹریال وغیرہ کے بعد کیلگری سدھارتا ہوں.. برٹش کولمبیا کے پہاڑوں میں گمشدہ ہوتا ہوں.. وہاں سے پھر فلوریڈا لوٹتا ہوں.. بالآخر نیویارک واپس آ کر پاکستان کی پرواز میں جگہ پاتا ہوں..

کینیڈا کے سفر کی روئیداد کے بارے میں مجھے ابھی تک کچھ علم نہیں میں لکھوں گا بھی یا نہیں.. اگر لکھوں گا تو کب لکھوں گا.. وہ ایک ایسا سفر تھا جسے کھول کر بیان کرنا ممکن نہیں.. اس کی سحرطرازی کو بیان کرنے کی مجھ میں اہلیت نہیں.. ابھی نہیں.. شاید کبھی نہیں!

چنانچہ میں کینیڈا میں تھا..

ٹورنٹو میں تھا..

اور آج ہی اشفاق حسین سے ملا تھا.. وہ سجاد ظہیر کانفرنس کے انعقاد کے آخری دموں پر تھا.. تھکا ہوا، پژمردہ تھا اگرچہ مطمئن اور پُرمسرت تھا.. یہ کانفرنس نہایت کامیاب رہی تھی.. ہم نے آج دوپہر روس کی اردو سکالر.. اقبال اور فیض کی پرستار لڈمیلا واسالووا اور ذرا بہکے ہوئے شاعر امید فاضلی کے ہمراہ ایک نہایت خصوصی کردار کے باوضع قسم کے ریستوران میں کھانا کھایا تھا.. لڈمیلا جسے اس کے دوست پیار سے میلا کہتے ہیں ایک ایسی خاتون ہے جس کی خوشگوار رفاقت کی چاہت ہمیشہ رہتی ہے.. ہم نے دنیا جہان کی باتیں کیں.. میلا نے نہایت جذباتی انداز میں اس دن کو یاد کیا جب وہ لاہور میں میرے گھر آئی تھی اور میں اسے فیض صاحب کی قبر پر لے گیا تھا اور وہ قبرستان میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز میں فیض کا کلام پڑھ رہی تھی اور جب میں نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میلا کے ہاتھ بھی اُٹھ گئے..

وہ مجھے ٹورنٹو میں گزارے ہوئے لمحات کی تفصیل بتا رہی تھی اس نے کیسے یہ دن جھیل ٹورنٹو میں بھیگتے اور تیرتے گزارے.. اگرچہ وہ میری عمر کی قربت میں تھی لیکن میں نے اسے ذرا چھیڑا تم بھیگی ہوئی بہتر لگتی ہوگی.. اسے بھی قلق تھا کہ اسے آج ہی ماسکو کے لیے روانہ ہونا ہے اور ہم کوئی طویل ملاقات نہیں کر سکتے..

اُن دونوں کو لڈمیلا اور فاضلی کو ایئرپورٹ پر رخصت کر کے ہم اشفاق کے گھر لوٹے.. تو

رات ہو رہی تھی.. کار کی ہیڈ لائٹس کی زد میں اس کے گھر کے باہر جو چنار کا درخت تھا وہ یکدم درخشاں ہوا اور اس کے خزاں رسیدہ سرخ پتے تمتمانے لگے..

اشفاق کے گھر تلے جو ایک تقریباً فٹ بال کے میدان ایسا وسیع تہہ خانہ تھا ہم اس کے ایک کونے میں براجمان جب دنیا جہان کی.. ادب اور شاعری کی باتیں کرنے میں محو تھے تب فون کی گھنٹی بلند ہوئی اور اشفاق نے بیزار ہو کر چونگا اٹھایا.. ہیلو کہہ کر کچھ سنا اور پھر کہا ''تارڑ صاحب آپ کے لیے ہے..''

رات کے پچھلے پہر.. جب آپ گہری نیند میں ہیں یا کسی اجنبی مقام پر جس کے بارے میں کوئی نہ جانتا ہو کہ آپ وہاں ہیں اگر ہیں تو کہاں ہیں تو تب ایک ٹیلی فون آپ کے لیے آتا ہے تو اس میں کوئی بری خبر ہوگی کوئی اطلاع ہوگی.. میرا کینیڈا کا شیڈول کچھ طے شدہ نہ تھا اور کسی کو علم نہ تھا کہ میں فلاں تاریخ کو کونسے شہر میں ہوں گا.. کس کے پاس ہوں گا تو اگر میرا کھوج لگا لیا گیا ہے تو یہ کوئی تشویشناک خبر ہے..

میں نے ایک سہما ہوا ''ہیلو'' کہا..

اُدھر کوئی تشویشناک خبر نہ تھی کوئی تشویشناک شخص تھا جو چہکتا چلا جاتا تھا.. بے وجہ فری ہوا جاتا تھا.. میری نہ سنتا تھا اپنی ہی سناتا چلا جاتا تھا.. ''جان من کیسے ہو.. یار تم نیویارک میں تھے اور اپنے دیرینہ دوست سے ملے بغیر کینیڈا چلے گئے.. اوئے کیا حال ہے تمہارا.. مجھے تو آج ہی شوکت فہمی نے بتایا ہے کہ تم آئے تھے اور چلے گئے.. یار تم.. تم.. تم..''

مجھے وہ حضرات سخت برے لگتے ہیں جن سے کچھ میل ملاقات نہیں ہوتی اور وہ چھوٹتے ہی.. تم.. تم کرنے لگتے ہیں.. چنانچہ میں نے اپنے لہجے میں بیافو اور ہسپر گلیشیئرز کی ساری برفیں بھر کر.. نہایت سرد ہو کر کہا ''آپ اپنا تعارف کروائیے.. آپ کون ہیں؟''

''یار میں ایمن ہوں.. پہچانا نہیں..''

''میں صرف راگ ایمن کو پہچانتا ہوں.. آپ وہ تو نہیں ہو سکتے تو کون ہیں..''

''یار..''

''اور میں آپ کا یار نہیں.. پہلے بتائیں آپ ہیں کون.. ورنہ میں فون بند کر دوں گا..''

''یار.. میرا مطلب ہے تارڑ.. میں ایمن ہوں تمہارا اسکول فیلو.. ہم مسلم ماڈل ہائی سکول

میں چھٹی جماعت میں اکٹھے پڑھتے تھے..نہیں پہچانا..''

''اگر تو آپ میرے سامنے آ کھڑے ہوتے یا فون پر آپ کی تصویر بھی آ رہی ہوتی تو میں مقدور بھر کوشش کرتا آپ کو پہچان لینے کی..اب نصف صدی کے بعد صرف نام کے زور پر میں چھٹی جماعت کے کسی لڑکے کو اپنے تصور میں کیسے لا سکتا ہوں..''

یہ کوئی بہت ہی بے ہودہ سے شخص لگتے تھے..

''تم نہیں..مگر میں تو تمہیں پہچانتا ہوں..''

''یہ آپ کا نہیں ٹیلی ویژن کا کمال ہے..''

وہ کھی کھی کرتا بچوں کی مانند ہنستا چلا گیا ''یار اُن دنوں میرا نام مامون الرشید تھا اور میرے ابا جی ہارون الرشید مسلم ماڈل سکول میں ماسٹر تھے' یاد ہے..'' عجیب شخص تھا بلکہ پورا عباسی عہد تھا..مجھے کچھ یاد نہ تھا ''نہیں مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا..''

''یار تم مشہور ہو گئے ہو اس لیے نہیں پہچانتے..''

یہ فقرہ مجھے ہمیشہ زہر لگتا ہے..بہت سے دوست اور رشتہ دار آپ کو اس فقرے کی تلوار کی دھار سے کاٹ دیتے ہیں..بے شک قصور ان کا ہو..آپ کا کچھ دوش نہ ہو لیکن آپ کو یہ طعنہ دے کر سرخرو ہو جاتے ہیں..آپ کو ذلیل کر کے پُرمسرت محسوس کرتے ہیں چنانچہ میں نے وہی جواب دیا جو اس سے پیشتر ایسے طعنوں کا دیا کرتا تھا ''اس کی شکایت آپ اللہ میاں سے کریں جنہوں نے مجھے مشہور کیا ہے..''

''یار تم تو بڑے کورے ہو گئے ہو'' وہ ذرا رنجیدہ ہو گئے..

''چلیے آپ یہ بتائیں کہ اگر آپ میرے کلاس فیلو رہ چکے ہیں تو ہماری کلاس میں اور کون کون لوگ تھے..''

''یار..بھیا اسماعیل جو پی سی ایس کر کے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچا..چھوٹا کمال جو مشہور ایٹمی سائنسدان ہو گیا..بڑا کمال جو پی آئی اے میں توپ شے ہو گیا..شیخ صلاح الدین جو شاید مر گیا ہے..اور شجاع جو مر کر زندہ ہو گیا تھا..یار ماسٹر محی الدین جو کُبڑے تھے..ماسٹر دین محمد قصائی..ماسٹر نادر خان' افتخار' رحمت خان' اسلم اور ہمارے ہیڈ ماسٹر عزیز صاحب..نہیں؟''

وہ یقیناً ناقابلِ تردید ثبوت مہیا کر رہا تھا اور یقیناً میرا کلاس فیلو رہ چکا تھا لیکن میری

یادداشت میں اُس کا کوئی نقش نہ تھا..

''تم خالد محمود بٹ کو جانتے ہو؟''

وہ پھر کھی کھی کرتا ہنسا..نہایت تھیئٹریکل انداز میں قہقہہ لگایا ''ہم دونوں پچھلے چھتیس برس سے نیویارک میں ہیں..اُس سے بات کرو گے؟..''

چند لمحوں بعد خالد محمود بٹ لائن پر تھا..ہم دونوں بیتے دنوں کو یاد کرتے رہے..اب تک ایک دوسرے سے ملاقات نہ کر سکنے کے بہانے تراشتے رہے اور وہ جو ہمارے درمیان تیسرا تھا..مامون یا ایمن تھا وہ اپنے تھیئٹریکل انداز میں قہقہے لگاتا رہا..طے یہ پایا کہ نیویارک واپسی پر ہم فلاں دن..ہم تینوں فلاں دن..کھانے کی میز پر مل بیٹھیں گے..

''اب تم نے مجھے پہچانا ہے یا نہیں'' بٹ چلا گیا تو ایمن نے کھی کھی کرتے پوچھا..

''تمہارے تمام تر حوالے اور اب خالد محمود بٹ سے رابطہ یہ ایسے مصدقہ حوالے ہیں کہ شک شبے کی کچھ گنجائش باقی نہیں ہے لیکن خدا لگتی کہتا ہوں چاہے وہ تمہیں لگے یا نہ لگے کہ میں ابھی تک تمہیں پہچان نہیں پایا..''

''یار تمہاری اردو گرائمر عجیب سی ہے..خود ساختہ لگتی ہے..اب یہ خدا لگتی کے ساتھ کیا کیا لگا دیا ہے..''

''میری گرائمر بھی میری طرح عجیب ہے..انشاء اللہ نیویارک میں ملاقات ہو گی بھائی میمن..''

''میمن نہیں یار..'' وہ پھر ہنسنے لگا ''ایمن..''

''راگ ایمن؟''

''دوستوں کے لیے..ہاں راگ ایمن..''

میں نے بالآخر فون رکھا تو اشفاق کہنے لگا ''تارڑ صاحب آپ ایمن صاحب کو کیسے جانتے ہیں؟''

''میں کہاں جانتا ہوں..وہ مجھے جانتا ہے..ویسے اشفاق مجھے محسوس ہوا ہے کہ یہ ایمن میاں تھوڑے سے ٹُن تھے..قدرے خمار میں تھے..''

''ایمن صاحب تو شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے..''

''یہ تو اور بھی تشویشناک بات ہے لیکن..تم اس ایمن کو جانتے ہو؟''

''انہیں تو پورا امریکہ اور کینیڈا جانتا ہے تارڑ صاحب.. نہایت نستعلیق شخصیت ہیں.. شاعر ہیں اور وہ بھی نستعلیق نوعیت کے.. عروض پر عبور حاصل ہے.. مشاعروں میں ہمیشہ شیروانی زیب تن کر کے آتے ہیں جو کسی بھی رنگ کی ہو سکتی ہے.. بلکہ ایک بار گلابی رنگ کی شیروانی پہن کر تشریف لائے اور اس اہتمام کے ساتھ کہ جوتے اور جرابیں بھی گلابی رنگ کے تھے۔''

یہ تو ایک نہایت ہی بور اور بے ہودہ شخص کی تمام تر نشانیاں ہیں.. یعنی شراب نہیں پیتے اور پھر بھی شاعر ہیں.. اور عروض پر عبور ہے اور گلابی رنگ کی شیروانیاں پہنتے ہیں.. ویسے میچ کرنے کے لیے یہ پنک شوز کہاں سے حاصل کرتے ہیں اشفاق..''

''بہت بھلے اور مجلسی شخص ہیں تارڑ صاحب..'' اشفاق اس ایمن کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا تھا.. شاید گلابی رنگ کا..

تو آج شب.. نیویارک کی اس شب میں.. اگر میں.. نیلی قمیض، سرخ ٹائی اور نیوی بلو سُوٹ میں ملبوس گورے چٹے سفید بالوں والے شخص کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس کے پہناوے میں سے آئیوڈین یا کسی دوائی کی مہک آ رہی تھی.. اور ہم براڈوے سٹریٹ پر رواں تھے اور وہ شخص ڈاکٹر خالد محمود بٹ تھا تو یہ کمال اسی فنی مین کا تھا جو گلابی شیروانیاں پہنتا تھا اور ہم دونوں جیکسن ہائٹ میں واقع کسی پاکستانی ریستوران میں جا رہے تھے جہاں یہ فنی مین.. ایمن ہمارا منتظر تھا..

''تم سے ملنے کی تمنا تو بہت تھی خالد.. ایک دو بار تمہارے لاہور میں ہونے کی اطلاع بھی ملی اور ایک مشترکہ دوست نے یہ بھی بتایا کہ تم بھی مجھ سے ملاقات کے خواہش مند ہو لیکن میں جانتا تھا کہ تم اپنے مختصر قیام کے دوران مسلسل گردے کی بیماریوں میں مبتلا اُن مریضوں کے آپریشن کر رہے ہو جو مدتوں سے تمہارے ایسے مسیحا کے منتظر تھے.. میں نے سوچا کہ اگر میں تم سے ملاقات کرتا ہوں تو ایک دو گھنٹے کے لیے ہم کچھ لایعنی باتیں کریں گے.. سکول کے زمانوں کو یاد کریں گے اور کیا کریں گے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ اتنے وقت میں تم ایک دو اور مریضوں کے آپریشن کر کے انہیں تھوڑی سی زندگی عطا کر دو.. اس لئے میں نے اجتناب کیا۔''

''اب اگر میرا ہر دوست ہر رشتہ دار اسی نہج پر سوچنے لگے تو میں چوبیس گھنٹے آپریشن ہی کرتا رہوں..'' وہ مسکرانے لگا.. ''یہ درست ہے کہ جب بھی پاکستان جاتا ہوں تو ایسے بہت سے

مریض منتظر ہوتے ہیں جو کھوج لگا کر میرے والد صاحب کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور پاکستان پہنچتے ہی والد صاحب ایک فہرست میرے سامنے رکھ دیتے ہیں کہ بیٹا یہ بہت دکھی اور غرض مند لوگ ہیں اور سکت نہیں رکھتے تو تم میری خاطر ان کے آپریشن کر دو..''

میرے علم میں آیا تھا کہ خالد سے نیویارک میں طبی مشورے کے لیے وقت حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا.. چھ سات ماہ سے پہلے ملاقات کا وقت نہیں ملتا تھا اور وہ یقیناً مریض کو صرف ہاتھ لگانے کے ہزاروں ڈالر وصول کرتا تھا اور پاکستان پہنچتا تھا تو منتظر مریضوں کے آپریشن مفت کرتا تھا بلکہ اپنے پلّے سے انہیں مطلوبہ دوائیاں بھی خرید کر دیتا تھا..

''خالد.. مجھے تم پر فخر ہے'' میں نے جذباتی ہو کر کہا..

وہ اُسی شرماہٹ سے مسکرایا.. شرمندہ شرمندہ'' میں بھی لوگوں کو بتاتا ہوں کہ مستنصر اور میں کلاس فیلو تھے.. میں بھی..'' اُس نے مجھے بھی شرمندہ کر دیا..

تب اُس نے ایک ٹھیٹھ امریکی انداز میں اپنی ران پر ہاتھ مار کر کہا ''اوہ مین.. ہم تو شاید راستہ بھول گئے ہیں.. بتاؤ ہم کہاں ہیں؟''

''مجھے کیا پتہ کہ ہم کہاں ہیں.. نیویارک میں تم پچھلے چھتیس برس سے رہتے ہو میں تو نہیں..'' ہمیں براڈوے سٹریٹ سے ڈرائیو کرتے تقریباً ایک گھنٹہ ہونے کو تھا اور اب ہم جیکسن ہائٹ کے علاقے میں بھٹکتے پھر رہے تھے..

جیکسن ہائٹ جو پاکستانیوں کے علاوہ ہر نوعیت کے ایسے لوگوں کی بستی تھی جن کا رنگ گورا نہ تھا.. بلکہ اس گمشدگی کے دوران مجھے ایک بھرا پُرا ریستوران نظر آیا جس میں براجمان زندگی کے مزے لوٹتے جتنے بھی لوگ تھے.. پاکستانی، ہندوستانی، بنگلہ دیشی، سری لنکن، چینی، ویت نامی وغیرہ تھے اور ان میں کوئی ایک بھی گوری رنگت والا نہ تھا..

کوئی ایمبیسڈر ہوٹل تھا جہاں ہمیں پہنچنا تھا.. جہاں ایمن منتظر تھا اور وہ ہمیں ملتا نہ تھا.. اور خالد بار بار اپنی ران پر دھپ مار کر کہتا تھا ''اوہ مین..''

ویسے جیکسن ہائٹ میں بھٹکتے اس علاقے کو اگرچہ سرسری دیکھا لیکن جتنا دیکھا اس نے اس حسرت تمنا کو بجھا دیا جو دل میں پروان چڑھنے لگی تھی کہ کاش میں بھی اس شہر کا باسی ہوتا.. مین ہاٹن کچھ اور تھا.. یہاں کا ڈیفنس یا گلبرگ تھا اور جیکسن ہائٹ کچھ کچھ ٹاؤن شپ اور سبزہ زار

کالونی وغیرہ لگتا تھا..

وہ جو بھلے زمانے ہوا کرتے تھے ہمارے زمانوں سے پیشتر کے زمانے تو ان میں ایک نہایت معروف مُتشرع اور باوضو بزرگ ہوا کرتے تھے اور جب وہ مسلسل مُتشرع ہوتے ہوتے تھک جاتے تھے تو اپنی ایک چہیتی طوائف کے کوٹھے پر جا کر اس کا گانا سن کر اپنی یہ تھکن اتارتے تھے تو میں نے ادبی مجلّے ''نقوش'' میں پڑھا تھا کہ یہ بزرگ ذرا اداس ہو گئے اور شب کا انتظار کیے بغیر بھری دوپہر میں اپنی مرغوب عفیفہ سے ملاقات کی خاطر اس بی بی کی قیام گاہ کی جانب چل پڑے.. وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ عفت مآب خاتون ایک درخت کی چھاؤں تلے چرخہ کات رہی ہے.. بزرگ اُسے اس شریفانہ کسب میں مشغول دیکھ کر الٹے قدموں لوٹنے کو تھے کہ انہوں نے آواز دی کہ.. مولانا چلے آیئے..تو مولانا نے کہا.. بی بی تم جیسی تو ہم اپنے گھر میں بھی چھوڑ آئے ہیں..تو اس جیکسن ہائٹ ایسی بی بی تو ہم اپنے لاہور میں بھی چھوڑ آئے تھے..

خالد اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ گھر سے چلتے ہوئے میں نے کمپیوٹر میں سے اس مقام کے حدود اربع کا نقشہ کیوں نہ حاصل کر لیا.. بہت سے لوگوں سے پوچھا.. اندھی گلیوں میں چلے گئے.. شاہراہوں پر بھٹکے.. انہی سڑکوں پر سے بار بار گزرے اور بالآخر وہ ریستوران تلاش کر ہی لیا..

اور وہاں یہ ایمن یا مامون منتظر تھا.. جیسا ٹیلی فون پر سنائی دیتا تھا ویسا ہی دکھائی دیتا تھا.. کِھی کِھی کرتا ہنستا ہوا.. ایک نوجوان بچہ جس کے سر کے بال ترشے ہوئے تھے جیسے وہ حج کر کے آیا ہو..اور یہ ریستوران ایمبیسیڈر بھی ویسا ہی تھا.. جیسے ریستوران ہم گھر میں چھوڑ آئے تھے اور وہ قدرے بہتر تھے کہ وہاں سیڑھیوں سے چپکے قالین اتنے بوسیدہ تو نہ ہوتے تھے..اتنے دامن دریدہ تو ہرگز نہ ہوتے تھے کہ ان کے دامنوں میں سے سیڑھیوں کی لکڑی ہویدا ہونے لگے.. صفائی بھی کچھ سبحان اللہ سی تھی.. جیسے ململ کی کُرتی جوانی میں دو دن نہیں چلتی ایسے اس نوعیت کا ریستوران تو لاہور یا کراچی میں دو دن نہ چلے..اور یہاں شور و غوغا بھی بہت تھا اور پاکستانی ہی تھا.. پاکستان میں اگر گاہک حضرات اتنا غُل کریں تو ریستوران سے باہر نکال دیے جائیں لیکن یہ امریکہ تھا جہاں ہر فرد کو آزادی تھی کہ جو جی چاہے کرے..

وہاں کسی پاکستانی انجمن کا اجلاس برپا تھا اور تل دھرنے کو جگہ نہ تھی.. ہم نے بمشکل اپنا تِل کسی جگہ پر رکھ ہی دیا..

اس دوران اس انجمن کے اجلاس میں شامل ایک صاحب مجھے پہچان کر اٹھے اور نہایت بے تکلفی سے ہاتھ ملا کر نہایت مربیانہ انداز میں پوچھنے لگے ''ہاں بھئی کب آئے ہو؟''

بھئی نے بتایا کہ کب آیا تھا..

''کب تک ہو یار..''

یار نے عرض کر دیا کہ کب تک ہوں..

''تو پھر کوئی وقت نکالو تمہیں کھانا وانا کھلا دیں..''

اُن کی اس پُرخلوص دریا دلی پر اگرچہ مجھے ان کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں نے ذرا بھنا کر کہا ''جناب میں آپ کو جانتا تک نہیں تو آپ کس سلسلے میں مجھے کھانا وانا کھلانا چاہتے ہیں؟''

اُنہیں میرا یہ انداز قدرے گراں گزرا..اور ذرا حیرت میں بھی ہوئے اور کہنے لگے ''تم ہمیں نہیں جانتے ہم تو تمہیں جانتے ہیں ناں.. پاکستان سے تم جیسے ادیب اور شاعر آتے جاتے رہتے ہیں اور ہم لوگ انہیں کھانا وانا کھلاتے رہتے ہیں اور پلاتے بھی رہتے ہیں..ہم ادب نواز لوگ ہیں..تو پھر کوئی وقت نکالو..کچھ دوستوں کو جمع کریں گے.. محفل کریں گے تمہارے ساتھ..''

میں مبالغہ نہیں کر رہا لیکن وہ مسلسل مجھ سے تم تڑاک کرتے رہے اور میں جواب میں انہیں آپ جناب کرتا رہا..

''آپ کو ادب سے شغف ہے..ادیب ہیں؟''

''ناں جی..میں ادیب تو نہیں ہوں بس ادب نواز ہوں..ایک معمولی کاروباری ہوں تو کب آئیں گے کھانا وانا کھانے.. پلا بھی دیں گے..''

اُن صاحب کا کچھ دوش نہ تھا.. چلن یہی تھا.. انہوں نے اپنی شناخت کے حوالے سے یہ بھی کہا کہ کیا تم نے فلاں شاعر کا میرے بارے میں.. میری مہمان نوازی کے بارے میں کالم نہیں پڑھا.. ایسے لوگ ادب نواز کہلاتے ہیں اور میں نے اپنی ان گناہگار آنکھوں سے ایک کالم میں یہ پڑھا تھا کہ خواجہ صاحب.. یا قریشی صاحب کو اگرچہ ادب سے کچھ لگاؤ نہیں ہے لیکن انہوں نے میرے اعزاز میں نیویارک میں اپنے ریستوران میں ایک نہایت شاندار ضیافت کا اہتمام کیا کہ وہ ایک ادب نواز شخصیت ہیں..

یہاں میں ایک نہایت بصیرت افروز قصہ بیان کرنا چاہوں گا..

جب مجھے مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کی جانب سے مشتاق احمد یوسفی کی سربراہی میں قائم کردہ کمیٹی کے فیصلے کے مطابق تاحیات علمی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ عطا کیا گیا جو میرے لئے پرائڈ آف پرفارمنس ایسے سرکاری درباری اعزاز سے کہیں بڑھ کر تھا کہ کسی بھی انعام کی پرکھ یہ ہے کہ آپ سے پیشتر کون سی ادبی شخصیات کو اس سے نوازا گیا ہے تو ایک روز دوحہ میں عبدالمجید مفتاح کے ہمراہ میں اور میری بیگم ایک شاپنگ مال میں کچھ شاپنگ کرنے کی غرض سے گئے.. میرے پاس مقامی کرنسی کی کمی تھی تو میں نے مفتاح سے دریافت کیا کہ یہاں اس شاپنگ مال میں میں کہاں اپنے ڈالر تبدیل کروا سکتا ہوں..اس نے دس بیس ہزار پاکستانی روپوں کے برابر قطر کے درہم میری جیب میں ٹھونس کر کہا ''تارڑ صاحب..آپ جی بھر کے شاپنگ کیجیے.. بعد میں کرنسی تبدیل کروا لیجیے گا.''

بعد میں اپنے ڈالر تبدیل کروا کے جب میں نے مفتاح کو رقم واپس کرنے کی کوشش کی تو اس نے صاف انکار کر دیا ''تارڑ صاحب آپ ہمارے مہمان ہیں..یہ کیا کر رہے ہیں.''

''مفتاح بھائی..آپ کی محبت اور عنایت کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ یہ رقم قبول کر لیں..مجھ پر اللہ کا بہت فضل ہے..میں کوئی بھک منگا نہیں ہوں.''

اگلے روز مفتاح کا باریش اور نہایت گہری سوچ رکھنے والا بیٹا ہمیں دوحہ سے باہر ایک ریگستان میں لے گیا..اس نے کچھ باتیں کیں پاکستان سے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں..پھر مفتاح کے گھر میں ایک ضیافت کے دوران ان کی اہلیہ نے میری بیگم سے کہا کہ.. بہن جی آپ لوگوں کو پتہ نہیں کیا پرابلم ہے..ورنہ یہاں تمام نہیں اکثر ایسے ادیب اور شاعر آتے رہتے ہیں جو ہمارے پلّے سے شاپنگ کرتے ہیں بلکہ خود سے فرمائش کرتے ہیں کہ میرے بیٹے کو فلاں کمپنی کا میوزک سسٹم درکار ہے یا میری بیٹی کہہ رہی تھی کہ دوحہ سے فلاں برانڈ کا کمپیوٹر لے آئیے گا..اور ہم اپنی خوشی سے ان کی خواہشیں پوری کرتے ہیں تو آپ کو کیا پرابلم ہے..

چنانچہ ان صاحب کا کچھ دوش نہ تھا..چلن یہی تھا..

بے شک اس ریستوران میں شور و غوغا بہت تھا..سیڑھیوں پر بچھا ٹاٹ نما قالین نگار بہت تھا لیکن کھانا خوش ذائقہ اور خوش مہک تھا..

ریستوران کے منیجر یا ہیڈ ویٹر ایک دراز قامت گنجے پاکستانی تھے جو کوجیک کے سگے بھائی لگتے تھے وہ ہر میز پر لپکتے ہوئے آتے شُستہ امریکی انگریزی میں آپ کا حال چال دریافت کرتے کھانے کا آرڈر لکھتے اور اسی طرح لپکتے چلے جاتے..ایک کونے میں فرشی نشست کا اہتمام تھا جہاں کچھ صراحیاں دھری تھیں اور چند دیے روشن تھے..دو پاکستانی نوجوان قالین پر آلتی پالتی مارے ایک امریکی لڑکی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور ہماری جانب اکثر نظر کرتے تھے..

خالد ایک دھیما اور شاندار شخص تھا..ایسا تھا کہ چنگا بھلا انسان بھی بیمار ہو جانے کی آرزو کرے کہ یوں چیک اپ کروانے کے بہانے اس شخص کی قربت نصیب ہو جائے گی..اس کی دونوں بیٹیاں بھی ایک مدت سے ڈاکٹر ہو چکی تھیں..

میں اور خالد آس پاس کے ماحول اور شور سے منقطع ہو کر ایک ٹائم مشین میں بند ہو کر پچاس برس پیچھے سفر کر گئے..

''تمہیں ان زمانوں کا کیا کیا کچھ یاد ہے؟''

''مجھے تمہارا دھاریدار پاجامہ یاد ہے..تمہارا گورا رنگ اور خوش شکلی یاد ہے جس پر ہم مرمٹتے تھے..اور تمہاری خوش آوازی یاد ہے..''

وہ پھر شرمیلا ہو گیا..

''ماسٹر رفیق یاد ہے..''

''موصوف کسی بھی طالب علم کو زدوکوب کئے بغیر گھر نہیں جانے دیتے تھے..''

''اور ماسٹر نادر خان..ماسٹر رحمت خان..ماسٹر فیض الحسن..''

''میں نے تمہارے سسر ہیڈ ماسٹر عزیز صاحب سے بھی مار کھائی ہوئی ہے..''

وہ ہنسنے لگا..

''اور یار وہ..اسماعیل..اور نوازش..''

''اور شجاع..یاد ہے شجاع جو مر گیا تھا..''

شجاع ہمارا کلاس فیلو تھا اور اُس کی پوری زندگی ایک یونانی المیے سے بھی زیادہ ڈرامائی تھی..

میں انگلستان سے واپس آ کر چکے سے گوالمنڈی میں کسان اینڈ کمپنی کی دیکھ بھال

کرنے لگا.. وہ قریب ہی کہیں ریلوے روڈ پر رہتا تھا اور میرے ہاں آیا کرتا تھا. ٹخنوں سے اوپر پاجامہ.. مذہبی قیود میں گم اور بے حد تنگ نظر.. ان دنوں اتنی آزاد خیالی کا رواج نہ تھا جتنا آزاد خیال میں تھا.. مذہب اور معاشرے کے حوالے سے کہ تازہ تازہ یورپ سے آیا تھا.. شجاع میرے نظریات سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتا اور مجھے جہنم کی آگ میں جھلسائے جانے کی نوید دیتا.. یہاں تک کہ نظر اٹھا کر کسی خاتون کو دیکھنے کو بھی نظروں کا زنا قرار دیتا تھا.. پھر وہ میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے.. ایک دو برس میو ہسپتال میں گزار کر انگلستان چلا گیا.. بہت عرصے کے بعد واپس آیا تو نہ صرف مذہب سے یکسر منحرف ہو چکا تھا بلکہ مجھے قدامت پسند اور بنیاد پرست قرار دیتا تھا.. شنید تھی کہ وہ وہاں انتہائی ثروت مند ہو چکا ہے.. ایک کنٹری مینشن میں رہائش پذیر ہے اور صرف رولز رائس میں سفر کرتا ہے اور وہ بھی شوفر کے ساتھ!

پھر خبر آئی کہ وہ مر گیا ہے..

اور ساتھ ہی یہ خبر آئی کہ وہ زندہ ہو گیا ہے..

'مرنے' سے پیشتر جب وہ پاکستان آیا تو خاص طور پر مجھے ملنے کے لیے آیا تھا لیکن موت کے بعد مرنے کا منظر دیکھ کر جب وہ پھر سے زندہ ہوا تو دوبارہ ملاقات نہ ہوئی..

میں نے اور خالد نے اس نشست کے دوران شجاع کی زندگی کے ٹکڑے جوڑ کر اس کی تصویر مکمل کی.. کچھ ٹکڑے میرے پاس تھے اور بہت سے ٹکڑے خالد کی یادداشت میں محفوظ تھے..

وہ دل کے امراض کا ایک ماہر.. ایسا ہنرمند کہ ایک دنیا اس کی قابلیت کا اعتراف کرتی تھی.. اسے انجائنا کا معمولی سا درد ہوا اور وہ اپنے ہی ہسپتال میں صرف اس لئے داخل ہو گیا کہ اسی بہانے کچھ آرام کر لے کہ آس پاس اس کا سٹاف اور جونیئر ڈاکٹر تھے.. ایک شب یکدم اسے دل کا شدید اور جھٹکے دار دورہ پڑا.. اس لمحے اس کے قریب جو نرس تھی اس نے اسے ایک ماہر قلب ہونے کی حیثیت سے کہا کہ تم فوری طور پر مجھے فلاں انجکشن لگا دو کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہو رہا ہے.. وہ نرس ٹس سے مس نہ ہوئی اور کہنے لگی.. سر آپ بے شک ایک ہارٹ سپیشلسٹ ہیں لیکن اس وقت آپ ایک مریض کی حیثیت میں اس ہسپتال میں داخل ہیں اور رولز کے مطابق آپ جن ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج ہیں جب تک وہ مجھے ہدایت نہ کریں میں آپ کو انجکشن نہیں لگا سکتی..

اور یوں شجاع فوت ہو گیا..

جی ہاں.. جسے بروقت طبی امداد کہتے ہیں اس کے نہ ملنے پر باقاعدہ فوت ہو گیا.. کمپیوٹر سکرین پر اس کے دل کی حرکت کی جو لکیر ایک کینچوے کی مانند کبڑی ہو کر چلتی تھی وہ ہموار ہو گئی کہ خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں.. اس دوران ہسپتال میں بھگدڑ مچ گئی اور شجاع کا علاج کرنے والے انچارج ڈاکٹر صاحب بھی موقع واردات پر پہنچ گئے.. اور جب انہوں نے سکرین پر اپنے پیارے کولیگ کے دل کی حرکت کو ایک ہموار صورت میں بہتے پایا تو ان پر فوراً ایک آخری حربہ آزمایا.. یعنی سینے پر وہ ایک تکیہ نما شے رکھ کر اُسے بجلی کے شدید دھچکے دیئے.. متعدد جھٹکے دینے پر شجاع کا دل رکا رہا اور پھر ایک آخری جھٹکے کی شدت سے سکرین پر ہموار لیٹی لکیر نے ذرا سا سر اٹھایا اور شجاع صاحب موت کا منظر خاصی دیر تک ملاحظہ کرنے کے بعد پھر سے زندہ ہو گئے.. بقول خالد اس نے ہوش میں آتے ہی پہلا فقرہ یہ کہا کہ.. ڈیم اٹ تم نے تو مجھے تقریباً مار ہی دیا تھا..

شجاع نہیں جانتا تھا کہ وہ تقریباً نہیں مکمل طور پر مر چکا تھا..

یہ مرگ کہانی اب آگے بڑھتی ہے..

شجاع نے مکمل طور پر صحت مند ہونے کے بعد اپنے کیس کی تشخیص کرنے کی غرض سے کمپیوٹر میں محفوظ اپنے دل کی واردات دیکھی.. ایک مدوجزر کی کیفیت دیکھی کہ یہ ابھی رواں ہے اور ابھی رک گیا ہے اور اس کے بعد اُس لمحے متحرک ہوا ہے جب صرف ایک اور لمحے کے بعد موت اس کے دماغ تک پہنچ کر اسے بھی مردہ کر دیتی.. یہ پل دو پل کا کھیل تھا.. ایک اور پل اور آج کے دن اس کا دسواں ہوتا.. شجاع ہراساں ہو گیا.. ڈر گیا.. کہ اس پر چند ساعتیں ایسی گزری تھیں جب وہ مر چکا تھا.. تو ان ساعتوں میں کیا ہوا تھا.. وہ کہاں تھا.. اس کی روح اسے چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھی اور پھر واپس آئی یا اس نے کچھ انتظار کیا.. ان خیالوں نے اسے لرزہ براندام کر دیا.. وہ ہمہ وقت یہی سوچتا رہتا کہ اس پر کیا گزری تھی.. زندگی کیا ہے.. موت کیا ہے اور کیا خدا ہے.. یا نہیں ہے وہ اسی ادھیڑ بُن میں رہتا.. وہ معمول کی زندگی میں واپس نہ آ سکا اور یہ بھی شنید ہے کہ اس نے ایک لمبی سی داڑھی رکھ لی اور بے حد مذہبی ہو گیا..

''اور شجاع..؟'' خالد اور میں وقت کے غار میں جب بہت پیچھے تک سفر کر چکے تھے تو ہم میں سے جانے کس نے پوچھا.. اور شجاع؟

''وہ اب ہمیشہ کے لیے مر گیا ہے.. کچھ عرصہ بعد اسے ایک اور ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ

دوبارہ زندہ نہ ہو سکا اور بالآخر واقعی مر گیا..''

لیکن ہم دونوں ابھی زندہ تھے..

نیویارک کی ایک شب میں.. جیکسن ہائٹس میں ایک پُرشور بوسیدہ ریستوران میں.. اور چراغوں کی روشنی میں دو نوجوان لڑکے اور ایک سانولی رنگت کی پرکشش لڑکی.. ہم تو ابھی مرے نہیں تھے.. زندہ تھے.. اگرچہ ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ ہمارا کلاس فیلو شجاع مرنے کے بعد دفن کہاں ہوا تھا لیکن کسے پرواہ تھی.. جو زندہ ہوتے ہیں وہ مُردوں کی پرواہ کرنے لگ جائیں تو خود بھی مُردہ ہو جائیں.. میں نے نہایت دقّت سے موضوع بدلنے کی کوشش کی ''خالد میں نے پاکستانی اخباروں میں پڑھا تھا کہ تم نے ہندوستان کے صدر کا گردوں کا آپریشن کیا تھا اور ہمارے ہاں بہت واویلا کیا گیا تھا کہ ایک پاکستانی مسلمان ڈاکٹر نے کیوں ایک ہندوستانی اور ہندو کا آپریشن کیا اور ملک و قوم کے ساتھ غداری کا مرتکب ہوا.. یہاں تک کہ یہ سوال پارلیمنٹ میں بھی اٹھایا گیا تھا تو اصل قصہ کیا تھا؟''

خالد کی شرماہٹ رخصت ہو گئی اور اس کی جگہ سنجیدگی اور بیزاری اس کے چہرے پر نقش ہونے لگی ''مستنصر.. تم مائنڈ نہ کرنا لیکن تم.. پاکستانی ذہنی طور پر بیمار ہو.. اور اپنی بیماری پر فخر بھی کرتے ہو.. میں بے شک پاکستان میں پیدا ہوا لیکن اب میں پچھلے اڑتیس برسوں سے امریکی ہوں.. ایک ڈاکٹر ایک دینی مدرسے کا تنگ نظر طالب علم یا ایک جہادی تنظیم کا رکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مریض سے پہلے یہ دریافت کرے کہ وہ کون سے عقیدے اور مسلک ہے اور پھر اس کا علاج کرے یا مرنے کے لیے چھوڑ دے.. ایک ڈاکٹر کا کوئی مذہب نہیں ہوتا..''

''ہاں.. جب ایک پوپ شدید بیمار ہوا تھا تو اُس نے اپنے عیسائی معالجوں پر اعتبار نہ کیا تھا اور قرطبہ کے ایک نامور مسلمان حکیم سے علاج کروانے کی خواہش کی تھی.. اور ان حکیم نے فوری طور پر اپنا بوریا بستر باندھ کر روم کا سفر اختیار کیا تھا اور پوپ کو صحت یاب کر دیا تھا..''

خالد مسکرانے لگا ''میں تاریخ سے اتنا آگاہ نہیں ہوں لیکن اب تم فیصلہ کر لو کہ آج سے ایک ہزار برس پیشتر اندلس کے مسلمانوں میں وسعت نظری کیسی تھی اور آج کے پاکستان میں تم کیسے ہو.. میں نے ہندوستان کے صدر کا نہیں بلکہ تامل ناڈو کے نہایت پاپولر اداکار اور وزیراعلیٰ کا آپریشن کیا تھا.. اسے ایک خصوصی طیارے میں نیویارک لایا گیا تھا نیم بے ہوشی کی حالت میں اور

میں نے اس کا آپریشن کیا.. اور اس دوران تامل ناڈو میں الیکشن ہو رہے تھے اور وہ وزیراعلیٰ متعدد حلقوں سے اس غیر حاضر کیفیت میں انتخاب لڑ رہا تھا.. مخالف جماعتوں نے حتمی طور پر دعویٰ کیا کہ وہ تو نیویارک میں مر چکا ہے اور یہ الیکشن محض ڈھونگ ہیں.. اس دوران ہندوستانی کونسل جنرل خصوصی طور پر مجھے ملنے کے لیے آیا اور اس نے صرف یہ پوچھا کہ ڈاکٹر بٹ آپ ہمیں یہ بتا دیجیے کہ کیا وہ زندہ ہے یا نہیں.. میں نے اسے بتایا کہ فی الحال اس کا سانس چل رہا ہے.. مختصر یہ کہ وہ پھر سے وزیراعلیٰ منتخب ہو گیا اور پھر کچھ برس زندہ رہا.. جب کہ اصولی طور پر اسے بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا..''

ایمن ہماری گمشدگی سے بیزار ہو چکا تھا..

ہم دونوں وقت کی غار میں سفر کرتے گزرے زمانوں میں چلے گئے تھے اور اسے ساتھ لے کر نہیں گئے تھے..

وہ ہماری طویل گفتگو سے اکتا چکا تھا..

اور یوں بھی اس کا مسئلہ ہری مرچ تھا..

اُس نے کھانے کے دوران گنجے کوجیک سے درخواست کی تھی کہ اسے نہایت کڑوی ہری مرچیں درکار ہیں جن کے بغیر وہ کھانا نہیں کھا سکتا..

فوری طور پر اُس کی خدمت میں ہری مرچوں سے لبریز ایک طشتری پیش کی گئی اور ایمن انہیں کچر کچر چبا گیا اور پھر منہ بسور کر بولا ''یہ خفیف سی کڑوی ہیں بہت نہیں.. مجھے نہایت زہریلی ہری مرچیں درکار ہیں''

جب مزید کڑوی مرچیں فراہم کی گئیں تو وہ بھی ایمن کی کڑواہٹ کے معیار پر پوری نہ اُتریں.. اور وہ بڑبڑاتا اپنی زندگی کو کوستا منہ بسورتا رہا.. اس نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے گھر کے باغیچے میں جانے کہاں سے کوئی خاص بیج حاصل کر کے نہایت ہی زہرناک مرچوں کی ایک کیاری اگا رکھی ہے.. ایسی مرچیں جو تن بدن میں آگ لگا دیتی ہیں اور ہر اس مقام پر لگتی ہیں جہاں مرچوں کو لگنا چاہیے اور وہ اپنے گھر میں ڈائننگ ٹیبل پر ان خصوصی آتش پرست مرچوں کے بغیر نہیں بیٹھتا..

کچھ روز بعد اس آتش پرستی کی تصدیق ہو گئی.. وہ واقعی نہیں بیٹھتا تھا اور اس کا جو بھی

مہمان اس کے کہنے میں آ جاتا تھا اور یہ مرچیں کھا لیتا تھا تو پھر وہ بیٹھ نہیں سکتا تھا فائر بریگیڈ کو اطلاع کرتا تھا کہ کوئی ہے جو آ کر یہ آگ بجھائے..

ابھی ہم وقت کی سرنگ میں داخل ہو کر پچاس برس پیچھے اگر سفر کر گئے تھے تو ہم گردش ایام کو لمحۂ موجود سے ذرا آگے بھی تو دوڑا سکتے ہیں.. یعنی ایک فلیش فارورڈ بھی تو کر سکتے ہیں..

اور جب ہم وقت کی سُرنگ میں ذرا آگے چلے جاتے ہیں تو کہاں ہوتے ہیں! ایمن کے لونگ آئی لینڈ والے پر سکون اور دل کش منظروں والے گھر میں جہاں اس نے میرے لئے ایک دعوت کا اہتمام کر رکھا ہے.. اور میں وہاں صرف ایک مرچ کھا کر نیو یارک فائر بریگیڈ کو اطلاع کرنے کی سوچ رہا ہوں کہ وہ آئے اور آگ بجھائے..

ایمن کے گھر تک مجھے ایک ''برخوردار'' نے پہنچایا ورنہ میں کہاں پہنچنے والا تھا..

اس نے مجھے اطلاع کی تھی کہ اس کا ایک برخوردار مجھے براڈوے سے پِک کرے گا اور آل دے وے لونگ آئی لینڈ لے جائے گا.. میرے من کو اس کی اس اطلاع نے کچھ رنجور سا کر دیا کہ میں اس نوعیت کے برخورداروں سے بہت الرجک ہوں جو نہایت مؤدب' فرمانبردار اور شریف ہوں.. ایک ایسے برخوردار کی رفاقت میں لوگ آئی لینڈ تک کا طویل سفر کرنا یقیناً دل کو اکتاہٹ سے دوچار کر سکتا ہے لیکن جب وہ برخوردار آیا تو اس کی شکل سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی برخورداری کے زمانے ایک مدت سے بیت چکے تھے.. وہ ایک مونچھوں والا درمیانی عمر کا شخص تھا اور حماد خان تھا.. شاعری کرتا تھا اور بعد میں کھلا کہ مقامی اخباروں میں نہایت اثر انگیز کالم بھی لکھتا تھا.. اس کی کار بھی اسی کی عمر تھی اگرچہ نَٹ کھٹ تھی یعنی اس کے اکثر نَٹ کھٹ کھٹ کرتے تھے..

کار میں سوار ہو کر میں نے پہلا سوال یہ پوچھا کہ کیا میں یہاں سگریٹ پی سکتا ہوں تو اس نے نہایت برخورداری سے جواب دیا کہ سائیں یہاں آپ سب کچھ پی سکتے ہیں..

اس اجمال کی تفصیل جاننے کا چنداں فائدہ نہیں کہ میں نے اس کی اس پیشکش سے کچھ فائدہ اٹھایا یا نہیں..

ایمن کے گھر میں بہت اہتمام تھا.. ایک ڈاکٹر جوڑا تھا' ایک مقصود جعفری تھے اور ایک شوکت فہمی تھا اور انواع و اقسام کے کھانے تھے جن میں سے کچھ کی نوعیت اور قسم کے بارے میں صرف اس کی بیگم شائستہ واقف تھی کہ وہ اس کے تیار کردہ تھے اور گھر کے ذائقے والے تھے..

اگرچہ ایمن کا گھر یہ تھا لیکن اس کا بسیرا مین ہاٹن کی قربت میں ایک فلیٹ میں ہوتا تھا.. موصوف ہفتے کے پانچ روز معلم کے فرائض سرانجام دیتے تھے اور اس فلیٹ میں راتیں گزارتے تھے.. ہفتہ اتوار لونگ آئی لینڈ کے گھر کے لیے مخصوص تھا..

ملاحظہ کیجیے کہ یہ کیسا سہانا بندوبست ہے.. بندہ پانچ راتیں اپنے ذاتی فلیٹ میں تنہا گزارے اور پھر دو دن اپنے بال بچوں' پوتے پوتیوں سے بھرے گھر کے لیے وقف کر دے..

البتہ ایمن میں ایک قباحت تھی کہ نہ تو وہ ناؤنوش کا شوقین تھا یعنی گلابی رنگ بھی اگر پسند کرتا تھا تو پانی کا نہیں شیروانی کا.. اور نہ ہی صنف نازک کا رسیا تھا تو یوں ذاتی فلیٹ میں الگ سے رہائش کرنے کا فائدہ.. اسے کہتے ہیں کار لا حاصل.. تنہائی کا ضیاع.. سہانا بندوبست تو تب ہوتا جب سہانی چیزوں کا بندوبست بھی ہوتا.. بہر حال شریف آدمی اور گلابی شیروانیاں پہننے والے شاعر یونہی عمر عزیز کو ضائع کرتے ہیں..

لیکن یہ سب کچھ.. ایمن کا گھر اور اس کی شاندار ضیافت تو ابھی مستقبل میں کہیں تھی اور میں نے ذرا فلیش فارورڈ کر لیا تھا تو اب پھر واپس آتے ہیں.. حال میں آ جاتے ہیں.. اور اس حال میں مجھے اپنے زمانوں کا وہ گیت یاد آ رہا تھا جو سنہری بالوں والی ماہی مُنڈا اڈورس ڈے نے گایا تھا کہ... کِے سرا سرا.. جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا.. مستقبل ہمارے دیکھنے کے لیے نہیں ہے.. جو ہونا ہے ہو جائے گا.. کِے سرا سرا..

جو ہونا ہے ہو جائے گا..

میں پچاس برس بعد خالد محمود بٹ کو نیو یارک میں ملوں گا..

شجاع مر جائے گا..

اور خالد مجھے اُس شب کے بعد براڈوے سٹریٹ چھوڑنے کے لیے جا رہا ہو گا اور کہہ رہا ہو گا کہ.. مستنصر مجھے ماضی میں لے جانے کا شکریہ!

اور میں اُسے کہہ رہا ہوں گا.. اس ماضی میں تم بھی تھے اور مجھے تم پر فخر ہے..

اور اُس کے گورے چٹے چہرے پر جو چند شکنیں ہیں عمر کی.. وہ زائل ہو جائیں گی اور اس کے بال سیاہ اور گھنے ہو جائیں گے اور اس کے لبوں پر وہی شرمیلی مسکراہٹ تیرنے لگے گی اور وہ مجھے دنیا کے ایک اہم ترین سرجن کی بجائے پھر سے ایک نوخیز دوست دکھائی دینے لگے گا جو

مسلم ماڈل سکول کی گراؤنڈ میں جمع ہم طالب علموں کے سامنے "لب پہ آتی ہے دعا.." گایا کرتا تھا اور ہم اس کی ہم نوائی کیا کرتے تھے..

کون جانے کب کسی کمپیوٹر سکرین پر ہمارے قلب کی حرکت کی لکیر یکدم ہموار ہو جائے تو جب تک وہ کُبڑی ہوتی رینگتی جا رہی ہے اور ہمارے زندہ ہونے کی نوید دے رہی ہے تب تک ہم کیوں نہ زندگی کے اس تحفے سے لطف اندوز ہوں کہ.. جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا... کے سِرا سرا....!



"آپرا کے بھوت سے ملاقات"

زمانہ... نیویارک میں قیام کے آخری دنوں میں سے ایک..

مقام... براڈوے سٹریٹ..

جگہ... میجسٹک تھیئٹر..

کھیل.. "فینٹم آف دی آپرا"..

میں ایک طویل قطار میں کھڑا تھیئٹر کے اندر جانے کا انتظار کر رہا تھا..

یہ کھیل "فینٹم آف دی آپرا" اسی میجسٹک تھیئٹر میں روزانہ پچھلے اٹھارہ برس سے کھیلا جا رہا تھا اور میں اس برس آیا تھا..

صرف میں تھا اس طویل قطار میں جو ایک سیاہ قمیض اور کارڈرائے کی جین ایسے عامیانہ پیراہن میں تھا اور دیگر تمام منتظر تماشائی اپنی وارڈروب کے مہنگے ترین لباسوں میں آراستہ تھے..

یورپ اور امریکہ میں تھیئٹر جانا آپ کے ذوقِ جمال کا آئینہ دار ہوتا ہے اور آپ یوں بن ٹھن کر جاتے ہیں جیسے کسی شاہانہ دعوت میں شریک ہونے کے لیے جا رہے ہیں..

خواتین ہمیشہ انتہائی نیچی گردن یعنی لونیک کے لباس زیب تن کرتی ہیں جو گردن سے نیچے وہاں جا کر شروع ہوتے ہیں جہاں سے ایک گرہ نیچے مقامات آہ و فغاں کی واضح نشانیاں عریاں ہو جاتی ہیں.. اور اگر آپ خوش بدن ہیں تو کیوں نہ اس بدن کی آخری سرحد پر مجبوراً ٹھہر کر دوسروں کو حسد میں مبتلا کیا جائے.. اور مرد حضرات ایسے جیسے کسی جنازے میں شرکت کرنے کے لیے آئے ہیں.. سیاہ سوٹوں اور بو ٹائیوں میں گردنیں اکڑائے ہوئے..

ایک میوزیم کی مانند ایک تھیئٹر کے باہر قطار میں کھڑے ہونا بھی آپ کے ثقافتی ہونے

کی دلیل ہے.. یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی پرورش میں ذوقِ جمال کا خاص خیال رکھا گیا ہے.. چنانچہ اس طویل قطار میں کھڑے لوگ ہرگز اندر جانے کے لیے بے چین اور مضطرب نہ تھے کہ وہ یوں براڈوے سٹریٹ میں میجسٹک تھیئٹر کے باہر دیکھے جانا چاہتے تھے..

وطن میں جب کبھی براڈوے سٹریٹ کا تذکرہ ہوتا تھا تو ہرگز یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ تو شیطان کی آنت کی طرح چلی جاتی ایک ایسی سٹریٹ ہے جو شروع ہوتی ہے تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی.. آدھے نیویارک میں سے گزرتی بالآخر ختم ہوتی ہے تو سمندر میں جا گرتی ہے.. تب یہی خیال تھا.. براڈوے کی تصویر یہی تھی کہ وہاں ہر سو کھیل دکھائے جاتے ہیں.. تھیئٹر ہیں اور آپرا ہاؤس ہیں جن کی شہرت کل جہان میں ہے.. چنانچہ نیویارک میں میری ایک ترجیح یہ بھی تھی کہ بہر صورت براڈوے کے کسی تھیئٹر میں کوئی سا بھی کھیل دیکھنا بہر صورت ہے.. کہ میں بھی کسی زمانے میں کھیل کھیلا کرتا تھا اور لکھا کرتا تھا..

پر یہ کوئی آسان کام نہ تھا.. جان جوکھوں کا کام تھا کہ براڈوے کے تھیئٹروں کے ٹکٹ اتنے مہنگے تھے کہ جان جاتی تھی.. یعنی ڈیڑھ دو سو ڈالر.. اپنے پاکستانی دس بارہ ہزار روپے خرچ کر کے محض ایک تماشا دیکھ لینا تو ہم مومنین کے لیے اتنا مفید نہ تھا.. لیکن سلجوق کی زنبیل میں نیویارک کے رموز و اسرار پا جانے والے ایک باسی کی حیثیت سے اس مسئلے کا بھی ایک حل تھا.. جیسا حل اس نے میٹروپولیٹن میں صرف ایک ڈالر خرچ کر کے داخل ہو جانے کا تلاش کر لیا تھا..

ٹائمز سکوائر کے درمیان میں ٹی کے ٹی ایس نامی تنظیم کا ایک کھوکھا سا تھا جو رضاکارانہ طور پر تھیئٹر کے اداکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں تھا.. یہاں براڈوے پر دکھائے جانے والے تمام کھیلوں اور آپراز کے شوز کے لیے فروخت ہو جانے والے ٹکٹوں کی لحہ بہ لحہ صورت حال کمپیوٹر کی سکرین پر ظاہر ہوتی جاتی تھی.. چنانچہ جہاں کہیں کسی بھی تھیئٹر یا آپرا ہاؤس میں کچھ نشستیں خالی رہ جاتی تھیں، تو ان کے لیے ٹکٹ نصف قیمت پر فروخت کر دیئے جاتے تھے..

لیکن ان رعایت شدہ ٹکٹوں کا حصول بھی ایک اور جان جوکھوں کا کام تھا..

میں دو مرتبہ فلیٹ سے صرف اس نیت سے نکلا کہ آج تو بہر طور میں نے ٹکٹ کا لہو لگوا کر تھیئٹر کے شہیدوں میں شامل ہونا ہے.. اور وہاں ہر مرتبہ کھوکھے سے شروع ہوتی شائقین کی قطار اتنی طویل ہوتی تھی کہ ٹائمز سکوائر میں سے اُڈتی ہوئی کسی بغلی گلی میں گم ہوتی جا رہی تھی.. اور

آج جب کہ میں جانے کہاں کہاں سے دھکے کھا کر اور کیا کیا دیکھ کر سلجوق کے فلیٹ کی جانب سفر کرتا ٹائمز سکوائر کے سٹیشن پر اُتر کر اگلی گاڑی میں سوار ہونے کی خاطر بھاگ دوڑ کر رہا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس ٹی کے ٹی ایس کے کھوکھے کے سامنے محض دو چار درجن افراد قطار بنائے کھڑے ہیں تو میں نے موقع غنیمت جانا اور ان میں جا شامل ہوا..

اب میں ایک اور بیہودہ سی تمنا کا اظہار کرنا چاہتا ہوں.. میرے دل میں ایک عرصے سے یہ خواہش بھی پنہاں تھی کہ میں نیویارک کے میٹروپولیٹن آپرا ہاؤس میں کوئی بھی کلاسیکی آپرا دیکھوں.. اور وہاں کیسے کیسے مشہور زمانہ آپرا سٹیج ہوتے تھے.. ایسے آپرا کھیل جن کے ناموں سے ہم جیسے لوگ بھی ایک مدت سے آشنا تھے.. ’’ٹائم‘‘ اور ’’نیوز ویک‘‘ میں ’’نیویارک ٹائمز‘‘ اور لنڈن کے صرف ’’ٹائمز‘‘ کے صفحوں پر ہم ان کے تذکرے پڑھتے آئے تھے.. ایسے آپرا جن سے بہت شناسائی تھی یہاں تک کہ ان کی کہانیوں سے بھی خوب واقف تھے بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ کس مشہور آپرا میں کون سا گلوکار گاتا تھا.. جیسے ’’آئیڈا‘‘ سے کون واقف نہیں ہے.. ’’رومیو اینڈ جیولیٹ‘‘، ’’ڈان پاسکل‘‘، ’’این امریکن ٹریجڈی‘‘، ’’سیمسن اینڈ ڈلائلہ‘‘، ’’سیرانو ڈی برگراک‘‘.. جی ہاں وہی انتہائی لمبی ناک والا سیرانو.. اور سب سے دل آویز ’’کارمن‘‘ جس میں اندلس کے خون کی وحشت اور خوبصورتی ہے..

لیکن ایسے کلاسیکی آپرا دیکھنے کی کاوش میں دو چار سخت مقام آتے ہیں..

ایک مقام ٹکٹوں کی قیمت کا.. دو چار سو ڈالر کا..

اور دوسرا مقام جو واقعی سخت ہے یعنی آپ ایک زرِ کثیر کو آگ لگا کر وہ ٹکٹ خریدتے ہیں اور صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ایک انتہائی بلند ذوق کے مالک شخص ہیں تو وہ سخت مقام یہ ہے کہ آپ کو وہ آپرا دیکھنا بھی پڑتا ہے.. چونکہ آپ مشرقی ہیں اور مغرب کی اس نہایت شدید اور بنیاد پرست موسیقی کے رموز سے آگاہ نہیں ہیں اس لیے آپ پر قیامت ٹوٹ پڑے گی.. آپ کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے کہ آپرا گلوکار گلا پھاڑ کر یوں گاتے ہیں کہ آپرا ہاؤس کے پردے لرزش میں آ جاتے ہیں اور باہر سڑک پر سے گزرنے والی بگھیوں میں جُتے گھوڑے بدکنے لگتے ہیں اور جو گلوکارائیں ہوتی ہیں وہ منہ کھول کر اتنے دل دوز انداز میں چیخیں مارتی ہیں کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے..

اور اس کے باوجود آپرا کے اتنے مہنگے ٹکٹ کم از کم دو چار ہفتے پہلے سے ایڈوانس خریدنے پڑتے ہیں..

چنانچہ میں نے آپرا دیکھنے کی تمنا کو تیاگ دیا اور صرف ایک کھیل.. براڈوے کی سٹیج پر کھیلا جانے والا کوئی بھی کھیل دیکھنے کی خواہش کی آبیاری کی..

کون سا کھیل..؟

اس سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا کہ کون سا کھیل.. شرط صرف یہ تھی کہ وہ براڈوے پر کھیلا جا رہا ہو.. ویسے میں نے اس موضوع پر مناسب ہوم ورک کر رکھا تھا اور جانتا تھا کہ ان دنوں میوزیکل ''شکاگو'' اور ''لائن کنگ'' سب سے زیادہ رش لے رہے تھے.. ان کے علاوہ اہم کھیلوں میں ''لائٹ ان دی پیازا''، ''وومن اِن وہائٹ''، ''فینٹم آف دی آپرا'' اور ''چٹی چٹی بینگ بینگ'' کی بہت شہرت تھی.... میوزیکل گروپ ایباز کے گیتوں پر مبنی کھیل ''مامامیا'' کو بھی پسند کیا جا رہا تھا..

میں جب ٹی کے ٹی ایس کے کھوکھے کی کھڑکی کے قریب ہوا تو ایک جاپانی سیاح لڑکی کھڑکی کے پیچھے کھڑی ایک موٹی سی خاتون کے ساتھ نہایت واجبی بلکہ ابتدائی انگریزی میں کچھ مذاکرات کر رہی تھی اور اس کی دو سہیلیاں کان لگائے ان مذاکرات کے نتائج سننے کی کوشش کر رہی تھیں..

''لائن کنگ.. پلیز.. ہاؤ مچ..؟''

''لائن کنگ اگلے دو ماہ کے لیے مکمل طور پر بک ہو چکا ہے.. اس کے ٹکٹ نہیں مل سکتے..''

''سوری..'' جاپانن کے پلّے اتنی ثقیل انگریزی نہ پڑی..

''نو لائن کنگ..'' موٹی عورت نے سر ہلا کر کہا..

''وہائی..؟''

''اینڈ وہائی ناٹ..'' وہ عورت ذرا بھنا گئی.. ''لائن کنگ.. نو ٹکٹ.. نو..''

''شکاگو..؟'' جاپانن نے زور زور سے سر ہلایا اتنے زور سے کہ اس کی پونی ٹیل دیر تک ہلتی رہی ''شکاگو ٹکٹ..؟''

''ہاں تمہیں اس کھیل کے سستے ٹکٹ مل سکتے ہیں.. یعنی صرف نوّے ڈالر.. او کے..؟''

''نو نو.. ہمیں رعایتی ٹکٹ چاہیے..''

''بے بی.. یہی رعایتی ٹکٹ ہے جس کی اصل قیمت دو سو ڈالر ہے..''

''ہم تین ہیں.. ہاؤ مچ..؟''

''دو سو ستر ڈالر..''

''نو.. ٹو مچ.. میں انتظار کرتی ہوں..''

وہ مایوس ہو کر ایک جانب ہو گئی.. ایسا ہوتا ہے کہ کسی کھیل کی پرفارمنس شروع ہونے سے پیشتر جو چند نشستیں خالی رہ جاتی ہیں فوری طور پر کمپیوٹر کی سکرین پر خبر آ جاتی ہے کہ ان کے ٹکٹ معمولی قیمت پر حاصل کیے جا سکتے ہیں اور وہ ٹکٹ خرید کر آپ کو مطلوبہ تھیئٹر تک بروقت پہنچنے کے لیے ایک اولمپک سٹائل کی ڈیش لگانی پڑتی ہے..

جب تک میں کھڑکی تک پہنچا وہ جاپانی لڑکی دو بار پوچھ چکی تھی کہ.. اب ''شکاگو'' کے لیے کتنے ڈالر اور وہاں سے وہی جواب آتا کہ اب بھی نوّے ڈالر..

میری باری آئی تو میں نے ایک نہایت معصوم سی درخواست پیش کر دی ''مجھے براڈوے کے کسی بھی کھیل کا.. جو سب سے کم قیمت ٹکٹ ہے وہ عنایت کر دیجیے.. کتنے کا..؟''

خاتون نے تین چار کھیلوں کے نام گنوائے ''تیس ڈالر.. ان میں سے کسی کا بھی ٹکٹ خرید لو..''

مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کیونکہ میں ذہنی طور پر ساٹھ ستر ڈالر خرچ کر دینے کی نیت سے آیا تھا ''آپ نے تیس ڈالر ہی کہا ہے ناں..؟''

''ہاں.. جلدی کرو.. کون سا کھیل..؟''

اس کے بیان کردہ کھیلوں میں ''فینٹم آف دی آپرا'' نہ صرف ایک شناسا نام تھا بلکہ کئی برسوں سے میں اس کا تذکرہ سنتا آتا تھا..

ٹکٹ پر درج تھا.. 16 اکتوبر 2005ء.... شام آٹھ بجے... قطار... ای.. نشست نمبر 13.... میجسٹک تھیئٹر...

تھیئٹر کے دروازے کھلے اور ہم اندر داخل ہوئے تو ایک نہایت بدتمیز باوردی دربان نے ہر تماشائی کے ٹکٹ پر سرسری نظر کرتے ہدایت کی کہ تم... اِدھر جاؤ.. تم اُدھر جاؤ.. میں نے پوچھا

کہ میں کدھر جاؤں تو وہ ظالم بولا.. ’’تم کہیں بھی چلے جاؤ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا..‘‘ یہ بے رُخی صرف اس لیے تھی کہ میرے پاس شاید اس شب کا سستا ترین ٹکٹ تھا.. پھر وہ ہنس کر بولا..

’’اوکے.. تم ان سیڑھیوں سے اوپر جاؤ.. جاتے رہو.. اور وہاں تک جاتے رہو جہاں سے تھیٹر کی چھت شروع ہو جاتی ہے..‘‘

میجسٹک تھیٹر جانے کس صدی میں تعمیر ہوا تھا.. اور اسے تب سے جوں کا توں رہنے دیا گیا تھا کہ ثقافتی ورثے کی حفاظت کا معاملہ تھا.. جس تھیٹر میں صرف ایک کھیل ہی ’’فینٹم آف دی آپرا‘‘ پچھلے اٹھارہ برس سے چل رہا تھا وہ جانے کب سے تھا.. یہ ایک بوسیدہ ماحول اور قدامت کی اور زوال کی مہک والا تھیٹر تھا اور شاید اس کی پہچان بھی یہی تھی..

میں اپنا ٹکٹ سینے سے لگائے پُرپیچ اور تہہ در تہہ قالینوں میں دفن سیڑھیوں پر قدم رکھتا اوپر چڑھتا گیا‘ یہاں تک کہ اوپر چڑھنے کو اور کچھ باقی نہ رہا کہ اس کے آگے تھیٹر کی چھت شروع ہو جاتی تھی.. مجھے دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا کہ میری نشست اس تھیٹر کی سب سے آخری اور بدترین نشست تھی.. وہاں براجمان ہو کر سامنے دیکھتا ہوں تو سامنے کچھ بھی نہیں.. کہ میں تو چھت سے لگا بیٹھا ہوں اگرچہ یہ ایک منقش اور دیدہ زیب چھت تھی.. البتہ میں ذرا آگے ہو کر بمشکل جھانکتا ہوں تو بہت گہرائی میں بہت دور کہیں سٹیج کا پردہ نظر آ رہا ہے..

ظاہر ہے تیس ڈالر میں تو ایک ایسی نشست ہی دستیاب ہو سکتی تھی وہ جو سٹیج کے عین سامنے بنے ٹھنے بیٹھے تھے‘ جانے کتنی جائیدادیں فروخت کر کے اُن نشستوں کے حقدار ہوتے تھے..

لیکن ابھی عشق کے امتحاں اور بھی تھے.. میرے آگے کی نشستوں پر ایک جاپانی جوڑا آ بیٹھا.. جاپانی صاحب بدقسمتی سے اپنی نسل کے معمول کے قد سے دوگنے بلند تھے.. چنانچہ مجھے تھوڑا بہت سٹیج جو نظر آتا تھا اس کے آگے بھی یہ دیوار کھڑی ہو گئی.. اگر میں ذرا دیوار کے ساتھ لگ جاتا تو سٹیج کا ایک کونہ بمشکل نظر آنے لگتا.. علاوہ ازیں وہ جاپانی ٹِک کر نہ بیٹھتا تھا بلکہ جھومتا رہتا تھا اور میں کھیل کے دوران کچھ دیکھنے کی سعی میں اسی انداز میں دائیں بائیں جھومتا رہتا تھا.. اور اس دوران مزید دشواری یہ ہوتی کہ وہ دراز قد جاپانی اپنی پستہ قد محبوبہ کو جھک کر کبھی کبھار چوم لیتا..

’’فینٹم آف دی آپرا‘‘ 1911ء کے زمانے کے پیرس کے ایک آپرا ہاؤس کا ڈرامہ ہے.. اس آپرا ہاؤس میں ایک نہایت حسین گلوکارہ کرسٹین نام کی ہے‘ جس کی ایک دنیا شیدائی ہے..

یہ کردار ساندرہ جوزف نے بہت مؤثر انداز میں پرفارم کیا ہے.. تو اس کرسٹین کے عشق میں اس آپرا میں بسیرا کرنے والا ایک بھوت مبتلا ہو جاتا ہے جس کا کردار ہاورڈ میکگلیکن نے کیا ہے...... یہ دونوں صرف کمال کے اداکار ہی نہیں گلوکار بھی ہیں کہ آپرا میں گانے والے لوگ کلاسیکی گائیکی کے استاد ہوتے ہیں.. اب یہ جو بھوت ایک حسینہ پر عاشق ہو جاتا ہے اس میں قباحت صرف یہ ہے کہ حسینہ کو بھوت پسند نہیں اور وہ اپنے بھوت عاشق سے ڈرتی بہت ہے.. اور یہ قابل فہم ہے کہ اس عمر میں بھی اگر مجھ پر ایک چڑیل عاشق ہو جائے تو میں بھی لرزہ براندام ہو جاؤں گا.. ویسے آپس کی بات ہے کہ کچھ چڑیلیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ کاش یہ مجھ پر عاشق ہو جائے.. بہرطور یہ حسینہ اس بھوت کی محبت کی قدر نہیں کرتی اس لیے بھی کہ وہ کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے..

یہ کھیل اگرچہ بنیادی طور پر ایک آپرا تھا لیکن شُدھ آپرا نہ تھا.. یوں کہہ لیجیے کہ مکمل کلاسیکل نہ تھا.. نیم کلاسیکل تھا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ مکمل کلاسیکل نہ تھا.. اگر ہوتا تو میں اس کی تاب نہ لا سکتا.. جیسی میری حالت اب ہے کبھی ایسی تو نہ تھی.. لیکن اپنے نفیس ذوق جمال کو ثابت کرنے کے لیے ایسی قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں..

ویسے اگر ذرا سنجیدگی سے پرکھا جائے تو یہ ایک نایاب اور انوکھا تجربہ تھا.. تھیٹر کی روشنیاں مدھم ہو کر گل ہو گئیں.. پردہ اٹھنے لگا تو وہاں سٹیج پر حیران کن مناظر.. رقص اور ملبوسات اور کھیل تماشے ظہور میں آنے لگے.. 1911ء کے زمانے کا پیرس زندہ ہونے لگا.. اور سٹیج کے نشیب میں ’’گڑھے‘‘ میں بیٹھے سینکڑوں ماہر موسیقاروں کا آرکسٹرا جب جوبن پر آتا تو بدن میں ایک سنسنی سی سرسرانے لگتی..

میں اقرار کرتا ہوں کہ اس ’’آپرا کے بھوت‘‘ کے دوران مجھ پر بوریت کے بہت لمحے آئے.. اپنی نشست پر پہلو بدلتے کچھ جمائیاں بھی آئیں.. لیکن کچھ لمحے بہت خوابناک اور دل کو چھو لینے والے بھی آئے.. مثلاً جب وہ بھوت اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر گاتا ہے کہ.. میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں.. اور اس گیت میں اُلفت کی اداسی اور محبت کی شدت اتنی تھی کہ آپ کو اس بھوت سے ہمدردی ہو جاتی ہے..

اس کھیل کا مرکزی خیال کچھ انوکھا یا اچھوتا نہ تھا.. ایک خیال تھا جو ازل سے چلا آتا تھا..

وہ جو عشق کے ہاتھی تلے روندا جاتا ہے کبھی یہ تو نہیں سوچتا کہ میں اُس کے لائق ہوں بھی یا نہیں..وہ تو لاچار اور بے بس ہو کر روندا جاتا ہے..

بے شک جب وہ آئینہ دیکھتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اس کے لائق نہیں اور جونہی وہ آئینے سے جدا ہوتا ہے تو فراموش کر دیتا ہے کہ وہ اس کے لائق نہیں ہے..

جیسے ہنچ بیک آف نوٹرڈیم..کہاں اپنی کریہہ شکل اور کُبڑے پن کو دیکھتا تھا..

ایک داستانوی گوریلا کنگ کانگ ایک نازک ملوک لڑکی کے عشق میں فنا ہو جاتا ہے..اپنی شکل کو نہیں دیکھتا اپنے دل کو دیکھتا ہے..

تو اس کھیل کی کہانی انوکھی یا اچھوتی نہیں ازل سے چلی آئی ہے..

ان بھوتوں اور کبڑے عاشقوں اور کنگ کانگ کو چھوڑیئے اگر آپ کتنے ہی خوش شکل اور شاندار کیوں نہ ہوں جب عشق سے روندے جاتے ہیں تو محبوب جیسا بھی ہو اس کے سامنے اپنے آپ کو بہت حقیر اور ''کوہجا'' سمجھتے ہیں..اپنے آپ کو اس کے لائق نہیں سمجھتے کہ یہی عشق کا آخر ہے..

نیویارک ہو یا پیرس..دانا باد ہو یا گجرات..یا سیالوں کا جھنگ ہو..ہر بھوت..ہر مرزا..ہر رانجھا اور مہینوال اپنے آپ کو کرسٹین..صاحباں..ہیر اور سوہنی کے سامنے پا کر ''کوہجا'' ہی محسوس کرتا ہے..اپنے آپ کو محبوب کے لائق نہیں سمجھتا کہ..یہی عشق کا آخر ہے..



''سات جھیلیں اور پرندے کی واپسی''

دریائے ہڈسن کے سمندر پانیوں پر بادبانی کشتیاں سفید تتلیوں کی مانند پر کھولے تیرتی تھیں اور یہ منظر علی کی مرسیڈیز کے شیشوں میں سے یوں نظر نواز ہوتا تھا کہ کبھی دھوپ کا کوئی خاص رُخ کار کے بانٹ پر گر کر جب کھڑکی کے شیشوں پر سے گزرتا تو وہ بادبانی کشتیاں بھی گویا شیشے پر تیرتی دکھائی دینے لگتیں..

شاید دھوپ کا کوئی ایسا زاویہ بھی کار کے اندر سے گزر جاتا ہو جس کے دوران یہ کشتیاں پل بھر کے لیے میرے چہرے پر بھی عکس ہو جاتی ہوں..

ہڈسن کا چوڑا پاٹ سویر کی دھوپ میں کروٹیں لیتا تھا..

اور اس دریا کے پار وہ شہر جس کے جے ایف کے ایئرپورٹ پر میں آج سے تقریباً ڈھائی ماہ پیشتر اترا تھا' بلند ہو رہا تھا..وہ شہر' جس کے بارے میں مجھے گورکی نے بھٹکایا تھا کہ یہ تو صرف سونے اور دولت کی ہوس کا مارا زرد شیطان کا شہر ہے' جس کے باشندے صرف اس کی حرص میں دن رات کرتے ہیں..دولت کے غلام ہیں' اس کے بندے ہیں اور بس ان کا یہی خدا ہے' اسی کو پوجتے ہیں' ایک میکانکی اور بے روح زندگی ایک لاش کی مانند بسر کرتے ہیں اور اس کی کھڑکیوں میں پھولوں کی سجاوٹ نہیں ہوتی..گورکی نے اسے اپنے نظریے کے تعصب کی آنکھ سے دیکھا تھا اور اس کا مشاہدہ اس کا اپنا سچ تھا..پورے ادب میں گورکی کے ''زرد شیطان کا شہر'' سے بہتر نیویارک کا سفرنامہ نہیں لکھا گیا..یہ ایک شاہکار ہے لیکن ایک مخصوص نظریے کا شاہکار ہے..

اور آج سے سو برس پیشتر کا نیویارک شاید ایسا ہی ہو گا..بہر طور اس سفرنامے نے مجھے نیویارک سے بدگمان تو کر دیا تھا..میں قطعی طور پر گورکی ایسے بڑے ادیب کی نیت اور مشاہدے پر شک نہیں کر

رہا.. میرے بہت سے سفرناموں پر بہت سے لوگوں کو اعتراض ہیں کہ انہوں نے ان شہروں کو ویسا نہ پایا جیسا کہ میں نے بیان کیا.. مجھے یاد ہے کہ ایک صاحب نے میری باقاعدہ گوشمالی کی تھی کہ تارڑ صاحب میں صرف آپ کی تحریر کے زیر اثر ہرات گیا تو وہ شہر تو ہمارے پتوکی اور قصور وغیرہ سے بھی گیا گزرا تھا.. اور آپ نے ارض روم کی بھی بہت توصیف کی تھی تو.. سفرنامے کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ صرف ایک شخص کی آنکھ سے دیکھے جانے والے مناظر کی کہانی ہوتی ہے اور اکثر وہ آنکھ جو کچھ دیکھنا چاہتی ہے صرف وہی دیکھتی ہے.. اور دنیا بھر میں جتنی آنکھیں ہوتی ہیں اتنے ہی ایک شہر، قصبے یا وادی کے روپ ان کے سفرناموں میں ظاہر ہوتے ہیں.. اس لیے گورکی کی نیت اور مشاہدے پر شک نہیں کیا جاسکتا..

میری آنکھ گورکی کی آنکھ سے جدا تھی، چنانچہ میں نے جو نیویارک دیکھا اس میں بے شک سرمایہ داری نظام کی بھگدڑ اور چکا چوند تھی لیکن اس کی دل فریبی اور کشش کی بھی کوئی مثال نہ تھی.. روم.. پیرس.. فلارنس یا دمشق میں داخل ہوتے ہوئے یہ طے ہو چکا ہوتا ہے کہ آپ بہر طور ان کی سحر کی زد میں آئیں گے کیونکہ ایک زمانہ ایک تاریخ ان کی توصیف کرتے ہیں.. ان کا تاریخی رعب اور ماضی کی عظمت آپ کو پابند کر دیتے ہیں کہ آپ نے ان سے متاثر ہونا ہے.. اور آپ ہو جاتے ہیں.. لیکن نیویارک بے چارے کے پاس اپنے آپ کو عظیم ثابت کرنے کے لیے تاریخ اور زمانے کی اسناد نہیں ہوتیں کیونکہ نہ تو اس پر کچھ زمانہ گزرا ہے اور زمانے کے بغیر تاریخ کہاں سے آجاتی.. صرف گورکی ہی نے نہیں بلکہ خود امریکیوں نے بھی مجھے نیویارک کے بارے میں بدظن کیا تھا.. عمارتیں ہی عمارتیں.. بھڑکیلے نیون سائن.. ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ اور مجسمہ آزادی اور اس کے سوا نیویارک میں رکھا ہی کیا ہے اور ہاں گلی کوچوں میں دندناتے فلم سٹار اور گینگسٹر..

اور میں اس لیے نیویارک سے دور رہا تھا..

ایک مدت یورپ میں قیام کے باوجود بحر اوقیانوس کے پار نہیں گیا تھا کہ پار جا کر کرنا کیا ہے.. چنانچہ نیویارک پر میں نے ایک بے روح.. بے ثقافت.. جدید اور پیسے کی پجاری شہر کی مہر لگا کر اسے اپنی متروک شدہ خواہشوں کی ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا..

اور جب میں نے یہاں کچھ شب و روز گزارے.. اس کے گلی کوچوں.. ریستورانوں.. عجائب گھروں.. کتب خانوں میں چند روز بسر کیے..

دریائے ہڈسن کے کناروں کے ساتھ سیرگاہ اور سنٹرل پارک میں کچھ سویریں میرے بدن پر اتریں.. اس کے باسیوں کے چہروں اور لباسوں پر نظر کی.. اور زندگی کی اس بے پناہ لہر کو محسوس کیا.. جو اس شہر کے رگ و پے میں رواں ہے.. اور گرین اِچ ولیج کی زردی میں اترا تو اس شہر نے جس کے تعارف میں تاریخ اور زمانے کا کوئی حوالہ نہ تھا.. اس شہر نے مجھ پر کچھ ایسے در وا کیے جن میں ذوقِ جمال اور زندگی کے ایسے پر بہار چلن پوشیدہ نظر آئے جو روم یا پیرس کے زوال پذیر شہروں کے دامن میں بھی نہ تھے..

میں اس شہر کا گرویدہ ایسا ہوا کہ اگر اپنی عمر رسیدگی کی شرمندگی نہ ہوتی تو میں ''آئی لو نیویارک'' والی ٹی شرٹ زیب تن کر کے وطن لوٹتا.. اگر ایسا کرتا تو کچھ احتیاط بھی کرتا کہ لاہور ایئرپورٹ پر اترتے ہی اس ٹی شرٹ کو اتار کر کوئی شریفانہ لباس پہن لیتا کہ کہیں کوئی جنت کا متلاشی جہادی مجھے امریکہ کا ایجنٹ قرار دے کر جہنم رسید نہ کر دے اور خود جنت کا ٹکٹ نہ کٹوا لے.. اگرچہ اس نوعیت کے افراد نہیں جانتے کہ میرے جیسے لوگ تو تب سے امریکی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کرتے اور ناپسند کرتے چلے آئے تھے جب یہ حضرات امریکہ کی آنکھ کا تارا تھے.. اس کے اشاروں پر چلتے تھے اور ہمیں ''سرخا'' کہہ کر مطعون کرتے تھے..

مجھے ان کا ڈر نہ ہوتا تو شاید میں ''آئی لو نیویارک'' والی ٹی شرٹ زیب بدن کر ہی لیتا..

اور کل شام مجھے اس پسند آگئے شہر سے رخصت ہو جانا تھا..

اور ایک پارہ صفت کھلنڈرا محبت بھرا بچہ.. علی.. اپنے ڈیئر انکل کو اپنے ڈیئر بچپن کے فاسٹ فرینڈ سلجوق کے ہمراہ نیویارک سے باہر کسی ''ریچھ پہاڑ'' پر لے جا رہا تھا..

ابھی کچھ دیر پہلے ہم نیویارک کی گھنی بھیڑ اور بلند عمارتوں کے شکنجے میں رینگتے تھے اور تب ہڈسن پر قائم ایک پل کے پار ہوئے ہیں تو رُت ہی بدل گئی.. ہر سُو خاموشی اُترنے لگی.. شور پیچھے رہ گیا اور ہمارے کان پریشان ہو گئے کہ یہ گھڑی دو گھڑی میں کیا ماجرا ہو گیا.. ہمارے بدن پہلے تو بے چین بہت ہوئے کہ ان پر شور و غل اور ٹریفک کے اژدھے کی چنگھاڑ یکدم معدوم ہو گئی اور پھر ایک صوفیانہ سکون میں چلے گئے.. صرف دھوپ تھی.. خزاں کی آمد سندیسے دینے والے گھنے درخت تھے جو زرد پیراہنوں میں ملبوس بدھ بھکشوؤں کی مانند شاہراہ کے دونوں جانب شانت کھڑے تھے.. اور ان کے درمیان میں سے کبھی کبھار ہڈسن میں رواں کوئی بادبانی کشتی نظر آجاتی.. اور کوئی

آبادی نہ تھی۔ کہیں ہریاول تھی اور کہیں سرسبز نشیب وفراز..آپ ہرگز یہ تصور کر ہی نہیں سکتے تھے کہ ابھی کچھ لمحے پہلے آپ نیویارک کے جھمیلوں میں رینگتے تھے..

اور خاموشی تھی..

اور یہیں پر بہت نشیب میں پھیلے ہڈسن کے سمندر پانیوں پر وہ سفید تتلیاں نظر آتی تھیں جو پر پھیلائے رواں تھیں اگرچہ یہاں سے سکوت میں لگتی تھیں..

علی مجھے محظوظ کرنے کی چاہت میں بار بار کیسٹ بدل کر کبھی مہدی حسن پر اور کبھی نصرت فتح علی خان پر سر دھنتا تھا اور کہتا تھا..انکل ذرا یہ سنیں..

اور انکل نہیں سُن سکتے تھے کہ وہ بہرے ہو چکے تھے..

آس پاس خاموشی کے سناٹے کا جو سحر تھا اس کی گرفت میں آ کر کچھ بھی سُن نہ سکتے تھے..صرف دیکھ سکتے تھے اور ان کی آنکھوں میں زرد پیراہنوں والے بدھ بھکشو شجر عکس ہوتے جاتے تھے..

خاموش اور سرسبز وسعت میں کچھ مختصر بستیاں تھیں اور کہیں کہیں تنہا گھر تھے جنہیں ہرے بھرے میدان اور کھیت گھیرے ہوئے اپنی دل کشی میں پناہ دے رہے تھے..

ہم پھر سے ہڈسن کے قریب ہونے لگے..اس پر ایستادہ ایک پل کے پار ہوئے اور ایک پہاڑی راستے پر ہولے ہولے احتیاط سے چکر کھاتے بلند ہونے لگے..

ہڈسن کے پانی نیچے رہتے گئے اور پھر ''ریچھ پہاڑ'' یا ''بیئر ماؤنٹین'' کی چوٹی پر پہنچ گئے..چوٹی کے نام سے کم از کم ہمارے ذہنوں میں نانگا پربت یا کے ٹو کی برفانی بلندیاں آتی ہیں لیکن ایسے بے مثال پہاڑ امریکہ کے نصیب میں کہاں..یہ ایک آخری پڑاؤ تھا..ایک پارکنگ کا مقام تھا جہاں ایک مختصر ریستوران تھا اور ایک بورڈ آویزاں تھا جس پر درج تھا کہ چوٹی کے نیچے پھیلے ہوئے جنگلوں میں سفید سر والا گنجا عقاب پایا جاتا ہے جو امریکہ کا امتیازی نشان ہے..

ایک تو میں اس گنجے عقاب سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ فلوریڈا میں بھی اسی کے تذکرے ہوتے تھے اور اس ایک اور امریکی دیوتا کی شان ایسی تھی کہ جہاں کہیں موصوف کا گھونسلا ہوتا ہے اس کے گرد ایک وسیع علاقے میں نہ تو کوئی جنگل کاٹا جاتا ہے اور نہ ہی کوئی رہائش گاہ یا شاہراہ تعمیر کی جا سکتی ہے..

تب یہ خیال بہرحال آتا تھا کہ یہ نیک دل امریکی فلسطینیوں کے گھونسلے کو بھی اگر ''محفوظ'' کر لیں بے شک قابض ہو جائیں اور ان کی معدوم ہوتی ہوئی نسل کو بچانے کے لیے جگہ جگہ ایسے بورڈ لگا دیں کہ..خبردار یہاں فلسطینی رہائش پذیر ہیں..انہیں بے دخل کر کے ان کے گھروں پر بلڈوزر چلا کر نئی بستیاں تعمیر کرنے کی ممانعت ہے..تو کیا مضائقہ ہے..

چوٹی کے گرد جو حفاظتی دیوار تھی' اس پر کہنیاں ٹکا کر اگر آپ لطف اندوز ہونا چاہیں تو ہو جائیں ورنہ وہاں سے دکھائی دینے والا منظر کوئی خاص منظر نہ تھا۔ صرف دریائے ہڈسن تھا اور اس کے کناروں پر ایک گھنا جنگل تھا..

علی نے نہایت وثوق سے..اور وہ ہر بیان نہایت وثوق سے دینے کا عادی تھا..مجھے بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے وہ جو سامنے والی پہاڑی ہے وہاں موسم سرما میں دو گنجے عقاب دیکھے تھے..اور وہ بھی یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دراصل گنجے عقاب ہی تھے..دو چیلیں نہیں تھیں..

''اور ریچھ کہاں ہیں..؟''

''کون سے ریچھ انکل..''

''یہ بیئر ماؤنٹین ہے ناں تو بیئرز..ریچھ..؟''

''ہاں وہ ریچھ..'' علی کھلکھلا کر ہنس دیا..''انکل ان دنوں تو یہاں کوئی ریچھ نہیں ہوتے' ریڈ انڈین لوگوں کے زمانے میں ہوتے تھے اسی لیے وہ اسے بیئر ماؤنٹین پکارتے تھے..امریکیوں نے اس نام کو محفوظ کر لیا ہے..''

''ہاں امریکیوں نے ناموں کو تو محفوظ رکھا ہے لیکن ریڈ انڈینز کو نہیں..''

عام طور پر ریڈ انڈین قبیلوں کو صرف امریکہ سے منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ وہ لوگ تو پورے جنوبی اور شمالی امریکہ میں پھیلے ہوئے تھے اور خاص طور پر آج کے کینیڈا میں تو وہ ایک از حد تہذیب یافتہ معاشرے کے فرد تھے..وہاں' کینیڈا میں آپ جس خطے میں بھی جائیں جن وادیوں میں اتریں..پہاڑوں پر بلند ہوں تو وہاں جتنے بھی نام ہیں آبشاروں..دریاؤں چوٹیوں اور چشموں کے وہ سب کے سب اس بیتے ہوز مانے کے ہیں جب وہاں گورے آباد کار نہیں آئے تھے اور انہوں نے مقامی لوگوں کی شناخت اور آبادی کو ملیامیٹ نہیں کیا تھا..البتہ کینیڈا میں قدم رکھنے والی گوری اقوام نے..خاص طور پر فرانسیسیوں نے..امریکیوں کی مانند مقامی لوگوں کو ''ریزرویشن''

علاقوں میں نایاب جانوروں کی مانند محفوظ کر کے نمائش پر نہیں رکھا.. یعنی جتنے بھی ان کی تیغ ستم کا شکار ہونے سے بچ گئے تھے.. بلکہ انہوں نے کینیڈا کے ان آبائی باشندوں کو اپنی معمول کی زندگی میں شامل کر لیا.. میں ایسے خطوں میں سے بھی گزرا جو انڈین علاقے کہلاتے تھے کہ وہاں اب بھی یہ قدیم قبیلے آباد ہیں.. کھیتی باڑی کرتے ہیں' کاروبار کرتے ہیں یعنی جانور نہیں جو نمائش پر ہیں بلکہ دوسرے انسانوں کی مانند انسان ہیں.. بلکہ انہیں خصوصی مراعات حاصل ہیں.. ویرانوں میں یُوکان وادی کے کسی دور افتادہ قصبے میں آپ ایک سٹور کے اندر جاتے ہیں تو وہاں ایک بڑھیا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا پھولدار لباس میں بیٹھی سگریٹ پر سگریٹ پھونکے چلی جا رہی ہے اور شاید بہری ہے جو آپ کی بات نہیں سنتی.. یہ سٹور اس کی ملکیت ہے.. انڈین لوگوں کا یہ حق بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ وطن اور یہ زمینیں ان کی ہیں چنانچہ انہیں ٹھیکہ دیا جاتا ہے اور یوں اکثر انڈین اپنی زمین کا ''کرایہ'' وصول کر کے مزے سے بیکار بیٹھتے ہیں اور شراب پیتے ہیں.. ایک پاکستانی کینیڈین خاتون بینش سیّد اس بندوبست کو شدید ناپسند کرتی تھی کہ دن رات مشقت ہم کرتے ہیں اور ہمارے ادا کردہ ٹیکسوں پر گھر بیٹھے عیاشی یہ لوگ کرتے ہیں.. کیلگری میں ایک بہت بڑا سٹور ''ڈیئر فٹ'' نام کا ہے جس کی برانچیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں.. ڈیئر فٹ.. یعنی ہرن کی ٹانگوں والا.. ایک انڈین شخص تھا جو سینکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ بھاگتے ہوئے طے کر جاتا تھا.. یہ سٹور اسی انڈین کی آل اولاد کی ملکیت ہے..

میں علی سے یہ شکایت کر ہی رہا تھا کہ ریچھ کہاں ہے تو وہاں ریچھ آ گئے..

بلکہ ان ریچھوں پر بھی ریچھ بیٹھے ہوئے تھے..

ہارلے ڈیوڈسن کی جہازی موٹر سائیکلیں.. کروم پلیٹڈ.. دمکتی لشکتی.. مارکو پولو بھیڑ کے سینگوں ایسے ہینڈلز والی.. کانوں کو بہرا کر دینے کی چنگھاڑ رکھنے والی طاقتور مشینیں.. یعنی سیاہ میکانکی ریچھ اور ان پر سوار نیلی جینوں اور جیکٹوں پر آہنی ستارے اور میڈل سجائے.. بیہودہ شکلوں والے مشٹنڈے جن کی مونچھیں سردار حضرات سے بھی زیادہ گھنی تھیں اور ان کے ننگے بازو سیاہ ٹیٹوؤں سے بھرے ہوئے تھے.. نہایت تنومند اور بے فکرے اور جوان بھی اور خاصے بوڑھے بھی.. اور ان کے ہمراہ پچھلی نشستوں پر سوار جو خواتین تھیں وہ بھی بہت مردانہ.. اتنی کہ میں ان کے سامنے زنانہ لگتا تھا اور خاصی نیم تہذیب یافتہ.. ایسی کہ ہم جیسوں کا تو پتہ پانی کر دیں اور اس کے سوا کچھ اور بھی

پانی کر دیں.. یہ درجنوں موٹر سائیکلیں اندھے ہاتھیوں کی مانند جھومتی آئیں اور بیئر ماؤنٹین کی چوٹی پر قبضہ کر لیا.. ان کے سوار ہمیں دھکیلتے ہوئے حفاظتی دیوار تک پہنچے اور اس پر سے جھانکتے نیچے پھیلے ہوئے ہڈسن دریا کے نظارے کرتے قہقہے لگانے لگے.. پھر انہوں نے چند درجن سینڈوچ اور برگر ہڑپ کیے.. بیئر سے اپنے حلق کو تر کیے اور بلند آواز میں ڈکاریں مارتے اپنے دیوزاد موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر بیئر ماؤنٹین سے اتر گئے..

ہم ان کی موجودگی میں بہت سہمے رہے.. یہاں تک کہ گفتگو بھی سرگوشیوں میں کرتے رہے کہ شنید تھی کہ ایسے گینگ ہمہ وقت لڑائی جھگڑے کے لیے بے چین رہتے ہیں.. مار کٹائی کا کوئی بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں یہاں تک کہ آپ ان کی جانب ذرا نظر بھر کر دیکھیں تو بھی مائنڈ کر جاتے ہیں کہ اوئے.. کیا دیکھتے ہو.. تمہیں کچھ دکھاؤں.. گویا یہ حضرات امریکی مولا جٹ یا نُوری نَت تھے جو بجا طور پر ہم سے پوچھ سکتے تھے کہ.. نواں آیاں اے سوہنیا.. اور ہم واقعی ان کے ''گاؤں'' میں نئے آئے تھے..

ان کے رخصت ہونے پر ہم نے سُکھ کا سانس لیا اور پھر وہاں سے کوچ کر جانے کا قصد کیا.. جب ہم بیئر ماؤنٹین کی جانب آ رہے تھے تو راستے میں بائیں ہاتھ پر ایک گھنا اور خوش نظر جنگل دکھائی دے رہا تھا جس میں ریستوران اور سوس طرز کے گھر نیم پوشیدہ تھے.. علی نے بتایا تھا کہ انکل اس جنگل کے پیچھے ایک جھیل ہے جو نیویارکرز کا پسندیدہ پکنک سپاٹ ہے' چنانچہ اُدھر کا قصد کیا کہ انکل جی کو اگر شائبہ بھی ہو جائے کہ آس پاس پانیوں کا کوئی ذخیرہ ہے.. بے شک ایک جوہڑ ہے تو ان کے دل میں کُھد بُد ہونے لگتی ہے کہ کیا پتہ ایک اور کرومبر جھیل ہو.. کیا معلوم ایک سیف الملوک ہو تو پتہ کرنا چاہیے.. معلوم کرنا ضروری ہے اور اسے دیکھے بغیر اس جہان سے رخصت نہیں ہونا..

علی نے اپنی مرسڈیز کو بمشکل پارک کیا کہ وہاں کاروں کا ایک ہجوم تھا اور پھر ہم ایک وسیع گھاس بھرے میدان میں بہت دیر چلے.. اور یاد رہے کہ امریکہ میں جو گھاس ہوتی ہے وہ ہمارے ہاں کی کھبل گھاس سے بھی بدتر ہوتی ہے بلکہ گھاس نہیں سبز نوکیلے کانٹے ہوتی ہے اور اس پر چلنے سے.. چاہے آپ نے جوگرز پہن رکھے ہوں پاؤں نبردِ عشق کی مانند زخمی ہو جاتے ہیں..

میدان کے آخر میں ایک متروک شدہ شکستگی کی حالت میں آسیب زدہ چوبی ہوٹل تھا.. کواڑ بند..

دروازے مقفل.. کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے اور آس پاس قدِ آدم گھاس جس میں کاروں کے دو زنگ آلود ڈھانچے زمین میں دھنسے ہوئے تھے.. اس ہوٹل کے برابر میں چلتے ہوئے درختوں کی گھناوٹ میں سے.. ان کے پتوں اور شاخوں میں سے جھیل جھلکنے لگی..

یہ ایک خاصی وسیع اور شریف سی خاموش جھیل تھی جس کے کنارے دور تک جاتے تھے اور ان کناروں پر جو شجر تھے وہ بھی دور تک اس پر جھکتے چلے جاتے تھے..

کنارے پر ایک بورڈ آویزاں تھا اور میں ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا کہ اس پر ''حسین جھیل'' درج تھا.. یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے.. کیا یہ ایک مسلمان جھیل ہے.. اگر حسین جھیل ہے تو پھر یہ مستنصر حسین جھیل ہے.. پر دوسرے لمحے میں نے مزید غور کیا تو کھلا کہ اس کا نام حسین نہیں... بلکہ ہَسّین ہے...

"HESSIAN LAKE"

اور اس نام تلے درج تھا کہ.... مچھلی کے شکاریوں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے..

جانے اس جھیل میں مچھلیاں تھیں یا نہیں.. البتہ اس کے کناروں پر خاندان کے خاندان آباد تھے.. اور ان کے فالتو بزرگ جھیل میں کنڈیاں ڈالے فشنگ راڈ تھامے کسی قسم کی بھی مچھلی ہاتھ آ جانے کے انتظار میں تھے.. وہ نہیں جانتے تھے کہ اس عمر میں مچھلیاں نہیں پھنستیں.. اگر پھنس بھی جائیں تو مایوس ہو کر ہاتھوں سے پھسل جاتی ہیں..

جھیل کنارے چھدرے درختوں کا ایک جھرمٹ تھا جن کے سائے میں ایک موج میلہ سا لگا تھا.. کھانے پینے کے سٹال.. پھلوں اور سبزیوں کے کھوکھے.. دستکاریاں.. بچوں کے کھلونے وغیرہ.. کسی حد تک ایک چھانگا مانگا جہاں شہر کے باسی کچھ کھانے پینے موج میلہ کرنے اور کچھ تازہ ہوا پھانکنے کے لیے آ جاتے ہیں.. رونق اس لیے بھی بہت تھی کہ وہاں جرمن نژاد امریکیوں کے بے شمار خاندان شیر خوار بچوں اور قریب المرگ بوڑھوں سمیت اترے ہوئے تھے اور اپنے جرمن ماضی کو زبان خوراک اور ثقافت کے مظاہروں سے یاد کر رہے تھے.. خواتین و حضرات بویریا اور بلیک فارسٹ کے روایتی لوک لباسوں میں یہاں تک کہ بچوں نے بھی یہی قدیم پیراہن زیب تن کر رکھے تھے اور یہ سب جرمن لوک رقص کرنے میں مشغول اور پرمسرت تھے.. انہوں نے عارضی طور پر امریکہ کو چھوڑ دیا تھا اور اپنے جرمنی میں چلے گئے تھے.. یہاں تک کہ آپس میں گفتگو

کے دوران انگریزی کا ایک لفظ نہ بولتے تھے.. صرف جرمن زبان میں جیتے تھے..

امریکہ کا کمال ہی یہی تھا کہ نیویارک سے چند کوس کے فاصلے پر آپ ایک جھیل کنارے پورا جرمنی آباد دیکھ سکتے تھے.. اور کہیں چین.. اطالیہ.. پولینڈ.. روس.. آئرلینڈ اور ہندوستان پاکستان دیکھ سکتے تھے..

اجمیر شریف کی درگاہ میں ایک بہت بڑی دو منزلہ دیگ ہے.. زائرین آتے ہیں اور اس دیگ میں جو کچھ ان کی جھولی میں ہوتا ہے.. چاول.. دالیں.. آٹا.. سبزیاں.. پھل فروٹ.. مرچ مصالحے.. روٹیاں.. سب کچھ اس میں انڈیلتے چلے جاتے ہیں.. اور پھر وہ دیگ پکنے لگتی ہے.. ایک انوکھے ذائقے کا پکوان تیار ہو جاتا ہے جسے ہر کس و ناکس رغبت سے کھاتا ہے..

کچھ یہی کیفیت امریکہ کی ہے جو کہ ایک بڑی دیگ ہے.. اس میں درجنوں زبانیں اور ثقافتیں اور مذاہب انڈیلے جاتے ہیں اور ان کے مرکب سے ایک الگ سے ذائقے کا پکوان تیار ہو جاتا ہے جو کہ امریکہ ہے..

بلند درختوں کے چھدرے سائے تلے پکنک پر آئے ہوئے لوگ اپنے ذاتی چولہوں پر تکّے لگا رہے تھے' مرغیاں بھون رہے تھے.. سٹیکس باربے کیو کر رہے تھے اور ان کے بھونے جانے کی مہک اور آگ پر گرتی چربی کی خوشبو ایسی اشتہا انگیز تھی کہ جھیل میں اگر کوئی ہم جیسی بھوکی ایک مچھلی تھی تو وہ بھی اس گرم مہک کے ذائقے اور تعاقب میں اچھل کر کناروں پر آ گرے اور صرف ایک تکّہ کھانے کے چاؤ میں تڑپ تڑپ کر جان دے دے..

ہم تو پردیسی لوگ تھے.. بھوکے ہو رہے تھے پر مجال ہے کسی کمبخت نے جھوٹ موٹ کی صلح بھی ماری ہو کہ آؤ ایک بھونی ہوئی بوٹی ہی کھا لو.. یقیناً یہ لوگ آداب مہمان نوازی سے آگاہ نہ تھے.. بے حد گنوار تھے..

اس دوران علی ایک مقامی کسان کے سٹال پر رک گیا جہاں وہ سب کچھ تازگی میں برائے فروخت تھا جو کچھ ایک کسان اپنی زمین پر اگاتا ہے اور اس کی پرورش کرتا ہے..

''سلجوق یار.. ٹماٹر..''

سلجوق یوں چوکنا ہوا جیسے علی کو جنگل میں شیر نظر آ گیا ہو.. ''ٹماٹر..؟''

وہ نہایت خوش و خرم اور شاداں وہاں پہنچ گیا جہاں شیر تھا.. میرا مطلب ہے ٹماٹر تھا..

''یار سلجوق دیکھو کیسے کمال کے لال سرخ ٹماٹر ہیں اور تازہ ہیں اور نیویارک کی نسبت آدھی قیمت پر ہیں تو خرید لیں یار..''

تو انہوں نے فوری طور پر ٹماٹروں سے لبریز دو ٹوکریاں خرید لیں اور پھر بقیہ پھل و سبزیات برائے فروخت کا جائزہ لیا اور پھر یکدم سلجوق پکارا ''یار علی..سیب..نیویارک سے آدھی قیمت پر' خرید لیں یار..''

میں نے ابھی تک درختوں کے جھنڈ کے سامنے پہلی حسیّن جھیل کی نہ تفصیل بیان کی ہے اور نہ توصیف کی ہے..اس لیے کہ یہ اگرچہ ایک نہایت وسیع اور بھلی لوک لیک تھی لیکن یہ شریف بہت تھی..اس میں کسی حد تک دل ربائی تو تھی پر دل کو جکڑ لینے والا سحر نہ تھا..یہ بے راہرو اور مخرب الاخلاق قسم کی جھیل نہ تھی جو اپنے نخروں اور خود سپردگی کی دعوتوں سے آپ کو ورغلانے میں کامیاب ہو جائے..کہ شرافت میں دھیما پن اور کردار تو ہوتا ہے لیکن یہ آپ کے اندر ازل سے بھر دیئے گئے گناہ کی ہوس کی نہ تو تسلی کر سکتا ہے اور نہ اپنی جانب کھینچ سکتا ہے..یعنی کھینچے ہے مجھے کفر..صرف کفر میں کشش ہوتی ہے..

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کہا تھا..''نہ تو مجھے دھیمے اور سدھائے ہوئے گھوڑے پسند ہیں اور نہ عورتیں..''

یہ ایک دھیمی اور سدھائی ہوئی جھیل تھی..جس میں اگر مچھلیاں تھیں تو وہ بھی یقیناً آسانی سے شکار ہو جانے والی نہ تھیں' نہایت پرہیزگار اور شریف بیبیاں تھیں..ہاتھ آنے والی نہ تھیں..

سات آسمان..

سات سُر..

آگ کے گرد سات پھیرے..سات دن..کعبہ کے سات طواف..سعی میں سات بار آنا جانا اور..

سات جھیلیں..

اور اگر سات آسمان اپنی نیلاہٹ اور چمکیلے پن کو سات سُروں میں انڈیل دیں تو ان کے ملاپ سے سات جھیلیں نمودار ہو جائیں..

گھنے جنگلوں کے کچھ شجر اکتوبر کے اوائل کی خزاں کی زردی میں کچھ پتے گراتے ہیں تو زمین پر جہاں کہیں وہ پتے زرد گرتے ہیں وہاں جھیلیں نمودار ہونے لگیں..ایسی سات جھیلیں..یکے بعد دیگرے..

یہ حقیقت کا نہیں وہم اور گمان کا ایک سفر تھا..

ڈھلتی دوپہر میں جھیل حسیّن سے واپسی پر علی نے کہا کہ انکل اب میں آپ کو سات جھیلوں کی جانب لے جا رہا ہوں..اور اس نے اپنی مرسیڈیز کو جس راستے پر ڈالا وہ ہمیں عجیب آبی خوابوں میں لے گیا..

اور یہ آب کے خواب گھنے جنگلوں میں اپنے آپ کو پوشیدہ کیے ہوئے تھے اور یہ خواب کیا ہی انوکھے اور الگ شباہت والے تھے یہاں تک کہ ان پر ٹھہرا ہوا سکوت بھی کچھ اور ہی تھا..

ان پانیوں میں ہلچل نہ تھی..

اور ان پر طاری خاموشی نے ازل سے چُپ کا روزہ رکھا ہوا تھا..

کہیں گھنی گھاس ان کے پانیوں پر جھکی سرسراتی تھی..

اور کہیں..ایک ایسی جھیل تھی جس کی سطح کنول کے چوڑے پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ان میں سے کچھ یہاں کچھ وہاں سب کہاں..لالہ و گل میں نمایاں ہوتے تھے..

کہیں ان کے پانیوں کو گھیرے ہوئے گھنے شجر ان میں اپنا عکس دیکھتے تھے اور اپنے آپ کو ایک آبی شیشے میں دیکھ کر انہیں احساس ہوتا تھا کہ زوال کے دن آ گئے ہیں..خزاں ان کی مانگ میں زردی بھر رہی ہے..

یہاں سے صرف سو ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر نیویارک نام کا کوئی شہر ہو ہی نہیں سکتا تھا..ہم جہاں سے آئے تھے وہ ایک سراب تھا اور حقیقت یہ تھی سات جھیلوں کی صورت میں ہمارے آس پاس پھیلی ہوئی..وہ جزیرہ جہاں نیویارک آباد ہونا تھا وہاں ابھی تک وہ ڈچ سوداگر نہ آئے تھے جنہوں نے اسے چند منکوں موتیوں کے عوض اس کے آبائی باشندوں سے زبردستی خرید لیا تھا اور نہ ہی انگریزوں نے اپنے قدم وہاں رکھے تھے..

یہ جو آس پاس تھی..جس میں سے ہم گزرتے تھے سراسر ریڈ انڈین سرزمین تھی جہاں ابھی تک ''تہذیب یافتہ'' اقوام کے سائے نہیں پہنچے تھے..

یہ وہ امریکہ تھا..جو کہ تھا..

ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی..

محسوس ہوتا تھا کہ یہ ایک ایسا کنوارا..اَن چھوا جہان ہے جس میں علی کی مرسیڈیز پہلی بار داخل ہوئی ہے..

اور ایسا ہو سکتا تھا..کیا معلوم کسی گھنے جنگل کی اَوٹ سے یکدم ایک گھڑ سوار نمودار ہو جائے..ایک شاندار شباہت کا مُشکی گھوڑے پر سوار اپنی آبائی ثقافت اور شرافت اور دریادلی کا امین' ہزاروں برسوں سے اسی سرزمین میں سانس لینے والا..ایک ریڈ انڈین گھڑ سوار یکدم نمودار ہو جائے..اور وہ قدرے حیرت زدہ ہو جائے کہ یہ کون لوگ ہیں جو میری دھرتی میں داخل ہو گئے ہیں اور ایک عجب شے پر سوار ہیں جو میرے گھوڑے سے بھی رفتار میں تیز ہے..یہ شے ہے کیا..اور اس کے باوجود کہ ہم اس کے آبائی گھر میں بلا اجازت گھس آئے تھے وہ ہمیں اپنے "ٹاماہاک" کا نشانہ نہیں بناتا..ہم پر تیر نہیں چلاتا بلکہ ہمیں مہمانوں کے طور پر خوش آمدید کہتا ہے..

اور ہم کچھ شرمندہ سے محسوس کرتے اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم انڈین ہو..؟

اور وہ ذرا حیرت میں آ کر اپنے گھوڑے کی پشت کو تھپک کر مسکراتا ہے اور کہتا ہے کہ..

نہیں..میں تو انڈین نہیں ہوں..شکل سے تم لگتے ہو..انڈین تو تم ہو..میری کوئی قومیت نہیں ہے کہ قومیت تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو ایک خطّے ایک عقیدے کی قید میں ہوں..میں ایک ملک کا نہیں ایک کائنات کا باسی ہوں..ناقابل یقین گھاٹیوں..بلند چٹانوں..پیاس کے صحراؤں کا..برف زاروں کا..آبشاروں..جنگلوں..جھیلوں کی کائنات کا..جب سے یہ وجود میں آئے ہیں تب سے ان کا باسی ہوں..صرف میں نہیں اس کائنات میں جو پرندے اور شجر ہیں..جانور اور دریا ہیں ہم سب ایک اکائی میں یہاں زندگی بسر کرتے چلے آئے ہیں..ہم جب سے ہیں ہم نے آج تک کوئی ایک درخت بے وجہ نہیں کاٹا..کسی ایک پرندے یا جانور کو بلاضرورت ہلاک نہیں کیا کہ یہ سب ہمارے قریبی عزیز ہیں..شجر تو ہمارے بڑے بوڑھے ہیں..جانور ہمارے بھائی ہیں اور ندیاں ہماری مائیں ہیں..کیا کوئی شخص اپنے بزرگوں' بھائیوں اور ماؤں کو قتل کر سکتا ہے..؟ چنانچہ یہ کائنات جب سے تخلیق کی گئی تب سے جوں کی توں ہے..انڈین تو تم ہو..

اگر ایک ایسا گھڑ سوار گھنے جنگلوں میں سے نمودار ہو کر ہم سے ہم کلام ہوتا تو یہی

کچھ کلام کرتا..

اگر آج ہم امریکہ کے آبائی باشندوں کو انڈین کہتے ہیں تو یہ حماقت کولمبس ایسے بیوقوف سے سرزد ہوئی تھی جو اپنے تئیں ہندوستان دریافت کرنے کی غرض سے گھر سے نکلا تھا اور بھٹکتا ہوا اِدھر آ نکلا تھا اور یہاں کے رہنے والوں کو انڈین سمجھ بیٹھا تھا..

تو یہ وہ امریکہ تھا..جو کہ تھا..

وہ امریکہ نہ تھا جو حضرت انسان نے..بلکہ گورے انسان نے ایک قدرتی کائنات کو ملیامیٹ کر کے اس میں بسنے والے لوگوں کو..لاکھوں لوگوں کو ہلاک کر کے اس کے سینے پر تعمیر کیا تھا.صرف زرد شیطان کے حصول کی خاطر..ہوسناکی اور لالچ کی خاطر..

ہم اُس امریکہ میں چلے جا رہے تھے جو کہ تھا..اور دور سے ایک درمیانی عمر کی خاتون جوگرز اور جین میں ہاتھ میں ایک نقشہ تھامے..کمر پر سامان کا تھیلا بوجھ کیے..خراماں خراماں چلی آ رہی تھی..وہ بھی نئے امریکہ سے بیزار..اس کی گھٹن سے بیزار..اس پرانے امریکہ کی سات جھیلوں کے کناروں پر پیدل چلنے کے لیے چلی آئی تھی..

یکے بعد دیگرے سات جھیلیں..

مجھے یہ خیال کہ گھنے جنگلوں میں سے یکدم ایک انڈین گھڑ سوار نمودار ہو سکتا ہے..تو یہی خیال مجھے کینیڈا میں نیاگرا آبشار کے سائے میں بھی آیا تھا کہ جب میرا چہرہ اس کی پھوار میں بھیگتا تھا اور میری پلکوں پر اس کے پانیوں کی بوندیں ذرا ٹھہرتی تھیں اور پھر میرے رخساروں پر گر کر میرے بدن پر بہنے لگتی تھیں اور ان آبشار پانیوں کے دھارے ایک سیلاب کی صورت ایک مہیب گونج کے ساتھ گرتے جاتے تھے اور میں خوش بخت بھی محسوس کرتا تھا اور مجھ میں ڈر بھی تھا..اور میرے آس پاس تہذیب کے جدید ترین مظاہر کی صورت میں شاندار بلند ہوٹل..عمارتیں..شاہراہیں اور پارک سر اٹھاتے تھے اور یہ سب کے سب نیاگرا آبشار کے گرد ازل سے بھوکے گدھوں کی مانند بیٹھے تھے اور اس آبشار کی بوٹیاں نوچ کر اپنا پیٹ بھرتے تھے..جو کچھ اس نے تخلیق کیا تھا..ایک بے مثال آبی معبد کی صورت میں..اسے کیسے سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے گھیرے میں لے کر بے وقعت کر دیا تھا..اور یہ گدھ ایسے نہیں ہیں جو صرف مغرب میں ہی پائے جاتے ہیں بلکہ یہ تو خانہ کعبہ کے گرد بھی براجمان ہیں..اسے گھیرے ہوئے ہیں..مسجد نبویؐ اور

میرے بابا کے سبز گنبد پر بھی اُمڈے ہوئے ہیں.. درجنوں منزلوں کے فائیو سٹار ہوٹلوں کی صورت میں.. میرے نبیؐ کی مسجد اور ان کی آرام گاہ کو بھی گھیرے ہوئے زرد شیطان کی پوجا کرتے ہیں..

یہ نیاگرا آبشار انسان پر نہیں.. انسان اس پر حاوی ہو گیا ہے اور اسے ایک سدھائے ہوئے بندر کی مانند اپنے اشاروں پر نچاتا ہے.. چٹانوں میں سرنگیں کھود کر اس آبشار کی دھار کے پیچھے چلا جاتا ہے.. اس کے قدموں میں پلیٹ فارم تعمیر کر کے اس کے قدرتی منظر کا ستیاناس کرتا ہے.. کبھی اس کا رخ بدل دیتا ہے اور کبھی پانیوں کے اخراج کو اپنی مرضی کے مطابق کم و بیش کر لیتا ہے..

نیاگرا کے آس پاس جو گھنے جنگل تھے وہاں ایک بیہودہ سیاحتی شہر تعمیر کر کے اسے گھیرے میں لے کر اسے ایک شوکیس میں بند کر دیتا ہے جیسے ایک ڈولفن یا شارک مچھلی کو شیشے کے تالاب میں قید کر دیا جائے.. یہ انسان دسویں منزل پر واقع ایک قمار خانے میں جوا کھیلتا ہے اور اس کے سامنے جو شیشے کی کھڑکی ہے اس میں سے نظر آتے نیاگرا کو بھی بس ایک نظر دیکھتا ہے اور داؤ کی رقم بڑھا دیتا ہے.. وہ ایک بلند و بالا ہوٹل میں اپنے بیڈروم کا پردہ وا کرتا ہے.. کھڑکی میں نیاگرا کو دیکھ کر واہ کرتا ہے اور پھر اپنی عورت کے پہلو میں جا لیٹتا ہے اور کہتا ہے ڈارلنگ ہم نے کتنا اچھا کیا جو نیاگرا میں آ گئے.. صبح اٹھ کر تم بھی اسے ایک نظر دیکھ لینا..

تب جب میں نیاگرا میں تھا اور دنیا کے اس عظیم آبشار کو عمارتوں اور شاہراہوں اور ہوس کے مظاہروں میں قید دیکھ کر دکھی ہوا تھا تب مجھے ایک خیال آیا تھا.. جب یہ دنیا ان دیکھی اور ان چھوئی تھی اور اس کی کنواری زمین پر ابھی سفید اقوام کے قدم نہیں پڑے تھے.. تب اس آبشار کا منظر اور اثر کیا ہوتا ہوگا.. اور میں نے قیاس کیا کہ اس دنیا کا کوئی قدیم باشندہ.. جسے انڈین کہنا ایک مجبوری ہے.. کوئی ایک تنہا انڈین.. کوئی آوارہ گرد.. چین سے نہ بیٹھنے والا اپنے قبیلے سے جدا.. اپنے جانور پر سوار شوقِ آوارگی سے مجبور.. اجنبی مقاموں اور وادیوں اور گھاٹیوں میں راتیں بسر کرنے والا.. مسلسل سفر میں رہنے والا جب کسی ایک سویر یا دوپہر یا ڈھلتی شام میں کسی آبائی اور گھنے اتنے کہ تاریک جنگل میں چلا جا رہا ہوگا تو اس کے کانوں میں سرسراتی ہوا.. پرندوں کی کوک اور گھوڑے کے کھلے منہ سے برآمد ہوتی ہانپنے کی تھکاوٹ کے علاوہ اس کے کانوں میں ایک عجیب ناآشنا دل میں ڈر بھر دینے والی گونج اتری ہوگی اور وہ ٹھٹک گیا ہوگا کہ یہ کیا ہے.. کیسا شور ہے.. یہ کیا ہے جو

اس ویرانے میں ایک شیر کی مانند دھاڑتا ہے.. بلکہ یہ تو سینکڑوں شیر ہیں جو گرج رہے ہیں.. اور پھر وہ یکدم گھنے جنگل کی نیم تاریکی میں سے باہر روشنی میں کھلی فضا میں آیا ہوگا تو سامنے.. یہ آبشار ہے جو افق تا افق پانیوں کی سفیدی کی ایک کائنات ہے جو گرتی چلی جا رہی ہے.. اور اس میں سے جنم لینے والی آبی دھند اس کے بدن کے گیلے بوسے لینے لگتی ہے تو اس آوارہ گرد پر کیا گزری ہوگی.. اس نے کیا محسوس کیا ہوگا.. مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اپنے گھوڑے سے اتر کر اس سفید آبی معجزے کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا ہوگا کہ.. یہی خدا ہے..

تو مجھے یہاں بھی.. اس خوابناکی میں یہی خیال آیا کہ اگر میں بھی اپنے قبیلے سے جدا ایک آوارہ گرد ہوتا.. اور یونہی تنہا بھٹکتا.. اُن زمانوں میں جب چند کوس کے فاصلے پر نیویارک نام کا شہر نہ تھا.. وہی پرانی آبائی دنیا اپنی اصلی حالت میں موجود ہوتی اور میں اپنی کمر پر اپنا کل اثاثہ بوجھ کیے پیدل چلتا کسی گھنے جنگل.. یہی جنگل جو میرے آس پاس دور تک گھنے ہو رہے تھے' ان میں سے یکدم باہر آتا اور اپنے سامنے ان اَن چھوئی جھیلوں کی ایک مالا دیکھتا تو میرا ردعمل کیا ہوتا.. اپنے آپ میں گم' شانتی اور امن اور چین کے پانیوں میں ٹھہری ہوئی مسلسل سات جھیلیں.. میں تنہا ان پر ظاہر ہوتا اور وہ مجھ پر منکشف ہوتیں تو مجھ پر کیا گزرتی.. میں بھی سجدہ ریز ہو جاتا.. اپنے رب کا شکر ادا کرنے کے لیے..

مجھے کل وطن واپس لوٹ جانا تھا..

سلجوق کے فلیٹ میں براڈوے سٹریٹ کی دسویں منزل پر واقع اس کے فلیٹ کے چوبی فرش پر میرا سامان بندھا پڑا تھا..

میرا کچھ سامان تمہارے پاس پڑا ہے..

اگرچہ مجھ پر قومیت.. پاسپورٹ اور ویزا کی پابندیاں عائد تھیں لیکن یہ پابندیاں لگانے والے نہیں جانتے تھے کہ دراصل میں تو اسی دنیا کا باشندہ ہوں.. ازلوں سے یہی رہتا آیا ہوں..

ہر جھیل جو علی کی آہستہ رو مرسیڈیز کی کھڑکی میں سے نمودار ہوتی اس کے پانیوں پر کیسی کیسی انوکھی شکلیں اور تصویریں نظر آتی تھیں..

اور وہ جو آخری جھیل تھی..

جہاں ہم کچھ دیر ٹھہرے..

جس کی آئینہ سطح پر ایک سرخ رنگ کا کینو..ایک ہلکی کشتی تیرتی تھی اور اس میں جو سوار چپو چلاتے تھے ان کے لبادے نیلے رنگ کے تھے..شاید سفید رنگ کے ہوں پر اُن پر جھیل کے پانی دمکتے عکس ہوتے تھے تو وہ دکھتے نیلے تھے اور جھیل کے پار کچھ شجر ابھی تک خزاں کی زرد ہم آغوشی سے بے خبر سرسبز تھے اور جن پر اس کا غلبہ ہو چکا تھا وہ زرد ہوتے پتے گراتے تھے اور وہ پتے جھیل کے پانیوں پر زرد آنسوؤں کی مانند ٹپ ٹپ گرتے تھے..سرخ کینو ان بہتے ہوئے زرد آنسوؤں کو رُلاتا ان میں تیرتا جاتا تھا..

تو اس آخری جھیل پر میری نظروں کے سامنے ایک پرندہ اترا.. پانی میں چونچ ڈبو کر بلند ہو گیا..اور جہاں اس نے چونچ ڈبوئی تھی وہاں ایک بھنور وجود میں آ کر پھیلا اور ہولے ہولے کناروں تک چلا آیا..میرے قدموں تک آ گیا اور اس کی لہریں میرے پاؤں کے گرد لپٹنے لگیں.. مجھے اپنی گردابی گرفت میں قید کرنے لگیں..کہ مت جاؤ..تم یہاں کے باشندے ہو..مت جاؤ..

وہ پرندہ جب پانیوں میں چونچ ڈبو کر فضا میں بلند ہوا تو ایسے جیسے کل پچھلے پہر پی آئی اے کے طیارے نے جے ایف کے ایئر پورٹ نیویارک سے بلند ہونا تھا..اور وہ جو پرندہ تھا جب بلند ہونا تھا تو اس کے پروں تلے نیویارک کا مین ہیٹن جزیرہ ہونا تھا..براڈوے سٹریٹ پر وہ فلیٹ ہونا تھا جس میں اپنے والد صاحب کی رخصتی پر ایک پر ملال بیٹے سلجوق نے ہونا تھا..بہت کچھ پیچھے رہ جانا تھا..عینی کا گھر بھی اور وہ تین کونجیں بھی..اور پھر اس پرندے کے پروں تلے بحر اوقیانوس کی نیلاہٹیں بے کراں اور بے انت ہوتی تھیں..یورپ ہونا تھا..اور پھر گھر ہونا تھا..

سات جھیلوں میں سے ایک جھیل پر میری نظروں کے سامنے جو ایک پرندہ اترا تھا اور پانیوں میں چونچ ڈبو کر بلند ہو گیا تھا..وہ مجھے اپنے گھر..اپنے پاکستان لے گیا..

